تفسیر مظہری

تالیف

حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتی

تشریحی ترجمہ مع ضروری اضافات

مولانا سید عبدالدائم الجلالی

دارالاشاعت

تفسیر مظہری

جلد نہم

سورۂ نمل سے سورۂ یٰسین تک
پارہ ۱۹ رکوع ۱۵ تا پارہ ۲۳ رکوع ۴

تالیف

حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتیؒ

تشریحی ترجمہ مع ضروری اضافات

مولانا سید عبدالدائم الجلالی
رفیق ندوۃ المصنفین

ناشر

دارالاشاعت

اردو بازار کراچی ۱ ــــــ فون ۲۱۳۷۶۸

باہتمام : خلیل اشرف عثمانی دارالاشاعت کراچی

طباعت : ۱۹۹۹ء خلیل پریس کراچی۔

ضخامت : صفحات در ۶ جلد

ملنے کے پتے

بیت القرآن اردو بازار کراچی
بیت العلوم 26- نابھہ روڈ لاہور
کشمیر بک ڈپو۔ چنیوٹ بازار فیصل آباد
کتب خانہ رشیدیہ۔ مدینہ مارکیٹ راجہ بازار راولپنڈی
یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار پشاور

ادارۃ المعارف جامعہ دارالعلوم کراچی
ادارہ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی لاہور
مکتبہ سید احمد شہید اردو بازار لاہور
مکتبہ امدادیہ ٹی بی ہسپتال روڈ ملتان
مکتبہ رحمانیہ ۱۸ اردو بازار لاہور

فہرست مضامین تفسیر مظہری اردو جلد نہم

تمت بالخیر

سورۃ النمل

یہ سورت مکی ہے اس میں ۹۳ آیات ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

طٰسٓ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ۝ یہ آیات قرآن کی اور (حلال و حرام کے احکام کو) واضح کردینے والی کتاب کی آیات ہیں۔

تِلْكَ سے آیاتِ سورت کی طرف اشارہ ہے۔

وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ سے مراد لوح محفوظ ہے جس کے اندر ہر ہونے والی چیز کا اندراج ہے اس کو مبین یعنی مظہر کل فرمایا، لوح محفوظ تحریر کے لحاظ سے قرآن پر مقدم ہے لیکن ہمارے علم کا تعلق قرآن سے ہی ہے اسی تعلق کا لحاظ کر کے القرآن کو کتاب مبین سے پہلے ذکر کیا۔

یا کتاب مبین سے بھی قرآن ہی مراد ہے قرآن حلال و حرام احکام کو کھول کر بیان کرنے والا ہے اور چونکہ معجز ہے اس لئے اپنے صحیح ہونے کو بھی واضح طور پر بیان کر رہا ہے۔

قرآن اور کتاب صفت کے صیغے بھی ہیں جو چیز پڑھی جائے وہ قرآن (مقروء) ہے اور جو چیز لکھی جائے وہ کتاب (مکتوب) ہے اور یہ دونوں اللہ کی کتاب کے عَلَم (یعنی خصوصی نام) بھی ہیں علمیت کے لحاظ سے بعض جگہ ان کو الف لام کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور وصفی معنی کے لحاظ سے بغیر الف لام کے۔

هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ یہ مجسم ہدایت بھی ہے اور مومنوں کے لئے (خاص طور پر) بشارت بھی ہے۔

یعنی سب لوگوں کے لئے یہ راہنما ہے اگر کوئی ہدایت یاب نہیں ہوتا تو اس کی بتائی اور دکھائی ہوئی راہ پر نہ چلنے کی وجہ سے اور (جو لوگ اس کی بتائی ہوئی راہ پر چلتے ہیں یعنی) مومنوں کے لئے (خصوصیت کے ساتھ) بشارت ہے۔

الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ جو نماز قائم کرتے ہیں یعنی نماز کے فرض، ارکان، نماز کی سنتیں اور نماز کے آداب کے پابند ہیں۔

وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور وہ آخرت پر پورا پورا ایمان رکھتے ہیں یعنی ایمان کے بعد ان کا اعمال صالحہ اختیار کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ ان کا آخرت پر یقین پختہ ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ ۝

جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے حقیقت یہ ہے کہ ہم نے ان کے (برے) اعمال کو ان کی نظروں میں سجا دیا ہے (کہ ان پر نفس کو مسلط کر دیا ہے اور ان کا نفس برے اعمال کو پسند کرنے لگا ہے) پس وہ سرگرداں ہیں یعنی نتائج اور انجام سے بے خبر رہ کر بداعمالی میں سرگرداں ہیں۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْعَذَابِ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے برا عذاب

ہے یعنی دنیا میں قتل، قید اور ذلت کا عذاب ہے۔ یہ بدر کے واقعہ کی پیشین گوئی ہے۔

وَهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمُ الْأَخْسَرُونَ ۝ اور یہی لوگ آخرت میں سب سے زیادہ خسارہ پانے والے ہیں۔

اللہ نے ان کو عزت بخشی، اپنا رسول ان کے اندر پیدا کیا اور رسول بھی ایسا جو ان کو گناہوں سے پاک صاف کرنا چاہتا ہے اور دنیا و آخرت میں کامیاب بنانے کا خواستگار ہے مگر انہوں نے رسول کا حکم نہیں مانا اور دنیا و آخرت کی کامرانی پر دنیا میں قتل اور ذلیل ہو جانے کو ترجیح دی اور آخرت میں دوامی دوزخ کو اختیار کیا پس ان سے زیادہ خاسر و نامراد کون ہو سکتا ہے۔

وَإِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْآنَ مِنْ لَدُنْ حَكِيمٍ عَلِيمٍ ۝ اور آپ کو بالیقین ایک بڑے حکمت والے، علم والے کی طرف سے قرآن دیا جا رہا ہے۔

حَكِيمٍ اور عَلِيمٍ میں تنوین مفید تعظیم ہے یعنی یہ قرآن ایک ایسے عظیم الشان علیم و حکیم کی طرف سے ہے جس کے علم و حکمت کی حد کو کوئی نہیں پہنچ سکتا۔

علم حکمت کے اندر داخل ہے کیونکہ علم عام مفہوم پر دلالت کرتا ہے اور حکمت کا لفظ عمل کے استحکام پر دلالت کرتا ہے لہٰذا دونوں اوصاف کو ظاہر کرنے کے لئے حکیم کے ساتھ علیم بھی فرمادیا، پھر اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ کچھ علوم تو حکمت ہوتے ہیں جیسے علم العقائد علم شریعت وغیرہ اور بعض علوم حکمت نہیں ہوتے جیسے قصص اور آئندہ چیزوں کا بیان۔ گویا لفظ علیم سے اس طرف اشارہ ہے کہ اس قرآن میں گزشتہ واقعات کو بھی بیان کیا گیا ہے چنانچہ اس سے آگے حضرت موسیٰ کے قصہ کی تفصیل ہے۔

إِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِأَهْلِهِ إِنِّي آنَسْتُ نَارًا جب (موسیٰ مدین سے مصر کی طرف آرہے تھے تو راستہ میں ایک جگہ) موسیٰ نے اپنی بیوی سے کہا کہ مجھے ایک آگ دکھائی دی ہے۔

اللہ نے وہ قول نقل کیا جو موسیٰ نے اپنی بیوی سے کہا تھا اور ظاہر ہے کہ موسیٰ نے عربی میں نہیں کہا ہو گا بلکہ اس مفہوم کو اپنی زبان میں ادا کیا ہو جس کو قرآن کے اندر عربی عبارت میں اللہ نے بیان کر دیا) اس میں دلیل ہے اس امر کی کہ حدیث کے معنی کو دوسرے الفاظ میں نقل کرنا (اور یہ کہنا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا فرمایا) جائز ہے اور نکاح بھی ایسے الفاظ سے جائز ہے جو تزویج کو نکاح کے مفہوم کو ظاہر کر رہے ہوں۔

سَآتِيكُمْ مِنْهَا بِخَبَرٍ میں تمہارے پاس وہاں سے کوئی خبر ضرور لے کر آؤں گا یعنی تم یہیں ٹھہرو میں جا کر کوئی خبر لاتا ہوں۔ اس جگہ سَآتِيكُمْ (میں ضرور لے کر آؤں گا) فرمایا اور سورۂ قصص میں لَعَلِّي آتِيكُمْ (امید ہے کہ میں کوئی خبر لے کر آؤں گا) فرمایا۔ ایک جگہ قطعیت اور یقین کا اظہار ہے دوسری جگہ محض امید کا۔ بات یہ ہے کہ امید جب قوی ہو تو اس کو قطعیت اور یقین کے رنگ میں بیان کیا جا سکتا ہے، حضرت موسیٰ کو امید تھی اس لئے لَعَلِّي آتِيكُمْ کہہ دیا اور یہ امید یقینی تھی کہ ضرور کوئی اطلاع مفید لے کر آؤں گا اس لئے سَآتِيكُمْ کہہ دیا۔

بِخَبَرٍ کوئی اطلاع یعنی صحیح راستہ کی اطلاع۔ حضرت موسیٰ راستہ بھٹک گئے تھے صحیح راستے کی بھی تلاش تھی۔

سَآتِيكُمْ کا سین (اظہار یقین پر تو دلالت کر ہی رہا ہے اسی کے ساتھ یہ بھی) بتارہا ہے کہ مسافت لمبی تھی خبر لانے میں تاخیر ہو سکتی تھی۔

أَوْ آتِيكُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ یا تمہارے پاس کوئی بھڑکتی لکڑی لے کر آؤں گا۔

شِهَاب بھڑکتی آگ کا شعلہ۔ قَبَس بڑی آگ میں سے لیا ہوا ایک شعلہ۔ کذا فی القاموس

بغوی نے لکھا ہے شِہَاب اور قَبَس دونوں قریب المعنی ہیں قَبَس اس لکڑی کو کہتے ہیں جس کے ایک سرے میں آگ لگی ہوئی ہو اور دوسرے سرے میں آگ نہ ہو۔

لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ۞ تاکہ تم تاپ لو (اپنے آپ کو آگ سے سینک لو) اِصْطِلَاءٌ باب افتعال مادہ صَلْیٌ۔ صَلْیٌ آگ بھڑکانا۔ یعنی مجھے امید ہے کہ تم لوگ سردی دور کرنے کے لئے آگ سے تاپ سکو گے، سردی کا موسم تھا اور سردی سخت تھی۔ اس لئے حضرت موسیٰؑ نے یہ بات کہی۔

فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِيَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا پھر جب موسیٰ آگ کے قریب پہنچے تو ندا دی گئی کہ جو اس آگ کے اندر ہے اس پر بھی برکت ہے اور جو آگ کے آس پاس ہے اس پر بھی برکت ہے۔ آگ پر پہنچنے سے مراد ہے آگ کے قریب پہنچنا جب کوئی شخص فرودگاہ کے قریب پہنچ جائے تو عرب کہتے ہیں بلغ فلانٌ المنزلَ فلاں شخص منزل کے قریب پہنچ گیا۔

نُوْدِيَ ندا دی گئی۔ نداء کے اندر قول کا معنی ہے یعنی پکار کر کہا گیا بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ یعنی پاک ہے وہ جو آگ کے اندر جلوہ افروز ہے اس سے مراد ہے اللہ تعالیٰ۔ حضرت ابن عباس، سعید بن جبیر اور حسن نے بھی تفسیر کی۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے موسیٰؑ کو ندا دی اور اپنا کلام سنایا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ وہ آگ نہ تھی اللہ تبارک و تعالیٰ کا نور جلوہ افروز تھا۔ موسیٰؑ نے اس کو آگ خیال کیا تھا اس لئے لفظ نار (آگ) کہا تھا۔

مسلم نے حضرت ابو موسیٰ کا قول نقل کیا ہے حضرت ابو موسیٰؓ نے فرمایا ہمارے (جلسہ کے) اندر رسول نے کھڑے ہو کر پانچ باتیں فرمائیں فرمایا اللہ سوتا نہیں نہ اس کے لئے سونا سزاوار ہے۔ وہی ترازو کے پلڑے کو اونچا نیچا کرتا ہے (یعنی گھٹاتا بڑھاتا اور ذلت و عزت دیتا ہے) اس کے سامنے رات کے اعمال دن کے اعمال سے پہلے اور دن کے اعمال رات کے اعمال سے پہلے پیش کئے جاتے ہیں، اس کا حجاب نور ہے اگر کھل جائے تو اس کی ذات کے چمکارے وہاں تک مخلوق کو سوختہ کر دیں جہاں تک اس کی نظر کی رسائی ہو (یعنی سارے جہان کو جلا ڈالے)

سعید بن جبیرؓ نے کہا وہ بعینہ آگ ہی تھی جو اللہ (کی ذات) کے لئے حجاب تھی جیسا کہ بعض روایات میں حِجَابُهُ النُّوْرُ کی بجائے حِجَابُهُ النَّارُ آیا ہے۔ اس تفسیر پر اس آیت کا شمار متشابہات میں ہوگا جیسا دوسری آیت میں آیا ہے هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وہ صرف اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ غمام کے سائبانوں میں ان کے پاس آپہنچے۔

چونکہ آیت مذکورہ سے اس بات کا وہم پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کسی مکان اور کسی شکل کا محتاج ہے حالانکہ خدا ہر عیب و نقص سے پاک ہے (نہ اس کو کوئی مکان گھیر سکتا ہے، نہ اس کی کوئی شکل ہے یہ دونوں چیزیں اس کے لئے باعث نقص ہیں۔ مترجم) اس لئے آئندہ آیت میں اللہ نے اپنی پاکی کی صراحت کی اور فرمایا۔

وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۞ اور پاکی کا اقرار کرو اس اللہ کی جو سارے جہان کا رب ہے۔

مجاہد کی روایت ہے کہ حضرت ابن عباس نے بُوْرِكَتِ النَّارُ (یعنی آگ کو برکت دی گئی۔ سعید بن جبیر راوی ہیں کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا میں نے اُبی کو پڑھتے سنا اَنْ بُوْرِكَتِ النَّارُ وَمَنْ حَوْلَهَا اس روایت میں مَنْ حَوْلَهَا میں مَنْ زائد ہوگا (یعنی برکت نازل کی گئی آگ پر اور آگ کے گرداگرد)۔

بُوْرِكَ النَّارُ اور بُوْرِكَ فِي النَّارِ (دونوں کا ایک ہی معنی ہے عرب کہتے ہیں بَارَكَ اللّٰهُ اور بَارَكَ اللّٰهُ فِيْهِ اور بَارَكَ اللّٰهُ عَلَيْهِ سب کا ایک ہی معنی ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ جو آگ میں ہیں (یعنی ملائکہ) اور جو آگ کے گرد ہیں (یعنی موسیٰؑ) سب کو برکت دی گئی نار کی صفت مبارکہ آئی ہے جیسے بقعۃ کی صفت مبارکہ آیت فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ (مبارک مقام) میں آئی ہے۔ بعض اہل علم نے کہا بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ میں مضاف محذوف ہے یعنی بُوْرِكَ مَنْ فِيْ طَلَبِ النَّارِ (برکت دی گئی اس کو جو آگ کی طلب میں ہے) یا بُوْرِكَ مَنْ فِيْ مَكَانِ النَّارِ (مبارک ہے وہ جو آگ کے

مقام پر ہے) بہر حال اس سے مراد حضرت موسیٰؑ ہیں اور مَنْ حَوْلَهَا سے ملائکہ مراد ہیں جو آگ کے آس پاس موجود تھے اللہ کی طرف سے موسیٰؑ کے لئے اس لفظ میں پیام برکت تھا جیسے حضرت ابراہیم کو فرشتوں کی زبانی پیام برکت و رحمت دیا گیا تھا اور فرشتوں نے کہا تھا۔ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ۔

بعض نے کہا مَنْ فِي النَّارِ سے مراد ملائکہ ہیں اور مَنْ حَوْلَهَا سے مراد موسیٰ۔ جو نور موسیٰؑ نے دیکھا تھا اس کے اندر ملائکہ تسبیح، تحمید اور تقدیس میں مشغول تھے اور موسیٰؑ آگ کے قریب تھے۔

بعض علماء نے کہا مَنْ حَوْلَهَا کا لفظ عام ہے وادی کے اندر جو کوئی تھا سب کو یہ لفظ شامل تھا اور ارض شام (جس کو مخزن انبیاء ہونے کی وجہ سے برکات بھی کہا گیا ہے) بھی اس میں داخل ہے اور خطاب کا صیغہ ذکر کرنے سے پہلے مَنْ حَوْلَهَا کا ذکر کرنا موسیٰؑ کو ایک طرح کی بشارت اور اس امر کی پہلے سے خوشخبری ہے کہ تمہارا واقعہ بڑی عظمت والا ہوگا تمہاری برکتیں ارض شام میں پھیلیں گی ان تمام تاویلات پر سبحان اللہ رب العالمین سے دو باتیں مستفاد ہوں گی ایک تو توہم تشبیہ کی نفی ہو جائے گی دوسری بات یہ کہ آئندہ واقعہ موسیٰؑ کی عظمت کا اظہار اور اس کا تعجب آفریں ہونا معلوم ہو جائے گا۔

يٰمُوْسٰٓى اِنَّهٗٓ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ اے موسیٰؑ حقیقت یہی ہے کہ میں ہی اللہ ہوں غالب اور حکمت والا ہوں۔ لفظ عزیز و حکیم در حقیقت تمہید ہے آئندہ واقعہ کی، یعنی میں ایسا قادر مطلق اور غالب کل اور حکمت و تدبیر کے ساتھ کام کرنے والا ہوں کہ کسی کے تصور کی رسائی بھی وہاں تک نہیں ہو سکتی مثلاً لاٹھی کو سانپ بنا دینا وغیرہ۔

وَاَلْقِ عَصَاكَ ۭ اور اپنی لاٹھی (ہاتھ سے زمین پر) پھینک دو۔ موسیٰؑ نے لاٹھی زمین پر پھینک دی فوراً لاٹھی سانپ بن گئی اور دوڑنے لگی۔

فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَاۗنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ۭ جب موسیٰؑ نے لاٹھی کو تیزی سے حرکت کرتے دیکھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ (تیزی سے اور دوڑ میں) ہلکا پھلکا سانپ ہے تو (ڈر کے مارے) پیٹھ پھیر کر بھاگ پڑے اور مڑ کر نہیں دیکھا۔ مقاتل نے کہا عقب کا معنی ہے بھاگنے کے بعد پھر لوٹ پڑنا۔

يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ ۣ اِنِّىْ لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ ۝ (ہم نے کہا) موسیٰؑ (سانپ سے) خوف نہ کرو میرے پاس پہنچ کر پیغمبر (کسی چیز سے) ڈرا نہیں کرتے۔ یعنی جب میرا قرب مل جاتا ہے اور میری بارگاہ میں پیغمبر آجاتے ہیں تو (حالت قرب میں) پھر کسی خوفناک چیز سے نہیں ڈرتے، یہ آخری جملہ عدم خوف کی علت ہے، مطلب یہ ہے کہ جو پیغمبر میرا پیام مخلوق کو پہنچاتے ہیں وہ صرف مجھ سے ڈرتے ہیں اور میرے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا انا اخشاکم باللہ بظاہر اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر سب سے زیادہ ڈرتے ہیں لیکن آیت کا جو مطلب ہم نے بیان کیا اس کی روشنی میں حدیث کا مطلب بھی واضح ہو گیا (کہ پیغمبروں کو بارگاہ الٰہی میں رسائی کے بعد مخلوق میں سے کسی کا خوف نہیں رہتا وہ صرف اللہ سے ڈرتے ہیں)

یا یہ مطلب ہے کہ پیغمبروں پر جس وقت وحی نازل ہوتی ہے تو اس وقت وہ اتنے مستغرق ہو جاتے ہیں کہ ان کو مطلقاً کوئی خوف نہیں رہتا۔ یا یہ مطلب ہے کہ ان کو اپنا انجام برا ہونے کا اندیشہ نہیں رہتا کیونکہ ان کا انجام اور مآل کار برا ہوتا ہی نہیں۔

اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْۗءٍ فَاِنِّىْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ مگر ہاں جس سے کوئی قصور سرزد ہو جائے پھر برائی ہو جانے کے بعد اس کے بجائے نیک کام کرلے تو میں بہت بخشنے والا بڑا مہربان ہوں۔

اِلَّا بہر حال استثنائیہ ہے لیکن استثناء متصل ہے (یعنی پیغمبر بھی کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ ان سے بیجا حرکات کا صدور ہو جاتا ہے پھر وہ توبہ کر لیتے ہیں اور بجائے گناہ کے نیک اعمال کرتے ہیں) یا منفصل ہے کہ مستثنیٰ منہ مُرْسَلُوْنَ نہیں ہے بلکہ اِلَّا استثنائیہ لیکن کے معنی میں ہے) کچھ علماء استثناء کو متصل کہتے ہیں اس میں قبطی کو قتل کرنے کی طرف اشارہ ہے مطلب یہ

ہو گا کہ اللہ اپنے کسی نبی کے دل میں کسی کا خوف نہیں آنے دیتا مگر اس پیغمبر کے دل میں کسی مخلوق سے ڈر پیدا ہو جاتا ہے۔ جس سے کوئی گناہ یعنی صغیرہ یا ترک اولیٰ کا ہو گیا ہو اور پھر اس نے توبہ کر لی ہو اور اعمال کو درست کر لیا ہو تو اللہ اس کو معاف فرما دیتا ہے وہ غفور رحیم ہے۔ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا کی صراحت اس لئے کر دی کہ انبیاء سے ایسا صغیرہ گناہ بھی سرزد نہیں ہو سکتا اور نہ نبوت سے پہلے کوئی (ایسا کبیرہ) گناہ سرزد ہو سکتا ہے جس کے بعد انہوں نے توبہ نہ کر لی ہو۔

بعض علماء نے کہا ثُمَّ بَدَّلَ کا عطف ایک محذوف لفظ پر ہے اور یہاں سے کلام ہی علیحدہ ہے پہلا کلام مَنْ ظَلَمَ پر ختم ہو گیا۔ پورا کلام اس طرح تھا فَمَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ الخ آخر تک یعنی جس آدمی نے گناہ کیا پھر توبہ کر لی۔ اس وقت اس جملہ کا حکم تمام لوگوں کے لئے عام ہو گا انبیاء ہی سے اس کا خصوصی تعلق نہ ہو گا۔

بعض علماء کے نزدیک استثناء منقطع ہے کیونکہ پیغمبروں سے ظلم (گناہ) کا صدور ممکن نہیں (اللہ نے ان کو معصوم بنایا ہے) اس وقت الا کا معنی ہو گا لیکن (اور کلام بالکل علیحدہ ہو گا) مطلب اس طرح ہو گا۔ لیکن پیغمبروں کے علاوہ جس نے گناہ کیا ہو پھر توبہ کر لی ہو تو اللہ غفور رحیم ہے اس کو معاف کر دے گا لیکن ایسے شخص کو اللہ کے سوا دوسروں کا خوف ہو جاتا ہے۔ بعض نے کہا یہ استدراک ہے بظاہر کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی پیغمبر سے کسی صغیرہ گناہ کا صدور بھی نہیں ہوتا باوجودیکہ ایسے پیغمبر بھی تھے جن سے صغیرہ گناہ کا صدور ہوا تھا (سب سے پہلے حضرت آدم سے ہی اجتہادی قصور ہوا یا بلا قصد گناہ کا صدور ہو گیا۔ مترجم) اس شبہ کو دور کرنے کے لئے فرمایا لیکن پیغمبروں میں سے جس کسی سے کوئی صغیرہ گناہ صادر ہو گیا تو اس نے اس کے پیچھے فوراً توبہ کر لی اور اللہ نے اس کو معاف کر دیا۔ پس ایسا پیغمبر بھی اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔

ان دونوں تاویلوں پر یہ کہنا پڑے گا کہ موسیٰؑ سانپ سے نہیں ڈرے حالانکہ یہ بات خلاف واقع ہے اللہ نے فرمایا ہے فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ دوسری آیت میں آیا ہے فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِهٖ خِیْفَةً مُّوْسٰى موسیٰؑ نے اپنے دل میں ایک قسم کا خوف محسوس کیا۔ ہاں اگر نفی خوف سے مراد ہو بد انجامی کا خوف نہ کرنا تو کلام کا مطلب بن جائے گا جس طرح دوسری آیت میں آیا ہے لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ نہ ان کو عذاب کا خوف ہو گا نہ گزشتہ کا رنج لیکن کلام کی رفتار اور سیاق کا تقاضا اس مطلب کے خلاف ہے کیونکہ موسیٰؑ کو جس خوف کی ممانعت کی گئی تھی وہ تو سانپ ہی کا خوف تھا۔ موسیٰؑ سانپ ہی سے ڈرتے تھے۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ اِلَّا اس جگہ وَلَا (اور نہیں) کے معنی میں ہے مطلب یہ ہو گا کہ میرے پاس پہنچ کر نہ تو پیغمبر خوف کرتے ہیں اور نہ وہ صلحاء مومنین جو پیغمبر نہیں اور ان سے کوئی گناہ ہو جاتا ہے اور وہ توبہ کر لیتے ہیں اور اپنے اعمال کو درست کر لیتے ہیں وہ بھی بے گناہ کی طرح سے ہو جاتے ہیں ان کو بھی کوئی خوف نہیں ہوتا اس توجیہ پر مذکورہ سابق دونوں تاویلوں کی طرح مطلق خوف کی نفی ہو گی صرف مخلوق سے ڈرنے کی نفی نہیں ہو گی۔ اس جگہ محشی نے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے ایک نفیس اطمینان بخش تنقیح نقل کی ہے جس کا ترجمہ ضروری ہے وہ یہ ہے۔[1]

وَاَدْخِلْ یَدَكَ فِیْ جَیْبِكَ اور اپنے ہاتھ کو اپنے (قمیص کے) گریبان میں ڈالو۔ جیب کرتہ کا گریبان

---

[1] یہ طویل بحث بے فائدہ ہے اہل دانش کا اس سے اطمینان نہیں ہوتا۔ ٹھیک وہ تشریح ہے جو حکیم الامت خاتم المفسرین نے بیان کی ہے حضرت اشرف المفسرین والمحدثین نے آیت خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِیْدُهَا سِیْرَتَهَا الْاُوْلٰى کی تفسیر کے ذیل میں لکھا ہے اور موسیٰ علیہ السلام کا ڈر جانا بعض نے کہا ہے کہ طبعی ہے جو کسی طرح جلالت شان کے منافی نہیں اور بعض نے کہا ہے کہ جو حادثہ مخلوق کی جانب سے ہو اس میں تو نہ ڈرنا کمال ہے جیسے ابراہیم آتش نمرود سے نہیں ڈرے اور جو امر خالق کی طرف سے ہو اس میں ڈرنا ہی کمال ہے کہ وہ فی الحقیقت حق تعالیٰ سے ڈرنا ہے جیسے ہوا تیز ہونے کے وقت جناب رسول اللہ ﷺ کا گھبرانا حدیثوں میں آتا ہے۔ سو چونکہ اس تبدل میں مخلوق کا واسطہ نہ تھا اس سے ڈر گئے کہ یہ کوئی قہر الٰہی نہ ہو۔ حضرت مولانا نے اسی آیت کی تشریح کے ذیل میں اپنی کتاب مسائل السلوک من کلام ملک الملوک میں لکھا ہے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(قاموس) بعض نے کہا جیب قمیص کو کہتے ہیں (جوب کا معنی ہے قطع کرنا) قمیص کو کاٹا جاتا ہے اس لئے اس کو جیب کہتے ہیں۔
بغوی نے لکھا ہے اہل تفسیر کا بیان ہے کہ حضرت موسیٰؑ اس وقت ایک چھوٹا سا اونی کرتہ پہنے ہوئے تھے جس کی نہ آستینیں تھیں نہ بٹن۔

تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ (اگر گریبان کے اندر ہاتھ ڈال کر باہر نکالو گے تو وہ) گورے رنگ کا ہو کر نکلے گا (جو سورج کی طرح روشن اور چمکدار ہوگا) بغیر کسی خرابی کے (یعنی برص وغیرہ کی بیماری کی وجہ سے اس کا گوراپن نہ ہوگا)

فِيْ تِسْعِ اٰيٰتٍ (یہ دونوں معجزات) منجملہ نو معجزات کے ہیں۔ یا یہ دونوں مع نو معجزات کے ہیں۔ نو آیات حسب ذیل تھیں۔ ۱۔ لاٹھی سے سمندر کو پھاڑ دینا۔ ۲۔ طوفان ہوائی۔ ۳۔ ٹڈی دل ۴۔ جوئیں ۵۔ مینڈکیاں ۶۔ خون ۷۔ صورت کا بگاڑ ۸۔ دیہات میں خشک سالی ۹۔ مویشیوں کا دودھ سے خشک ہو جانا۔ جس نے عصا اور ید بیضاء کو بھی نو معجزات میں شامل کیا ہے۔ اس نے خشک سالی اور دودھ خشک ہو جانے کو ایک معجزہ قرار دیا ہے اور سمندر کے پھٹنے کو تسع آیات میں شمار نہیں کیا کیونکہ فرعون کے پاس جانے کا حکم جس وقت دیا گیا تھا اس وقت یہ معجزہ عطا نہیں ہوا تھا۔
یا فِیْ تِسْعِ آیاتٍ الگ جملہ ہے گویا اِذْهَبْ فِیْ تِسْعِ اٰیٰتٍ پورا کلام تھا۔

اِلٰى فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهٖ (ان معجزات کے ساتھ) فرعون اور اس کی قوم والوں کی طرف (جاؤ)

اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ (کیونکہ) وہ بدکار لوگ تھے۔ یہ حضرت موسیٰؑ کو فرعون کے پاس بھیجنے کی علت ہے۔

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ جب ان کے پاس (ہمارے احکام واضح طور پر پہنچ گئے یا) ہماری نشانیاں (یعنی معجزات) کھلم کھلا پہنچ گئے تو فرعون اور اس کی قوم والوں نے کہا یہ کھلا جادو ہے۔

خلاصہ مطلب یہ ہے کہ موسیٰؑ کو حکم ملا اپنی لاٹھی زمین پر پھینک دو، موسیٰؑ نے لاٹھی پھینک دی وہ سانپ بن گئی اور تیزی کے ساتھ دوڑنے لگی اور حکم ملا اپنا ہاتھ گریبان کے اندر کر کے نکالو وہ سفید بے داغ نکلے گا۔ موسیٰؑ نے اس حکم کی بھی تعمیل کی اور ہاتھ اندر سے گورا چمکیلا بے داغ نکلا اور حکم ملا یہ دونوں نشانیاں لے کر مع نو نشانیوں کے فرعون اور اس کی قوم کے پاس جاؤ وہ بدکار لوگ ہیں، موسیٰؑ گئے اور معجزات پیش کئے فرعون اور اس کے ساتھیوں نے کہا یہ کھلا جادو ہے۔

وَجَحَدُوْا بِهَا اور انہوں نے ان آیات کا انکار کیا۔ یعنی اللہ کی طرف سے نازل ہونے کا انکار کیا۔

(گزشتہ سے پیوستہ) قال العبد الضعیف فیہ بقاء الطبائع فی الکاملین حیث خاف علیہ السلام خوفا طبعیا وفیہ الامر بتعدیل الطبعیات بالعقلیات یعنی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کاملین میں بھی طبعی تقاضے باقی رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام کو بتقاضائے طبع خوف پیدا ہوا۔ اس میں (ضمنی) حکم ہے اس بات کا کہ طبعی تقاضوں کو عقل کے زیر حکم اعتدال پر لانا ضروری ہے۔
حاصل کلام یہ نکلا کہ موسیٰ علیہ السلام کو محض خدا سے ڈر تھا کسی اور سے نہ تھا اور لاٹھی بھی غیر معمولی طور پر بلاواسطہ اللہ کے حکم سے سانپ بنی تھی اس لئے اس سانپ سے خوف ہوا نہ کہ ہر سانپ سے۔ مترجم) یا موسیٰؑ کا یہ خوف طبعی تھا اور ممانعت عقلی خوف سے کی گئی ہے اس لئے دونوں میں کوئی منافات نہیں۔ انتہی۔ یہ فقیر مترجم کہتا ہے کہ یہی آخری توجیہ زیادہ صحیح ہے اول الذکر تاویل مناسب نہیں کیونکہ حضرت موسیٰؑ قبطی کو قتل کرنے کے بعد فرعون کے خوف سے بھاگے تھے اور ظاہر ہے کہ قبطی کا قتل اگرچہ معصیت خداوندی نہیں تھا بحکم خدا نہ تھا، فعل موسیٰؑ تھا کوئی نہیں من جانب اللہ حادثہ نہ تھا، ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ خوف نبوت سے پہلے ہوا تھا نبوت کے بعد تو بامر خدا خود فرعون کے پاس پہنچ گئے۔ واللہ اعلم۔

وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ اور ان کے دلوں کو ان آیات کا پکا یقین ہو گیا تھا۔ استیقان کے معنی میں ایقان سے زیادہ زور ہے۔

ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ۭ ظلم اور تکبر کی وجہ سے (انہوں نے انکار کیا تھا) ظلم سے یہ مراد ہے کہ انہوں نے اپنی جانوں پر کیا تھا کہ دوامی دوزخ کے مستحق ہو گئے تھے اور تکبر یہ تھا کہ انہوں نے موسیٰؑ پر ایمان لانے سے سرتابی کی تھی۔

فَانْظُرْ پس (اے مخاطب بصیرت نظر سے) دیکھ۔

ع ۱ ۱۹ **كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ۝** تباہ کاروں کا انجام کیسا ہوا (کہ دنیا میں ان کو پانی میں غرق کر دیا گیا اور مرنے کے بعد دوزخ میں پہنچا دیا گیا۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ اور ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم عطا کیا۔ یعنی طاقت بشریہ کے مطابق اللہ کی ذات، صفات، احکام اور مبدء و معاد کے احوال اور پرندوں اور چوپایوں کی بولی اور پہاڑوں کی تسبیح اور لوہے کو نرم کرنے کا علم ہم نے عطا کیا۔

وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰي كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ اور (اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہوئے) دونوں نے کہا تعریف ہے اس اللہ کی جس نے اپنے کثیر مومن بندوں پر ہم کو برتری عنایت فرمائی۔

قَالَا سے پہلے فَ نہ ہونا اور واؤ ہونا بتا رہا ہے کہ اس سے پہلے کچھ کلام محذوف ہے پوری عبارت اس طرح تھی پس دونوں نے علم کے مطابق عمل کیا اور نعمت کے حق کو پہچان کر یہ جملہ کہا۔ اگر کلام کو محذوف نہ قرار دیا جائے تو پھر بجائے واؤ کے فَ ہونا چاہئے عرب کہتے ہیں اعطیتہ فشکر۔

آیت بتا رہی ہے کہ علم بڑی فضیلت ہے باعث شرف ہے اور علماء کو دوسروں پر فضیلت حاصل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا عابد پر عالم کی فضیلت ایسی ہے جیسے چودھویں کے چاند کو باقی ستاروں پر فضیلت ہے۔ علماء انبیاء کے جانشین ہیں اور انبیاء نے کوئی دینار و درہم اپنی میراث میں نہیں چھوڑا بلکہ علم کی میراث چھوڑی ہیں جس نے اس میراث کو لیا (وہ بڑا خوش نصیب ہے) اس نے بڑی میراث پائی۔ رواہ احمد والترمذی وابو داؤد وابن ماجہ من حدیث کثیر بن قیس ترمذی نے قیس بن کثیر لکھا ہے۔

یہ بھی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عابد پر عالم کی برتری ایسی ہے جیسے تم میں سے ادنیٰ آدمی پر میری برتری، رواہ الترمذی عن ابی امامۃ الباہلی۔

آیت میں نعمت علم کا شکر ادا کرنے کی ترغیب ہے اور اس بات کی تعلیم ہے کہ آدمی کو خواہ بہت لوگوں پر فضیلت حاصل ہو پھر بھی اس کو تواضع کرنا چاہئے اور یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس پر بھی بہت لوگوں کو برتری حاصل ہے وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ہر عالم سے اونچا عالم ہے۔

وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ اور سلیمان داؤد کے وارث ہوئے یعنی نبوت کے، حکومت کے اور علم کے وارث ہوئے۔ قتادہ نے یہی تفسیر کی اخرجہ عبد بن حمید وابن المنذر وابن ابی حاتم۔ شیعہ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ انبیاء بھی دوسروں کو اپنا وارث بناتے ہیں۔ لیکن شیعہ فرقہ کا یہ استدلال بجائے فائدہ کے ان کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اگر سلیمان داؤد کے مال کے وارث ہوئے یہ صحیح مانا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت داؤد کے جو دوسرے اٹھارہ بیٹے تھے ان کو باپ کے مال میں سے کچھ نہیں ملا سب کے وارث سلیمان ہو گئے اور وراثت کا معنی یہ ہے کہ ایک شی دوسرے کی طرف بغیر کسی بیع شراء اور ہبہ اور عاریت وغیرہ کے منتقل ہو جائے خواہ وہ دونوں آپس میں قرابتدار ہوں یا نہ ہوں، اللہ نے فرمایا ہے۔ وَاَوْرَثَنَا

۱۔ بیضاوی نے لکھا ہے کہ ظاہر میں انہوں نے انکار کیا تھا اب یہ شبہ نہ کرنا چاہئے کہ دل سے انکار تو یقین کے ساتھ ممکن نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دل سے یقین اور زبان سے انکار تھا۔

هٰكَذٰلِكَ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ہم نے اس سرزمین کا بنی اسرائیل کو وارث بنادیا (یعنی اس کی ملکیت بغیر کسی عقد کے بنی اسرائیل کی طرف منتقل کردی) دوسری آیت میں آیا ہے وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ (اور تم کو ان کی زمین اور ان کے گھروں کا وارث یعنی قابض و مالک بنادیا ظاہر ہے کہ دونوں آیتوں میں مورث اور وارث میں قرابت نہیں تھی اس لئے شرعی میراث تو مراد نہیں ہے صرف تملیک اور قبضہ مراد ہے۔ مترجم)

رسول اللہ ﷺ کی حدیث میں جو لَا نُوْرَثُ کا لفظ آیا ہے اس کا معنی یہ ہے کہ کوئی آدمی (خواہ کتنا ہی عزیز اور قرابتدار ہو) کسی نبی کے مال کا وارث نہیں ہوتا بلکہ نبی کی وفات کے بعد اس کا مال وقف قرار پائے گا اور اللہ براہ راست اس کا مالک ہوگا۔

بغوی نے لکھا ہے حضرت داؤد کو اللہ نے جو نعمتیں عطا فرمائی تھیں وہ نعمتیں سب حضرت سلیمان کو عطا فرمادیں بلکہ تسخیر ہوا اور تسخیر شیاطین یہ دونوں چیزیں زیادہ عنایت فرمائیں۔

مقاتل نے کہا سلیمان کا ملک بڑا تھا اور داؤد میں سلیمان کی نسبت سے قوت فیصلہ بڑی تھی اور آپ عبادت گزار زیادہ تھے اور حضرت سلیمان اللہ کی نعمتوں کے شکر گزار (بہت تھے) میں کہتا ہوں حضرت داؤد بھی ایسے ہی تھے۔

وَقَالَ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ اور سلیمان نے کہا اے لوگو ہم کو پرندوں کی بولی سکھادی گئی ہے۔ اس کلام میں حضرت سلیمان کی طرف سے اللہ کی نعمت کے شکر کا اظہار ہے اور معجزہ کا ذکر کرکے لوگوں کو اس کی تصدیق کی دعوت ہے۔

نطق اور منطق وہ بولی جو دل کی بات کو ظاہر کرتی ہے خواہ مفرد ہو یا مرکب۔ قاموس میں ہے نَطَقَ يَنْطِقُ (باب ضرب) نُطْقًا و مَنْطِقًا ونُطُوْقًا (تینوں مصدر) آواز کے ساتھ اور ایسے حروف کے ساتھ تلفظ کیا جس سے معنی سمجھ میں آسکیں۔

اور چونکہ انسانوں کے لئے معانی کا سمجھنا انہی الفاظ پر موقوف ہے جو انسان بولتے ہیں اس لئے نطق کو انسان کے کلام کے لئے مخصوص سمجھ لیا گیا مگر حضرت سلیمان تو پرندوں کی آواز سے بھی ان کا دلی مدعا سمجھ جاتے تھے اس لئے پرندوں کی بولی کو بھی حضرت سلیمان نے اپنے لئے منطق کہا۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت کعب نے فرمایا حضرت سلیمان کے پاس جنگلی کبوتر نے آواز نکالی تو آپ نے پوچھا کیا تم کو معلوم ہے کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ حاضرین نے کہا نہیں۔ فرمایا یہ کہہ رہا ہے مرنے کے لئے جنو اور ویران ہونے کے لئے عمارتیں بناؤ۔ فاختہ چیخی تو آپ نے فرمایا جانتے ہو یہ کیا کہہ رہی ہے؟ حاضرین نے کہا نہیں۔ فرمایا یہ کہہ رہی ہے کاش یہ مخلوق پیدا نہ کی جاتی۔ مور چیخا تو آپ نے پوچھا جانتے ہو یہ کیا کہہ رہا ہے حاضرین نے کہا نہیں۔ فرمایا یہ کہہ رہا ہے جیسا دوسروں سے معاملہ کرو گے ویسا ہی تم سے کیا جائے گا۔ ہدہد بولا تو پوچھا کیا کہہ رہا ہے تمہیں معلوم ہے؟ حاضرین نے کہا نہیں۔ فرمایا یہ کہہ رہا ہے جو رحم نہیں کرے گا اس پر رحم نہیں کیا جائے گا۔ ترمتی نے آواز دی تو پوچھا تم جانتے ہو یہ کیا کہہ رہی ہے۔ حاضرین نے کہا نہیں۔ فرمایا یہ کہہ رہی ہے گنہگارو اللہ سے معافی کی درخواست کرو۔ طیطوی چیخا تو پوچھا تم کو معلوم ہے یہ کیا کہہ رہا ہے۔ لوگوں نے کہا نہیں۔ فرمایا یہ کہہ رہا ہے ہر زندہ مرے گا اور ہر نیا پرانا فرسودہ ہوگا۔ خطاف چیخا تو پوچھا کیا جانتے ہو یہ کیا کہہ رہا ہے؟ حاضرین نے کہا نہیں۔ فرمایا یہ کہہ رہا ہے پہلے سے نیکی بھیجو (وہاں) تم کو مل جائے گی۔ کبوتری نے آواز دی تو فرمایا یہ کیا کہہ رہی ہے؟ تم کو معلوم ہے؟ حاضرین نے کہا نہیں۔ فرمایا یہ کہہ رہی ہے پاکی بیان کرو میرے رب برتر کی اتنی کہ آسمانوں اور زمین کو بھر دے۔ قمری چیخی تو پوچھا جانتے ہو یہ کیا کہہ رہی ہے؟ لوگوں نے کہا نہیں۔ فرمایا یہ کہہ رہی ہے میرے رب اعلیٰ کی پاکی بیان کرو۔ فرمایا کوا عشر وصول کرنے والے (کل مال کا دسواں حصہ بطور ٹیکس وصول کرنے والے) کو بددعا دیتا ہے اور چیل کہتی ہے سوائے اللہ کے ہر چیز کو فنا ہے۔ اور قسطاۃ کہتی ہے جو خاموش رہا محفوظ رہا۔ اور طوطا کہتا ہے تباہی ہے اس کے لئے جس کا مقصد دنیا ہی ہے اور مینڈک کہتا ہے میرے رب قدوس کی پاکی بیان کرو اور باز کہتا ہے میرے رب کی پاکی بیان کرو اور ثنا کرو اور مینڈکی کہتی ہے

پاکی بیان کرو اس کی جس کا ذکر ہر زبان پر ہے۔

مکحول نے کہا سلیمانؑ کے پاس ایک تیتر چیخا تو آپ نے پوچھا جانتے ہو یہ کیا کہہ رہا ہے؟ لوگوں نے کہا نہیں۔ فرمایا یہ کہہ رہا ہے اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى (رحمن عرش پر متمکن ہے) فرقد نجی کا بیان ہے ایک بلبل درخت پر بیٹھا سر بلا رہا تھا اور دم نیچے کو جھکا رہا تھا (اور بول رہا تھا) حضرت سلیمانؑ کا ادھر سے گزر ہوا، فرمایا جانتے ہو یہ بلبل کیا کہہ رہا ہے؟ لوگوں نے کہا اللہ اور اس کا نبی ہی خوب واقف ہے۔ فرمایا یہ کہہ رہا ہے میں نے آدھا چھوارا کھا لیا پس دنیا پر لازم ہے کہ اس کو بوجھا کر پورا کردے۔

روایت میں آیا ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت نے حضرت ابن عباسؓ سے کہا ہم سات چیزوں کے متعلق آپ سے دریافت کرتے ہیں اگر آپ بتادیں گے تو ہم مسلمان ہو جائیں گے اور آپ کی تصدیق کریں گے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا سمجھنے کے لئے پوچھ سکتے ہو ضد کے لئے نہیں پوچھ سکتے۔ یہودیوں نے پوچھا بتائیے چنڈول اپنے گانے میں کیا کہتا ہے اور مینڈک اپنی ٹرٹر میں کیا کہتا ہے اور مرغ اپنی بانگ میں کیا کہتا ہے اور گدھا اپنے رینگنے میں کیا کہتا ہے اور گھوڑا اپنی ہنہناہٹ میں کیا کہتا ہے اور زرزور اور تیتر کیا کہتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا چنڈول کہتا ہے اے اللہ محمد ﷺ اور آل محمد ﷺ سے بغض رکھنے والوں پر لعنت کر اور مرغ کہتا ہے غافلو! اللہ کی یاد کرو اور مینڈک کہتا ہے پاک ہے وہ معبود جس کی عبادت سمندروں کے کنڈوں میں بھی کی جاتی ہے اور گدھا کہتا ہے اے اللہ عشر وصول کرنے والے پر لعنت کر۔ گھوڑا جب معرکہ میں صفوں کے مقابلہ پر ہوتا ہے تو کہتا ہے پاک اور مقدس ہے ملائکہ اور جبرئیل کا رب۔ زرزور کہتا ہے اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ ہر روز کی روزی اسی روز عطا فرما اور تیتر کہتا ہے۔ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى یہودی یہ جواب سن کر مسلمان ہو گئے اور ان کا اسلام اچھا رہا۔

حضرت امام جعفر صادق نے اپنے والد کی وساطت سے اپنے دادا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ جب گدھ چلاتا ہے تو کہتا ہے اے آدم کے بیٹے جی لے جب تک چاہے آخر موت ہے۔ عقاب چیختا ہے تو کہتا ہے لوگوں سے دور رہنے میں سلامتی ہے اور چنڈول چیختا ہے تو کہتا ہے اے اللہ آل محمد ﷺ سے بغض رکھنے والوں پر لعنت بھیج اور خطاف چلاتا ہے تو کہتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ اور وَلَا الضَّآلِّيْنَ کو ایسا کھینچتا ہے جیسے قاری کھینچتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ جانوروں کی آوازوں کی جو تشریح حضرت کعب سے منقول ہے اور جو تفصیل مکحول اور فرقد کے اقوال میں آئی ہے اس سب کا تعلق ممکن ہے کہ کسی ہنگامی آواز سے ہو (حضرت سلیمانؑ کے سامنے کسی وقت جانور اس طرح بولے ہوں) اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ جانور جب بھی بولتے ہیں تو یہی کلمات کہتے ہیں۔ اللہ نے اس سورت میں جو ہدہد اور چیونٹی کا کلام نقل کیا ہے اس کا تعلق تو پیش آمدہ واقعہ کے ساتھ تھا ہی البتہ یہودیوں کے سوال کے جواب میں جو کچھ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا وہ چیخ بتا رہا ہے کہ یہ جانور ہمیشہ ہی یہ الفاظ کہتے ہیں اگر یہ روایت پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے تو اس کی تاویل کرنی ضروری ہوگی۔

وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ اور ہم کو ہر چیز دی گئی ہے۔ اس سے مراد کثرت انعامات کا اظہار ہے (کل استغراقی نہیں) عرب کہتے ہیں فلاں شخص کے پاس ہر شخص آتا ہے یعنی آدمی بہت آتے ہیں۔ فلاں شخص ہر بات جانتا ہے یعنی اس کو معلومات بہت ہیں۔

عُلِّمْنَا اور اُوْتِيْنَا جمع متکلم کے صیغے ہیں حضرت سلیمانؑ نے اپنے ساتھ حضرت داؤدؑ کو شامل کر کے جمع متکلم کے صیغے استعمال کئے۔ یا حضرت سلیمانؑ نے اپنے متبعین کو شامل کر کے یہ لفظ کہے۔ کیونکہ آپ کے متبعین کو آپ کی وساطت سے وہ علم اور وہ انعام ملا جو اللہ نے آپ کو عطا فرمایا تھا۔ یا اصول سیاست کو پیش نظر رکھ کر حضرت سلیمانؑ نے شاہانہ الفاظ استعمال کئے بادشاہ اپنے کو ہم کہتے ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا كُلِّ شَيْءٍ سے دنیا اور آخرت سے تعلق رکھنے والی ہر چیز مراد ہے۔ مقاتل نے کہا نبوت

حکومت اور شیاطین و ہوا کی تسخیر مراد ہے۔

إِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ۝ کوئی شبہ نہیں کہ یہ (عطاء خداوندی) کھلا ہوا (اللہ کا) فضل ہے۔ یعنی ہم کو اسکا کوئی ذاتی استحقاق نہیں نہ یہ ہمارے اعمال کا بدلہ ہے بلکہ محض اللہ کی مہربانی اور کرم ہے یا فضلِ مُبِیْن سے مراد ہے کھلی ہوئی فضیلت۔ یعنی یہ دوسروں پر ہماری واضح برتری ہے۔ حضرت سلیمان نے یہ بات اداءِ شکر کے طور پر کہی (اظہار فخر کے لئے نہیں کہی) جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا میں اولاد آدم کا سردار ہوں اور (یہ بات) فخر (کے طور پر) نہیں ہے اور قیامت کے دن آدم کے سوا سب لوگ میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس طرح کی جو بات فرمائی وہ اس حکم کی تعمیل کے طور پر تھی جو آیت وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ میں دیا گیا ہے۔

بغوی نے لکھا ہے روایت میں آیا ہے کہ حضرت سلیمان نے ساری روئے زمین پر سات سو برس اور چھ ماہ تمام جن و انس اور پرندوں اور چرندوں اور درندوں پر حکومت کی اور ہر چیز کی بولی اللہ نے ان کو سکھادی تھی اور انہی کے زمانہ میں عجیب عجیب صنعتوں کی ایجاد ہوئی۔ [1]

وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ۝

اور سلیمان کے لئے جن و انس اور پرندوں کی فوجیں جمع کردی گئی تھیں اور (ان کی اتنی کثرت تھی کہ) ان کو روکا جاتا تھا۔

يُوْزَعُوْنَ روکے جاتے تھے یعنی اول حصہ کو دوسرے حصہ کے ساتھ روک کر ملا دیا جاتا تھا۔ اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ باوجودیکہ لشکر کی تعداد بہت زیادہ تھی پھر بھی کسی کو دور نہیں رکھا جاتا تھا۔

قاموس میں ہے وَزَعَهٗ میں نے اس کو روک دیا، اسی سے ہے وَازِع کی جمع وَزَعَةٌ روکنے والے جرم سے، اور کتا اور جھڑکنے والا (سب کو وازع کہا جاتا ہے) تَوْزِيْع اِيْزَاع تَوَزُّع (تفعیل افعال تفعل) سب ہم معنی ہیں، تقسیم کرنا، بانٹنا، جدا جدا کر دینا۔ مقاتل نے يُوْزَعُوْنَ کا ترجمہ کیا ہے يُسَاقُوْنَ ان کو چلایا جاتا تھا۔ محمد بن کعب نے کہا سلیمان کی لشکر گاہ سو فرسخ تھی ۲۵ فرسخ جنات کے لئے ۲۵ فرسخ آدمیوں کے لئے ۲۵ فرسخ پرندوں کے لئے اور ۲۵ فرسخ جنگلی جانوروں کے لئے۔ سلیمان کے ایک ہزار کمرے تھے جو لکڑی کے تختوں کے فرش پر قائم تھے تین سو منکوحہ بیبیاں تین سو گھروں میں رہتی تھیں اور سات سو باندیاں سات سو گھروں میں۔ سلیمان کے حکم سے تند ہوا اس تخت کو اٹھا کر اوپر کو لے جاتی تھی پھر بحکم سلیمان نرم نرم ہوا اس کو لے کر چلتی تھی۔ (ایک روز) جو آپ کہیں جا رہے تھے اور آسمان و زمین کے درمیان تھے کہ اللہ نے وحی بھیجی میں نے تمہاری حکومت میں اضافہ کر دیا ہے اب کوئی مخلوق جہاں بھی کوئی بات کرے گی ہوا وہ بات لا کر تم کو پہنچا دے گی۔

حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ یہاں تک کہ یہ سب جب چیونٹیوں کی وادی پر پہنچے۔

عَلٰى وَادٍ میں لفظ عَلٰى بتا رہا ہے کہ وہ اوپر سے آئے تھے اور بات بھی معلوم ہو رہی ہے کہ اس وادی کو طے کر کے آخر کنارہ پر پہنچ گئے تھے (اور وہیں چیونٹیوں کے بل تھے) اتی علی الشیئی کا معنی ہے کسی چیز کو ختم کر دیا اور اس کے آخری حصہ پر پہنچ گئے۔ وہب بن منبہ نے بحوالہ کعب بیان کیا ہے کہ حضرت سلیمان جب تخت پر سوار ہوتے تو اہل و عیال کو نوکروں چاکروں کو اور لاؤ لشکر کو بھی سوار کر لیتے تھے۔ سالن پکانے کے برتن اور روٹیاں پکانے کی آہنی تنور بھی ساتھ ہوتے تھے، اتنی بڑی بڑی دیگیں بھی ہوتی تھیں کہ ایک دیگ میں دس اونٹوں کا گوشت آجائے۔ چوپایوں کے لئے میدان بھی اپنے سامنے

---

[1] بعض پرندوں کے ہم نام لفظ اردو میں نہیں ہیں اس لئے ان کے عربی نام بعینہ ترجمہ میں لکھ دیئے گئے ہیں لیکن اہل لغت نے جو ان کی شناخت بتائی ہے اس کو نقل کرنا ضروری ہے۔

خطاف ایک پرندہ ہوتا ہے جس کے بازو بڑے اور ٹانگیں چھوٹی ہوتی ہیں رنگ کالا ہوتا ہے۔

زرزور چڑیا سے بڑا ایک پرندہ ہوتا ہے جس کی ایک قسم کا رنگ خالص سیاہ ہوتا ہے اور دوسری قسم بھی سیاہ ہوتی ہے مگر اس پر سفید نقطے بکثرت ہوتے ہیں۔

ہوا تے تھے اثنائے سیر میں آسمان و زمین کے درمیان چوپائے اپنے میدانوں میں دوڑتے تھے اور باورچی کھانا اور روٹیاں پکانے میں مشغول رہتے تھے ہوا ان سب کو لے کر چلتی تھی ایک بار اصطخر سے یمن کو جاتے میں مدینہ شریف کے اوپر سے بھی گزرے اور فرمایا یہ نبی آخر الزماں کی ہجرت گاہ ہے خوشخبری ہے اس کے لئے جو ان کے اوپر ایمان لائے اور خوشی ہے اس کے لئے جس نے ان کا اتباع کیا۔ کعبہ کے اوپر سے گزرے تو کعبہ کے گرداگرد بت نظر آئے جن کی پوجا کی جاتی تھی جب سلیمان کعبہ سے آگے بڑھ گئے تو کعبہ رونے لگا اللہ نے کعبہ کے پاس وحی بھیجی (اور دریافت فرمایا) تیرے رونے کا کیا سبب ہے؟ کعبہ نے کہا اے میرے رب! مجھے اس بات نے رلایا کہ یہ تیرا نبی تھا اور تیرے دوستوں کی جماعت تھی یہ لوگ میری طرف سے گزرے اور میرے پاس نماز نہیں پڑھی حالانکہ میرے آس پاس تجھے چھوڑ کر بتوں کی پوجا کی جاتی ہے اللہ نے وحی بھیجی تو نہ رو کچھ مدت کے بعد میں تجھے سجدہ کرنے والے چہروں سے بھر دوں گا اور تیرے اندر جدید قرآن نازل کروں گا اور تیرے اندر سے آخر زمانہ میں ایک نبی پیدا کروں گا، میں اپنے انبیاء سے محبت رکھتا ہوں تیرے اندر اپنی مخلوق سے ایسے لوگوں کو آباد کروں گا جو میری عبادت کریں گے اور میں اپنے بندوں پر ایک فرض (یعنی فریضہ حج) مقرر کر دوں گا (جس کو ادا کرنے کے لئے) وہ اتنی تیزی سے تیرے قریب پہنچیں گے جتنی تیزی سے گدھ اپنے آشیانوں کی طرف جاتے ہیں وہ تیرے ایسے مشتاق ہوں گے جیسے اونٹنی کو اپنے بچہ کی طرف اور کبوتری کو اپنے انڈوں کی طرف اشتیاق ہوتا ہے۔ (اونٹنی اپنے بچہ کے پاس اور کبوتری اپنے انڈوں کے پاس بڑی بے تابی سے پہنچنا چاہتی ہے) میں تجھے بتوں اور شیطانوں کے پجاریوں سے پاک کر دوں گا۔ پھر سلیمان چلتے چلتے وادی سدیر کی طرف سے گزرے ہوا دی سدیر وادی طائف کا حصہ ہے وہاں آپ کا مرور وادی نمل پر ہوا۔ کعب کا یہی قول ہے کہ وادی نمل طائف میں تھی۔ مقاتل اور قتادہ نے کہا وہ شام میں ایک زمین تھی۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اس وادی میں جن رہتے تھے اور وہاں کی چیونٹیاں ان کی سواریاں تھیں۔ فرق حمیدی نے کہا اس وادی کی چیونٹیاں مکھیوں کی طرح تھیں بعض نے کہا بختاتی اونٹ کے برابر تھیں مشہور یہ ہے کہ یہ بات کہنے والی ایک چھوٹی چیونٹی تھی۔

قَالَتْ نَمْلَةٌ ایک چیونٹی نے کہا۔ شعبی نے کہا (وہ چیونٹی پردار تھی) اس کے دو بازو تھے، بعض نے کہا وہ لنگڑی تھی، ضحاک نے اس کا نام طاحیہ اور مقاتل نے حذمی بتلایا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوا مَسَاكِنَكُمْ اے چیونٹیو اپنے اپنے بلوں میں گھس جاؤ۔ اُدْخُلُوا جمع مذکر حاضر کا صیغہ ہے ضابطہ نحوی کے لحاظ سے اُدْخُلْنَ بصیغہ جمع مونث حاضر ہونا چاہئے جمع مذکر کا خطابی صیغہ استعمال کرنے کی وجہ یہ ہے کہ انسان جب کلام کرتا ہے اور حیوانات کے متعلق بات کرتا ہے تو حیوانات کے بے عقل ہونے کی وجہ سے ان کے لئے وہ ضمیریں استعمال کرتا ہے جو جمادات کے لئے مستعمل ہیں عورتوں کے لئے بھی ان کے ضعیف العقل ہونے کی وجہ سے جمادات کی ضمیریں استعمال کرلی جاتی ہیں گویا ان کو بھی بے عقل مان کر جمادات کے ساتھ شامل کر دیا جاتا ہے لیکن حیوانات جب دوسرے حیوانوں سے کلام کرتے ہیں تو وہ اپنی نظر میں اپنے کو ذی عقل سمجھتے ہیں اور دوسرے کو اہل عقل کی طرح خطاب کرتے ہیں۔ اس جگہ اللہ نے وہ کلام نقل کیا ہے جو ایک چیونٹی نے دوسری چیونٹیوں کو اہل عقل قرار دے کر کیا تھا اس لئے وہ صیغہ اختیار کیا جس کے مخاطب اہل عقل ہوتے ہیں۔

لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمَانُ وَجُنُودُهُ تم کو سلیمان اور ان کی فوجیں کہیں پیس نہ ڈالیں۔ اس کلام میں (بظاہر) پیس ڈالنے کی ممانعت ہے (لیکن ایک چیونٹی حضرت سلیمان اور ان کی فوج کو پیسنے کی ممانعت کیسے کر سکتی تھی پھر چیونٹی کا روئے خطاب تو دوسری چیونٹیوں کی طرف تھا، حضرت سلیمان اور ان کی فوج کی جانب نہیں تھا) لیکن فی الحقیقت چیونٹیوں کو باہر نکلنے اور باہر رہنے کی ممانعت ہے تاکہ پامال ہونے سے بچ جاؤ جیسے عرب کہتے ہیں لَا أَرَاكَ هٰهُنَا میں تجھے یہاں نہ دیکھوں یعنی یہاں نہ ٹھہرنا (یا پھر نہ آنا)

وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ⑱ ایسی حالت میں کہ ان کو پتہ بھی نہ ہو۔ کیونکہ اگر ان کو معلوم ہوگا تو وہ خود ہی تم کو

نہیں روندیں گے۔ گویا یہ حضرت سلیمان اور آپ کے ساتھیوں کی طرف سے ممکن الوقوع فعل کی معذرت کا اظہار ہے اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دانستہ یہ قصور تو ان سے سرزد نہ ہوگا۔

افسوس شیعہ فرقہ کو چیونٹی کی برابر بھی سمجھ نہیں کہ وہ صحابہ کرام کی جانب سے قصداً اہل بیت کو ایذاء پہنچانے کے قائل ہیں۔

ایک شبہ

حضرت سلیمان کا تخت تو ہوا پر رواں تھا پھر پیس ڈالنے کا احتمال ہی کیا تھا۔

ازالہ

ممکن ہے حضرت سلیمان کی کچھ پیادہ اور سوار فوج زمین پر چل رہی ہو جس کی طرف سے چیونٹی کو اندیشہ ہوا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ واقعہ تسخیر ہوا سے پہلے کا ہو اس وقت حضرت سلیمان اور آپ کا لشکر زمین پر ہی چل رہا ہو۔ بعض اہل عرفان نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ چیونٹی نے دوسری چیونٹیوں سے کہا ایسا نہ ہو کہ تم حضرت سلیمان کے لشکر اور ان کے ساز و سامان اور شان شوکت کی سیر کرنے میں اتنی مشغول ہو جاؤ کہ اللہ کے ذکر سے بھی غافل ہو اور ذکر خدا سے غفلت تمہاری ہلاکت کا ذریعہ ہو جائے۔ یہ بات سلیمان نے تین میل سے سن پائی۔ کذا قال مقاتل۔ کیونکہ جہاں کہیں جو مخلوق بات کرتی تھی ہوا وہ بات حضرت سلیمان کے گوش گزار کر دیتی تھی۔

فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا پس سلیمان مسکراتے ہوئے ہنس پڑے۔ یہاں کچھ کلام محذوف ہے اور اسی پر عطف ہے پورا کلام اس طرح تھا سلیمان نے چیونٹی کی بات سن لی اس کا مطلب سمجھ لیا مطلب سمجھ کر خوش ہوئے اور اس بات سے بھی ان کو مسرت ہوئی کہ چیونٹی نے آپ کو اور آپ کی فوج کو عادل سمجھا یہ تمام باتیں سمجھ کر آپ خوش ہوئے اور مسکرا دیئے۔ یا یوں کہا جائے کہ آپ کو چیونٹی کی دانش مندی اور احتیاط سے تعجب ہوا اور اس بات پر بھی اچنبھا ہوا کہ ایک حقیقی چیونٹی اپنی اور اپنی قوم کے بچاؤ کے راستے کیسے جانتی ہے ان باتوں پر آپ کو تعجب ہوا اور آپ مسکرا دیئے۔

ضَاحِكًا یعنی حضرت سلیمان کا تبسم ضحک کی حد تک پہنچ گیا (گویا ہنس دیئے) زجاج نے کہا انبیاء کی ہنسی اکثر بصورت تبسم ہی ہوتی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شروع میں مسکرائے ہوں پھر ہنس دیئے ہوں۔ حضرت عائشہ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو کبھی بھرپور ہنستے نہیں دیکھا کہ آپ کے حلق کا کوا نظر آگیا ہو آپ صرف مسکرایا کرتے تھے۔ رواہ البخاری۔

حضرت عبداللہ بن حارث بن جزء کا بیان ہے میں نے رسول اللہ ﷺ سے زیادہ کسی کو مسکراتے نہیں دیکھا، رواہ الترمذی۔

مِّنْ قَوْلِهَا اس کے قول کے سبب سے۔ پس آپ نے لشکر کو روک دیا کہ چیونٹیاں اپنے بلوں میں گھس گئیں۔

وَقَالَ اور کہا یعنی اللہ کی نعمت کا شکر ادا کرتے ہوئے اور ادائے شکر سے بھی اپنے کو قاصر سمجھتے ہوئے اور ادائے شکر کے لئے اللہ ہی سے مدد طلب کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔

رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰى وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ اے میرے رب مجھے توفیق دے کہ میں تیری اس نعمت کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھے اور میرے والدین کو عطا فرمائی ہے اور نیک اعمال کروں جو تجھے پسند ہوں۔

اَوْزِعْنِیْ بعض علماء نے کہا کہ اس جگہ اس لفظ کا حقیقی معنی مراد ہے اِیْزَاع کا معنی ہے روک دینا، وقف کر دینا (قاموس) بیضاوی نے لکھا ہے اس کا معنی یہ ہے کہ میں تیری نعمت کے شکر کو اپنے پاس روکے رکھوں، ہمیشہ رہوں کہ مجھ سے چھوٹ نہ جانے پائے۔ بعض اہل تحقیق نے لکھا ہے اس کا معنی یہ ہے کہ اے میرے رب تو مجھے ایسا کر دے کہ میں کفر سے اپنے نفس کو روکے رکھوں۔ بعض نے کہا یہ مطلب ہے کہ اپنے سوا ہر چیز سے میرے نفس کو روک دے۔

عَلٰی وَالِدَیَّ ماں باپ پر۔ اللہ کا انعام اور ان کا صالح ہونا ماں باپ پر تو اللہ کا احسان ہے ہی لیکن یہ انعام حقیقت میں اولاد پر بھی انعام ہوتا ہے جو اولاد کے لئے موجب شکر ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے۔

اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ۔

وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ اور مجھے اپنی رحمت سے اپنے صالح بندوں (کے گروہ) میں شامل کر دے۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا صالح بندوں سے مراد ہیں حضرت ابراہیم حضرت اسماعیل حضرت اسحٰق حضرت یعقوب اور ان کے بعد والے انبیاء۔

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ اور پرندوں کو طلب کیا۔

یعنی پرندوں کے متعلق تفتیش کی اور ان کو طلب کیا۔ تَفَقُّدٌ کا معنی ہے گم شدہ چیز کا ڈھونڈنا۔ غرض پرندوں کی تفتیش کرنے کے بعد ہدہد کو غیر حاضر پایا۔ ہدہد کو تلاش کرنے کی وجہ یہ تھی کہ جب حضرت سلیمان کسی منزل پر اترتے تھے تو دھوپ سے بچانے کے لئے پرندے پورے لشکر پر سایہ کر لیتے تھے اور ہدہد اوپر چڑھ کر زمین کو دیکھتا تھا اور زمین کے اندر پانی کی تلاش کرتا تھا اور پانی کا دور یا قریب ہونا معلوم کرتا تھا کیونکہ اس کو زمین کے اندر کی چیزیں اسی طرح نظر آتی تھیں جیسے شیشہ کے اندر چیزیں دکھائی دیتی ہیں۔ پانی جہاں نظر آجاتا وہاں جا کر چونچ سے زمین کو کریدتا تھا پھر جنات پہنچ کر زمین کو کھود کر پانی بر آمد کر لیا کرتے تھے۔ کذا اخرج ابن ابی شیبۃ وعبد بن حمید وابن المنذر وابن ابی حاتم والحاکم۔ حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا جب حضرت ابن عباس نے یہ فرمایا تو نافع بن ازرق نے کہا اے بیان کرنے والے دیکھ کیا کہہ رہا ہے (سمجھ کے بات کر) ایک بچہ جب جال بچھا کر اس پر مٹی ڈال دیتا ہے (اور اس پر دانہ بکھیر دیتا ہے) تو ہدہد کو جال نظر نہیں آتا اور آکر پھنس جاتا ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا تیرا برا ہو جب تقدیری حکم ہو جاتا ہے تو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ دوسری روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں جب قضاء وقدر آجاتی ہے تو نظر جاتی رہتی ہے اور نابینا ہو جاتی ہے۔

غرض حضرت سلیمان ایک منزل پر اترے لوگوں نے پانی تلاش کیا کہیں نہیں ملا پانی کی ضرورت سخت تھی حضرت سلیمان نے ہدہد کو تلاش کرایا آپ کو خیال تھا کہ وہ حاضر ہوگا لیکن وہ نہیں ملا۔

فَقَالَ مَا لِيَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ ۖ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ ۝ پس کہا مجھے کیا ہو گیا ہے مجھے ہدہد دکھائی نہیں دیتا یا (واقعی) وہ غیر حاضر ہے۔ اس جملہ کا عطف تَفَقَّدَ الطَّيْرَ پر ہے یعنی سلیمان نے پرندوں کو سایہ فگن ہونے کا حکم دیا لیکن دھوپ آپ کے تخت پر دکھائی دی اور پرندوں کی طرف تفتیشی نظر سے دیکھا تو ہدہد کو نہ پایا اور فرمایا۔

یا یوں کہا جائے کہ سلیمان کے لئے تمام لشکر وغیرہ فوجیں پیچھے جمع کر دیئے گئے اور وہ ایک منزل پر اترے پانی کی ضرورت ہوئی اور پانی نہ ملا تو ہدہد کو بلوایا ہدہد نہ ملا تو فرمایا۔ مَا لِيَ میں استفہام تعجبی ہے۔

جب تلاش کے بعد بھی ہدہد نہیں ملا اور ظاہر ہو گیا کہ وہ غیر حاضر ہے تو اس بات سے اعراض کیا اور دریافت کیا کہ مجھے جو ہدہد دکھائی نہیں دے رہا ہے کیا واقعی وہ غائب ہے پھر جب ثابت ہو گیا کہ ہدہد غائب ہے تو فرمایا۔

لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا اَوْ لَاَاذْبَحَنَّهٗٓ اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝ میں اس کو سخت عذاب (کی سزا) دوں گا یا اس کو ذبح کر ڈالوں گا یا وہ (اپنی غیر حاضری کی) کوئی واضح وجہ پیش کرے گا۔

لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا یعنی میں اس کو سخت عذاب دوں گا تاکہ دوسرے ہدہدوں کو عبرت ہو۔ عذاب شدید دینے سے کیا مراد تھی اس کی تعیین کے متعلق علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ بعض نے کہا مراد یہ تھی کہ میں اس کے سارے پر و بال اور دم نوچ کر لو تھڑا بنا کر دھوپ میں ڈلوا دوں گا کہ کیڑے مکوڑے اور چیونٹیاں اس کو کھالیں۔ مقاتل نے کہا میں لو تھڑا بنا کر

تار کول ملوا کر دھوپ میں پھنکوا دوں گا۔ بعض نے کہا پنجرہ میں بند کر دینا مراد تھا۔ کسی نے کہا مادہ سے ہمیشہ کے لئے جدا کرنا مقصود تھا یا یہ مطلب تھا کہ میں اس کے مخالف کے ساتھ اس کو قید کر دوں گا۔ یا یہ معنی تھا کہ میں اس کو ساتھیوں کا خدمت گار بنا دوں گا کہ وہ اپنے ساتھ والوں کی خدمت کرتا رہے۔

حضرت سلیمان کے لئے (ہدہد کو) عذاب دینا جائز تھا۔

اَوْ لَيَأْتِيَنِّيْ میں اَوْ بمعنی اِلَّا کے بھی ہو سکتا ہے مگر یہ کہ وہ غیر حاضری کی کوئی کھلی ہوئی وجہ بیان کرے (تو سزا نہیں دوں گا) عرب کہتے ہیں لَاَلْزَمَنَّكَ اَوْ تُعْطِيَنِيْ حَقِّيْ میں تیرا پیچھا نہیں چھوڑوں گا مگر یہ کہ تو مجھے میرا حق ادا کر دے۔

فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ اس کے بعد سلیمان (زیادہ دیر نہیں ٹھہرے یا) تھوڑی دیر ہی ٹھہرے تھے۔

غَيْرَ بَعِيْدٍ یعنی لمبا توقف نہیں کیا تھا یا زیادہ مدت تک نہیں ٹھہرے تھے۔ مطلب یہ کہ حضرت سلیمان کے خوف سے ہدہد جلد واپس آگیا۔ ہدہد کی غیر حاضری کا سبب علماء نے یہ بیان کیا ہے کہ حضرت سلیمان بیت المقدس کی تعمیر سے فارغ ہو کر حرم (کعبہ) کو چلے گئے اور اللہ کی مشیت جتنی تھی اسی کے مطابق وہاں قیام پذیر رہے جب تک مکہ میں رہے روزانہ پانچ ہزار اونٹنیاں پانچ ہزار بیل اور بیس ہزار مینڈھے ذبح کرتے رہے آپ نے اپنی قوم کے سرداروں سے فرمایا کہ یہ وہ مقام ہے جہاں سے نبی عربی ﷺ جن کے اوصاف یہ یہ ہوں گے برآمد ہوں گے، ان کو مخالفین پر فتح یاب کیا جائے گا، ان کا رعب ایک ماہ کی مسافت تک پڑے گا، نزدیک اور دور ان کے لئے برابر ہوگا، اللہ کے معاملہ میں وہ کسی ملامت گر کی ملامت کی پرواہ نہیں کریں گے۔ حاضرین نے پوچھا اے اللہ کے نبی ان کا دین کیا ہوگا فرمایا دین توحید (دین حنیف یعنی دین ابراہیمی) پر چلیں گے خوشی ہو اس کے لئے جو ان کو پائے اور ان پر ایمان لائے۔ حاضرین نے دریافت کیا ان کی بعثت میں کتنی مدت باقی ہے۔ حضرت سلیمان نے فرمایا ایک ہزار سال۔ حاضرین کو چاہئے کہ وہ یہ بات ان لوگوں تک پہنچا دیں جو یہاں حاضر نہیں ہیں۔ بیشک وہ انبیاء کے سردار اور خاتم المرسلین ہوں گے۔

راوی کا بیان ہے حضرت سلیمان مکہ میں قیام پذیر رہے جب حج پورا کر لیا تو مکہ سے نکلے اور صبح کو مکہ سے روانہ ہو کر یمن کی طرف چل دیئے صنعاء میں زوال کے وقت پہنچ گئے یہ مسافت ایک ماہ کی راہ تھی، صنعاء کی زمین کو خوبصورت اور سرسبز پایا آپ نے وہاں اترنے کو پسند کیا تاکہ کھانے اور نماز سے فراغت حاصل کر لیں۔ ہدہد نے سوچا کہ سلیمان تو اترنے میں لگے ہوئے ہیں اتنے میں آسمان کی طرف اڑ کر زمین کی لمبائی چوڑائی دیکھ لوں چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور اوپر جا کر دائیں بائیں نظر دوڑائی تو بلقیس کا ایک باغ نظر آیا ہدہد سبزے کی طرف چل دیا اور باغ میں اتر گیا وہاں ایک اور ہدہد سے ملاقات ہو گئی ہدہد سلیمان اس کے پاس اتر کر پہنچ گیا۔ ہدہد سلیمان کا نام یعفور اور ہدہد یمن کا نام عنفیر تھا۔ عنفیر نے یعفور سے پوچھا کہاں سے آئے ہو اور کہاں کا ارادہ ہے۔ یعفور نے کہا میں اپنے مالک سلیمان بن داؤد کے ساتھ شام سے آیا ہوں عنفیر نے پوچھا سلیمان کون ہے؟ یعفور نے کہا وہ جن و انس اور شیطانوں و وحشی جانوروں پرندوں اور ہواؤں کے بادشاہ ہیں۔ (ان کا حکم سب پر چلتا ہے) تم کہاں کے رہنے والے ہو، عنفیر نے کہا اسی ملک کا باشندہ ہوں۔ یعفور نے پوچھا اس ملک کا بادشاہ کون ہے؟ عنفیر نے کہا یہاں کی بادشاہ ایک عورت ہے جس کو بلقیس کہا جاتا ہے بیشک تمہارے آقا کا ملک بڑا ہے لیکن بلقیس کا ملک بھی کم نہیں ہے وہ یمن کی ملکہ ہے اس کے زیر حکم بارہ ہزار جنرل ہیں اور ہر جنرل کے ماتحت ایک لاکھ جنگی سپاہی ہیں کیا تم میرے ساتھ چل کر اس کی حکومت دیکھنا چاہتے ہو؟ یعفور نے کہا مجھے یہ ڈر لگا ہوا ہے کہ نماز کے وقت سلیمان کو پانی کی ضرورت ہوگی اور مجھے تلاش کریں گے عنفیر نے کہا تمہارا مالک اس بات سے خوش ہوگا کہ تم اس کو اس ملکہ کی خبر بتاؤ گے۔ یعفور نے عنفیر کے ساتھ بلقیس کو اور اس کی حکومت کو دیکھا اور سلیمان کے پاس عصر کے وقت سے پہلے نہ پہنچ سکا ادھر جب سلیمان اترپڑے تو اس جگہ پانی نہ تھا نماز کا وقت آگیا اور پانی کی ضرورت ہوئی تو پانی نہیں ملا آپ نے جنات سے آدمیوں سے اور شیاطین سے پانی کے متعلق دریافت کیا لیکن کسی کو معلوم نہ تھا کہ پانی کہاں ہے پرندوں کی تلاش کی تو ہدہد کو غیر حاضر پایا پرندوں کے عریف (مانیٹر، سردار، ناظم) یعنی

گدھ کو طلب فرمایا اور ہدہد کے متعلق اس سے پوچھا گدھ نے کہا مجھے معلوم نہیں وہ کہاں ہے میں نے تو اس کو نہیں بھیجا نہیں ہے۔ اس وقت حضرت سلیمان کو غصہ آگیا اور فرمایا لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا اَوْ لَاَاذْبَحَنَّهٗٓ اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ پھر پرندوں کے سردار عقاب کو بلوایا۔ اور حکم دیا ابھی ہدہد کو پکڑ لاؤ عقاب فوراً اڑا اور آسمان کے نیچے ہوا کے ساتھ چسپاں ہو گیا وہاں سے اس کو یہ دنیا ایک پیالہ کی طرح نظر آئی پھر ادھر ادھر نظر دوڑائی تو یمن کی طرف سے ہدہد بھی آتا دکھائی دیا عقاب اس پر ٹوٹ پڑا ہدہد نے عقاب کو پر توڑ کر اپنی طرف آتا دیکھا تو سمجھ گیا کہ عقاب کا ارادہ میرے متعلق برا ہے ہدہد نے اس کو قسم دی اور کہا میں تجھے اس خدا کی قسم دیتا ہوں جس نے تجھے طاقت عطا کی ہے اور مجھ پر قدرت دی ہے تو مجھ پر رحم کر اور کوئی دکھ پہنچانے کے درپے نہ ہو عقاب ہدہد کی طرف سے پلٹ گیا کم بخت تو مرے اللہ کے پیغمبر نے قسم کھائی ہے کہ وہ تجھے عذاب دیں گے یا ذبح کر ڈالیں گے اس کے بعد دونوں نے حضرت سلیمان کی طرف رخ کر دیا جب لشکر تک پہنچے تو گدھ اور دوسرے پرندوں نے جا لیا اور کہا ارے آج تو دن بھر کہاں غائب رہا اللہ کے پیغمبر نے تیرے متعلق یہ یہ کہا تھا ہدہد نے کہا کیا انہوں نے (اپنی قسم میں) کوئی شرط بھی لگائی تھی پرندوں نے کہا ہاں یہ بھی فرمایا اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ۔ ہدہد نے کہا بس تو میں عذاب سے بچ گیا پھر عقاب اور ہدہد اڑ کر حضرت سلیمان کی خدمت میں پہنچے آپ اس وقت کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے عقاب نے کہا یا نبی اللہ میں اس کو لے آیا ہدہد نے سلیمان کو دیکھ کر اظہار عاجزی کے طور پر اپنا سر اٹھایا دم اور دونوں بازو نیچے کو لٹکا دیئے اور زمین پر ان کو کھینچنے لگا جب آپ کے قریب پہنچ گیا تو آپ نے اس کا سر پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور فرمایا تو کہاں تھا میں تجھے ضرور سخت عذاب دوں گا۔ ہدہد نے کہا یا نبی اللہ اس وقت کو یاد کیجئے جب آپ اللہ کے سامنے کھڑے ہوں گے۔ یہ بات سن کر حضرت سلیمان لرز گئے اور ہدہد کو معاف کر دیا۔ پھر غیر حاضری کی وجہ دریافت کی۔

فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ (کہ ہدہد آگیا) اور اس نے کہا میں ایسی بات پوری پوری معلوم کر کے آیا ہوں جو آپ کو معلوم نہیں۔

اِحاطہ کسی چیز کا ہمہ جہتی (پورا پورا) علم۔ اللہ کے سوا دوسروں کے علم کے لئے اس کا استعمال یا بطور مجاز ہوتا یا بطریق مبالغہ۔ مطلب یہ ہے کہ مجھے ایک بات تحقیقی طور پر معلوم ہوئی ہے جو آپ کے علم میں نہیں ہے۔ ایک ہدہد کا ایک جلیل القدر نبی سے اس طرح خطاب کرنا چاہتا ہے کہ ادنیٰ جانور کو بھی بعض وہ باتیں معلوم تھیں جو سلیمان کو بھی نہ تھیں اس میں تنبیہ ہے اس امر پر کہ سلیمان کو اپنے علم پر ناز نہ کرنا چاہئے بلکہ سمجھ لینا چاہئے کہ میرا علم بہت ہی ناقص ہے۔ اس سے شیعہ فرقہ کا اس عقیدہ کا غلط ہونا ثابت ہوتا ہے کہ امام سے کوئی بات چھپی نہیں رہتی اور اس کے زمانہ میں کوئی بھی اس سے زیادہ اور بڑھ کر عالم نہیں ہوتا۔

وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۭ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ ۝ اور میں آپ کے پاس سبا کی ایک تحقیقی خبر لایا ہوں۔

سبا یمن کے ایک شہر کا نام ہے۔ جس کا صنعاء سے فاصلہ تین برید ہے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے سبا کے متعلق دریافت کیا گیا آپ نے فرمایا سبا ایک آدمی تھا جس کے دس بیٹے تھے جن میں سے چھ دائیں سمت کو چلے گئے اور چار بائیں رخ کو یعنی چھ نے دائیں طرف جا کر آبادی کر لی یہ ملک یمن ہو گیا اور چار نے بائیں جانب جا کر آباد ہو گئے یہ آبادی شام کے نام سے موسوم ہوئی۔

بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ تحقیقی خبر۔ حضرت سلیمان نے واقعہ دریافت کیا تو ہدہد نے کہا۔

اِنِّيْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ میں نے ایک ایسی عورت پائی جو سبا والوں پر حکمرانی کرتی ہے (یعنی ان کی ملکہ ہے)

ملکہ سبا کا نام بلقیس بنت شراحیل تھا وہ یعرب بن قحطان کی نسل سے تھی اس کا باپ بہت بڑا بادشاہ تھا جس کے ۳۹ آباؤ اجداد بادشاہ ہو گزرے تھے وہ خود چالیسواں تھا ملک یمن پر حکومت کرتا تھا اور سرحدی ہمسر نہ بادشاہوں میں سے کسی کو اپنا

ہمسر نہیں جانتا تھا اسی لئے اس نے ہر بادشاہ کی بیٹی سے نکاح کرنے سے انکار کر دیا تھا آخر اس کا نکاح (خاندان جنات میں) ایک پری سے ہو گیا جس کا نام ریحانہ بنت سکن تھا اس پری کے پیٹ سے بلقیس بنت شراحیل پیدا ہوئی۔ سوائے بلقیس کے شراحیل کا کوئی اور بچہ نہیں ہوا۔ حدیث میں آیا ہے کہ بلقیس کے ماں باپ میں سے کوئی ایک جنات میں سے تھا (مترجم کو یہ حدیث نہیں ملی۔ یا حدیث سے مراد ہے قصہ یعنی بلقیس کے قصہ میں یہ بات آئی ہے کہ بلقیس کے ماں باپ میں سے کوئی ایک تو قوم جن تھا۔ واللہ اعلم)

باپ کے مرنے کے بعد بلقیس نے ملکہ بننے کی خواہش کی اور اپنی حکومت کا اعلان کر دیا قوم میں سے کچھ لوگوں نے مان لیا اور کچھ نے مخالفت کی، مخالفین نے ایک اور شخص کو اپنا بادشاہ بنالیا، قوم دو فرقوں میں بٹ گئی، یمن کی مملکت کے بھی دو ٹکڑے ہو گئے، جس مرد کو بادشاہ بنایا گیا تھا اس نے لوگوں سے بہت برا سلوک کیا۔ رعیت کی عورتوں پر دست درازی کرنے لگا لوگوں نے اس کو معزول کرنا چاہا لیکن اس کی طاقت زیادہ تھی کچھ بس نہ چلا۔ بلقیس نے جب عورتوں کی یہ بے حرمتی دیکھی تو اس کو غیرت آئی اور اس نے اس ظالم بادشاہ کے پاس لو خود تحریر بھیجی اور خواہش کی کہ تم مجھ سے نکاح کر لو (تاکہ دونوں حکومتیں ایک ہو جائیں اور قومی نفاق مٹ جائے) بادشاہ نے جواب لکھا۔ مجھے تمہاری طرف سے امید نہ تھی کہ تم میرے پیام نکاح کو قبول کر لو گی اسی لئے میں نے اپنی طرف سے نکاح کی تحریک نہیں کی۔ بلقیس نے کہا مجھے کوئی عذر نہیں تم میرے کفو اور شریف ہو اب میری قوم والوں کو جمع کر کے ان کے سامنے مجھ سے نکاح کرنے کی درخواست رکھو۔ بادشاہ نے سب لوگوں کو جمع کیا اور سب کو نکاح کا پیام دیا، لوگوں نے کہا ہمارے خیال میں تو بلقیس راضی نہیں ہو گی بادشاہ نے کہا ابتدائی تحریک خود اس کی طرف سے ہو چکی ہے میں آپ لوگوں سے یہ چاہتا ہوں کہ اس کی زبان سے تم خود اس کا اقرار سن لو، قوم والوں نے آکر بلقیس سے اس کا ذکر کیا بلقیس نے کہا ہاں مجھے اولاد کی تمنا ہے غرض لوگوں نے بلقیس کا نکاح بادشاہ سے کر دیا بلقیس جب وداع ہو کر گئی تو اپنی بہت سی فوج کو (جلوس) لیتی گئی اور بادشاہ کے پاس پہنچی تو اس کو اتنی شراب پلائی کہ وہ بے ہوش ہو گیا پھر اس کا سر کاٹ کر رات ہی کو اپنے گھر واپس آ گئی صبح ہوئی اور لوگوں نے بادشاہ کو مقتول اور سر دروازہ پر لٹکا ہوا پایا تو سمجھ لیا کہ یہ نکاح ایک فریب و مکر تھا اس کے بعد سب لوگوں نے بالاتفاق بلقیس کو ملکہ مان لیا۔

حضرت ابوبکرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو جب اطلاع ملی کہ فارس والوں نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنی ملکہ بنالیا ہے تو فرمایا وہ قوم ہرگز کامیاب نہیں ہو گی جس نے ایک عورت کو اپنے امر کا والی (یعنی اپنی ملکہ) بنالیا ہو۔ رواہ البخاری فی الصحیح واحمد والترمذی والنسائی۔

وَأُوتِيَتْ مِن كُلِّ شَيْءٍ اور اس کو ہر چیز دی گئی ہے یعنی اسلحہ، سازو سامان وغیرہ جس کی بادشاہوں کو ضرورت ہوتی ہے وہ سب کچھ اس کے پاس ہے۔ یا کُلِّ شَيْءٍ سے مراد محض کثرت ہے (یعنی لشکر کی عددی کثرت ملک کی وسعت مال کی فراوانی وغیرہ)

وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيمٌ ﴿۲۳﴾ اور اس کا تخت عظیم ہے۔

یعنی حجم میں بڑا سونے کا بنا ہوا یاقوت سرخ، زبرجد سبز اور موتیوں سے مرصع، جس کے پائے یاقوت و زمرد کے تھے۔ اس کے اوپر سات کمرے تھے اور ہر کمرہ کا دروازہ علیحدہ تھا جو بند رہتا تھا۔ ابن ابی حاتم نے زہیر بن محمد کے حوالہ سے بیان کیا کہ وہ تخت سونے کا تھا جس کے دونوں پہلو یاقوت و زبرجد سے مرصع تھے، اس کا طول ۸۰ ہاتھ اور عرض ۴۰ ہاتھ تھا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا بلقیس کا تخت تیس ہاتھ لمبا تیس ہاتھ چوڑا تھا۔

مقاتل نے کہا طول اسی ہاتھ تھا اور اونچائی ستر ہاتھ۔

وَجَدتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُونَ لِلشَّمْسِ مِن دُونِ اللَّهِ میں نے ملکہ اور اس کی قوم کو اللہ کو چھوڑ کر سورج کو سجدے کرتے پایا۔ مِن دُونِ اللَّهِ کا تعلق يَسْجُدُونَ سے ہے۔

وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ اور شیطانوں نے ان کے اعمال ان کی نظروں میں پسندیدہ بنا دیئے ہیں۔ یعنی آفتاب پرستی جیسے برے اعمال کو ان کے لئے مرغوب خاطر کر دیا ہے۔

فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ ۝ پس شیطان نے ان کو سیدھے راستے سے روک دیا ہے اس لئے وہ سیدھے راستے پر نہیں چلتے۔

اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کہ اللہ کو سجدہ نہیں کرتے جو (ایسا قادر ہے کہ) آسمانوں کی اور زمین کی پوشیدہ چیزوں کو برآمد کرتا ہے۔

اَلَّا يَسْجُدُوْا۔ اَلَّا اصل میں اَنْ لَا تھا۔ اَنْ مصدریہ لَا نافیہ حرف جر اَنْ سے پہلے محذوف ہے یعنی لِاَنْ لَا يَسْجُدُوْا۔ مطلب یہ ہے کہ شیطان نے ان کو راہ حق سے روک دیا ہے کہ وہ اللہ کو سجدہ نہیں کرتے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لا زائد ہو اور اس کا تعلق لَا يَهْتَدُوْنَ سے ہو یعنی وہ اللہ کو سجدہ کرنے کی راہ نہیں پاتے۔ خَبْأ بمعنی مَخْبُوْء (اسم مفعول) کے معنی میں ہے یعنی پوشیدہ اور اخراج سے مراد ہے اظہار۔

اکثر اہل تفسیر کہتے ہیں کہ خَبْءُ السَّمٰوٰتِ بارش اور خَبْءُ الْاَرْضِ سبزہ ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ آسمان و زمین کی چھپی ہوئی چیزوں کا علم مراد ہے لفظ خبء اور اخراج عام ہے ستاروں کو نکالنا بارش برسانا زمین سے سبزہ اگانا ہر چیز کو پردہ قوت سے میدان فعلیت میں لانا ہر ممکن اور معدوم کو جوب وجود کا جامہ پہنانا سب کچھ اخراج خباء کے ذیل میں آتا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسا کرنے والا قادر صرف اللہ ہے جو واجب بالذات ہے لہٰذا صرف وہی سجود کا مستحق ہے۔

وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ۝ اور وہ جانتا ہے ان باتوں کو جو تم (دلوں میں) چھپاتے ہو اور ان باتوں کو جن کو تم ظاہر کرتے ہو اس لئے ضروری ہے کہ تم ظاہر باطن میں اس کے ساتھ شرک کرنے سے پرہیز رکھو۔

اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۝ وہی اللہ ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہی عرش عظیم کا مالک ہے۔

قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ سلیمان نے کہا ہم دیکھیں گے (غور کر کے معلوم کریں گے) کہ تو نے سچ کہا یا تو جھوٹوں میں سے ہے، یعنی جھوٹ کہا۔ جب کوئی شخص جھوٹوں میں شامل کر دیا جائے اور اس کا شمار جھوٹوں میں ہو جائے تو اس کا جھوٹا ہونا یقینی ہے۔ آیت میں جھوٹ کہنے کو مبالغہ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے یا آیات کے فواصل کا لحاظ کر کے طرز ادا کو بدل دیا۔

اس کے بعد ہد ہد نے لوگوں کو پانی کا پتہ بتایا اور لوگوں نے گڑھے کھود کر پانی خود بھی پیا اور جانوروں کو بھی پلایا۔ حضرت سلیمان نے ایک خط اس طرح لکھا۔ بندہ خدا سلیمان بن داؤد کی طرف سے بلقیس ملکہ سبا کے نام بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سلام ہو اس پر جو ہدایت پر چلے۔ اما بعد مجھ پر تفوق نہ کرو اور میرے پاس اطاعت گزار ہو کر آجاؤ۔ ابن جریج نے کہا حضرت سلیمان نے صرف اتنے ہی الفاظ لکھے جتنے اللہ نے اپنی کتاب میں نقل کئے ہیں۔ قتادہ نے کہا انبیاء کی تحریریں ایسی ہی مختصر ہوتی ہیں وہ کلام کو طول نہیں دیتے نہ زیادہ بات لکھتے ہیں۔ خط لکھ کر حضرت سلیمان نے اس پر مشک چھپاں کیا اور اس پر اپنی مہر لگا کر ہد ہد کے حوالہ کیا اور فرمایا۔

اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ ۝

میرے اس خط کو لے جا کر ان لوگوں کے پاس ڈال کر الگ ہو جانا پھر دیکھتے رہنا وہ لوگ باہم کیا گفتگو کرتے ہیں۔

حسب الحکم ہد ہد خط لے کر بلقیس کے پاس پہنچا، بلقیس اس وقت صنعاء سے تین منزل پر مقام مأرب میں تھی، ہد ہد ملکہ کے قصر میں پہنچا تو دروازے سب مقفل پائے اور کنجیاں ملکہ نے اپنے سرہانے رکھ لی تھیں، غرض ہد ہد (کسی طرح) بلقیس کے قریب پہنچ گیا۔ بلقیس چت لیٹی سو رہی تھی ہد ہد نے خط اس کے سینہ پر رکھ دیا۔ کذا اخرج عبد بن حمید و ابن المنذر و ابن ابی حاتم

عن قتادہ۔
مقاتل کا بیان ہے کہ ہدہد اپنی چونچ میں خط پکڑ کر لے گیا اور بلقیس کے سرہانے جا کھڑا ہوا بادی گارڈ، سردار اور سپاہی موجود تھے، ہدہد نے پر پھڑ پھڑائے لوگ اس کو دیکھتے رہے آخر ملکہ نے خود سر اٹھایا ہدہد نے فوراً خط ملکہ کی گود میں ڈال دیا۔
وہب بن منبہ اور ابن زید کا بیان ہے کہ سورج کے رخ پر ایک روشن دان تھا اور سورج سامنے سے نکلتا تھا جونہی ملکہ روشن دان (یا دریچہ) سے اس کی طرف دیکھتی اور سورج نظر آتا فوراً اس کو سجدہ کرتی تھی ہدہد اس دریچہ میں گھس گیا اور دونوں بازو پھیلا کر روشندان کو بند کر دیا سورج حسب معمول اونچا ہوا لیکن روشن دان بند ہونے کی وجہ سے ملکہ کو پتہ نہ چلا جب دیر ہو گئی تو اٹھ کر سورج کو دیکھنے گئی ہدہد نے فوراً خط اس کی طرف پھینک دیا، بلقیس پڑھی ہوئی تھی خط لے کر مہر دیکھی مہر دیکھتے ہی لرز گئی کیونکہ سلیمان کی حکومت (کا نقشہ) مہر میں موجود تھا سمجھ گئی کہ جس نے یہ خط بھیجا ہے وہ مجھ سے بڑا بادشاہ ہے ہدہد خط پھینک کر کچھ پیچھے ہٹ گیا بلقیس نے خط پڑھا پھر جا کر تخت پر بیٹھی اور اپنی قوم کے سرداروں کو جمع کیا یہ سردار بارہ ہزار تھے ہر سردار کے ماتحت ایک لاکھ سپاہی تھے۔ حضرت ابن عباس کا قول ایک روایت میں آیا ہے کہ بلقیس کے ساتھ ایک لاکھ اقیال تھے اور ہر قیل کے پاس ایک لاکھ فوج تھی قیل یعنی نواب یا بادشاہ جو شہنشاہ کے ماتحت ہوتا ہے۔ قتادہ اور مقاتل نے کہا بلقیس کی مشورہ کمیٹی ۳۱۳ آدمیوں کی تھی ہر ممبر شوریٰ کے ماتحت دس دس ہزار سپاہی تھے سب آ کر اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے تو

قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا بلقیس نے ان سے کہا اے سردارو۔

اِنِّيْۤ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ (اے اہل دربار) میرے پاس ایک معزز خط ڈالا گیا ہے۔ عطاء اور ضحاک نے اس خط کو کریم (معزز) کہنے کی یہ وجہ بیان کی کہ وہ سر بمہر تھا۔ طبرانی نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا خط کا معزز ہونا اس کی مہر کی وجہ سے ہے۔
ابن مردویہ نے اس آیت میں لفظ کریم کی تفسیر میں کہا مختوم (سربمہر) ابن جریج نے کہا کریم یعنی عمدہ، اچھا۔ زجاج نے بھی اسی ترجمہ کو پسند کیا ہے۔ حضرت ابن عباس کا قول ایک روایت میں آیا ہے کریم یعنی بزرگ کیونکہ اس کا بھیجنے والا بھی بزرگ تھا۔ بعض نے کریم کہنے کی یہ وجہ بیان کی کہ خط پہنچنے کا واقعہ عجیب تھا، بلقیس اپنے کمرہ کے اندر لیٹی ہوئی تھی دروازے سب مقفل تھے ہدہد روشن دان سے آ کر بلقیس کے سینہ پر خط ڈال گیا اور بلقیس کو پتہ بھی نہ چلا۔ بعض نے کہا خط کی بسم اللہ الرحمن الرحیم سے ابتدا کی گئی تھی اس لئے اس کو کریم کہا۔
اس کے بعد بلقیس نے بتایا کہ یہ خط کہاں سے آیا اور کہا۔

اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ بلاشبہ یہ (خط یا عنوان) سلیمان کے پاس سے آیا ہے۔

وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۳۰﴾ اور وہ (مکتوب یا مضمون یہ ہے) بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۱﴾ مجھ پر غرور نہ کرو اور اطاعت گزار ہو کر میرے پاس آؤ، مطلب یہ کہ میرے حکم کا انکار نہ کرو، حکم سے انکار تکبر و غرور کی علامت ہے۔ یہ کلام انتہائی مختصر ہونے کے باوجود مقصد پر پوری پوری دلالت کر رہا ہے۔ اول بسم اللہ ہے جو اللہ کی ذات و صفات پر صریحی دلالت کر رہی ہے اور التزاماً بھی پھر تکبر کی ممانعت ہے تکبر تمام بری خصلتوں کو جنم دینے والا ہے، پھر ایمان و اطاعت کا حکم ہے جو تمام فضائل کو جامع ہے۔ اس کلام میں پہلے اپنی رسالت کو ثابت کیا ہے، پھر اطاعت کا حکم دیا ہے۔ دلیل رسالت بیان کئے بغیر اطاعت کا حکم نہیں دیا ورنہ یہ تقلید محض کی استدعا ہوتی، خط کو اس طرح سے پہنچانا خود رسالت کی بڑی دلیل ہے۔

قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْۤ اَمْرِيْ ۚ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ﴿۳۲﴾
(بلقیس نے) کہا اے سردارو! مجھے میرے معاملہ میں مشورہ دو جب تک کہ تم میرے پاس موجود نہ ہو میں کسی بات کا

قطعی فیصلہ نہیں کرتی۔
فُتیا اور فتویٰ کسی مشکل بات کا جواب یعنی جو معاملہ میرے سامنے ہے اس میں مجھے مشورہ دو۔
حَتّٰی تَشْهَدُوْنِ یہاں تک کہ تم میرے پاس موجود نہ ہو اور مجھے مشورہ نہ دو یا جب تک اس بات کے درست ہونے کی شہادت نہ دیدو۔

قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِیْدٍ ۙ۬ وَّالْاَمْرُ اِلَیْكِ فَانْظُرِیْ مَاذَا تَاْمُرِیْنَ ۝

وہ کہنے لگے ہم بڑے طاقتور اور بڑے لڑنے والے ہیں (آئندہ) اختیار آپ کے ہاتھ میں ہے آپ خود ہی غور کر لیں (اور) جو حکم آپ دیں (ہم اس کی تعمیل کریں گے)
قُوَّۃ یعنی لڑنے کی قوت۔ بَأْس شَدِیْد یعنی لڑائی کے وقت سخت طاقتور۔ مقاتل نے کہا قوت سے مراد ہے تعداد کی کثرت اور بأس سے مراد ہے شدت شجاعت۔
بلقیس نے اہل دربار سے صلح یا جنگ دونوں کا مشورہ لیا تھا لڑائی صلح کے مقابلہ میں مشکل اور سخت کام ہے جنگ کی صورت میں اہل دربار نے تعمیل حکم کا اقرار کیا۔ بر خلاف ان یہودیوں کے جنہوں نے حضرت موسیٰ سے کہا تھا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ تم اور تمہارا اللہ اور دونوں جا کر لڑو ہم تو یہیں بیٹھے ہیں یعنی ہم تو آگے نہیں جائیں گے۔ جب بلقیس کے حکم پر انہوں نے لڑنے کا اظہار کر دیا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ صلح کا اگر حکم ہوا تو ہم اس کی تعمیل بدرجۂ اولیٰ کریں گے آپ کو دونوں باتوں کا اختیار ہے۔
مَاذَا تَاْمُرِیْنَ میں ما استفہامیہ ہے اور پورا جملہ بتاویل مفرد ہو کر انظری کا مفعول ہے یعنی آپ خود دیکھ لیں اور سوچ لیں کہ دونوں میں کون سی چیز آپ کے لئے مفید ہے جنگ یا صلح، بہر حال ہم آپ کے فیصلہ پر چلنے کے لئے تیار ہیں۔

قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْیَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْۤا اَعِزَّةَ اَهْلِهَاۤ اَذِلَّةً ۚ وَ كَذٰلِكَ یَفْعَلُوْنَ ۝

ملکہ نے کہا بادشاہ جب کسی بستی میں جبراً داخل ہوتے ہیں تو اس کو تباہ کر دیتے ہیں اور وہاں کے معزز باشندوں کو ذلیل کر دیتے ہیں (یعنی ان کا مال لوٹتے ہیں گھروں کو اجاڑتے ہیں تاکہ ان کا رعب اور اقتدار قائم ہو جائے) اور یہ لوگ بھی (اگر غالب آگئے تو) ایسا ہی کریں گے۔
ملکہ نے عام بادشاہوں کا عمومی ضابطہ بیان کر کے اول قوم کو مبہم طور پر جنگ سے ڈرایا پھر آخری فقرہ کہہ کے صراحت کر دی کہ ان لوگوں سے بھی مجھے یہی خطرہ ہے۔ کَذٰلِكَ یَفْعَلُوْنَ کا ایک ترجمہ یہ بھی کیا گیا ہے کہ بادشاہ ایسا ہی کرتے رہتے ہیں ان کا دستور یہی ہے اس ترجمہ پر اس فقرہ کا ارتباط سابق جملہ سے ہوگا اور یَفْعَلُوْنَ کی ضمیر ملوک کی طرف راجع ہوگی، حضرت سلیمان اور آپ کے لشکر کی طرف راجع نہ ہوگی۔
یا یہ مقولہ اللہ کا ہے اللہ نے بلقیس کے قول کی تصدیق فرما دی کہ ہاں بادشاہوں کا یہی طریقۂ عمل ہے۔ ملکہ کے اس کلام سے معلوم ہو رہا ہے کہ بلقیس صلح کو مناسب خیال کرتی تھی۔

وَاِنِّیْ مُرْسِلَةٌ اِلَیْهِمْ بِهَدِیَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ یَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ۝ اور میں ان کو ایک

ہدیہ بھیجوں گی پھر دیکھوں گی کہ قاصد کیا جواب لے کر آتا ہے۔
مطلب یہ ہے کہ میں اپنے پاس سے کچھ تحفہ دے کر قاصدوں کو روانہ کروں گی۔ ہدیہ وہ چیز جو ہدیہ میں دی جائے جیسے عطیہ دی ہوئی چیز۔
بغوی نے لکھا ہے بلقیس ہدیہ بھیج کر حضرت سلیمان کی جانچ کرنی چاہتی تھی کہ بادشاہ ہیں یا نبی اگر بادشاہ ہوں گے تو ہدیہ قبول کر لیں گے اور لشکر کشی نہیں کریں گے اور نبی ہوں گے تو ہدیہ کو رد کر دیں گے اور بغیر اتباع ایمانی کے راضی نہیں ہوں گے۔

اس کے بعد ہدیہ میں ملکہ نے کچھ غلام اور کچھ باندیاں بھیجیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا سب کو ایک ہی طرح کا لباس پہنا دیا تا کہ (لڑکے اور لڑکی کی) شناخت نہ ہو سکے۔ مجاہد نے کہا دو سو غلام اور دو سو باندیاں بھیجی تھیں۔ مجاہد اور مقاتل کا قول ہے کہ باندیوں کو غلاموں کا لباس اور غلاموں کو باندیوں کا لباس پہنا دیا تھا۔ سعید بن جبیر نے کہا (سونے کی) اینٹ ریشم اور دیبا کے ساتھ بھیجی تھی۔ بعض نے کہا سونے کی چار اینٹیں بھیجی تھیں۔ وہب بن منبہ نے بیان کیا بلقیس نے پانچسو لڑکے اور لڑکیاں بھیجیں لڑکیوں کو قبائیں اور کمر کے پٹکے یعنی لڑکوں کا لباس پہنایا اور غلاموں کو باندیوں کے کپڑے پہنائے۔ کلائیوں میں سنہری کنگن، گلے میں سونے کے طوق، کانوں میں بالیاں اور بالے جواہر سے مرصع پہنائے۔ لڑکیوں کو پانچسو گھوڑوں پر اور لڑکیوں کو پانچسو خچروں پر سوار کر لیا ہر گھوڑے کی لگام سنہری جواہر سے جڑی تھی اور چار جامے رنگارنگ کے دیبا کے۔ بلقیس نے چاندی کی پانچ سو اینٹیں اور سوتی اور یاقوت سے جڑا ہوا تاج بھی بھیجا اور مشک و عنبر و عود بھی پھر ایک ڈبہ میں بلا سوراخ کیا ہوا ایک قیمتی موتی اور ٹیڑھا کیا ہوا ایک پوتھ رکھ کر بند کر دیا اور اپنی قوم کے ایک سردار کو جس کا نام منذر بن عمرو تھا بلوا کر کچھ دوسرے سمجھدار ہوشیار آدمیوں کو اس کے ساتھ کر کے ایک خط جس میں تحفوں کی فہرست تھی دے کر ہدایت کی اور سب چیزیں دے کر بھیج دیا اور نمائندہ سے کہہ دیا کہ سلیمان سے جا کر یہ کہنا کہ اگر آپ نبی ہیں تو باندیوں کو غلاموں سے الگ چھانٹ دیجئے اور بغیر کھولے بتائیے کہ ڈبہ میں کیا ہے (اور جب وہ بتا دیں تو کہنا کہ اس موتی میں ٹھیک سوراخ کر دیجئے اور سوراخ دار پوتھ میں دھاگہ ڈال دیجئے لیکن کسی آدمی یا جن سے اس میں مدد نہ لیجئے غلاموں اور باندیوں کو یہ بھی حکم دیا کہ غلام باندیوں کی بولی میں زنانہ لوچ دار بات کریں اور باندیاں کرخت لہجے میں مردانہ بات کریں، پھر قاصد سے یہ بھی کہہ دیا کہ تم اس بات کا اندازہ کرنا کہ وہ کس طور پر پیش آتے ہیں اگر غصہ کی نظر سے تم کو دیکھیں تو سمجھ لینا وہ بادشاہ ہیں تم ہرگز خوف زدہ نہ ہونا ہم ان سے زیادہ عزت رکھتے ہیں اور اگر کشادہ پیشانی اور مہربانی سے پیش آئیں تو سمجھ لینا وہ نبی مرسل ہیں ان کی بات سمجھنا اور (ادب کے ساتھ) جواب دینا۔ غرض بلقیس کے قاصد سارے تحفے لے کر روانہ ہو گئے ادھر ہدہد نے جلد جا کر حضرت سلیمان کو اس واقعہ کی اطلاع دے دی آپ نے جنات کو حکم دیا کہ سونے چاندی کی اینٹیں تیار کریں حکم کی تعمیل کی گئی، پھر آپ نے حکم دیا کہ ان اینٹوں کو اس جگہ سے نو فرسخ تک ایک میدان میں یہ اینٹیں بچھا دیں اور میدان کے گرداگرد سونے چاندی کی اونچی دیوار کھینچ دیں، پھر فرمایا خشکی اور دریا میں کون سا جانور سب سے اچھا ہوتا ہے، حاضرین نے عرض کیا یا نبی اللہ ہم نے فلاں سمندر میں کچھ جانور دیکھے ہیں جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں ان کے دو بازو، گردن پر کلغیاں اور پیشانیوں پر بال ہوتے ہیں، فرمایا ابھی لے آؤ جنات نے فوراً لا کر حاضر کر دیئے فرمایا میدان کے دائیں بائیں دونوں طرف سونے چاندی کی اینٹوں کے فرش پر ان کو باندھ دو اور ان کا چارہ ان کے سامنے ڈال دو جنات کو حکم دیا اپنی اولاد کو لا کر میدان کے دائیں بائیں کھڑا کر دو۔

ان احکام کی تعمیل کے بعد حضرت سلیمان اپنے تخت پر رونق افروز ہو گئے اور اپنے دائیں بائیں جانب چار ہزار کرسیاں بچھوا دیں اور دائیں بائیں فرسخوں تک صف بستہ کھڑے ہونے کا شیطانوں کو حکم دیا جب قاصد قریب پہنچ گئے اور سلیمان کی حکومت دیکھی اور ایسے چوپائے جو کبھی نہیں دیکھے تھے اور ان کو چاندی سونے کی اینٹوں پر گوبر کرتے پایا تو خود وہ اپنی نظروں میں حقیر ہو گئے اور جو تحفے ساتھ لائے تھے سب پھینک دیئے۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ حضرت سلیمان نے سونے چاندی کی اینٹیں بچھانے کا حکم جس وقت دیا تھا اس وقت بلقیس کی بھیجی ہوئی اینٹوں کی گنتی کے مطابق جگہ خالی چھوڑ دی تھی قاصدوں نے جب کچھ اینٹوں کی جگہ خالی دیکھی اور باقی زمین پر فرش پایا تو ان کو اندیشہ ہوا کہ کہیں کوئی ہم پر اینٹیں اٹھا لینے کی تہمت نہ لگائے اس لئے خالی جگہ پر اینٹیں پھینک دیں۔ پھر شیاطین کو دیکھ کر تو خوف زدہ ہو گئے ان سے کہا گیا آگے بڑھو ڈر کی کوئی بات نہیں قاصد تمام جن و انس اور پرندوں، درندوں اور چرندوں کی ٹکڑیوں سے گزر کر حضرت سلیمان کے سامنے جا کھڑے ہوئے آپ نے ان کی طرف کشادہ روئی کے ساتھ اچھی نظروں سے دیکھا اور فرمایا کیا بات ہے؟ امیر وفد نے ساتھ لائی ہوئی چیزیں پیش کر دیں اور ملکہ کا خط بھی دے دیا آپ نے خط غور سے پڑھا اور

فرمایا ڈبہ کہاں ہے امیر وفد نے پیش کر دیا آپ نے ڈبہ کو ہلایا اتنے میں جبرئیل آ گئے اور ڈبہ کے اندر جو چیز تھی وہ بتا دی۔ حضرت سلیمان نے فرمایا اس کے اندر بغیر سوراخ کا ایک قیمتی موتی ہے اور ایک ٹیڑھا سوراخ کیا ہوا مہرہ ہے۔ قاصد نے عرض کیا آپ نے صحیح فرمایا اب موتی میں سوراخ کر دیجئے اور مہرہ میں دھاگہ پرو دیجئے۔ حضرت سلیمان نے جنات اور آدمیوں سے دریافت فرمایا کوئی اس میں سوراخ کر سکتا ہے کسی کو سوراخ کرنے کی تدبیر معلوم نہ تھی اس لئے خاموش رہے پھر آپ نے شیاطین سے دریافت کیا ایک شیطان نے کہا لکڑی کے کیڑے کو بلوائیے حسب الحکم لکڑی کا کیڑا آیا اور دھاگہ منہ میں پکڑ کر موتی میں سوراخ کرتا ہوا دوسری جانب نکل آیا حضرت سلیمان نے فرمایا تو کیا انعام چاہتا ہے کیڑے نے عرض کیا میری روزی درخت (لکڑی) میں مقرر کر دی جائے حضرت نے فرمایا تیرے لئے ایسا ہی کر دیا گیا۔ پھر آپ نے لڑکوں اور لڑکیوں کو الگ الگ چھانٹ دیا جس کی تدبیر یہ کی کہ سب کو ہاتھ منہ دھونے کا حکم دیا۔ لڑکی برتن میں سے پانی ایک ہاتھ میں لیتی پھر ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں ڈالتی پھر منہ پر مارتی تھی اور لڑکا براہ راست برتن سے پانی لے کر منہ پر مارتا تھا۔ لڑکی ہاتھ کے اندرونی جانب پانی ڈالتی تھی اور لڑکا کلائی کے بیرونی جانب پانی بہاتا تھا لڑکی یوں ہی پانی دھارتی تھی اور لڑکا اوپر سے نیچے کو ہاتھ پر پانی گراتا تھا۔ خلاصہ یہ کہ آپ نے سب کو الگ الگ چھانٹ دیا پھر لائے ہوئے ہدیے واپس کر دیئے جیسا کہ آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔ یہ تمام تفصیل بغوی نے بیان کی ہے جو مختلف روایات سے ماخوذ ہے بعض باتیں ابن ابی حاتم نے سدی کی روایت سے اور بعض باتیں ابن ابی حاتم اور ابن المنذر دونوں نے یزید بن رومان کی روایت سے بیان کی ہیں۔

فَلَمَّا جَآءَ سُلَيْمٰنَ پھر جب وہ (قاصد یا تحفہ) سلیمان کے پاس پہنچ گیا۔

قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ تو انہوں نے کہا کیا تم لوگ (یعنی تم اور تمہارے ساتھی یا تم اور بلقیس) حقیر (دنیوی) مال سے میری مدد کر رہے ہو۔ استفہام انکاری ہے یعنی مجھے تمہاری طرف سے مالی امداد کی ضرورت نہیں تمہارا ہدیہ مجھے درکار نہیں اس کی میرے لئے کوئی وقعت نہیں کیونکہ۔

فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ اللہ نے جو کچھ عطا فرما دیا ہے (یعنی دین، نبوت، حکمت، حکومت) وہ اس سے افضل و بہتر ہے جو تم کو دیا ہے (میں اس ہدیہ کے لین دین سے خوش نہیں ہوتا) بلکہ تم ہی اپنے ہدیہ سے خوش ہوتے ہو۔

کیونکہ تم لوگ صرف ظاہری دنیوی زندگی کو جانتے ہو یہی تمہاری نظروں کے سامنے ہے اس لئے ہدیے لے کر مال میں اضافہ کرنا چاہتے ہو اور ہدیے دے کر اپنے ہمسروں پر فخر کرنا چاہتے ہو تم میری حالت کو اپنی حالت پر قیاس کرتے ہو حالانکہ یہ بات غلط ہے۔ پھر منذر بن عمرو سردار وفد کی طرف رخ کر کے فرمایا۔

اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَآ اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ تم ان کے (یعنی بلقیس اور قوم کے) پاس لوٹ کر جاؤ ہم ایسے لشکر لے کر ان پر جا پہنچیں گے جن کے مقابلہ کی ان میں طاقت نہیں اور ان کو اس (سرزمین) سے بے عزت کر کے نکال دیں گے اور وہ ذلیل ہوں گے۔ صٰغِرُوْنَ کے لفظ سے اَذِلَّةً (بے عزت) ہونے کی تاکید ہو رہی ہے بعض علماء نے کہا ذلت عزت کی ضد ہے آبرو اور حکومت کا زوال ذلت ہے اور صغار سے مراد ہے قیدی ہو جانا یعنی اگر وہ مسلمان ہو کر نہیں آئیں گے تو ہم ان کو ان کی سرزمین سے نکال دیں گے (اور ان کو قیدی بنا لیا جائے گا)

وہب بن منبہ وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ جب وفد یمن حضرت سلیمان کے پاس سے لوٹ کر بلقیس کے پاس پہنچا (اور واقعہ بیان کیا) تو بلقیس نے کہا واللہ میں تو پہلے ہی پہچان چکی کہ وہ بادشاہ نہیں ہے اور اس کے مقابلہ کی ہم میں سکت نہیں۔ اس کے بعد بلقیس نے حضرت سلیمان کے پاس پیام بھیجا میں خود اپنی قوم کے سرداروں کے ساتھ آپ کے پاس آ رہی ہوں اور دیکھوں گی کہ جس دین کی طرف آپ ہم کو بلا رہے ہیں وہ کیا ہے۔ پھر بلقیس نے حکم دے کر اپنے تخت کو تہ بہ تہ سات کمروں میں بند

کرا کے دروازوں کو مقفل کر دیا سات محلوں کے اندر اس کو رکھوا دیا اور حفاظت کے لئے کچھ نگراں مقرر کر دیئے اور اپنے نائب سے کہا تم یہاں کے حالات کے نگراں رہنا میرے تخت تک کوئی پہنچنے نہ پائے اور کوئی اس کو خراب نہ کر سکے۔ پھر اعلانچی کو یہ اعلان کرنے کا حکم دے دیا کہ تمام ممالک محروسہ کے باشندوں کو معلوم ہو جانا چاہئے کہ ہم کوچ کر رہے ہیں اس کے بعد یمن کے بارہ ہزار نوابوں کو لے کر روانہ ہو گئی ہر نواب کے ماتحت ہزاروں سپاہی تھے۔

حضرت ابن عباس کا قول ہے کہ حضرت سلیمان بڑے باوقار اور رعب داب کے آدمی تھے اگر کسی سے کچھ دریافت کرتے تھے تو (اس کی مجال نہ ہوتی کہ خود اپنی طرف سے جواب دے سکے بلکہ) وہ حضرت پر ہی آپ کے سوال کا جواب محول کر دیتا (اور کہہ دیتا کہ اللہ کے نبی کو ہی اس کا بخوبی علم ہے) ایک روز اپنے تخت حکومت پر باہر نکل کر تشریف فرما تھے کہ ایک غبار قریب ہی اڑتا نظر آیا اور دریافت فرمایا یہ کیا ہے، حاضرین نے عرض کیا بلقیس اس جگہ آکر اتری ہے۔ یہ مقام حضرت سلیمان کی مجلس سے ایک فرسخ کے فاصلہ پر تھا حضرت سلیمان نے یہ بات سن کر اپنے لشکر والوں کی طرف متوجہ ہو کر۔

قَالَ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ۝

کہا اے سردارو تم میں سے کون اس کا تخت میرے پاس لے آئے گا قبل اس کے کہ وہ لوگ مسلمان ہو کر میرے پاس پہنچیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام بلقیس کو اللہ کی قدرت اور اس کا عطا کردہ معجزہ دکھانا چاہتے تھے بلقیس کی عقل کی آزمائش بھی مقصود تھی کہ (مرصع کاری کو) بدلنے کے بعد وہ اپنے تخت کو پہچان سکے گی یا نہیں۔

مسلمان ہو کر آنے سے پہلے کی (حسب صوابدید مفسرؒ) شرط اس لئے لگائی کہ مسلمان ہونے کے بعد تو بلقیس کی رضا مندی کے بغیر اس کا تخت لینا حضرت سلیمان کے لئے حلال نہ تھا (اس فقیر مترجم کی نظر میں یہ توجیہ نامناسب ہے اس سے معصوم پیغمبر پر الزام عائد ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان بلقیس کے تخت پر بھر چلے اور بہانے سے قبضہ کرنا چاہتے تھے حالانکہ حضرت سلیمان کو اللہ نے سونے چاندی اور جواہر کے انبار عطا فرما دیئے تھے آپ کو کسی طرح کسی غیر مسلم کے مال کا لالچ نہیں ہو سکتا۔ واللہ اعلم)

عفریت کا ترجمہ ضحاک نے کیا خبیث۔ فراء نے کہا سخت طاقتور۔ ابن قتیبہ نے کہا وہ جس کی تخلیقی ساخت مضبوط ہو اس کو عفریت کہتے ہیں۔ اصل میں یہ لفظ عفر سے بنا ہے اور عفر مٹی کو کہتے ہیں عافرہ اس سے کشتی لڑ کر اس کو مٹی پر گرا دیا۔ بہرحال

قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ

ایک خبیث دیو نے کہا میں آپ کے اس مقام سے اٹھنے سے پہلے ہی وہ تخت آپ کے پاس لا سکتا ہوں۔ مقام سے مراد ہے اجلاس فیصلہ مقدمات کی مجلس۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا سلیمان ہر صبح کو اجلاس کرتے تھے جو دوپہر تک جاری رہتا تھا۔

اس دیو کا نام وہب نے کوزی، بعض لوگوں نے ذکوان اور بعض نے صخر جنی کہا ہے۔ یہ دیو ایک پہاڑی کی طرح تھا بقدر حد نگاہ اس کا ایک قدم پڑتا تھا۔

وَاِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ۝

اور یقیناً میں اس کو لانے پر طاقت رکھتا ہوں (اور) امانت دار ہوں۔

یعنی جن جواہر سے وہ مرصع ہے ان میں کمی نہیں کروں گا۔ حضرت سلیمان نے فرمایا میں اس سے زیادہ جلد منگوانا چاہتا ہوں۔

قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ

کہا اس نے جس کے پاس کتاب کا کچھ علم تھا۔ ابن ابی حاتم نے ابن لہیعہ کا قول نقل کیا ہے کہ وہ خضر تھے۔ بعض نے کہا جبرئیل (بصورت انسانی۔ مترجم) تھے کسی نے کہا کوئی اور فرشتہ تھا۔ اکثر مفسرین نے صراحت کی ہے کہ وہ آصف بن برخیا تھے جو صدیقیت کے مرتبہ پر فائز تھے ان کو اسم اعظم معلوم تھا جب اسم اعظم لے کر اللہ سے دعا کرتے تھے تو اللہ ان کی دعا قبول فرما لیتا تھا اور ان کا سوال پورا کر دیتا تھا۔ جریر اور مقاتل نے بوساطت ضحاک حضرت ابن عباس کی طرف اس بیان کی نسبت کی ہے کہ آصف نے نماز کے بعد حضرت سلیمان سے کہا جہاں تک آپ

کی نظر پہنچے اپنی آنکھیں اٹھا کر دیکھیے حضرت سلیمان نے نظر اٹھا کر یمن کی طرف دیکھا اور آصف نے دعا کی فوراً اللہ نے فرشتوں کو بھیج دیا فرشتوں نے تخت اٹھایا اور زمین کو اندر ہی اندر چیرتے ہوئے لا کر حضرت سلیمان کے سامنے رکھ دیا۔

کلبی نے کہا آصف نے سجدہ میں گر کر اللہ کا اسم اعظم پڑھ کر دعا کی فوراً بلقیس کا تخت زمین کے اندر ہی اندر چل دیا یہاں تک کہ حضرت سلیمان کی کرسی کے پاس برآمد ہو گیا۔ بعض اہل روایت کا کہنا ہے یہ مسافت دو مہینے کی راہ کے برابر تھی۔ آصف نے کیا دعا مانگی تھی، علماء کا اس کی تعیین میں اختلاف ہے۔ مجاہد نے کہا یَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِکْرَام کہا تھا یعنی یہ اسم اعظم ہے۔ کلبی نے کہا یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ (کہی اسم اعظم ہے) حضرت عائشہ کا بھی یہی قول ہے۔

زہری کا قول مروی ہے کہ جس کے پاس علم کتاب تھا اس نے اس طرح دعا کی تھی یَا اِلٰھَنَا وَاِلٰہَ کُلِّ شَیْءٍ اِلٰھًا وَاحِدًا لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ اِئْتِنِیْ بِعَرْشِھَا اے ہمارے معبود اور ہر چیز کے تنہا معبود تیرے سوا کوئی معبود نہیں میرے پاس اس کا تخت لے آ۔

اللہ کے اسم اعظم کی بحث ہم نے سورۂ آل عمران کے شروع میں تفصیل کے ساتھ لکھ دی ہے۔ میرے نزدیک زہری کا قول قابل ترجیح ہے۔

محمد بن منکدر نے کہا اَلَّذِیْ عِنْدَہٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ سے خود حضرت سلیمان کی ذات مراد ہے اللہ نے آپ کو علم و فہم عطا فرمایا تھا اس جگہ عِنْدَہٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ کہنا علم کی عظمت اور اس امر پر دلالت کر رہا ہے کہ سلیمان کو جو عزت و کرامت حاصل ہوئی تھی وہ علم ہی کے سبب سے تھی۔ رہا آئندہ آیت میں خطاب۔

اَنَا اٰتِیْکَ بِہٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْکَ طَرْفُکَ ۚ میں تیرے پلک جھپکنے سے پہلے اس کو تیرے پاس لے آؤں گا۔

تو یہ خطاب عفریت کو ہے اور اظہار معجزہ کی غرض سے ہے۔ عفریت نے تخت لانے کا جو وعدہ کیا تھا حضرت سلیمان نے اس مدت کو طویل سمجھا اور ایسے معجزہ کا اظہار کرنا چاہا جس سے بڑے بڑے دیو بھی عاجز تھے دوسروں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ اس صورت میں اَلْکِتٰبِ میں الف لام جنسی ہو گا اللہ کی بھیجی ہوئی ہر کتاب اس میں داخل ہو گی یا اس سے مراد لوح محفوظ ہو گی (اس وقت الف لام عہدی ہو گا)

طَرْفٌ کا معنی ہے دیکھنے کے لئے پلک ہلانا۔ دیکھنے والے کو کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک جانب کو اپنی پلکوں کی حرکت متوجہ کر دی اس لئے اس کے مقابل رَدُّ الطَّرْفِ آتا ہے یعنی پلکوں کی روانگی کو واپس لے لیا، مطلب یہ ہے کہ تم کسی چیز پر آنکھیں کھول کر نظر دوڑاؤ پھر دیکھ کر نظر کو واپس لے آؤ تو نظر کی اس واپسی سے پہلے ہی میں تخت کو لے آؤں گا یعنی انتہائی جلد۔

فَلَمَّا رَاٰہُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَہٗ قَالَ ھٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ ۖ لِیَبْلُوَنِیْٓ ءَاَشْکُرُ اَمْ اَکْفُرُ ؕ

اس کے بعد فوراً سلیمان نے تخت کو اپنے پاس رکھا دیکھا تو کہا یہ میرے رب کی ادنیٰ عنایت ہے وہ میری جانچ کر رہا ہے کہ میں اس کا شکر ادا کرتا ہوں یا ناشکری کرتا ہوں۔ اس کلام سے پہلے کچھ عبارت محذوف ہے (جس پر کلام کی رفتار دلالت کر رہی ہے) پوری عبارت اس طرح تھی "سلیمان نے اس کو تخت لانے کا حکم دیا انہوں نے اللہ کا اسم اعظم پڑھ کر دعا کی تخت میں حرکت پیدا ہوئی اور زمین کے اندر ہی اندر وہ آ کر سلیمان کے تخت کے پاس برآمد ہو گیا"۔ سلیمان نے جو اتنی جلدی اس کو اپنے پاس رکھا دیکھا تو کہا۔

قال یعنی شکر نعمت کے طور پر کہا۔ اللہ کے مخلص بندوں کا یہی طریقہ ہوتا ہے۔ ھٰذَا یعنی ساتھ منزل دور سے پلک جھپکتے ہی تخت منگوا لینے کی قدرت مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ یعنی میرے رب کی مہربانیوں کا کچھ حصہ ہے مِنْ تبعیضیہ ہے لِیَبْلُوَنِیْ یعنی اس کا یہ فضل مجھ پر میری جانچ کرنے کے لئے ہے۔ ءَاَشْکُرُ کہ کیا میں اس کی نعمت کا شکر کرتا ہوں اور محض اس کی مہربانی سمجھتا ہوں اپنی طاقت اور قوت کا نتیجہ نہیں قرار دیتا اور پھر اس عطیہ خداوندی کا حق ادا کرتا ہوں۔ اَمْ اَکْفُرُ یا

ناشکری کرتا ہوں کہ اپنے آپ کو اس کا مستحق قرار دیتا ہوں یا اس کا حق ادا کرنے میں قصور کرتا ہوں۔

وَمَنْ شَكَرَ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ رَبِّي غَنِيٌّ كَرِيمٌ ۝ اور جو شکر کرے گا وہ اپنے فائدے کیلئے شکر کرے گا اور جو ناشکری کرے گا تو میرا رب (اس کے شکر سے) بے نیاز ہے اور (بہر حال) کریم ہے۔

يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ شکر سے موجودہ نعمت کا بقاء اور مزید نعمت کا حصول ہوتا ہے۔ اَلشُّكْرُ قَيْدُ النِّعْمَةِ الْمَوْجُوْدَةِ وَصَيْدُ النِّعْمَةِ الْمَفْقُوْدَةِ شکر موجود نعمت کو روک رکھتا ہے اور غیر موجود نعمت کا شکار کرتا ہے (یعنی زیادت نعمت کا ذریعہ ہے) شکر کرنے سے صاحب نعمت کی ذمہ داری پوری ہو جاتی ہے وہ حق واجب ادا کر دیتا ہے اور اس کا درجہ عند اللہ اونچا ہو جاتا ہے اور آخرت میں ثواب کا استحقاق پیدا ہو جاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کھانے والا شکر ادا کرنے والا (یعنی کھا کر شکر ادا کرنے والا) صابر روزہ دار کی مثل ہے رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ والحاکم بسند صحیح عن ابی ہریرہ۔ امام احمد اور ابن ماجہ نے صحیح سند کے ساتھ حضرت سنان بن سنہ کی روایت سے یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے کھانے والے (پھر اس کا) شکر کرنے والے کیلئے اتنا ہی اجر ہے جیسے صابر روزہ دار کا۔

غَنِيٌّ یعنی اس کے شکر سے بے پرواہ ہے، کریم یعنی شاکر اور کافر سب کو دیتا ہے۔

قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ اَتَهْتَدِيْٓ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ لَا يَهْتَدُوْنَ ۝

سلیمان نے (بلقیس کی سمجھ کو جانچنے کے لئے) حکم دیا اس کے لئے اس کے تخت کی صورت بدل دو ہم دیکھیں کہ اس کو صحیح پتہ لگتا ہے یا اس کا شمار انہی لوگوں میں ہے جو (ایسی باتوں کا) پتہ نہیں لگا سکتے۔ نَكِّرُوْا یعنی تخت کو ایسا کر دو کہ وہ پہچان نہ سکے۔ (اس کو اپنا نہیں کوئی غیر تخت محسوس ہو، مترجم) روایت میں آیا ہے کہ حسب الحکم تخت کے نچلے حصہ کو بالائی اور بالائی حصہ کو نچلا کر دیا گیا اور سرخ جواہر کی جگہ سبز جواہر جڑ دیئے گئے اور سبز کی جگہ سرخ۔

اَتَهْتَدِيْ کیا وہ اپنے تخت کو شناخت کرنے کی راہ پالے گی (کسی طریقہ سے شناخت کر سکے گی) سلیمان نے ایسا کیوں کیا اس کے متعلق وہب بن منبہ اور کعب وغیرہ کا بیان ہے کہ شیاطین کو یہ اندیشہ تھا کہ سلیمان بلقیس سے عقد نہ کر لیں اگر ایسا کر لیا تو جنات کے سارے راز وہ سلیمان سے کہہ دے گی کیونکہ اس کی ماں پری تھی وہ جنات کی خفیہ باتوں سے واقف تھی پھر اگر کوئی اولاد ہو گئی تو سلیمان کے بعد اس کے زیر حکم رہنا پڑے گا اور یہ نسل سلیمان کی غلامی بھی دور نہ ہو گی اس لئے حضرت سلیمان کو نفرت دلانے کے لئے شیاطین نے حضرت سلیمان سے بلقیس کی مذمت کی اور کہا اس کی عقل میں کچھ کمزوری ہے اس کے دونوں قدم گدھے کے سم کی طرح ہیں اس کی پنڈلیوں پر بال ہیں اسی اطلاع کی بنیاد پر حضرت سلیمان نے تخت کی صورت بدل ڈالنے کا حکم دیا تاکہ بلقیس کی عقل کی جانچ ہو جائے اور پنڈلیاں دیکھنے کے لئے ایک شیشہ گھر بنانے کا حکم دیا۔

فَلَمَّا جَآءَتْ قِيْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ ۖ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ ۚ پھر جب وہ آ گئی تو اس سے کہا گیا کیا آپ کا تخت بھی ایسا ہی ہے ملکہ نے کہا ایسا معلوم ہوتا ہے بعینہ یہ وہی ہے۔

اَهٰكَذَا عَرْشُكِ۔ یہ اشتباہی لفظ بلقیس کی عقل کی آزمائش کے لئے کہا گیا۔ مقاتل کا بیان ہے کہ بلقیس نے اپنا تخت پہچان تو لیا تھا لیکن اشتباہی الفاظ میں اس نے جواب اس لئے دیا کہ اس سے مشتبہ الفاظ میں ہی سوال کیا گیا تھا۔ بعض نے کہا واقعی وہ پوری یقینی شناخت نہیں کر پائی تھی اس لئے نہ کھل کر اقرار کیا نہ انکار حضرت سلیمان اس طرز کلام سے اس کی دانشمندی کو پہچان گئے پھر اس سے کہا گیا واقعی یہ تخت آپ ہی کا ہے لیکن آپ نے دیکھا کہ سات دروازوں میں مقفل ہونے اور چوکیداروں کی حفاظت کرنے سے یہ محفوظ نہ رہ سکا۔ اس پر بلقیس نے جواب دیا۔

وَاُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِيْنَ ۝ اور ہم کو تو اس نشانی سے پہلے ہی (اللہ کی قدرت اور سلیمان کی نبوت کی صداقت کا) علم ہو چکا تھا۔ یعنی دوسری نشانیوں سے ہم نے آپ کی نبوت کو جان لیا تھا۔ ہدہد کا خط لانا اور ہمارے تحفوں کو واپس کر دینا اور قاصدوں کے ذریعہ سے پیام بھیجنا۔ بعض علماء نے کہا کہ وَاُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِيْنَ

حضرت سلیمان اور آپ کے ساتھیوں کا کلام ہے یعنی ہم تو اللہ کی قدرت اور ہر حکم خدا کی صحت کو اس واقعہ سے پہلے ہی جانتے ہیں اور ہم اس کے بھیجے ہوئے دین پر قائم ہیں اور برابر اس کے اطاعت گزار اور فرمانبردار ہیں۔ اس وقت اس کلام کی غرض ہوگی محض اللہ کی نعمتوں کا ذکر اور ان کے شکر کا اظہار۔ بعض اہل علم نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ ہم کو بلقیس کے ایمان لانے اور آنے سے پہلے اطاعت گزار ہو جانے کا علم ہو چکا تھا اور ہم اللہ کے فرماں بردار ہیں۔

وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ۝

اور سلیمان نے اس کو ان معبودوں کی عبادت سے منع کر دیا جن کو اللہ کے سوا وہ پوجتی تھی بلاشبہ کافر قوم میں سے تھی یعنی سورج کی پوجا سے سلیمان نے اس کو منع کر دیا۔ بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ صَدَّ کا فاعل مَا كَانَتْ تَعْبُدُ ہے یعنی اللہ کے سوا جن معبودوں کو وہ پوجتی تھی انہوں نے اس کو توحید سے روک دیا تھا، عقل کی کمزوری یا خرابی نے اس کو توحید سے نہیں روکا تھا اس لئے جن کا یہ کہنا غلط تھا کہ اس کی سمجھ میں فتور ہے۔

جملہ اِنَّهَا كَانَتْ مستانفہ ہے یعنی بلقیس ایسی قوم میں سے ہے جو آفتاب کی پجاری تھی اسی آفتاب پرست قوم میں وہ پلی بڑھی تھی اس لئے سورج کی پوجا کے سوا وہ کسی اور کی عبادت سے واقف نہیں تھی۔ اس کے بعد حضرت سلیمان نے چاہا کہ بلقیس کے قدموں اور پنڈلیوں کی حالت کا انکشاف کسی تدبیر سے خود ہو جائے، انکشاف کی درخواست نہ کرنی پڑے، اس لئے آپ نے شیطانوں کو حکم دیا کہ ایک شیش محل یا شیشہ گھر تیار کریں جو سفیدی میں پانی معلوم ہو، بعض نے کہا شیشہ کا صحن خانہ تیار کرنے کا حکم دیا جس کے نیچے پانی ہی پانی رکھا اور پانی میں مینڈکیاں اور طرح طرح کی مچھلیاں چھوڑ دیں، پھر اس صحن کے شہ نشین میں اپنا تخت بچھوایا اور اس پر رونق افروز ہوگئے۔ پرندے جنات اور انسان آپ کے اوگرد جمع ہوگئے۔ بعض کا خیال ہے شیشہ کا ایک صحن تیار کرایا تھا جس کے نیچے مچھلیوں اور مینڈکیوں کی مورتیں رکھی تھیں، دیکھنے والا اس کو پانی ہی سمجھتا تھا۔ غرض اس کے بعد بلقیس کو بلوایا۔

قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ ۚ اس سے کہا گیا صحن میں داخل ہو جاؤ۔

فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً (وہ دروازہ کے اندر آگئی اور آکر) جب صحن کو دیکھا تو اس کو پانی کا کنڈ (یا تالاب یا حوض) سمجھی۔

وَّكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ۭ اور اپنی پنڈلیوں سے کپڑا ہٹالیا تاکہ میں داخل ہو جاؤں۔ ابن ابی شیبہ ابن المنذر عبد بن حمید اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس کے نقل کردہ ایک طویل بیان میں کہا ہے کہ بلقیس کے آنے سے پہلے حضرت سلیمان نے ایک قصر بنوایا جس کا صحن سفید آبگینہ کار کھا اور اس کے نیچے پانی چھوڑ دیا پانی کے نیچے آبی جانور بھی چھوڑ دیئے اور اپنے تخت کو اس صحن کے شہ نشین پر بچھوایا اور تخت پر تشریف فرما ہوگئے۔ جب بلقیس آئی اور اس نے صحن کو دیکھا تو رکا ہوا پانی خیال کیا اور پنڈلیوں سے کپڑا اٹھا دیا تاکہ پانی میں گھس کر سلیمان کے پاس پہنچ جائے۔ سلیمان نے اس کی طرف دیکھا تو پنڈلیاں اور قدم بہت ہی خوبصورت دکھائی دیئے البتہ پنڈلیوں پر بال تھے سلیمان نے دیکھ کر نظر پھیرلی۔

علماء نے اسی جگہ سے یہ مطلب اخذ کیا ہے کہ اگر اجنبی عورت کو نکاح کا پیام دینا ہو تو اس کو دیکھ لینا جائز ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا تم میں سے جب کوئی کسی عورت کو نکاح کا پیام دے اور وہ حصہ بدن (چہرہ وغیرہ) دیکھنا ممکن ہو جس کو دیکھ کر نکاح کر سکے تو ایسا کرلے۔ رواہ ابو داؤد عن جابر ورویٰ احمد والترمذی والنسائی وابن ماجہ والدارمی عن مغیرہ بن شعبہ حضرت مغیرہ کا بیان ہے میں نے ایک عورت کو نکاح کا پیام بھجوایا رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا کیا تم نے اس کو دیکھ لیا ہے میں نے کہا نہیں فرمایا تو اس کو دیکھ لو تم دونوں کے آپس میں محبت پیدا کرنے کے لئے یہ بات مناسب ہے۔

قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ ڛ کہنے والے نے کہا یہ آبگینہ کا بنا ہوا چکنا صحن ہے (پانی نہیں ہے)۔

مُمَرَّدٌ چکنا امرد بھی اسی سے بنا ہے (وہ لڑکا جس کی داڑھی ابھی نہ نکلی ہو)

قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَیْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۴۴﴾ ع ۱۸

کہنے لگی اے میرے رب میں نے اپنی جان پر ظلم کیا اور (اب میں نے سورج کی پوجا وغیرہ سے توبہ کی اور) سلیمان کے ساتھ اللہ رب العالمین کی توحید خلوص کے ساتھ ایمان لائی (یا خالص طور پر اللہ رب العالمین کی فرمانبردار ہو گئی)

آیت کی تفسیر میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب بلقیس صحن پر پہنچی اور اس کو کنڈ سمجھی تو خیال کیا کہ سلیمان مجھے غرق کرنا چاہتے ہیں اس سے تو قتل ہونا آسان ہے، پھر جب حقیقت ظاہر ہو گئی تو کہنے لگی میں نے سلیمان پر بدگمانی کر کے اپنے اوپر ظلم کیا اب میں نے توبہ کی اور اسلام لے آئی۔

مسلمان ہونے کے بعد بلقیس کے احوال کو علماء نے مختلف طور پر بیان کیا ہے۔ عون بن عبداللہ نے بیان کیا ایک شخص نے عبداللہ بن عتبہ سے دریافت کیا، کیا حضرت سلیمان نے بلقیس سے نکاح کر لیا تھا۔ ابن عتبہ نے کہا بلقیس کا واقعہ تو اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَیْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ پر ختم ہو گیا۔ یعنی ہم کو اس سے زیادہ علم نہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے نکاح کر لیا تھا ابن عساکر نے عکرمہ کا یہی قول نقل کیا ہے۔ عکرمہ کا بیان ہے جب سلیمان نے بلقیس سے نکاح کرنا چاہا تو پنڈلیوں پر بالوں کی کثرت پسند نہ آئی لوگوں سے بال صاف کرنے کی تدبیر دریافت کی لوگوں نے اس کی تدبیر استرہ بتائی۔ بلقیس نے کہا میری جلد کو لوہا بھی نہیں چھو سکتا۔ حضرت سلیمان نے بھی استرہ کو پسند نہیں کیا اور فرمایا استرہ تو کاٹ دیتا ہے پھر آپ نے جنات سے دریافت کیا۔ انہوں نے بھی لاعلمی ظاہر کی پھر آپ نے شیطانوں سے پوچھا انہوں نے کہا ہم آپ کے لئے ایسی تدبیر کریں گے کہ جلد سفید چاندی کی طرح ہو جائے گی چنانچہ انہوں نے نورہ اور حمام کی ترکیب بتائی۔ (نورہ بال صفا چونہ) اسی زمانہ میں حماموں کا اور چونہ کا رواج ہو گیا۔ حضرت سلیمان نے جب بلقیس سے نکاح کر لیا تو آپ کو بلقیس سے بڑی محبت ہو گئی اور یمن کی سلطنت پر اس کو برقرار رکھا۔ اور حضرت سلیمان کے حکم سے جنات نے یمن میں تین قلعے اتنے اونچے بنائے کہ ایسے اونچے اور خوبصورت قلعے کسی نے نہ دیکھے ہوں گے ان کے نام تھے سلحون، سنون اور عمدان۔ جب حضرت سلیمان نے بلقیس کو ان کے ملک میں واپس کر دیا تو ہر مہینے ملاقات کے لئے ایک بار جایا کرتے تھے اور تین روز وہاں قیام پذیر رہتے تھے صبح کو شام سے یمن کو چل دیتے تھے اور پھر صبح کو ہی یمن سے شام کو روانہ ہو جاتے تھے۔ بلقیس کے بطن سے حضرت سلیمان کا ایک لڑکا بھی ہوا۔ وہب کا بیان ہے لوگوں کا خیال ہے کہ بلقیس جب مسلمان ہو گئی تو حضرت سلیمان نے فرمایا اپنی قوم میں سے کسی کا انتخاب کر لو میں تمہارا نکاح اس سے کر دوں گا۔ بلقیس نے کہا اے اللہ کے نبی مجھ جیسی عورت مردوں سے نکاح کرلے (ایسا نہیں ہو سکتا) آپ کو معلوم ہے کہ میری قوم میں بادشاہ بھی ہیں بڑے بڑے تسلط والے سردار بھی ہیں (لیکن میں نے کسی سے نکاح نہیں کیا) حضرت سلیمان نے فرمایا ہاں مجھے معلوم ہے لیکن اسلام میں ایسا کرنا ہی ہو گا یہ بات کسی طرح زیبا نہیں کہ اللہ نے جو چیز تمہارے لئے حلال کی ہے تم اس کو اپنے لئے حرام کر لو۔ بلقیس نے کہا جب ایسا کرنا ضروری ہی ہے تو میرا نکاح ذی تبع شاہ ہمدان سے کرا دیجئے، حضرت سلیمان نے ذی تبع سے بلقیس کا نکاح کرا دیا، پھر بلقیس کو یمن واپس کر دیا اور یمن کا ملک ذی تبع کے تسلط میں دے دیا، پھر یمن کے امیر جنات کو جس کا نام زوبعہ تھا بلوا کر ہدایت فرما دی کہ ذی تبع تم سے جو کام لیں وہ کام تم انجام دیا کرو، حسب الحکم زوبعہ عمل کرتا رہا اور ذی تبع حضرت سلیمان کی وفات تک یمن کا بادشاہ رہا۔ جب حضرت سلیمان کی وفات پر ایک سال گزر گیا اور جنات کو حضرت سلیمان کی وفات کا یقینی پتہ چل گیا تو ایک جن تہامہ میں آیا اور وسط یمن میں چیخ کر اس نے کہا اے گروہ جن شاہ سلیمان کی وفات ہو گئی اب تم (اپنی اپنی ڈیوٹیوں سے) ہاتھ اٹھا لو سب دست بردار ہو گئے اور ادھر ادھر چلے گئے اور حضرت سلیمان کی حکومت کے ختم ہوتے ہی ذی تبع اور بلقیس کی حکومت کا بھی زوال ہو گیا۔

میں کہتا ہوں حضرت سلیمان کا بلقیس کی پنڈلیوں کو دیکھنا اس روایت کی تائید کرتا ہے۔ جس میں حضرت سلیمان کا بلقیس سے نکاح کرنا مذکور ہے اور ذی تبع سے نکاح کرانے کی روایت اس کے مقابلہ میں کمزور ہو جاتی ہے۔

کہا گیا ہے کہ ۱۳ برس کی عمر میں حضرت سلیمان کو حکومت ملی تھی اور ۵۳ برس کی عمر پا کر آپ کی وفات ہوئی
سبحان اللہ من لا زوال لملکہ پاک ہے وہ خدا جس کی حکومت کو کبھی زوال نہیں۔

لاملک سلیمان ولا بلقیس لا آدم فی الکون ولا ابلیس
والکل قصورة وانت المعنی یامن ھوللقلوب مقناطیس

نہ سلیمان کی حکومت (کوئی حقیقت رکھتی) ہے نہ بلقیس نہ آدم اس کائنات میں وجود (حقیقی) رکھتے ہیں نہ ابلیس اے وہ
ذات جو دلوں کو اپنی طرف کھینچنے والی مقناطیس ہے تو ہی حقیقت ہے اور کل جہان صورت۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ کوئی شک نہیں کہ
ہم نے ثمود کے پاس ان کے بھائی صالح کو (یہ حکم دے کر) بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو یعنی صرف اللہ کی عبادت کرو۔
فَإِذَا هُمْ فَرِيقَانِ يَخْتَصِمُونَ ﴿۴۵﴾ سو اچانک ان کے دو فریق ہو گئے جو (دین کے معاملہ میں) باہم
جھگڑنے لگے یعنی ایک فریق کافروں کا دوسرا فریق مومنوں کا ہو گیا۔ سورۂ اعراف میں انہیں دو فریقوں کے متعلق فرمایا ہے۔
قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِن قَوْمِهِ لِلَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا سے إِن كُنتَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ تک۔
قَالَ يَا قَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُونَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ صالح نے کہا اے بھائیو تم نیک کام
(یعنی توبہ وایمان) سے پہلے برائی (یعنی عذاب) کو کیوں جلدی مانگتے ہو۔
السَّيِّئَةِ سے مراد ہے عذاب یعنی جلد عذاب آنے کے طلب گار ہوتے ہو۔ قوم ثمود نے کہا تھا یَا صَالِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا
إِن كُنتَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ اے صالح اگر تو پیغمبروں میں سے ہے تو وہ عذاب ہم پر لے آجس کی دھمکیاں تو ہم کو دے رہا ہے۔
الْحَسَنَةِ سے مراد ہے توبہ یعنی توبہ کو نزول عذاب کے وقت پر ٹال رہے ہو۔ استفہام انکاری یا زجری ہے۔ تم کو ایمان
کرنا چاہئے۔
لَوْلَا تَسْتَغْفِرُونَ اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿۴۶﴾ نزول عذاب سے پہلے کفر سے توبہ کر کے) اللہ سے
معافی کے طلب گار کیوں نہیں ہوتے کہ تم پر رحم کیا جائے (اور تمہاری توبہ کو قبول کر لیا جائے جب عذاب آنکھوں کے سامنے
آجائے گا تو پھر توبہ قبول نہ ہو گی)
قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَن مَّعَكَ کہنے لگے ہم تو تم کو اور تمہارے ساتھ والوں کو منحوس سمجھتے ہیں
یعنی تم کو اور تمہارے ساتھیوں کو ہم منحوس سمجھتے ہیں تم لوگ منحوس ہو کہ جب سے تم نے یہ نیا مذہب نکالا ہے ہمارے اندر
پھوٹ پڑ گئی ہم پر پیہم مصائب کا نزول ہونے لگا ہم بارش سے محروم ہو کر قحط میں مبتلا ہو گئے۔ یہ سارے دکھ اور تکلیفیں تمہارے
اور تمہارے ساتھیوں کی نحوست کی وجہ سے ہیں۔
قَالَ طَائِرُكُمْ عِندَ اللَّهِ صالح نے کہا تمہاری نحوست کا سبب اللہ کے علم میں ہے۔
طائر نحوست۔ مراد نحوست کا سبب جس کی وجہ سے یہ خرابیاں آئیں بس اللہ کا حکم ہے یا تمہاری بداعمالیاں ہیں جو اللہ
کے پاس لکھی ہوئی ہیں۔ قضاء وقدر سے زیادہ تیزی کے ساتھ پہنچنے والی کوئی چیز نہیں اسی سرعت نزول کی وجہ سے اس کو
طائر قرار دیا۔ لاشئی اسرع من قضاء محتوم قضاء قطعی سے زیادہ تیز کوئی چیز نہیں اور چونکہ انسانی اعمال آسمان کی طرف
بہت تیزی کے ساتھ چڑھتے ہیں اس لئے ان کو بھی طائر کہا جاتا ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا طَائِرُكُمْ عِندَ اللَّهِ کا یہ
مطلب ہے کہ تم پر یہ نحوست تمہارے کفر کے سبب اللہ کی طرف سے ہے۔
بعض اہل علم نے کہا نحوست کو طائر کہنے کی یہ وجہ ہے کہ سفر کے وقت پرندوں کے ایک خاص رفتار سے گزرنے اور
آواز نکالنے کو عرب بدشگون سمجھتے تھے اسی عقیدہ کی بناء پر لفظ طائر سے بطور استعارہ نحوست مراد لی جاتی تھی۔
بَلْ أَنتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُونَ ﴿۴۷﴾ بلکہ تم وہ لوگ ہو جو (اپنے کفر کی وجہ سے) عذاب میں مبتلا ہو گئے یہ کلام سابق

کے مفہوم سے اعراض ہے یعنی میری اور میرے ساتھیوں کی وجہ سے یہ مصائب تم پر نہیں ہیں بلکہ تمہارے کفر کی وجہ سے تم پر یہ عذاب آرہا ہے (یا عذاب آئے گا) حضرت ابن عباس نے (اس جگہ فتنہ کا معنی جانچ اور امتحان کیا ہے اور) فرمایا بلکہ بھلائی اور برائی (دکھ اور سکھ) دے کر تمہاری آزمائش کی جارہی ہے اسی مفہوم کو دوسری آیت میں اس طرح ادا کیا ہے۔ وَنَبْلُوكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ہم دکھ سکھ دے کر ان کی پختہ آزمائش کرتے ہیں۔

وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ اور (ثمود کے) شہر (یعنی حجر) میں نو آدمیوں کی ایک ٹولی تھی۔

رہط تین یا سات سے دس تک کی جماعت جیسے نفر تین سے نو تک کی جماعت کو کہتے ہیں۔

يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ۝ جو اس سرزمین میں فساد برپا کرتے اور اصلاح (حالات ذرا) نہیں کرتے تھے یعنی ان کا کام خالص تباہی مچانا اور تخریب کرنا تھا جس میں اصلاح اور درستی کا شائبہ بھی نہ تھا۔ یہ لوگ قوم صالح کے سرداروں کے لڑکے تھے، سب نے اونٹنی کو قتل کرنے پر اتفاق رائے کر لیا تھا، یہ سب سے بڑے خنڈے اور سنگدل تھے، ان سب میں قدار بن سالف شقی ترین شخص تھا۔

قَالُوا تَقَاسَمُوا بِاللَّهِ لَنُبَيِّتَنَّهُ وَأَهْلَهُ ثُمَّ لَنَقُولَنَّ لِوَلِيِّهِ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ أَهْلِهِ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ۝ انہوں نے کہا سب مل کر آپس میں قسمیں کھاؤ کہ ہم رات کے وقت حملہ کر کے صالح اور اس کے متعلقین کو قتل کر دیں گے، پھر ان کے وارث سے کہہ دیں گے کہ ہم ان کے متعلقین کے مارے جانے میں (یا مارے جانے کے مقام پر) موجود بھی نہ تھے اور ہم بالکل سچے ہیں۔

قَالُوا یعنی ایک نے دوسرے سے کہا تَقَاسَمُوا (صیغہ امر) باہم قسمیں کھاؤ۔ اس وقت یہ لفظ قَالُوا کا مقول (یعنی مفعول) ہوگا لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ ماضی کا صیغہ ہو گا اس وقت ترجمہ یوں ہوگا انہوں نے کہا اللہ کی قسمیں کھائیں لَنُبَيِّتَنَّهُ ہم صالح کو رات کے وقت ضرور قتل کر دیں گے۔ أَهْلَهُ اس کے آدمیوں کو یعنی جو لوگ اس پر ایمان لائے ہیں (اور ساتھی ہو گئے ہیں) ان کو بھی قتل کر دیں گے لِوَلِيِّهِ یعنی انتقام کا وارث، ولی دم۔ مَهْلِكَ أَهْلِهِ، مَهْلِك ہلاک سے ظرف زماں یا مکان ہے یا مصدر ہے ہلاک ہونے کے وقت یا مرنے کی جگہ یا ہلاک ہونے میں، مطلب یہ کہ ہم صرف صالح کے متعلقین کے ہلاک ہونے کے وقت وہاں موجود بھی نہ تھے بلکہ صالح کے اور اس کے ساتھیوں کے ہلاک ہونے کے مقام و وقت پر بھی موجود نہ تھے عرب کہتے ہیں۔ مَا رَأَيْتُ ثَمَّ رَجُلًا اس مجلس میں میں نے وہاں ایک آدمی کو نہیں دیکھا بلکہ دو کو نہیں دیکھا۔

وَمَكَرُوا مَكْرًا وَمَكَرْنَا مَكْرًا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ۝ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ أَنَّا دَمَّرْنَاهُمْ وَقَوْمَهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ اور (یہ مشورہ کر کے) انہوں نے ایک خفیہ داؤ کیا اور ایک پوشیدہ تدبیر ہم نے کی اور اس تدبیر کی ان کو خبر بھی نہ ہوئی سو دیکھ لو ان کے داؤ کا کیا انجام ہوا کہ ہم نے ان کو اور ان کی قوم کو سب کو (آسمانی عذاب بھیج کر) تباہ کر دیا۔

مَكَرُوا مَكْرًا یعنی انہوں نے غداری کی کہ شب خون مار کر صالح کو قتل کر ڈالنے کا باہم مشورہ طے کر لیا۔ وَمَكَرْنَا مَكْرًا یعنی ہم نے بھی ان کو ہلاک کرنے کا سبب اسی بات کو بنا دیا۔ كَيْفَ كَانَ میں استفہام تعجبی ہے۔ تعجب کے ساتھ ان کے انجام پر نظر کرو۔ أَنَّا دَمَّرْنَاهُمْ کہ ہم نے ان کو ہلاک کر دیا ان نو آدمیوں کو ہلاک کس طرح کیا گیا اس کے متعلق روایات میں اختلاف ہے حضرت ابن عباس نے فرمایا اللہ نے فرشتوں کو صالح کے مکان کی حفاظت کے لئے بھیج دیا جب ان نو آدمیوں نے تلواریں سونت کر صالح کے گھر پر چڑھائی کی تو فرشتوں نے ان پر پتھر برسائے پتھر تو ان کو دکھتے تھے اور پتھر مارنے والا کوئی نظر نہ آتا تھا آخر سب وہیں ڈھیر ہو گئے۔

مقاتل نے کہا ایک پہاڑ کے دامن میں اکٹھے ہونے کے لئے بیٹھے تاکہ سب مل کر صالح کے مکان پر پہنچیں لیکن اللہ نے وہ پہاڑی ان پر گرا دی اور سب مر گئے۔ عبدالرزاق عبد بن حمید ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے قتادہ کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ

نے ایک چٹان سے ان کو ہلاک کر دیا ایک چٹان نے ان کو آلیا۔

وَقَوْمَهُمْ اور انکی قوم والوں کو بھی اللہ نے ہلاک کر دیا ایک چیخ تھی آئی جس سے سب جہاں تہاں تھے وہیں مر کے رہ گئے۔

فَتِلْكَ بُيُوتُهُمْ خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوا ؕ　سو انکے ظلم (یعنی کفر اور برے کرتوت) کی وجہ سے یہ ان کے مکان کھنڈر پڑے ہیں یا خالی ویران پڑے ہیں۔ یا ڈھے پڑے ہیں۔ خوی البطن پیٹ خالی ہو گیا۔ خوی النجم ستارہ گر گیا۔

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝　بلاشبہ دانشمندوں کے لئے اس (واقعہ) میں (اللہ کی قدرت اور پیغمبروں کی صداقت کی) بڑی نشانی ہے (یعنی جو لوگ علم والے ہوں اور اس سے عبرت حاصل کریں ان کے لئے پیغمبروں کی سچائی کی کھلی ہوئی دلیل ہے)

وَأَنْجَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ۝　اور ہم نے ان لوگوں کو بچالیا جو ایمان لے آئے تھے اور (نافرمانی سے) بچتے تھے۔ یعنی کفر و معصیت سے پرہیز رکھتے تھے۔ ان سے مراد ہیں حضرت صالح اور آپ کے چار ہزار مومن ساتھی۔

وَلُوطًا إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ وَأَنْتُمْ تُبْصِرُونَ ۝　اور ہم نے لوط کو بھیجا جب کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا کیا تم بے حیائی کا کام کرتے ہو حالانکہ تم سمجھدار ہو۔

وَلُوطًا اس کا عطف وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ ثَمُودَ پر ہے یعنی ہم نے لوط کو بھیجا أُذْكُرْ محذوف ہے یعنی لوط کا واقعہ یاد کرو۔

الْفَاحِشَةَ انتہائی برا کام أَتَأْتُونَ میں استفہام انکاری اور زجری ہے۔

وَأَنْتُمْ تُبْصِرُونَ حالانکہ تم اس کی خرابی کو جانتے ہو جو کسی کام کی برائی سے واقف ہو اور پھر اس کام کو کرے تو اس کا یہ عمل انتہائی قبیح ہو گا۔ (مطلب یہ کہ دیدہ و دانستہ تم انتہائی بے حیائی کا کام کرتے ہو) یا یہ مطلب ہے کہ بے حیائی کا کام تم ایک دوسرے کی نظروں کے سامنے (بلا جھجک) کرتے ہو ان لوگوں کا یہ طریقہ تھا کہ لوگوں کی موجودگی میں سب کے سامنے ایسے برے کام کرتے تھے۔

یا یہ مطلب ہے کہ گزشتہ نافرمان قوموں کے نشانات و آثار تباہی تمہاری نظروں کے سامنے ہیں پھر بھی یہ حرکت کرتے ہو۔

أَئِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِنْ دُونِ النِّسَاءِ ۚ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُونَ ۝

کیا تم شہوت کے ساتھ مردوں پر چڑھتے ہو عورتوں کو چھوڑ کر (اس کی وجہ کوئی نہیں) بلکہ (اس معاملہ میں تم بالکل جاہل لوگ ہو) محض جہالت کرتے ہو۔

یہ قوم لوط کی بدکاری کا بیان ہے کہ شہوت رانی کے لئے مردوں پر آتے ہیں عورتوں کو چھوڑ کر حالانکہ عورتیں اس کام کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ آیت میں اس امر پر تنبیہ بھی ہے کہ جماع کا اصل مقصد ہے طلب نسل محض تقاضائے شہوت پورا کرنا مقصود نہیں ہے (کہ جہاں چاہا بے محل بے راہ عمل کو کر لیا)۔

بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُونَ یعنی یہ حرکت اس شخص کی طرح کرتے ہو جو اس کی برائی سے ناواقف ہو یا سبک سر بے وقوف ہو جو اچھے برے کا امتیاز نہ رکھتا ہو یا تم اس کے انجام سے ناواقف لوگ ہو۔

یہ آیات دلالت کر رہی ہیں کہ اشیاء کا حسن و قبح (محض شرعی نہیں ہے بلکہ) واقعی اور نفس الامری چیز ہے اگرچہ بعض چیزوں کے اچھے برے ہونے کا علم شریعت پر موقوف ہے۔[1]

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا أَخْرِجُوا آلَ لُوطٍ مِنْ قَرْيَتِكُمْ ۖ إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَتَطَهَّرُونَ ۝

---

[1] علماء اسلام میں اختلاف ہے کہ اشیاء میں حسن و قبح عقلی ہے یا شرعی۔ کچھ علماء اول شق کے قائل ہیں جیسے فرقہ معتزلہ اور کچھ اہل علم دوسری شق کے قائل ہیں جیسے اشاعرہ حضرت مفسر نے آیت سے اشیاء کے حسن و قبح کے واقعی ہونے پر استدلال کیا ہالبتہ بعض چیزوں کے اچھا برا ہونے کا علم صراحت شریعت پر موقوف قرار دیا۔ یہ فقیر مترجم کہتا ہے کہ کوئی چیز بھی اللہ کی پیدا کی ہوئی قبیح (باقی صفحہ آئندہ پر)

سو (اس تقریر کا) ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا بجز اس کے کہ انہوں نے (آپس میں) کہا لوط کا
ساتھ دینے والوں کو (بھی) اپنی بستی سے نکال باہر کر دو یہ لوگ بڑے پاک بنتے ہیں۔
یَتَطَهَّرُوْنَ یعنی ہمارے افعال سے یا گندگیوں سے پاک صاف بنتے ہیں۔

فَاَنْجَیْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۫ قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِیْنَ ۝ سو ہم نے لوط کو اور
اسکے لوگوں کو بچالیا بجز اس کی بیوی کے کہ (اس کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے) ہم نے اس کو ان ہی لوگوں میں تجویز کر رکھا تھا جو
(عذاب میں) رہ جانے والے تھے۔

وَاَمْطَرْنَا عَلَیْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِیْنَ ۝ اور ہم نے ان لوگوں پر ایک نئی قسم کا مینہ
برسایا (یعنی کنکروں کی بارش کی) پس ان لوگوں پر جن کو (عذاب سے پہلے ہی) ڈرایا گیا تھا برا مینہ برسا (اس طرح وہ سرزمین
بدکار کافروں کی آلائش سے پاک کر دی گئی)

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰى ؕ (اے محمد ﷺ) آپ (بیان توحید کے
لئے بطور خطبہ کے) کہہ دیجئے کہ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے سزاوار ہیں اور اس کے ان بندوں پر سلامتی نازل ہو جن کو اس نے
منتخب فرمایا ہے۔

(گزشتہ سے پیوستہ) نہیں ہو سکتی ہر چیز اللہ نے حسن اور اچھی بنائی ہے کیونکہ اشیاء میں نقص و قبح ذاتی مندرجہ ذیل چار وجوہ سے ہی ہو سکتا
ہے اسکے علاوہ قبح ذاتی کی کوئی وجہ نہیں۔ ۱۔ فاعل اور صانع کامل نہ ہو ناقص العلم یا قاصر العمل ہو۔ ظاہر ہے کہ اللہ بہمہ حیثیات کامل
ہے اس کی طرف علمی یا عملی نقص کی نسبت ہی نہیں کی جا سکتی۔ ۲۔ مادہ صالح اور مناسب نہ ہو جس چیز کو پیدا کرنا اور بنانا ہو اس کے لائق
مادہ نہ ہو، مادہ میں کوئی خرابی نہ ہو جو صورت مادہ کو پہنانا مقصود ہو اس صورت کو مادہ عدم صلاحیت کی وجہ سے قبول نہ کر سکے۔ یہ بات بھی
یہاں ممکن نہیں کیونکہ مادہ کا خالق بھی اللہ ہی ہے اس نے غیر صالح مادہ کو اس کے نامناسب صورت کا لباس پہنایا ہی نہیں ہر مادہ اپنے اندر
تمام تر صلاحیت لے کر آیا ہے ورنہ اس سے خالق کا نقص علم یا قصور عمل ظاہر ہو گا۔ ۳۔ جس غرض کے لئے کسی چیز کو پیدا کیا گیا اس غرض
کے مناسب صورت نہ عطا کی گئی ہو اس سے بھی پیدا کی ہوئی چیز میں قبح پیدا ہو جائے گا لیکن اللہ کی پیدا کی ہوئی مخلوق میں اس قول کا بھی احتمال
نہیں ورنہ اللہ کی علمی کم مائیگی یا عملی بے بضاعتی لازم آئے گی۔ ۴۔ تخلیق شئی کی جو غرض اور مقصد تو تھی یا مصلحی یا نفسی ہو وہ پورا اور حاصل
نہ ہو خواہ پہلے سے کوئی غایت و غرض سوچی ہی نہ گئی ہو یا سوچی تو گئی ہو لیکن کسی چیز کی پیدائش کے بعد وہ چیز اپنے مقصد تخلیق اور منصوبہ
صانع کو پورا کرنے سے قاصر ہو۔ اللہ کی شان میں یہ احتمال بھی نا ممکن ہے کہ اس نے کسی غرض کے لئے کسی چیز کی تخلیق اعضاء و قویٰ اور
صنعت ہیئت و صورت اور عطاء کیفیت کی ہو اور اللہ کا وہ مقصود پورا نہ ہو اس سے خدا کا عاجز ہونا اور کامل الارادہ ہونا لازم آئے گا۔ اس
تقریر سے واضح ہو گیا کہ اشیاء میں تخلیقی اور ذاتی کوئی خرابی اور نقص نہیں اور ساری کائنات کی تخلیق خیر ہی خیر ہے اور کسی چیز کے اندر ذاتی
اور واقعی قبح نہیں ہے۔ بد شکل سے بد شکل جانور یا درخت یا پتھر کیا اپنے اندر فطری اور تخلیقی حسن نہیں رکھتا کیا کوئی جڑی بوٹی، پھل پھول،
بچھال کھال، معدنی اور ارضی، دریائی اور ہوائی جاندار اور بے جان مخلوق حسن فطرت کا آئینہ نہیں ہے۔ آسمان ہو یا زمین یا ان کی کائنات ہر ایک
سے حسن ذاتی کی بارش ہو رہی ہے اور ہر چیز بجائے خود خیر ہی خیر ہے اس کائناتی مشین کا پرزہ چھوٹا ہو یا بڑا، ٹیڑھا ہو یا سیدھا، موٹا ہو یا پتلا،
کمزور ہو یا طاقتور، خوبصورت ہو یا بد شکل، غرض ہر حصہ اور ہر جزا اپنی جگہ ٹھیک ٹھیک پیوستہ چسپیدہ، جڑا ہوا اور جڑا ہوا ہے اور اس ساخت
ترتیب اور ترکیب میں نہ کوئی نقص ہے نہ قبح نہ شر۔ ہاں اس مخلوق میں شر اضافی ضرور ہے۔ بعض چیزیں بعض کیلئے بری اور ضرر رساں
ہیں۔ یعنی بعض چیزوں کیلئے بعض چیزوں کا استعمال برا اور ضرر رساں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ذاتی حسن و خیر ہونے کے باوجود استعمال سے
کوئی چیز کسی کیلئے بری اور مضرت رساں ہو جاتی ہے اور کبھی استعمال صحیح ہوتا ہے تو خیر واقعی شر اضافی میں تبدیل نہیں ہوتی۔ اسی لئے
حسنات و سیئات، حلت و حرمت کو اشیاء کی صفت نہیں قرار دیا جاتا بلکہ افعال کی صفت کہا جاتا ہے کسی چیز کو کھانا حلال یا حرام ہوتا ہے، نفس
شئی میں تو کوئی حرمت نہیں کیونکہ اس میں فطری شر نہیں۔ ہمارے لئے اس کو کھانا یا کرنا مضرت رساں ہے اس لئے حرام ہے لیکن دوسری
کائنات کے لئے تو اس ممنوع انسانی چیز کی افادیت اہم ہے اسی لئے ہم اس کو خیر واقعی اور شر اضافی کہتے ہیں۔ واللہ اعلم و علمہ اتم

مذکورہ بالا تمام انبیاء اور ان کی امتوں کے احوال جب اللہ نے بیان کر دیئے جن سے اللہ کی قدرت قاہرہ اور عظمت ظاہرہ ثابت ہو رہی ہے اور انبیاء کو جن معجزات و اعزازات سے نوازا تھا ان کا بھی اظہار ہو گیا تو آخر میں اخص طور پر اپنے رسول کو خطاب کر کے اللہ کی ستائش کرنے کا حکم دیا کہ اس نے سابق امتوں میں سے کافروں کو غارت کر دیا اور انبیاء کو نعمتوں سے سرفراز کیا اور رسول اللہ ﷺ کو ان کے احوال پر مطلع فرمایا پھر ان نیک بندوں کے لئے دعاء سلامتی کا بھی حکم دیا جن کو اللہ نے منتخب فرمالیا تاکہ رسول اللہ ﷺ کی تعریف سے ان کے فضائل اور دینی سعی و عمل کا اعتراف ہو جائے۔

مقاتل نے کہا اَلَّذِیْنَ اصْطَفٰی سے مراد انبیاء و مرسلین ہیں کیونکہ انہیں کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِیْنَ۔

بروایت امام مالک حضرت ابن عباس کا قول آیا ہے کہ اس سے مراد صحابہ کرام ہیں۔ سفیان ثوری کا بھی یہی قول ہے۔ کلبی نے کہا ساری امت محمد یہ مراد ہے کیونکہ اللہ نے ساری امت کے لئے فرمایا ہے ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ الخ بعض نے کہا گزشتہ اور آئندہ سب مومن مراد ہیں۔

بعض اہل تفسیر کا خیال ہے کہ یہ حضرت لوط کے قصہ کا تتمہ ہے اور قُلْ سے خطاب حضرت لوط ہی کو ہے اس سے پہلے قُلْنَا محذوف ہے یعنی ہم نے لوط کو حکم دیا کہ تم اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہو اور اللہ کا شکر کرو کہ اس نے کافروں کو غارت کر دیا اور ان لوگوں کے لئے دعاء سلامتی کرو جن کو فواحش اور ہلاکت سے محفوظ رکھا اور منتخب فرمالیا یہ مطلب ہے کہ محمد ﷺ اور امت محمد ﷺ کے لئے دعاء سلامتی کرو کیونکہ انبیاء اور ان کی امتوں کو جن آفتوں سے اللہ نے بچایا اور عزت و کرامت عطا فرمائی وہ سب کچھ نور محمدی کی برکت سے ہوا رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میں (آغاز) آفرینش کے لحاظ سے سب سے پہلا ہوں اور بعثت کے اعتبار سے سب کے بعد رواہ ابو سعد عن قتادہ مرسلا۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میں (اس وقت) نبی تھا جب کہ آدم روح و جسم کے درمیان تھے (یعنی حضرت آدم کے بدن میں روح بھی نہیں پڑی تھی) رواہ ابن سعد بسند صحیح عن میسرہ بن سعد عن ابی الجدعاء و رواہ الطبرانی عن ابن عباس۔

آٰللّٰهُ خَیْرٌ اَمَّا یُشْرِكُوْنَ ۞ کیا اللہ بہتر ہے یا وہ چیزیں جن کو وہ اللہ کا ساجھی قرار دیتے ہیں۔

اس آیت کا تعلق ابتداء سورت کی آیت اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ --- هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ سے ہے اس آیت میں درحقیقت مشرکوں کی حماقت اور سبک سری کا اظہار ہے۔ جب انبیاء اور ان کی امتوں کے قصے بیان کر دیئے جن سے ثابت ہو رہا ہے کہ اللہ کو اپنے نیک بندوں کی عزت افزائی اور دشمنوں کو ذلیل کرنے کی قدرت کاملہ حاصل ہے اور کوئی اس کی قدرت سے سرتابی نہیں کر سکتا تو اب فرمایا کہ اے کیا رب قادر عبادت کے قابل اور مرکز خوف و رجا ہونے کا مستحق ہے یا وہ عاجز بے بس بت وغیرہ جو نہ نفع پہنچانے کی قدرت رکھتے ہیں نہ ضرر پہنچانے کی طاقت بلکہ ان کا ضرر نفع سے زیادہ قریب ہے۔

الحمد للہ و سلام علی عبادہ الذین اصطفی۔

انیسواں پارہ ختم ہوا

بیسویں پارہ کی تفسیر کا ترجمہ اس کے بعد ہی انشاء اللہ آرہا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امن خلق

بیسواں پارہ شروع

اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ یا وہ ذات بہتر ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو بنایا۔

ام منقطعہ ہے اور معطوف علیہ محذوف ہے پورا کلام اس طرح تھا کیا تمہارے معبود بہتر ہیں جنہوں نے کچھ پیدا نہیں کیا یا وہ اللہ بہتر ہے جس نے آسمان و زمین پیدا کئے۔ بعض مفسرین کے نزدیک ام منقطعہ ہے اور بمعنی بل کے ہے اور ہمزہ سابق استفہام سے اعراض کے لئے ہے کیونکہ یہ بات بالکل کھلی ہوئی ہے کہ اللہ ہی ہر خیر کا مبدء ہے اور دوسرے معبودوں میں کہیں خیر کا پتہ بھی نہیں ہے۔ پھر استفہام کی صورت میں دونوں میں برابری کرنا اور سوال میں موازنہ کرنا کسی طرح زیبا نہیں اس لئے سابق استفہام سے اعراض کیا، اس صورت میں یہ استفہام تقریری ہوگا یعنی تاکید ہوگی اس بات کی کہ جس نے آسمان و زمین بنائے وہی بہتر ہے۔

وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ؕ

اور اس نے تمہارے فائدہ کے لئے اوپر سے پانی اتارا پھر پانی سے ہم نے پر رونق باغات اگائے کہ تم ان کے درخت نہیں اگا سکتے تھے۔

حدائق، حدیقۃ کی جمع ہے۔ باغات فراء نے کہا حدیقہ اس باغ کو کہتے ہیں جس کی باونڈری (احاطہ) بھی ہو، اگر احاطہ نہ ہو تو اس کو حدیقہ نہیں کہا جاتا۔ بیضاوی نے لکھا ہے حدیقہ کا لفظ احداق سے بنا ہے اور احداق کا معنی ہے احاطہ۔

ذات بہجۃ خوبصورت جس کے دیکھنے سے شگفتگی طبع پیدا ہو۔

فانبتنا بہ میں صنعت التفات ہے پہلے اپنی ذات کو بصیغہ غائب ذکر کیا تھا پھر صیغہ متکلم کی طرف انتقال کیا اور اس لئے کیا کہ سننے والے متنبہ ہو جائیں اور ان کو دماغ کی بیداری کے ساتھ یہ بات معلوم ہو جائے کہ تمام درختوں کا مادہ ایک جیسا ہے پھر ہر درخت کی طبیعت دوسرے کی طبیعت سے جدا اور ایک کی نوع دوسرے کی نوع سے مختلف پھر ان سب مختلف الانواع اور متباعد الطبائع، درختوں کو اکٹھا کر کے شاداب تر و تازہ اور پر رونق باغ بنانا، سوائے اللہ کے اور کسی کا کام نہیں، تم ایک درخت بھی نہیں پیدا

کر سکتے۔ شَجَرَهَا یعنی کوئی درخت ان کے درختوں میں سے نہیں پیدا کر سکتے۔

ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ یَّعْدِلُوْنَ ۝ کیا اللہ کی موجودگی میں کوئی دوسرا بھی معبود ہو سکتا ہے بلکہ یہ ایسے لوگ ہیں جو (استحقاق عبادت میں غیر مستحقوں کو اللہ کے) برابر قرار دیتے ہیں۔ استفہام انکاری ہے یعنی کوئی بھی معبود ایسا نہیں کہ استحقاق عبادت رکھتا ہو سوائے اللہ کے کیونکہ اللہ ہی خالق تنہا ہے۔

قَوْمٌ یَّعْدِلُوْنَ یعنی جو خالق نہیں ان کو کفار مکہ خالق کے برابر قرار دیتے ہیں۔ یا یہ مطلب ہے کہ توحید سے اعراض کرتے ہیں حق سے پھر رہے ہیں۔

اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ جَعَلَ خِلٰلَهَاۤ اَنْهٰرًا وَّ جَعَلَ لَهَا رَوَاسِیَ وَ جَعَلَ بَیْنَ الْبَحْرَیْنِ حَاجِزًا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝

یا وہ ذات جس نے زمین کو مخلوق کی قرار گاہ بنایا اور اس کے درمیان دریا بنائے اور اس (کو ٹھہرانے) کے لئے پہاڑ بنائے اور دو سمندروں کے درمیان ایک حد فاصل بنادی کیا اللہ کی موجودگی میں کوئی اور معبود ہے۔ (مگر مشرکین نہیں مانتے) بلکہ ان میں سے اکثر سمجھتے بھی نہیں۔

جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا یعنی زمین کے کچھ حصہ کو پانی سے ابھار کر رہنے اور ٹھہرنے کے قابل بنادیا۔

وَّ جَعَلَ خِلٰلَهَاۤ اَنْهٰرًا یعنی زمین کے درمیان دریا جاری کئے۔

وَّ جَعَلَ لَهَا رَوَاسِیَ اور زمین کے لئے پہاڑوں کو (میخوں کی طرح) گاڑ دیا کہ زمین میں (اضطرابی) حرکت نہ ہونے دیں اور پہاڑوں سے دریا نکالے۔

الْبَحْرَیْنِ دو سمندر شیریں اور نمکین۔ حَاجِزًا آڑ۔ دونوں کو مخلوط ہونے سے روکنے والی۔

ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ استفہام انکاری ہے یعنی نہیں ہے۔

بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ یعنی ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے کہ اللہ کے سوا کوئی قابل عبادت نہیں کیونکہ باوجود قطعی دلائل توحید کے موجود ہونے کے یہ غور ہی نہیں کرتے، اس لئے شرک میں مبتلا ہوتے ہیں اور بعض لوگ جانتے ہیں مگر محض ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے شرک کو نہیں چھوڑتے۔

اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ یَكْشِفُ السُّوْٓءَ یا کون ہے ایسا کہ جب کوئی بے قرار اس کو پکارتا ہے تو وہ اس کی دعا قبول کرتا ہے اور مصیبت کو دور کر دیتا ہے یعنی اللہ کے سوا کوئی ایسا نہیں۔ اضطرار (باب افتعال) ضر سے بنا ہے مُضْطَرّ یعنی وہ شخص جو ایسے دکھ میں مبتلا ہو گیا ہو جس سے مجبور ہو کر بے قراری کے ساتھ وہ اللہ کی طرف رجوع کرتا اور اس سے پناہ کا خواستگار ہوتا ہو۔ اَلْمُضْطَرّ میں الف لام جنسی ہے استغراق کے لئے نہیں ہے اس لئے ہر دعا کرنے والے کی ہر دعا قبول کرنا ضروری نہیں۔

اِذَا دَعَاهُ یعنی اللہ اگر چاہتا ہے تو مضطر کی دعا قبول کر لیتا ہے۔

وَ یَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ اور تم کو زمین کے وارث بناتا ہے یعنی اسلاف کے جانشین اخلاف ہوتے ہیں زمین کے وارث بنانے کا مطلب ہے زمین پر رہنے، زمین میں تصرف کرنے یا زمین پر تسلط جمانے کا اختیار دینا۔ بعض اہل علم نے کہا انسانوں کو اللہ نے زمین پر جنات کا جانشین کر دیا۔ میں کہتا ہوں یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ نے زمین پر تم میں سے کچھ آدمیوں کو اپنا نائب بنایا یہی مضمون آیت اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً کا ہے۔

ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے (مگر تم لوگ) بہت ہی کم یاد رکھتے ہو۔

یعنی یہ خصوصی اور عمومی نعمتیں عطا کرنے والا تو اللہ ہی ہے اس لئے اس کے سوا کوئی بھی معبود نہیں۔

قَلِيلًا مَّا میں مَا زائدہ ہے اور قلت سے مراد عدم ہے یعنی نہیں رکھتے یا قلت سے مراد (تعداد کی کمی نہیں بلکہ مرتبہ کی کمی مراد) حقارت ہے اور حقارت بھی اتنی زیادہ کہ فائدہ ہی فوت ہو جائے۔

أَمَّنْ يَهْدِيكُمْ فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ ۗ أَإِلَٰهٌ مَعَ اللَّهِ ۚ تَعَالَى اللَّهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ۝ (یہ بت بہتر ہیں) یا وہ خدا جو تم کو خشکی اور دریاؤں کی تاریکیوں میں راہ سوجھاتا ہے اور جو ہواؤں کو اپنی رحمت یعنی بارش کو نازل کرنے سے بھیجتا ہے جو (بارش کی امید دلا کر دلوں کو) خوش کر دیتی ہیں کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے اللہ ان کے شرک سے بالا و برتر ہے۔

أَمَّنْ يَهْدِيكُمْ یعنی جب تم رات کو سفر کرتے ہو تو خشکی اور سمندر میں ہونے والی تاریکیوں میں ستاروں اور زمین کے نشانات راہ کے ذریعہ کون تم کو راہ دکھاتا اور سوجھاتا ہے۔

رَحْمَتِهِ میں رحمت سے مراد بارش ہے۔ تَعَالَى اللَّهُ یعنی وہ اللہ جو قادر و خالق ہے ان کافروں کے شرک سے پاک ہے وہ برتر ہے جو عاجز مخلوق کو عبادت میں اس کا شریک قرار دیتے ہیں۔ اللہ اس سے بالا ہے۔

أَمَّنْ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ یا وہ بہتر ہے جو مخلوق کو دنیا میں پہلی بار پیدا کرتا ہے پھر وہی (قیامت کے دن) دوبارہ پیدا کرے گا۔ (پہلی تخلیق تو مسلم تھی لیکن) قیامت کے دن دوبارہ پیدا ہونے کے کفار منکر تھے پر عقلاً اعادۂ تخلیق ناممکن نہیں۔ اور نقلی دلائل سے وجوب اعادہ ثابت ہے۔ نقلی دلائل کے واجب الیقین ہونے پر معجزات کی تائید کافی ہے اس لئے دوبارہ تخلیق بھی ناقابل شک ہے اور یہ یقینی ہے کہ اللہ ہی دوبارہ پیدا کرے گا۔

وَمَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ۗ أَإِلَٰهٌ مَعَ اللَّهِ ۚ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ اور کون آسمان و زمین سے تم کو روزی دیتا ہے کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم سچے ہو تو اپنی دلیل پیش کرو۔

مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ یعنی اسباب سماوی (مثلاً چاند، سورج اور ستاروں کا طلوع و غروب اور بارش وغیرہ) اور اسباب ارضی (مثلاً ہوا، مٹی پانی وغیرہ) سے۔

هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ یعنی اس بات کی دلیل پیش کرو کہ اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا بھی معبود ہے جو مذکورہ چیزوں پر قدرت رکھتا ہے إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ یعنی اگر دوسروں کو عبادت میں شریک قرار دینے میں تم سچے ہو تو دلیل پیش کرو کہ اللہ کے علاوہ دوسرے معبود بھی ان کاموں کی قدرت رکھتے ہیں کیونکہ الوہیت کے لئے کمال قدرت لازم ہے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ مشرکوں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا تھا قیامت کب ہوگی اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ ۚ آپ کہہ دیجئے جو بھی اہل علم آسمانوں میں اور زمین میں ہیں کوئی بھی بجز اللہ کے غیب کو نہیں جانتا۔

مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ یعنی فرشتے وَالْأَرْضِ یعنی جن و انس، جن میں تمام انبیاء بھی شامل ہیں۔ الْغَيْبَ غیب سے مراد وہ چیز ہے جو حواس (ظاہری و باطنی) کی رسائی سے باہر ہو یعنی حسی نہ ہو اور نہ اس کے ثبوت پر کوئی عقلی دلیل قائم ہو (یعنی نظری ہونا قابل استدلال، غیر ممکن الحصر۔ مترجم) إِلَّا اللَّهُ یعنی صرف اللہ ہی ان تمام باتوں کو جانتا ہے جو ملائکہ اور جن و انس کے لئے ناممکن الحصول ہیں۔ ہاں اگر اللہ چاہے تو بعض غیب کی باتیں اپنے بندوں کو بتا دے اس طرح اللہ کی عطاء و موہبت سے کچھ غیبی باتیں بندوں کو بھی معلوم ہو جائیں۔ إِلَّا اللَّهُ میں استثناء منقطع ہے کیونکہ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ میں اللہ پہلے سے داخل نہ تھا اللہ کے لئے نہ آسمان مکان بن سکتا ہے نہ زمین اللہ ہر استقرار و تمکن سے پاک ہے۔

بعض اہل علم کہتے ہیں کہ استثناء متصل ہے (اور استثناء متصل میں مستثنیٰ کا مستثنیٰ منہ کے اندر داخل ہونا چونکہ ضروری ہے اور اس جگہ اللہ کا مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ میں داخلہ ممکن نہیں ہم کہیں گے کہ) اس جگہ مستثنیٰ منہ میں مستثنیٰ کا داخلہ بفرض محال ہے۔ یعنی بفرض محال اگر مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ میں اللہ کو شامل سمجھ لیا جائے تب بھی اللہ کے سوا

کوئی دوسرا زمین و آسمان میں غیب سے واقف نہیں۔ حضرت مفسر نے فرمایا اِلَّا اللّٰہُ کا مطلب اِلَّا یُعَلِّمُہُمُ اللّٰہُ بھی ہو سکتا ہے یعنی کوئی بھی غیب سے واقف نہیں مگر اللہ کے واقف بنانے سے۔

وَمَا یَشْعُرُوْنَ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ اور ان کو پتہ بھی نہیں کہ ان کا حشر کب ہوگا کیونکہ وقت حشر حسی نہیں کہ حواس کے ذریعہ سے اس کا وقت معلوم ہو سکے اور نہ اس کے وقت کی تعیین نظری قابل استدلال ہے اس لئے کسی آسمانی، زمینی مخلوق کے لئے قیامت کا تعیینی علم ممکن نہیں، ہاں اگر اللہ کسی کو بتاوے تو معلوم ہونا ممکن ہے مگر اللہ نے کسی کو قیامت کی تعیین کا علم عطا نہیں فرمایا یہ علم اپنی ذات کے لئے مخصوص رکھا ہے۔

بَلِ ادّٰرَکَ عِلْمُہُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ بلکہ آخرت کے بارے میں ان کا علم (بالوقوع) ہی نیست ہوگیا۔

اِدّٰرَکَ اصل میں تَدَارَکَ تھا اور تدارک کا معنی ہے تکامل یعنی آخرت کے معاملہ میں ان کا علم تعلیم انبیاء (جتنا ہونا تھا) پورا ہو گیا (اس سے زیادہ ممکن نہیں) یا یہ مطلب ہے کہ آخرت میں جب قیامت کا معائنہ کرلیں گے اس وقت ان کا علم مکمل ہو جائے گا۔ (یہاں تو تعیین وقت کا علم ممکن نہیں)

تَدَارَکَ الْفَاکِہَۃُ پھل بالکل پک گیا۔ عرب کا محاورہ ہے یعنی پکنے کی انتہائی مدت کو پہنچ گیا۔

مومنوں کو دنیا میں وقوع قیامت کا علم تو حاصل ہو ہی چکا اور کافروں کے لئے بھی بایں معنی حصول علم قیامت ہو گیا کہ وقوع قیامت کا قطعی دلائل سے ثبوت ہو گیا۔

بَلْ ہُمْ فِیْ شَکٍّ مِّنْہَا بلکہ یہ لوگ اس سے شک میں ہیں۔ یعنی رسول اللہ ﷺ کا قیامت کی خبر دینا علم قطعی کا موجب ہے کیونکہ رسول کی صداقت معجزات سے ثابت ہے لیکن کافروں کو اس قطعیت کے باوجود قیامت کے وجود میں شک ہے یہ شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ بَلِ ادّٰرَکَ بطور استفہام ہے یعنی کیا ان کا علم قیامت کے معاملہ میں مکمل ہو گیا ہے؟ ان کو پورا پورا علم حاصل ہو گیا ہے ایسا نہیں ہوا علم قیامت ان کو حاصل نہیں ابھی یہ علم قیامت تک نہیں پہنچ سکے قیامت کا وجود ان کی عقلی رسائی سے خارج ہے۔ اس مطلب کی تائید حضرت ابن عباس کی قرأت سے ہوتی ہے۔ حضرت ابن عباس کی قرأت میں بَلٰی اَدّٰرَکَ آیا ہے یعنی بَلْ کی جگہ بَلٰی کلمہ ایجاب اور اَدّٰرَکَ ہمزہ استفہام آیا ہے جس کو وصل کے بعد بَلِ اَدّٰرَکَ پڑھا گیا ہے۔ اور حضرت ابی کی قرأت میں اَمْ تَدَارَکَ آیا ہے۔ عرب بَلْ کو اَمْ کی جگہ اور اَمْ کو بَلْ کی جگہ استعمال کرلیتے ہیں۔ علی بن عیسیٰ اور اسحاق نے کہا کہ اس جگہ بَلْ بمعنی لَوْ کے ہے مطلب یہ ہے کہ جو علم آخرت میں ان کو ہوتا ہے اگر وہ دنیا میں ہی ہو جاتا تو وہ شک نہ کرتے اب ان کو یقین نہیں ہے بلکہ وہ شک میں پڑے ہوئے ہیں۔

بَلْ ہُمْ مِّنْہَا عَمُوْنَ بلکہ یہ قیامت کی طرف سے اندھے بنے ہوئے ہیں۔

عَمُوْنَ، عَمِیٌّ کی جمع ہے۔ اور نابینائی سے مراد ہے دل کی نابینائی۔ شروع میں اللہ نے علم غیب کی نفی کی پھر اس کی تاکید نفی شعور سے کر دی کہ ان کو اپنے مآل کا شعور بھی نہیں ہے، پھر اس سے بھی اعراض کر کے صراحت کی کہ دلائل اور آیات کے ذریعہ سے صرف ان کو اتنا علم ہے کہ قیامت ہوگی اور ضرور ہوگی لیکن کب ہوگی یہ کسی آیت یا دلیل نے نہیں بتلایا۔

پھر اس سے بھی ترقی کے طور پر فرمایا کہ باوجودیکہ ثبوت قیامت کے دلائل موجود ہیں مگر یہ لوگ شک میں پڑے ہوئے ہیں اور ایسے متحیر ہیں جیسے کوئی دلیل نہ پانے والا متحیر ہوتا ہے اب یہ اپنے شک کو دور کر ہی نہیں سکتے۔ پھر اس سے بھی آگے ترقی کے طور پر فرمایا کہ یہ لوگ بالکل اندھے ہیں تحیر سے بھی بڑھ کر نابینائی کے درجہ میں پہنچ چکے ہیں۔ ان کے دل کور بصیرت ہو چکے ہیں اب اثبات قیامت کا [illegible] بیان کر کے [illegible] کا بیان فرمایا اور ان کی [illegible] جماعت کی طرف منسوب کر دیا تھا جیسے اسی طرح مشرکوں کے [illegible] حضرت [illegible] کی طرف منسوب کر دیا ہے۔

بعض اہل علم نے کہا [illegible] قیامت کا [illegible] استہزاء [illegible]

بعض علماء کا کہنا ہے کہ اِدّٰرَکَ کا معنی ہے انتہا کو پہنچ گیا اور انتہا کو پہنچ کر نیست و نابود ہو گیا۔ ہر چیز جب اپنی ترقی کی انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو پھر وجود کی جگہ عدم آجاتا ہے۔ یعنی آخرت کے معاملہ میں ان کا علم ختم ہو گیا نیست ہو گیا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّاٰبَآؤُنَآ اَئِنَّا لَمُخْرَجُوْنَ ۝ اور کافروں نے کہا جب ہم خاک ہو گئے اور ہمارے باپ دادا بھی خاک ہو گئے تو کیا ہم (دوبارہ زندہ کر کے زمین سے) برآمد کئے جائیں گے۔ پہلے کافروں کا نام صراحت کے ساتھ نہیں آیا تھا اس لئے بجائے ضمیر کے اس جگہ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا صراحت کے ساتھ فرمایا۔ اَئِنَّا کیا ہم اور ہمارے باپ دادا سب لَمُخْرَجُوْنَ یعنی قبروں سے زندہ کر کے نکالے جائیں گے یا عدم اور موت سے زندگی کی طرف نکال کر لائے جائیں گے۔ یہ کافروں کے کور بصیرت ہونے کا بیان ہے (کہ وہ ایسے نابینا ہیں کہ ایسی بات انکاریہ لہجہ میں کہہ رہے ہیں) استفہام انکاری ہے۔ اور دوسرا جملہ پہلے جملہ کی تاکید ہے۔

لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ اس (دوبارہ جی اٹھانے) کا وعدہ تو ہم سے (آپ کی زبانی) اور اس سے پہلے ہمارے باپ دادوں سے (ان کے زمانہ کے پیغمبروں کی زبانی) ہوتا رہا ہے یہ تو گزرے ہوئے لوگوں کی جھوٹی داستانیں ہیں اور غلط سلط باتیں ہیں جو وہ لکھ گئے ہیں۔

قُلْ سِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ (اے محمد) آپ کہہ دیجئے کہ ملک میں چل پھر کر دیکھو کہ مجرموں کا انجام کیسا (برا) ہوا۔

یہ دھمکی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ کے کافروں کو کہ دیکھو تکذیب انبیاء کا نتیجہ کتنا برا نکلا، اس سے تم کو بھی ڈرنا چاہئے کہ تکذیب کا جو خمیازہ ان کو بھگتنا پڑا تم کو بھی تکذیب رسول کی ویسی ہی سزا ملے گی۔ کافروں کو مجرمین کہنے سے مومنوں کے غیر مجرم ہونے کی طرف لطیف ایماء ہے۔

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ اور آپ ان کی طرف سے تکذیب وانکار پر کوئی رنج نہ کریں۔ (غمگین نہ ہوں)

وَلَا تَكُنْ فِىْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ۝ اور جو سازشیں یہ کر رہے ہیں ان سے تنگدل نہ ہوں۔

بغوی نے لکھا ہے کہ مکہ میں جو لوگ رسول اللہ ﷺ کا مذاق اڑاتے تھے ان کے متعلق اس آیت کا نزول ہوا یعنی آپ کو مکمل کامیابی ہوگی (ان کی خفیہ سازشوں کی آپ فکر نہ کریں)

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ اور کافر کہتے ہیں کہ اگر تم (اس بات میں کہ عذاب آئے گا) سچے ہو تو بتاؤ یہ (عذاب کا) وعدہ کب پورا ہوگا۔

قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ رَدِفَ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِىْ تَسْتَعْجِلُوْنَ ۝ آپ (اس کے جواب میں) کہہ دیجئے کہ جس عذاب کے جلد پہنچنے کے تم خواستگار ہو رہے ہو تو ہو سکتا ہے کہ اس کا کچھ حصہ تمہارے پیچھے ہی آلگا ہو۔ یعنی بلا مہلت فوراً تم کو پہنچ جائے۔ اس عذاب سے مراد جنگ بدر کا عذاب ہے۔ بیضاوی نے لکھا ہے کہ عَسٰى اور لَعَلَّ اور سَوْفَ بادشاہوں کے وعدہ آگین کلام میں در حقیقت قطعیت اور یقین ہی کا معنی رکھتا ہے۔ اپنے وقار کے اظہار کے لئے وہ مشتبہ الفاظ کہتے ہیں ایسے الفاظ کہنے سے ان کا اشارہ اس طرف ہوتا ہے کہ ہمارا ایماء بھی صراحت کی طرح قطعی واجب العمل ہے۔ اللہ کے کلام میں بھی وعدہ و وعید کے موقع پر ان مشتبہ الفاظ کا استعمال قطعیت کو ظاہر کرتا ہے، یہی مطلب ہے اس شخص کے قول کا کہ اللہ کے کلام میں عَسٰى اور لَعَلَّ کا استعمال وجوب وقوع کے لئے ہوتا ہے یعنی وعدہ ثواب کے موقع پر شکی الفاظ مفید جزم یقین ہوتے ہیں وعید عذاب تو مومن کے لئے بدل سکتی ہے اور معافی ہو سکتی ہے ہاں کافر مستحق عفو نہیں ہے۔

فرعون کے متعلق حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کو حکم دیا گیا تھا فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى اس آیت کا تعلق بحث وعید سے نہیں ہے اس لئے فرعون نہ نصیحت پذیر ہوا نہ اس کو کوئی خوف ہوا۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝ اور بے شک آپ کا رب لوگوں پر بڑا مہربان ہے لیکن اکثر لوگ (اس کی مہربانیوں کا) شکر ادا نہیں کرتے۔

یعنی وہ ایسا مہربان ہے کہ مومن کو اگر چاہے گا تو بخش دے گا اور کافر کو عذاب دینے میں جلدی نہیں کرتا (تاکہ اس کو

توبہ کا موقع مل جائے۔ مترجم) اسی لئے اس نے مکہ والوں پر عذاب نازل کرنے میں جلدی نہیں کی۔ مقاتل نے آیت کی اسی طرح تفسیر کی۔ اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے یعنی اللہ کی نعمتوں کا حق نہیں پہچانتے نعمت کی قدردانی نہیں کرتے اسی لئے جلد عذاب آنے کے خواستگار ہوتے ہیں۔

وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ وَمَا يُعْلِنُونَ ۝ آپ کا رب بلاشک و شبہ ان باتوں کو جانتا ہے جن کو وہ لوگ اپنے سینوں میں چھپائے رکھتے ہیں اور جن باتوں کو وہ ظاہر کرتے ہیں۔

یعنی وہ آپ کی جس عداوت کو دلوں میں چھپائے رکھتے ہیں یا اس کا اظہار کرتے ہیں اللہ اس سے واقف ہے اس کی سزا ضرور دے گا تاخیر عذاب کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اللہ سے کوئی حالت چھپی ہوئی ہے۔

وَمَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِي السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ إِلَّا فِي كِتٰبٍ مُّبِينٍ ۝ اور آسمان و زمین میں کوئی ایسی مخفی چیز نہیں جو لوح محفوظ میں موجود نہ ہو۔

غَآئِبَةٍ یعنی وہ چیز جو لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہو۔ غَائِبَة یا خَافِيَة کی طرح صفت غالبہ ہے (یعنی صفت کا صیغہ ہے لیکن موصوف کے بغیر اس کا استعمال بکثرت ہوتا ہے) اس وقت اس میں ت مبالغہ کی ہے جیسے رَاوِيَة (اس صورت میں غَآئِبَة مذکر کا صیغہ ہوگا) یا اسم صفت ہے جیسے عافیۃ اور عاقبت۔ بغوی نے لکھا ہے کہ یہ صفت ہے موصوف محذوف ہے یعنی پوشیدہ راز چھپی ہوئی بات، مخفی امر۔ کِتٰبٍ مُّبِينٍ کھلی ہوئی کتاب یا اپنے اندراجات کو پڑھنے والے پر کھول دینے والی کتاب اس سے مراد لوح محفوظ ہے۔ إِلَّا فِي كِتٰبٍ میں استثناء مفرغ ہے۔

إِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ أَكْثَرَ الَّذِي هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۝ بے شک یہ قرآن بنی اسرائیل پر اکثر ان باتوں کی حقیقت کو ظاہر کرتا ہے جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔

يَقُصُّ یعنی بیان کر دیتا ہے۔ الَّذِي هُمْ فِيهِ بیشتر وہ دینی مسائل جن میں بنی اسرائیل کا باہم اختلاف ہے۔

کلبی کا بیان ہے کہ اہل کتاب کا باہم بعض مذہبی باتوں میں اختلاف تھا اسی لئے فرقے فرقے بن گئے تھے ہر فرقہ دوسرے پر طعن کرتا تھا قرآن نے آکر ان کے اختلافی مسائل کو بیان کر دیا (اور جو بات صحیح تھی وہ ظاہر کر دی)

وَإِنَّهُ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ۝ بلاشک و شبہ قرآن مومنوں کے لئے ہدایت اور رحمت ہے۔

کیونکہ قرآن سے فائدہ اٹھانے والے صرف مومن ہیں اس لئے قرآن انہی کے لئے ہدایت و رحمت ہے کافروں کے لئے رحمت نہیں ہے خواہ کفار کتابی نہ ہوں۔

إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِي بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ ۝ بلاریب آپ کا رب بنی اسرائیل کے درمیان اپنے حکم سے (عملی) فیصلہ کردے گا اور وہی غالب ہے (اس کے فیصلہ کو کوئی رد نہیں کر سکتا) جاننے والا ہے (جس بات کا فیصلہ کرتا ہے اس کی حقیقت و حکمت سے بخوبی واقف ہے)

يَقْضِي قیامت کے دن فیصلہ کردے گا۔ بَيْنَهُمْ مذہبی امور میں اختلاف کرنے والوں کے درمیان۔

ایک شبہ۔ يَقْضِي کا معنی ہے بِحُكْمِهِ قضا اور حکم ایک ہی چیز ہے پھر يَقْضِي بِحُكْمِهِ ایسا ہی ہوگیا جیسے يَحْكُمُ بِحُكْمِهِ کہا جائے اور یہ صحیح نہیں۔

ازالہ: حکم سے مراد محکوم یعنی وہ فیصلہ جو قرآن میں بیان کر دیا گیا۔ یعنی قیامت کے دن اللہ اس فیصلہ کے مطابق جو قرآن میں کر دیا گیا ہے حکم دیدے گا (گویا علمی فیصلہ تو قرآن میں یہیں ہوگیا قیامت کے دن اسی کے مطابق عملی فیصلہ ہو جائے گا۔ مترجم)

فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۖ سو آپ اللہ پر بھروسہ رکھیں یعنی آپ دشمنوں کی کوئی پرواہ نہ کریں اللہ پر بھروسہ رکھیں کیونکہ۔

اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ ۝ آپ واضح حق پر ہیں یعنی ایسے حق پر جس کی حقیقت کھلی ہوئی ہے۔ اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ جو واقعی صاحب حق ہو اس کو اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہئے اللہ اس کا مددگار ہے۔

اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى آپ یقیناً مُردوں کو (یعنی کافروں کو) نہیں سنا سکتے۔ کافروں کو قرآن سننے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا اس لئے ان کو مُردوں سے تشبیہ دی۔ مردوں کو قرآن سنانے سے کوئی فائدہ نہیں جیسا کہ آیت میں کافروں کو بہرا کہا گیا ہے۔

وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ۝ اور نہ آپ بہروں کو سنا سکتے ہیں (خصوصاً) جب کہ وہ پشت پھیر کر چل دیں۔

ایک سوال: اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ کہنے کا کیا فائدہ، بہرے تو بہر حال نہیں سنتے خواہ منہ سامنے کئے ہوں یا پیٹھ پھیرے جا رہے ہوں۔

جواب: صرف تاکید اور کلام میں زور پیدا کرنے کے لئے ایسا کہا۔ یہ جواب بعض اہل تفسیر نے دیا ہے۔ بعض نے کہا اگر بہرا سامنے منہ کئے ہو تو کبھی چلا کر بات کرنے کی آواز سن لیتا ہے۔ کبھی ہونٹوں کے اشارہ یا کنایہ سے سمجھ جاتا ہے لیکن پشت پھیرے ہو تو بالکل نہیں سمجھتا۔

آیت کا حاصل مطلب یہ ہے کہ کافر انتہائی طور پر دعوت سے کتراتے اور بے رخی اختیار کئے ہوئے ہیں اسی لئے مُردوں کی طرح ہیں جن کو سنانے کا کوئی راستہ نہیں یا پشت پھیرے ہوئے بہروں کی طرح ہیں جن کو سنانا ممکن نہیں۔

وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِى الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝
اور نہ آپ اندھوں کو ان کی گمراہی سے (نکال کر) سیدھا راستہ دکھانے والے ہیں آپ تو صرف انہی لوگوں کو سنا سکتے ہیں جو ہماری آیات کا یقین رکھتے ہیں پھر وہ مانتے (بھی) ہیں۔

یعنی اللہ نے جس کے دل کو اندھا کر دیا ہے ایمان کی راہ اس کو سوجھائی نہیں دیتی آپ اس کو ایمان کا راستہ نہیں دکھا سکتے آپ کا قرآن سنانا سوائے ان لوگوں کے کسی کو فائدہ نہیں دے سکتا جو ہماری آیات پر ایمان رکھنے والے ہیں یعنی ایمان لانا ہم نے ان کے لئے مقدر کر دیا ہے پس وہ ہی مسلم ہوتے ہیں یعنی اپنا رخ خلوص کے ساتھ اللہ کی طرف کر دیتے ہیں۔

وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اور جب (اللہ کا) قول یعنی عذاب اور دوبارہ قبروں سے اٹھنے کا وقت (قریب) آ جائے گا۔

اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تو ہم زمین سے ایک چوپایہ ان کے لئے برآمد کر دیں گے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا وہ دابہ ایسا دابہ نہ ہوگا جس کی دم ہو بلکہ داڑھی والا دابہ ہوگا آپ کا اس کلام سے اس طرف اشارہ ہے کہ وہ آدمی ہوگا (چوپایہ نہ ہوگا) لیکن اکثر اہل تفسیر کا قول ہے کہ وہ چوپایہ ہی ہوگا۔ عبد بن حمید نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ وہ ایک اون اور ہر رنگ کے پروں والا ہوگا اس کی چار ٹانگیں ہوں گی۔ پھر وہ حاجیوں کے پیچھے سے برآمد ہوگا۔ ابن جریر کی روایت ہے کہ ابوالزبیر نے دَآبَّةُ الْاَرْض کے حالات اس طرح بیان کئے اس کا سر بیل کا (جیسا) سر ہوگا، اس کی آنکھیں خنزیر کی آنکھوں (کی طرح) ہوں گی، اس کے کان ہاتھی کے کان (جیسے) ہوں گے، اس کے سینگ بارہ سینگھے کے سینگوں (کی مانند) ہوں گے، اس کا سینہ شیر کا سینہ ہوگا اس کا رنگ چیتے کا رنگ ہوگا، اس کی کوکھیں بلی کی کوکھوں کی طرح ہوں گی، اس کی دم مینڈھے کی دم کی طرح ہوگی، اس کی ٹانگیں اونٹ کی ٹانگوں (کی مثل) ہوں گی۔ ہر دو جوڑوں کے درمیان بارہ ہاتھ کا فاصلہ ہوتا ہے، اس کے پاس موسیٰ کی لاٹھی اور سلیمان کی انگشتری ہوگی، ہر مومن کے سجدہ کے مقام (پیشانی یا ناک) پر لاٹھی کی نوک سے نشان بنا دے گا جس سے اس کا چہرہ جگمگا جائے گا اور سلیمان کی انگوٹھی سے ہر کافر کے چہرہ کو نشان زد کر دے گا جس سے اس کا چہرہ کالا ہو جائے گا (یہ نشان اتنے نمایاں ہوں گے کہ) بازاروں میں لوگ خرید و

فروخت کرتے وقت (کافر و مومن کی شناخت کرلیں گے اور) کہیں گے اے کافر یہ چیز کتنے کی ہے۔ اے مومن اس کی کیا قیمت ہے۔ پھر دابہ لوگوں سے کہے گا اے فلاں تو جنتی ہے، اے فلاں تو دوزخی ہے، یہی معنی ہے آیت وَإِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ أَخْرَجْنَا لَهُمْ دَابَّةً مِّنَ الْأَرْضِ۔ بغوی نے حضرت ابن عمر کا قول نقل کیا ہے کہ دابۃ الارض کوہ صفا کے ایک شگاف سے برآمد ہوگا۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس نے احرام کی حالت میں صفا کو لاٹھی سے ٹھوکا اور فرمایا دابہ میری لاٹھی کے ٹھوکے کو سن رہا ہے۔ حضرت ابن عمر نے فرمایا دابہ ایک گھاٹی سے برآمد ہوگا اس کا سر بادل کو چھوئے گا اور اس کی ٹانگیں زمین کے اندر ہوں گی باہر نکل بھی نہ ہوں گی وہ نماز پڑھتے آدمی کی طرف سے گزرے گا اور کہے گا نماز کی تجھے کیا ضرورت پھر اس (کے ماتھے یا ناک پر) نشان بنا دے گا۔

بغوی نے حضرت ابو شریحہ انصاری کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پوری مدت میں تین بار دابہ کا خروج ہوگا۔ ایک بار یمن سے برآمد ہوگا جس کی شہرت بادیہ (صحراء) میں پھیل جائے گی۔ اور قریہ یعنی مکہ میں بھی اس کا تذکرہ پہنچ جائے گا۔ پھر ایک روز سب سے بڑی عزت و عظمت والی مسجد یعنی مسجد حرام میں لوگ جمع ہوں گے کہ دابہ دکھائی دے گا۔ عمرو (راوی) نے کہا رکن اسود سے باب بنی مخزوم تک درمیان میں دکھائی دے گا اور مسجد کے ہر گوشہ میں موجود لوگوں کو دیکھے گا لوگ اس کو دیکھ کر بکھر جائیں گے لیکن ایک جماعت اس کے سامنے بھی رہے گی وہ سمجھ لیں گے کہ اللہ نے چھوٹ کر دہ نہیں جا نہیں سکتے دابہ اپنے سر سے مٹی جھاڑتا ہوا ان کی طرف گزرے گا اور ان کے چہروں کو (نشان زد کرکے) ایسا روشن کر دے گا جیسے چمکدار ستارے، پھر زمین کو پھاڑتا ہوا چلا جائے گا (اتنی تیزی کے ساتھ) کہ اس کو پکڑنے والا پا نہ سکے گا اور اس سے بھاگنے والا چھوٹ نہ سکے گا، پھر کچھ لوگ اٹھ کر نماز پڑھنے لگیں گے تو (تیسری بار) وہ پیچھے سے آپڑے گا اور کہے گا اے فلاں تو اب نماز پڑھ رہا ہے، پھر نمازی کے سامنے آکر اس کے چہرہ پر نشان بنا دے گا، پھر لوگ وہاں سے ہٹ کر اپنے گھروں کو چلے جائیں گے اور ساتھ ساتھ مل کر سفر کریں گے اور باہم باتوں میں شرکت کریں گے اور کافر کا مومن سے امتیاز ہو جائے گا مومن کو مومن کہہ کر پکارا جائے گا اور کافر کو کافر کہہ کر۔

حضرت حذیفہ بن یمان کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے دابہ کا تذکرہ آیا تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ وہ کہاں سے برآمد ہوگا۔ فرمایا سب سے بڑھ کر حرمت والی مسجد سے اس وقت عیسیٰ طواف کر رہے ہوں گے مسلمان آپ کے ساتھ ہوں گے کہ قندیل کی حرکت کی طرح ان کے قدموں کے نیچے زمین میں لرزہ پیدا ہوگا اور مشرقی جانب کوہ صفا پھٹ کر اس سے دابہ برآمد ہو جائے گا سب سے پہلے اس کا سر نکلے گا۔ اس پر اون اور پر ہوں گے کوئی پکڑنے والا اس تک پہنچ نہ سکے گا اور نہ بھاگنے والا اس سے چھوٹ سکے گا۔ وہ لوگوں پر مومن و کافر کا نشان بنا دے گا۔ مومن کا چہرہ چمکدار ستارہ کی طرح روشن ہو جائے گا اس کی دونوں آنکھوں کے بیچ میں کافر لکھا ہوگا رواہ البغوی وکذا اخرج ابن جریر بغوی نے سہل بن صالح کے والد کی روایت سے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دو یا تین بار فرمایا جناد کی گھاٹی بری گھاٹی ہے۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ ایسا کیوں ہے؟ فرمایا اس سے دابہ برآمد ہوگا اور تین چیخیں مارے گا جن کو مشرق و مغرب کے درمیان سب سنیں گے اس کا چہرہ مرد کا چہرہ ہوگا اور (باقی) جسمانی بناوٹ پرندے کی ہوگی اور جو اس کو دیکھے گا اس سے وہ کہے گا کہ اہل مکہ محمد ﷺ اور قرآن پر یقین نہیں رکھتے تھے۔

تُكَلِّمُهُمْ وہ دابہ لوگوں سے کہے گا۔ سدی نے کہا وہ کہے گا کہ سوائے اسلام کے سب مذاہب باطل ہیں۔ بعض نے کہا اس کا کلام یہ ہوگا کہ ایک کے متعلق کہے گا یہ مومن ہے اور دوسرے کے متعلق کہے گا یہ کافر ہے جیسا کہ احادیث میں آیا ہے۔ بعض نے کہا اس کا کلام وہ ہے جو اگلی آیت میں مذکور ہے۔

أَنَّ النَّاسَ كَانُوا بِآيَاتِنَا لَا يُوقِنُونَ ۝ کہ (کافر) لوگ ہماری آیات پر یقین نہیں لاتے تھے۔

مقاتل نے کہا وہ عربی میں کلام کرے گا اور اللہ کی طرف سے کہے گا۔ اَنَّ النَّاسَ کَانُوْا بِاٰیٰتِنَا لَا یُوْقِنُوْنَ۔ وہ لوگوں کو خبر دے گا کہ اہل مکہ قرآن اور قیامت پر ایمان نہیں لائے۔ (اَنَّ بفتح ہمزہ کوفی قرأت ہے۔ مقاتل کا قول بھی اس پر مبنی ہے اور جن لوگوں نے اس کو دابہ کا مقولہ قرار دیا ہے وہ بھی اَنَّ النَّاسَ پڑھتے ہیں) اور اِنَّ بالکسر جمہور کی قرأت ہے اس قرأت پر یہ کلام استینافیہ ہوگا اور مطلب یہ ہوگا کہ خروج دابہ سے پہلے لوگ ہماری آیات پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ بعض اہل علم نے کہا کہ آیات سے مراد ہیں خروج دابہ اور دوسری علامات قیامت و احوال قیامت۔ یہ سب آیاتُ اللہ ہیں۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا یعنی خروج دابہ اس وقت ہوگا جب بھلائی کا حکم اور برائی کی ممانعت نہ کی جائے گی۔

شیخ جلال الدین محلی نے لکھا ہے کہ خروج دابہ سے معروف کا حکم اور منکر سے باز داشت (کا زمانہ) ختم ہو جائے گا اس کے بعد کوئی کافر ایمان نہیں لائے گا (ویسی ہی حالت پیدا ہو جائے گی) جیسی اللہ نے حضرت نوحؑ کے پاس وحی بھیجی تھی کہ جو ایمان لا چکا لا چکا آئندہ تمہاری قوم میں سے کوئی شخص ایمان نہیں لائے گا۔ میں کہتا ہوں اس مضمون کا استنباط مختلف احادیث و آثار سے ہوتا ہے۔

فصل: حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا چھ چیزوں سے پہلے اعمال کر لو۔ الدُّخَانَ وَالدَّجَّالَ وَدَابَّۃَ الْاَرْضِ وَطُلُوْعَ الشَّمْسِ مِنْ مَّغْرِبِہَا وَاَمْرَ الْعَامَّۃِ وَخُوَیْصَّۃَ اَحَدِکُمْ۔ رواہ مسلم۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ کا بیان ہے میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ سب سے پہلے نشان جو نمودار ہوگا وہ مغرب سے طلوع آفتاب اور دن چڑھے لوگوں کے سامنے دابۃ الارض کا خروج ہوگا۔ ان میں سے جو واقعہ بھی پہلے ہوگا دوسرا اس کے بعد قریب ہی ہو جائے گا۔ رواہ مسلم۔ حضرت حذیفہ بن اسد غفاری راوی ہیں ہم باہم کچھ تذکرہ کر رہے تھے کہ اچانک رسول اللہ ﷺ بر آمد ہوئے اور فرمایا کیا تذکرہ کر رہے ہو؟ لوگوں نے کہا قیامت کا ذکر کر رہے ہیں فرمایا قیامت اس وقت تک بپا نہ ہوگی جب تک اس سے پہلے تم دس نشانیاں نہ دیکھ لو گے پھر آپ نے وہ نشانیاں بتائیں اور فرمایا۔ دھواں (آسمان پر چھایا ہوا) دجال، دابۃ الارض۔ مغرب سے آفتاب کا طلوع عیسیٰؑ بن مریم کا نزول، یاجوج، تین جگہ زمین کا دھنسایا جانا ایک مشرق میں ایک مغرب میں ایک جزیرۃ العرب میں اور آخر میں ایک آگ یمن سے نکلے گی جو لوگوں کو میدان حشر کی طرف ہنکا کر لے جائے گی۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ ایک آگ قعر عدن سے نکلے گی۔ ایک اور روایت دسویں علامت کی جگہ فرمایا ہے ایک آندھی لوگوں کو سمندر میں پھینک دے گی۔ رواہ مسلم۔

حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دابہ بر آمد ہوگا اس کے پاس موسیٰؑ کا عصا اور سلیمانؑ کی انگشتری ہوگی، مومن کے چہرہ کو لاٹھی کے نشان سے چمکدار بنا دے گا اور کافر کی ناک پر انگشتری کا نشان بنا دے گا یہاں تک کہ لوگ جمع ہوں گے تو ایک دوسرے کو کہے گا اے مومن اور دوسرا کہے گا اے کافر۔ رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ والحاکم وصححہ۔

حضرت ابو امامہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دابہ بر آمد ہوگا اور لوگوں کی ناکوں پر نشان لگا دے گا اس کے بعد بھی لوگ (مدت تک) زندہ رہیں گے یہاں تک کہ بعض لوگ جانور خرید کر لائیں گے تو ان سے دریافت کیا جائے گا تم نے یہ جانور کس سے خریدا وہ جواب دیں گے فلاں ناک داغے آدمی سے۔ رواہ احمد۔ حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جمعہ کی رات کو دابہ بر آمد ہوگا لوگ منیٰ کی طرف جا رہے ہوں گے۔ ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے حسن کا بیان نقل کیا ہے موسیٰؑ نے اپنے رب سے خواہش کی کہ مجھے دابۃ الارض دکھا دیا جائے (اللہ نے دعا قبول فرمائی اور) چنانچہ دابہ تین دن رات (برابر) لگاتار فضا میں جاتا رہا اور اس کا کوئی کنارہ نظر نہ آتا تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے ہیبت ناک منظر دیکھ کر درخواست کی اے میرے رب اس کو لوٹا دے اللہ نے اس کو لوٹا دیا۔

میں کہتا ہوں احادیث دلالت کر رہی ہیں کہ دابۃ الارض سچے مومنوں کو ان منافقوں سے الگ کر دے گا جو زبان سے مومن اور دل سے کافر ہوں گے اور کفر سے مراد ہے اس اسلام کی ضد جو (صرف زبانی ہوتا ہے لیکن زبان سے اسلام کا اقرار

کرنے والوں کے) دلوں میں نہیں ہوتا بلکہ ایسے لوگوں کے دل اس دین کی تصدیق نہیں کرتے جو رسول اللہ ﷺ کا لایا ہوا ہے، اس اسلام کو مجازی اسلام کہا جاتا ہے یا کفر سے مراد ہے اس حقیقی اسلام کی ضد جس کے دعوی دار دلوں میں بھی ایمان رکھتے اور زبان سے بھی تصدیق کرتے ہیں لیکن اطمینان قلب اور ایمان نفس کے درجہ پر فائز نہیں ہوتے۔ اگر کفر سے موخر الذکر معنی مراد ہو تو وہ جو بعض لوگوں سے کہے گا کہ فلاں تو دوزخیوں میں سے ہے اس سے مراد یہ ہوگی کہ تو دوزخ میں ضرور جائے گا یہ مطلب نہ ہوگا کہ تو ہمیشہ دوزخ میں رہے گا۔

کفر سے مراد علانیہ کفر کا اقرار نہیں ہو سکتا کیونکہ فتح کے بعد مکہ کے اندر علانیہ کفر کا دعویدار کوئی باقی نہیں رہا (نہ آئندہ ہوگا) پھر مومنوں سے تمیز کر دینے کا کوئی معنی نہیں۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ۝ اور یاد کرو اس دن کو جب ہم ہر امت میں سے ان لوگوں کا ایک گروہ جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی ہے جمع کریں گے پھر وہ (سب تکذیب کرنے والے ایک جگہ جمع کر کے) روکے جائیں گے۔

فَوْج جماعت گروہ اُمَّت اس جگہ بمعنی قرن (یعنی ہر پیغمبر کی امت جو اس پیغمبر کے دور نبوت کی ہو) یہ وہ وقت ہوگا جب اللہ حضرت آدم کو حکم دے گا اپنی نسل میں سے دوزخ کا حصہ بھیجو۔ سورۂ حج کے شروع میں یہ حدیث گزر چکی ہے۔

یُوْزَعُوْنَ روکے جائیں گے یعنی اولین و آخرین سب کو ایک جگہ روکا جائے گا تاکہ سب جمع ہو جائیں گے۔ بیضاوی نے لکھا ہے کہ روکے جانے کا مطلب یہ ہے کہ ان کی تعداد بہت ہوگی اور ان کے کنارے بہت دور دور ہوں گے۔

حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْ یہاں تک کہ جب وہ (سب محشر کی طرف) آجائیں گے۔

قَالَ اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِيْ وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا اَمَّاذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ اللہ فرمائے گا کیا تم نے میری آیات کو ایسی حالت میں جھٹلایا تھا کہ ان کا پورا علم بھی تم نے حاصل نہیں کیا تھا (اگر نہیں جھٹلایا تھا اور ان کی تصدیق کی تھی تو بتاؤ) عمل کیا کرتے تھے۔

یعنی کیا تم نے یونہی سطحی طور پر رائے قائم کر لی تھی اور آیات کی حقیقت پر غور نہیں کیا تھا کہ تم کو ان کی حقیقت معلوم ہو جاتی اور تم ان کا علمی احاطہ کر لیتے۔ یا یہ مطلب ہے کہ تم نے میری آیات کی تکذیب کر دی اور یہ پورے طور پر نہیں جانا کہ آیات مستحق تصدیق ہیں یا سزاوار تکذیب۔ استفہام زجری ہے۔ اَمَّاذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ یہ بھی زجر و توبیخ ہے۔ کچھ کلام اس جگہ محذوف ہے، اصل کلام اس طرح تھا کیا تم نے تکذیب نہیں کی اگر نہیں کی تو بتاؤ پھر سوائے تکذیب کے اور کیا عمل کرتے تھے اور چونکہ جاہلانہ تکذیب کے علاوہ انہوں نے اور کچھ کیا نہ ہوگا اس لئے کہہ نہ سکو گے کہ ہم نے تکذیب نہیں کی بلکہ یہ کام کیا۔

وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ ۝ اور قول (یعنی عذاب موعود کا قول) ان پر ان کے ظلم کرنے (یعنی تکذیب آیات کرنے) کی وجہ سے واجب ہو جائے گا اس لئے وہ (کوئی کلمہ معذرت) نہیں بولیں گے۔

کیونکہ ان کے پاس تکذیب کرنے کا کوئی عذر ہی نہ ہوگا یا اس وجہ سے کہ ان کو بولنے کی اجازت نہیں ملے گی کہ کچھ عذر پیش کر سکیں۔ بعض نے کہا نہ بولنے کی وجہ یہ ہوگی کہ ان کے مونہوں پر مہریں لگی ہوں گی۔ بعض نے کہا وہ عذاب میں ایسے گرفتار ہوں گے کہ ان کو بولنے کا ہوش ہی نہ ہوگا اول توجیہ زیادہ صحیح ہے۔ اسی پر اگلی آیت دلالت کر رہی ہے۔

اَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا الَّيْلَ لِيَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے رات بنائی تاکہ لوگ اس میں آرام کریں اور دن بنایا جس میں دیکھیں، بے شک و شبہ اس میں بڑی دلیلیں ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں۔

یعنی جب وہ دلائل جو موجب ایمان تھیں انہوں نے دیکھ لیں تو پھر معذرت کیا پیش کر سکیں گے۔ اَلَمْ يَرَوْا میں استفہام انکاری اور انکار نفی اثبات ہوتا ہے (عدم کا عدم مرادف وجود ہے۔ مترجم) اس لئے اَلَمْ يَرَوْا کا مطلب ہوا انہوں نے

دیکھ لیا۔ جَعَلْنَا ہم نے پیدا کیا (اس جگہ جَعَلَ بمعنی خَلَقَ ہے) لِيَسْكُنُوا فِيهِ یعنی سوئیں اور حرکت چھوڑ کر قرار پکڑیں۔ مُبْصِرًا دن تمہیں دکھاتا آدمی دن میں دیکھتے ہیں ابصار کی قوت کو ظاہر کرنے کے لئے دن کو ہی مبصر قرار دیا أَلَمْ يَرَوْا میں رؤیت (دیکھنا) بمعنی علم ہے یعنی کیا یہ نہیں جانتے کہ خاص طریقہ سے مفید طور پر معاش و معاد کے مصالح کے مطابق روشنی اور تاریکی کا توارد و تعاقب اللہ نے کر دیا ہے ان کا اس طور پر تعاقب دلالت کر رہا ہے کہ ان کا فاعل خالق، حکیم اور قادر قاہر ہے اور ظاہر ہے کہ جو شب و روز کے تعاقب پر قدرت رکھتا ہے وہ پیغمبروں کو اللہ کی عبادت کی دعوت دینے کے لئے بھیج سکتا ہے اور فرمانبرداری و نافرمانی کی جزا سزا دینے کی بھی اس کو قدرت ہے اور موت کے بعد زندگی بھی لا سکتا ہے جیسا کہ وہ نور ظلمت اور بیداری و خواب کا تبادلہ کرتا رہتا ہے اور پیغمبروں کے معجزات سے پیغمبروں کی اور ان کی لائی ہوئی تعلیم کی صداقت ثابت ہو رہی ہے ان تمام امور مذکورہ میں اللہ کی توحید اور رسول سے صادق ہونے کی کھلی ہوئی نشانیاں ہیں تکذیب کرنے والے کو ان دلائل کے بعد کون سا عذر ہو سکتا ہے لیکن ان دلائل و آیات کا فائدہ انہی لوگوں کو پہنچتا ہے جو ایمان رکھتے ہیں۔

أَلَمْ يَرَوْا سے آخر تک حشر کی دلیل ہے ظلمت کو نور سے اور خواب کو بیداری سے بدلنا دلالت کر رہا ہے کہ جو قادر یہ تبادلہ کرتا ہے وہ موت کے بعد دوبارہ زندگی بھی لا سکتا ہے۔

وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ اور یاد کرو اس دن کو جب کہ صور کے اندر پھونک ماری جائے گی۔

حضرت ابن عمر راوی ہیں کہ ایک اعرابی نے رسول اللہ ﷺ سے صور کے متعلق دریافت کیا فرمایا وہ ایک سینگ ہے جس میں پھونکا جائے گا۔ رواہ ابوداؤد والترمذی وحسنہ والنسائی وابن حبان والحاکم حضرت ابن مسعود سے بھی اسی طرح کی حدیث مروی ہے۔ رواہ مسدد بسند صحیح۔

حضرت زید بن ارقم راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں کیسے چین پا سکتا ہوں سینگ (صور) والا تو سینگ منہ میں لئے پیشانی آگے کو جھکائے اور کان لگائے ہوئے ہے کہ کب اس کو (پھونکنے کا) حکم دیا جاتا ہے۔ صحابہ کو یہ فرمان سن کر بڑی دشواری ہوگی۔ (کہ جب رسول اللہ ﷺ کا یہ حال ہے کہ دل کو کسی وقت سکون میسر نہیں تو ہمارا کیا ٹھکانا ہے) فرمایا کہو حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ اللہ ہمارے لئے کافی ہے وہی اچھا مددگار ہے۔

احمد، حاکم، بیہقی اور طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے یہ حدیث اسی طرح بیان کی ہے اور ترمذی، حاکم اور بیہقی نے حضرت ابو سعیدؓ کی روایت سے بھی یونہی نقل کیا ہے اور ابو نعیم نے حضرت جابرؓ کی روایت سے بھی ایسا ہی بیان کیا ہے۔ سعید بن منصور اور بیہقی نے حضرت ابو سعید خدری کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جبرئیل اس کے یعنی اسرافیل کے دائیں جانب اور میکائیل بائیں جانب ہیں اور وہی صور والا ہے۔ قرطبی نے لکھا ہے تمام (پیغمبروں کی) امتوں کے علماء کا اتفاق ہے کہ اسرافیل ہی صور پھونکیں گے۔

فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَاءَ اللّٰهُ پس گھبرا جائیں گے وہ جو آسمانوں میں ہوں گے یعنی ملائکہ اور ارواح مومنین اور جو زمین میں ہیں یعنی انسان سوائے ان کے جن کو خدا نہ چاہے وہ نہیں گھبرائیں گے۔

یہ نفخۂ فزع یا نفخۂ صعق (نفخۂ بیہوشی یا نفخۂ موت) ہی ہوگا یا دونوں الگ الگ ہوں گے، علماء کے اس میں دو قول ہیں، بعض لوگوں کا خیال صور تین بار پھونکا جائے گا ایک نفخۂ فزع جس سے ساری مخلوق گھبرا جائے گی اور خوف زدہ ہو جائے گی دوسرا نفخۂ صعق جس کو سن کر لوگ بے ہوش ہو جائیں گے یعنی مر جائیں گے۔ تیسرا نفخۂ بعث جس سے لوگ زندہ ہو کر قبروں سے اٹھ کر کھڑے ہوں گے۔ اس آیت میں نفخۂ فزع کی صراحت ہے اور نفخۂ صعق و نفخۂ بعث کا ذکر آیت وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَاءَ اللّٰهُ ثُمَّ نُفِخَ فِيهِ أُخْرَىٰ فَإِذَا هُمْ قِيَامٌ يَنْظُرُونَ میں کیا گیا ہے۔ یہ قول ابن عربی کا ہے تینوں نفخات کا ذکر حضرت ابوہریرہ کی روایت کردہ طویل حدیث میں کیا ہے جس کو ہم عنقریب ذکر کریں گے۔

بعض علماء کا قول ہے کہ صرف دو نفخات ہوں گے نفخۂ فزع ہی نفخۂ صعق ہوگا ان لوگوں کا خیال ہے کہ نفخہ ایک ہی ہوگا جس میں دونوں حالتیں پیدا ہو جائیں گی اور یہ دونوں باہم لازم ملزوم ہوں گی، صور کی آواز سن کر پہلے گھبراہٹ پھر بے ہوشی اور موت ہو جائے گی۔ قرطبی نے اس قول کو صحیح قرار دیا ہے اور استدلال میں کہا ہے کہ نفخۂ فزع سے اس جگہ مَنْ شَآءَ اللّٰهُ کو مستثنیٰ کر لیا گیا ہے جس طرح کہ نفخۂ صعق سے مَنْ شَآءَ اللّٰهُ کو مستثنیٰ کیا گیا ہے دونوں کے متعلق اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ کہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں الگ الگ نفخات نہیں ہوں گے بلکہ ایک ہی نفخہ ہوگا (جس کو نفخۂ فزع بھی کہا گیا ہے اور نفخۂ صعق بھی)

میں کہتا ہوں یہ دلیل صحیح نہیں ہے اس سے دونوں نفخوں کا ایک ہونا ثابت نہیں ہوتا ہے شک مستثنیٰ منہ دونوں کلاموں میں ایک ہی ہے لیکن مَنْ شَآءَ اللّٰهُ کو دونوں جگہ مستثنیٰ کر لینے کا یہ معنی نہیں کہ دونوں مستثنیٰ ایک ہی ہیں۔

بغوی نے لکھا ہے مستثنیٰ کون لوگ ہوں گے اس کی تعیین میں علماء کے اقوال میں اختلاف ہے۔ حضرت ابوہریرہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے آیت اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ کی بابت دریافت کیا گیا تو حضور ﷺ نے فرمایا وہ شہداء ہوں گے کیونکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ موجود ہیں ان کو فزع لاحق نہ ہوگا۔ بغوی نے اس جگہ کلبی اور مقاتل کا قول نقل کیا ہے جس کا ذکر ہم آگے کریں گے، لیکن بغوی کے اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ مستثنیٰ دونوں جگہ ایک ہی ہے اور نفخۂ فزع اور نفخۂ صعق بھی الگ الگ نہیں۔ بلکہ ایک ہی ہیں اور ظاہر یہ ہے کہ دونوں نفخے الگ الگ ہوں گے۔ ذیل میں ان احادیث اور آثار کو ذکر کرتے ہیں جو استثناء کے متعلق ہیں۔

ابو یعلیٰ، بیہقی اور حاکم نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے ذکر کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے جبرئیل سے آیت وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ کے سلسلہ میں دریافت کیا کہ وہ کون ہیں جن کو اللہ بے ہوش کرنا (یا صور کی آواز سے مردہ کرنا) نہ چاہے گا، وہ شہداء ہوں گے جو تلواریں لٹکائے عرش کے گرداگرد ہیں۔ علماء نے استثناء شہداء کی بابت یہ وجہ بیان کی ہے کہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں۔ بغوی نے لکھا ہے بعض آثار میں آیا ہے کہ شہداء اللہ کے استثناء کردہ ہیں یعنی اللہ نے خود نفخۂ صور کے اثر سے ان کو مستثنیٰ کر دیا ہے کذا روی ہناد بن السری والبیہقی والنحاس فی معانی القرآن عن سعید بن جبیر۔

کلبی اور مقاتل نے جن کا اللہ نے استثناء کیا ہے وہ جبرئیل اور اسرافیل اور ملک الموت ہیں (انہیں کو مستثنیٰ کیا ہے) کیونکہ فریابی نے اپنی تفسیر میں حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آیت وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ سے اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ تک تلاوت کی، تو صحابہؓ نے دریافت کیا یا رسول اللہ ﷺ یہ کون لوگ ہیں؟ جن کا اللہ نے استثناء کیا ہے فرمایا جبرئیل و میکائیل فرشتہ موت، اسرافیل اور حاملین عرش۔ جب اللہ مخلوق (یعنی انسانوں) کی روحیں قبض کرے گا تو ملک الموت سے فرمائے گا اب کون باقی ہے۔ ملک الموت جواب دے گا اے مالک عظمت و عزت تو پاک ہے، بڑی خیر والا ہے، بزرگ و برتر ہے، جبرئیل اور میکائیل اور ملک الموت باقی ہیں۔ اللہ فرمائے گا میکائیل کی جان لے لے۔ ملک الموت میکائیل کی جان لے لے گا اور میکائیل بڑے پہاڑ کی طرح گر جائے گا۔ پھر اللہ فرمائے گا (اب) کون باقی رہا ملک الموت عرض کرے گا جبرئیل اور ملک الموت اللہ فرمائے گا اے موت کے فرشتے تو مر جا موت کا فرشتہ فوراً مر جائے گا۔ اللہ فرمائے گا جبرئیل اب کون باقی رہے گا جبرئیل تیری ذات کریم لاافانی اور جبرئیل میت فانی۔ اللہ فرمائے گا (موت تو تجھے بھی آنی ہے) مرے بغیر چارہ نہیں جبرئیل فوراً سجدہ میں گر جائے گا اپنے دونوں بازو پھڑ پھڑانے لگے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جبرئیل کی جسمانی ساخت کی میکائیل کی جسمانیت پر بیشی ایسی ہے جیسے بڑے پہاڑ کی بڑائی چھوٹے ٹیلہ پر۔ بیہقی نے آیت فَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ کے ذیل میں حضرت انس کی مرفوع روایت نقل کی ہے کہ جن کو اللہ نے مستثنیٰ کیا ہے ان میں سے تین اشخاص ہوں گے۔ جبرئیل اور میکائیل اور ملک الموت اللہ باوجودیکہ خوب جانتا ہوگا فرمائے گا اے ملک الموت کون باقی رہا ملک الموت عرض کرے گا تیری لافانی ذات کریم اور

تیرا بندہ جبرئیل اور میکائیل اور ملک الموت۔ اللہ فرمائے گا میکائیل کی جان لے لے، پھر فرمائے گا باوجودیکہ خوب واقف ہوگا (اب) کون باقی رہا ملک الموت عرض کرے گا تیری ذات کریم لافانی اور تیرا بندہ ملک الموت اور وہ بھی مرنے والا ہے اللہ فرمائے گا تو بھی مر جا (ملک الموت بھی مر جائے گا) پھر فرمائے گا میں نے ہی مخلوق کو شروع میں پیدا کیا تھا پھر میں ہی دوبارہ تخلیق کروں گا اب کہاں ہیں مغرور متکبر۔ کوئی بھی جواب نہیں دے گا۔ پھر اللہ پکار کر فرمائے گا آج حکومت کس کی ہے؟ کوئی بھی جواب دینے والا نہ ہوگا اللہ خود ہی فرمائے گا ایک غالب کل اللہ کی اس کے بعد (ملک الموت کو سب سے پہلے اٹھایا جائے گا اور) دوبارہ صور میں پھونک ماری جائے گی اور یکدم سب کھڑے ہو جائیں گے (اور ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوں گے)۔

بیہقی نے زید بن اسلم کا قول نقل کیا ہے کہ جن کو اللہ نے مستثنیٰ کیا ہے وہ بارہ ہیں جبرئیل، میکائیل اسرافیل، ملک الموت اور آٹھ حاملین عرش۔ بغوی نے لکھا ہے روایت میں آیا ہے کہ جبرئیل و میکائیل کی روح قبض کی جائے گی پھر حاملین عرش کی پھر اسرافیل کی روح پھر ملک الموت کی روح۔

بیہقی نے مقاتل کا قول نقل کیا ہے (اول) میکائیل کی روح قبض کی جائے گی، پھر جبرئیل کی روح، پھر اسرافیل کی روح، پھر ملک الموت کو بھی (مر جانے کا) حکم ہوگا وہ بھی مر جائے گا۔

ابو الشیخ نے کتاب العظمۃ میں وہب کا قول نقل کیا ہے کہ ان چاروں یعنی جبرئیل، میکائیل، اسرافیل اور ملک الموت کو اللہ نے سب سے پہلے پیدا کیا اور سب کے آخر میں ان کو وفات دے گا اور پھر سب سے پہلے ان کو زندہ کرے گا یہی ہیں اَلْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا (کاموں کا انتظام کرنے والے ملائکہ) اور اَلْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا (کاموں کو تقسیم کرنے والے ملائکہ) یعنی قرآن کی اس آیت میں یہی مراد ہیں۔ سیوطی نے لکھا استثناء کی ان تمام روایات میں کوئی تعارض نہیں ہے ان تمام روایات کو اس طرح جمع کیا جا سکتا ہے کہ یہ سب مستثنیٰ ہیں (چاروں ملائکہ بھی اور آٹھوں حاملین عرش بھی)۔

میں کہتا ہوں جتنی احادیث اور آثار آئی ہیں وہ نفخۂ صعق (نفخۂ موت) سے استثناء کے متعلق ہیں نفخۂ فزع سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ میرے نزدیک تحقیق سے جن لوگوں کا استثناء کیا گیا ہے ان سے مراد وہ نیکوکار مومن ہیں جن کا ذکر آیت مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَیْرٌ مِّنْهَا وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ یَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ اور آیت اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤى اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ لَا یَسْمَعُوْنَ حَسِیْسَهَا وَهُمْ فِیْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ لَا یَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ میں کیا گیا ہے۔ ان آیات میں صراحت ہے کہ جو لوگ دوزخ میں جائے بغیر جنت میں چلے جائیں گے ان پر نفخۂ فزع کے وقت گھبراہٹ طاری نہ ہوگی اور نفخۂ فزع کے وقت سوائے کافروں کے اور کوئی موجود ہی نہ ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت صرف شریروں پر برپا ہوگی۔ رواہ احمد و مسلم عن ابن مسعود۔ یہ بھی رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے قیامت اسی وقت قائم ہوگی جب زمین پر اللہ اللہ کہنے والا ہی نہ ہوگا اور اللہ اللہ نہیں کہا جائے گا۔ رواہ احمد و مسلم والترمذی عن انسؓ

رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا قیامت برپا ہوگی یہاں تک کہ کعبہ کا حج نہیں کیا جائے گا (کوئی حج کرنے والا ہی نہ ہوگا اس وقت قیامت آئے گی) رواہ عبد الرزاق فی الجامع۔ یہ بھی حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ قیامت نہیں آئے گی یہاں تک کہ کعبہ اور قرآن اٹھا لیا جائے گا (اس وقت آئے گی) رواہ السجزی عن ابن عمر۔ اس مضمون کی اور احادیث بھی آئی ہیں۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ارواح شہداء کو مستثنیٰ قرار دیا کیونکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں باقی ملائکہ اور ارواح انبیاء بھی استثناء میں داخل ہیں وہ بھی بالکل گھبراہٹ سے مستثنیٰ ہوں گی۔

ابن جریر نے تفسیر میں طبرانی نے المطولات میں ابو یعلی نے مسند میں بیہقی نے البعث میں ابو موسیٰ مدینی نے المطولات میں علی بن معبد نے کتاب الطاعۃ والعصیان میں ابو الشیخ نے کتاب العظمۃ میں نیز عبد بن حمید نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کردہ ایک طویل حدیث نقل کی ہے جس میں ذکر کیا گیا ہے پھر تین بار صور پھونکا جائے گا۔ پہلا نفخہ فزع ہوگا اور دوسرا نفخۂ صعق اور تیسرا نفخۂ وہ ہوگا جس کے بعد سب رب العالمین کے سامنے کھڑے ہو جائیں گے اللہ اسرافیل کو پہلی بار صور

پھونکنے کا حکم دے گا اسرافیل پھونکے گا جس سے (سارے) اہل سموات وارض گھبرا جائیں گے (سخت خوف زدہ ہو جائیں گے) سوائے ان کے جن کو اللہ (محفوظ رکھنا) چاہے گا (وہ محفوظ رہیں گے) یہاں تک کہ حضور ﷺ نے فرمایا پھر دودھ پلانے والیاں اپنے شیر خوار بچوں کو بھول جائیں گی حاملہ عورتوں کے حمل ساقط ہو جائیں گے بچوں کے بال سفید ہو جائیں گے اور شیطان اڑے اڑے بھاگ کر زمین کے کناروں پر پہنچ جائیں گے، سامنے سے ملائکہ آکر ان کے منہ پر مار مار کر واپس لوٹا دیں گے لوگ پیٹھ پھیرے بھاگ رہے ہوں گے ایک دوسرے کو پکارے گا اللہ نے اسی دن کو یَوْمَ التَّنَادِ (پکار کا دن) فرمایا ہے اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ (قبروں کے اندر) اس بیرونی کیفیت سے بالکل بے خبر ہوں گے ان کو کچھ معلوم نہ ہوگا کہ اوپر کیا ہو رہا ہے، میں نے عرض کیا یارسول اللہ وہ کون لوگ ہیں جن کو اللہ نے مستثنیٰ کیا ہے اور فرمایا ہے الامن شاء اللہ فرمایا وہ شہداء ہوں گے (تمام) زندوں تک وہ خوف پہنچے گا (مگر شہیدوں تک نہیں پہنچے گا) اور وہ اپنے رب کے پاس زندگی کی حالت میں ہوں گے ان کو اللہ کی طرف سے روزی ملتی ہے اللہ ان کو اس روز کے خوف سے محفوظ رکھے گا اور اس گھبراہٹ سے وہ امن میں رہیں گے یہ عذاب انہی لوگوں پر قائم ہوگا جو اللہ کی مخلوق میں سب سے برے (یعنی کافر) ہوں گے اللہ نے فرمایا ہے۔ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ الخ اللہ جتنی مدت چاہے گا لوگ اسی حالت میں رہیں گے پھر نفخہ صعق کا حکم دے گا تو سارے آسمان و زمین والے مر جائیں گے سوائے ان کے جن کو اللہ (موت سے محفوظ رکھنا) چاہے۔ ملک الموت عرض کرے گا آسمان و زمین والے (سارے) مر گئے سوائے ان کے جن کو تو نے (محفوظ رکھنا) چاہا۔ اللہ فرمائے گا حالانکہ وہ خوب جانتا ہوگا اب کون باقی رہا پھر (بروایت ابوہریرہ) رسول اللہ ﷺ نے جبرئیل، میکائیل، ملک الموت اور حاملین عرش کے مرنے کا تذکرہ حضرت انس کی روایت کردہ حدیث کے مطابق کیا۔

ایک شبہ: آسمانوں میں تو کوئی شیطان نہیں اور یہ گھبراہٹ انہیں انس و جن کے شیطانوں پر طاری ہوگی جو اشرار خلق ہیں پھر فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ (آسمانوں والے گھبرا جائیں گے) کا کیا معنی ہے۔

ازالہ: میں کہتا ہوں شاید مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ کا ذکر مبنی بر فرض ہے (یعنی بالفرض اگر آسمانوں پر شیاطین ہوں گے تو وہ بھی خوف زدہ ہو جائیں گے) یا یوں کہا جائے کہ چوری چھپے فرشتوں کی کوئی بات سننے کے لئے کبھی شیاطین آسمان تک پہنچ جاتے ہیں۔ یا آسمانوں سے مراد بادل ہے لفظ سماء کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوتا ہے جو تمہارے اوپر ہو۔ اللہ نے فرمایا فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ اس کو چاہئے کہ چھت تک رسی تان لے یا یوں کہا جائے کہ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ سے مراد ہیں بعض مومنوں کی روحیں اور سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى سے مراد ہیں انبیاء اور مقربین بارگاہ الٰہی۔

نفخۃ الصعق سے مستثنیٰ کون ہوں گے اس بحث میں صحیح قول وہ ہے جو صاحب مفہم نے کہا ہے کہ لفظ صعق سے بطور عموم مجاز ایسا مفہوم مراد ہے جو موت کو بھی شامل ہے اور صرف بے ہوشی کو بھی۔ زندوں کے لئے موت اور مردوں کے لئے بے ہوشی ہو جائے گی یہ بے ہوشی تمام انبیاء کو (جو عالم برزخ میں موجود ہیں) ہوگی، البتہ حضرت موسیٰؑ کے لئے بے ہوش ہونے میں تردد ہے کوئی قطعی بات نہیں کہی جا سکتی۔ شیخین نے صحیحین میں اور ترمذی و ابن ماجہ نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے ذکر کیا ہے کہ ایک یہودی نے مدینہ کے بازار میں کہا قسم ہے اس کی جس نے موسیٰؑ کو تمام انسانوں پر فضیلت عطا کی یہ بات سن کر ایک انصاری نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور یہودی کے طمانچہ مارا اور کہا تو ایسی بات کہتا ہے حالانکہ ہم میں رسول اللہ ﷺ موجود ہیں۔ اس بات کا تذکرہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے کیا گیا تو ارشاد فرمایا اللہ نے فرمایا ہے۔ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ پس میں ہی سب سے پہلے اپنا سر اٹھاؤں گا تو اچانک دیکھوں گا کہ موسیٰؑ عرش کا ایک پایہ پکڑے ہوئے ہیں مجھے نہیں معلوم کہ مجھ سے پہلے انہوں نے اپنا سر اٹھا لیا (اور اٹھ کھڑے ہوئے) یا ان لوگوں میں سے تھے جن کو اللہ نے مستثنیٰ کر دیا ہے۔ جب لفظ صعق موت اور بیہوشی دونوں کو شامل ہے اور انبیاء پر (عالم برزخ میں) غشی طاری ہو جائے گی تو شہداء کا بیہوش ہونا بدرجہ اولیٰ ہوگا اور ملائکہ بھی بے ہوش ہوں

گے البتہ جبرئیل، میکائیل، اسرافیل، ملک الموت اور حاملین عرش کی موت صور پھونکنے کی آواز سے نہیں ہو گی بلکہ یہ ملائکہ بعد کو مریں گے جیسا کہ احادیث میں آچکا ہے۔

وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ ﴿۸۷﴾ اور سب کے سب اس کے سامنے دبے جھکے رہیں گے یعنی تمام آسمان و زمین والے نفخۂ بعث کے بعد موقف میں عاجزی کے ساتھ حاضر ہوں گے چونکہ یہ واقعہ آئندہ یقینی ہو گا۔ اس کی قطعیت ظاہر کرنے کے لئے اتوہ بصیغۂ ماضی فرمایا۔

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ؕ (اے دیکھنے والے) تو پہاڑوں کو دیکھ رہا ہے اور تو ان کو اپنی جگہ جما ہوا خیال کر رہا ہے (اور سمجھتا ہے کہ یہ جنبش نہیں کریں گے) حالانکہ وہ بادلوں کی طرح اڑے پھریں گے۔ (یہ ترجمہ مولانا اشرف علی صاحبؒ کے ترجمہ کے مطابق ہے لیکن حضرت مفسر کی تفسیر کے مطابق جو ترجمہ ہو گا وہ اس طرح ہو گا۔ مترجم)

اے دیکھنے والے تو (فزع کے وقت) پہاڑوں کو دیکھے گا خیال کرے گا کہ یہ اپنی جگہ کھڑے ہیں (متحرک نہیں ہیں) حالانکہ وہ بادلوں کی طرح (تیز رفتاری کے ساتھ) چلیں گے۔

پھر تیزی کے ساتھ چل کر زمین پر گر پڑیں گے اور زمین کے برابر ہو جائیں گے اس کی وجہ یہ ہے کہ بڑے بڑے جسم بھی اگر تیزی کے ساتھ ایک طرف کو حرکت کر رہے ہوں تو ان کی حرکت محسوس نہیں ہوتی۔

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ؕ اِنَّهٗ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۸۸﴾ یہ خدا کا کام ہو گا جس نے ہر چیز کو (مناسب انداز پر) مضبوط بنا رکھا ہے۔ یہ یقینی بات ہے کہ اللہ کو تمہارے سب افعال کی پوری خبر ہے۔ یعنی ہر شخص کو نافرمان ہو یا فرماں بردار اس کے عمل کے مطابق بدلہ دے گا اس کی تفصیل آئندہ آیات میں مذکور ہے۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ جو شخص نیکی لائے گا سو اس کو اس نیکی کے اجر سے بہتر ملے گا۔
ابو معشر نے کہا ابراہیم بلا استثناء قسم کھا کر کہتے تھے کہ اَلْحَسَنَةِ (سے مراد) لا الٰہ الا اللہ ہے۔ قتادہ نے کہا اخلاص (مراد) ہے۔ بعض علماء نے کہا ہر طاعت مراد ہے۔ خَيْرٌ تفضیل کے لئے نہیں ہے اور مِنْهَا میں مِنْ سببیہ ہے، لا الٰہ الا اللہ سے بہتر کوئی چیز ہو ہی نہیں سکتی اس لئے تفضیل اضافی مراد نہیں ہے بلکہ واقعی بہتری یعنی ثواب کا حصول اور عذاب سے امن مراد ہے جو حسنہ کے سبب سے حاصل ہو گا۔ محمد بن کعب اور عبدالرحمٰن بن زید نے کہا مِنْ تفضیلیہ ہے (سببیہ نہیں ہے) اور اس سے مراد ہے دس گنا سے سات سو گنا تک ثواب اور اس سے آگے جتنا اللہ چاہے اس کی نظیر دوسری آیت ہے فرمایا ہے مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا۔

وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ ﴿۸۹﴾ یعنی (صور پھونکے جانے کے) دن کے خوف سے وہ لوگ مامون ہوں گے یعنی کسی طرح کی گھبراہٹ اور کسی قسم کا خوف ان کو نہ ہو گا۔ فزع میں تنوین تنکیر مفید استغراق ہے کیونکہ اٰمِنُوْنَ کا معنی ہے لَا يَخَافُوْنَ اور مِنْ فَزَعٍ کا تعلق اٰمِنُوْنَ سے ہے اور نکرہ جب احاطۂ نفی میں آتا ہے تو مفید استغراق ہو جاتا ہے (یعنی نفی کا عموم ہو جاتا ہے)

وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ ؕ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۰﴾
اور جو شخص بدی (یعنی شرک) لے کر آئے گا سو ان کو اوندھے منہ آگ میں ڈال دیا جائے گا (اور ان سے کہا جائے گا کہ) تم کو انہی اعمال کی سزا دی جا رہی ہے جو تم کیا کرتے تھے۔
اَلسَّيِّئَةِ سے مراد ہے شرک۔ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ یعنی ان کو اوندھے منہ آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ وَجْهٌ سے مراد پوری شخصیت ہے۔ هَلْ تُجْزَوْنَ یعنی اعمال کے مطابق سزا دی جائے گی اور شرک سے بڑھ کر کوئی جرم نہیں اور جہنم سب سزاؤں سے بڑھ کر عذاب ہے اس لئے جرم شرک کے مطابق جہنم میں ان کو ڈالا جائے گا۔

اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِيْ حَرَّمَهَا وَلَهٗ كُلُّ شَيْءٍ وَّاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۹۱﴾ مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں اس (اللہ) کی عبادت کروں جو (خاص طور پر) اس شہر کا مالک حقیقی ہے جس نے اس کو محترم بنایا ہے (ویسے تو عام طور پر) ہر چیز اسی کی ہے اور مجھے یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ میں (اسی کا) فرمانبردار رہوں۔

هٰذِهِ الْبَلْدَةِ یعنی مکہ۔ رب کی هٰذِهِ الْبَلْدَةِ کی طرف اضافت شہر کی عزت ظاہر کرنے اور اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ہے کہ اس کے اندر کعبہ ہے جو تجلیات الٰہیہ کی پرتوافگنی کا خصوصی مقام ہے۔

الَّذِيْ حَرَّمَهَا یعنی وہ رب ایسا ہے کہ اس نے اس شہر کو حرم بنادیا، یہ مکمل مقام امن ہے یہاں کسی پر ظلم نہیں کیا جاتا نہ کسی کا خون بہایا جاتا ہے، نہ کسی کو لوٹا جاتا ہے، نہ یہاں کے شکار کو بھڑکا کر نکالا جاتا ہے، نہ یہاں کے درخت اور گھاس کاٹنے کی اجازت ہے۔ حقیقت میں اللہ کی اس صفت کا ذکر کر کے قریش کو اللہ کے احسان کی یاد دلائی گئی ہے کہ اس نے ان تمام فتنوں فسادوں اور بدامنیوں سے تمہارے مسکن کو محفوظ رکھا ہے جو سارے عرب میں پھیلے ہوئے ہیں۔

لَهٗ كُلُّ شَيْءٍ یعنی ہر چیز اسی کی مخلوق و مملوک ہے اس شہر کا بھی مالک حقیقی وہی ہے۔ اَلْمُسْلِمِيْنَ یعنی فرمانبردار مطیع حکم ہو جاؤں یا ملت اسلام پر قائم رہوں (پہلا معنی لغوی ہے دوسرا معنی اصطلاحی)

وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ ۚ اور (مجھے یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ) میں قرآن پڑھ کر سناؤں۔

اَتْلُوَا تلاوت سے ہے یعنی تبلیغ و دعوت کی غرض سے پڑھ کر سناؤں یا تِلْوٌ سے مشتق ہے اور تِلْوٌ کا معنی (پیچھے پیچھے چلنا) اتباع کرنا یعنی اس قرآن کی پیروی کروں (اس کے راستہ پر چلوں) بیضاوی نے لکھا ہے کہ اللہ نے اول مبدء و معاد و قیامت کے احوال لوگوں کے لئے بیان فرما دیئے اس کے بعد اپنے رسول کو حکم دیا کہ آپ ان کو یہی بات سنا دیجئے اب رسول اللہ کے ذمہ تبلیغ و دعوت کا فریضہ تو باقی نہیں صرف یہی کام رہ گیا کہ اپنے رب کی عبادت میں مستغرق ہو جائیں اور ہر وقت اسی کی یاد میں لگے رہیں، اِنَّمَآ اُمِرْتُ سے پہلے قُلْ محذوف یعنی آپ کہہ دیجئے کہ مجھے عبادت کرنے اور اطاعت پر قائم رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔

فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿۹۲﴾ سو جو سیدھے راستہ پر چلے گا وہ اپنے لئے چلے گا اور جو راہ راست سے بھٹکے گا تو آپ کہہ دیجئے (میرا کچھ ضرر نہ ہوگا) میں صرف ڈرانے والا ہوں یعنی کسی کو ہدایت یاب بنانے کا ذمہ دار میں نہیں کسی کی گمراہی کا وبال مجھ پر نہیں پڑے گا میرا کام صرف پہنچا دینا ہے کسی کے ہدایت یاب نہ ہونے اور راہ راست پر نہ چلنے کی بازپرس مجھ سے نہیں ہوگی اور آپ یہ بھی کہہ دیجئے کہ سب خوبیاں اللہ ہی کے لئے ہیں وہ عنقریب تم کو اپنی نشانیاں دکھا دے گا اس وقت تم ان کو پہچان لوگے اور آپ کا رب تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو۔

فَمَنِ اهْتَدٰى یعنی آپ کی دعوت و تبلیغ سے جو شخص راہ یاب ہو جائے گا تو اس کا فائدہ خود اسی کو ہوگا آپ پر احسان جتانے کا اس کو حق نہیں اور جو راہ راست سے بھٹکے گا سیدھا راستہ کھو دے گا اور تبلیغ و دعوت کے بعد بھی راہ حق پر نہ چلے گا اس کا وبال اسی پر پڑے گا آپ کہہ دیجئے میرا کام صرف ڈرانا ہے تمہارا ذمہ دار نہیں آپ یہ کہہ دیجئے۔

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ اور اللہ نے جو نعمت نبوت سے مجھے سرفراز کیا اور جو تبلیغ و دعوت مجھ پر واجب تھی اس کو پورا کرنے کی مجھے توفیق عنایت کی اس پر اس کا شکر ہے وہ مستحق ستائش و ثنا ہے۔

سَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ عنقریب تم کو اللہ اپنی نشانیاں دکھا دے گا۔ نشانیوں سے مراد ہیں دنیا میں نمودار ہونے والی آیات قدرت جو رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی آیات صداقت ہیں جیسے بدر کی لڑائی میں کافروں کا مارا جانا قید ہونا، فرشتوں کا نازل ہو کر مسلمانوں کی مدد کرنا اور کافروں کے چہروں کو زخمی کرنا اور پشت پر ضربیں لگانا، چاند کا پھٹنا، کنکریوں کا تسبیح پڑھنا اور آخر زمانہ میں دابۃ الارض کا برآمد ہونا۔ انہی آیات کی طرف اشارہ ایک اور آیت میں آیا ہے فرمایا ہے سَاُرِيْكُمْ اٰيٰتِيْ

فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ یا آیات سے مراد ہیں آخرت میں نمودار ہونے والی نشانیاں (یعنی واقعات قیامت) دوسری جگہ فرمایا ہے سَیُرِیْكُمْ اٰیٰتِهٖ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَفِیْ اَنْفُسِكُمْ ایک اور جگہ فرمایا ہے سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْ اَنْفُسِهِمْ۔

فَتَعْرِفُوْنَهَا ۔ اس وقت تم ان آیات کو پہچان لو گے لیکن اس وقت پہچاننے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾ اور (اے محمد ﷺ) آپ کا رب ان کے کسی عمل سے بے خبر نہیں ہے جو ع ۷
یہ کرتے رہتے ہیں یعنی اعمال کے مطابق ہر ایک کو بدلہ دے گا اور وقت مقرر پر دے گا۔

سورت النمل کی تفسیر (مظہری) ۲۲ر شعبان ۱۲۰۵ھ کو بحمد اللہ ختم ہوئی اس کے بعد انشاء اللہ سورۃ القصص کی تفسیر آئے گی۔

الحمد للہ کہ سورۃ نمل کی تفسیر مظہری کا ترجمہ اللہ کی توفیق سے

۲۶ر رمضان المبارک ۱۳۹۰ھ کو صبح پانچ بجے ختم ہوا۔

سورۃ القصص

سورۃ القصص مکی ہے صرف آیات اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْکِتٰبَ سے لَا نَبْتَغِی الْجٰهِلِیْنَ تک مدنی ہیں۔ اس سورت کی آیات اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ الخ مکہ و مدینہ کے درمیان راستہ میں نازل ہوئیں (جن کو محامدنی کہا جاتا ہے۔ مترجم) اس سورت میں کل ۸۸ آیات ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

طٰسٓمّٓ ۞ تِلْكَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ ۞ اَبَانَ (باب افعال جس سے مُبِیْن بنا ہے) لازم بھی ہے اور متعدی بھی۔ اول صورت میں کتاب کے مبین ہونے کے یہ معنی ہوں گے کہ اعجاز کی وجہ سے اس کتاب کا اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہونا ظاہر ہے۔ دوسری صورت میں مبین کا یہ معنی ہوگا کہ یہ کتاب احکام کو وعدہ وعید کو اور قصص وغیرہ کو کھول کر بیان کرنے والی ہے۔

نَتْلُوْا عَلَیْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰی وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ۞ ہم آپ کو موسیٰؑ اور فرعون کا کچھ حصہ ٹھیک ٹھیک پڑھ کر (یعنی نازل کر کے) سناتے ہیں ان لوگوں کے (فائدے) کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں۔

نَتْلُوْا ہم پڑھتے ہیں یعنی جبرئیل کی زبانی، مراد ہے نازل کرنا۔

مِنْ نَّبَاِ کچھ خبر، کچھ قصہ (مِنْ تبعیضیہ ہے)۔

بالحق یعنی سچائی کا حامل۔ لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ان لوگوں کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں کیونکہ انہیں کو اس سے فائدہ ہوگا (جو ایمان نہ رکھتا ہو اس کو اس کے سننے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ایمان والے کے ایمان میں پختگی اس کو سننے سے پیدا ہوتی ہے ایمان ہی نہ ہو تو استحکام ایمان کیسے ہوگا۔ مترجم)۔

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِیَعًا فرعون سرزمین (مصر) میں بہت بڑھ چڑھ گیا تھا اور اس نے وہاں کے باشندوں کو مختلف قسمیں بنا رکھا تھا۔

عَلَا یعنی مغرور متکبر اور جابر بن گیا تھا (مطلب یہ کہ بڑا اور عالی مرتبہ واقع میں تو نہ تھا، اونچا ہونے کا مدعی تھا مغرور ہو گیا تھا۔ مترجم)

اَلْاَرْضِ سے مراد ہے مصر کی سرزمین (یعنی اَلْاَرْضِ میں الف لام عہد خارجی کے لئے ہے جس سے مصر کی سرزمین کی طرف اشارہ ہے۔ مترجم)

شِیَعًا فرقے فرقے۔ کہ سب فرعون کے تابع تھے، فرعون جو کام لینا چاہتا تھا وہ کرتے تھے۔ یا ایک دوسرے کا پیرو اور تابع تھا۔ یا یہ مطلب کہ اس نے رعایا کے الگ الگ فرقے بنا رکھے تھے ایک گروہ یعنی قبطیوں کو اونچا بنا رکھا تھا اور دوسرے گروہ یعنی بنی اسرائیل کو نیچا۔ یا یہ مراد ہے کہ کام اور خدمت کے لئے اس نے لوگوں کے گروہ بنا دیئے تھے۔ ہر گروہ سے وہ کام لیتا تھا جو اس کے متعلق کر دیا تھا۔ یا یہ مطلب کہ فرعون نے مصر کے باشندوں میں پھوٹ پیدا کر دی تھی تاکہ متفق نہ ہو سکیں۔ قاموس میں ہے شیعۃ الرجل۔ کسی کے پیرو تابع اور مددگار اور جد افرقہ۔

یَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ یُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَیَسْتَحْیٖ نِسَآءَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ ۞ کہ ان میں سے ایک جماعت (یعنی بنی اسرائیل) کو کمزور کر رکھا تھا (اس حد تک کہ) ان کے بیٹوں کو ذبح کر دیتا تھا اور

ان کی عورتوں (یعنی لڑکیوں) کو زندہ رہنے دیتا تھا۔ واقعی وہ بڑا مفسد تھا۔

یُذَبِّحُ اَبۡنَآءَهُمۡ یعنی بنی اسرائیل کے (نومولود) بیٹوں کو قتل کرا دیتا تھا کیونکہ کسی کاہن نے اس سے کہہ دیا تھا کہ بنی اسرائیل کے گروہ میں ایک لڑکا پیدا ہوگا جس کے ہاتھوں سے تیری حکومت کا زوال ہو جائے گا۔ کذا اخرج عبد الرزاق وعبد بن حمید وابن المنذر عن قتادہ۔

وَیَسۡتَحۡیٖ نِسَآءَهُمۡ عورتوں سے مراد ہیں (نومولود) لڑکیاں۔ لڑکوں کو قتل کر دینے اور لڑکیوں کے زندہ چھوڑ دینے کو ضعیف بنانا اس لئے قرار دیا کہ بنی اسرائیل اس مصیبت کو دفع کرنے سے عاجز تھے دفاع کی طاقت نہیں رکھتے تھے (ورنہ لڑکیوں کو زندہ چھوڑ دینے کو ضعیف بنانا نہیں کہا جا سکتا)۔

کَانَ مِنَ الۡمُفۡسِدِیۡنَ وہ یقیناً خود ہی تباہ کار اور برباد کن تھا کہ نسل انبیاء کو فنا کرنے کی جرات کی اور بے قصور بچوں کو قتل کرنے لگا، خواہ کاہنوں نے سچ کہا ہو یا جھوٹ۔ بہرحال اگر وہ واقعی مفسد نہ ہوتا تو ایسا نہ کرتا۔ قتل اطفال سے اس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔

وَنُرِیۡدُ اَنۡ نَّمُنَّ عَلَی الَّذِیۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡا فِی الۡاَرۡضِ وَنَجۡعَلَهُمۡ اَئِمَّةً وَّنَجۡعَلَهُمُ الۡوٰرِثِیۡنَ ۝ وَنُمَکِّنَ لَهُمۡ فِی الۡاَرۡضِ

اور ہم کو منظور تھا کہ سرزمین مصر میں جن لوگوں کا زور گھٹایا جا رہا تھا ان پر احسان کریں اور ان کو پیشوا بنا دیں اور وارث کر دیں اور ان کو زمین میں حکومت عطا کریں۔

وَنُرِیۡدُ اَنۡ نَّمُنَّ عَلَی الَّذِیۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡا یعنی ہم چاہتے تھے کہ بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم اور دباؤ سے رہا کر دیں۔

اَئِمَّةً مجاہد کے نزدیک دینی پیشوا اور داعیان خیر مراد ہیں۔ قتادہ کے نزدیک والیان ملک اور بادشاہ مراد ہیں کیونکہ اللہ نے بنی اسرائیل کے متعلق ایک اور آیت میں فرمایا ہے۔ وَجَعَلَکُمۡ مُّلُوۡکًا۔

الۡوٰرِثِیۡنَ یعنی فرعون اور اس کی قوم کے ملک ومال کے مالک۔

وَنُمَکِّنَ لَهُمۡ فِی الۡاَرۡضِ یعنی سرزمین مصر وشام میں ان کو حکومت عطا کریں۔ تَمۡکِیۡن کا لغوی معنی ہے کسی چیز کی جگہ بنا دینا کہ اس میں وہ چیز ٹھہر جائے (لغت کے لحاظ سے نُمَکِّنَ لَهُمۡ کا ترجمہ ہوا ہم ان کو جماؤ عطا کر دیں) مجازاً تَمۡکِیۡن کا معنی ہے حاکم بنا دینا مسلط اور غالب کر دینا۔

وَنُرِیَ فِرۡعَوۡنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوۡدَهُمَا مِنۡهُمۡ مَّا کَانُوۡا یَحۡذَرُوۡنَ ۝

اور فرعون و ہامان اور ان کے تابعین کو وہ بات دکھا دی جس کا بنی اسرائیل کی طرف سے ان کو اندیشہ تھا (جس سے وہ بچاؤ کر رہے تھے)

حَذَر کا معنی ہے ضرر سے بچنا۔ فرعون اور اس کے ساتھیوں کو (نجومیوں سے) اطلاع ملی تھی کہ بنی اسرائیل میں سے ایک آدمی کے ہاتھوں سے ان کی تباہی ہوگی اس لئے ان کو بنی اسرائیل کی طرف سے اندیشہ لگا رہتا تھا لیکن اللہ ان کے سامنے وہی بات لے آیا جس سے وہ بچاؤ کرنا چاہتے تھے۔

وَاَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰۤی اُمِّ مُوۡسٰۤی اَنۡ اَرۡضِعِیۡهِ ۚ

اور (موسیٰؑ کے پیدا ہونے کے بعد) ہم نے موسیٰؑ کی ماں کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ موسیٰؑ کو اپنا دودھ پلا۔

بغوی نے بیان کیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی والدہ کا نام یوخابذ بنت لاوی تھا اور لاوی حضرت یعقوب کا بیٹا تھا۔ علماء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ یہ وحی نبوت والی وحی نہیں تھی کیونکہ کوئی عورت نبی نہیں ہوئی۔ قتادہ نے اس جگہ اَوۡحَیۡنَا کا ترجمہ کیا ہم نے اس کے دل میں ڈال دیا۔ صوفیہ کی اصطلاح میں اسی کو الہام کہتے ہیں، الہام ہی کی ایک قسم وہ سچا خواب بھی ہے جس سے دل کو یقین اور اطمینان ہو جائے۔ یہ آیت دلالت کر رہی ہے کہ الہام بھی علم کا ایک ذریعہ ہے اگرچہ اس سے علم ظنی (غیر یقینی) حاصل ہوتا ہے لیکن الہام قلبی اور القاء انہی دلوں کا قابل اعتبار ہوتا ہے جو پاک صاف اور حامل اطمینان ہوں۔ وسوسے اور الہام کا فرق ہی یہ ہے کہ وسوسہ (دل کا کھٹکا) موجب اطمینان نہیں ہوتا اور الہام سے اطمینان قلبی حاصل ہو جاتا ہے اور (صاحب الہام کو اپنی

تک) قلبی یقین ہو جاتا ہے۔

اَنْ اَرْضِعِيْهِ یعنی موسیٰؑ کی ماں کے دل میں یہ بات ڈال دی اور کہہ دیا کہ جب تک پوشیدہ رکھنا ممکن ہو موسیٰؑ کو دودھ پلاتی رہو۔

حضرت موسیٰؑ نے والدہ کا دودھ کتنی مدت پیا، علماء کے اقوال اس میں مختلف ہیں۔ کسی نے آٹھ ماہ کہا ہے۔ کسی نے چار ماہ کسی نے تین ماہ۔ موسیٰؑ کی والدہ موسیٰؑ کو گود میں لئے دودھ پلاتی رہتی تھیں اور وہ نہ روتے تھے نہ حرکت کرتے تھے۔ کذا ذکر البغوی۔

فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِى الْيَمِّ وَلَا تَخَافِىْ وَلَا تَحْزَنِىْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ پھر جب تجھے اس کی نسبت (جاسوسوں کے مطلع ہونے کا) اندیشہ (خطرہ) ہو جائے تو اس کو سمندر (یعنی نیل) میں ڈال دینا اور (اس کے ڈوب جانے کا) اندیشہ نہ کرنا، نہ (جدائی کا) کوئی غم کرنا، یقیناً ہم اس کو تیرے پاس واپس پہنچا دیں گے اور (وقت آنے پر) اس کو پیغمبر بنا دیں گے۔

اَلْيَمِّ سمندر۔ مراد دریائے نیل۔ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ یعنی ہم عنقریب اس کو تیرے پاس واپس اس طرح پہنچا دیں گے کہ پھر تجھے اس کی نسبت کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔

عطاء اور ضحاک راوی ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا مصر میں جب بنی اسرائیل کی تعداد بہت ہو گئی اور لوگوں پر انھوں نے دراز دستی شروع کر دی، اللہ کی نافرمانیاں کرنے لگے نہ بھلائی کا کسی کو حکم دیتے تھے نہ گناہ سے منع کرتے تھے آخر اللہ نے ان پر قبطیوں کو مسلط کر دیا قبطیوں نے ان کا زور توڑ دیا اور بہت زیادہ کمزور بنا دیا، بالآخر اللہ نے اپنے نبی موسیٰؑ کے ذریعہ سے قبطیوں کے تسلط سے ان کو رہا کرا دیا۔ حضرت ابن عباسؓ کا یہ بھی بیان ہے کہ جب موسیٰؑ کی ولادت کا زمانہ قریب آ گیا تو موسیٰؑ کی والدہ نے ایک دایہ کو بلوایا یہ دایہ انہی دائیوں میں سے تھی جو فرعون کی طرف سے بنی اسرائیل کی حاملہ عورتوں کے لئے مقرر تھیں لیکن موسیٰؑ کی والدہ کی دوست تھی درد زہ ہوا تو اسی دائی کو بلوایا وہ آ گئی تو اس سے کہا میری جو حالت ہے تجھے معلوم ہے آج تیری دوستی سے مجھے فائدہ حاصل کرنا ہے دائی اپنے کام میں لگ گئی جب موسیٰؑ پیدا ہو گئے اور دائی کے ہاتھوں میں آ گئے تو موسیٰؑ کی دونوں آنکھوں کے بیچ سے ایک نور نکلتا دیکھ کر دائی حیرت زدہ ہو گئی اس کا ہر جوڑ لرز اٹھا اور پورے بدن میں سنسنی پیدا ہو گئی اور موسیٰؑ کی محبت اس کے دل میں جم گئی، موسیٰؑ کی ماں سے کہنے لگی تو نے جب بلوایا تھا اور میں تیرے پاس آئی تھی اس وقت میرے پیچھے تیرے بیٹے کو قتل کرنے والے تھے (یعنی میرا ارادہ تھا کہ تیرے بچہ کو قاتلوں کے حوالے کر دوں گی) لیکن اب میرے دل میں تیرے بیٹے کی محبت ایسی محسوس ہوتی ہے کہ ایسی محبت میں نے کسی کی نہ پائی، اس لئے میں کہتی ہوں کہ اپنے بیٹے کی حفاظت رکھنا۔ پھر دائی کو موسیٰؑ کی ماں کے گھر سے نکلتے کسی جاسوس نے دیکھ لیا، فوراً سب دروازہ پر آ گئے اور اندر گھسنا چاہا۔ حضرت موسیٰؑ کی بہن دوڑی آئی اور کہنے لگی اماں دروازہ پر سپاہی آ گئے، فوراً موسیٰؑ کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر بہن نے تنور میں ڈال دیا تنور میں آگ روشن تھی لیکن اس کے اوسان خطا ہو گئے تھے اس کو پتہ بھی نہ چلا کہ میں کیا کر رہی ہوں سرکاری آدمی اندر گھس آئے تنور بھڑک رہا تھا اور موسیٰؑ کی والدہ کے چہرے پر کوئی تغیر نہ تھا نہ چہرے کے رنگ میں کوئی فرق آیا تھا نہ دودھ اترا تھا کہنے لگے دائی یہاں کیوں آئی تھی حضرت موسیٰؑ کی والدہ نے کہا وہ میری دوست ہے ملاقات کے لئے آئی تھی۔ غرض وہ لوگ واپس چلے گئے اب موسیٰؑ کی والدہ کی عقل بھی ٹھکانے پر آئی اور موسیٰؑ کی بہن سے پوچھا بچہ کہاں ہے موسیٰؑ کی بہن نے کہا مجھے معلوم نہیں، اتنے میں تنور کے اندر سے بچے کے رونے کی آواز آئی ماں نے جا کر دیکھا تو تنور کی آگ موسیٰؑ کے لئے ٹھنڈی پڑ چکی تھی اور خنکی بھی اتنی جو باعث سلامتی تھی ماں نے موسیٰؑ کو اٹھا لیا پھر مدت کے بعد والدۂ موسیٰؑ نے دیکھا کہ فرعون کو لڑکوں کی تلاش بے حد ہے اور اس کو اپنے بچے کا خطرہ ہوا تو اللہ نے اس کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ ایک صندوق لے کر موسیٰؑ کو اس میں رکھ کر دریا میں ڈال دے اس خیال کے پیدا ہوتے ہی وہ ایک بڑھئی کے پاس آ گئی جو فرعون کی قوم میں سے تھا اور اس سے ایک صندوقچہ خریدا بڑھئی نے پوچھا تجھے کس کام کے لئے ضرورت ہے موسیٰؑ کی والدہ نے جھوٹ

بولنا پسند نہیں کیا بیچ بتا دیا کہ میرا ایک بچہ ہے میں صندوقچے کے اندر اس کو چھپاؤں گی۔ بڑھئی نے پوچھا کیوں؟ والدۂ موسیٰؑ نے کہا فرعون کے خوف سے غرض صندوقچے خرید کر اٹھا لائی وہ بڑھئی کے پاس سے چلی ہی تھی کہ بڑھئی قاتلوں کو اس واقعہ کی اطلاع دینے پہنچ گیا اور کچھ بولنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ اللہ نے زبان روک دی اور بولنے کی طاقت سلب ہو گئی کچھ بول نہ سکا اور ہاتھ سے اشارے کرنے لگا لیکن سپاہی کچھ نہ سمجھ سکے۔ جب اشاروں کو سمجھنے سے عاجز آ گئے تو ان کے سردار نے حکم دیا کہ اس کو مار کر نکال دو۔ بڑھئی پٹ پٹا کر اپنی جگہ پہنچا تو اللہ نے پھر زبان میں گویائی کی طاقت لوٹا دی وہ پھر مخبری کرنے کے ارادہ سے سپاہیوں کے پاس پہنچا اس مرتبہ زبان بھی بند ہو گئی اور نظر بھی جاتی رہی نہ بول سکا نہ آنکھوں سے کچھ دیکھ سکا۔ آخر مار کر لوگوں نے نکال دیا بڑھئی حیران پریشان لڑکتا پڑکتا ایک وادی میں جا پہنچا اور اس نے پختہ نیت کر لی کہ اگر اللہ نے میری نگاہ اور قوت گویائی واپس کر دی تو وہ موسیٰؑ کی نشاندہی نہیں کرے گا بلکہ موسیٰؑ جہاں ہوں گے ان کے ساتھ رہے گا اور ان کی حفاظت کرے گا۔ اللہ نے اس کو سچا جانا اور بینائی اور گویائی واپس دے دی، فوراً وہ سجدہ میں گر گیا اور دعا کی اے میرے رب مجھے اس نیک بندہ کا پتہ بتا دے اللہ نے اس کو موسیٰؑ تک پہنچنے کا راستہ بتا دیا وہ وادی سے نکل آیا اور موسیٰؑ پر ایمان لے آیا وہ سمجھ گیا کہ یہ بات اللہ کی طرف سے ہے۔

وہب بن منبہ نے بیان کیا کہ موسیٰؑ کی والدہ جب حاملہ ہو گئی تو اس نے اپنی حالت پوشیدہ رکھی کوئی بھی اس کے حمل سے واقف نہ ہوا چونکہ بنی اسرائیل پر اللہ کو احسان کرنا مقصود تھا اس لئے حمل پر پردہ ڈال دیا موسیٰؑ کی پیدائش کا سال وہی تھا کہ فرعون نے تفتیش کے لئے دائیوں کو بنی اسرائیل کی عورتوں پر مامور کر دیا تھا اور ایسی تفتیش کرائی تھی کہ اس سے پہلے بھی ایسی جستجو نہیں ہوئی۔ موسیٰؑ کی ماں حاملہ تو ہو گئی تھی مگر پیٹ میں کوئی ابھار ہی نہیں ہوا تھا نہ رنگ بدلا تھا نہ دودھ اترا تھا، دائیاں اس سے کوئی تعرض ہی نہیں کرتی تھیں جب شب ولادت آ گئی اور موسیٰؑ پیدا ہو گئے تو اس وقت نہ کوئی چوکیدار تھا نہ کوئی دائی، سوائے موسیٰؑ کی بہن کے موسیٰؑ کے پیدا ہونے کی کسی کو اطلاع ہی نہ ہوئی بہن کا نام مریم تھا۔ اللہ نے موسیٰؑ کی ماں کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ اس کو دودھ پلاتی رہو جب تجھے (فرعون کے آدمیوں کے مطلع ہو جانے کا) خطرہ ہو جائے تو اس کو دریا میں ڈال دینا موسیٰؑ کی والدہ بچہ کو تین ماہ تک گود میں چھپائے دودھ پلاتی رہیں موسیٰؑ روتے بھی نہ تھے اور نہ حرکت کرتے تھے۔ بالآخر والدۂ موسیٰؑ کو جب (قوی اندیشہ ہو گیا تو اس نے ایک سربند صندوق بنوا لیا۔ بعض کا خیال ہے کہ ایک صندوقچہ لیا جس کے اندر تارکول کا پالش کر دیا اور دراڑیں بند کر دیں اور بچھونا کر دیا اور موسیٰؑ کو اندر رکھ کر صندوقچہ بند کر کے دریا میں رات کو ڈال دیا۔

حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ فرعون کی صرف ایک لڑکی تھی اور کوئی اولاد نہ تھی لڑکی سے فرعون کو بڑی محبت تھی ہر روز فرعون سے وہ اپنے تین کام پورے کرائی تھی اس لڑکی کو سخت برص تھا فرعون نے اس کے علاج کے لئے مصر کے تمام اطباء اور ساحروں کو جمع کیا (طبیب کوئی کامیاب علاج نہ کر سکے) ساحروں نے کہا کہ اس کو صحت دریا کی طرف سے ہو گی کوئی چیز انسان کی شکل کی دریا میں پائی جائے گی اس کے منہ کا لعاب لے لیا جائے اور برص کے داغوں پر لگا دیا جائے تو یہ اچھی ہو جائے گی ایسا فلاں دن فلاں ساعت میں سورج نکلنے کے وقت ہو گا۔ چنانچہ دوسرا دن دوشنبہ کا تھا فرعون نے نیل کے کنارے اپنی بیٹھنے کی جگہ تیار کرائی اور جا کر بیٹھا ساتھ میں اس کی بیوی آسیہ بنت مزاحم بھی تھی فرعون کی لڑکی بھی اپنی خادماؤں کے ساتھ آ کر نیل کے کنارے بیٹھ گئی اور لڑکیوں کے منہ پر پانی کے چھپاکے مار مار کر کھیلنے لگی اچانک نیل میں بہتا ہوا سامنے سے ایک صندوق نظر آیا لہریں طمانچے مار مار کر اس کو لا رہی تھیں۔ فرعون نے کہا نیل میں یہ چیز درخت سے آ ٹکتی ہے اس کو لاؤ ہر طرف سے کشتیوں نے جا کر اس کو گھیر لیا اور لا کر فرعون کے سامنے رکھ دیا لوگوں نے ہر چند کھولنے کی تدبیریں کیں لیکن کھول نہ سکے پھر توڑنا چاہا توڑ بھی نہ سکے آخر آسیہ قریب آئی اس کو صندوق کے اندر ایک نور دکھائی دیا جو کسی اور کو نہیں دکھائی دیا کوشش کر کے اس نے صندوق کو کھول دیا اندر ایک چھوٹا سا بچہ بچھونے پر لیٹا تھا اس کی دونوں آنکھوں کے بیچ میں ایک نور چمک رہا تھا اور اللہ نے اس کا رزق دونوں انگوٹھوں میں پیدا کر دیا تھا جن کے اندر سے وہ دودھ چوس رہا تھا اللہ نے بچہ کی محبت آسیہ کے دل میں ڈال دی

فرعون بھی اس سے محبت کرنے لگا اور دل سے مہربان ہو گیا، صندوقچے سے بچہ کو نکالا گیا فرعون کی لڑکی بھی آگئی اور اس نے بچہ کے منہ کا لعاب لے کر اپنے داغوں پر ملا فوراً اچھی ہو گئی لڑکی نے بچہ کو چوم لیا اور سینے سے چمٹا لیا۔ جادوگروں نے کہا اے بادشاہ ہمارا خیال ہے کہ یہ بچہ وہی ہے جس سے تجھے خطرہ تھا یہ بنی اسرائیل کا بچہ ہے تیرے خوف سے اس کو دریا میں پھینک دیا گیا ہے۔ فرعون نے بچہ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تو آسیہ نے قُرَّتُ عَيْنٍ لِّي وَلَكَ لَا تَقْتُلُوهُ عَسَىٰ أَن يَنفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا یہ میری اور آپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اس کو قتل نہ کرو امید ہے کہ یہ ہمارے کام آئے گا یا ہم اس کو بیٹا بنالیں گے آسیہ کے اولاد نہ ہوتی تھی (بانجھ تھی یا کوئی اور وجہ تھی) فرعون سے آسیہ نے کہا موسیٰؑ کو مجھے دیدو فرعون نے آسیہ کو موسیٰ ہبہ کر دیا اور کہنے لگا مجھے اپنے لئے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر اس روز فرعون کہہ دیتا یہ جیسے تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے ویسے ہی میرے لئے بھی خنکی چشم ہے تو اللہ نے جس طرح آسیہ کو ہدایت یاب کر دیا اسی طرح فرعون کو بھی ہدایت یاب کر دیتا۔

آسیہ سے کہا گیا اس کا کچھ نام رکھو آسیہ نے کہا میں نے اس کا نام موسیٰ رکھ دیا ہے کیونکہ ہم نے اس کو پانی اور درختوں کے درمیان پایا تھا۔ مُو پانی اور سَا درخت۔

فَالْتَقَطَهُ آلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُونَ لَهُمْ عَدُوًّا وَحَزَنًا تو فرعون کے لوگوں نے موسیٰؑ کو (یعنی موسیٰؑ کو مع صندوق کے) اٹھا لیا تاکہ وہ ان لوگوں کے لئے دشمن اور غم (کا باعث) ہو جائے۔

یعنی آئندہ بڑھ کر موسیٰؑ ان کے دشمن اور باعث غم ہو گئے تو گویا موسیٰؑ کو پانی سے نکال کر خود انہوں نے اپنے لئے ایک دشمن اور باعث غم پیدا کرنا چاہا۔ لِيَكُونَ میں لام عاقبت کا ہے کسی فعل کا نتیجہ باعث فعل ہوتا ہے (کوئی خاص غرض کسی کام کو کرنے پر آمادہ کرتی ہے جو وجود ذہنی میں اس فعل سے مقدم ہوتی ہے اور وجود خارجی میں فعل کے بعد ظہور پذیر ہوتی ہے یہی غایت فعل بھی ہوتی ہے اور باعث فعل بھی)۔

عَدُوًّا یعنی ایسا دشمن ہو گا جو ان کے مردوں کو قتل کرے گا اور ایسا سبب غم ہو گا جو ان کی عورتوں کو باندیاں بنا دے گا۔

إِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا كَانُوا خَاطِئِينَ ۝ بے شک فرعون اور ہامان اور ان کے تابعین (اس بارے میں) بہت چوکے۔ (یہ ترجمہ حضرت مولانا اشرف علی صاحبؒ نے کیا ہے۔ سادہ ترجمہ اس طرح ہے کہ) فرعون اور ہامان اور ان کے گروہ والے خطاکار تھے۔ اس ترجمہ کا ایک مطلب تو وہی ہے جو مولانا تھانوی کے ترجمہ سے ظاہر ہے کہ وہ لوگ ہر بات میں خطاکار تھے موسیٰؑ کی وجہ سے ہزاروں کو قتل کیا گیا (یہ بھی ان کی غلطی تھی) پھر موسیٰؑ ہی کو اپنے گھر میں پرورش کیا کہ بڑے ہو کر موسیٰؑ ان کے ساتھ وہ معاملہ کریں جس کا ان کو اندیشہ تھا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ چونکہ گناہ گار تھے اس لئے اللہ نے ان کو سزا دی اور ان کے دشمن کو انہیں سے پرورش کرایا۔

وَقَالَتِ امْرَأَتُ فِرْعَوْنَ اور فرعون کی بی بی نے (فرعون سے) کہا۔ وہب بن منبہ نے بیان کیا جب فرعون کے سامنے صندوقچہ رکھا گیا اور لوگوں نے اس کو کھولا اور اس کے اندر سے موسیٰؑ برآمد ہوئے تو فرعون نے ان کو دیکھ کر کہا یہ تو عبرانی ہے، دشمنوں میں سے ہے موسیٰؑ کو دیکھ کر اس کو غصہ آیا اور کہنے لگا یہ لڑکا کیسے بچ گیا فرعون نے ایک اسرائیلی عورت سے نکاح کر لیا تھا جس کو آسیہ بنت مزاحم کہا جاتا تھا یہ عورت بہت نیک تھی اور انبیاء کی نسل سے تھی مسکینوں کے لئے تو ماں تھی ان پر بڑا ترس کھاتی تھی، بہت خیرات دیتی تھی، جب آسیہ فرعون کے پاس بیٹھی ہوئی تھی تو اس نے فرعون سے کہا یہ لڑکا تو ایک سال سے زائد کا ہے اور آپ کا حکم اس سال کے لڑکوں کو قتل کرنے کا ہے اس لئے اس کو چھوڑ دیجئے۔

قُرَّتُ عَيْنٍ لِّي وَلَكَ میری اور آپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہو گا۔

لَا تَقْتُلُوهُ اس کو قتل نہ کیجئے۔ جمع مخاطب کا صیغہ تعظیم کے طور پر بولا۔ یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ آسیہ نے کہا یہ کسی اور ملک کا ہے بنی اسرائیل کا نہیں ہے۔

عَسٰۤى اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ امید ہے کہ یہ ہمارے کام آئے گا۔ یہ قتل نہ کرنے کی درخواست کی علت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے اندر برکت کے نشانات ہیں ہم کو اس سے فائدہ پہنچنے کی علامتیں موجود ہیں۔ آسیہ نے یہ بات اس لئے کہی کہ ان کو موسیٰ کی دونوں آنکھوں کے درمیان ایک نور چمکتا نظر آیا تھا انگوٹھوں سے دودھ چوستے بھی انہوں نے دیکھ لیا تھا اور فرعون کی لڑکی بھی ان کے منہ کا لعاب لگانے سے اچھی ہو گئی تھی۔

اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا یا ہم اس کو بیٹا بنالیں گے کیونکہ یہ بیٹا ہونے کے قابل ہے۔

وَّهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ۝ اور ان کو احساس نہ تھا کہ فرعون اور اس کے آدمیوں کی تباہی اور موت اس کے ہاتھوں سے ہو گی۔ فرعون یہ بات سن کر کچھ جھجک گیا اللہ نے موسیٰ کی محبت اس کے دل میں ڈال دی۔ ابن جریر نے بروایت محمد بن قیس مرفوع حدیث بیان کی ہے کہ فرعون نے کہا تھا کہ یہ تیری آنکھ کی ٹھنڈک ہو گا میری آنکھ کی ٹھنڈک نہیں ہے اگر وہ یوں کہہ دیتا کہ جیسے یہ تیری آنکھ کی ٹھنڈک ہو گا ویسے ہی میری آنکھ کی بھی ٹھنڈک ہو گا تو جس طرح اللہ نے آسیہ کو ہدایت یافتہ کر دیا اسی طرح فرعون کو بھی ہدایت یافتہ بنا دیتا۔ محمد بن وہب نے کہا حضرت ابن عباس نے فرمایا اگر اللہ کا دشمن آسیہ کی طرح موسیٰ کی بابت عَسٰۤى اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ کہہ دیتا تو اللہ اس کو بھی فائدہ پہنچا دیتا لیکن اللہ نے اس کے لئے بدبختی لکھ دی تھی وہی بد نصیبی غالب آئی اور اس نے انکار کر دیا۔

وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا اور موسیٰ کی ماں کا دل خالی ہو گیا۔ یعنی شدت خوف اور ہجوم غم سے موسیٰ کی ماں کا دل عقل سے خالی ہو گیا (اس کے اوسان خطا ہو گئے) کیونکہ اس نے سن لیا تھا کہ موسیٰ فرعون کے ہاتھوں میں پڑ گئے۔ ایک اور آیت میں وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ یعنی ان کے دل عقل سے خالی ہیں ان میں فہم نہیں ہے۔

اکثر اہل تفسیر نے خالی ہونے کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ موسیٰ کی یاد کے علاوہ اس کا دل ہر بات سے خالی ہو گیا۔

حسن نے یہ مطلب بیان کیا کہ اس کا دل خالی ہو گیا وہ اس الہام کو بھول گئی جو اللہ نے اس کے دل میں پیدا کر دیا تھا کہ اس کو دریا میں ڈال دینا اور کچھ خوف و غم نہ کرنا ہم ضرور اس کو لوٹا کر تیرے پاس پہنچا دیں گے۔ اور اس کو پیغمبر بنائیں گے مگر شیطان نے اس سے آکر کہا کیا تجھے یہ بات تو پسند نہیں کہ فرعون تیرے بچہ کو قتل کر دے اور تجھے اس کا اجر و ثواب ملے اور تو خود بچہ کو قتل کرنے کے درپے ہو رہی ہے اور اس کو دریا میں ڈال کر غرق کر رہی ہے (اس کا گناہ تو تجھ پر ہو گا اور اگر فرعون اس معصوم کو قتل کر دے گا تو تجھے اجر ملے گا) غرض جب اس کو اطلاع ملی کہ فرعون نے نیل میں موسیٰ کو پالیا تو اس مصیبت نے اس کو اللہ کا وعدہ فراموش کرا دیا۔ میں کہتا ہوں شاید اس کو اس سے یہ خیال پیدا ہو گیا کہ ممکن ہے اس کے دل میں جو القاء ہوا تھا وہ غلط ہو کیونکہ اولیاء کا الہام ظنی ہوتا ہے قطعی نہیں ہوتا الہام میں غلطی ہو سکتی ہے۔

ابو عبیدہ نے کہا اس کا دل غم سے خالی ہو گیا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اللہ کا وعدہ ضرور سچا ہے۔ (بچہ کبھی ضائع نہ ہو گا) قتبی نے کہا ابو عبیدہ کی یہ تاویل غلط ہے کیونکہ اللہ نے آگے فرمایا ہے۔

اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِیْ بِهٖ قریب تھا کہ وہ اس کو ظاہر کر دیتی یعنی قریب تھا کہ وہ ظاہر کر دیتی کہ یہ موسیٰ میرا بیٹا ہے اس کو شدت حزن نے اس حد تک پہنچا دیا تھا (کہ وہ ضبط کرنے کی طاقت تقریباً کھو چکی تھی) عکرمہ نے حضرت ابن عباسؓ کا جو قول نقل کیا ہے اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا قریب تھا کہ وہ کہہ دیتی ہائے بیٹا۔

مقاتل نے کہا جب اس نے صندوق کو دیکھا کہ دریا کی لہریں اس کو اوپر اٹھا کر پھر نیچے پٹک رہی ہیں اور وہ لہروں میں پھنسا ہوا ہے تو اس کو ڈوب جانے کا خطرہ لاحق ہوا کہ قریب تھا وہ چیخ پڑے (اور بات کھل جائے)

کلبی نے کہا جوان ہونے کے بعد جب حضرت موسیٰ کو فرعون کا بیٹا کہا جانے لگا اور آپ کی والدہ نے بھی یہ بات سنی تو اس کو یہ بات اتنی شاق گزری کہ قریب تھا وہ ظاہر کر دیتی کہ موسیٰ میرا بیٹا ہے۔

بعض اہل تفسیر نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ والدۂ موسیٰ کا دل غم و فکر سے خالی ہو گیا (اس کو کوئی غم نہ رہا) جب کہ اس نے سن لیا کہ موسیٰ کو فرعون نے بیٹا بنالیا ہے۔ یہ بات سن کر اس کو اتنی خوشی ہوئی کہ خوشی سے مغلوب ہو کر وہ قریب تھا کہ ظاہر کر دیتی کہ موسیٰ میرا بیٹا ہے (میرے بیٹے کو فرعون نے بیٹا بنالیا ہے) ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے سدی کا بیان نقل کیا ہے کہ جب موسیٰ کی بہن نے کہا کہ میں تم کو ایک ایسی عورت بتاتی ہوں کہ موسیٰ اس کا دودھ پی لے گا اور پھر ماں کو لے کر آگئی اور موسیٰ نے ماں کے پستان کو منہ میں لے لیا تو قریب تھا کہ ماں بول اٹھتی یہ تو میرا ہی بیٹا ہے لیکن اللہ نے اس کو اظہار سے بچالیا۔

ابو عبیدہ نے آیت کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ موسیٰ کی ماں کا دل خوف و حزن سے خالی ہو گیا کیونکہ اللہ نے فرمادیا تھا لَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ یعنی اس کو اللہ کے اس وعدہ پر اتنا اعتماد تھا کہ قریب تھا وہ بتادے کہ موسیٰ میرا بیٹا ہے یا یہ ظاہر کر دے کہ مجھے وحی سے اللہ کا یہ وعدہ معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ اس کو میرے پاس لوٹا کر ضرور لائے گا اور اس کو پیغمبر بنائے گا۔

لَوْلَآ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۝ اگر ہم اس کے دل کو اس غرض سے مضبوط نہ کر دیتے کہ وہ (ہمارے وعدہ پر) یقین رکھے۔

اَنْ مصدریہ ہے یعنی اگر ہماری طرف سے یقین پر قائم رہنے کی غرض سے اس کے دل کی بندش غم پر یا انتہائی خوشی پر (بر تفسیر اول و دوم) یا اسرار خداوندی کو پوشیدہ رکھنے پر (بر تفسیر ابو عبیدہ) نہ ہو گئی ہوتی تو قریب تھا کہ وہ بات ظاہر کر دیتی۔ خلاصۂ مطلب یہ ہے کہ ہم نے اس کے دل کو مضبوط کر دیا کہ اس نے غم پر یا شدت مسرت پر صبر رکھا تاکہ وہ ہمارے وعدہ پر اعتماد قائم رکھے۔ اس مطلب پر لِتَكُوْنَ کا تعلق رَبَطْنَا سے ہوگا۔

لیکن لِتَكُوْنَ کا تعلق اَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا سے بھی ہوگا اس صورت میں یہ مطلب ہو گا کہ موسیٰ کی ماں کا دل خوف و حزن سے خالی ہو گیا تاکہ وہ ان مومنوں کے زمرہ میں شامل ہو جائے جو اللہ کے وعدہ پر یقین رکھتے ہیں۔

ہماری اس تشریح سے قیسی کا وہ اعتراض ساقط ہو گیا جو انہوں نے ابو عبیدہ کی تاویل پر کیا تھا۔

یوسف بن حسین نے کہا موسیٰ کی ماں کو دو حکم دیئے گئے تھے اور دو چیزوں کی ممانعت کی گئی اور دو بشارتیں دی گئی تھیں لیکن اس کو کسی سے کوئی فائدہ اس وقت تک نہیں پہنچا جب تک اللہ نے اس کی حفاظت نہیں کی اور اس کے دل کو مضبوط نہ کیا اور بے چینی کو سکون سے نہ بدلا تاکہ وہ ان مومنوں میں سے ہو جائے جو اللہ کے وعدہ پر پختہ بھروسہ رکھتے ہیں۔ فرعون کے بیٹا بنانے پر بھروسہ نہ رکھے۔

وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ۝ اور موسیٰ کی ماں نے موسیٰ کی بہن (مریم بنت عمران) سے کہا اس کے پیچھے پیچھے چلی جا (اور اس کی خبر کی تلاش رکھ مریم پیچھے پیچھے چل دی) بہن نے اس کو دور سے دیکھا اور ان لوگوں کو پتہ بھی نہ تھا (کہ موسیٰ کی بہن موسیٰ کی ٹوہ لے رہی ہے) اس قصہ میں یہ بھی آیا ہے کہ مریم الگ الگ جارہی تھی اور نظر چرا کر دیکھتی جاتی تھی تاکہ لوگوں کو پتہ نہ چلے کہ وہ موسیٰ کو دیکھ رہی ہے۔

وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ اور ہم نے پہلے ہی سے موسیٰ پر دودھ پلانے والیوں (کے دودھ) کی بندش کر دی تھی۔

بندش کرنے سے مراد ہے تکوینی (فطری) بندش، تشریعی بندش مراد نہیں ہے (کیونکہ بچہ احکام تشریعی کا مکلف نہیں ہوتا خصوصاً نوزائیدہ بچہ۔ مترجم)

مَرَاضِع یا مُرْضِع کی جمع ہے یعنی ہر دودھ پلانے والے کے دودھ کی بندش کر دی تھی اس لئے موسیٰ نے کسی کا دودھ نہیں پیا یا مَرْضَع کی جمع ہے اور مَرْضَع یا مصدر میمی ہے یعنی دودھ پینے کی بندش کر دی تھی یا مَرْضَع ظرف مکان ہے یعنی ہر عورت کی پستان کو روک دیا تھا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا فرعون کی بیوی چاہتی تھی کہ کسی طرح کسی دودھ پلانے والی کا دودھ موسیٰ پی لیں، چنانچہ ایک کے بعد ایک دودھ پلانے والیاں آئیں مگر موسیٰ نے کسی کے پستان کو منہ نہیں لگایا، موسیٰ کی بہن

یہ کیفیت دیکھتی رہی آٹھ راتیں یونہی گزر گئیں کہ موسیٰؑ نے کسی مرضعہ کا دودھ نہیں پیا اور چلاتے رہے۔

فَقَالَتْ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰٓى اَهْلِ بَیْتٍ یَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ ﴿۱۲﴾

سو (موسیٰؑ کی بہن نے) کہا کیا میں تم کو ایسے گھرانے کا پتہ بتاؤں جو تمہارے لئے اس بچہ کی پرورش کریں اور (دل سے) اس کی خیر خواہی کرتے رہیں۔

یعنی دودھ پلانے اور پرورش کرنے میں کوتاہی نہ کریں۔ نُصْحٌ کھوٹ کی ضد ہے یعنی کسی کام کو بگاڑ اور خرابی کی آمیزش سے پاک صاف رکھنے کو نصح کہتے ہیں۔ ابن جریج اور سدی نے وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ کا مطلب یہ بیان کیا کہ وہ لوگ بادشاہ کے خیر خواہ ہیں۔ موسیٰؑ کی بہن نے وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ کہا تو لوگوں نے اس کو پکڑ لیا اور کہا معلوم ہوتا ہے کہ تو اس کے گھر والوں کو جانتی ہے بتا وہ کون ہیں موسیٰؑ کی بہن نے کہا مجھے تو اس کے گھر والے معلوم نہیں میں نے یہ کہا تھا کہ وہ لوگ بادشاہ کے خیر خواہ ہیں۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے بھی سدی کا یہ قول نقل کیا ہے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ موسیٰؑ کی بہن سے جب بازپرس ہوئی تو اس نے کہا میں یہ بات بادشاہ کی خوشی کے لئے کہہ رہی تھی اور اس بات کو ظاہر کرنا تھا کہ ہمارا تعلق بادشاہ سے ہے۔ بعض اہل روایت نے لکھا ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ کی بہن نے هَلْ اَدُلُّكُمْ کہا تو لوگوں نے کہا ایسا کون ہے اس نے کہا میری ماں ہے لوگوں نے پوچھا کیا تیری ماں کا کوئی لڑکا ہے۔ ہمشیرۂ موسیٰؑ نے کہا ہاں ہارون ہے (حضرت ہارون اس سال پیدا ہوئے تھے جس سال لڑکوں کو قتل نہیں کیا جاتا تھا) لوگوں نے کہا تو نے ٹھیک کہا اس کو ہمارے پاس لے آ۔ لڑکی نے اپنی ماں سے جا کر پوری بات کہہ دی اور اس کو اپنے ساتھ لے آئی۔ موسیٰؑ نے جو اپنی ماں کی خوشبو سونگھی تو پستان کو منہ لگا دیا اور پینے لگے اور اتنا پیا کہ دونوں کوکھیں بھر گئیں سدی نے کہا روز کی اجرت موسیٰؑ کی والدہ کو ایک دینار ملتی تھی اور وہ اس لئے لے لیتی تھیں کہ وہ حربی کافر کا مال تھا۔

فَرَدَدْنٰهُ اِلٰٓى اُمِّهٖ پس ہم نے موسیٰؑ کو ان کی ماں کی طرف لوٹا دیا۔

اس سے پہلے کا کلام محذوف ہے (رفتار عبارت سے سمجھ میں آجاتا ہے اس لئے ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی) پورا کلام اس طرح تھا لوگوں نے حضرت موسیٰؑ کی بہن سے کہا بتا وہ کون عورت ہے موسیٰؑ کی بہن نے اپنی ماں کا پتہ بتایا لوگوں نے کہا اپنی ماں کو بلا لا وہ جا کر ماں کو لے آئی لوگوں نے موسیٰؑ کی ماں کی گود میں بچہ کو رکھ دیا ماں نے دودھ پلایا بچہ نے پی لیا لوگوں نے بچہ کو موسیٰؑ کی ماں کے سپرد کر دیا اس طرح ہم موسیٰؑ کو ماں کے پاس واپس لے آئے۔

كَیْ تَقَرَّ عَیْنُهَا تاکہ (موسیٰؑ کی واپسی سے) ماں کی آنکھ ٹھنڈی ہو۔

وَلَا تَحْزَنَ اور وہ (موسیٰؑ کے فراق سے) رنجیدہ نہ ہو۔

وَلِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ اور تاکہ اس کو معلوم ہو جائے کہ اللہ (نے جو وعدہ موسیٰؑ کی واپسی کا کیا تھا اس) کا وعدہ سچا ہے۔

وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳﴾ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے یعنی نہیں جانتے کہ اللہ کا وعدہ سچا ہوتا ہے اسی لئے ممنوعات خداوندی کا بغیر خوف عذاب کے ارتکاب کرتے ہیں اور اوامر الٰہیہ کو ثواب کی امید نہ رکھنے کی وجہ سے ترک کرتے ہیں اگر وعدہ وعید کا ان کو یقین ہوتا تو نہ منہیات کا ارتکاب کرتے نہ مامورات کو ترک کرتے۔ حضرت موسیٰؑ کی ماں انتہائی جزع میں مبتلا ہو گئی تھی اس کا دل صبر سے خالی ہو گیا تھا یہ اس کی طرف سے قصور تھا آیت میں اسی بنا پر ایک قسم کی اس پر تعریض ہے۔

لَا یَعْلَمُوْنَ کا یہ مطلب بھی بیان کیا گیا ہے کہ فرعون کے آدمی نہ اللہ کے وعدہ کو جانتے تھے نہ اس بات سے کہ وہ موسیٰؑ کی بہن اور وہ والدہ ہے۔ غرض حضرت موسیٰؑ اپنی والدہ کے پاس دودھ چھڑانے کے وقت تک رہے جب دودھ چھوٹ گیا تو آپ کی والدہ آپ کو لے کر فرعون کے پاس آئی پھر فرعون کے پاس ہی آپ پرورش پاتے رہے (یہاں تک کہ جوان

ہو گئے) جیسا کہ اللہ نے آئندہ آیت میں بیان کیا ہے۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰۤى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ اور جب موسیٰؑ اپنی بھرپور طاقت (یعنی کامل جوانی) کو پہنچ گئے اور (قوت عقلیہ کے لحاظ سے) درست ہو گئے تو ہم نے ان کو حکمت و علم عطا کیا۔

اَشُدَّ شِدَّۃٌ کی جمع ہے جیسے اَنْعُم، نِعْمَۃٌ کی۔ شدت کا معنی ہے قوت، اَشُدَّ کو پہنچنے کا یہ مطلب ہے کہ ایسی طاقت (جوانی) کو پہنچ گئے جو نمو کی آخری حد تھی۔ کلبی نے کہا اَشُدَّ کی عمر ۱۸ سے ۳۰ سال تک ہے۔ مجاہد وغیرہ کے نزدیک ۳۳ سال کی عمر اَشُدَّ کی عمر ہے۔

اِسْتَوٰى یعنی ان کی عقل ٹھیک ہو گئی۔ مراد یہ ہے کہ چالیس سال کی عمر ہو گئی کذا روی سعید بن جبیر عن ابن عباس بعض کے نزدیک اِسْتَوٰى کا یہ مطلب ہے کہ وہ اپنی جوانی کی انتہا کو پہنچ گئے۔

حُكْمًا یعنی نبوت عِلْمًا یعنی اللہ اور اس کے احکام کی معرفت۔ بعض کے نزدیک اس سے نبی ہونا مراد نہیں ہے کیونکہ نبوت تو مصر سے ہجرت کرنے کے بعد مدین سے واپسی میں ملی تھی بلکہ اس سے مراد ہے دانش اور احکام شرعی کا علم۔ میں کہتا ہوں واؤ مطلق عطف کے لئے آتا ہے ترتیب ضروری نہیں، نبوت اگرچہ ہجرت کے بعد ملی تھی لیکن اس جگہ پہلے ذکر کرنا اس وعدہ کی تکمیل کو ظاہر کر رہا ہے جو آپ کی والدہ سے اللہ نے فرمایا تھا اور ارشاد فرمایا ہے۔ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ۔

وَكَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِيْنَ ⑭ اور ہم نیکوکاروں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں یعنی موسیٰؑ اور ان کی والدہ کو ان کی نیکوکاری کی ہم نے جزا دی ایسی ہی جزا ہم نیکوکاروں کو دیا کرتے ہیں۔

وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا اور موسیٰؑ شہر میں اس وقت داخل ہوئے جب کہ شہر والے بے خبر (پڑے سو رہے) تھے۔ سدی نے کہا شہر سے مراد ہے مدین کا شہر جو حدود مصر میں تھا۔ مقاتل نے کہا خانیں کا قصبہ مراد ہے جو مصر سے دو فرسخ پر تھا۔ بعض نے کہا شہر عین الشمس مراد ہے۔ محلی نے کہا شہر منف مراد ہے ایک مدت کے بعد حضرت موسیٰؑ منف میں گئے تھے حِيْنِ غَفْلَةٍ سے مراد ہے دوپہر کا وقت جب کہ لوگ قیلولہ میں تھے۔ محمد بن کعب قرظی نے کہا مغرب و عشاء کا درمیانی وقت مراد ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ حضرت موسیٰؑ کو فرعون کا بیٹا کہا جاتا تھا آپ کی سواری فرعون کی سواری کی طرح ہوتی تھی اور لباس بھی فرعون کا ہی جیسا شاہانہ ہوتا تھا ایک روز فرعون سوار ہو کر نکلا موسیٰؑ اس وقت موجود نہیں تھے جب واپس آئے تو فرعون جا چکا تھا آپ اس کے پیچھے سوار ہو کر روانہ ہو گئے منف میں پہنچے تو دوپہر کا وقت ہو گیا اس وقت راستوں میں کوئی نہ تھا (سب اپنے اپنے گھروں میں جا چکے تھے) محمد بن اسحاق نے کہا بنی اسرائیل میں کچھ لوگ موسیٰؑ کے پیرو تھے آپ کی نصیحتیں سنتے اور ان پر چلتے بھی تھے جب آپ کی حق پرستی ظاہر ہو گئی تو آپ نے فرعون اور اس کی قوم کے مذہب کی مخالفت کی اس کا ذکر فرعون سے بھی کیا گیا لوگوں نے حضرت موسیٰؑ کو ڈرایا کہ وجہ تھی کہ آپ جس بستی میں جاتے تو چھپتے چھپاتے اور ڈرتے ڈرتے جاتے۔ ایک روز جو (کسی) شہر میں گئے تو (حسب معمول) ایسی حالت میں گئے کہ لوگ بے خبر تھے (معلوم ہوتا ہے کہ مصر کی رعایا اختلاف مذہبی کی وجہ سے آپ کی دشمن ہو گئی تھی) عید کا دن تھا لوگ کھیل کود اور تفریح میں مشغول تھے۔

فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ ۗ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ۚ سو انہوں نے وہاں دو آدمیوں کو لڑتے پایا ایک ان کی برادری میں کا تھا اور دوسرا مخالفین میں سے۔

يَقْتَتِلٰنِ یعنی آپس میں جھگڑ رہے تھے مِنْ شِيْعَتِهٖ یعنی بنی اسرائیل میں سے تھا مِنْ عَدُوِّهٖ یعنی قبطیوں میں سے تھا۔

فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِیْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِیْ مِنْ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ ۚ سو جو شخص برادری میں سے تھا اس نے موسیٰؑ سے اس شخص کے خلاف جو مخالفین میں سے تھا مدد

طلب کی تو موسیٰؑ نے اس کے ایک گھونسہ مار دیا اور اس کا کام ہی تمام کر دیا۔

استغاثہ مدد طلب کرنا۔ اسرائیلی نے قبطی کے مقابلہ میں موسیٰؑ سے مدد مانگی، موسیٰؑ کو سخت غصہ آیا، قبطی اسرائیلی کو پکڑے ہوئے تھا اور اتنی بات جانتا تھا کہ موسیٰؑ بنی اسرائیل کی نظر میں محترم ہیں اور موسیٰؑ بھی ان کی پاسداری کرتے ہیں اور عام لوگ اتنا ہی جانتے تھے کہ موسیٰؑ کو ایک اسرائیلی عورت نے دودھ پلایا ہے اس لئے موسیٰؑ بنی اسرائیل کا پاس لحاظ رکھتے ہیں۔

آپ نے فرعون کے آدمی سے کہا اس کو چھوڑ دے (وہ شاہی سپاہی تھا) اس نے کہا ہم تو اس کو اس لئے پکڑ رہے ہیں کہ یہ لکڑیاں اٹھا کر آپ کے والد کے باورچی خانہ میں پہنچا دے (یعنی بیگار میں پکڑ رہے ہیں) موسیٰؑ اس سے جھگڑنے لگے فرعونی بولا اب تو میں نے یہ ارادہ کر لیا ہے کہ لکڑیاں تیرے اوپر لاد کر پہنچاؤں گا۔ حضرت موسیٰؑ قد آور بھی تھے اور بہت زیادہ طاقتور بھی آپ نے اس کے ایک گھونسہ رسید کر دیا وہ فوراً مر گیا۔

وَکَزَہٗ حضرت ابن مسعودؓ کی قرأت میں لَکَزَہٗ آیا ہے دونوں کا معنی ایک ہی ہے یعنی گھونسہ مارا۔ بعض نے کہا وَکْزٌ سینہ پر گھونسہ مارنے کو اور لَکْزٌ پشت پر گھونسہ مارنے کو کہتے ہیں۔ فراء نے کہا دونوں کا اصل معنی ہے دھکا دینا۔ ابو عبیدہ کا قول ہے وَکْزٌ کا معنی ہے انگلیوں کے سروں سے دھکا دینا۔ بعض تفسیروں میں آیا ہے کہ موسیٰؑ نے تراسی کا عقد بنا کر قبطی کے سینہ پر ضرب رسید کی۔

فَقَضٰی عَلَیْہِ یعنی اس کو قتل کر دیا پھر ریت میں ہی دفن کر دیا۔ محلی نے یہی لکھا ہے فَقَضٰی عَلَیْہِ اس کے کام سے فارغ ہو گئے اس کا کام تمام کر دیا۔ قَضَیْتُہٗ اور قَضَیْتُ عَلَیْہِ دونوں کا ایک ہی معنی ہے میں نے اس کو تمام کر دیا، پورا کر دیا۔ موسیٰؑ نے اس کو قصداً قتل نہیں کیا تھا اس لئے پشیمان ہوئے اور

قَالَ ھٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ ۭ اِنَّہٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِیْنٌ ۝ کہا یہ شیطانی حرکت ہو گئی، بے شک شیطان (آدمی کا) کھلا ہوا دشمن ہے غلطی میں ڈال دیتا ہے۔

حضرت موسیٰؑ نے اس فعل کو شیطانی حرکت اس لئے قرار دیا کہ اس وقت آپ کو کافروں کے قتل کرنے کا حکم نہیں تھا اور ان لوگوں کے اندر آپ محفوظ بھی تھے ان میں سے کسی کو اچانک قتل کر دینا آپ کے لئے جائز نہ تھا۔ لیکن یہ قتل خطا تھا قصداً نہ تھا اس لئے اس کو عصمت انبیاء کے خلاف نہیں قرار دیا جا سکتا موسیٰؑ نے اس فعل کو شیطانی حرکت شمار کیا اور ظلم سمجھا اور پھر استغفار کی، اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ آپ مقرب بندوں میں سے تھے حقیر فروگزاشت کو بھی عظیم گناہ جانتے تھے اہل قرب کی یہی حالت ہوتی ہے (اگر ان سے کوئی غلطی ہو جائے تو وہ اس کو گناہ کبیرہ سمجھتے ہیں اور پھر استغفار کرتے ہیں)

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْ لِیْ فَغَفَرَ لَہٗ ۭ اِنَّہٗ ھُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ۝

موسیٰؑ نے کہا اے میرے رب میں نے اپنی جان پر ظلم کیا (کہ تیرے حکم کے بغیر ایک شخص میرے ہاتھ سے مارا گیا) سو میرے اس قصور کو تو معاف فرما دے، اللہ نے موسیٰؑ کو معاف کر دیا، بے شک وہ بڑا معاف کرنے والا نہایت مہربان ہے۔ یعنی اللہ نے اپنا حق معاف کر دیا اور قبطی چونکہ معصوم الدم نہ تھا کہ جس کو قتل کرنا موجب قصاص و دیت ہوتا اس لئے وارثوں سے معاف کرانے کی ضرورت ہی نہ تھی نہ قیامت کے دن مقتول کے عفو کرنے کی ضرورت ہو گی۔

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ فَلَنْ اَکُوْنَ ظَہِیْرًا لِّلْمُجْرِمِیْنَ ۝ اے میرے رب چونکہ تو نے مجھ پر (بڑے بڑے) انعام فرمائے ہیں تو میں بھی آئندہ مجرموں کا مددگار کبھی نہ ہوں گا۔

حضرت مفسر نے فرمایا بِمَآ اَنْعَمْتَ میں ب قسمیہ ہے اور جواب قسم اس کے بعد والا کلام ہے اور فَلَنْ اَکُوْنَ کا عطف محذوف کلام پر ہے۔ اصل کلام اس طرح تھا موسیٰؑ نے کہا اے میرے رب میں قسم کھاتا ہوں ان انعامات کی جو تو نے مجھ کو عطا فرمائے ہیں میں نے توبہ کی۔

باء کا تعلق فعل محذوف سے ہے اس صورت میں مطلب اس طرح ہوا اے میرے رب مجھے لغزشوں سے محفوظ

رکھ مجھے ان انعامات کے جو میرے حال پر تو نے مبذول فرمائے ہیں۔

لِلْمُجْرِمِیْنَ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اَلْمُجْرِمِیْنَ یعنی اَلْکَافِرِیْنَ اگر یہ روایت صحیح مان لی جائے تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ وہ اسرائیلی کافر تھا۔ مقاتل کا یہی قول ہے۔ قتادہ نے کہا آیت کا معنی یہ ہے کہ آئندہ میں کسی مجرم کا مددگار نہ ہوں گا۔ بعض نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اس کے بعد میں کسی کی مدد ایسی نہیں کروں گا کہ میری مدد مجھے جرم تک پہنچا دے (یعنی مجرم بنا دے)

فَاَصْبَحَ فِی الْمَدِیْنَةِ خَآئِفًا یَّتَرَقَّبُ پھر موسیٰؑ کو اس شہر میں صبح ہوئی خوف اور دہشت کی حالت میں۔

اَلْمَدِیْنَةِ یعنی اسی شہر میں جس میں قبطی کو قتل کیا تھا۔ یَتَرَقَّبُ مقتول کے وارثوں کی طرف سے انتقام کا اندیشہ کرتے تھے یا اپنے رب کی طرف سے مدد کے منتظر تھے۔

فَاِذَا الَّذِی اسْتَنْصَرَهٗ بِالْاَمْسِ یَسْتَصْرِخُهٗ ؕ قَالَ لَهٗ مُوْسٰۤی اِنَّكَ لَغَوِیٌّ مُّبِیْنٌ ۝ تو دیکھتے کیا ہیں کہ جس شخص نے موسیٰؑ سے کل مدد مانگی تھی وہی موسیٰؑ کو چیخ کر پکار رہا ہے، موسیٰؑ نے اس سے کہا حقیقت میں تو ہی کھلا ہوا کج رفتار ہے۔

یَسْتَصْرِخُهٗ اس سے فریاد کر رہا ہے (مدد مانگ رہا ہے) یہ صُرَاخٌ سے مشتق ہے (صُرَاخ کا معنی ہے چیخنا فریاد کرنا)

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا لوگ فرعون کے پاس آئے اور کہا بنی اسرائیل نے ہمارا ایک آدمی مار ڈالا ہمارا حق (قصاص) دلوا دیجئے فرعون نے کہا قاتل کو تلاش کرو اور گواہوں کو پیش کرو بغیر شہادت کے تو فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ لوگ تلاش میں گھومنے لگے لیکن کوئی یقینی شہادت نہ مل سکی اتفاقاً دوسرے روز موسیٰؑ جا رہے تھے کہ کل والے اسرائیلی کو کسی فرعونی سے لڑتے دیکھا اسرائیلی نے فریاد کی اور فرعونی کے خلاف موسیٰؑ سے مدد مانگی موسیٰؑ کل کے ہی قصور پر نادم تھے کہ ان کے ہاتھ سے ایک قبطی مارا گیا تھا اسرائیلی سے کہا تو ہی کج رو ہے تیری کج راہی کھلی ہوئی ہے کل ایک شخص کے مارے جانے کا تو ہی سبب بنا اور آج ایک اور آدمی سے لڑ رہا ہے اور مجھ سے مدد مانگ رہا ہے۔

بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے فرعونی سے کہا تھا اِنَّكَ لَغَوِیٌّ مُّبِیْنٌ کیونکہ وہ ظلم کر رہا تھا پھر اسرائیلی پر آپ کو رحم آیا کیونکہ فرعونی اس پر ظلم کر رہا تھا اور فرعونی کو پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

فَلَمَّاۤ اَنْ اَرَادَ اَنْ یَّبْطِشَ بِالَّذِیْ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا ۙ قَالَ یٰمُوْسٰۤی اَتُرِیْدُ اَنْ تَقْتُلَنِیْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًۢا بِالْاَمْسِ ۖۗ اِنْ تُرِیْدُ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِی الْاَرْضِ وَ مَا تُرِیْدُ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِیْنَ ۝ سو جب موسیٰؑ نے اس شخص کی طرف ہاتھ بڑھانے کا ارادہ کیا جو دونوں کا مخالف تھا تو اسرائیلی بول اٹھا موسیٰؑ کیا (دنیا میں) اپنا زور بٹھانا چاہتے ہو اور صلح کرانا نہیں چاہتے۔ یہ ترجمہ حضرت مولانا تھانویؒ کے ترجمہ کے موافق ہے۔

هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا یعنی قبطی جو حضرت موسیٰؑ اور دوسرے اسرائیلی کا دشمن یا اس معنی تھا کہ ان کے مذہب سے اس کا مذہب جدا تھا یا یوں کہا جائے کہ تمام قبطی بنی اسرائیل کے دشمن تھے۔ اسرائیلی نے حضرت موسیٰؑ کا ہاتھ بڑھتا دیکھ کر خیال کیا کہ موسیٰؑ مجھے پکڑنا چاہتے ہیں کیونکہ حضرت موسیٰؑ کو وہ غصہ میں دیکھ ہی چکا تھا اور آپ کا یہ قول اِنَّكَ لَغَوِیٌّ مُّبِیْنٌ بھی سن چکا تھا۔ یہ خیال کر کے۔

قَالَ یٰمُوْسٰۤی یعنی اسرائیلی نے کہا یا قبطی نے کہا کیونکہ حضرت موسیٰؑ کے قول اِنَّكَ لَغَوِیٌّ مُّبِیْنٌ سے اس کو شبہ ہو گیا تھا کہ موسیٰؑ نے اس اسرائیلی کی حمایت میں کل قبطی کو قتل کیا ہے اول قول زیادہ واضح ہے۔

جَبَّارًا یعنی شدت غضب کی وجہ سے بڑا قاتل۔ فِی الْاَرْضِ یعنی مصر کی سرزمین میں جہاں بغیر خوف انجام کے لوگوں پر تم ظلم کرتے ہو۔ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِیْنَ اور تمام لوگوں میں صلح کرانی نہیں چاہتے کہ خوش اسلوبی کے ساتھ آپس کے

جھگڑے کو دور کرا سکو۔

قبطی نے جب اسرائیلی کا یہ قول سنا کہ اس نے موسیٰؑ کو مخاطب کر کے کہا اَتُرِيْدُ اَنْ تَقْتُلَنِىْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًا بِالْاَمْسِ تو سمجھ گیا کہ کل جو قبطی مارا گیا تھا اس کے قاتل موسیٰؑ ہیں اور فوراً فرعون کو جا کر اطلاع دیدی فرعون نے موسیٰؑ کو قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ حضرت موسیٰؑ نے لوگوں کے اقوال سن لئے تھے کہ عام لوگ کہہ رہے تھے کہ موسیٰ قاتل ہے اور یہ اطلاع فرعون کے پاس بھی پہنچ گئی تھی اور لوگ حضرت موسیٰؑ کو قتل کرنے کے درپے ہو گئے تھے۔ (بہر حال فرعون کو خبر پہنچ گئی اور فرعون کے درباری آپ کے قتل کا مشورہ کرنے لگے)

وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى (اور شہر کے آخری حصہ کا رہنے والا دوڑتا ہوا (حضرت موسیٰؑ کے پاس) آیا۔ اکثر اہل تفسیر نے اس کا نام حزقیل بتایا ہے مُؤْمِنٌ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ (قبطیوں میں سے ایک مرد مومن) اسی کو کہا گیا ہے۔ بعض نے اس کا نام شمعون اور بعض نے سمعان بیان کیا ہے۔

قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّىْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ ۝۲۰

اور اس نے کہا موسیٰؑ (فرعون کے) درباری آپ کو قتل کرنے کا مشورہ کر رہے ہیں آپ فوراً یہاں سے (باہر نکل جائیے میں قطعی آپ کے خیر خواہوں میں سے ہوں (اس لئے دوڑا ہوا اطلاع دینے آیا ہوں)

فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ (یہ بات سنتے ہی) موسیٰ نکل کھڑے ہوئے ڈرتے ڈرتے لو و لگاتے (کہ پیچھے سے کوئی تلاش کرنے والا نہ آرہا ہو۔ یا یہ مطلب ہے کہ اللہ سے مدد کی امید کرتے ہوئے اور دشمنوں سے ڈرتے ہوئے نکل چلے)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء اللہ کے سوا مخلوق سے بھی ڈرتے ہیں حالانکہ لَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ قرآن کی نص قطعی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اپنی جان کا خوف فطری چیز ہے اور فطری خوف منافی نبوت نہیں۔ انبیاء جو اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے اوامر و نواہی کے اظہار و اشاعت میں ذاتی ضرر پہنچنے سے وہ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے ان کو کسی کی سوائے اللہ کے پروا نہیں ہوتی۔ انبیاء کے علاوہ دوسرے لوگ آدمیوں سے ایسا ہی ڈرتے ہیں جیسا اللہ سے ڈرنا چاہئے بلکہ اللہ کے خوف سے بھی زیادہ ان کو بندوں کا ڈر ہوتا ہے۔ انسانوں کے ہاتھوں پہنچنے والی تکلیف کو وہ اللہ کے عذاب کے برابر جانتے ہیں۔

قَالَ رَبِّ نَجِّنِىْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝۲۱ کہا اے میرے رب مجھے ان کافر لوگوں سے بچا یعنی مجھ تک ان کی رسائی نہ ہو میں ان کی گرفت سے باہر ہو جاؤں۔ فرعون کو جب موسیٰؑ کے فرار ہونے کی اطلاع ملی تو اس نے گرفتاری کے لئے سپاہیوں کا ایک دستہ بھیج دیا اور حکم دیا سوار ہو کر مختلف راستوں کو جاؤ کیونکہ موسیٰؑ کو اصل شاہراہ تو معلوم نہیں ہے۔

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّىْٓ اَنْ يَّهْدِيَنِىْ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۝۲۲ اور جب موسیٰؑ مدین کی طرف ہو لئے کہنے لگے امید ہے کہ میرا رب مجھے (کسی مقام کے) سیدھے راستہ پر چلا دے گا۔

زجاج نے کہا یعنی اس راستہ پر چل پڑے جو مدین پر پہنچاتا تھا۔ مدین ایک بستی کا نام تھا جو حضرت ابراہیم کے صاحبزادے مدین کے نام پر آباد کی گئی تھی۔ موسیٰؑ پیدل نکلے تھے، نہ سواری تھی نہ کھانے پینے کا سامان ساتھ تھا۔ مدین مصر سے آٹھ منزل کے فاصلہ پر تھا اور فرعون کی حکومت سے خارج تھا۔

قَالَ یعنی موسیٰؑ نے اللہ پر بھروسہ رکھتے ہوئے کہا۔ موسیٰؑ کو اپنے رب پر پورا یقین تھا۔

اَنْ يَّهْدِيَنِىْ سَوَآءَ السَّبِيْلِ یعنی امید ہے کہ اللہ مجھے سیدھے راستہ پر ڈال دے گا جس میں کوئی زحمت نہ ہو گی۔ موسیٰؑ کو مصر سے نکلتے وقت مدین کو جانے والا راستہ معلوم نہ تھا، جب موسیٰؑ نے یہ الفاظ کہے کہ ایک فرشتہ (بصورت انسانی) ہاتھ میں چھوٹا برچھا لئے نمودار ہوا اور موسیٰؑ کو لے چلا۔

اہل تفسیر نے لکھا ہے موسیٰؑ جب مصر سے نکلے تو کھانے کے لئے آپ کو صرف درختوں کے پتے اور سبزیاں ہی ملیں انہی کو کھاتے کھاتے آپ کو اجابت بھی سبز ہونے لگی اور مدین پہنچے ہیں تو ناخن گر چکے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اللہ کی طرف سے موسیٰؑ کی یہ پہلی آزمائش تھی۔

وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ اور جب مدین کے پانی پر اترے یعنی مدین کے کنویں تک پہنچے جس کا پانی کھینچ کر لوگ اپنے جانوروں کو پلاتے تھے۔

وَجَدَ عَلَيْهِ أُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُونَ ۬ تو پانی کے (کنارے) لوگوں کا ایک (بڑا) گروہ دیکھا (اپنے مویشیوں کو) پانی پلا رہا تھا۔

وَوَجَدَ مِن دُونِهِمُ امْرَأَتَيْنِ تَذُودَانِ ۚ اور ان سے ورے (یعنی نشیبی مقام میں) دو عورتیں پائیں جو (اپنے جانوروں کو) روکے ہوئے (کھڑی) تھیں یعنی اپنی بکریوں کو الگ روکے کھڑی تھیں تاکہ ان کی بکریاں دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر پانی پر نہ چلی جائیں۔

قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ۖ موسیٰؑ نے کہا تمہارا کیا واقعہ ہے یعنی کیا وجہ ہے کہ تم اپنے مویشیوں کو پانی سے روک رہی ہو۔ خَطْبٌ کا معنی ہے حال کذا قال فی القاموس بعض نے کہا خَطْب مصدر ہے بمعنی اسم مفعول یعنی تمہارا کیا مقصد ہے۔

قَالَتَا لَا نَسْقِي حَتَّىٰ يُصْدِرَ الرِّعَاءُ ۖ وَأَبُونَا شَيْخٌ كَبِيرٌ ۝ دونوں عورتوں نے کہا ہم (اپنے جانوروں کو) اس وقت تک پانی نہیں پلاتے جب تک چرواہے (اپنے جانوروں کو پانی پلا کر) نکال کر لے (نہ) جائیں اور ہمارے والد بہت بوڑھے ہیں یعنی ضعف پیری کی وجہ سے خود آکر جانوروں کو پانی نہیں پلاسکتے مجبوراً ہم کو پانی پلانا ہوتا ہے۔

يُصْدِرَ الرِّعَاءُ یعنی چرواہے اپنے جانوروں کو پانی سے واپس نہ لے جائیں۔

قَالَتَا لَا نَسْقِي الخ سے عورتوں کے جذبہ عفت کا اظہار اور مردوں کے ساتھ اختلاط سے ان کے اجتناب کو بیان کرنا مقصود ہے۔

وَأَبُونَا شَيْخٌ كَبِيرٌ یہ جواب بظاہر سوال کے مطابق نہیں معلوم ہوتا لیکن حقیقت میں سوال ہی کا جواب ہے کیونکہ حضرت موسیٰؑ کا مقصد تھا بکریوں کو روکے رکھنے کا سبب دریافت کرنا باوجودیکہ پانی موجود تھا اور پلانے کی ضرورت بھی تھی عورتوں نے سبب بیان کر دیا کہ ہم کمزور عورتیں ہیں مردوں میں قوت کے ساتھ گھس کر آگے بڑھنا ہماری طاقت سے باہر ہے پھر ہم کو مردوں سے اختلاط کرنے میں شرم بھی آتی ہے۔ باپ بہت زیادہ بوڑھے ہوگئے ہیں وہ خود یہ کام کر نہیں سکتے۔ شیخ کبیر کا کیا نام تھا، بغوی نے لکھا ہے کہ مجاہد، ضحاک، سدی اور حسن کے نزدیک یہ بزرگ حضرت شعیب پیغمبر تھے۔ وہب اور سعید بن جبیر نے کہا شیروں کا نام تھا جو حضرت شعیب کے بھائی کا بیٹا تھا۔ حضرت شعیب کی وفات تو اس واقعہ سے پہلے نابینا ہونے کی حالت میں ہو چکی تھی اور آپ کو مقام ابراہیم اور زمزم کے درمیان دفن کر دیا گیا تھا۔ بعض اہل علم کا قول ہے کہ ایک اور مرد مومن تھا جو حضرت شعیب پر ایمان لے آیا تھا۔

فَسَقَىٰ لَهُمَا پھر موسیٰؑ نے ان دونوں عورتوں (کی بکریوں کو پانی پلا دیا)

حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے حضرت موسیٰؑ لوگوں کو ہٹاتے ہوئے کنویں پر پہنچے اور عورتوں کی بکریوں کو پانی پلا دیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ موسیٰؑ نے برابر والے کنویں کے منہ پر ڈھانکا ہوا پتھر اکھاڑ کر الگ کر دیا یہ کنواں پہلے کنویں کے قریب تھا اور پتھر اتنا بڑا بھاری تھا کہ ایک جماعت ہی اس کو اٹھا سکتی تھی۔ بعض لوگوں نے کہا دس آدمی اس کو اٹھاتے تھے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے ایک ڈول پانی کھینچا اور برکت کی دعا کی ایک ہی ڈول سے سب بکریاں سیراب ہو گئیں۔

ثُمَّ تَوَلَّىٰ إِلَى الظِّلِّ پھر پشت پھیر کر ایک (درخت کے) سایہ کی طرف چلے گئے یعنی گرمی سخت تھی شدت گرمی کی وجہ سے ایک درخت کے سایہ میں جا بیٹھے۔ امتحان سخت ہو چکا تھا اس لئے اپنے مولیٰ ہی سے اپنے دکھ کا شکوہ کیا اور

اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے کہ آدمی اپنے رب کی بھیجی ہوئی تکلیف کا شکوہ اپنے رب سے ہی کرے۔

فَقَالَ رَبِّ إِنِّي لِمَا أَنْزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ ۝ پھر کہا اے میرے رب اس وقت جو نعمت تو مجھے بھیج دے میں اس کا سخت حاجت مند ہوں (ترجمہ مولانا تھانوی)

علماء کے نزدیک لِمَا اَنْزَلْتَ میں لام بمعنی الیٰ ہے۔ فَقِيرٌ لَهٗ اور فَقِيرٌ اِلَيْهِ دونوں طرح مستعمل ہے اِنْزَال (اتارنا) سے مراد ہے عطاء کرنا، اَنْزَلَ اللّٰهُ نِعْمَتَهٗ اور نِعْمَتَهٗ عَلَى الْخَلْقِ اللہ نے مخلوق کو اپنی نعمتیں عطاء فرمائیں یا اپنی نعمت عطا کی۔ اللہ کی طرف سے عطاء نعمت کبھی براہ راست اتارنے ہی کے ذریعہ سے ہوتی ہے جیسے قرآن کا اتارنا۔ بارش کا اوپر سے اتارنا۔ کبھی وہ نعمت براہ راست اوپر سے نہیں اتاری جاتی بلکہ اس کے اسباب اتارے جاتے ہیں اور اس کی طرف رہنمائی اوپر سے ہوتی ہے جیسے اللہ نے فرمایا وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ اور ہم نے لوہا اتارا اور اللہ نے تمہارے آٹھ جوڑے چوپایوں کے اتارے اور ہم نے تم پر لباس اتارا (یہ مختلف مقامات کی آیات کا ترجمہ ہے ان تمام آیات میں مذکورہ اشیاء کے اتارنے سے مراد ہے ان کے اسباب مولدہ کا اتارنا۔)

اَنْزَلْتَ اگرچہ ماضی کا صیغہ ہے لیکن اس جگہ مستقبل کے معنی میں ہے یعنی جو کچھ تو مجھے عطا فرمائے میں اس کا محتاج ہوں یا اَنْزَلْتَ کا معنی ہے قَدَّرْتَ اِنْزَالَهٗ (اس وقت صیغہ ماضی ہی کا ترجمہ کیا جائے گا۔ مترجم) یعنی میرے لئے جس چیز کا عطا کرنا تو نے مقدر کر دیا ہے میں اس کا محتاج ہوں۔

مِنْ خَيْرٍ یعنی کھانا تھوڑا ہو یا بہت فقیر یعنی محتاج ہوں سائل ہوں چونکہ لفظ فقیر اپنے اندر سوال کا معنی رکھتا ہے اس لئے الیٰ کی جگہ لام استعمال کیا گیا۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا موسیٰؑ نے اللہ سے ایک لقمہ طلب کیا جس سے اپنی کمر سیدھی کر سکیں۔ امام باقر علیہ الرحمۃ نے فرمایا موسیٰؑ اس وقت چھوارے کے ایک ٹکڑے کے محتاج تھے اس لئے مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ فرمایا۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا حضرت موسیٰؑ نے رَبِّ اِنِّیْ لِمَا اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ کہا حالانکہ آپ اللہ کے نزدیک بڑی عزت والے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت آپ چھوارے کے ایک ٹکڑے کے محتاج تھے۔

مجاہد نے کہا حضرت موسیٰؑ نے سوائے خیر کے اور کچھ نہیں مانگا۔ بعض علماء نے کہا لِمَا میں لام سببیہ ہے یعنی اے میرے رب چونکہ تو نے مجھے خیر عطا فرمائی ہے (خیر سے مراد ہے دین اور حکمت) اس لئے میں فقیر ہوں، فرعون کی مذہبی مخالفت میں نے کی اس لئے میری یہ حالت ہو گئی جب تک حضرت موسیٰؑ فرعون کے پاس رہے بڑے عیش سے رہے (پھر مخالفت مذہبی نے اختلاف پیدا کر دیا اور آخر یہ نوبت آ گئی کہ دانے دانے کو محتاج ہو گئے اس کلام سے حضرت موسیٰؑ کا مقصد تھا اظہار مسرت اور اداء شکر۔

میں کہتا ہوں اس تفسیر پر یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ موسیٰؑ نے کہا اے میرے رب تو نے مجھے دین اور علم عطا فرمایا میں محتاج ہوں اور تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ اس سے زیادہ مجھے عطا فرما یہی مضمون رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا کا ہے۔

میں کہتا ہوں اَنْزَلْتَ کو نُزُل سے بھی مشتق قرار دیا جا سکتا ہے اور نُزُل کا معنی ہے طعام مہمانی یعنی اے میرے رب میرے لئے جو کچھ کھانا تو فراہم کر دے میں اس کا محتاج اور سائل ہوں۔

لے حضرت عمر بن الخطاب نے فرمایا موسیٰؑ جب مدین کے کنویں پر پہنچے تو وہاں کچھ لوگوں کو اپنے جانوروں کو پانی پلاتے پایا جب لوگ فارغ ہو کر وہاں سے ہٹ گئے اور پتھر کنویں کے منہ پر رکھ دیا پتھر اتنا بھاری تھا کہ دس آدمیوں سے کم اس کو اٹھا نہیں سکتے تھے۔ موسیٰؑ نے دو عورتوں کو الگ کھڑے دیکھا پوچھا تمہاری اس کنارہ کشی کا کیا مقصد ہے عورتوں نے وجہ بیان کی حضرت موسیٰؑ نے جا کر پتھر اٹھا دیا پھر پانی کھینچا اور صرف ایک ہی ڈول کھینچا تھا کہ سب بکریاں سیراب ہو گئیں عورتوں نے جا کر اپنے باپ سے واقعہ بیان کر دیا اس کے بعد حضرت موسیٰؑ سایہ میں چلے گئے۔ رَبِّ اِنِّیْ لِمَا اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ الخ

فَجَاءَتْهُ إِحْدَاهُمَا تَمْشِي عَلَى اسْتِحْيَاءٍ ۚ قَالَتْ إِنَّ أَبِي يَدْعُوكَ لِيَجْزِيَكَ أَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَا ۚ

سو موسیٰؑ کے پاس ان دونوں میں کی ایک لڑکی آئی جو شرماتی ہوئی چلتی تھی (اور) کہنے لگی میرے والد آپ کو بلاتے ہیں تاکہ آپ کو اس کا صلہ دیں جو آپ نے ہماری خاطر (ہمارے جانوروں کو) پانی پلایا تھا۔

بغوی نے لکھا ہے حضرت عمر بن خطاب نے فرمایا وہ عورت بے باک نہ تھی کہ بے جھجک مردوں میں گھستی پھرتی بلکہ موسیٰؑ کے پاس وہ لجتی، کرتے کی آستین منہ پر ڈالے شرماتی آئی۔

ابن عساکر نیز بغوی نے ابو حازم سلمہ بن دینار کا بیان نقل کیا ہے سلمہ کا بیان ہے کہ موسیٰؑ نے جب یہ بات سنی تو جانے کا ارادہ نہیں کیا لیکن بھوکے تھے مجبوراً جانا پڑا عورت آگے آگے چلی اور موسیٰؑ اس کے پیچھے پیچھے۔ ہوا کے جھونکے سے عورت کی پنڈلی سے کپڑا ہٹ جاتا تھا اور پنڈلی کھل جاتی تھی موسیٰؑ کو یہ بات بری محسوس ہوئی آپ نے عورت سے کہا تم میرے پیچھے چلو (میں آگے چلوں گا) اگر صحیح راستہ سے ہٹوں تو بتا دینا عورت نے ایسا ہی کیا حضرت شعیب کے پاس پہنچے تو اس وقت شام کے کھانے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ حضرت موسیٰؑ سے کہا جوان بیٹھو اور کھانا کھاؤ موسیٰؑ نے کہا میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔ شعیب نے کہا کیوں؟ کیا بھوک نہیں لگی ہے؟ موسیٰؑ نے کہا کیوں نہیں مگر مجھے اندیشہ ہے کہ یہ کھانا اس نیکی کی مزدوری ہو جو میں نے عورتوں کے مویشیوں کو پانی پلانے کی شکل میں کی تھی اور میں ایسے خاندان کا فرد ہوں جو کوئی عمل آخرت مزدوری کے لئے نہیں کرتے۔ شعیب نے کہا نہیں جوان بخدا یہ بات نہیں ہے بلکہ میرا اور میرے باپ دادا کا معمول ہی یہ ہے کہ ہم مہمان کی میزبانی کرتے اور کھانا کھلاتے ہیں موسیٰؑ بیٹھ کر کھانے لگے۔

میں کہتا ہوں آیت إِنَّ أَبِي يَدْعُوكَ لِيَجْزِيَكَ أَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَا دلالت کر رہی ہے کہ عورت موسیٰؑ کو پانی پلانے کی اجرت دینے کے لئے بلانے آئی تھی اور اسی غرض سے موسیٰؑ کو طلب کیا تھا اور موسیٰؑ اس کے ساتھ گئے تھے یہ بات نہ تھی کہ موسیٰؑ کا شروع میں جانے کا ارادہ نہ تھا پھر ایسا ہو گیا اس لئے ابو حازم کا قول غلط ہے، ابو حازم کا بیان کیا ہوا قصہ آیت کی صراحت کے خلاف ہے پھر ابو حازم کا یہ بیان آیت لَوْ شِئْتَ لَاتَّخَذْتَ عَلَيْهِ أَجْرًا حضرت موسیٰؑ نے حضرت خضر سے کہا اگر آپ چاہتے تو اس کار خیر کی مزدوری لے لیتے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے جس نبی کو مبعوث فرمایا اس نے بکریاں ضرور چرائیں صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا آپ نے بھی؟ فرمایا میں اہل مکہ کی بکریاں چند قیراط (دانگ یا چھ جو چاندی) پر چراتا تھا۔ رواہ البخاری۔ ہم آگے ایک حدیث بھی ذکر کریں گے کہ حضرت موسیٰؑ نے اپنی شرمگاہ کی عفت اور پری شکم کے لئے آٹھ یا دس سال تک اپنے آپ کو کرایہ پر دے دیا تھا۔

صحیح فیصلہ یہ ہے کہ تعلیم قرآن یا امامت یا اذان غرض اس عمل پر جو خود عبادت مقصودہ ہے یا عبادت مقصودہ کی شرط ہے اجرت لینا اور ٹھہرانا جائز نہیں ہاں جو امر بجائے خود مباح ہے (عبادت اور نیکی نہیں ہے) اور نیت صالحہ کے بعد وہ طاعت بن جاتا ہے اس کی اجرت لینی اور ٹھہرانی جائز ہے۔ امام شافعی نے تو اذان وغیرہ کی اجرت کو بھی جائز قرار دیا ہے۔ متاخرین حنفیہ نے بھی تعلیم قرآن کی اجرت کو درست مانا ہے۔ واللہ اعلم

فَلَمَّا جَاءَهُ وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ قَالَ لَا تَخَفْ ۖ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿٢٥﴾

جب موسیٰؑ شعیب کے پاس پہنچ گئے اور اپنی سرگزشت ان سے بیان کی تو انہوں نے کہا (اب) تم کچھ اندیشہ نہ کرو ان کافر لوگوں سے تم بچ آئے (یہاں محفوظ ہو)۔

فَلَمَّا جَاءَهُ اس کا عطف محذوف کلام پر ہے اصل عبارت اس طرح تھی جب عورت موسیٰؑ کے پاس پہنچی اور مذکورہ بات کہی تو موسیٰؑ اس کے ساتھ ہوئے اور شعیب کے پاس پہنچ گئے جب شعیب کے پاس پہنچ گئے تو ان سے اپنا قصہ بیان کیا۔ قَصَّ اور قَصَصٌ کسی کے پیچھے نشان قدم پر چلنا۔ قَصَّ الْخَبَرَ پوری خبر بیان کر دی۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ قبطی

کے قتل اور فرعون کی طرف سے موسیٰؑ کو قتل کرنے کے لئے جستجو سب کچھ موسیٰؑ نے شعیب سے بیان کر دیا۔

اَلظّٰلِمِیْنَ سے مراد ہیں فرعون اور اس کی قوم والے حضرت شعیب نے یہ اس لئے کہا کہ مدین پر فرعون کا تسلط نہ تھا۔

قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا یٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ اِنَّ خَیْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ۝

ان دونوں میں سے ایک نے کہا ابا ان کو ملازم رکھ لیجئے کیونکہ آپ کا اچھا ملازم وہی ہو گا جو طاقتور اور امانت دار ہو۔

یعنی جس کو آپ کام پر رکھیں اس کا کام پورا کرنے کی طاقت رکھنا اور امانتدار ہونا ضروری ہے بہترین کارگزار وہی ہے جو طاقتور اور امانت دار ہو (اور ان میں یہ دونوں اوصاف موجود ہیں اس لئے یہ بہترین اجیر ہوں گے) اِسْتَاْجَرْتَ ماضی کا صیغہ بجائے مضارع کے بولنا اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ ان کے ان دونوں اوصاف کا تجربہ کیا جا چکا ہے۔

خطیب نے اپنی تاریخ میں حضرت ابوذر کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس لڑکی سے اس کے باپ نے پوچھا تجھے اس کی قوت و امانت کا حال کیسے معلوم ہوا، لڑکی نے کہا کنویں کے منہ سے اتنا بھاری پتھر اٹھا دیا جس کو دس آدمیوں سے کم (یا چالیس سے کم) نہیں اٹھاتے یہ تو اس کی طاقت ہے اور امین ہونے کا یہ ثبوت ہے کہ اس نے مجھ سے پیچھے پیچھے رہنے کو کہا تھا تاکہ ہوا کی وجہ سے میری کھلی پنڈلی پر اس کی نظر نہ پڑے۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا تین آدمی بڑے زیرک اور ہوشیار تھے شعیب کی لڑکی یوسف کا ساتھی جس نے کہا تھا عَسٰۤى اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ اور ابوبکر جنہوں نے اپنی زندگی میں عمر کو خلیفہ بنا دیا۔

قَالَ اِنِّیْۤ اُرِیْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَیَّ هٰتَیْنِ

شعیب نے کہا میں چاہتا ہوں کہ اپنی دونوں لڑکیوں میں سے ایک کا نکاح تمہارے ساتھ کر دوں۔

شعیب جبائی نے کہا ان لڑکیوں کے نام صفورہ اور لیا تھے ابن اسحٰق نے صفورہ اور شرقا لکھا ہے۔ بعض نے کہا بڑی صفراء اور چھوٹی صفیراء تھی۔ وہب بن منبہ نے کہا بڑی لڑکی کا موسیٰؑ سے نکاح کر دیا تھا، اکثر اہل علم نے کہا چھوٹی سے نکاح کر دیا تھا جس کا نام صفورہ تھا، یہی لڑکی موسیٰؑ کو بلانے گئی تھی۔ بزار اور طبرانی نے حضرت انس کی روایت سے بھی یہی نقل کیا ہے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابوذر کی مرفوع روایت ہے یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تم سے دریافت کیا جائے کہ موسیٰؑ کا نکاح کس لڑکی سے کر دیا تھا تو تم کہہ دینا چھوٹی سے کر دیا تھا وہی موسیٰؑ کے پاس آئی تھی اور اسی نے کہا تھا یٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ حضرت موسیٰؑ نے چھوٹی سے ہی نکاح کیا تھا۔

عَلٰۤى اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ

اس شرط پر کہ آٹھ سال تم میری ملازمت کرو۔ یعنی تم میرے اجیر بن جاؤ۔ فراء نے کہا نکاح کے عوض تم آٹھ سال میرا کام کرو یعنی اس نکاح کے عوض آٹھ سال تم میری بکریاں چراؤ۔

حِجَج حِجَّۃ کی جمع ہے حِجَّۃ کا معنی ہے سال۔

فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ

اس کے بعد اگر تم دس سال پورے کر دو گے تو یہ تمہاری طرف سے ہو گا (لازم نہیں ہے) یعنی تمہاری طرف سے یہ حسن سلوک ہو گا۔

حضرت شعیب کا یہ کلام ایک طرح کی درخواست نکاح تھی عقد نکاح نہ تھا کیونکہ دونوں لڑکیوں میں سے کسی کو انہوں نے تعیین نہیں کی اور عقد نکاح کے لئے تعیین زوجہ لازم ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مشورہ کے بعد حضرت شعیب نے کسی ایک لڑکی کا نکاح حضرت موسیٰؑ سے کر دیا ہو گا لیکن یہ آیت دلالت کر رہی ہے کہ اپنی بکریاں آٹھ سال تک حضرت موسیٰؑ سے چروانے کو پورا مہر یا جزء مہر قرار دیا تھا جیسا کہ حضرت عتبہ بن منذر کی روایت سے ثابت ہوتا ہے حضرت عتبہ نے فرمایا ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے آپ نے سورت طٰسٓمٓ پڑھی جب موسیٰؑ کے قصہ پر پہنچے تو فرمایا موسیٰؑ نے شرمگاہ کی عفت اور پیٹ کے لئے اپنے آپ کو آٹھ سال تک ملازمت پر دے دیا۔ رواہ احمد وابن ماجہ۔

مسئلہ:- اس آیت و حدیث سے فقہاء نے استدلال کیا ہے کہ کسی عورت سے اس مہر پر نکاح کرنا کہ شوہر اس عورت

کی بکریاں چرانے کا صحیح ہے اور ہماری شریعت میں بھی ایسا نکاح جائز ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا قصہ بیان فرمایا اور ہماری شریعت میں ایسا کرنے کی نفی نہیں کی اس سے معلوم ہوا کہ یہ عمل ہماری شریعت میں بھی جائز ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کا قول بروایت ابن سماعہ آیا ہے کہ ایسا نکاح ہماری شریعت میں بھی جائز ہے لیکن اصل اور جامع کی روایت میں ایسے نکاح کے عدم جواز کو امام ابو حنیفہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ موخر الذکر قول کی وجہ یہ ہے کہ اس آیت اور حدیث سے اس مسئلہ کے مثبت رخ پر استدلال ہی درست نہیں ہے۔ یہ استدلال اس وقت صحیح ہوگا کہ وہ بکریاں اس لڑکی کی ملک ہوں۔ (حضرت شعیب کی نہ ہوں) کیونکہ ہماری شریعت میں اس بات پر اجماع ہے کہ مہر عورت کا حق ہے عورت کے ولی کا حق نہیں ہے اور یہ واقعہ ہے کہ بکریاں حضرت شعیب کی تھیں۔ اس لئے اجماع دلالت کرتا ہے کہ یہ حکم شریعت شعیبی کا تھا ہماری شریعت کا نہیں ہے۔ ہم نے یہ مسئلہ سورۂ نساء آیت وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ کی تفسیر میں تفصیل سے لکھ دیا ہے۔

وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَيْكَ ؕ اور میں تم پر کوئی دشواری ڈالنی نہیں چاہتا (کہ دس سال پورے کرنے پر مجبور کروں یا اوقات کی پابندی یا کام لینے میں کچھ خوردہ گیری کروں)۔ مشقت کا مادۂ اشتقاق شق ہے اور شق کا معنی پھاڑ دینا۔

سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ انشاء اللہ تم مجھے صالحین میں سے پاؤ گے۔

عمر نے کہا یعنی حق صحبت کی نگہداشت اور قول کی وفا میں تم مجھے صالح پاؤ گے۔ یہ جملہ سابق جملہ کی تاکید ہے۔ صالح ہونے کو اللہ کی مشیت کے ساتھ مشروط کرنے سے مراد ہے اللہ کی توفیق پر بھروسہ اور اس کی مدد پر اعتماد، اپنے وعدہ میں تردد مقصود نہیں ہے (یعنی ان شاء اللہ تشکیک نہیں ہے)

قَالَ ذٰلِكَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ ؕ موسیٰؑ نے کہا یہ بات میرے اور آپ کے درمیان ٹھیک ہے جو حق آپ نے مقرر کیا ہے وہ میں ادا کروں گا اور جو میرا حق مقرر کیا ہے وہ آپ ادا کریں۔

اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ ؕ دونوں مدتوں میں سے میں جو نسی مدت پوری کروں اس کے بعد مجھ پر زیادتی نہ ہونی چاہئے یعنی دونوں مدتوں میں سے میں جو نسی مدت پوری کر دوں خواہ بڑی مدت یا چھوٹی مدت پھر آپ اس سے زیادہ مدت کام کرنے پر مجھے مجبور نہ کریں۔ مقصد یہ ہے کہ دس سال گزرنے پر جیسے مجھ سے مزید مطالبہ نہیں کیا جا سکتا ایسا ہی آٹھ سال گزرنے پر مجھ کو مزید کام پر آپ مجبور نہیں کر سکتے۔ یا یہ مطلب کہ اگر آٹھ سال گزرنے کے بعد میں کام چھوڑ دوں گا تو معتدی نہ قرار پاؤں مجھے قصوروار نہ سمجھا جائے۔

وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ۝ اور ہم (باہم) جو کچھ کہہ رہے ہیں اللہ اس کا گواہ ہے۔ وکیل وہ شخص ہوتا ہے جس کے سپرد کوئی معاملہ کر دیا جائے اس جگہ وکیل سے مراد گواہ اور نگراں۔ اسی لئے اس کا صلہ علیٰ آیا ہے۔

حضرت شداد بن اوس راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شعیب نبی اتنا روئے کہ بینائی جاتی رہی اللہ نے دوبارہ بینائی عطا فرما دی پھر بھی اتنا روئے کہ آنکھیں جاتی رہیں اللہ نے پھر بینائی عنایت کر دی اور فرمایا اس رونے کی کیا وجہ ہے کیا جنت کے شوق میں روتے ہو یا دوزخ کے ڈر سے؟ شعیب نے عرض کیا نہیں اے میرے رب (نہ جنت کے شوق میں گریہ کرتا ہوں نہ دوزخ کے خوف سے) بلکہ تیرے دیدار کے شوق میں روتا ہوں۔ اللہ نے وحی بھیجی اگر یہ بات ہے تو میرا دیدار تم کو مبارک ہو (یعنی نابینائی کی حالت مبارک ہو یہی حالت تم کو میرے دیدار تک پہنچا دے گی) اے شعیب میں نے تمہارے کام کے لئے موسیٰؑ کو تمہارا خادم بنا دیا ہے۔

تکمیل معاہدہ کے بعد حضرت شعیب نے اپنی لڑکی کو حکم دیا کہ موسیٰؑ کو لاٹھی لا دو تاکہ درندوں سے وہ بکریوں کی حفاظت کر سکیں یہ لاٹھی کیسی اور کون سی تھی، اہل روایت کے اس کے متعلق مختلف خیالات ہیں حضرت آدم اس کو جنت سے لائے تھے وفات آدم کے بعد جبرئیل نے وہ لے لی اور اپنے پاس رکھ لی۔ یہاں تک کہ ایک رات آکر موسیٰؑ کو دیدی یہ عکرمہ کا

خیال ہے۔ دوسرے علماء نے کہا وہ لاٹھی جنت کے درخت آس کی تھی حضرت آدمؑ اس کو جنت سے ساتھ لائے تھے پھر سلسلہ وار ہر نبی اس کا وارث ہوتا رہا نبی کے علاوہ کسی کو نہیں ملی آخر حضرت نوحؑ تک پہنچی پھر حضرت ابراہیمؑ تک آئی پھر حضرت شعیبؑ کو ملی پھر شعیبؑ نے موسیٰؑ کو دیدی۔

سدی کا بیان ہے ایک فرشتہ نے آدمی کی شکل میں آکر وہ لاٹھی حضرت شعیبؑ کے پاس امانت رکھی تھی۔ جب حضرت شعیبؑ نے اپنی لڑکی کو لاٹھی لانے کا حکم دیا تو لڑکی وہی لاٹھی اٹھالائی۔ حضرت شعیب نے فرمایا یہ لاٹھی واپس لے جا دوسری لا کر دو۔ لڑکی نے وہ لاٹھی لے جا کر ہاتھ سے ڈال دی اور دوسری اٹھانی چاہی مگر سوائے اس کے اور کوئی لاٹھی ہاتھ میں نہ آئی آخر اسی کو اٹھالائی۔ حضرت شعیب نے پھر واپس کردی یہ لوٹا پھیری تین مرتبہ ہوئی۔ بالآخر حضرت شعیبؑ نے حضرت موسیٰؑ کو وہی لاٹھی دے دی اور آپ اس کو لے کر چلے آئے۔ حضرت شعیبؑ کو اس کے بعد پشیمانی ہوئی اور آپ نے کہا وہ تو ایک شخص کی امانت تھی میں نے یہ کیا حرکت کی یہ خیال آتے ہی حضرت موسیٰؑ کے پیچھے گئے اور ان سے لاٹھی واپس مانگی حضرت موسیٰؑ نے دینے سے انکار کردیا یہ لاٹھی تو میری ہو چکی دونوں میں اختلاف ہوا آخر دونوں اس بات پر راضی ہوگئے کہ جو شخص بھی سامنے سے آئے گا اس کے فیصلہ کی ہم دونوں پابندی کریں گے ایک فرشتہ بصورت انسانی سامنے سے آیا اس شخص نے فیصلہ کیا اس لاٹھی کو زمین پر پھینک دو پھر جو اٹھالے لاٹھی اسی کی ہے موسیٰؑ نے لاٹھی زمین پر ڈال دی حضرت شعیب نے ہر چند اس کو (اٹھا) لینے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوئے اور حضرت موسیٰؑ نے اس کو اٹھالیا حضرت شعیبؑ نے وہ لاٹھی حضرت موسیٰؑ کے پاس چھوڑ دی۔

اس کے بعد جب موسیٰؑ نے مدت مقررہ پوری کردی اور حضرت شعیب نے اپنی لڑکی ان کو دے دی تو حضرت موسیٰؑ نے بی بی سے کہا تم اپنے والد سے کہو کہ کچھ بکریاں ہم کو دیدیں بیوی نے جا کر اپنے باپ سے بکریوں کی طلب کی۔ حضرت شعیب نے فرمایا اس سال جو دو رنگا بچہ ہوگا وہ تم دونوں کا ہوگا حضرت شعیبؑ موسیٰؑ کو حسن خدمات کا بدلہ دینا چاہتے تھے اور اپنی لڑکی پر بتقاضاء خون مرحمت کرنے کے خواہشمند تھے اسی لئے اپنی لڑکی سے فرمایا اس سال جو نر مادہ جفت کیر فی (ابلق دو رنگے) بچے پیدا ہوں وہ میں نے تم کو دیئے۔ اللہ نے موسیٰؑ کو خواب میں بتایا کہ بکریوں کے پاؤ پر پانی میں لاٹھی ماریں۔ موسیٰؑ نے بیدار ہو کر پانی میں لاٹھی ماری پھر بکریوں کو وہی پانی پلایا۔ جس جس بکری نے وہ پانی پیا اس کا بچہ ابلق ہی پیدا ہوا۔ حضرت شعیبؑ سمجھ گئے یہ خداداد نصیب ہے اللہ نے موسیٰؑ کے لئے یہ رزق بھیجا ہے چنانچہ آپ نے اپنا قول پورا کیا (اور سب ابلق بچے حضرت موسیٰؑ کو دے دیئے۔

فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ　　پھر جب موسیٰؑ نے مدت مقررہ پوری کردی یعنی مدت ختم کر کے فارغ ہوگئے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ سعید بن جبیرؒ نے کہا مجھ سے حیرہ کے رہنے والے ایک یہودی نے دریافت کیا موسیٰؑ نے کون سی مدت پوری کی تھی؟ میں نے جواب دیا مجھے معلوم نہیں حبر العرب (علامۂ عرب یعنی حضرت ابن عباسؓ کے) پاس جا کر پوچھ کر بتاؤں گا چنانچہ میں حضرت ابن عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دریافت کیا فرمایا سب سے زیادہ اور خوشگوار ترین (جس سے فریقین کو پورا اطمینان حاصل ہوگیا) مدت پوری کی، اللہ کا رسول جب کوئی بات کہہ دیتا ہے تو کرتا بھی ہے۔ بغوی کا بیان ہے کہ حضرت ابوذرؓ نے فرمایا (کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا) جب تم سے پوچھا جائے کہ موسیٰؑ نے کونسی مدت پوری کی تو کہہ دینا دونوں مدتوں میں جو بہتر اور (حسن سلوک میں اعلیٰ تھی یا) زیادہ وفادار تھی رواہ البزار۔ مجاہد نے کہا جب حضرت موسیٰؑ مدت مقررہ پوری کر چکے تو اس کے بعد بھی اپنے خسر کے پاس دس سال اور قیام پذیر رہے کل بیس سال رہے اس کے بعد مصر کو واپس جانے کی اجازت طلب کی، حضرت شعیبؑ نے اجازت دے دی اور آپ روانہ ہوگئے۔

وَسَارَ بِاَهْلِهٖۤ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا　　اور بیوی کو لے کر چل دیئے تو طور کی جانب سے ایک آگ دکھائی دی یعنی جب طور سینا کے قریب صحراء میں پہنچے اور رات تاریک تھی موسم سرما کی سردی بھی سخت

تھی اور راستہ بھٹک گئے تھے تو بیوی سے کہا (اگر یہ روایت صحیح مان لی جائے کہ بیوی کے علاوہ کوئی اور ساتھ نہ تھا تو پھر امکثوا باعتبار تغلیب فرمایا جاتا)۔

قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ۝ اپنی بیوی سے کہا تم ٹھہرو مجھے آگ دکھائی دی ہے (میں وہاں جاتا ہوں) شاید وہاں سے (راستہ کی) کوئی خبر لاؤں یا آگ کی جلتی ہوئی کوئی چنگاری (جلتی ہوئی لکڑی) لے آؤں تاکہ تم تاپ لو۔

بغوی نے لکھا ہے قتادہ اور مقاتل نے کہا جَذْوَةٍ اس (جلتی ہوئی) لکڑی کو کہتے ہیں جس کا کچھ حصہ جل چکا ہو اس کی جمع جذی آتی ہے۔ قاموس میں ہے جَذْوَة موٹی لکڑی کو کہتے ہیں خواہ اس کے سرے پر آگ ہو یا نہ ہو اسی لئے جَذْوَةٍ کے بعد مِنَ النَّارِ فرمایا یعنی آگ سے جلتی ہوئی موٹی لکڑی تَصْطَلُوْنَ تاکہ تم گرمی حاصل کر سکو۔

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ يّٰمُوْسٰٓى اِنِّيْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ جب موسیٰ آگ پر پہنچے تو (پاک یا) برکت والے مقام میں دائیں طرف کی وادی کے کنارے ایک درخت سے آواز دی گئی کہ موسیٰ بلاشبہ میں ہی اللہ رب العالمین ہوں۔

اَلْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ یعنی موسیٰ کے لئے بڑی برکت والا مقام۔ یہیں اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا اور اسی جگہ پیغمبری سے سرفراز کیا۔ عطاء نے کہا مُبَارَكَة سے مراد ہے مقدس (کیونکہ دوسری آیت میں بالوادی المقدس طوی آیا ہے۔ مترجم)۔

مِنَ الشَّجَرَةِ یہ درخت وادی کے کنارے پر تھا حضرت ابن مسعود نے فرمایا یہ ایک سرسبز درخت تھا جو چمک رہا تھا۔

قتادہ، کلبی اور مقاتل نے کہا وہ عوسج کا درخت تھا وہب نے کہا علیق تھا، حضرت ابن عباس نے فرمایا عناب درخت تھا۔

اس جگہ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ فرمایا سورۂ طٰہٰ میں اَنَا رَبُّكَ اور نمل میں اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ آیا ہے مقصد سب کا ایک ہے۔ اختلاف الفاظ کی وجہ یا تو یہ ہے کہ یہ روایت بالمعنی ہے یعنی الفاظ مختلف و متعدد ہیں معنی ایک ہے جو تمام الفاظ سے ادا ہو رہا ہے یا یوں کہا جائے کہ اللہ نے اس موقع پر تو اپنی تمام صفات مذکورہ بیان فرمائی تھیں لیکن قرآن مجید میں جب ان کا ذکر کیا تو تھوڑا تھوڑا کر کے مختلف مقامات میں مختصر طور پر کیا۔ یہ اختصار بعض دوسری عبارتوں میں بھی کیا ہے جن کا تعلق ایک ہی واقعہ سے ہے جیسے سورۂ طٰہٰ میں فرمایا فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى اور سورت نمل میں فرمایا۔ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا۔

وَاَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ اور اپنی لاٹھی (زمین پر) ڈال دو۔ اس کے بعد موسیٰ نے لاٹھی زمین پر پھینک دی لاٹھی فوراً اژدھا بن گئی اور حرکت کرنے لگی۔

فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ؕ سو انہوں نے جب اس کو لہراتے ہوئے دیکھا (تیزی سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ) گویا وہ سنپولیا تھا تو پشت پھیر کر بھاگے اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

یعنی موسیٰ نے لاٹھی ڈال دی وہ اژدھا بن گئی اور لہرانے لگی جب موسیٰ نے اس کو (تیز دوڑتے اور تڑپتے) دیکھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پتلا چھوٹا سانپ ہے تو بھاگے۔

وَلَمْ يُعَقِّبْ اور پیچھے نہ لوٹے۔

يٰمُوْسٰٓى اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ ۣ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ ۝ (حکم ہوا) اے موسیٰ تم ادھر آؤ اور کوئی خوف نہ کرو تم بلاشبہ (ہر طرح) امن میں ہو یعنی میرے پاس آکر پیغمبر کسی چیز سے ڈرتے نہیں ہیں تم بھی خوف نہ کرو۔

اُسْلُكْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ۡ تم اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈالو

وہ بلا کسی مرض کے نہایت روشن ہو کر نکلے گا۔

وَاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ اور خوف دور کرنے کے لئے پھر اپنا بازو اپنی طرف ملا لینا۔

عطاء نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ نے موسیٰؑ کو حکم دیا کہ اپنا ہاتھ اپنے سے ملا لو تاکہ خوف دور ہو جائے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا موسیٰؑ کے بعد جو خوف زدہ آدمی بھی اپنا ہاتھ اپنے سینہ پر رکھ لیتا ہے اس کا ڈر جاتا رہتا ہے۔ مجاہد نے کہا جو شخص بھی اپنے دونوں جناح اپنے بدن سے ملا لے گا اس کا خوف دور ہو جائے گا۔ اور جناح پورا ہاتھ ہے۔ (یعنی صرف بازو ہی کو جناح نہیں کہتے بلکہ پورے ہاتھ کو کہتے ہیں۔ مترجم) بعض نے کہا جناح بمعنی بازو ہے بعض اہل علم نے کہا ضم جناح (کا حقیقی معنی مراد نہیں ہے بلکہ اس) سے بطور استعارہ مراد ہے سکون، ثبات، استقامت اور جرأت۔ پرندہ خوف کے وقت اپنے دونوں بازو پھیلا دیتا ہے اور امن و اطمینان کے وقت سمیٹے رکھتا ہے۔

بغوی نے لکھا ہے یعنی اپنے خوف کو دور کرو اور اپنے پہلو کو اپنے لئے نرم کر لو خوف زدہ آدمی کا دل دھڑکتا اور بدن لرزتا ہے اسی معنی میں اللہ نے فرمایا ہے وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ دوسری آیت ہے وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ یعنی ان کے ساتھ نرمی کرو۔

فراء نے کہا جَنَاح سے مراد عصا ہے یعنی اپنی لاٹھی کو اپنے پاس جمع کر لو۔ (یعنی اٹھالو) بعض اہل لغت نے کہا قبائل حمیر کے محاورہ میں رہب کا معنی آستین ہے۔ اصمعی کا بیان ہے میں نے بعض عربوں سے سنا اَعْطِنِيْ مَافِيْ رَهْبِكَ جو کچھ تمہاری آستین میں ہے مجھے دیدو۔ اس صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ آستین سے ہاتھ نکال کر اپنے بدن سے چمٹا لو بات یہ تھی کہ حضرت موسیٰؑ اس وقت آستین میں ہاتھ ڈالے اور ہاتھ میں لاٹھی پکڑے ہوئے تھے جب کہ اللہ نے فرمایا تھا خُذْهَا وَلَا تَخَفْ۔ میرے نزدیک ظاہر یہ ہے کہ وَاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ عطف تفسیری ہے یعنی پہلے جملے کے مفہوم کی تشریح ہے۔ ضم جناح سے مراد بھی گریبان میں ہاتھ ڈالنا ہے ایک ہی مفہوم کو دو عبارتوں میں بیان کرنے اور تکرار مفہوم کرنے سے دو فائدے حاصل ہو رہے ہیں اول ضبط نفس، دفع خوف، اظہار جرأت و ثبات کی تلقین۔ یہی اس جگہ مراد ہے مطلب یہ ہے کہ سانپ کو دفع کرنے کے لئے جو دونوں ہاتھ تم نے پھیلا دیئے ہیں ان کو اپنی طرف کو سمیٹ لو اور گریبان میں داخل کر لو۔ دوئم ایک اور معجزہ کا ظاہر کرانا بھی مقصود تھا۔ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ سے یہ دوسرا معجزہ ہی مراد ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں اسکی صراحت آئی ہے فرمایا ہے وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰى۔

فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ سو یہ دونوں (عصا اور ید بیضاء) دو سندیں ہیں تمہارے رب کی طرف سے۔ قاموس میں ہے بُرْهَان بمعنی حجت بَرْهَنَ عَلَيْهِ اس پر دلیل قائم کی۔ اس صورت میں بُرْهَانٌ کا وزن فُعْلَالٌ ہو گا (اور نون اصلی ہو گا) بعض نے کہا وزن فُعْلَانٌ ہے اور بَرَهٌ مادہ ہے۔ بَرِهَ الرَّجُلُ وہ آدمی گورا ہو گیا۔ گوری عورت کو بَرْهَاءُ اور بَرَهْرَهَةٌ کہا جاتا ہے۔ قاموس میں ہے اَبْرَهَ دلیل پیش کی یا عجیب عجیب باتیں ظاہر کیں یا لوگوں پر غالب ہو گیا۔

اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف جانے کے واسطے کیونکہ وہ بڑے بدکار لوگ ہیں (تم ان کے پاس ہمارے رسول ہو کر جاؤ)

قَالَ رَبِّ اِنِّيْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ۝ وَاَخِيْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْاً موسیٰؑ نے کہا اے میرے رب میں نے ان کا آدمی قتل کر دیا ہے اس لئے مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے اور میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ تیز زبان ہے اس کو میرے ساتھ مددگار بنا کر بھیج دیجئے حضرت موسیٰؑ نے اپنے منہ میں انگارا رکھ لیا تھا اس لئے زبان میں گرہ پڑ گئی تھی (اور بولنے میں ہکلانے لگے تھے)

رِدْءًا مددگار، کہا جاتا ہے اَرْدَاَنَہٗ میں نے اس کی مدد کی۔ رِدْءًا اصل میں اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ سے مدد کی جاتی ہے۔

یُّصَدِّقُنِیۡۤ ۫ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اَنۡ یُّکَذِّبُوۡنِ ﴿۳۴﴾ کہ وہ میری (تقریر کی وضاحت کرکے اور شبہات دور کرکے) تصدیق کرے گا کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مجھے جھوٹا قرار دیں گے۔

بعض علماء نے کہا تصدیق ہارون سے مراد ہے تصدیق قوم جو ہارون کی تقریر اور توضیح سے حاصل ہوگی۔ مقاتل نے کہا یُصَدِّقُنِیۡ کی ضمیر فرعون کی طرف راجع ہے مطلب یہ ہے کہ اگر تو میرے ساتھ ہارون کو پیغمبر بنا کر بھیج دے گا تو اس کے حسن تقریر سے فرعون میری تصدیق کرے گا۔

وَاَخَافُ یعنی ضرورت کے وقت چونکہ میری زبان کام نہیں دیتی اس لئے مجھے اندیشہ ہے کہ وہ میری تکذیب کریں گے۔

قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَکَ بِاَخِیۡکَ وَ نَجۡعَلُ لَکُمَا سُلۡطٰنًا فَلَا یَصِلُوۡنَ اِلَیۡکُمَا ۚ

اللہ نے فرمایا ہم تمہارے بھائی کے ذریعہ سے تمہارا بازو قوی کردیں گے اور تم دونوں کو غلبہ عطا کریں گے پھر وہ لوگ تم دونوں تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ بازو کی قوت سے موسیٰؑ کو قوی بنادیا آدمی کی قوت ہاتھ کی طاقت سے ہوتی ہے اور ہاتھ کی طاقت بازو کی قوت ہے۔

بِاَخِیۡکَ یعنی تمہارے بھائی کو پیغمبر بنا کر تمہارے ساتھ بھیج کر۔ حضرت ہارون اس زمانہ میں مصر میں تھے۔ سلطنا غلبہ یا دلیل۔ فَلَا یَصِلُوۡنَ اِلَیۡکُمَا یعنی فرعون اور اس کی قوم والے تم دونوں کو ضرر نہیں پہنچا سکیں گے۔

بِاٰیٰتِنَاۤ ۚ اَنۡتُمَا وَ مَنِ اتَّبَعَکُمَا الۡغٰلِبُوۡنَ ﴿۳۵﴾ تم دونوں ہمارے معجزات کے ساتھ (جاؤ) تم دونوں اور تم دونوں کے اتباع کرنے والے غالب ہوں گے۔

بِاٰیٰتِنَا کا تعلق نَجۡعَلُ سے ہے یعنی اپنی آیات کے ذریعہ سے ہم تم دونوں کو غلبہ عطا کریں گے۔ یا اس کا تعلق فعل محذوف سے ہے یعنی تم دونوں ہماری آیات کے ساتھ جاؤ۔ یا لَا یَصِلُوۡنَ سے تعلق ہے یعنی ہماری آیات کے سبب سے فرعون اور اس کی قوم والے تم تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ یا اَلۡغٰلِبُوۡنَ سے متعلق ہے یعنی تم دونوں اور تمہارے متبعین ہمارے معجزات کی وجہ سے غالب رہیں گے۔

فَلَمَّا جَآءَہُمۡ مُّوۡسٰی بِاٰیٰتِنَا بَیِّنٰتٍ قَالُوۡا مَا ہٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّفۡتَرًی وَّ مَا سَمِعۡنَا بِہٰذَا فِیۡۤ اٰبَآئِنَا الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۳۶﴾

پھر جب ان کے پاس موسیٰؑ ہماری کھلی دلیلیں لے کر پہنچے تو انہوں نے (معجزات دیکھ کر) کہا یہ تو محض جادو ہے جس کی اللہ پر افترا بندی کی جارہی ہے ایسی بات تو ہم نے اگلے باپ دادوں میں بھی (ہوتی) نہیں سنی۔

مَا ہٰذَا یعنی لاٹھی وغیرہ آیات بینات سے مراد ہے عصا اور یَدِ بَیۡضَآء۔ مُّفۡتَرًی گھڑا ہوا تراشیدہ جس کی مثل پہلے کبھی نہیں کیا گیا۔ یا یہ مطلب ہے کہ یہ صرف جادو ہے موسیٰؑ نے بنالیا ہے اور غلط طور پر اس کی نسبت اللہ کی طرف کردیتے ہیں۔ یا سِحۡرٌ مُّفۡتَرًی سے جھوٹا سحر مراد ہے اور سحر کا یہ واقعی وصف ہے ہر سحر جھوٹا ہی ہوتا ہے (بے حقیقت)۔

بِہٰذَا یعنی جادو یا نبوت کا دعویٰ۔

وَ قَالَ مُوۡسٰی رَبِّیۡۤ اَعۡلَمُ بِمَنۡ جَآءَ بِالۡہُدٰی مِنۡ عِنۡدِہٖ اور موسیٰؑ نے کہا میرا رب خوب جانتا ہے اس کو جو اس کے پاس سے ہدایت (دین صحیح) لے کر آیا ہے۔

پس وہی جانتا ہے کہ میں حق پر ہوں اور تم لوگ باطل پرست ہو۔ وضوح آیات کے بعد حق کا انکار کرتے ہو باوجودیکہ تم دلوں سے اس پر یقین رکھتے ہو مگر غلط طور پر زبانوں سے انکار کرتے ہو۔

وَمَنْ تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۚ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُونَ ۝ اور اس کو جس کا انجام اچھا ہوگا بلاشبہ ظالم کامیاب نہیں ہوں گے۔

عَاقِبَةُ الدَّارِ یعنی دار آخرت میں اچھا انجام۔ بیضاوی نے لکھا ہے اَلدَّار سے دنیا مراد ہے اور اس کا اصلی انجام جنت ہے کیونکہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے اصل مقصد ثواب ہی ہے اور عاقبت میں عذاب ہونا تو بالعرض ہے (اصل مقصد نہیں ہے)۔

اہل تحقیق کا قول ہے کہ عقبیٰ اور عاقبت کا اطلاق نیکیوں کے انجام یعنی ثواب پر ہوتا ہے اور عقاب۔ عقوبت اور معاقبت کا اطلاق برائیوں کے انجام بد یعنی عذاب پر ہوتا ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا۔ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ۔ نِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ۔ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ اور (عذاب کے لئے) فرمایا ہے۔ فَحَقَّ عِقَابِ۔ شَدِيْدُ الْعِقَابِ۔ وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ۔

لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ یعنی دنیا میں ہدایت یاب اور آخرت میں حسن ثواب پر فائز نہیں ہوتے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ۚ اور فرعون نے کہا اے سردارو میں تو اپنے سوا تمہارا کوئی اور خدا نہیں جانتا۔

فرعون نے اپنے سوا کسی دوسرے خدا کو جاننے کی نفی کی خدا کے وجود کی نفی نہیں کی کیونکہ اس کو اپنے سوا دوسرے خدا کے نہ ہونے کا جزم نہ تھا۔ (یعنی موسیٰ کے کہنے اور دلائل پیش کرنے سے وہ متردد ہو گیا تھا اس کے پاس کوئی قطعی دلیل ایسی نہ تھی کہ وہ دوسرے خدا کے وجود کو محال ثابت کر سکتا۔ مترجم) اس لئے اس نے کہا۔

فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى ۙ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝

تو اے ہامان تو میرے لئے مٹی (کی اینٹیں بنوا کر ان) پر آگ دہکا پھر ان (پختہ اینٹوں) سے میرے لئے ایک پختہ اونچی عمارت بنوا تاکہ میں (اس پر چڑھ کر) موسیٰ کے (بتائے ہوئے) خدا کو جھانکوں اور میں تو اس کو یقیناً جھوٹا خیال کرتا ہوں۔

ہامان فرعون کا وزیر تھا، فرعون نے اس کو پختہ اینٹیں بنوانے کا حکم دیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ فرعون نے ہی سب سے پہلے پختہ اینٹیں بنوا کر عمارت بنوائی۔

صَرْحًا بہت اونچا محل۔ تنوین تعظیم کو ظاہر کر رہی ہے۔

اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى فرعون کا خیال تھا کہ اگر موسیٰ کا بیان کردہ خدا ہو گا تو آسمان میں ہو گا۔

لَاَظُنُّهٗ میں موسیٰ کو یقیناً خیال کرتا ہوں جھوٹا۔ یعنی اس دعویٰ میں جھوٹا کہ آسمان و زمین کا ایک خالق ہے۔ فرعون دہری تھا اس کا عقیدہ نہ تھا کہ تمام ممکنات کا موجد ایک واجب ہے اس کا یہ بھی خیال تھا کہ جو بادشاہ سب پر تسلط رکھتا ہو اور قوت کے ذریعے سے سب پر غالب آجائے وہی رعایا کا خدا اور پرستش کا مستحق ہوتا ہے۔

بغوی نے لکھا ہے اہل تفسیر کہتے ہیں کہ ہامان نے بکثرت راجوں اور مزدوروں کو جمع کیا یہاں تک کہ مزدوروں کے علاوہ پچاس ہزار معمار اکٹھے ہو گئے اینٹیں پکانے والے، چونہ تیار کرنے والے، لکڑی کا کام کرنے والے، کیلیں بنانے اور دوسرے کار گزار ان کے علاوہ تھے۔ چنانچہ سب نے مل کر اتنی مضبوط اور اونچی عمارت بنا دی کہ کسی شخص کی عمارت (اس زمانہ تک) اتنی اونچی نہیں بنی تھی۔ اللہ ان لوگوں کی آزمائش کرنا چاہتا تھا، عمارت سے فارغ ہو کر فرعون اور اس کے ساتھی اوپر چڑھ گئے فرعون نے اوپر پہنچ کر تیر اندازوں کو حکم دیا کہ اوپر کی طرف تیر چھوڑیں تیر اندازوں نے اوپر کو تیر پھینکے تیر خون آلود ہو کر واپس لوٹے، فرعون بولا میں نے موسیٰ کے خدا کو قتل کر دیا، فرعون کو خچر پر سوار کر کے اوپر چڑھایا گیا تھا، اللہ نے غروب آفتاب کے وقت جبرئیل کو بھیجا، جبرئیل نے اپنا ایک پر خچر کے مار کر اس کے تین ٹکڑے کر دیئے ایک ٹکڑا فرعون کے لشکر پر گرا جس سے لاکھوں آدمی مارے گئے ایک ٹکڑا سمندر میں جا کر گرا اور ایک ٹکڑا مغرب میں۔ جن جن لوگوں نے عمارت بنانے میں کچھ بھی کام

کیا تھا سب ہی ہلاک ہو گئے۔

وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُودُهُ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ إِلَيْنَا لَا يُرْجَعُونَ ۝

اور فرعون اور اس کے تابعین اس زمین (یعنی اس دنیا) میں بغیر استحقاق کے بڑے بن بیٹھے تھے (مولانا تھانویؒ نے لکھا ہے اور فرعون اور اس کے تابعین نے اس دنیا میں سر اٹھار کھا تھا) اور یوں سمجھ رہے تھے کہ ان کو ہمارے پاس لوٹا کر نہیں لایا جائے گا۔

حق بمعنی استحقاق ، بر حق ، بڑا ہونا اسی کو زیبا ہوتا ہے جس سے بڑا اور اس کے برابر بلکہ اس کی نسبت سے کچھ کم بھی کوئی دوسرا نہ ہو اور ایسا صرف خدا تعالیٰ ہے (اس کی بڑائی سے کسی کی بڑائی کی کوئی نسبت ہی نہیں نہ زیادتی کی نہ برابری کی نہ کمی کی۔ در حقیقت وہی بڑا ہے کبریائی کے آخری درجہ پر پہنچا ہوا اسی لئے اللہ نے فرمایا بڑائی میری چادر ہے اور بزرگی میر الازار (یعنی عظمت و کبریائی میرا ہی لباس ہے) جو شخص بھی اس لباس کو مجھ سے کھینچے گا (اور اتار کر خود پہننا چاہے گا) میں اس کو دوزخ میں پھینک دوں گا۔ رواہ احمد و ابوداؤد و ابن ماجہ بسند صحیح عن ابی ہریرہ و ابن ماجہ عن ابن عباس حاکم نے صحیح سند سے حضرت ابوہریرہ کی روایت سے حدیث مذکور ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے بڑائی میری چادر ہے جو بھی میری چادر کو مجھ سے کھینچے گا میں اس کو توڑ دوں گا۔ (ہلاک کر دوں گا) سمویہ نے حضرت ابوسعیدؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں جو شخص مجھ سے دونوں میں سے کسی کو بھی کھینچے گا میں اس کو عذاب دوں گا۔

فَأَخَذْنَاهُ وَجُنُودَهُ فَنَبَذْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ ۖ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ ۝

تو ہم نے اس کو اور اس کے تابعین کو پکڑ کر دریا میں پھینک دیا (اور غرق کر دیا) سو دیکھئے ظالموں کا کیسا برا انجام ہوا یعنی اپنی قوم کو اس طرح کے برے انجام سے ڈرایئے۔

وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ لَا يُنصَرُونَ ۝ وَأَتْبَعْنَاهُمْ فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ هُم مِّنَ الْمَقْبُوحِينَ ۝

اور ہم نے ان کو (گمراہوں کا) پیشوا بنادیا جو (لوگوں کو) دوزخ کی طرف بلا رہے تھے اور قیامت کے دن (اتنے بے بس ہوں گے کہ) ان کی کوئی مدد نہیں کی جائے گی اور اس دنیا میں (بھی) ہم نے ان کے پیچھے لعنت لگا دی اور قیامت کے دن (بھی) وہ بد حال لوگوں میں سے ہوں گے۔

اَئِمَّةً یعنی گمراہوں کے پیشوا جو دوسروں کو گمراہ کرنے پر آمادہ کرتے تھے یا دنیا میں سردار اور مالدار آبرو والے رئیس۔

اِلَی النَّارِ دوزخ کی طرف یعنی ان اسباب کی طرف جو دوزخ میں داخلہ کے موجب تھے یعنی کفر و معاصی کی طرف۔

لَا یُنْصَرُوْنَ یعنی کوئی شخص عذاب الٰہی کے مقابلہ میں ان کی مدد نہیں کرے گا۔

لَعْنَةً یعنی رحمت سے دور کر دیا لعنت کرنے والوں کی لعنت ان کے پیچھے لگا دی کہ اللہ اور ملائکہ اور مومن بندے ان پر لعنت کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ اَلْمَقْبُوْحِیْنَ یعنی رحمت سے دور ملعون لوگوں میں سے۔ ابو عبیدہؒ نے ترجمہ کیا ہلاک کردہ لوگوں میں سے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا بگڑی ہوئی صورتوں والوں میں سے چہرے کالے، آنکھیں نیلی۔ عرب کہتے ہیں قَبَحَهُ اللّٰهُ اللہ نے اس کی صورت بگاڑ دی اور ہر بھلائی سے اگر کسی کو دور کر دیا ہو تو عرب کہتے ہیں قَبَحَهُ قُبْحًا و قُبُوحًا۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ مِن بَعْدِ مَا أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ الْأُولَىٰ بَصَائِرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ۝

اور ہم نے موسیٰ کو اگلی امتوں کو ہلاک کرنے کے پیچھے کتاب (توریت) دی تھی جو (اسرائیلی) لوگوں کے لئے دانشمندیوں کا مجموعہ اور ہدایت و رحمت تھی تاکہ وہ اس سے نصیحت حاصل کریں۔

اَلْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى یعنی قوم نوح قوم ہود، قوم صالح، قوم لوط وغیرہ۔

بَصَآئِرَ بصائر بصیرت کی جمع ہے۔ بصیرت وہ نور جو دلوں میں ہوتا ہے اور اس کے ذریعہ سے دل اشیاء یعنی واجب اور ممکن کی حقائق کو بقدر طاقت بشری دیکھ لیتے ہیں حق و باطل کو پرکھ لیتے ہیں اور سیدھی اور ٹیڑھی راہوں میں امتیاز کر لیتے ہیں۔

هُدًى یعنی ایسی ہدایت جس سے راہ نجات مل جائے اور امور معاش و معاد درست ہو جائیں۔

وَّرَحْمَةً یعنی رحمت خداوندی کے حصول کا ذریعہ۔

لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ تاکہ وہ نصیحت پذیر ہو جائیں یا ان کی ایسی حالت ہو جائے کہ نصیحت اندوز ہونے کی ان سے امید کی جا سکے۔

تذکر اور خوف علم کا ثمرہ ہے اللہ نے فرمایا ہے اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝

اور آپ (طور کے) مغربی جانب موجود نہیں تھے جب کہ ہم نے موسیٰ کو احکام دیئے تھے اور نہ آپ ان لوگوں میں تھے جو (اس زمانہ میں) موجود تھے۔

بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ یعنی موسیٰ کی جگہ سے، غربی جانب مطلب یہ ہے کہ طور کے غربی جانب۔ قتادہ اور سدی نے کہا کوہ غربی کی جانب۔ کلبی نے کہا وادی غربی کی جانب۔ سب کی مراد یہ ہے کہ جَانِب مضاف موصوف اور اَلْغَرْبِيِّ مضاف الیہ صفت نہیں ہے بلکہ اَلْغَرْبِيِّ کا موصوف محذوف ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے کہا اس سے مراد وہ مقام ہے جہاں حضرت موسیٰ نے اللہ سے کلام کیا تھا اور مَا كُنْتَ سے خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے یعنی اے محمد تم وہاں موجود نہ تھے۔

اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ یعنی جب ہم نے فرعون اور اس کی قوم کے پاس پیام لے جانے کی موسیٰ کے پاس وحی بھیجی تھی۔

وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ یعنی آپ ان لوگوں میں نہ تھے جو موسیٰ کے پاس وحی آنے کے شاہد تھے یا اس وقت موجود تھے جب موسیٰ پر نزول وحی ہو رہا تھا۔ اَلشّٰهِدِيْنَ سے مراد وہ ستر آدمی ہیں جن کو حضرت موسیٰ اپنے ساتھ طور پر لے گئے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ موسیٰ کے واقعات لوگوں کے سامنے بیان کرنا تمہارے لئے بغیر وحی اور اطلاع غیبی کے ممکن نہیں۔ یہ تمہارا ایک (خداداد) معجزہ ہے جو تمہارے دعویٰ نبوت کو ثابت کر رہا ہے۔

وَلٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ لیکن (موسیٰ کے بعد) ہم نے بہت سی نسلیں پیدا کیں پھر ان پر زمانہ دراز گزر گیا۔

قُرُوْنًا یعنی ہم عصر لوگ یا مضاف محذوف ہے اور قرن کا معنی ہے زمانہ یعنی مختلف زمانوں والے (اہل قرون)۔

فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ یعنی ہم نے تمہارے پاس وحی بھیجی کیونکہ انقطاع پیغمبری کا زمانہ طویل ہو گیا تھا علوم مٹ چکے تھے شریعتیں بگڑ چکی تھیں خبروں میں اختلاف و تعارض اس وجہ سے ہو گیا تھا کہ ہم نے موسیٰ کے بعد مختلف قرون پیدا کر دیئے مدت طویل ہو گئی اس لئے باہم اختلاف ہو گیا اور ایک دوسرے کو کاذب قرار دینے لگا۔

بغوی نے لکھا ہے اللہ نے حضرت موسیٰ سے اور ان کی قوم سے محمد ﷺ کی بابت کچھ عہد لئے تھے اور آپ پر ایمان لانے کا وعدہ لیا تھا لیکن جب مدت دراز ہو گئی اور ایک قرن کے بعد دوسری قرن پیہم گزرتی چلی گئی تو لوگ ان عہدوں کو بھول گئے اور وفاء عہد سے غافل ہو گئے۔ اس تفسیر پر آیت کا مطلب اس طرح ہوگا جب آپ کی بابت ہم نے موسیٰ سے عہد لیا تھا اس وقت آپ موجود نہیں تھے نہ آپ کی درخواست پر ایسا کیا گیا تھا بلکہ ہم نے اپنی مہربانی سے خود ہی ایسا کیا تھا تاکہ آئندہ طویل زمانہ گزرنے کے بعد تمہارے مخالفوں کو عذر کا موقع نہ رہے اور جب ہم نے قرن در قرن پیدا کر دیئے تو مدت دراز ہو گئی اور یہ لوگ بھول گئے (اسی مفہوم کی ایک اور آیت آئی ہے فرمایا ہے وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ سے آخر

تَقُولُوٓا اِنَّا کُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ..... تک

وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِیٓ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۙ اور نہ اہل مدین میں آپ قیام پذیر تھے کہ (وہاں کے حالات دیکھ کر) ہماری آیتیں ان لوگوں کو پڑھ پڑھ کر سنا رہے ہوں۔

تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا یعنی وعدہ اور وعید سنا کر تم ان کو نصیحت کر رہے ہو۔ مقاتل نے کہا مطلب یہ ہے کہ تم اہل مدین میں موجود نہ تھے کہ ان کی خبریں اہل مکہ کو پڑھ کر سنا رہے ہو۔

وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ۝ بلکہ (اہل مکہ اور سب لوگوں کی طرف ہم ہی تم کو معجزات اور غیب کی خبریں دے کر) بھیجنے والے ہیں۔

یعنی اگر یہ بات نہ ہوتی تو تم ان کے واقعات ان لوگوں کو نہ سنا سکتے۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا اور نہ آپ طور کے جانب موجود تھے جس وقت کہ ہم نے (موسیٰ کو) پکارا تھا۔

بِجَانِبِ الطُّوْرِ طور کے کنارے جہاں اللہ نے موسیٰؑ سے کلام کیا تھا۔

اِذْ نَادَيْنَا جب ہم نے (موسیٰ کو) پکارا تھا اور کہا تھا خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ اس جگہ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ سے مراد ہے توریت عطا کرنے کا وقت اور وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِیِّ سے مراد ہے نبوت عطا کرنے کا وقت۔

وہب کا بیان ہے موسیٰؑ نے کہا اے میرے رب مجھے محمد کا دیدار کرا دے۔ اللہ نے فرمایا تم ہرگز وہاں تک نہیں پہنچ سکتے اور اگر تم چاہو تو میں ان کی امت کو پکاروں اور ان کی آواز تم کو سنوا دوں، موسیٰؑ نے کہا بہت خوب۔ اللہ نے فرمایا اے امت محمد امت والوں نے اپنے باپوں کی پشت سے لبیک کہا۔

ابوزرعہ بن عمرو بن جریر کا قول ہے کہ اللہ نے ندا دی اے امت محمد قبل اس کے کہ تم مجھ سے دعا کرو میں نے تمہاری دعا قبول کرلی اور مانگنے سے پہلے تم کو دے دیا۔

حضرت ابن عباسؓ نے کہا اللہ نے فرمایا اے امت محمد لوگوں نے باپوں کی پشتوں اور ماؤں کے رحموں سے جواب دیا لبیک اللھم لبیک ان الحمد والنعمة لک و الملک لک لاشریک لک اللہ نے فرمایا اے امت محمد میری رحمت میرے غضب سے اور میری معافی میرے عذاب سے آگے ہے (یعنی غالب ہے) میں نے مانگنے سے پہلے تم کو دے دیا اور دعا کرنے سے پہلے تمہاری دعا قبول کرلی اور گناہ کرنے سے پہلے تمہاری مغفرت کردی جو شخص قیامت کے دن یہ گواہی لے کر آئے گا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ میرے بندے اور رسول ہیں وہ جنت میں داخل ہو جائے گا خواہ اس کے گناہ سمندر کے جھاگوں سے بھی زیادہ ہوں۔

وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝ (لیکن ہم نے آپ کو بھیجا ہم نے آپ کو تعلیم دی) آپ کے رب کی رحمت کی وجہ سے تاکہ آپ ایسے لوگوں کو ڈرائیں کہ جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا (نبی) نہیں آیا تاکہ وہ نصیحت پذیر ہوں۔

قوماً سے مراد ہیں اہل مکہ مثل مکہ کو (بلکہ سارے عرب کو۔ مترجم) حضرت اسماعیلؑ کے بعد رسول ﷺ سے پہلے کوئی ڈرانے والا یعنی نبی نہیں آیا حضرت موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو صرف بنی اسرائیل کے لیے بھیجا گیا تھا۔

وَلَوْلَآ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَيَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ اگر یہ بات نہ ہوتی تو ان کی بدکرداری کے سبب جب ان پر کوئی مصیبت آپڑے گی تو وہ کہنے لگیں گے اے ہمارے رب تو نے ہمارے پاس کوئی پیغمبر نہیں بھیجا کہ ہم تیرے احکام پر چلتے اور مومنوں میں سے ہو جاتے (تو ہم پیغمبر نہ بھیجتے)۔

مُّصِيْبَةٌ یعنی عذاب اور سزا۔ وَلَوْلَآ اَنْ تُصِيْبَهُمْ الخ کا جواب محذوف ہے پورا مطلب اس طرح ہے اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ بد کرداری کی وجہ سے نازل ہونے والی مصیبت کے وقت یہ لوگ کہنے لگیں گے کہ ہمارے پاس کوئی رسول کیوں نہیں بھیجا گیا کہ ہم ایمان لاتے اور احکام کا اتباع کرتے تو ہم کوئی پیغمبر نہ بھیجتے اور بغیر حجت و تخویف سابق کے ان کے کفر کی سزا ان کو دیدیتے لیکن ہم نے اتمام حجت اور آئندہ معذرت کا راستہ بند کرنے کے لیے آپ کو پیغمبر بنا کر بھیجا لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ تاکہ پیغمبروں کی بعثت کے بعد لوگوں کو کفر و معصیت کا کوئی عذر پیش کرنے کا موقع باقی نہ رہے۔

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى ۭ

پھر جب ان کے پاس حق (قرآن یا پیغمبر) ہمارے پاس سے آگیا تو کہنے لگے اس (پیغمبر) کو ویسا معجزہ کیوں نہیں دیا گیا جیسا موسیٰؑ کو دیا گیا تھا۔

قَالُوْا یعنی کفار مکہ نے محض ضد اور ہٹ کی وجہ سے کہا۔

مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى یعنی موسیٰؑ کو جیسے عصا اور ید بیضاء وغیرہ کے معجزات دیے گئے ایسے معجزات اس پیغمبر کو کیوں نہیں دیئے گئے یا یہ مطلب کہ جیسے پوری کتاب یکدم موسیٰؑ پر اتاری گئی تھی ویسی یکدم پوری کتاب محمد ﷺ پر کیوں نہ اتاری گئی۔

اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۚ قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا ۣ کیا موسیٰؑ کو جو کچھ پہلے دیا گیا تھا اس کا انہوں نے انکار نہیں کیا تھا اور کہا تھا یہ دونوں جادوگر ہیں جو باہم متفق ہو گئے ہیں (ایک دوسرے کا مددگار ہو گیا ہے)۔

اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا میں استفہام انکاری ہے اور انکار نفی اثبات ہوتا ہے یعنی انہوں نے انکار کیا تھا۔ مِنْ قَبْلُ سے مراد ہے قرآن سے پہلے۔

لَمْ يَكْفُرُوْا سے مراد ہیں کفار مکہ کے ابناء جنس جو رائے و مذہب میں انہی جیسے تھے یعنی حضرت موسیٰؑ کے زمانہ کے کافر (فرعون اور قوم فرعون) مطلب یہ کہ موسیٰؑ کے زمانہ کے کافروں نے موسیٰؑ کی تکذیب کی اور جو معجزات موسیٰؑ کو دیے گئے تھے ان کی صداقت کو ماننے سے انہوں نے انکار کر دیا۔ پھر یہ کفار مکہ (جو کفار موسیٰؑ کی طرح ہیں بلکہ بالکل وہی ہیں مترجم) کس طرح آپ سے موسیٰؑ کے معجزات جیسے معجزات طلب کرتے ہیں (یہ بھی انکار کر دیں گے اور موسیٰؑ کے معجزات جیسے معجزات کو نہیں مانیں گے۔ مترجم)۔

کلبی کا بیان ہے جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ والوں کو اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے مدینہ کو علماء یہود کے پاس کچھ آدمی رسول اللہ ﷺ کے دعویٰ کی صداقت یا کذب کو دریافت کرنے کے لیے بھیجے۔ یہودیوں نے بتایا کہ پیغمبر آخر الزماں یعنی محمد ﷺ کے اوصاف توریت میں موجود ہیں قاصدوں نے واپس آکر مکہ والوں سے یہودیوں کا جواب نقل کر دیا لیکن انہوں نے اس جواب کو بھی نہ مانا اور جو کتاب موسیٰؑ کو دی گئی تھی اس کا بھی انکار کر دیا۔ اس شان نزول پر اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا کا فاعل حقیقتاً کفار مکہ ہوں گے اور مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى سے مراد توریت ہو گی۔ مترجم)۔

قَالُوْا سِحْرٰنِ بقول کلبی مکہ والوں نے کہا کہ محمد ﷺ اور موسیٰؑ دونوں جادوگر ہیں۔ دوسرے اہل تفسیر کے قول پر ساحران سے مراد ہوں گے موسیٰؑ اور ہارونؑ۔

تَظٰهَرَا یعنی محمد ﷺ اور موسیٰؑ دونوں متفق ہو گئے ہیں ایک کی کتاب دوسرے کی کتاب کی تائید کر رہی ہے یا موسیٰؑ اور ہارونؑ متفق الرائے ہو گئے ہیں۔

وَقَالُوْٓا اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ ۝ اور (کفار مکہ یا موسیٰؑ کے زمانہ کے کافروں نے) کہا ہم ان دونوں محمد ﷺ و موسیٰؑ یا موسیٰؑ و ہارونؑ میں سے ہر ایک کے منکر ہیں۔

کلبی کا تفسیری قول رفتار کلام کے زیادہ مناسب ہے اور آئندہ آیت سے بھی زیادہ موافق ہے۔

قُلْ فَأْتُوا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَا اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

(اے محمد) آپ کہہ دیجئے اگر تم سچے ہو (کہ محمد ﷺ و موسیٰؑ جادوگر ہیں اور ان کی پیش کردہ کتابیں جادو ہیں) تو اللہ کی طرف سے کوئی ایسی کتاب پیش کرو جو ان دونوں سے (یعنی محمد ﷺ و موسیٰؑ کی کتابوں سے) زیادہ ہدایت آفریں ہو کہ میں اس پر چلوں۔

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ اس میں حرف شک (یعنی ان) اظہار شک کے لئے نہیں ہے بلکہ بطور استہزاء ذکر کیا گیا ہے اور اس سے مراد ہے صرف لاجواب بنا دینا اور الزام دینا۔

فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ؕ پھر اگر یہ آپ کے کہنے کو پورا نہ کر سکیں تو آپ سمجھ لیں کہ یہ لوگ محض اپنی نفسانی خواہشات پر چلتے ہیں۔

یعنی آپ جو ان سے ایسی کتاب پیش کرنے کو کہہ رہے ہیں جو قرآن و توریت سے زیادہ ہدایت آگیں ہو اگر یہ لوگ ایسی کتاب پیش نہ کر سکیں تو جان لیجئے کہ ان کے پاس کوئی دلیل نہیں اگر کوئی دلیل ہوتی تو پیش کرتے۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

اور ایسے شخص سے زیادہ کون گمراہ ہوگا جو نفسانی خواہش پر چلتا ہو بغیر اس کے کہ اللہ کی طرف سے کوئی دلیل اس کے پاس ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے ناحق کوش لوگوں کو اللہ ہدایت نہیں کیا کرتا۔

بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ محض تاکید ہے یا قید (احترازی) ہے کیونکہ خواہش نفس کبھی حق کے موافق ہو جاتی ہے بشرطیکہ ایمان کامل ہو جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تم میں سے کوئی شخص (کامل) مومن نہیں ہوگا جب تک کہ اس کا میلان نفس اس (حق) کا تابع (نہ) ہو جائے جو میں لے کر آیا ہوں۔ رواہ البغوی فی شرح السنۃ عن عبداللہ بن عمرو وقال النووی حدیث صحیح۔ اَلظّٰلِمِيْنَ یعنی جن لوگوں نے خواہشات نفسانیہ میں انہماک کیا ہو اور خود اپنے نفسوں پر ظلم کیا ہو۔

وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝ اور ہم نے اس کلام (یعنی قرآن) کو ان کے لئے مسلسل نازل کیا (یعنی تازہ بتازہ ایک کے بعد دوسری آیت) تاکہ یہ لوگ (تازہ بتازہ سننے کے بعد) نصیحت حاصل کریں۔

وَلَقَدْ وَصَّلْنَا الخ فراء نے کہا یعنی ہم نے قرآن کی آیات یکے بعد دیگرے اتاریں۔ بیضاوی نے لکھا ہے یعنی ہم نے اتارنے میں اتصال رکھا تاکہ یاد دہانی برابر ہوتی رہے یا عبارت میں وصل رکھا تاکہ دلائل سے دعوت میں اور وعدہ وعید سے مواعظ میں اور عبرتوں سے نصیحتوں میں قوت پیدا ہو۔ مفسر مدارک نے لکھا ہے توصیل کا معنی ہے تکثیر و تکرار وصل (یعنی باب تفعیل مبالغہ کے لئے ہے مترجم) حضرت ابن عباسؓ نے وَصَّلْنَا کا ترجمہ کیا ہے بَيَّنَّا ہم نے کھول کر بیان کر دیا یعنی بعض آیات دوسری آیات کے مضمون کو کھول کر بیان کرنے والی ہیں۔ قتادہ نے کہا اس قرآن میں اللہ نے بار بار بیان کیا ہے کہ گزشتہ لوگوں سے کیا سلوک کیا گیا۔ مقاتل نے کہا ہم نے کفار مکہ کے لئے قرآن میں گزشتہ امتوں کے واقعات بیان کر دیئے اور بتا دیا کہ تکذیب و کفر کی وجہ سے ان پر کیسے عذاب آئے۔ ابن زید نے کہا ہم نے خبر دنیا کے ساتھ خبر آخرت کو ملا دیا اس قدر کہ گویا انہوں نے دنیا میں آخرت کا معائنہ کر لیا۔ ابن جریر اور طبرانی نے رفاعہ قرظی کا قول نقل کیا ہے کہ آیت وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ دس آدمیوں کے حق میں نازل ہوئی جن میں سے ایک میں ہوں۔

ابن جریر نے علی بن رفاعہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ اہل کتاب میں سے دس آدمی جن میں ایک رفاعہ یعنی علی کے باپ بھی تھے نکل کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور ایمان لے آئے پھر ان کو دکھ دیئے گئے اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۝ اس (قرآن یا محمد ﷺ) سے پہلے ہم

نے جن لوگوں کو کتاب دی تھی وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں۔

ابن جریر نے قتادہ کا قول نقل کیا ہے ہم سے بیان کیا جاتا تھا کہ (بعثت سے پہلے) اہل کتاب میں سے دس آدمی حق پر تھے پھر جب رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے تو وہ حضور ﷺ پر ایمان لے آئے انہی میں سے عبداللہ بن سلام بھی تھے۔ کذا ذکرہ البغوی و کذا اخرج ابن مردویہ عن ابن عباس۔ طبرانی نے الاوسط میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت نجاشی کے ساتھیوں میں چالیس آدمی آئے اور غزوۂ خیبر میں شریک ہوئے اور کچھ زخمی بھی ہوئے شہید کوئی نہیں ہوا۔ پھر خیبر کے واقعہ کے بعد انہوں نے دیکھا کہ مسلمان بہت محتاج ہیں تو خدمت گرامی میں عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہم مالدار ہیں ہم کو اجازت دیجئے کہ ہم اپنا مال لے کر آجائیں اور مسلمانوں کی مالی ہمدردی کریں۔ اس پر آیت اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ یُؤْمِنُوْنَ نازل ہوئی۔

ابن ابی حاتم نے بروایت سعید بن جبیرؒ بیان کیا ہے کہ جب حضرت جعفرؓ اور آپ کے رفقاء نجاشی کے پاس پہنچے تو نجاشی نے ان کی میزبانی کی اور اچھا سلوک کیا جب یہ لوگ لوٹنے لگے تو نجاشی کی حدود مملکت میں رہنے والوں نے نجاشی سے کہا ہم کو اجازت دیجئے کہ (ہم ان کے ساتھ جائیں اور) سمندر میں ان کی خدمت کریں اور پھر نبی کی خدمت میں پہنچ کر تجدید عہد کریں۔ نجاشی نے اجازت دے دی، وہ لوگ اپنے ملک سے روانہ ہو کر خدمت گرامی میں حاضر ہو گئے۔ احد، حنین، اور خیبر کی لڑائیوں میں حضور ﷺ کے ساتھ شریک ہوئے لیکن ان میں سے کوئی شہید نہیں ہوا، اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں گزارش کی کہ ہم کو اپنے دیس کو جانے کی اجازت مرحمت فرما دیجئے، اپنے ملک میں ہمارے پاس مال ہے، ہم وہاں سے مال لا کر مہاجرین کو تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ مہاجرین سخت محنت (ناداری) میں مبتلا ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اجازت دے دی وہ لوگ چلے گئے پھر مال لے کر آئے اور مہاجرین کو تقسیم کیا اللہ نے انہیں کے بارے یہ آیت نازل فرمائی۔

بغوی نے سعید بن جبیر وغیرہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ انہیں کے بارے میں اللہ نے آیات اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ سے وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ تک نازل فرمائیں۔

(بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ یہ آیت اسی ۸۰ اہل کتاب کے حق میں نازل ہوئی ہیں نجرانی تھے بتیس حبشی اور آٹھ شامی)۔

اس سے آگے مومنین اہل کتاب کے اوصاف بیان فرماتے ہیں۔

وَاِذَا یُتْلٰى عَلَیْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِیْنَ ﴿۵۳﴾

اور جب (قرآن) ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے بلاشبہ یہی سچا ہے ہمارے رب کی طرف سے (اترا ہے) ہم تو اس سے پہلے ہی مسلم (اطاعت گزار) تھے۔

ہم اس پر ایمان لائے یعنی اس بات پر ایمان لائے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ مُسْلِمِیْنَ یعنی اقرار توحید میں مخلص تھے، محمد ﷺ کے نبی ہونے پر ایمان رکھتے تھے۔ پہلے سے رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر ایمان رکھنے کی یہ وجہ تھی کہ حضرت عیسیٰؑ نے رسول اللہ ﷺ کی بشارت دے دی تھی اور فرما دیا تھا مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ اور رسول اللہ ﷺ کا ذکر توریت میں بھی تھا اور انجیل میں بھی۔ مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر ہمارا ایمان نیا نہیں بلکہ پہلے سے ہے۔

ممکن ہے کہ جملہ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِیْنَ استینافیہ نہ ہو بلکہ رَبِّنَآ اٰمَنَّا بِهٖ کا بیان ہو رَبِّنَآ اٰمَنَّا میں ایمان جدید و قدیم دونوں کا احتمال تھا۔ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ سے ایمان جدید کا احتمال زائل ہو گیا۔

اُولٰٓئِكَ یُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَیْنِ ان لوگوں کو ان کا اجر دو مرتبہ دیا جائے گا (دوہرا اجر ملے گا)۔

ایک بار اپنی کتاب پر اور کتاب کی شہادت کے بموجب نزول قرآن سے پہلے قرآن پر ایمان لانے کا اور دوسری مرتبہ نزول قرآن کے بعد اس پر ایمان لانے کا۔

بِمَا صَبَرُوْا بوجہ اس کے کہ وہ (نزول قرآن کے بعد اپنے ایمان پر) جمے رہے۔ (جس طرح پہلے ایمان رکھتے تھے اسی طرح نزول کے بعد بھی ایمان پر قائم رہے۔ برخلاف دوسرے اہل کتاب کے کہ نزول قرآن سے پہلے تو قرآن پر ان کا ایمان تھا اور کافروں کے مقابلہ میں رسول اللہ ﷺ کے طفیل سے دعاء فتح کیا کرتے تھے۔ لیکن جب وہ جانا پہچانا قرآن (یا رسول) ان کے پاس آگیا تو محض حسد کی وجہ سے ماننے سے انکار کر دیا اور سابق ایمان پر قائم نہ رہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین (آدمی) ہیں جن کو دوہرا ثواب ملے گا ایک وہ کتابی جو اپنے نبی پر بھی ایمان لایا اور محمد پر بھی ایمان لایا، (دوسرا) وہ مملوک غلام جس نے اللہ کا بھی حق ادا کیا اور اپنے آقاؤں کا بھی اور (تیسرا) وہ شخص جس کے پاس کوئی باندی ہو اور وہ اس کو اچھی طرح تربیت و تعلیم دے کر آزاد کر کے اس سے نکاح کر لے اس کو بھی دوہرا ثواب ہو گا۔

وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اور وہ بھلائی سے برائی کو دفع کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا لا الٰہ الا اللہ کی شہادت دے کر شرک کو دفع کرتے ہیں۔ مقاتل نے کہا مشرکوں کی طرف سے گالیاں اور برا بھلا سن کر عفو و درگزر سے کام لیتے ہیں۔

میں کہتا ہوں یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ دشمنوں کی دشمنی کو ان کے ساتھ بھلائی کر کے دفع کرتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا ہے فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ جس شخص کی تم سے دشمنی ہے (اگر اس کے ساتھ احسان کرو گے) تو وہ ایسا ہو جائے گا کہ گویا وہ گہرا دوست ہے۔ یہ بھی مطلب بیان کیا گیا ہے کہ طاعت سے معصیت کو دفع کرتے ہیں اللہ نے فرمایا ہے اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ بلاشبہ نیکیاں گناہوں کو زائل کر دیتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے بدی کے پیچھے نیکی کر لیا کرو کہ وہ بدی کو مٹا دے گی۔

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے کچھ (راہ خیر میں) خرچ کرتے ہیں۔

وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۡ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۡ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ۝ اور جب وہ (مشرکوں سے) بیہودہ بات سنتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں ہمارے عمل ہمارے لئے تمہارے عمل تمہارے لئے (ہمارا دین ہمارے لئے تمہارا دین تمہارے لئے) تم کو سلام ہم جاہلوں (سے الجھنا) نہیں چاہتے۔

اَللَّغْوَ بیہودہ بات۔ بغوی نے لکھا ہے کہ مشرکین مومنین اہل کتاب کو گالیاں دیتے اور کہتے تھے تم مردو تم نے اپنا مذہب چھوڑ دیا۔ مومن ان سے منہ پھیر لیتے اور کوئی جواب نہیں دیتے تھے۔ سلام علیکم اس سے مراد سلام تحیت و دعا نہیں بلکہ سلام ترک مراد ہے مطلب ہم گالیاں نہیں دیں گے، برا نہیں کہیں گے تم کو جواب نہیں دیں گے۔ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ یعنی ہم جاہلوں کا دین نہیں چاہتے تمہارے مذہب کو پسند نہیں کرتے۔ بعض کے نزدیک یہ مطلب ہے کہ ہم جاہلوں کے ساتھ رہنا نہیں چاہتے۔ بعض نے یہ مطلب بیان کیا ہے ہم جاہلوں میں سے ہونا نہیں چاہتے یعنی تم ہم کو گالیاں دیتے ہو برا کہتے ہو اگر جواب میں ہم بھی تم کو گالیاں دیں گے تو تمہاری طرح جاہل ہو جائیں گے اور ہم ایسا ہونا نہیں چاہتے، ہم جاہلوں میں سے ہو جانے سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

بغوی نے لکھا ہے یہ حکم اس وقت تھا جب جہاد کا حکم نہیں ہوا تھا۔ میں کہتا ہوں بغوی کا یہ قول واقعہ نزول کے مطابق نہیں ہے کیونکہ اس آیت کا نزول یا حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھیوں کے حق میں ہوا یہ حضرات تو ہجرت کے بعد اسلام لائے تھے یا ان حبشیوں کی بابت ہوا جو حضرت جعفر بن ابی طالب کے ساتھ نجاشی کے پاس سے آئے تھے ان کی آمد بھی ۷ھ میں غزوۂ خیبر کے وقت ہوئی تھی یا چالیس نجرانیوں اور آٹھ شامیوں کے متعلق نزول ہوا۔ یہ واقعہ بھی ہجرت کے بعد کا ہے اور اس وقت کا جب جہاد کا حکم آچکا تھا۔

مسلم وغیرہ نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا ابو طالب سے فرمایا آپ لا الٰہ الا اللہ کہہ دیجئے تاکہ قیامت کے دن میں آپ کے لئے شہادت دے سکوں۔ اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ قریش کی عورتیں عار دلائیں گی اور کہیں گی (موت کے) خوف سے ابو طالب نے کلمہ پڑھ لیا تو میں یہ کلمہ پڑھ کر تمہاری آنکھ ٹھنڈی کر دیتا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝

بے شک آپ (ہر اس شخص کو) جس کو پسند کریں ہدایت یاب نہیں کر سکتے بلکہ اللہ ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت یاب کرتا ہے اور وہی ہدایت پانے والوں کو خوب جانتا ہے۔

مَنْ اَحْبَبْتَ یعنی جس کو ہدایت یاب کرنا آپ پسند کریں یا جس سے قرابت داری کی وجہ سے آپ کو محبت ہو۔ اَلْمُهْتَدِيْنَ مجاہد و مقاتل نے کہا یعنی ان لوگوں کو اللہ ہی خوب جانتا ہے جن کے لئے ہدایت مقرر کر دی گئی ہے۔ ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں اور نسائی نے ابو سعید بن رافع کی روایت سے بیان کیا ہے۔ ابو سعید نے کہا میں نے حضرت ابن عمرؓ سے دریافت کیا کیا آیت اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ ابو جہل اور ابو طالب کے متعلق نازل ہوئی۔ فرمایا ہاں شیخین، نسائی، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابو الشیخ، ابن مردویہ اور بیہقی نے سعید بن مسیب کے حوالہ سے ان کے باپ کی روایت نقل کی ہے، سعید کے باپ نے کہا ابو طالب کے انتقال کا وقت آپہنچا تو رسول اللہ ﷺ ان کے پاس تشریف لے گئے ابو جہل اور عبداللہ بن ابی امیہ بن مغیرہ وہاں موجود تھے حضور ﷺ نے فرمایا میرے چچا لا الٰہ الا اللہ ایک بار کہہ دیجئے تاکہ اللہ کے سامنے اس کلمہ کو آپ کے لئے حجت میں پیش کر سکوں ابو جہل اور عبداللہ نے کہا کیا آپ عبدالمطلب کے دین سے روگرداں ہو جائیں گے۔ رسول اللہ برابر کلمہ پیش کرتے رہے اور بار بار دہراتے رہے، بالآخر ابو طالب نے جو آخری لفظ زبان سے نکالا وہ یہ تھا علیٰ ملۃ عبدالمطلب۔ عبدالمطلب کے مذہب پر اور لا الٰہ الا اللہ کہنے سے انکار کر دیا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تک مجھے ممانعت نہ ہوگی میں آپ کے لئے دعاء مغفرت کرتا رہوں گا، اس کے بعد یہ آیت نازل فرمائی مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ الآیۃ نبی کے لئے اور مسلمانوں کے لئے مشرکوں کے لئے دعا مغفرت کرنی جائز نہیں۔ الآیۃ اور ابو طالب کے متعلق یہ آیت نازل فرمائی اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ۔

ابن جریر نے بروایت عوفی حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ کچھ قریشی لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے کہا تھا اگر ہم آپ کی پیروی کریں گے تو لوگ ہم کو اچک لیں گے اس پر اللہ نے نازل فرمایا۔

وَقَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ۭ اور انہوں نے یعنی مکہ والوں نے کہا اگر ہم آپ کے ساتھ ہدایت پر چلیں گے تو ہم، ہماری (اس) زمین سے اچک لئے جائیں گے۔

بغوی نے لکھا ہے یہ آیت حارث بن عثمان بن نوفل بن عبد مناف کے بارے میں نازل ہوئی، حارث نے کہا تھا ہم جانتے ہیں کہ آپ جو کچھ کہتے ہیں وہ حق ہے لیکن اگر ہم آپ کے کہنے پر چلیں گے تو ہم کو اندیشہ ہے کہ عرب ہم کو مکہ کی سرزمین سے نکال دیں گے۔ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا کا یہی مطلب ہے۔ کذا اخرج النسائی وابن المنذر عن ابن عباس۔ نسائی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ حارث بن عامر بن نوفل نے یہ بات کہی تھی۔ اِخْتِطَاف (جھپٹ لینا، اچک لینا) تیزی سے چھین لینا۔ اللہ نے اس کی تردید میں فرمایا۔

اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

کیا ہم نے ان کو امن و امان والے حرم میں جگہ نہیں دی جہاں پر ہر قسم کے پھل کھنچے چلے آتے ہیں جو ہماری طرف سے کھانے کو ملتے ہیں لیکن ان میں سے اکثر لوگ (اس احسان و مصلحت کو) نہیں جانتے۔

اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ الخ استفہام انکاری ہے اور محذوف جملہ پر عطف ہے یعنی کیا ہم نے ان کو مکہ کا ساکن نہیں بنایا اور کیا ان کو حرم میں جگہ نہیں دی جو امن والا ہے۔ دور جاہلیت میں عرب باہم قتل و غارت کیا کرتے تھے، لوٹ مار کا عام دستور تھا کسی جگہ امن نہ تھا لیکن مکہ والے حرم کی حرمت کی وجہ سے امن چین سے رہتے تھے۔ مشہور بات ہے کہ ہرن بھیڑیوں سے اور کبوتر شکاری چیلوں سے محفوظ رہتے، حرم کے اندر کوئی جانور بھی کسی جانور کا شکار نہیں کرتا تھا۔

جب بت پرستی کے دور میں بت پرست حرمت حرم کی وجہ سے مامون و محفوظ تھے تو حرمت کعبہ کے ساتھ جب حرمت توحید بھی شامل ہو گئی تو پھر جھپٹ لے جانے پر اللہ کیسے قدرت دے سکتا ہے۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لیکن ان میں سے اکثر لوگ جاہل ہیں نہ اس بات کو سمجھتے ہیں نہ غور کرتے ہیں اور نہ تو کفر و معصیت کی وجہ سے اللہ کے عذاب سے چاہئے نہ کہ ایمان و توحید سے کیونکہ۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۢ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ۚ وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۵۸﴾ اور ہم بہت سی ایسی بستیاں ہلاک کر چکے ہیں جو اپنے اسباب عیش پر اتراتے تھے سو (دیکھ لو) یہ ان کے گھر (تمہاری نظروں کے سامنے) ہیں کہ ان کے بعد ان گھروں میں آبادی نہیں ہوئی مگر تھوڑے مکانوں میں اور آخر کار ان کے سب مکانوں کے ہم ہی مالک رہے۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ یعنی بہت سی بستیوں والوں کو ہم نے غارت کر دیا جن کی حالت تمہاری حالت کی طرح تھی۔ بَطِرَتْ جو نازاں تھی، مغرور تھی، اترائی تھی یعنی ان کے باشندے اپنی خوش عیشی کے زمانہ میں اتراتے تھے اللہ کی نعمتوں کے شکر گزار نہ تھے۔ عطاء نے کہا وہ عیش و غرور میں پڑے ہوئے تھے اللہ کا دیا ہوا رزق کھاتے تھے، مزے اڑاتے تھے اور بت پرستی کرتے تھے، اللہ کی نافرمانی میں غرق تھے۔ مَعِيْشَتَهَا یہ ظرف (مفعول فیہ) ہے یعنی عیش کے زمانہ میں اتراتے رہے۔ آخر اللہ نے ان کو غارت کر دیا اور ان کی بستیوں کو تباہ کر دیا سب کو ہلاک کر دیا۔

فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ پس یہ (قوم ثمود کے حجر میں کھنڈر اور قوم لوط کے ویران دیہات) جو ان کے رہنے کے مقامات تھے ویران پڑے ہیں۔

مِنْۢ بَعْدِهِمْ ان کے ہلاک کرنے کے بعد۔ اِلَّا قَلِيْلًا مگر قلیل سکونت یا تھوڑے وقت کے لئے (اول صورت میں مفعول بہ ہے اور دوسری صورت میں مفعول فیہ، مترجم) حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ان کھنڈروں میں ایک دن یا ایک گھنٹہ کے لئے مسافر اور راہگیر ٹھہرے اور کوئی ان میں نہیں رہا۔ بعض نے کہا کوئی شخص بھی سوائے تھوڑے سے لوگوں میں وہاں نہیں رہا اور یہ ان کے گناہوں کی نحوست کا نتیجہ ہوا۔

وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ یعنی ان کا جانشین کوئی نہیں رہا کہ ان مکانوں میں رہتا اور ان کی چیزیں استعمال کرتا ہم ہی آخر مالک رہے۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۹﴾ اور آپ کا رب ایسا تو نہیں کہ بستیوں کو ہلاک کر دے بغیر اس کے کہ ان کے صدر مقام میں کسی ایسے رسول کو بھیجے جو ہماری آیات ان کو پڑھ کر سنائے ہم بستیوں کو اسی وقت ہلاک کرتے ہیں جب ان میں رہنے والے بہت ہی شرارت کرنے لگیں۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ یعنی آپ کے رب کا یہ دستور نہیں ہے کہ بغیر رسول بھیجے کسی بستی کو یونہی تباہ کر دے۔

الْقُرٰى یعنی کافر بستیاں۔ فِيْٓ اُمِّهَا یعنی ان کی سب سے بڑی بستی میں۔

رَسُوْلًا (یعنی اللہ کے عذاب اور اس کے احکام کی خلاف ورزی سے) ڈرانے والا۔ بڑی بستی کو بعثت رسول کے لئے اس لئے خاص کیا کہ عموماً پیغمبروں کو سرداروں کے پاس ہدایت کرنے کے لئے (پہلے) بھیجا گیا کیونکہ عوام تو کفر و ایمان میں خواص

کے تابع ہوتے ہیں اس لئے رسول اللہ ﷺ نے ہرقل کو نامہ مبارک بھیجا تھا جس میں لکھا اسلام لاؤ سالم رہو گے ورنہ تم پر رعایا کا بھی وبال گناہ ہوگا۔ اور سردار لوگ عام طور پر بڑے شہروں میں ہی رہتے ہیں اور مرکزی مقامات ہی میں ان کے مکان ہوتے ہیں۔

یَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا مقاتل نے کہا رسول ان کو اطلاع دیتا ہے کہ اگر ایمان نہ لائے تو تم پر عذاب نازل ہوگا۔

اَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ یعنی پیغمبروں کو تکذیب اور انکار کرکے اپنے اوپر خود ظلم کرتے ہیں۔

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۶۰

اور جو کچھ تم کو (مال واسباب) دیا گیا ہے وہ دنیوی زندگی کا (عارضی) سروسامان اور سجاوٹ ہے اور جو (اجر و ثواب) اللہ کے ہاں ہے وہ (دنیوی سامان وزینت سے) بہت بہتر اور لازوال ہے کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے۔

فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا یعنی دنیوی سامان ہے جس کو تم برتتے ہو اور دنیا کی سجاوٹ ہے۔ جس سے زندگی بھر (زینت حاصل کرتے ہو فَمَا عِنْدَ اللّٰهِ یعنی جو جنت اور مراتب قرب خیر اس سے فی نفسہ بہتر ہے کیونکہ وہ خالص لذت اور کامل سرور ہے۔ وَّاَبْقٰى اور بہت زیادہ باقی رہنے والی ہے کیونکہ ابدی (لازوال) ہے اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ استفہام انکاری ہے اور عطف محذوف جملہ پر ہے یعنی تم غور نہیں کرتے اور نہیں سمجھتے۔

اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ۝۶۱

کیا وہ شخص جس سے ہم نے پسندیدہ وعدہ کر رکھا اور وہ اس کو (یعنی وعدہ کئے ہوئے ثواب کو) پائے گا بھی اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس کو دنیوی فوائد سے تو ہم نے بہرہ اندوز کر دیا ہے۔ پھر قیامت کے دن وہ ان لوگوں میں سے ہوگا جو گرفتار کرکے حاضر کئے جائیں گے۔

اَفَمَنْ میں استفہام انکاری ہے اور اس کا عطف محذوف جملہ پر ہے یعنی کیا اس کھلے ہوئے فرق کے باوجود تم نے اس شخص کو جس سے ہم نے ایک اچھا وعدہ کر رکھا ہے۔ الخ

وَعْدًا حَسَنًا یعنی جنت کا وعدہ۔ جس چیز کا وعدہ کیا جائے اگر وہ اچھی ہو تو اس کا وعدہ بھی اچھا ہوتا ہے جنت بجائے خود اچھی ہے اس لئے اس کا وعدہ بھی اچھا ہے۔

فَهُوَ لَاقِيْهِ لامحالہ وہ اس کو وعدۂ الٰہی کے مطابق ضرور پائے گا کیونکہ اللہ کے وعدہ کے خلاف ہونا ناممکن ہے۔

مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا یعنی وہ حیات دنیاوی کا سامان جو آلام سے پر ہے تکالیف اور مصائب نے اس کو مکدر کر دیا ہے پھر فانی ہے زوال کے بعد سوائے حسرت کے اس کا اور کوئی نتیجہ نہیں۔

اَلْمُحْضَرِيْنَ یعنی وہ لوگ جن کو حساب یا عذاب کے لئے حاضر کیا جائے گا۔ قتادہ نے کہا یعنی مومن و کافر برابر نہیں ہو سکتے کافر کا مآل برا اور مومن کا اچھا ہوگا۔

بغوی اور ابن جریر نے مجاہد کی روایت سے بیان کیا کہ یہ آیت رسول اللہ ﷺ اور ابوجہل کے بارے میں نازل ہوئی۔ دوسرے سلسلۂ روایت سے بغوی نے لکھا ہے کہ یہ آیت حضرت حمزہ اور ابوجہل کے متعلق نازل ہوئی۔ بغوی نے مقاتل اور محمد بن کعب قرظی کی روایت سے بیان کیا کہ اس آیت کا نزول حضرت حمزہ اور ابوجہل یا حضرت علی اور ابوجہل کے حق میں ہوا۔ بعض نے کہا کہ حضرت عمار اور ولید بن مغیرہ کے متعلق اس کا نزول ہوا۔

وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ۝۶۲ اور اس دن کو یاد کرو

جب اللہ ان (مشرکوں) کو پکار کر فرمائے گا (آج) وہ میرے شریک کہاں ہیں جن کو (دنیا میں میرا شریک) خیال کرتے تھے۔

میں کہتا ہوں شاید شرکاء سے مراد وہ سرداران کفر ہوں کہ جن کی وجہ سے ان کے تابعین نے اللہ کی عبادت چھوڑ کر

انھیں کی عبادت اختیار کرلی تھی اور انھیں کا اتباع کرتے تھے۔ ان کو شرکاء بطور استہزاء کہا گیا ہے۔

قَالَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ الَّذِينَ أَغْوَيْنَا ۚ أَغْوَيْنٰهُمْ كَمَا غَوَيْنَا ۚ تَبَرَّأْنَآ إِلَيْكَ ۖ مَا كَانُوٓا إِيَّانَا يَعْبُدُونَ ۝ جن لوگوں پر (خدا کی) بات پوری ہو چکی ہو گی وہ کہیں گے بے شک یہ وہی لوگ ہیں جن کو ہم نے بہکا دیا تھا جیسا ہم بہکے تھے ویسا ہی ہم نے ان کو بہکا دیا (آج) ہم تیرے سامنے ان سے دست بردار ہوتے ہیں (کیونکہ) یہ لوگ ہماری پوجا نہیں کرتے تھے۔

قَالَ الَّذِينَ یعنی کافروں کے سردار اور لیڈر کہیں گے۔ اَلْقَوْلُ یعنی اللہ کی یہ بات واجب ہو چکی ہو گی کہ میں دوزخ کو جنات سے اور آدمیوں سے سب سے بھر دوں گا اور اس کے علاوہ دوسری آیات وعید عذاب کا وقوع بھی واجب ہو چکا ہو گا۔ أَغْوَيْنَا مفعول کی ضمیر محذوف ہے یعنی یہ وہی لوگ ہیں جن کو ہم نے بہکا دیا تھا۔ كَمَا غَوَيْنَا یعنی جس طرح ہم بھٹک گئے تھے خود اپنے اختیار سے گمراہی میں پڑ گئے تھے کسی نے ہم پر جبر نہیں کیا تھا اسی طرح یہ لوگ خود اپنے اختیار سے بہکے تھے ہم نے ان پر زبردستی نہیں کی تھی ہم کو جبراً گمراہ کر دینے کا اختیار نہیں تھا ہم نے تو ان کو ورغلایا تھا وسوسے پیدا کئے تھے لالچ دیئے تھے۔ یہ لالچ میں پڑ گئے ہمارا فریب وسوسہ اگرچہ ان کو کفر کی طرف دعوت دے رہا تھا لیکن اللہ نے پیغمبر بھیج دیئے تھے، کتابیں نازل کردی تھیں، ہر طرح کی دلیلیں قائم کردی تھیں، جن کی موجودگی میں ان کو ہمارے بہکاوے میں نہ آنا چاہئے۔ یہ آیت مضمون کے لحاظ سے ایسی ہی ہے جیسی دوسری آیت میں فرمایا ہے وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الخ۔

تَبَرَّأْنَآ إِلَيْكَ یعنی آج ہم تیری بارگاہ میں تیرے سامنے ان سے اور جس کفر کو انہوں نے اپنے نفسانی میلان و جھکاؤ سے اختیار کیا تھا اس سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔

مَا كَانُوٓا إِيَّانَا يَعْبُدُونَ یعنی یہ ہماری پوجا نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی نفسانی خواہشات کے پجاری تھے۔

وَقِيلَ ادْعُوا شُرَكَآءَكُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُمْ وَرَأَوُا الْعَذَابَ ۚ لَوْ أَنَّهُمْ كَانُوا يَهْتَدُونَ ۝ اور (کافروں سے کہا) جائے گا اپنے شریکوں کو پکارو (وہ آج آکر تم کو عذاب سے رہا کرائیں) وہ پکاریں گے لیکن وہ جواب ہی نہیں دیں گے اور کافر اپنے لئے اور اپنے باطل معبودوں کے لئے) عذاب دیکھ لیں گے۔ اگر وہ (دنیا میں) ہدایت یاب ہو چکے ہوتے (تو عذاب ان کے سامنے نہ آتا)۔

شُرَكَآءَكُمْ اس جگہ شرکاء سے مراد ہیں بت اور دوسرے باطل معبود۔ فَدَعَوْهُمْ وہ معبودوں کو پکاریں گے یا تو اس کا سبب یہ ہو گا کہ وہ بدحواس ہو چکے ہوں گے دہشت زدہ ہو کر پکاریں گے یا اس لئے پکاریں گے کہ ان کا عقیدہ ہی تھا کہ یہ معبود خدا سے ہماری سفارش کریں گے۔ فَلَمْ يَسْتَجِيبُوا یعنی دعوت قبول نہیں کریں گے مدد کے لئے تیار نہ ہوں گے، کیونکہ مدد کرنے کی ان کو قدرت ہی نہیں ہو گی۔ لَوْ أَنَّهُمْ الخ یعنی اگر وہ دنیا میں ہدایت پالیتے تو آخرت میں یہ عذاب ان کو دیکھنا نہ پڑتا۔ زیادہ صحیح یہ ہے کہ آیت میں لَوْ اظہار تمنا کے لئے ہے یعنی وہ تمنا کریں گے کہ کاش وہ ہدایت یاب ہو گئے ہوتے۔

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ مَاذَآ أَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِينَ ۝ فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْأَنۢبَآءُ يَوْمَئِذٍ فَهُمْ لَا يَتَسَآءَلُونَ ۝ اور (یاد کرو اس دن کو) جس دن کافروں سے پکار کر پوچھا جائے گا کہ تم نے پیغمبروں کو کیا جواب دیا تھا سو اس روز ان کے ذہن سے ساری باتیں گم ہو جائیں گی سو وہ (نہ خود کوئی جواب دے سکیں گے نہ) باہم پوچھ سکیں گے (کہ پوچھ کر جواب دے سکیں)

اول الذکر سوال زجری سوال تھا جو شرک کے متعلق تھا اور یہ دوسرا سوال پیغمبروں کے انکار سے تعلق رکھتا ہے۔

فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْأَنۢبَآءُ یعنی جواب دینے کے سلسلہ میں وہ اندھوں کی طرح ہو جائیں گے جن کو کوئی راستہ نہیں سوجھتا پس وہ بھی اسی طرح کچھ بتانے سے عاجز ہو جائیں گے۔ کلام میں زور پیدا کرنے کے لئے اسلوب کو بدل دیا گیا ہے اصل کلام اس طرح تھا۔ فَعَمُوا عَنِ الْأَنۢبَآءِ مقصود یہ ہے کہ دنیا میں جو وجوہ بیان کی جاتی ہیں وہ عارضی ہوتی ہیں بیرونی مؤثرات کا

نتیجہ ہوتی ہیں قیامت کے دن بیرونی اغواء تو ختم ہو چکا ہو گا اور کوئی خارجی حیلہ گری موجود نہ ہو گی اس لئے کوئی جواب دے نہ سکیں گے۔

الْاَنْبَآءُ اس سے مراد ہے پیغمبروں کو جھوٹا قرار دینے کا عذر۔ مجاہد نے کہا دلائل مراد ہیں مطلب یہ ہے کہ وہ کچھ نہ کر سکیں گے اور کوئی دلیل پیش نہیں کر سکیں گے کیونکہ ان کے پاس کوئی دلیل ہی نہیں ہو گی۔

بیضاوی نے لکھا ہے کہ اس روز ڈر کے مارے جب پیغمبر جواب میں لڑکھڑا ئیں گے اور جواب کو اللہ کے علم کے سپرد کر دیں گے (اور کہیں گے کہ تو جانتا ہے تیرے علم میں ہے کہ ہم نے ان کو شرک کا حکم نہیں دیا وغیرہ) تو کافر لوگ کس گنتی میں ہوں گے۔ وہ کیا کہہ سکیں گے فَهُمْ لَا يَتَسَآءَلُوْنَ وہ آپس میں سوال نہیں کریں گے دہشت اور خوف کی وجہ سے پوچھنے کی بھی ہمت نہ ہوگی یا اس خیال سے نہیں پوچھیں گے کہ جس سے سوال کیا جائے گا وہ بھی سائل کی طرح (لاجواب) ہو گا پھر پوچھنے کا کیا حاصل۔

فَاَمَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِيْنَ ﴿۶۷﴾

لیکن جس نے (شرک سے) توبہ کر لی اور ایمان لے آیا اور نیک عمل کئے (یعنی ایمان کے ساتھ اعمال بھی ٹھیک کر لئے) تو امید ہے (یعنی اس کو امید رکھنی چاہئے کہ اللہ کے نزدیک) وہ فلاح پانے والے لوگوں میں سے ہو گا۔

عَسٰی کا لفظ اس جگہ یا تو اسی طرح استعمال کیا ہے جیسے بادشاہ یقینی بات کو بھی شکی الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں یا وہی مطلب ہے جو ترجمہ میں بیان کر دیا گیا ہے کہ مومن صالح کو امید رکھنی چاہئے۔ (یعنی امید کا رجوع اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں ہے اللہ امیدوار نہیں ہوتا بندہ امیدوار ہوتا ہے امید و خوف لازمہ بندگی ہے۔ مترجم)

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ ؕ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۸﴾

اور آپ کا رب جس چیز کو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور (جس حکم کو چاہتا ہے) اختیار کرتا ہے ان لوگوں کو (تخلیق اور تجویز احکام کا) کوئی اختیار حاصل نہیں اللہ تعالیٰ ان کی شرک آفرینی سے پاک اور برتر ہے۔

وَيَخْتَارُ اور جس کو جس چیز کے لئے چاہتا ہے اختیار کر لیتا ہے اس نے تمام لوگوں کو چھوڑ کر نبوت کے لئے محمد ﷺ کا انتخاب کر لیا۔ بغوی نے لکھا ہے مشرکوں نے کہا تھا یہ قرآن دونوں بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں اتارا گیا یعنی ولید بن مغیرہ پر یا عروۃ بن مسعود ثقفی پر اس قول کے جواب میں آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ خِیَرَۃٌ اسم مصدر ہے اور مصدر کے بجائے اس کا استعمال کیا جاتا ہے اور کبھی اسم مفعول کے معنی میں بھی یہ مستعمل ہے جیسے محمد خيرة الله من خلقه اللہ کی مخلوق میں اللہ کی طرف سے برگزیدہ کئے ہوئے محمد ﷺ ہیں آیت کا مقصد یہ ہے کہ بندوں کو اس بات کا اختیار نہیں کہ وہ کہنے لگیں کہ فلاں کو پیغمبر کیوں نہیں بنایا گیا گویا یہ جملہ سابق جملہ کی تاکید و تائید ہے اس کی مزید تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ اس کا نزول مشرکوں کے قول مذکور کے جواب میں ہوا تھا۔

سُبْحٰنَ اللّٰهِ یعنی اللہ پاک ہے اس بات سے کہ کوئی اس کے اختیار میں مداخلت کرے۔ اور ان کی شرک آفرینی سے یا مفروضہ شریکوں کی مشارکت سے بالا و اعلیٰ ہے۔

بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ مَا كَانَ لَهُمُ میں مَا موصولہ ہے جو يَخْتَارُ کا مفعول اور الخیرۃ کے معنی ہیں خیر اور بہتر یعنی بندوں کے لئے جس چیز میں بہتری ہوتی ہے اللہ اس کو اختیار کرتا ہے اس تفسیر میں سراسر تکلف ہے، پھر بھی معتزلہ کے دعویٰ کی دلیل اس آیت سے نہیں نکلتی، معتزلہ کہتے ہیں کہ جو زیادہ بہتر اور مفید ہو اس کو پیدا کرنا اور غیر مفید قبیح کو نہ پیدا کرنا اللہ پر لازم ہے۔ یہ مسئلہ اس آیت سے ثابت نہیں ہوتا، اس آیت کا تو مطلب یہ ہے کہ اللہ اس چیز کو جو تم لوگوں کے لئے بہتر ہو اختیار کرنے کا حق رکھتا ہے یعنی اپنی مہربانی اور کرم سے تمہارے لئے فائدہ رساں بات اختیار کرتا ہے (کیا اللہ پر ایسا کرنا واجب

ہے یہ تو آیت سے ثابت نہیں ہوتا)

بعض علماء کہتے ہیں کہ آیت اس امر پر دلالت کر رہی ہے کہ انسان اپنے ہر فعل میں مجبور ہے کوئی (ترجیحی) اختیار نہیں رکھتا۔ مگر یہ استدلال بھی غلط ہے ورنہ اَلْخِیَرَۃُ نہ ہوتا بلکہ خِیَرَۃٌ (کوئی اختیار نہیں) مذکور ہوتا اَلْخِیَرَۃُ تو بتا رہا ہے کہ خاص قسم کا اختیار بندوں کو نہیں اس میں الف لام عہدی ہے یعنی کسی کو پیغمبر بنانے کا اختیار بندوں کو نہیں، شان نزول سے یہی معلوم ہوتا ہے۔

وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ وَمَا يُعْلِنُونَ ﴿۶۹﴾ اور آپ کا رب جانتا ہے ان باتوں کو جو ان کے سینوں کے اندر چھپی ہوئی ہیں (جیسے رسول اللہ ﷺ سے حسد و دشمنی) اور جو یہ لوگ ظاہر کرتے ہیں (جیسے رسول اللہ ﷺ پر طعن وطنز)

وَهُوَ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ اور وہی مستحق عبادت ہے اس کے سوا قابل عبادت اور کوئی نہیں۔ یہ مذکورہ بالا آیات کی تائید ہے۔

لَهُ الْحَمْدُ فِي الْأُولَىٰ وَالْآخِرَةِ اسی کو استحقاق ستائش ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

کیونکہ اصلی حسن وجمال اسی کا ہے دوسروں کے اندر جمال مستعار ہے (حمد کا معنی ہے کسی کی خوبی کی تعریف کرنا زبان سے) وہی ساری نعمتیں عطا کرنے والا ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی مومن دنیا میں بھی اس کی حمد کرتے ہیں اور آخرت میں بھی کریں گے جنت میں داخلہ کے بعد کہیں گے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ حمد اس خدا کے لئے جس نے ہمارا غم دور کر دیا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ اس اللہ کے لئے ہر طرح کی ثنا سزاوار ہے جس نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا۔

وَلَهُ الْحُكْمُ اسی کا فیصلہ (حکم) ہر چیز میں نافذ ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اہل طاعت کے لئے اس کا حکم مغفرت اور گناہ گاروں کے لئے فیصلہ بدبختی نافذ ہے۔

وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿۷۰﴾ اور اسی (کے حکم) کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے مرنے کے بعد زندہ کر کے اٹھائے جاؤ گے۔

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِن جَعَلَ اللَّهُ عَلَيْكُمُ اللَّيْلَ سَرْمَدًا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُم بِضِيَاءٍ ۖ أَفَلَا تَسْمَعُونَ ﴿۷۱﴾ (اے محمد ﷺ) آپ کہہ دیجئے بھلا بتاؤ تو اگر اللہ روز قیامت تک مسلسل رات ہی رات تم پر کر دے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو تمہارے لئے روشنی لے آئے گا کیا تم (گوش ہوش سے اتنی بات بھی) نہیں سنتے۔

اَرَءَیْتُمْ اے مکہ والو مجھے بتاؤ۔ سَرْمَدًا ہمیشہ۔ یہ لفظ سَرْد سے بنا ہے اور مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اس میں میم زائد ہے یعنی قیامت تک سورج نہ نکلے ہمیشہ رات ہی رات رہے۔ بِضِیَآءٍ کون معبود ہے جو روشنی لے آئے جس میں تم اپنی معاش کی تلاش کرتے ہو۔

بیضاوی نے لکھا ہے هَلْ اِلٰهٌ کی جگہ مَنْ اِلٰهٌ کا صرف کافروں کے خیال کے موافق (کہ ان کے معبود صاحب علم و قدرت ہیں)۔

اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ کیا میری نصیحت تدبر اور بصیرت کے ساتھ نہیں سنتے۔

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِن جَعَلَ اللَّهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُم بِلَيْلٍ تَسْكُنُونَ فِيهِ ۖ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ﴿۷۲﴾ آپ کہہ دیجئے بھلا دیکھو تو اگر اللہ تم پر ہمیشہ روز قیامت تک دن ہی دن کر دے تو اللہ کے سوا کون ایسا معبود ہے جو تم پر رات لے آئے جس میں تم آرام پاؤ کیا تم لوگ (چشم بصیرت اندوز سے) نہیں دیکھتے۔

اَلنَّهَارَ سَرْمَدًا یعنی سورج کو وسط آسمان میں روک دے اور دن ہی دن رہے۔ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ کیا ہماری قدرت کی نشانیوں کا تم مشاہدہ نہیں کرتے۔

رات کی صفت تَسْکُنُوْنَ فِیْہِ بیان فرمائی لیکن روشنی کی صفت کوئی ذکر نہیں فرمائی کیونکہ روشنی بجائے خود بڑی نعمت ہے رات ایسی چیز نہیں ہے (حضرت مفسر کا خیال ہے) پھر روشنی کے فوائد اتنے ہیں جن کا بیان نہیں کیا جاسکتا اس لئے ضِیَاءٍ کے ساتھ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ اور لیل کے ساتھ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ فرمایا کیونکہ عقل کو سننے سے فوائد بکثرت حاصل ہوتے ہیں دیکھنے سے اتنے منافع حاصل نہیں ہوتے۔

وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ اور اللہ نے اپنی رحمت سے تمہارے لئے رات اور دن بنائے تاکہ رات میں تم آرام پاؤ اور (دن میں) اللہ کے فضل کو تلاش کرو اور تاکہ تم (اللہ کی نعمتوں کا) شکر ادا کرو۔

وَمِنْ فَضْلِهٖ یعنی دنیا اور آخرت کے منافع تلاش کرو۔ فِیْہِ کی ضمیر لیل کی طرف لوٹ رہی ہے اس صورت میں لف نشر مرتب ہوگا۔ (پہلے دو چیزوں کا ذکر یکجائی کیا پھر ہر ایک کا حکم اور حال ترتیب کے ساتھ الگ الگ بیان کر دیا جس چیز کا ذکر پہلے کیا تھا اس کا حکم پہلے بیان کیا اور جس کا ذکر پیچھے کیا تھا اس کے حکم کو پیچھے ذکر کیا) زجاج نے کہا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فِیْہِ سے مراد ہو فِیْ كُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا یعنی رات و دن اسی لئے بنائے کہ تم دونوں میں ہر ایک میں آرام پاؤ اور اللہ کے فضل کو تلاش کرو۔

میں کہتا ہوں چونکہ سکون و آرام کی قسمیں جدا جدا ہیں اور اللہ کے فضل کی طلب بھی رات و دن میں الگ الگ طور سے ہوتی ہے اس لئے اَلَّیْلَ اور اَلنَّہَارَ الگ ذکر کیا دونوں کو ملا کر جَعَلَ لَکُمُ الزَّمَانَ نہیں فرمایا۔

وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ۝ اور (یاد کرو اس دن کو) جب کہ اللہ ان (کافروں) کو ندا دے گا اور فرمائے گا (آج) کہاں ہیں وہ میرے (فرض کئے ہوئے) شریک جن کو تم (اپنا سفارشی اور عذاب خدا سے بچانے والا) خیال کرتے تھے۔

یہ زجر کے بعد دوسری زجر ہے، یہ تنبیہ ہے اس امر پر کہ اللہ کے غضب کا موجب سب سے بڑھ کر شرک ہے۔ پہلی زجر تھی اس بات پر کہ وہ اپنے سرداروں کے نقش قدم پر چلتے تھے اور سرداروں کا اتباع کر کے انھوں نے اللہ کی عبادت کو ترک کر دیا تھا اور یہ دوسری زجر ہے اس بات پر کہ ان کا عقیدہ ہی بگڑا ہوا ہے وہ پتھروں کو اپنا سفارشی سمجھتے ہیں۔

وَنَزَعْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا فَقُلْنَا هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ فَعَلِمُوْٓا اَنَّ الْحَقَّ لِلّٰهِ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝ اور ہم ہر امت میں سے ایک ایک گواہ (یعنی نبی کو) نکال کر لائیں گے پھر ہم (کافروں سے) کہیں گے کہ اپنی کوئی دلیل پیش کرو سو ان کو معلوم ہو جائے گا کہ سچی بات خدا ہی کی تھی اور (دنیا میں) جو باتیں گھڑا کرتے تھے ان میں سے کسی بات کا پتہ بھی نہ ہوگا۔

نَزَعْنَا ہم نکال کر لائیں گے۔ شَہِیْدًا یعنی پیغمبر کو جو ان کے خلاف شہادت دیں گے۔ بُرْہَانَکُمْ اپنی دلیل یعنی اس بات کی دلیل کہ جس مذہب پر وہ چلتے تھے وہ صحیح تھا۔ اَنَّ الْحَقَّ لِلّٰہِ کہ الوہیت اللہ ہی کا حق ہے الوہیت میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ ضَلَّ غائب ہو جائیں گی جیسے کوئی کھوئی ہوئی چیز غائب ہو جاتی ہے۔

مَا کَانُوْا یَفْتَرُوْنَ یعنی دنیا میں جو بے اصل باتیں گھڑتے تھے۔

اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى قارون بلاشبہ موسیٰ کی قوم میں سے تھا۔ بغوی نے لکھا ہے کہ قارون حضرت موسیٰ کا چچا کا بیٹا تھا۔ حضرت موسیٰ کے باپ کا نام عمران تھا اور قارون کا باپ یصہر تھا اور عمران و یصہر دونوں قاہت بن لاوی بن یعقوب علیہ السلام کے بیٹے تھے۔ کذا اخرج ابن المنذر عن ابن جریج۔ ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ قارون حضرت موسیٰ کا چچا اور عمران کا بھائی تھا اور قارون و عمران دونوں یصہر بن قاہت کے بیٹے تھے اور بنی اسرائیل میں کوئی بھی قارون سے زیادہ توریت کا قاری نہ تھا مگر سامری کی طرح یہ بھی منافق ہو گیا۔ جلال الدین محلی نے لکھا ہے کہ قارون حضرت موسیٰ کے چچا کا بیٹا بھی تھا اور خالہ کا بیٹا بھی۔

فَبَغٰى عَلَيْهِمْ ۖ وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَآ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِي الْقُوَّةِ ۤ

پھر وہ قوم پر تکبر کرنے لگا کیونکہ ہم نے اس کو اتنے خزانے دیئے تھے کہ ان کی کنجیاں ایک طاقتور جماعت کو (اٹھانا) بھاری پڑتی تھیں۔

روایت میں آیا ہے کہ فرعون کی طرف سے قارون کو بنی اسرائیل کا سردار بنادیا گیا تھا جس کی وجہ سے وہ بنی اسرائیل پر ظلم کرنے لگا (اس تفسیر پر بَغٰى عَلَيْهِمْ کا ترجمہ ہوگا قارون نے ان پر ظلم کیا) ضحاک نے کہا قارون نے شرک کرکے قوم کے خلاف بغاوت کی۔ بعض لوگوں نے ترجمہ کیا قارون بنی اسرائیل پر تکبر اور غرور کرنے لگا۔ بعض نے کہا قارون نے ان پر حسد کیا اور سب سے برتر و بالا ہونے کا خواستگار ہو گیا۔

عبد بن حمید اور ابن ابی حاتم نے بروایت قتادہ بیان کیا ہے کہ قارون موسیٰؑ کے چچا یعنی موسیٰؑ کے باپ کے بھائی کا بیٹا تھا اور بنی اسرائیل کے ساتھ دریا کو پار کرنے میں بھی شریک تھا اور بڑا خوش آواز تھا لیکن سامری کی طرح اللہ کا دشمن منافق ہو گیا اللہ نے اس کو غارت کردیا اور کئے کی پوری سزا دی۔ مال و اولاد کی کثرت کی وجہ سے وہ مغرور بن گیا تھا لیکن سورۂ مومن کی آیت وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَقَارُوْنَ فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ (ہم نے اپنی طرف سے نشانیاں دے کر موسیٰؑ کو فرعون اور ہامان اور قارون کے پاس بھیجا تو ان (تینوں) نے کہا تو بڑا جھوٹا جادوگر ہے) دلالت کررہی ہے کہ فرعون و ہامان کی طرح قارون بھی کافر تھا نہ ظاہر میں ایمان لایا تھا نہ باطن میں (یعنی منافق نہ تھا کہ ظاہر میں ایمان لے آیا ہو)

شہر بن حوشب نے کہا (غرور و تکبر کا مظاہرہ کرنے کے لئے) قارون نے اپنے کپڑوں کی لمبائی (دوسروں کے مقابلہ میں) ایک بالشت بڑھائی تھی (یعنی اس کے کپڑے نیچے لٹکتے تھے)

حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اپنا کپڑا (ازار یعنی تہبند لنگی یا کرتا عبا جبہ وغیرہ) تکبر سے کھینچ کر چلتا ہے اللہ اس کی طرف (رحمت کی) نظر نہیں کرے گا۔ رواہ البغوی۔ مسلم نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اپنی چادر غرور کی وجہ سے کھینچتا چلتا ہے اللہ (قیامت کے دن رحمت کی) نظر سے اس کی طرف نہیں دیکھے گا۔ امام احمد اور نسائی نے صحیح سند سے حضرت ابن عباسؓ کی مرفوع روایت نقل کی ہے کہ اللہ (رحمت کی نظر سے) اس شخص کو نہیں دیکھے گا جو اپنی ازار (لنگی یا تہبند) کو گھسیٹتا چلتا ہے۔

مِنَ الْكُنُوْزِ جمع کردہ اموال کے ذخیرے۔ مَفَاتِحَهٗ یعنی مالوں کے صندوق کی کنجیاں مَفَاتِح مِفْتَح کی جمع ہے قتادہ اور مجاہد اور ایک جماعت علماء کا یہی قول ہے۔ بعض نے کہا مَفَاتِح سے مراد خزانے ہیں جیسے اللہ نے دوسری آیت میں فرمایا ہے وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ اللہ کے پاس غیب کے خزانے ہیں جن کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا لیکن اس مطلب پر اگلی آیت لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِي الْقُوَّةِ سے قارون کے خزانوں کی زیادہ فراوانی ثابت نہ ہوگی کیونکہ چالیس آدمی (جو عصبہ کا معنی کہا جاتا ہے) چار لاکھ درہم بھی نہیں اٹھا سکتے۔

جریر نے بوساطت منصور خیثمہ کا بیان نقل کیا ہے خیثمہ نے کہا میں نے انجیل میں دیکھا تھا کہ قارون کے خزانوں کی کنجیاں ساٹھ خچروں کا بوجھ ہوتی تھیں کوئی کنجی ایک انگلی سے بڑی نہ تھی اور ہر کنجی ایک خزانے کی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قارون جہاں جاتا تھا اپنے خزانوں کی کنجیاں اپنے ساتھ اٹھا کرلے جاتا تھا اور وہ کنجیاں لوہے کی تھیں جب بوجھ زیادہ ہونے لگا تو اس نے لکڑی کی کنجیاں بنوالیں پھر ان کنجیوں کا بار بھی زیادہ ہو گیا تو گائے کے چمڑے کی کنجیاں ایک ایک انگلی کی برابر تیار کرالیں یہ کنجیاں بھی (اتنی بھاری ہو گئی تھیں کہ) اس کے ساتھ چالیس خچروں پر لد کر جاتی تھیں۔

روایات مذکورہ میں سے کسی روایت کی تائید قرآن سے نہیں ہوتی کیونکہ قرآن مجید میں اَلْعُصْبَة کا لفظ ہے اور عصبہ مردوں کی جماعت کو کہتے ہیں خچروں کی جماعت کو نہیں کہتے۔

بغوی نے لکھا عُصْبَة کی عددی تعیین میں علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ مجاہد نے کہا دس سے پندرہ تک کی جماعت کو

عصبہ کہتے ہیں۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس کا قول بیان کیا ہے کہ تین سے دس تک عصبہ ہوتا ہے۔ قتادہ نے کہا دس سے چالیس تک کی جماعت عصبہ ہے۔ قاموس میں بھی یہی کہا گیا ہے۔ بعض نے ستر کی تعداد بیان کی ہے۔ حضرت ابن عباس کا ایک قول آیا ہے کہ اس کی کنجیاں چالیس قوی ترین آدمی اٹھایا کرتے تھے اور لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ کا مطلب یہ ہے کہ ایک جماعت ان کو لے کر چلتی تھی اور جب وہ گروہ ان کو اٹھاتا تھا تو بوجھ کی وجہ سے وہ نیچے کو جھک جاتے تھے۔

ابو عبیدہ نے کہا آیت میں ترکیب مقلوب ہے، اصل عبارت اس طرح تھی اِنَّ الْعُصْبَةَ لَتَنُوْٓءُ بِهَا عرب کہتے ہیں ناء فلاں بکذا فلاں شخص اس بھاری بوجھ کو لے کر اٹھا۔

اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ۞ جب قوم نے اس سے کہا خوشی میں مت اترا اللہ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

فَرَحٌ کا لغوی ترجمہ ہے خوشی اور مرغوب چیز پاکر سینہ کی کشائش۔ جس فرح کی ممانعت کی گئی ہے وہ فرح بمعنی غرور ہے۔ جب انسان اپنے کو غنی پاتا ہے تو اترانے لگتا ہے، مغرور ہو جاتا ہے، تکبر کرنے لگتا ہے۔ ایسی فرح کی ممانعت ہے اللہ نے اسی کو طغیان (یعنی انسانیت کی حد سے تجاوز کرنا) فرمایا ہے ارشاد فرمایا ہے اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى انسان نے اپنے کو غنی پایا تو طغیان (غرور تکبر) کرنے لگا۔ قاموس میں ہے فرح کا معنی ہے خوشی اور (اپنے کو) دیکھنا۔ بغوی نے لَا تَفْرَحْ کا ترجمہ کیا ہے نہ اترا غرور نہ کر نہ اکڑ۔

فرح یعنی حصول مقصد سے خوشی تو فطری امر ہے بندہ کے اختیار کو اس میں کوئی دخل نہیں اس لئے اس کی ممانعت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ بیضاوی نے لکھا ہے کہ دنیا ملنے پر خوش ہونا مطلقاً مذموم ہے (خواہ غرور و تکبر پیدا ہو یا نہ ہو) کیونکہ دنیا کی محبت اور دنیا کی پسندیدگی موجب ہے زوال دنیا کی طرف سے غافل ہو جانے کی اور فنا و زوال کی طرف سے غافل ہونا بہرحال مذموم ہے یہ سمجھ لینا کہ دنیا فانی ہے اس کی ہر لذت زوال پذیر ہے یہ آنی جانی ہے۔ انسان سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ دنیا سے دل نہ لگائے اسی لئے اللہ نے فرمایا ہے لِكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ جو چیز تم کو نہ ملی اس کا غم نہ کرو اور جو کچھ اللہ نے تم کو عطا فرما دیا ہے اس پر خوش نہ ہو۔

لَا تَفْرَحْ (یعنی ممانعت فرح) کی علت یہ ہے کہ یہ فرح ہم کو اللہ کی محبت سے روکتی ہے اسی لئے فرمایا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ یعنی جو دنیا کی پر فریب لذتوں سے خوش ہوتے اور غرور و تکبر کرتے ہیں اور اللہ کا شکر ادا نہیں کرتے اللہ ان کو پسند نہیں کرتا۔

بعض اہل تحقیق نے لکھا ہے کہ قرآن مجید کے اندر متعدد آیات میں فرح کی مذمت کی گئی ہے ایک جگہ فرمایا ہے وَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ دوسری جگہ فرمایا ہے وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ تیسری جگہ فرمایا ہے ذٰلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ۔ ایک اور جگہ فرمایا ہے حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا

فرح کی اجازت صرف آیت فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا میں اور آیت وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ بِنَصْرِ اللّٰهِ میں دی گئی ہے۔ میرے نزدیک قول فیصل یہ ہے کہ دنیا میں اس نعمت کے ملنے پر جو آخرت میں کام آنے والی ہے فرح کرنا بہرحال قابل تعریف ہے اور اسی کا حکم آیت فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا میں دیا گیا ہے۔ اور جس دنیاوی نعمت کے ملنے پر اللہ کا شکر بھی ادا کیا جائے اس پر بھی خوش ہونا اچھا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کھانے والا شکر گزار روزہ دار صابر کی طرح ہے۔ ہاں اگر دنیوی لذتوں کے حصول کے بعد طغیان سرکشی اور ناشکری پیدا ہو جائے تو قطعاً ایسی نعمت پر خوش ہونا مذموم ہے۔ خوش ہونے کا مذموم یا محمود ہونا شکر اور ناشکری کی بنا پر ہے، فی نفسہٖ بذات خود حصول مطلوب پر خوش ہونا تو فطری امر ہے، انسان کے اختیار کو اس میں دخل نہیں، شریعت کا کوئی حکم اس سے متعلق نہیں (غیر اختیاری چیز کا انسان مکلف نہیں) اگر بندہ کو اللہ سے سچی محبت ہو گی تو وہ اس چیز سے ضرور خوش ہو گا جو اللہ کی خوشنودی حاصل ہونے کا ذریعہ ہو، پس اللہ سے محبت اس کو نہیں ہو سکتی جو اپنے

مطلب کے حصول سے صرف اس لئے خوش ہوتا ہے کہ وہ اس کا مطلوب ہے، مرغوب خدا ہوتے نہ ہونے کا اس کو کوئی خیال نہیں ہوتا۔

وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ ۖ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا ۖ وَأَحْسِن كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ ۖ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ﴿۷۷﴾

اور تجھ کو خدا نے جتنا دے رکھا ہے اس میں عالم آخرت کی بھی جستجو کیا کر اور دنیا سے اپنا حصہ (آخرت میں لے جانا) فراموش نہ کر اور جس طرح خدا نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو بھی (اس کے بندوں کے ساتھ) احسان کیا کر اور دنیا میں بگاڑ کا خواہاں نہ ہو بے شک اللہ اہل فساد کو پسند نہیں کرتا۔

فِیۡمَاۤ اٰتٰىکَ اللّٰہُ یعنی اللہ نے جو دنیوی نعمتیں تجھے عطا فرمائی ہیں۔

اَلدَّارَ الۡاٰخِرَۃَ یعنی جنت کی طلب کر، مطلب یہ ہے کہ خداداد نعمتوں کا شکر کر اور ان کو اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے راستہ میں خرچ کر۔ وَلَا تَنۡسَ نہ بھول یعنی بھولی بسری چیز کی طرح دنیا سے اپنا حصہ ترک نہ کر یعنی دنیا سے اتنا حصہ ضرور حاصل کر جس سے آخرت میں جنت تجھے مل جائے۔ دنیا آخرت کی کھیتی ہے انسان کا دنیا میں اصلی نصیب وہ ہے جس سے آخرت کو حاصل کر لے۔ کذا قال مجاہد وابن زید۔

سدی نے کہا نَصِیۡبَکَ مِنَ الدُّنۡیَا سے مراد ہے خیرات دنیا اور کنبہ پروری کرنا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا اپنی صحت قوت، جوانی اور مالداری کو آخرت کے حصول کے لئے صرف کرنے کو ترک نہ کر۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت سمجھ، اپنی زندگی کو مرنے سے پہلے، اپنی صحت کو بیماری سے پہلے، اپنی فرصت کو مشغولیت سے پہلے، اپنی جوانی کو بڑھاپے سے پہلے اور اپنی مالداری کو افلاس سے پہلے۔ رواہ الحاکم والبیہقی بسند صحیح واحمد فی الزہد وروی البغوی وابن حبان وابو نعیم فی الحلیۃ عن عمر بن میمون الاودی مرسلا نحوہ۔ حسن نے کہا حکم دیا گیا تھا کہ ضرورت سے زائد جو چیز ہے اس کو راہ خدا میں پیش کر دے اور بقدر کفایت روک لے۔ منصور بن زاذان نے کہا دنیا سے اپنا حصہ نہ بھول یعنی اپنی اور اپنے اہل و عیال کی روزی ترک نہ کر۔

وَاَحۡسِنۡ یعنی اللہ کے بندوں سے بھلائی کر یا یہ مطلب ہے کہ اللہ کی عبادت اچھی طرح کر، ہمیشہ اس کی یاد کر، اس کا شکر کر، اس کی طاعت میں سرگرم رہ، جیسا کہ اللہ نے تیرے ساتھ بھلائی کی ہے کہ اپنی متواتر بے شمار ان گنت نعمتیں تجھے عطا کی ہیں۔

وَلَا تَبۡغِ الۡفَسَادَ اور زمین پر فساد (بگاڑ) کا خواستگار نہ ہو۔ بیضاوی نے لکھا ہے اس سے مراد ہے ظلم و بغی کی ممانعت۔ بغوی نے لکھا ہے جس نے اللہ کی نافرمانی کی وہ زمین پر فساد کا طلب گار ہوا۔ (یعنی گناہ اور اللہ کی نافرمانی ہی فساد اور تباہی ہے)

لَا یُحِبُّ الۡمُفۡسِدِیۡنَ یعنی بد اعمالوں کی بداعمالی کی وجہ سے اللہ ان کو پسند نہیں کرتا۔

قَالَ اِنَّمَاۤ اُوۡتِیۡتُہٗ عَلٰی عِلۡمٍ عِنۡدِیۡ ؕ قارون نے کہا مجھے جو کچھ ملا ہے (مجھے دیا گیا ہے) وہ مجھے میرے علم کی وجہ سے ملا ہے۔ قوم والوں نے قارون سے کہا تھا۔ اَحۡسِنۡ کَمَاۤ اَحۡسَنَ اللّٰہُ اِلَیۡکَ قارون نے اس کا تردیدی جواب یہ دیا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے میرے ساتھ کوئی احسان نہیں کیا مجھے اس کا استحقاق تھا اس کی کوئی مہربانی نہیں جس کا شکریہ ادا کرنا مجھ پر لازم ہو اور اس کے بندوں سے بھلائی کرنا مجھ پر فرض ہو جائے مجھے جو کچھ عزت مال اور سیادت ملی وہ میرے علم کی وجہ سے ملی۔

بعض علماء نے کہا علم سے مراد ہے کیمیا گری۔ سعید بن مسیب کا بیان ہے حضرت موسیٰؑ کیمیا بنانی جانتے تھے آپ نے علم کیمیا کا ایک حصہ تو یوشع بن نون کو سکھا دیا اور ایک تہائی حصہ کالب بن یوقنا کو اور ایک تہائی قارون کو۔ قارون نے یوشع اور کالب کو فریب دے کر وہ حصہ بھی معلوم کر لیا جو انہوں نے سیکھا تھا اس طرح پورا علم کیمیا اس کو حاصل ہو گیا اس کی مالداری کا

یہی کر تھا۔ بعض اہل علم نے کہا قارون نے جو لفظ علم بولا تھا اس سے اس کی مراد یہ تھی کہ میں تجارت کے گر جانتا ہوں، کاشتکاری کے فن سے خوب واقف ہوں اور کمائی کے دوسرے راستے مجھے معلوم ہیں انہی ذرائع سے میرے پاس مال آیا ہے۔
سہل نے کہا جس نے اپنے کو دیکھا (یعنی اترایا) اس نے فلاح نہیں پائی، خوش نصیب وہ ہے جس نے اپنے اوپر (غرور کی) نظر نہ ڈالی اور (نظر غرور سے) اپنے افعال و اعمال کو نہیں دیکھا اور بدبخت وہ ہے جس کی نظر میں اس کے اپنے اقوال، اعمال اور احوال پسندیدہ بنا کر دکھا دیئے ہوں اور ان پر فخر کرنے لگا ہو، عنقریب کسی دن ایسا بد نصیب ہلاک کر دیا جائے گا جس طرح کہ قارون کو زمین میں دھنسا دیا گیا جب کہ اس نے اپنے لئے برتری کا دعویٰ کیا تھا۔

اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ؕ

کیا اس کو معلوم نہ ہوا کہ اس سے پہلے اللہ گزشتہ اقوام میں ایسوں کو ہلاک کر چکا ہے جو (مالی) قوت میں بھی اس سے کہیں بڑھے ہوئے تھے اور جتھا بھی ان کا اس سے زیادہ تھا۔
اَلَمْ يَعْلَمْ استفہام تعجبی ہے یا انکاری۔ کیا اس کو اتنا بھی معلوم نہ ہوا اگر معلوم ہوتا تو مال پر غرور نہ کرتا اور جماعت کی کثرت پر نہ اتراتا اور جان لیتا کہ اللہ ہی ہلاک کرنے والا ہے، وہی دینے والا اور وہی روک لینے والا ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی نے قوم عاد کو ہلاک کر دیا۔ جو (جسمانی طاقت اور مال کی کثرت اور تعداد میں اس سے زائد تھی۔ شداد بن عاد تو بہت بڑا بادشاہ تھا ساری زمین پر حکومت کرتا تھا۔

وَلَا يُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝ اور مجرموں سے ان کے قصوروں کے متعلق (تحقیق کی غرض سے) نہیں پوچھا جائے گا۔ کیونکہ اللہ کو پہلے ہی ان کے جرائم معلوم ہوں گے اس کو پوچھنے اور دریافت کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسی لئے دنیا میں وہ بغیر دریافت کئے جرائم کی سزا میں ہلاک کرتا ہے اور آخرت میں دوزخ میں داخل کرے گا۔ پہلے اللہ نے ایسے لوگوں کو ہلاک کرنے کا ذکر کیا جو مالدار بھی بہت تھے اور تعداد میں بھی بہت تھے تاکہ قارون کے دل میں اپنی ہلاکت کا خوف پیدا ہو۔ اس آیت میں فرمایا کہ یہ عذاب انہیں کے ساتھ خاص نہ تھا بلکہ اللہ تمام اگلے پچھلے مجرموں کے جرائم پر مطلع ہے سب کو سزا دے گا۔ قتادہ نے لَا يُسْـَٔلُ کا یہ مطلب بیان کیا کہ بغیر پوچھے اور بغیر حساب لئے ان کو دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔ مجاہد نے کہا فرشتے ان سے ان کے جرائم کا سوال نہیں کریں گے بلکہ چہروں سے ہی پہچان لیں گے۔ حسن نے کہا دریافت حال اور تحقیق کے لئے ان سے نہیں پوچھا جائے گا بلکہ توبیخ و زجر کی غرض سے باز پرس کی جائے گی۔

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِيْ زِيْنَتِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَاۤ اُوْتِيَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝

پھر (ایک بار) وہ اپنی قوم کے سامنے بن سنور کر (شان شوکت کے ساتھ) نکلا تو (اس کی برادری میں سے) جو لوگ (صرف) دنیاوی زندگی کے طلب گار تھے انہوں نے کہا کاش ہمارے پاس بھی ویسی ہے (دولت و راحت) ہوتی جو قارون کو دی گئی ہے یہ یقیناً بڑا خوش نصیب ہے۔
ابراہیم نخعی نے کہا قارون اور اس کی قوم والے (نوکر چاکر اور کنبہ خاندان کے آدمی) سبز سرخ لباس پہن کر نکلے۔ ابن زید نے کہا قارون ستر ہزار آدمیوں کو جو زعفرانی لباس میں تھے ساتھ لے کر نکلا۔ مجاہد نے کہا قارون اپنے ساتھیوں کو جو زعفرانی لباس میں تھے اور سفید خچروں پر سوار تھے جن پر ارغوانی رنگ کی زینیں کسی ہوئی تھیں ساتھ لے کر نکلا۔
مقاتل نے کہا قارون سفید خچر پر نکلا خچر پر سنہری ارغوانی زین تھی چار ہزار سوار تھے ان سواروں کے گھوڑے ارغوانی تھے تین سو باندیاں بھی سفید خچروں پر سوار ساتھ تھیں باندیاں گوری گوری زیور اور سرخ لباس سے آراستہ تھیں۔
بنی اسرائیل (اگرچہ دنیا کے طلب گار تھے لیکن) مومن تھے اس لئے یہ نہیں کہا کہ قارون کی دولت ہم کو مل جاتی یہ تو حسد ہو جاتا بلکہ یوں کہا کہ قارون کی دولت کی طرح کاش ہم کو بھی دولت مل جاتی۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ وَلَا يُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ۝

اور جن لوگوں کو (دین کا) علم عطا کیا گیا تھا انہوں نے کہا ارے تمہارا برا ہو اللہ کے گھر کا ثواب (بدرجہا) بہتر ہے جو ان لوگوں کو ملے گا جو ایمان لائے اور نیک اعمال کئے اور (کامل طور پر) انہی لوگوں کو دیا جائے گا جو (حرص و طمع سے) اپنے آپ کو روکنے والے ہیں۔

اُوْتُوا الْعِلْمَ یعنی جو لوگ اس ثواب سے واقف تھے جس کا وعدہ اللہ نے مومنوں سے کیا ہے انہوں نے ان تمنا کرنے والوں سے کہا۔

وَیْلَكُمْ لفظ وَیْل مصدر ہے اس کا معنی ہے ہلاکت یہ فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے یعنی تم مرو ہلاک ہو جاؤ۔ حقیقت میں اس لفظ کا مفہوم ہے بددعا لیکن اس کا استعمال ناپسندیدہ کام سے روکنے اور زجر کرنے کے لئے ہوتا ہے۔

وَلَا يُلَقّٰىهَا اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ یعنی یہ بات (کہ اللہ کا ثواب بہتر ہے) نہیں سکھائی جاتی مگر اہل صبر کو یا اللہ کی طرف سے ثواب نہیں دیا جاتا مگر صابروں کو اَلصّٰبِرُوْنَ یعنی وہ لوگ جو اللہ کی اطاعت پر جمے رہتے ہیں اور گناہوں سے اور دنیا کی حرص سے اپنے آپ کو روکے رکھتے ہیں۔

فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ ۝۸۱ پھر ہم نے اس کو اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا سو اس کی کوئی جماعت ایسی نہ ہوئی کہ اللہ کے عذاب سے اس کو بچا سکتی اور نہ وہ خود اپنے آپ کو بچا سکا۔

يَنْصُرُوْنَهٗ یعنی اللہ مِنْ فِئَةٍ (یعنی لوٹ کر رجوع کرنا) فِئَة وہ مددگار جن کی طرف مصیبت کے وقت آدمی رجوع کرتا ہے يَنْصُرُوْنَهٗ یعنی اللہ کے عذاب کو دفع کرسکتے۔ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ یعنی خود بھی وہ اپنے کو عذاب خسف سے محفوظ نہ رکھ سکا نَصَرَهٗ اس کی مدد کی اِنْتَصَرَ (وہ مدد دیا گیا) محفوظ ہو گیا۔

اہل روایت نے لکھا ہے کہ بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰؑ و حضرت ہارونؑ کے بعد قارون سب سے بڑا عالم تھا اور توریت کا سب سے بڑا قاری تھا سب سے زیادہ حسین خوش آواز اور مالدار بھی تھا لیکن اس نے سرکشی کی اور حد و بندگی سے آگے بڑھ گیا۔ سرکشی اور نافرمانی کی ابتدا اس واقعہ سے ہوئی کہ اللہ نے حضرت موسیٰؑ کے پاس وحی بھیجی کہ اپنی قوم کو حکم دے دو کہ ہر شخص اپنی چادر کے چاروں کونوں پر ایک ایک نیلا آسمانی رنگ کا دھاگہ باندھ لیں تاکہ دھاگہ کو دیکھ کر آسمانی رنگ ان کی نظر کے سامنے آجائے اور آسمانی رنگ کو دیکھ کر آسمان کی طرف نگاہ اٹھائیں اور ان کو یاد ہو جائے کہ اس آسمان سے اللہ نے اپنا کلام اتارا ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے عرض کیا اے میرے رب کیا تیرا حکم اس طرح نہیں پورا ہو سکتا کہ وہ اپنی پوری چادریں نیلے رنگ میں رنگ لیں کیونکہ بنی اسرائیل ان دھاگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھیں گے۔ فرمایا موسیٰؑ میرا چھوٹا حکم بھی چھوٹا نہیں ہوتا اگر وہ میرا چھوٹا حکم بھی نہیں مانیں گے تو بڑا حکم بدرجہ اولیٰ نہیں مانیں گے۔ حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کو جمع کیا اور فرمایا اللہ کا حکم ہے کہ تم اپنی چادروں پر آسمانی رنگ کے دھاگے باندھ لیا کرو تاکہ ان کو دیکھ کر تم کو اپنے رب (کے کلام) کی یاد ہو جائے۔ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ کے حکم کی تعمیل کی، لیکن قارون نے حکم نہیں مانا اور غرور سے کہنے لگا (موسیٰ سب کو غلام بنا لینا چاہتے ہیں) ایسا عمل تو آقا اپنے غلاموں کے ساتھ کرتے ہیں تاکہ ان کے غلام دوسرے غلاموں سے الگ معلوم ہو جائیں۔ قارون کی نافرمانی اور سرکشی کا یہی آغاز تھا۔ پھر جب حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو لے کر دریا کے پار پہنچ گئے تو بنی اسرائیل کی ساری قربانیوں کی نگرانی حضرت ہارونؑ کے سپرد کر دی اور ان کو افسر قربانی بنا دیا۔ بنی اسرائیل اپنی اپنی قربانیاں حضرت ہارونؑ کے پاس لاتے تھے اور ہارونؑ ان قربانیوں کو قربانی کی جگہ میں رکھ دیتے پھر آسمان سے ایک آگ آکر قربانی کو کھا جاتی تھی۔ قارون کو حضرت ہارونؑ کی اس سرداری کا بھی رنج ہوا اور حضرت موسیٰؑ کے پاس آکر کہنے لگا موسیٰؑ تمہارے لئے تو رسالت ہو گئی اور ہارون کے لئے قربانی کی افسری اور میں جو توریت کا سب سے بڑا قاری ہوں مجھے کچھ نہیں ملا میں اس بات پر صبر نہیں کر سکتا۔ حضرت موسیٰؑ نے فرمایا میں نے ہارون کو خود یہ عہدہ نہیں دیا ہے بلکہ اللہ نے یہ عہدہ ان کو دیا ہے۔ قارون

نے کہا میں تو تمہاری بات اس وقت تک سچ نہیں مانوں گا جب تک تم اس کا ثبوت مجھے دکھا نہ دو۔ حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ ہر شخص اپنی اپنی لاٹھی لے کر آئے اور اس خیمہ کے اندر لا کر درخت کی طرح گاڑ دے۔ حسب الحکم سب لوگوں نے اپنی اپنی لاٹھیاں مقررہ خیمہ کے اندر لا کر کھڑی کر دیں رات یوں ہی گزر گئی صبح ہوئی تو لوگوں نے دیکھا کہ حضرت ہارونؑ کی لاٹھی ایک درخت کی طرح (سرسبز) ہو گئی اور اس میں ہرے ہرے پتے نکل آئے۔ قارون کہنے لگا موسیٰؑ جو جادو تم بناتے رہے ہو اس سے زیادہ تعجب آفریں جادو یہ نہیں ہے اس کے بعد قارون حضرت موسیٰؑ سے الگ ہو گیا حضرت موسیٰؑ قرابت کی وجہ سے اس سے نرمی کا سلوک کرتے رہے مگر وہ ہر وقت آپ کو دکھ ہی دیتا رہا اس کی سرکشی، نافرمانی اور دشمنی بڑھتی ہی گئی اس نے حضرت موسیٰؑ سے کٹ کر اپنا ایک مکان تعمیر کیا جس کا دروازہ سونے کا بنوایا اور دیواروں پر سونے کی چادریں لگوائیں بنی اسرائیل کے بڑے بڑے آدمی روزانہ صبح شام اس کے پاس آتے باتیں کرتے ہنسی مذاق کرتے اور قارون سب کو کھانا کھلاتا تھا (یہ محفل عیش روزانہ گرم ہوتی تھی)

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جب حضرت موسیٰؑ کو زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا گیا (اور حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کو وہ حکم سنایا) تو قارون نے ماننے سے انکار کر دیا آخر حضرت موسیٰؑ نے ایک فی ہزار کی شرط پر قارون سے مصالحت کر لی قارون نے وعدہ کر لیا کہ ہزار دینار میں ایک دینار ہزار درہم میں ایک درہم اور ہزار بکریوں میں ایک بکری مذکورہ میں ادا کرے گا جب قارون اس اقرار کے بعد اپنے گھر پہنچا اور حساب لگایا تو بڑی رقم ہو گئی اور اس کے دل نے اتنا کثیر مال دینے کی اجازت نہیں دی۔ آخر (سوچ کر ایک تدبیر کی) بنی اسرائیل کو جمع کیا اور سب سے خطاب کر کے کہا لوگو موسیٰؑ نے جو حکم بھی تم کو دیا تم نے اس کی تعمیل کی اب (یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ) وہ تمہارے مال بھی لے لینا چاہتا ہے۔ بنی اسرائیل نے کہا آپ ہمارے بڑے ہیں جو آپ کی منشاء ہو حکم دیجئے قارون نے کہا میں حکم دیتا ہوں کہ تم فلاں زانیہ عورت کو لے آؤ ہم کچھ معاوضہ دے کر اس سے طے کر لیں گے وہ موسیٰؑ کو اپنے ساتھ زنا کرنے کی تہمت لگائے اگر اس نے ایسا کر لیا تو بنی اسرائیل موسیٰؑ کو چھوڑ دیں گے اور اس کے حلقہ سے نکل جائیں گے۔ چنانچہ لوگوں نے اس عورت کو بلوایا قارون نے ایک ہزار درہم معاوضہ دینا منظور کر لیا۔ بعض روایات میں ہزار دینار بعض میں سونے کا ایک طشت دینا طے کیا۔ بعض اہل روایت نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ قارون نے اس سے کہا تجھے مالدار بنا دوں گا اور تجھے اپنی بیویوں میں شامل کر لوں گا بشرطیکہ کل صبح بنی اسرائیل موسیٰؑ کے پاس جمع ہوں تو موسیٰؑ کو اپنے ساتھ زنا کرنے پر تو متہم کر دے۔ جب دوسرا دن ہوا تو قارون نے بنی اسرائیل کو جمع کیا پھر موسیٰؑ کے پاس گیا اور کہا بنی اسرائیل آپ کے برآمد ہونے کا انتظار کر رہے ہیں آپ باہر آ کر ان کو وعظ و نصیحت کریں حضرت موسیٰؑ باہر آ گئے بنی اسرائیل اس وقت کھلے میدان میں جمع تھے۔ آپ تقریر کرنے کھڑے ہوئے اور فرمایا اے بنی اسرائیل (سنو) جو چوری کرے گا ہم اس کا ہاتھ کاٹ دیں گے جو کسی پر زنا کی تہمت لگائے گا ہم اس کے کوڑے ماریں گے اور جو زنا کرے گا ہم اس کے کوڑے ماریں گے بشرطیکہ اس کی بیوی نہ ہو اور بیوی ہوتے ہوئے اگر زنا کرے گا تو ہم پتھر مار مار کر اس کو ہلاک کر دیں گے۔ قارون بولا خواہ تم ہی ایسے ہو (تب بھی اپنے کو یہی سزا دو گے) حضرت موسیٰؑ نے فرمایا خواہ میں ہی ہوں۔ قارون کہنے لگا بنی اسرائیل کا خیال ہے کہ تم نے فلاں عورت سے زنا کیا ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے فرمایا اس عورت کو بلواؤ اگر وہ یہ بات کہہ دے تو وہی بات (صحیح) ہو گی جو وہ کہہ دے گی، عورت آ گئی حضرت موسیٰؑ نے اس سے کہا اے عورت کیا میں نے تیرے ساتھ ایسا کیا ہے؟ یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں حضرت موسیٰؑ نے اس الزام کا بڑا اثر لیا اور اس خدا کا حوالہ دیا جس نے بنی اسرائیل کے لئے دریا کو پھاڑ دیا اور توریت نازل فرمائی اور فرمایا کیا تو سچ سچ نہیں کہے گی اللہ نے اس عورت کا خیال پلٹ دیا اور اس نے اپنے دل میں خیال کیا کہ سچ توبہ کر لینا اللہ کے رسول کو دکھ دینے سے بہتر ہے کہنے لگی نہیں۔ یہ لوگ جھوٹ کہتے ہیں بلکہ قارون نے مجھے معاوضہ دینا طے کیا تھا کہ میں آپ پر زنا کی تہمت لگا دوں۔ حضرت موسیٰؑ یہ سنتے ہی سجدہ میں گر پڑے اور رو رو کر کہنے لگے اے اللہ اگر میں تیرا رسول ہوں تو میری وجہ سے اس پر غضب نازل فرما۔ اللہ نے وحی بھیجی کہ زمین کو تمہارے زیر حکم کر دیا گیا تم جو حکم چاہو اس کو دو یہ حکم کی تعمیل

کرے کی حضرت موسیٰؑ نے فرمایا۔
اے بنی اسرائیل اللہ نے جس طرح مجھے فرعون کے پاس بھیجا تھا اسی طرح قارون کے پاس بھی بھیجا تھا اب جو اس کے ساتھ رہنا چاہے وہ اس کے پاس ٹھہرا رہے اور جو میرا ساتھ دینا چاہے وہ اس کے پاس سے الگ ہو جائے۔ یہ سنتے ہی سب لوگوں نے قارون کا ساتھ چھوڑ دیا سب اس کے پاس سے ہٹ آئے صرف دو آدمی اس کے پاس رہ گئے پھر حضرت موسیٰؑ نے (زمین کو حکم دیا اور) فرمایا، اے زمین! ان کو لے لے زمین نے ان کے قدم کھینچ لئے ایک روایت میں آیا کہ وہ اپنے تخت اور فرش پر اس وقت موجود تھا زمین نے اس کے تخت کو نگل لیا پھر آپ نے زمین کو حکم دیا لے لے زمین نے گھٹنوں تک ان کو نگل لیا پھر آپ نے فرمایا ان کو لے لے زمین نے کمر تک ان کو نگل لیا پھر آپ نے فرمایا زمین ان کو لے لے زمین ان کو گلے تک نگل گئی قارون اور اس کے ساتھی برابر موسیٰؑ سے منت وزاری کرتے رہے اور قارون برابر حضرت موسیٰؑ کو اللہ کا اور قرابت کا واسطہ دیتا رہا یہاں تک کہ ستر بار اس نے واسطہ دیا لیکن شدت غضب کی وجہ سے حضرت موسیٰؑ نے اس کی طرف کوئی التفات نہیں کی اور زمین کو حکم دیا ان کو لے لے غرض زمین نے سب کو نگل لیا۔
اللہ نے موسیٰؑ کے پاس وحی بھیجی اور فرمایا تمہارا دل بھی کیسا سخت ہے قارون نے ستر بار تم سے فریاد کی مگر تم نے ایک بار بھی اس کی فریاد رسی نہیں کی۔ قسم ہے اپنی عزت وعظمت کی اگر وہ ایک بار بھی مجھ سے فریاد کرتا تو میں اس کی فریاد رسی ضرور کرتا۔ بعض اقوال میں آیا ہے کہ اللہ نے فرمایا آئندہ میں زمین کو کسی کا تابع حکم نہیں بناؤں گا۔
قتادہ نے کہا زمین نے قارون کو اپنے اندر دھنسا لیا اور وہ روز بقدر قد آدم زمین کے اندر دھنس رہا اور یونہی دھنستا رہے گا مگر قیامت تک انتہائی گہرائی کو نہ پہنچ سکے گا قارون کے زمین میں گھس جانے کے بعد بنی اسرائیل آپس میں کہنے لگے کہ موسیٰؑ نے قارون کے لئے بددعا صرف اس لئے کی کہ خود اس کی جگہ اس کا مکان خزانے اور سارا مال متاع لینا چاہتے ہیں حضرت موسیٰؑ نے دعا کی آپ کی دعا سے اللہ نے اس کے ساتھ اس کے گھر اور خزانوں اور مال متاع کو بھی زمین میں دھنسا دیا یہی مضمون ہے آیت فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ کا۔

وَاَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ ۚ
اور جو لوگ قارون جیسے (مالدار) ہونے کی کل تمنا کر رہے تھے (اب) کہنے لگے ارے ایسا لگتا ہے کہ اللہ جس شخص کی روزی فراخ کرنا چاہتا ہے فراخ کر دیتا ہے اور جس کی روزی تنگ کرنا چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔

مَكَانَهٗ یعنی قارون کے مقام پر پہنچنے کی تمنا جو لوگ کل یعنی کچھ وقت پہلے کرتے تھے۔ وَيْكَاَنَّ بصرہ کے علماء نحو کے نزدیک یہ لفظ وَیْ اور کَاَنَّ سے مرکب ہے وَیْ کلمۂ تعجب ہے اور کَاَنَّ تشبیہ اَللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ یعنی رزق کی فراخی اور تنگی دونوں اللہ کی مشیت سے وابستہ ہیں نہ رزق کی فراخی عند اللہ معزز ہونے کی علامت ہے (کہ کافر کو نہ ملے) نہ رزق کی تنگی اللہ کی طرف سے بے عزتی کا نشان ہے (کہ مومن صالح کا رزق تنگ نہ ہو) خلیل نے کہا لفظ وَیْ اسم فعل ہے تعجب اور ندامت کے اظہار کے لئے اس کا استعمال کیا گیا ہے وہ لوگ اپنی پچھلی تمنا پر پشیمان ہوئے تھے اور انہوں نے پشیمان ہو کر ایسا کہا تھا اور کَاَنَّ کا معنی ہے ایسا اندازہ ہوتا ہے ایسا خیال ہوتا ہے ایسا لگتا ہے۔ قطرب نے کہا وَيْكَ اصل میں وَيْلَكَ تھا دونوں کا معنی ایک ہی ہے لام حذف کر دیا گیا۔ اَنَّ اللّٰهَ فعل محذوف کا مفعول ہے ترجمہ اس طرح ہے ارے جان لے کہ اللہ رزق کشادہ کرتا ہے۔ بعض نے کہا وَيْكَاَنَّ پورا ایک لفظ ہے جو تنبیہ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ حسن نے کہا وَيْكَ کلمۂ ابتدائیہ ہے۔ مجاہد نے کہا اس کا ترجمہ ہے کیا تو نہیں جانتا۔ قتادہ نے کہا اس کا معنی ہے کیا تو نے نہیں دیکھا۔ فراء نے کہا یہ کلمۂ تقریر ہے جیسے کوئی کہے اَمَا تَرٰى اِلٰى صُنْعِ اللّٰهِ وَاِحْسَانِهٖ کیا اللہ کے حسن سلوک اور احسان کو تو نہیں دیکھ رہا ہے یعنی ضرور دیکھ رہا ہے۔ فراء نے کہا میں نے خود سنا کہ۔ ایک بدوی عورت نے اپنے شوہر سے کہا بیٹا کہاں ہے اس نے جواب دیا ویکانه وراء البیت یعنی کیا

ع ۱۱

دیکھو نہیں رہی کہ وہ گھر کے پیچھے ہے۔

لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ۭ وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ۝

اور اگر اللہ ہم پر احسان نہ کرتا تو (قارون کی طرح) ہم کو بھی دھنسا دیتا۔ ارے کیا تم نہیں جانتے کہ کافر فلاح نہیں پاتے یعنی آخرت کے یا پیغمبروں کے یا پیغمبروں کے وعدۂ ثواب کے منکر فلاح یاب نہیں۔

اس جگہ معنی تشبیہ کے علاوہ وَيْكَاَنَّهٗ کا ہر معنی درست ہو سکتا ہے۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝

یہ عالم آخرت ہم ان ہی لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں جو دنیا میں نہ بڑے بننے کے خواستگار ہیں نہ فساد کرنے کے۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ یعنی یہ دار آخرت جس کی خبر تم نے سنی اور جس کے حالات کی اطلاع تم کو دی گئی۔

عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ مقاتل اور کلبی نے کہا یعنی جو لوگ ایمان سے غرور کی وجہ سے سرکشی نہیں کرتے۔ عطاء نے کہا لوگوں پر جبر اور چیرہ دستی نہیں کرتے اور ان کو حقیر نہیں جانتے۔ حسن نے کہا حاکموں اور سرداروں کے پاس عزت و مرتبہ کے طلب گار نہیں ہوتے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا اس آیت کا نزول ان حاکموں کے متعلق ہوا جو باوجود قدرت کے تواضع کرتے ہیں۔ آپ کا مقصد یہ ہے کہ جو حاکم اور صاحب قدرت متواضع ہوتا ہے وہ ملک میں خود اونچا اٹھنے (اور سب پر فوقیت حاصل کرنے) کا خواستگار نہیں ہوتا۔

کلبی نے کہا فساد سے مراد ہے اللہ کے سوا دوسروں کی عبادت کی طرف بلانا۔ عکرمہ نے کہا ناحق (ظلم سے) لوگوں کا مال لینا مراد ہے۔ ابن جریج اور مقاتل نے کہا گناہ کرنا مراد ہے۔

وَالْعَاقِبَةُ قتادہ نے کہا عاقبت سے مراد جنت ہے۔ میں کہتا ہوں کہ نیکیوں کے بعد جو نتیجہ (یعنی ثواب) آتا ہے اس کو عاقبت کہا جاتا ہے اور برائیوں کے بعد آنے والے نتیجہ (یعنی عذاب) کو عقاب کہا جاتا ہے۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

جو شخص (قیامت کے دن) نیکی لے کر آئے گا اس کو نیکی کی مقدار سے اچھا ملے گا اور جو شخص بدی لے کر آئے گا سو ایسے لوگوں کو جو برے کام کرتے ہیں اتنا ہی بدلہ ملے گا جتنا وہ کرتے تھے۔

فله خير منها یعنی دس گنا سے سات سو گنا تک اور اس سے آگے جتنا اللہ کو منظور ہو۔ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ فَلَا يُجْزَوْنَ کی جگہ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ فرمایا تاکہ بدی کی نسبت کی تکرار ہو جائے اور ان کی بری حالت کا بیان ہو جائے۔

اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ یعنی جتنا عمل ہوا اسی کے برابر سزا ہوگی عمل اور سزا باہم بالکل مساوی ہوں گے۔

اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَاۗدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ ۭ

جس خدا نے آپ پر قرآن کو فرض کیا وہ آپ کو آپ کے اصل وطن میں لوٹا کر لے آئے گا۔

فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ یعنی جس نے آپ پر قرآن نازل کیا۔ اکثر مفسرین نے یہی تفسیر کی ہے۔ کذا قال البغوی عطاء نے کہا جس نے آپ پر قرآن کی تلاوت تبلیغ اور اس کے مطابق عمل فرض کیا ہے۔

اِلٰى مَعَادٍ معاد سے مراد ہے مکہ۔ چنانچہ اس وعدہ کے مطابق اللہ نے فتح مکہ کے دن رسول اللہ ﷺ کو مکہ میں لوٹا بھی دیا۔ عوفی نے حضرت ابن عباسؓ کا یہی قول بیان کیا ہے۔ مجاہد کا بھی یہی قول ہے۔ قتیبی نے کہا کسی شخص کا معاد اس کا شہر ہوتا ہے جہاں وہ لوٹ کر آتا ہے۔ معاد میں تنوین تنکیر اظہار عظمت و شان کے لئے ہے یہی وہ جگہ ہے جہاں اللہ کا رسول اللہ کے دشمنوں پر غالب آیا کفر کو شکست ہوئی اور اسلام کا بول بالا ہوا۔

بغوی نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب (مکہ کو چھوڑ کر) مدینہ کی طرف جانے کے لئے غار (ثور) سے نکلے تو تعاقب کے اندیشہ سے عام راستہ کو چھوڑ کر دوسرے راستہ پر چل دیے پھر جب کوئی اندیشہ نہ رہا تو اصل راستہ پر آگئے اور جحفہ کے مقام پر پہنچے جو مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک مقام تھا (یہاں سے مکہ کو بھی راستہ جاتا تھا اور مدینہ کو بھی) مکہ کی جانب والا راستہ دیکھ کر آپ کو مکہ کا شوق پیدا ہوا، جبرئیل نے کہا کیا آپ کے دل میں اپنے شہر اور جنم بھومی کا شوق پیدا ہو گیا؟ حضور ﷺ نے فرمایا جی ہاں جبرئیل نے کہا اللہ فرماتا ہے اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ چنانچہ فتح مکہ کے دن اللہ نے آپ کو لوٹا کر مکہ پہنچا دیا۔

سعید بن جبیرؓ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول بیان کیا ہے کہ معاد سے مراد موت ہے۔ میں کہتا ہوں موت اصلی حالت کی طرف واپس ہونے کا نام ہے اسی لئے معاد موت ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاكُمْ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ تم بے جان تھے اللہ نے تم کو جاندار بنایا پھر وہ تم کو بے جان کر دے گا۔

زہری اور عکرمہ نے کہا معاد سے مراد قیامت ہے۔ بعض نے کہا اس سے جنت مراد ہے کیونکہ اللہ نے جب صراحت فرمادی کہ عاقبت یعنی اچھا انجام متقیوں کے لئے خاص ہے تو نیکوکاروں کو ثواب دینے اور بدکاروں کو عذاب دینے کا وعدہ کر کے اس کی تائید و تاکید کر دی اور دونوں جہاں میں ان کے اچھے انجام کا وعدہ فرمایا۔

کفار مکہ نے رسول اللہ ﷺ سے کہا تھا تم کھلی ہوئی گمراہی میں ہو اس کے جواب میں اللہ نے آیت ذیل نازل فرمائی۔

قُلْ رَّبِّیْٓ اَعْلَمُ مَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى آپ کہہ دیجئے کہ میرا رب خوب جانتا ہے اس کو جو ہدایت لے کر آیا ہے اور اس بات کو بھی خوب جانتا ہے کہ وہ ہدایت لانے والا کس ثواب اور لداد کا مستحق ہے۔

وَمَنْ هُوَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ اور اس کو بھی (خوب جانتا ہے) جو کھلی ہوئی گمراہی میں پڑا ہوا ہے (اور کس عذاب و ذلت کا مستحق ہے) اول سے مراد ہیں رسول اللہ ﷺ اور گمراہی میں پڑے رہنے والوں سے مراد ہیں مشرکین۔ اس آیت میں سابق وعدہ کی مزید تاکید ہے۔

وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ یُّلْقٰٓى اِلَیْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ اور آپ کو تو کوئی امید بھی نہیں تھی کہ آپ کو قرآن دیا جائے گا (اور آپ کے پاس وحی آئے گی) مگر ایسا تو محض آپ کے رب کی رحمت کی وجہ سے ہوا۔ فراء نے کہا اس جگہ استثناء منقطع ہے اور اِلَّا کا معنی ہے لیکن۔ لیکن آپ کے رب نے اپنی رحمت سے آپ کو قرآن عطا کر دیا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ استثناء متصل مفرغ ہو، گویا مطلب اس طرح ہو گا کہ آپ کے رب نے یہ قرآن کسی اور وجہ سے (یعنی استحقاق وغیرہ کی وجہ سے) نہیں دیا۔ مگر اپنی رحمت کی وجہ سے دیا۔

فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِیْرًا لِّلْكٰفِرِیْنَ ۝ سو آپ کافروں کے مددگار نہ بنیں کہ آپ ان سے نرمی کریں ان کی بیہودگیوں کو برداشت کریں اور جس بات کی طرف وہ آپ کو بلائیں آپ اس طرف چلے جائیں۔

مقاتل نے کہا کافروں نے رسول اللہ ﷺ کو دین آباء و اجداد اختیار کرنے کی دعوت دی تھی اس کے جواب میں اللہ نے آپ کو اپنی نعمتیں یاد دلائیں اور کافروں کی پشت پناہی و امداد سے روک دیا۔

وَلَا یَصُدُّنَّكَ عَنْ اٰیٰتِ اللّٰهِ بَعْدَ اِذْ اُنْزِلَتْ اِلَیْكَ اور (یہ کافر) آپ کو نہ روکیں اللہ کی آیات (کو پڑھنے اور ان پر عمل کرنے) سے بعد اس کے کہ وہ اتار کر آپ کی طرف بھیج دی گئی ہیں۔

وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ اور آپ اپنے رب کی (توحید اور معرفت و عبادت کی) طرف (لوگوں کو) بلائیں۔

وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝ اور (کافروں کی مدد و پشت پناہی کر کے) مشرکوں میں سے آپ ہرگز نہ ہو جائیں۔

وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ اور اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو آپ نہ پکاریں یہ اور اس سے اوپر والی

آیات میں حکم دیا ہے کہ کافروں کی امیدوں کو بالکل قطع کر دو۔ وہ کوئی امید اس بات کی نہ کریں کہ آپ ان کی مدد کریں گے۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ کیونکہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ یہ کلام سابق کی علت ہے۔

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ۚ اس کی ذات کے سوا ہر چیز ہلاکت پذیر ہے کیونکہ اللہ کے سوا ہر چیز ممکن ہے اور ممکن وہی ہوتا ہے جو فی نفسہٖ معدوم الوجود ہوتا ہے (اس کا وجود ذاتی نہیں ہوتا) ہر چیز کا وجود ایک عاریت ہے اللہ نے بطور عاریت عطا فرمایا ہے۔

بعض نے كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ جس عمل کا مقصد ذات الٰہی (کی خوشنودی کا حصول) نہ ہو وہ لغو اور باطل ہے یہ کلام سابق کی علت ہے۔

لَهُ الْحُكْمُ اسی کے لئے حکم دینا خاص ہے یعنی اسی کا حکم مخلوق میں جاری ہے۔

وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ اور (آخرت میں) تم لوگ اسی کی طرف لوٹا کر لے جائے جاؤ گے یعنی وہی تم کو تمہارے اعمال کی سزا جزا دے گا۔ ع ۱۲

(۲۸ ربیع الاول ۱۲۰۶ھ کو سورت قصص کی تفسیر ختم ہوئی۔ بحمد اللہ تعالیٰ)۔

سورۃ العنکبوت

یہ سورۃ مکی ہے اس میں ۶۹ آیات ہیں۔ شعبی کے قول پر اس سورۃ کی ابتدائی دس آیات مدنی ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابن ابی حاتم نے شعبی کا بیان نقل کیا ہے کہ کچھ مسلمان مکہ میں رہ گئے تھے۔ مدینہ میں رسول اللہ ﷺ کے جو صحابہؓ تھے انہوں نے مکہ والے مسلمانوں کو لکھا کہ جب تک مکہ سے ہجرت نہ کر آؤ گے تمہارا (محض) اقرار اسلام قبول نہیں ہوگا یہ پیام ملتے ہی مکہ کے مسلمان مدینہ کو جانے کے ارادہ سے چل پڑے کافروں نے ان کا تعاقب کیا اور لوٹا کر (زبردستی) مکہ کو لے گئے اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

الٓمّٓ ۞ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ۞ الٓمّٓ۔ کیا لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ صرف اتنا کہہ دینے سے کہ ہم ایمان لے آئے ان کو چھوڑ دیا جائے گا اور ان کی جانچ نہیں کی جائے گی۔ مدنی صحابہؓ نے مکی مسلمانوں کو یہ آیت لکھ کر بھیج دی مکی مسلمانوں نے کہا اب تو ہم یہاں سے نکل ہی چلیں گے اگر کسی نے ہمارا پیچھا کیا تو ہم اس سے لڑیں گے، چنانچہ یہ حضرات نکل کھڑے ہوئے، مشرکوں نے ان کا تعاقب کیا راستہ میں دونوں گروہوں کی جنگ ہوئی کچھ مسلمان شہید ہوگئے اور کچھ مسلمان بچ کر نکل گئے ان کے متعلق اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِیْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا الخ

ابن ابی حاتم نے قتادہ کی روایت سے بیان کیا ہے یہ آیت کچھ مکی لوگوں (یعنی مکی مسلمانوں) کے حق میں نازل ہوئی تھی یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے مکہ سے چل پڑے تھے مشرکوں نے ان کو روکا تو وہ لوٹ گئے (مدنی) بھائیوں نے ان کو وہ آیت لکھ کر بھیجی جو ان کے بارے میں نازل ہوئی تھی جدید آیت پڑھ کر وہ نکل کھڑے ہوئے۔ شہید ہونے والے شہید ہوگئے اور بچنے والے بچ گئے انہی کے متعلق اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا الخ

بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ آیت میں النّاس سے مراد وہیں مکہ میں رہ جانے والے مسلمان سلمہ بن ہشام، عیاش بن ربیعہ، ولید بن ولید، عمار بن یاسر وغیرہ۔

ابن سعد، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن عمیرؓ کے حوالہ سے بیان کیا کہ آیت ذیل کا نزول حضرت عمار بن یاسر کے متعلق ہوا آپ کو اللہ کی راہ میں سخت دکھ دیئے جاتے تھے اللہ نے فرمایا اَحَسِبَ النَّاسُ الخ بغوی نے ابن جریج کا بھی یہی قول نقل کیا ہے۔ مقاتل نے کہا حضرت عمرؓ کے آزاد کردہ غلام حضرت مہجع بن عبداللہ کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی تھی اس امت میں آپ پہلے شخص ہوں گے جن کو جنت کے دروازہ کی طرف بلایا جائے گا۔

میں کہتا ہوں حضرت مہجع ہی جنگ بدر کے دن مسلمانوں کی طرف سے سب سے پہلے کافروں کے مقابلہ کے لئے قطار سے باہر نکل کر آئے تھے۔ عامر بن حضرمی نے آپ کو تیر مار کر شہید کر دیا اور خدا میں سب سے پہلے شہید آپ ہی ہوئے۔ جب آپ کے والدین اور بی بی بے تابی کے ساتھ گریہ وزاری کرنے لگے تو ان کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔

اَلٓمّٓ کے بعد ہمزہ استفہام کا ذکر کرنا دلالت کر رہا ہے کہ اَلٓمّٓ الگ مستقل جملہ ہے (کیونکہ ہمزہ استفہام کا تقاضا ہے کہ آغاز کلام میں آئے اگر اَلٓمّٓ سے بعد والے جملہ کا ارتباط ہوتا تو ہمزہ استفہام اَلٓمّٓ سے پہلے آتی۔ مترجم)

حسبان سے مراد ہے گمان کرنا اور استفہام انکاری ہے یا زجری۔ مطلب یہ ہے کہ کیا لوگ اپنے کو یونہی متروک بے امتحانی سمجھ بیٹھے ہیں کہ صرف آمنّا کہہ دینے سے چھوٹ جائیں گے ایسا نہیں ہوگا بلکہ اللہ ان کو مصائب اور دشواریوں میں مبتلا کر کے ان کا امتحان لے گا مثلاً وطن سے ہجرت کرنا، جہاد کرنا اور طرح طرح کے مالی جانی اور اولاد کے دکھ ان کو اٹھانے ہوں گے تاکہ مخلص اور منافق کے درمیان امتیاز ہو جائے اور دین پر ثابت قدم رہنے والا تردد و شک کرنے والے سے الگ ہو جائے اور صبر کرنے والوں کو اونچے مراتب ملیں۔

بغوی نے ذکر کیا ہے کہ شروع میں اللہ نے صرف ایمان کا حکم دیا تھا پھر نماز، زکوٰۃ اور دوسرے قوانین فرض کئے۔ بعض لوگوں کو اس کی تعمیل میں دشواری ہوگی اور ان پر یہ حکم شاق ہوا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس شان نزول پر آیت کا یہ مطلب ہوگا کیا لوگوں کو یہ خیال ہے کہ صرف ایمان لانے سے (بغیر شرائع کے) ان کو چھوڑ دیا جائے گا اور دوسرے اوامر و نواہی بھیج کر ان کی آزمائش نہیں کی جائے گی۔ صرف ایمان لانا اگرچہ دوامی جہنمی ہونے سے روکتا ہے اور جنت میں (کبھی نہ کبھی) داخل ہونے کا مستحق بنا دیتا ہے لیکن حصول درجات تو ادائے طاعات اور ترک خواہشات سے وابستہ ہے۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ہم ان سے پہلے لوگوں کی (سخت) آزمائشیں کر چکے ہیں۔ یعنی انبیاء اور مومنین کی سخت آزمائشیں ہم کر چکے ہیں۔ بعض انبیاء کو آروں سے چیر اگیا۔ بعض کو قتل کر دیا گیا۔ بنی اسرائیل کو فرعون بدترین عذاب دیتا رہا۔ مراد یہ ہے کہ اللہ کا یہ پرانا دستور ہے کہ نیک لوگوں کو سخت مصائب میں مبتلا کر کے پرکھا جاتا ہے تمام امتیں اسی آزمائشی دور سے گزری ہیں، تو کیا اس زمانہ میں اس سنت قدیمہ کی خلاف ورزی ہو سکتی ہے۔

فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۝ سو اللہ ان لوگوں کو (ظاہری علم سے) جان کر رہے گا جو (ایمان کے دعوئی میں) سچے ہیں اور جھوٹوں کو بھی جان کر رہے گا۔

اللہ تو ہمیشہ سے جانتا ہے سچوں کو بھی اور جھوٹوں کو بھی اس لئے حصول علم مقصود نہیں ہے بلکہ اس کے علم ازلی کا سچوں کی سچائی اور کاذبوں کے جھوٹ سے بالفعل (بعد العمل) تعلق پیدا کرنا مقصود ہے تاکہ سچے ایمان والے جھوٹے منافقوں سے ممتاز ہو کر الگ ہو جائیں اور ان سے ثواب یا عذاب کا تعلق ہو جائے۔ بعض کے نزدیک آیت کا مطلب اس طرح ہے کہ اللہ سچوں کو جھوٹوں سے الگ کر کے ظاہر کر دے گا تاکہ اللہ کے ازلی علم کا فعلی ظہور ہو جائے۔ مقاتل نے علم کا ترجمہ دکھانا کیا ہے۔ اللہ دکھا دے گا۔ بعض نے اس طرح معنی بیان کئے کہ اللہ ناپاک کو پاک سے الگ کر دے گا۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ؕ کیا بدکاریاں کرنے والے یہ خیال کرتے ہیں کہ ہماری گرفت سے وہ نکل جائیں گے۔ بدکاریوں سے مراد ہے کفر اور معاصی کیونکہ عمل کا لفظ جس طرح اعضاء کے افعال کو شامل ہے اسی طرح دلوں کے فعل کو بھی شامل ہے۔

اَنْ يَّسْبِقُوْنَا کہ وہ ہم سے آگے بڑھ جائیں گے اور ہم ان سے انتقام نہ لے سکیں گے۔ ام منقطعہ ہے اور اول کلام سے اضراب (اعراض) کو ظاہر کر رہا ہے اول حسب کا مفہوم ہے ایمان کا امتحان نہ ہونے کا گمان اور دوسرے حسب کا مفہوم ہے گناہوں کی سزا نہ پانے کا گمان۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اول گمان کرنے والے مومن تھے اور یہ دوسرا خیال کافروں کا تھا۔

میں کہتا ہوں ام متصلہ بھی ہو سکتا ہے اس سے مقصود ہے دونوں گمانوں کا ابطال۔ مطلب اس طرح ہوگا اے اہل ایمان تم یہ خیال نہ کرنا کہ تمہاری آزمائش نہیں کی جائے گی۔ مصائب میں مبتلا کر کے تمہارا امتحان ضرور لیا جائے گا تاکہ تم کو اونچے مراتب تک پہنچایا جائے اور تمہارے دشمنوں کو بھی یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ اللہ ان کو دنیا اور آخرت میں عذاب نہیں دے گا ان کو ضرور عذاب دیا جائے گا دنیا میں مسلمانوں کے ہاتھوں (قتل و قید کی صورت میں) اور آخرت میں براہ راست خدا کی طرف سے

(دوزخ کی صورت میں) خلاصہ کلام یہ کہ مسلمانوں کو مصائب میں مبتلا کر کے آزمائش ضرور کی جائے گی اور نتیجہ میں ان کو غلبہ حاصل ہو گا۔

سَآءَ مَا یَحْکُمُوْنَ ۝ برا ہے وہ فیصلہ جو یہ لوگ کر رہے ہیں (کہ ہمارے ہاتھ سے چھوٹ کر نکل جائیں گے اور ہم ان سے انتقام نہ لے سکیں گے۔ مترجم)

مَنْ کَانَ یَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ؕ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝ جو شخص اللہ سے ملنے کی امید رکھتا ہو سو اللہ تعالیٰ (سے ملنے) کا وہ معین وقت ضرور آنے والا ہے اور وہی سب کچھ جاننے والا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اس جگہ رجاء کا معنی ہے خوف یعنی جو شخص حشر نشر، حساب فہمی اور عذاب خدا سے ڈرتا ہے۔ سعید بن جبیرؒ نے کہا رجاء بمعنی طمع ہے یعنی جو شخص ثواب کا خواہشمند ہے۔

میں کہتا ہوں یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جو شخص (دنیا میں) اللہ کے دیدار کا خواہشمند ہے۔ اس مطلب پر آیت سے استدلال کیا جا سکے گا کہ دنیا میں اللہ کا دیدار نہیں ہو سکتا۔ ہاں بعض روایات میں آیا ہے کہ معراج میں رسول اللہ ﷺ نے اللہ کو دیکھا تھا۔ مگر یہ دنیا میں دیدار نہ تھا (اس مادی دنیا سے برزخی دنیا الگ ہے اگر حضور ﷺ نے باری تعالیٰ کو دیکھا تھا تو برزخی عالم میں دیکھا تھا۔ مترجم) اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ دنیا میں چہرہ کی آنکھوں سے خدا کو دیکھنے کا جو شخص مدعی ہو وہ جھوٹا ہے۔

اَجَلَ اللّٰهِ یعنی اللہ سے ملنے کا مقرر وقت ضرور آنے والا ہے۔ مقاتل نے کہا اس سے مراد ہے قیامت کا دن۔ یعنی قیامت کا دن ضرور آئے گا اس لئے آدمی پر لازم ہے کہ ایسے کاموں کی طرف پیش قدمی کرے جن سے ثواب کا حصول ہو جس کی اس کو خواہش ہے اور عذاب سے نجات مل جائے جس کا اس کو ڈر ہے۔ دوسری آیت میں اس مفہوم کو اس طرح ادا کیا ہے فَمَنْ کَانَ یَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْیَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا یُشْرِکْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا

وَهُوَ السَّمِیْعُ اور وہی اپنے بندوں کے اقوال سننے والا ہے اور ان کے عقائد و اعمال کو جاننے والا ہے۔

وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا یُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ۝ اور جو جہاد کرے گا وہ اپنے فائدہ کے لئے جہاد کرے گا اللہ کو تو دنیا جہان میں سے کسی بات کی ضرورت نہیں۔ (وہ سب سے بے نیاز ہے) یعنی جو میدان جنگ میں اللہ کے دشمنوں سے لڑے گا یا اپنے نفس سے جہاد کرے گا ممنوعہ خواہشات سے اپنے آپ کو روکے گا، شیطان کا مقابلہ کرے گا، طاعت خداوندی پر جمع رہے گا، شیطانی وسوسوں کو دفع کرے گا۔

لَغَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ لوگوں کی عبادت و طاعت کی اللہ کو حاجت نہیں اس نے اپنے بندوں کو اپنی عبادت کا حکم محض اپنی رحمت سے دیا اور انہی کے فائدوں کے لئے دیا۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُکَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے ہم ان کے برے کام ان سے ساقط کر دیں گے۔ یعنی نیکیوں کے ذریعہ سے برائیوں کو دور کر دیں گے (برائیوں کو معاف کر دیں گے۔ مترجم) حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پانچوں نمازیں (باہم ایک وقت سے دوسرے وقت تک) اور جمعہ کی نماز (آئندہ) جمعہ تک اور رمضان (کے روزے آئندہ) رمضان تک درمیانی گناہوں کو اتار دینے والے ہیں بشرطیکہ بندہ کبیرہ گناہوں سے بچتا ہے، رواہ مسلم۔ یہ بحث آیت اِنْ تَجْتَنِبُوْا کَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُکَفِّرْ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ کی تفصیل کے ذیل میں گزر چکی ہے۔

وَلَنَجْزِیَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِیْ کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ اور ہم ان کو (سب سے اچھے) اعمال کا بدلہ دیں گے۔ سب سے اچھا عمل ہے طاعت یعنی ہم ان کی اطاعت کو ضائع نہیں کریں گے۔ بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان کے اعمال سے زیادہ جزا ان کو دیں گے، دس گنے سے سات سو گنے تک اور اس سے زائد جتنا اللہ چاہے۔ بعض نے کہا اَحْسَنَ اس جگہ (اسم تفضیل کے معنی میں نہیں ہے بلکہ) حسن اچھا کے معنی میں ہے (یعنی بمعنی صفت مشبہ ہے)

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۚ اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ بھلائی کرنے کی نصیحت کی (حکم دیا)

وصیت کا معنی ہے کسی سے نصیحت آمیز بات کہنا وَصَّیْنَا یعنی ہم نے حکم دیا۔ حُسْنًا سے مراد ہے ایسا کام جس میں بھلائی ہو۔ حسن مصدر ہے (اگر کسی عمل میں انتہائی خوبی ہوا تی کہ گویا وہ مجسم حسن ہو جائے اس پر حسن کا اطلاق مبالغۃً کر دیا جاتا ہے) اسی جگہ بطور مبالغہ ہی حسن کو حسن فرمایا ہے۔ مراد ہے فرمانبرداری، اطاعت، مہربانی۔ مسلم، ترمذی، بغوی، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے حضرت سعدؓ بن ابی وقاصؓ کی روایت سے بیان کیا ہے (حضرت سعدؓ بن ابی وقاصؓ عشرہ مبشرہ میں سے تھے سابقین اولین میں سے تھے اپنی ماں کے بڑے فرمانبردار اور اطاعت گزار تھے آپ کے باپ کا نام مالک تھا اور قبیلہ بنی زہرہ کے ایک ممتاز شخص تھے) حضرت سعد سے ان کی ماں حمنہ بنت ابی سفیان بن عبد الشمس نے کہا تو نے یہ کیا نئی بات نکال رکھی ہے جب تک تو اس کا انکار نہیں کرے گا اس وقت تک بخدا میں نہ کھانا کھاؤں گی نہ پانی پیوں گی یہاں تک کہ یونہی مرجاؤں گی۔ دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں جب تک اس مذہب سے جس پر تو قائم ہے لوٹ نہیں جائے گا میں کچھ کھاؤں گی نہ پیوں گی یونہی مر جاؤں گی پھر ہمیشہ تجھے لوگ اس کی عار دلاتے رہیں گے کہ یہ ماں کا قاتل ہے اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَإِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۚ اور اگر وہ دونوں تم سے زور دے کر کہیں کہ میرے ساتھ ان چیزوں کو شریک قرار دو جن (کی الوہیت) کا تم کو کچھ علم نہیں ہے تو ان کا کہنا نہ ماننا

یعنی جن چیزوں کے خدا ہونے نہ ہونے کا تم کو کچھ علم نہیں ان کی الوہیت کا صحیح ہونا تم کو معلوم نہیں تو ایسی حالت میں بھی تم والدین کا کہنا نہ ماننا چہ جائیکہ تم کو اللہ کی الوہیت کی وحدانیت اور دوسروں کی الوہیت کی نفی قطعی دلائل سے معلوم ہو تو اس صورت میں اطاعت والدین نہ کرنا تو بدرجہ اولیٰ ضروری ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی فرمانبرداری (جائز) نہیں رواہ احمد والحاکم وصحح عن عمران۔ صحیحین اور سنن ابوداؤد اور نسائی میں حضرت علیؓ کی روایت سے آیا ہے کہ اللہ کی نافرمانی میں کسی کی فرمانبرداری (جائز) نہیں (والدین کی) اطاعت تو اچھے کاموں میں (لازم) ہے۔

بغوی نے لکھا ہے اس آیت کے نزول کے بعد حضرت سعدؓ کی ماں نے ایک دن رات یا تین دن بغیر کھائے پئے گزار دیئے۔ سعدؓ ماں کے پاس گئے اور کہا اماں اگر تیری سو جانیں ہوں اور ایک ایک جان نکل جائے تب بھی میں اپنا مذہب نہیں چھوڑوں گا تیرا دل چاہے کھانا چاہے نہ کھا۔ جب ماں ناامید ہو گئی تو اس نے کھانا پینا شروع کر دیا۔

إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۞ میری ہی طرف تم سب کو واپس آنا ہے پھر میں ہی تم کو بتاؤں گا جو کچھ تم کرتے۔ یعنی تمہارے اعمال کی سزا جزا دوں گا۔ حضرت سعدؓ کے قصہ کے زمانہ میں ہی وہ آیت بھی نازل ہوئی جو سورۂ لقمان میں آئی ہے اور وہ آیت بھی جو سورۂ احقاف میں ہے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصَّالِحِينَ ۞ اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیکیاں کیں ہم ضرور ہی ان کو صالحین میں شامل کر دیں گے۔

اَلصّٰلِحِیْنَ سے مراد ہیں انبیاء، اولیاء، شہداء یعنی ہم نیکوکار مومنوں کو انبیاء اولیاء وغیرہ کے ساتھ شامل کر دیں گے یا ان کا حشر ان لوگوں کے ساتھ کریں گے یا جنت میں ان کے ساتھ ان کو داخل کریں گے جنت میں سب ساتھ ہو جائیں گے۔ صلاح اور نیکی میں کمال مومنوں کے درجات کی انتہا ہے اور انبیاء مرسلین کی تمنا کا بھی یہی آخری نقطہ ہے کیونکہ کمال صلاح کا معنی یہ ہے کہ کسی طرح کا بگاڑ اور خرابی نہ ہو نہ عقیدہ نہ عمل میں نہ اخلاق و مشاغل زندگی میں۔

ابن جریر اور ابن المنذر نے بروایت عکرمہ حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ مکہ کے کچھ لوگ تو مسلمان ہو گئے تھے مگر وہ اپنے ایمان پوشیدہ رکھتے تھے، بدر کی لڑائی میں مشرک ان کو اپنے ساتھ (مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے) لے گئے ان

میں سے کوئی مارا گیا تو مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا یہ لوگ تو مسلمان تھے مجبوراً ناگواری خاطر مشرکوں کے ساتھ آئے جو لوگ مارے گئے ان کے لئے آپ دعا مغفرت فرما دیجئے اس پر سورۂ نساء کی آیت اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِهِمْ الخ نازل ہوئی مدینہ کے مسلمانوں نے یہ آیت لکھ کر مکہ میں رہ جانے والے مسلمانوں کو بھیج دی اور یہ بھی لکھ دیا کہ اب تمہارے لئے عذر کا کوئی موقع باقی نہیں رہا۔ یہ خط پڑھ کر مکہ کے مسلمان نکل کھڑے ہوئے مشرکوں نے ان کا تعاقب کیا اور زبردستی واپس لے گئے اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِیَ فِی اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ؕ

اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے لیکن جب اللہ کی راہ میں ان کو کچھ دکھ پہنچتا ہے تو آدمیوں کی طرف سے پہنچنے والے دکھ کو وہ اللہ کے عذاب کی طرح قرار دیتے ہیں۔

یہ منافقوں کی حالت بیان کی گئی ہے فِی اللّٰهِ اللہ کی راہ میں یعنی مسلمان ہونے کی بنیاد پر جو دکھ ان کو کافروں کی طرف سے پہنچتا ہے۔ كَعَذَابِ اللّٰهِ یعنی آخرت کے عذاب کی طرح، مطلب یہ ہے کہ کچھ لوگ کافروں کی طرف سے پہنچنے والے دکھ پر صبر نہیں رکھتے اور بے تاب ہو کر کافروں کا کہا مان لیتے ہیں اور اسلام کو چھوڑ دیتے ہیں جس طرح کہ مسلمان اللہ کے عذاب آخرت کے خوف سے کفر و معصیت کو ترک کر دیتے ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اس آیت کے نزول کی جب مکہ کے مسلمانوں کو اطلاع ملی تو وہ گروہ بند ہو گئے اور اپنی جماعت قائم کر کے انہوں نے کہا اب ہم یہاں سے ضرور نکل کر (مدینہ کو) جائیں گے اگر کوئی ہمارا تعاقب کرے گا تو ہم اس سے لڑیں گے اس پر آیت ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِیْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا الخ نازل ہوئی اور مدینہ والوں نے ان کو یہ آیت لکھ بھیجی۔ خط پڑھتے ہی سب لوگ نکل کھڑے ہوئے کافروں نے تعاقب کیا اور راستہ میں ان کو جا لیا آخر لڑائی ہوئی کچھ لوگ بچ کر نکل گئے اور جو شہید ہونے والے تھے شہید ہو گئے۔ قتادہ نے کہا کہ اس آیت کا نزول ان لوگوں کے متعلق ہوا جن کو مشرک لوٹا کر لے گئے تھے۔

وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَیَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ؕ اَوَلَیْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِیْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِیْنَ ۝

اور اگر آپ کے رب کی طرف سے (مسلمانوں کے لئے) کوئی مدد آجائے (یعنی مسلمان فتح یاب ہو جائیں اور مال غنیمت ان کو حاصل ہو جائے) تو کہتے ہیں ہم تو تمہارے ہی ساتھ تھے کیا اللہ لوگوں کے دلوں کی باتوں سے واقف نہیں ہے۔

نَصْرٌ یعنی مسلمانوں کی فتح اور مال غنیمت کا حصول۔

بعض اہل روایت کا کہنا ہے کہ آیت وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ کا نزول منافقوں کے متعلق ہوا اس قول کی تائید آیت اَوَلَیْسَ اللّٰهُ سے ہوتی ہے۔

اَوَلَیْسَ میں ہمزہ استفہام انکار حال کے لئے ہے یعنی ایسی حالت نہیں ہے کہ اللہ ان کے سینوں کے اندر کی باتیں نہ جانتا ہو وہ سب کے دلوں کی باتوں سے واقف ہے اخلاص ہو یا نفاق وہ سب کو جانتا ہے اور منافقوں کو ان کے نفاق کی سزا دے گا۔

وَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ ۝ اور اللہ ضرور جان کر رہے گا ان کو جو (سچے دل سے) ایمان لائے اور منافقوں کو بھی ضرور جان کر رہے گا یعنی ہر شخص کو اس کے پوشیدہ ضمیر کے مطابق بدلہ دے گا۔ شعبی کا قول ہے آغاز سورت سے یہاں تک دس آیات مدنی ہیں اور اس کے آگے آخر سورت تک ساری آیات مکی ہیں۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِیْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰیٰكُمْ ؕ

اور کافروں نے مومنوں سے کہا ہماری راہ پر چلو (اگر قیامت راہ اور ہماری راہ پر چلنا غلط ہو گا) تو ہم کو تمہارے جرائم بھی اپنے اوپر اٹھا لینا ضرور ہے۔ مجاہد نے کہا کفار مکہ نے یہ بات کہی تھی۔ کلبی اور مقاتل نے کہا ابوسفیان نے مومنوں سے کہا تھا ہمارے دین

پر اور ہمارے باپ دادا کے مذہب پر چلو کفر کو اختیار کرنے کی جرأت پیدا کرنے کے لئے انھوں نے ایسا کہا تھا۔

فراء نے کہا وَلْنَحْمِلْ لفظ کے اعتبار سے امر کا صیغہ ہے لیکن معنی کے لحاظ سے (شرط محذوف کی) جزاء ہے یعنی اگر ہماری راہ پر چلو گے تو ہم تمہارے گناہ (قیامت کے دن بشرطیکہ وہ دن آیا) اپنے اوپر اٹھالیں گے (امر بمعنی جزا) دوسری آیت میں بھی اسی طرح آیا ہے فرمایا ہے فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ پھر دریا کو چاہئے کہ اس کو ساحل پر پھینک دے یعنی دریا اس کی لاش کو ساحل پر پھینک دے گا۔

وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝ اور وہ ان کے گناہوں میں سے کچھ بھی (اپنے اوپر) نہیں اٹھائیں گے واقع میں وہ جھوٹے ہیں یعنی جو دوسروں کے گناہ اپنے اوپر اٹھانے کی خبر دے رہے ہیں یہ جھوٹ کہہ رہے ہیں (کذب اور صدق خبر کے اوصاف ہیں اور کافروں نے وَلْنَحْمِلْ کہا تھا جو امر کا صیغہ ہے اور امر انشاء کی ایک قسم ہے اور انشاء سے کذب کا تعلق نہیں ہو سکتا اس لئے مفسر کو بالا تاویل کرنی پڑی۔ مترجم)

وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ اور یہ لوگ (خود کئے ہوئے گناہوں کے) بوجھ اٹھائیں گے اور اپنے اعمال کے بوجھ کے ساتھ کچھ اور بوجھ بھی اٹھائیں گے یعنی دوسروں کو گمراہ کرنے کا بار مگر اس سے گمراہ ہونے والوں کا بار ہلکا نہ ہو سکے گا۔

وَلَيُسْـَٔلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝ اور قیامت کے دن ان سے ان کی افترا پردازیوں کی باز پرس ضرور ہو گی یعنی وہ جھوٹی باتیں جن سے دوسروں کو گمراہ کرتے تھے ان سے ان باتوں کی ضرور باز پرس ہو۔ ع ۱۴

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا ۭ فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝ اور ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف (ہدایت کرنے کے لئے) بھیجا سو وہ ان کے اندر پچاس سال کم ایک ہزار برس (ہدایت میں مشغول) رہے آخر ان کو طوفان نے آپکڑا اس لئے کہ وہ ظالم تھے۔

فَلَبِثَ (کاف تعقیبیہ) دلالت کر رہا ہے کہ حضرت نوح پیغمبر بنائے جانے کے بعد اپنی قوم میں نو سو پچاس برس رہے۔ طوفان (بہت گھومنے والا، بہت چکر لگانے والا۔ مبالغہ کا صیغہ ہے۔ مترجم) جو چیز حد سے زیادہ گردش کرے خواہ ہوا ہو یا پانی یا اور کچھ اس کو طوفان کہتے ہیں۔ عظیم سیلاب طوفان ہے زیادہ تند تیز آندھی طوفان ہے اس جگہ طوفان آبی مراد ہے۔ طوفان نے قوم نوح کو آپکڑا جس میں سب ڈوب گئے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا چالیس سال کی عمر میں حضرت نوح کو نبوت ملی پھر ساڑھے نو سو برس قوم کو ہدایت کرتے رہے اور طوفان کے بعد ساٹھ برس زندہ رہے جب لوگوں کی نسلیں بڑھ گئیں اور پھیل گئیں اور آپ کی عمر ایک ہزار پچاس برس کی ہو گئی تو آپ کی وفات ہو گئی۔ حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول ابن ابی شیبہ نے عبد بن حمید نے ابن المنذر نے ابن ابی حاتم نے ابو الشیخ نے اور حاکم نے نقل کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے ابن مردویہ نے بھی اس کو نقل کیا ہے اور بغوی نے اس کا ذکر کیا ہے۔

وہب کا بیان ہے کہ حضرت نوح کی عمر ایک ہزار چار سو برس ہوئی۔ آخر موت کے فرشتے نے آپ سے پوچھا اے دراز ترین عمر والے پیغمبر آپ نے دنیا کو کیسا پایا فرمایا ایسا جیسے کسی نے ایک مکان بنایا ہو جس کے دو دروازے رکھے ہوں میں ایک دروازہ سے داخل ہوا اور دوسرے دروازے سے باہر نکل گیا۔

آیت میں نو سو پچاس برس کا لفظ نہیں فرمایا کیونکہ ہزار کے لفظ میں ایک طرح کی شان اور عظمت ہے دکھانا یہ ہے کہ ایک عظیم الشان طویل مدت تک حضرت نوح قوم کی طرف سے پہنچنے والی تکالیف پر صبر کرتے رہے اور اتنی طویل مدت تک قوم کی پرفریب تدبیروں کا مقابلہ کرتے رہے پھر لفظ الف میں اختصار کیا ہے۔

فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ پھر ہم نے نوح کو اور کشتی والوں کو (طوفان سے) بچالیا۔ کشتی والوں سے مراد ہیں حضرت نوح کی اولاد اور وہ لوگ جو آپ پر ایمان لے آئے تھے اور آپ کے ساتھ کشتی میں سوار تھے۔ ان کی کل تعداد

اسی (۸۰) تھی، بعض نے ۷۸ بتائی ہے۔ ایک قول میں دس کی تعداد آئی ہے۔ کشتی والوں میں آدھی تعداد مردوں کی تھی آدھی عورتوں کی۔ حضرت نوحؑ کے قصہ کی پوری تفصیل سورۂ ہود اور سورۂ اعراف میں گزر چکی ہے۔

وَجَعَلْنٰهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۵﴾ اور (اس کشتی کو یا واقعہ) کو ہم نے تمام لوگوں کے لئے (باعث عبرت اور قدرت خداوندی پر دلیل) بنایا۔ تاکہ وہ نصیحت پذیر ہوں اور اللہ کی ہمہ گیر قدرت پر اس سے استدلال کریں۔

وَاِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اور ہم نے ابراہیم کو پیغمبر بنایا۔ یاد کرو (اس واقعہ کو کہ) جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ کی عبادت کرو اور اس سے ڈرو۔ یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ یعنی جب ابراہیم کمال عقل کے درجہ پر پہنچ گئے اور غور و نظر کی طاقت کامل ہو گئی اور حق کی معرفت ان کو حاصل ہو گئی اور دوسروں کو بھی انہوں نے حق کو قبول کرنے اور اس پر چلنے کا حکم دیا تو ہم نے ان کو پیغمبر بنایا تو انہوں نے اپنی قوم کو حکم دیا صرف اللہ کی عبادت کرو اس سے ڈرو (یا اس کے عذاب سے خوف کرو)

اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶﴾ اگر تم اہل علم میں سے ہو تو ایسا کرو یعنی اگر تم خیر و شر کو جانتے ہو اور حق کا باطل سے امتیاز کرتے ہو یا یہ مطلب ہے کہ اگر تم علمی نظر رکھتے ہو اور تعصب و ضد سے تمہاری نظر پاک ہے یا یہ مطلب ہے کہ اگر تم ان لوگوں میں سے جو اہل علم و تمیز ہیں تو تم سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہو گی کہ اللہ کی عبادت اور اس کے عذاب کا خوف اس مذہب سے بہتر ہے جس پر تم چل رہے ہو۔

اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ۭ کوئی شبہ نہیں کہ اللہ کو چھوڑ کر تم محض بتوں کو پوجتے ہو (جو نہ ضرر پہنچا سکتے ہیں نہ نفع) اور تم جھوٹ گھڑتے ہو (کہ بتوں کو تم معبود کہتے ہو اور ان کو اپنا سفارشی قرار دیتے ہو۔ اس صورت میں اِفْكًا مفعول مطلق ہو گا۔ ممکن ہے کہ یہ مفعول لہ ہو اور فعل سابق کی علت ہو یعنی محض جھوٹ کی وجہ سے تم ان کو تراشتے ہو۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا یہ حقیقت کہ اللہ کے سوا تم جن کی پوجا کرتے ہو (بت ہوں یا کوئی اور کچھ) وہ تم کو رزق دینے کے مالک نہیں ہیں یعنی ان کی عبادت بے سود ہے ان کے قبضہ میں تمہارا رزق بھی نہیں ہے۔ یہ غیر اللہ کی پرستش کے قبیح ہونے کی دوسری دلیل ہے۔ رِزْق مصدر ہے۔ (رزق دینا) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مصدر بمعنی اسم مفعول ہو یعنی وہ چیز جو دی جاتی ہے اس صورت میں رِزْقًا کی تنوین عموم اور تحقیر کے لئے ہو گی۔ یعنی کسی ادنیٰ مرزوق کے بھی مالک نہیں ہیں۔

فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ سو (سارا) رزق اللہ ہی کے پاس تلاش کرو کیونکہ وہی ہر رزق کا مالک ہے اس کے سوا کوئی اور رزق کا مالک نہیں۔

وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ۭ اور اس کی عبادت کرو اور اس کا شکر بجالاؤ۔ یعنی عبادت اور شکر نعمت کو حصول مقاصد کا ذریعہ بناؤ اور انہی دونوں کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرنے کیلئے تیار ہو جاؤ، کیونکہ۔

اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۷﴾ تم سب کو اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔

وَاِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ۭ پھر اگر تم میری تکذیب کرتے ہو تو تم سے پہلے بہت امتیں (اپنے اپنے پیغمبروں کی) تکذیب کر چکی ہیں۔

لیکن ان کی تکذیب سے پیغمبروں کو کوئی ضرر نہیں پہنچا، تکذیب کرنے والوں نے خود اپنا نقصان کیا کیونکہ تکذیب کی وجہ سے ان پر عذاب آیا۔ اسی طرح تمہاری تکذیب بھی مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی خود تم مصیبت میں مبتلا ہو گے۔

وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۸﴾ اور رسول پر تو سوائے اس کے کہ کھول کر (اللہ کا پیام) پہنچا دے اور کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ یعنی رسول کے ذمہ تو ایسی تبلیغ ہے جو شک کو دور کر دے، مطلب یہ ہے کہ کسی کی

تکذیب سے پیغمبر کا کچھ نقصان نہیں ہوتا، مخلوق کو راستہ دکھادینا اس کا فرض ہے کسی کو ہدایت یاب کر دینا اس پر لازم نہیں یہ بات اس کی قدرت سے باہر ہے۔ یہ آیت فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖ تک حضرت ابراہیم کا کلام بھی ہو سکتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ بطور جملہ معترضہ حضرت ابراہیم کے قصہ کے درمیان ذکر کر دی گئی ہو جس میں رسول اللہ ﷺ اور قریش کی حالت بیان کر دی گئی ہو اور رسول اللہ ﷺ سے جو قریش بد سلوکی کرتے تھے اس پر عذاب کی وعید کا اظہار کر دیا گیا ہو۔ حضرت ابراہیم کے قصہ کے درمیان اس کو اس لئے ذکر کیا کہ آیت کی رفتار بتا رہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو تسلی دینا مقصود ہے یہ بیان کرکے کہ آپ کے والد حضرت خلیل اللہ کی حالت بھی آپ کی حالت کی طرح ہوئی تھی ان کی بھی مخالفت قوم کی طرف سے ہوئی تھی اور قوم نے ان کی تکذیب کی تھی۔

أَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ۚ کیا ان لوگوں کو معلوم نہیں کہ اللہ مخلوق کو کس طرح اول بار پیدا کرتا ہے پھر وہی اس کو دوبارہ پیدا کرے گا۔ استفہام انکاری ہے یعنی تکذیب کے وقت کوئی ایسی حالت ہی نہیں ہے کہ انہوں نے ابتدائی تخلیق کو نہ دیکھا ہو۔

كَيْفَ يُبْدِئُ یعنی کیا انہوں نے اپنی ابتدائی تخلیق کی کیفیت کو نہیں دیکھا۔ ضرور دیکھا ہے لیکن عبرت حاصل نہیں کی اللہ نے ان کو نطفہ سے، پھر بستہ خون سے، پھر گوشت کی بوٹی سے بناتا، پھر بچہ بنا کر باہر لے آتا ہے، پھر وقت موت تک اس کے حالات تو بدلتے رہتے ہیں یہاں تک کہ موت آجاتی ہے۔

ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ۔ اعادہ سے مراد ہے مرنے کے بعد دوبارہ زندگی عطا کرنا۔ یہ بھی اعادہ کا مطلب ہو سکتا ہے کہ سبزہ اور پھل وغیرہ اللہ دوبارہ ویسے ہی پیدا کر دیتا ہے جیسے گزشتہ سال پیدا کئے تھے۔

اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ یہ (اعادہ یا فعل مذکور) اللہ کے لئے آسان ہے کیونکہ اللہ ایسا کرنے میں کسی چیز کا محتاج نہیں ہے نہ ایسا کرنے سے اللہ کو تھکان ہوتی ہے۔

قُلْ سِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ آپ کہہ دیجئے ملک میں چل پھر کر دیکھو کہ اللہ نے کس طرح ابتدائی تخلیق کی ہے یعنی مخلوق کی اجناس اور احوال کو دیکھو۔ یہ کلام یا تو اس قول کی نقل ہے جو اللہ نے حضرت ابراہیم سے فرمایا تھا، اس صورت میں فعل محذوف ماننا پڑے گا یعنی ہم نے ابراہیم سے کہا کہ تم لوگوں سے کہہ دو یا خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے۔

ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ ۚ پھر اللہ پچھلی بار بھی پیدا کرے گا۔

قیاس کا تقاضا تھا کہ عبارت اس طرح ہوتی كَيْفَ بَدَاَ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ (یعنی بدء کے ساتھ اس کا فاعل ذکر کیا جاتا پھر يُنْشِئُ کی ضمیر مستتر اس کی طرف راجع کر دی جاتی اور دوسرے جملہ کو بھی فعلیہ بنایا جاتا اسمیہ نہ بنایا جاتا) طرز عبارت بدلنے کی وجہ یہ ہے کہ اعادہ کا جواز ثابت کرنا مقصود ہے جب ابتدائی جملہ میں ثابت کر دیا کہ ابتدائی تخلیق اللہ کی طرف سے ہے تو یہ ثبوت ہو گیا کہ اعادہ بھی اللہ کر سکتا ہے کیونکہ دوبارہ تخلیق اول تخلیق کی طرح ہے (اس سے مشکل نہیں ہے) جو ابتدائی تخلیق پر قادر ہے وہ ثانوی تخلیق پر بھی قادر ہوگا گویا مطلب اس طرح ہوا کہ جس نے تخلیق اول کی وہی دوبارہ تخلیق بھی کرے گا۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ بیشک اللہ ہر چیز پر قابو رکھتا ہے، کیونکہ اس کی قدرت ذاتی کی نسبت تمام ممکنات کی طرف برابر ہے پس وہ دوسری تخلیق پر بھی ایسی ہی قدرت رکھتا ہے جیسی پہلی تخلیق پر۔

يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وہ جس کو چاہے عذاب دے اور جس پر رحم کرنا چاہے رحم کرے۔ یعنی آخرت میں دوزخ کا عذاب دے کر اور دنیا میں بے مدد چھوڑ کر یا دنیا کا حریص بنا کر یا بد اخلاق بنا کر یا اللہ کی طرف سے روگرداں بنا کر یا بدعات کا مرتکب بنا کر۔ یہ سب صورتیں عذاب کی ہیں۔ اسی کے مقابل اللہ جس پر رحم کرنا چاہے رحم

کرے آخرت میں جنت میں داخل فرما کر اور دنیا میں مدد دے کر اور قناعت عطا فرما کر اور خوش اخلاق بنا کر اور اللہ کی طرف متوجہ بنا کر اور اتباع سنت کی توفیق دے کر۔

وَإِلَيْهِ تُقْلَبُونَ ۝ اور تم سب اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ اور تم (اپنے رب کو) عاجز بنا دینے والے نہیں (کہ اس کی گرفت سے تم آزاد ہو سکو)

فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ زمین میں اور نہ آسمان میں یعنی تم بھاگ کر زمین میں چھپ جاؤ یا زمین کے غاروں میں گھس جاؤ تب بھی اللہ کے حکم سے نکل نہیں سکتے اسی طرح اگر (بالفرض) آسمان میں اور فلک بوس قلعوں میں پناہ گیر ہو جاؤ تب بھی قضاء خداوندی سے باہر نہیں ہو سکتے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وَلَا فِي السَّمَاءِ کا مطلب ہو وَلَا مَنْ فِي السَّمَاءِ یعنی اللہ کے ان ملائکہ کو بھی عاجز نہیں بنا سکتے جو آسمان میں ہیں، جیسے حضرت حسان کا شعر ہے۔

فَمَنْ يَهْجُوْ رَسُوْلَ اللّٰهِ مِنْكُمْ وَيَمْدَحُهُ وَيَنْصُرُهُ سَوَاءٌ

تم میں سے جو لوگ رسول اللہ ﷺ کی ہجو کریں اور وہ لوگ جو رسول اللہ ﷺ کی مدح اور مدد کریں دونوں فریق رسول اللہ ﷺ کے لئے برابر ہیں (یعنی آپ کو نہ کوئی ضرر پہنچا سکتا ہے نہ نفع کسی کی ہجاء سے آپ کا کوئی نقصان نہیں اور کسی کی تعریف سے آپ کو کوئی فائدہ نہیں)

وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللّٰهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ۝ اور اللہ کے علاوہ نہ کوئی تمہارا رفیق ہے نہ مددگار یعنی وہی زمین و آسمان کی مصیبتوں سے حفاظت کرتا ہے اس کے سوا نہ کوئی حفاظت کرنے والا ہے اور نہ بچانے والا۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللّٰهِ اور جنہوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا یعنی اللہ کی وحدانیت کے دلائل اور ان آیات کا انکار کیا جو اللہ نے اپنی کتابوں میں نازل فرمائی ہیں۔

وَلِقَائِهِ اور اللہ سے ملنے کا یعنی قیامت کا۔

أُولَٰئِكَ يَئِسُوا مِنْ رَحْمَتِي وہ (قیامت کے دن) میری رحمت سے ناامید ہوں گے یا رحمت سے مراد ہے جنت یعنی کافر دنیا میں ہی جنت سے ناامید ہیں کیونکہ قیامت کے ہی منکر ہیں۔

وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ اور انہی لوگوں کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔ اگر یہ حضرت ابراہیمؑ کے کلام کا حصہ ہے تو لفظ قَالَ اللّٰهُ محذوف ہوگا یعنی اللہ نے یہ فرمایا ہے کہ جنہوں نے کفر کیا اور اگر حضرت ابراہیمؑ کے کلام کا جز اس کو نہ قرار دیا جائے تو جملہ معترضہ ہوگا جو حضرت ابراہیمؑ کے کلام کے درمیان ذکر کر دیا گیا۔ اور اس کے بعد پھر حضرت ابراہیمؑ کے قصہ کی طرف رجوع کیا۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا اقْتُلُوهُ أَوْ حَرِّقُوهُ سو ان کی قوم کے پاس سوائے اس بات کے اور کوئی جواب نہیں تھا کہ اس کو مار ڈالو یا اس کو جلا دو۔

یعنی یہ بات ان میں سے بعض نے بعض سے کہی یا کسی ایک نے کہی اور چونکہ سب اس بات پر راضی تھے اس لئے سب کی طرف قول کی نسبت کر دی گئی۔

فَأَنْجَاهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ پھر اللہ نے ان کو آگ سے نجات دی۔ اس جملہ کا عطف محذوف کلام پر ہے پورا کلام اس طرح تھا قوم ابراہیم نے ابراہیمؑ کو جلا ڈالنے کے فیصلہ پر اتفاق کر لیا پھر ان کو آگ میں پھینک دیا پھر اللہ نے ان کو آگ میں جلنے نہ دیا بچا لیا کہ آگ کو سرد کر دیا اور باعث سلامتی بنا دیا۔

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝ اس (نجات دینے اور محفوظ رکھنے) میں (قدرت خدا اور حکومت خدا کی) بہت نشانیاں ہیں (لیکن) ان لوگوں کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں کیونکہ وہی ان آیات سے سبق حاصل کرتے

تیسرا۔ وَقَالَ إِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ أَوْثَانًا مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا

اور (ابراہیم نے اپنی قوم سے) کہا کہ تم نے خدا کو چھوڑ کر بتوں کو (معبود) آپس کے دنیوی تعلقات کی وجہ سے بنا رکھا ہے پھر قیامت کے دن تم میں ایک دوسرے کا مخالف ہو جائے گا اور ایک دوسرے پر لعنت کرے گا۔ یعنی باہم ایک دوسرے کا انکار اور ہر ایک دوسرے پر لعنت کرے گا یا بتوں کا انکار کریں گے اور ان پر لعنت بھیجیں گے۔

وَمَأْوٰكُمُ النَّارُ اور تم سب کا ٹھکانہ دوزخ ہو گا یعنی بت پرستوں کا بھی اور بتوں کا بھی۔

وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۵﴾ اور تمہارا کوئی حامی نہ ہو گا کہ تم کو دوزخ سے رہائی دلا سکے۔

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ إِنِّيْ مُهَاجِرٌ إِلٰى رَبِّيْ ۖ پس لوط نے ابراہیم کی تصدیق کی اور ابراہیم نے کہا میں اپنے رب (کی بتائی ہوئی جگہ) کی طرف (وطن) چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔

حضرت لوط تکذیب انبیاء سے (فطری طور پر من جانب اللہ) معصوم تھے۔ آپ حضرت ابراہیم کے بھائی ہاران کے بیٹے تھے۔

اِنِّیْ مُہَاجِرٌ یعنی اللہ نے مجھے جہاں چلے جانے کا حکم دیا ہے وہاں چلا جاؤں گا یا جہاں میرے لئے اپنے رب کی عبادت کی سہولت ہو گی وہاں چلا جاؤں گا۔ یا یہ مطلب ہے کہ میں اپنی قوم سے منہ پھیر لوں گا ان سے کوئی (دینی) تعلق نہیں رکھوں گا اور اپنا رخ اپنے رب کی طرف کر لوں گا۔ (سب سے کٹ کر اللہ سے جڑ جاؤں گا یا ہمہ بے ہمہ) صوفیہ کی اصطلاح میں اسی کو وطن میں سفر کہتے ہیں۔ اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم نے کوثیٰ علاقہ کوفہ سے حران کی طرف ہجرت کی پھر حران سے شام کو چلے گئے۔ حضرت لوط اور آپ کی بیوی حضرت سارہ دونوں آپ کے ساتھ تھے حضرت ابراہیم ہی سب سے پہلے شخص تھے جنہوں نے راہ خدا میں ترک وطن کیا پھر حضرت ابراہیم نے فلسطین میں اور حضرت لوط نے سدوم میں قیام اختیار کیا۔ مفسرین نے کہا ہے کہ ہجرت کے وقت حضرت ابراہیم کی عمر پچھتر سال تھی۔[1]

إِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۶﴾ بلاشبہ وہی غالب ہے (جو دشمنوں سے میری حفاظت کرتا ہے) اور وہی مصلحت والا ہے (جو مجھے اسی کام کی توفیق دیتا ہے جس میں میری بہتری ہوتی ہے)

وَوَهَبْنَا لَهٗ إِسْحٰقَ اور ہم نے ابراہیم کو (ایک بیٹا) اسحاق عطا کیا یعنی اسماعیل کے بعد جب کہ ابراہیم اپنے بڑھاپے اور اپنی بیوی کی پیری اور بانجھ ہونے کی وجہ سے اولاد سے ناامید ہو گئے اس وقت اسحاق نام کا بیٹا ہم نے ان کو عنایت کیا۔

وَيَعْقُوْبَ اور یعقوب بھی یعنی پوتا یعقوب مزید عنایت کیا۔

وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ وَاٰتَيْنٰهُ أَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا ۖ وَإِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۲۷﴾ اور ہم نے ابراہیم کی نسل میں نبوت اور کتاب (کے سلسلہ) کو قائم کیا اور ہم نے ان کو ان کا صلہ دنیا میں بھی دیا اور وہ آخرت میں بھی (کامل) نیک بندوں میں شامل ہوں گے۔

الْكِتٰبَ سے مراد ہیں توریت، انجیل، زبور اور قرآن۔

أَجْرَهٗ یعنی ترک وطن کرنے اور ہجرت کرنے کا دنیوی بدلہ۔

[1] حضرت اسماء بنت حضرت ابوبکر صدیقؓ راوی ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے حبشہ کی جانب ہجرت کی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ابراہیم و لوط کے بعد عثمانؓ سب سے پہلے مہاجر ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا حضرت عثمانؓ نے رسول اللہ ﷺ کی طرف سب سے پہلے ہجرت کی جیسے حضرت لوط نے حضرت ابراہیم کی طرف سب سے اول ہجرت کی۔ حضرت زیدؓ بن ثابت کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عثمانؓ اور رقیہ سے پہلے لوط کے بعد اور کوئی مہاجر نہیں ہوا۔ (از مفسر رحمۃ اللہ)

فِي الدُّنْيَا دنیوی اجر بڑھاپے میں جب کہ اولاد ہونے کا زمانہ گزر چکا تھا اولاد دی اور پاکیزہ نسل عطا فرمائی۔ سدی نے یہی تفسیر کی ہے۔ دوسرے اہل تفسیر نے کہا دنیوی اجر سے مراد ہے حضرت ابراہیمؑ کی نسل میں مسلسل نبوت کا ہونا۔ تمام مذاہب (یہودیوں عیسائیوں اور مسلمانوں) کا آپ کی طرف انتساب کہ ہر مذہب والے اپنے مذہب کو دین ابراہیمی قرار دیتے ہیں) حضرت ابراہیمؑ پر ہمیشہ قیامت تک درود و سلام بھیجا جانا۔

میں کہتا ہوں شاید اجر دنیوی سے یہ مراد ہو کہ جس طرح دنیا والے حسی چیزوں سے لذت اندوز ہوتے ہیں اس سے زائد حضرت ابراہیمؑ کو ذکر فکر اور عبادت میں لذت حاصل ہوتی تھی یہی ان کا دنیا میں اجر تھا۔

اللہ نے فرمایا ہے لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ

اَلصّٰلِحِيْنَ سے مراد ہیں کامل اہل صلاح یعنی آخرت میں حضرت ابراہیمؑ کا شمول کامل اہل صلاح میں ہوگا۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ ۡ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۞

اور ہم نے لوطؑ کو پیغمبر بنا کر بھیجا جبکہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ تم ایسی بے حیائی کا کام کرتے ہو جو تم سے پہلے کسی نے دنیا جہان والوں میں نہیں کیا۔

اَلْفَاحِشَةَ حد سے بڑھی ہوئی حرکت۔

اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ۙ کیا تم مردوں سے بدکاری کرتے ہو اور رہزنی کرتے ہو۔

مسافروں کا راستہ کاٹنے کی وجہ یہ تھی کہ آتے جاتے مسافروں کو راستے سے پکڑ کر وہ لے جاتے تھے اور ان سے بد فعلی کرتے تھے اسی وجہ سے لوگوں نے ان کی طرف سے نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ بعض لوگوں نے کہا قطع راہ سے مراد ہے عورتوں کا راستہ کاٹ دینا۔ وہ عورتوں پر مردوں کو ترجیح دیتے تھے اس وجہ سے عورت کا مرد سے راستہ کٹ گیا تھا۔

وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ ؕ اور اپنی مجلسوں میں بری حرکتیں کرتے ہو۔ نادی اس مجلس کو کہتے ہیں جس میں اہل مجلس موجود ہوں۔

بغوی نے بروایت ابوصالحؒ حضرت ام ہانیؓ کا قول نقل کیا ہے حضرت ام ہانیؓ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ سے آیت وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ کے متعلق دریافت کیا اور عرض کیا وہ بری بات کون سی تھی جو قوم لوط والے اپنی مجلسوں میں کرتے تھے فرمایا وہ لوگ (اپنی مجلسوں میں سر راہ بیٹھ کر) آنے جانے والوں کے غلے مارتے اور ان کا مذاق بناتے تھے۔ رواہ احمد والترمذی۔

بغوی نے لکھا ہے روایت میں آیا ہے کہ قوم لوط والے اپنی مجلسوں میں بیٹھے ہوتے ہر شخص کے پاس ایک پیالہ میں کچھ چھریاں ہوتی تھیں کوئی مسافر ادھر سے گزرتا تو وہ آپس میں کہتے تھے (اپنے شکار کو) لو چنانچہ ہر شخص مسافر کو نشانہ بنا کر کنکری مارتا تھا جس کی کنکری مسافر کے لگ جاتی وہی مسافر کا مستحق قرار پاتا تھا اول اس کا سب سامان چھین لیتا پھر اس کے ساتھ بد فعلی کرتا تھا۔ اور تین درہم اس کو دے کر چلتا کر دیتا تھا ان کا سرپنچ تین درہم دینے کا فیصلہ کرتا تھا۔

قاسم بن محمد نے کہا وہ مجلسوں میں بیٹھ کر آواز کے ساتھ ریاح خارج کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن سلام نے فرمایا ایک دوسرے پر تھوکتا تھا۔ مکحول نے کہا قوم لوط کی بری حرکتوں میں سے یہ باتیں تھیں کہ وہ علک چباتے، مہندی سے انگلیاں رنگتے، لنگیاں کھول دیتے، سیٹیاں بجاتے، کنکریاں مارتے اور بد فعلیاں کرتے تھے۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۞

لوطؑ کی بات کا قوم والوں کے پاس سوائے اس کے کوئی جواب نہ تھا کہ (بطور استہزاء) انہوں نے کہا کہ اگر تو سچا ہے تو اللہ کا عذاب ہم پر لے آ یعنی اگر اپنی عذاب کی دھمکی میں سچا ہے یا ہمارے ان افعال کو برا کہنے میں سچا ہے یا نبوت

کے دعوی میں سچا ہے تو ہم پر اللہ کا عذاب لے آ۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِي عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِينَ ۝ لوط نے کہا اے میرے رب (عذاب نازل فرما کر) ان تباہ کار لوگوں پر مجھے فتح عنایت کر۔ ۱۵

الْمُفْسِدِينَ یعنی یہ مفسد لوگ ہیں انہوں نے لواطت کی ایجاد کی اور آئندہ لوگوں کے لئے اس کی بنیاد ڈال دی الْمُفْسِدِينَ کا لفظ ذکر کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ یہ لوگ عذاب کے مستحق ہیں ان پر فوری عذاب نازل ہونا ضروری ہے۔ الْمُفْسِدِينَ کہنے سے نزول عذاب کی درخواست میں قوت پیدا ہو گئی۔

وَلَمَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا إِبْرَاهِيمَ بِالْبُشْرَىٰ اور جب ہمارے فرستادے (ملائکہ) ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کر آئے یعنی اسحاق اور اسحاق کے بعد یعقوب کی پیدائش کی بشارت لے کر پہنچے۔

قَالُوا إِنَّا مُهْلِكُو أَهْلِ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ تو انہوں نے (ابراہیم سے) کہا کہ ہم اس بستی والوں کو ضرور ہلاک کرنے والے ہیں یعنی سدوم کی بستی کو ضرور تباہ کریں گے، کیونکہ)

إِنَّ أَهْلَهَا كَانُوا ظَالِمِينَ ۝ اس کے باشندے بلاشبہ ظالم ہیں یعنی کفر و معاصی پر اڑے ہوئے ہیں ایک طویل مدت سے کفر اور بیجا حرکتوں پر جمے ہوئے ہیں۔

قَالَ إِنَّ فِيهَا لُوطًا ابراہیم نے کہا اس میں تو لوط بھی ہیں یعنی ایسے لوگ بھی وہاں موجود ہیں جو ظالم نہیں ہیں۔ یہ ملائکہ کے قول پر حضرت ابراہیم نے اعتراض کیا یا یہ بطور معارضہ فرمایا (کہ کافروں اور بدکاروں کا وہاں ہونا ضرور موجب عذاب ہے لیکن) ان کا پیغمبر لوط وہاں موجود ہے جس کی موجودگی مانع عذاب ہے۔

قَالُوا نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَنْ فِيهَا فرشتوں نے کہا جو لوگ اس بستی کے اندر ہیں ہم ان کو (آپ سے) زیادہ جانتے ہیں۔

لَنُنَجِّيَنَّهُ وَأَهْلَهُ ہم ان کو اور ان کے گھر والوں کو ضرور بچا لیں گے۔ ملائکہ کی طرف سے یہ قول حضرت ابراہیم کے اعتراض کو تسلیم کرنے پر دلالت کر رہا ہے لیکن اسی کے ساتھ حضرت ابراہیم کے علم سے زیادہ علم کا اظہار بھی ہے (کہ آپ نہیں جانتے کہ ہم ان کو بچا لیں گے) اور ابراہیم کی بات کا پورا جواب بھی اس سے ہو گیا کہ (آپ فکر نہ کریں) ہم لوط اور لوط کے گھر والوں کے علاوہ دوسرے لوگوں کو غارت کریں گے۔ یا یوں کہا جائے کہ بستی والوں کی تباہی کا وقت مقرر کر دیا کہ جب لوط اور ان کے ساتھیوں کو ہم وہاں سے نکال لیں گے اس وقت بستی کو غارت کریں گے۔ (فرشتوں نے پہلے کہا تھا کہ ہم اس بستی کے باشندوں کو ہلاک کر دیں گے اس قول میں حضرت لوط کا استثناء نہیں کیا تھا لیکن جب حضرت ابراہیم نے فرمایا وہاں تو لوط بھی ہیں تو فرشتوں نے کہا ہم ان کو اور ان کے گھر والوں کو بچا لیں گے۔ یہ استثناء یا تخصیص اول کلام سے بعد کو کی) یہ وقت خطاب سے تاخیر بیان ہے جو جائز نہیں ہے ہاں وقت حاجت سے بیان کو موخر کرنا جائز نہیں ہے۔

إِلَّا امْرَأَتَهُ كَانَتْ مِنَ الْغَابِرِينَ ۝ مگر لوط کی بیوی کو (ضرور ہلاک کریں گے) کیونکہ وہ (اللہ کے علم میں ہے کہ) پیچھے رہ جانے والوں میں شامل ہو گی یعنی عذاب میں یا بستی میں رہ جائے گی۔ كَانَتْ مِنَ الْغَابِرِينَ استثناء کی علت ہے۔

وَلَمَّا أَنْ جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سِيءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا اور جب ہمارے قاصد (ملائکہ) لوط کے پاس پہنچے تو لوط کو ان کی وجہ سے دکھ (یعنی غم و فکر) ہوا۔

ذَرْعًا طاقت طویل الذراع، بہت قوی لمبے ہاتھوں والا ہاتھ بڑھا کر وہ چیز لے لیتا ہے جو کوتاہ دست نہیں لے پاتا مطلب یہ کہ ملائکہ کی حفاظت کیسے کریں اس کی تدبیر کیا ہو اس سے لوط کی طاقت عاجز تھی۔

وَقَالُوا لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ إِنَّا مُنَجُّوكَ وَأَهْلَكَ إِلَّا امْرَأَتَكَ كَانَتْ مِنَ الْغَابِرِينَ ۝

اور ملائکہ نے کہا تم نہ کچھ خوف کرو نہ غم کرو ہم تم کو اور تمہارے ساتھیوں کو ضرور بچالیں گے سوائے تمہاری بیوی کے کیونکہ وہ (اللہ کے علم میں ہے کہ) پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہوگی اور انہی کے ساتھ ہلاک کردی جائے گی) یعنی اس بات کا کوئی اندیشہ اور غم نہ کرو کہ وہ لوگ ہم پر قابو پا سکیں گے یا یہ مطلب ہے کہ تم اس کا اندیشہ نہ کرو کہ وہ ہم پر قابو پا سکیں گے اور اس بات کا غم نہ کرو کہ ہم ان کو غارت کردیں گے۔

إِنَّا مُنزِلُونَ عَلَىٰ أَهْلِ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ۝

ہم اس بستی والوں پر اوپر سے ایک عذاب ان کی بدکاریوں کی وجہ سے نازل کریں گے۔

بقول مقاتل رِجْزٌ سے مراد ہے زمین میں دھنسانے (یعنی زمین الٹ دینے) اور اوپر سے پتھر برسانے کا عذاب۔

رِجْز کا معنی ہے بے چینی اضطراب اِرْتَجَزَ وہ بے قرار اور بے چین ہوگیا۔ عذاب بھی موجب اضطراب ہوتا ہے اس لئے عذاب کو رجز فرمایا۔

وَلَقَد تَّرَكْنَا مِنْهَا آيَةً بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝ اور ہم نے ان کے (یعنی قوم لوط کی بستیوں کے) کھلے ہوئے نشانات ان لوگوں کے (عبرت اندوز ہونے کے) لئے چھوڑ دیئے جو سمجھیں یعنی ان لوگوں کے لئے نشانات چھوڑ دیئے جو آیات قدرت پر غور کرتے ہیں اور ان سے عبرت اندوز ہوتے ہیں)

حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک اٰیَۃً بَیِّنَۃً سے مراد ہیں قوم لوط کی بستیوں کے ویران کھنڈر قتادہ نے کہا اس سے مراد وہ پتھر ہیں جو ان پر برسائے گئے تھے اللہ نے وہ پتھر باقی رکھے اس امت کے ابتدائی دور تک وہ پتھر موجود تھے اور اگلے لوگوں نے ان کو دیکھا تھا۔

مجاہد نے کہا زمین کے اندر سے سیاہ پانی برآمد کرنا اٰیَۃً بَیِّنَۃً سے مراد ہے۔ بعض نے کہا ان کے قصہ کی شہرت مراد ہے یعنی ہم نے قوم لوط کی تباہی کے قصہ کو ایک نشانی کر کے چھوڑ دیا۔

وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا فَقَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَارْجُوا الْيَوْمَ الْآخِرَ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۝ اور مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیبؑ کو (پیغمبر بنا کر) بھیجا شعیبؑ نے کہا اے میری قوم والو اللہ کی عبادت کرو اور روز آخرت سے ڈرو اور ملک میں تباہی کی غرض سے بگاڑ نہ پیدا کرو۔

بعض اہل علم نے کہا اس جگہ رجاء سے مراد ہے خوف یعنی روز آخرت کے عذاب سے ڈرو یا رجاء کا معنی اس جگہ بھی امید ہی ہے اس صورت میں مطلب اس طرح ہوگا کہ (ایسے کام کرو جن سے روز آخرت کے ثواب کے تم امیدوار ہوسکو سبب کو مسبب کے قائم مقام ذکر کردیا۔

تَعْثَوْا کا معنی بھی لَا تُفْسِدُوْا ہے پھر مُفْسِدِیْنَ کا لفظ اس غرض سے ذکر کیا گیا کہ کبھی تخریب اصلاح کی غرض سے ہوتی ہے جیسے کافروں سے جنگ کرنے کی صورت میں ان کو قتل کرنا، زخمی کرنا، آبادیوں کو اجاڑنا اور درختوں کو کاٹ ڈالنا اور کبھی بگاڑ برائے بگاڑ ہوتا ہے (اصلاح مقصود نہیں ہوتی) پس مطلب یہ ہے کہ محض فساد کی نیت سے تم ملک میں تباہی نہ پھیلاؤ۔

فَكَذَّبُوهُ فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جَاثِمِينَ ۝ پھر قوم نے شعیبؑ (کی نبوت) کی تکذیب کی آخر ان کو ایک سخت زلزلے نے پکڑ لیا اور وہ اپنے اپنے گھر میں زانو کے بل بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے (سب مر کر رہ گئے)

رَجْفَۃٌ سخت بھونچال۔ بعض نے کہا جبرئیل کی چیخ مراد ہے جس سے دل لرز گئے تھے۔

جٰثِمِیْنَ گھٹنوں کے بل بیٹھے ہوئے۔ دار سے مراد یا تو شہر ہے یا دار سے مراد ہیں بہت سے مکان یہ شبہ تو ہو سکتا ہی نہیں کہ سب ایک مکان میں ہوں اس لئے جمع کی بجائے واحد کا صیغہ استعمال کیا۔

وَعَادًا وَثَمُودَ وَقَد تَّبَيَّنَ لَكُم مِّن مَّسَاكِنِهِمْ ۖ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ

وَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ اور ہم نے عاد و ثمود کو بھی ہلاک کیا اور یہ امر تمہارے لئے ان کے مقامات سکونت (دیکھنے سے) واضح ہو رہا ہے اور شیطان نے ان کے اعمال کو ان کی نظر میں آراستہ کر دیا تھا اور ان کو راہ (حق) سے روک دیا تھا۔

وَعَادًا وَّثَمُودَا اس جگہ فعل محذوف ہے یعنی ہم نے عاد و ثمود کو ہلاک کیا۔

وَقَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ اور اے مکہ والو تمہاری نظروں کے سامنے ہیں واضح ہیں۔

مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ ان کے کچھ مقامات سکونت یا یہ مطلب ہے کہ جب ان کے ویران مقامات کی طرف جاتے ہو اور ادھر سے گزرتے ہو تو ان کے کھنڈروں سے تم پر ان کا تباہ ہو جانا واضح ہو جاتا ہے۔

اَعْمَالَهُمْ یعنی کفر اور گناہ

عَنِ السَّبِيلِ یعنی پیغمبروں کے بتائے ہوئے جنت کے راستہ سے شیطان نے ان کو روک دیا۔

وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ ﴿۳۸﴾ اور (ویسے دنیوی امور میں) وہ ہوشیار تھے۔ مقاتل، قتادہ اور کلبی نے اس جملہ کی تشریح میں کہا وہ لوگ اپنے مذہب کو اور حق سے گمراہ ہونے کو پسند کرتے تھے اور اپنے آپ کو راہ راست پر خیال کرتے تھے اسی تشریح کی بناء پر آیت کا معنی یہ ہو گا کہ وہ اپنی نظر میں (اپنے دین کے معاملہ میں) بڑے ہوشیار تھے۔ فراء نے مستبصر ہونے کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ وہ لوگ اہل دانش و ہوش تھے، بصیرت مند تھے، غور و نظر کر سکتے تھے لیکن انہوں نے غور و فکر سے کام نہیں لیا یہ مطلب بھی بیان کیا گیا ہے کہ ان پر واضح کر دیا گیا تھا کہ ان پر عذاب ضرور آئے گا۔ پیغمبروں کے اقوال سے ان پر ظاہر ہو چکا تھا کہ (اگر وہ تائب نہ ہوئے تو) عذاب میں مبتلا ہوں گے لیکن وہ اپنے افکار و اطوار پر جمے رہے اور نتیجہ میں تباہ کر دیئے گئے۔

وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ ۣ اور ہم نے قارون اور فرعون اور ہامان کو ہلاک کر دیا۔ قارون نسبی لحاظ سے فرعون و ہامان سے شریف تھا اس لئے قارون کا لفظ فرعون و ہامان سے پہلے ذکر کیا گیا اس سے اشارہ نکلتا ہے اس امر کی طرف کہ اعلیٰ نسب والے سے کفر و معصیت کا صدور بہت ہی برا ہے۔

وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ ﴿۳۹﴾ فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ

اور موسیٰ ان کے پاس کھلے ہوئے معجزات لے کر گئے (لیکن) اس سرزمین میں وہ لوگ مغرور ہو گئے (مگر) ہماری گرفت سے آگے نہ نکل سکے ہم نے ہر ایک کو اس کے جرم کی وجہ سے دھر پکڑا۔

یعنی ہماری گرفت سے چھوٹ نہ سکے بلکہ اللہ کے حکم عذاب نے ان کو آلیا۔

سٰبِقِيْنَ بمعنی فَآئِتِيْنَ۔ سَبَقَ طَالِبَهٗ وہ اپنے طالب (یعنی پکڑنے والے) سے آگے نکل گیا (یعنی چھوٹ گیا ہاتھ نہ آیا)

اَخَذْنَا ہم نے پکڑ لیا یعنی سزا دی۔

فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ پس ان کافروں میں سے کچھ تو وہ تھے جن پر ہم نے پتھریاں برسانے والی ہوا بھیج دی یعنی قوم لوط۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ اور کچھ وہ تھے جن کو ایک چیخ نے دھر پکڑا یعنی قوم ثمود و مدین۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ اور کچھ وہ تھے جن کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا یعنی قارون۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ اور کچھ وہ تھے جن کو ہم نے غرق کر دیا یعنی قوم نوح اور فرعون اور فرعون کی قوم۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ اور اللہ ایسا تو نہیں تھا کہ ان پر ظلم کرتا یعنی ظالموں کی طرح ان سے برتاؤ کرتا اور بلا جرم ان کو سزا دیتا یہ اس کی عادت نہیں۔

وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ لیکن وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے یعنی عذاب پانے کے درپے تھے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ۭ جن لوگوں نے اللہ کے سوا دوسروں کو کارساز بنا رکھا ہے۔ ان کی حالت ایسی ہے جیسے کسی مکڑی نے کوئی جالا بنایا ہو یعنی جو کافر بتوں پر بھروسہ رکھتے ہیں اور انہوں نے بتوں کو اپنا محل اعتماد قرار دے رکھا ہے ان کی مثال کمزوری اور ضعف کے لحاظ سے ایسی ہے جیسے کسی مکڑی نے اپنا جالا بنالیا ہو۔ بلکہ مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ ان کا محل اعتماد کمزور ہے مکڑی کا جالا پھر بھی کوئی حقیقت رکھتا ہے اور اس کا کچھ فائدہ مکڑی کو پہنچتا ہے۔ بت پرستوں کی حالت اس سے بھی گئی گزری ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بت پرستوں کے مذہب کی مثال مکڑی کے جالے کی طرح ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ جن کافروں نے اللہ کے سوا دوسروں کو کارساز سمجھ رکھا ہے اہل توحید کے مقابلے میں ان کی حالت ایسی ہے جیسے اس مکڑی کی جس نے اپنا گھر کسی آدمی کے گھر کے مقابلے میں بنایا ہو۔

لفظ عَنْكَبُوْت کا اطلاق واحد پر بھی ہوتا ہے اور جمع پر بھی مذکر پر بھی اور مونث پر بھی۔ اس کی جمع عناکیب، عکاب اور اعکب ہے۔ عَنْكَبُوْت کی ت طاغوت کی ت کی طرح ہے۔[1]

وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ اور سب سے زیادہ کمزور گھر بلاشبہ مکڑی کا ہوتا ہے۔ یعنی مکڑی کے گھر سے زیادہ کمزور گھر اور کوئی نہیں ہوتا نہ سردی سے بچاتا ہے نہ گرمی سے۔

لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ اگر وہ جانتے یعنی اگر وہ علم کی طرف رجوع کرتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ یہ ہی ان کی مثال ہے اور ان کا مذہب اس سے بھی زیادہ کمزور ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ۭ (آپ کافروں سے کہہ دیجئے کہ) وہ جس چیز کو اللہ کے سوا پکارتے ہیں (یعنی پوجتے ہیں) اللہ کو اس کا علم ہے۔ (اس ترجمہ پر مَا يَدْعُوْنَ میں لفظ مَا موصولہ ہوگا) مَا کو استفہامیہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے یعنی اللہ کے سوا وہ کس چیز کو پوجتے ہیں اللہ واقف ہے۔ یا مَا مصدریہ ہے یعنی اللہ ان کی عبادت غیر اللہ کو جانتا ہے۔ یا مَا نافیہ ہے یعنی اللہ واقف ہے کہ وہ کسی چیز کو اللہ کے سوا نہیں پکارتے۔ اس صورت میں کفار کی عبادت کو جو مذکورہ بالا عبادت میں خانہ عنکبوت سے تشبیہ دی اس کی تاکید اس جملہ سے ہو جائے گی اور کلام میں کافروں کی جہالت کا اظہار ہوگا۔

وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ اور وہی غالب اور حکمت والا ہے یہ سابق کلام کی علت ہے۔ ایک غالب حکیم ہستی کے ساتھ ایسی چیز کو عبادت میں شریک کرنا جو بالکل ہیچ اور بے مقدار ہیں انتہائی حماقت ہے۔ اللہ قادر مطلق ہے ہر چیز پر اس کو قدرت تامہ حاصل ہے، عالم کل بھی ہے، اس کے مقابلہ میں بے جان جماد کوئی ہستی نہیں رکھتا بالکل معدوم کی طرح ہے ایسا محیط کل علم رکھنے والا قادر مطلق یقیناً منکروں کو سزا دینے پر قدرت رکھتا ہے۔

وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ۝ اور ہم لوگوں (کی ہدایت اور ان کو سمجھانے) کے لئے یہ مثالیں بیان کرتے ہیں اور صرف اہل علم ہی ان کو سمجھتے ہیں۔ جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں اور اشیاء کی حقائق و کیفیات کو جانتے ہیں۔

بغوی نے عطا اور ابو الزبیر کی روایت بیان کی کہ حضرت جابرؓ نے آیت وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ تلاوت کی اور فرمایا عالم وہ ہے جس کو اللہ کی طرف سے سمجھ ملی ہو اور سمجھنے کے بعد وہ اللہ کی اطاعت

---

[1] حضرت علیؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں اور ابو بکرؓ غار میں داخل ہوئے تو مکڑیوں نے جمع ہو کر فوراً وہاں جالا تن دیا اس لئے تم ان کو قتل نہ کیا کرو۔

کرے اور اس کی نافرمانی سے پرہیز رکھے۔ ثعلبی اور واحدی کی روایت بھی اسی طرح ہے ابوداؤد بن محبر نے کتاب العقل میں حارث بن اسامہ کے طریق سے بھی اس روایت کو بیان کیا۔ ابن جوزی نے اس کا ذکر موضوعات میں کیا ہے۔

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ اس نے آسمان و زمین کو برحق (یعنی ٹھیک) پیدا کیا۔ اس کائنات کی تخلیق کی اصل غرض ہے افادۂ خیر اور اپنی ذات و صفات کا اظہار۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۟ اس تخلیق میں اہل ایمان کے لئے نشانی ہے اللہ کی ہستی اور
ع ۱۴ توحید کی اس کے ہمہ گیر علم محیط کل قدرت اور ارادہ کی اور تمام عیوب و نقائص سے پاک ہونے کی۔ اور چونکہ اہل ایمان ہی اس سے فائدہ اندوز (اور ہدایت یاب) ہوتے ہیں اس لئے انہی کے لئے یہ تخلیق رہنما ہے۔

(بیسواں پارہ ختم)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اُتْلُ مَا اُوْحِیَ

اکیسواں پارہ شروع

اُتْلُ مَا اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ جو کتاب آپ کے پاس وحی کے ذریعہ سے بھیجی گئی ہے اس کو پڑھیے۔

تاکہ اللہ کا قرب حاصل ہو، نصیحت پذیری کا تحفظ ہو، احکام کی نگہداشت ہو، اس کی مثالوں سے عبرت حاصل ہو، معانی قرآن کا انکشاف ہو، کیونکہ بار بار غور کر کے پڑھنے سے ان معانی کا انکشاف ہوتا ہے جن کا انکشاف پہلی مرتبہ تلاوت کرنے سے نہیں ہوتا اس پیہم تلاوت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پڑھنے والا معانی قرآن کو سمجھ کر قرآن کے اوامر و نواہی کا پابند ہو جاتا ہے۔

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اور (فرض) نماز قائم کرو۔

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ (کیونکہ) نماز بلاشبہ بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے۔

اَلْفَحْشَآءُ وہ بری بات جس کی برائی شرعاً اور عقلاً کھلی ہوئی ہو۔ نماز اللہ کی یاد دلاتی ہے اور نفس کے اندر خشیت (خوف عذاب) پیدا کرتی ہے اس لئے گناہوں سے روکتی ہے۔

بغوی نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ایک انصاری جوان رسول اللہ ﷺ کے ساتھ پانچوں نمازیں پڑھتا تھا لیکن اس کے باوجود کوئی کھلا ہوا گناہ ایسا نہ تھا جس کا وہ ارتکاب نہ کرتا ہو، اس کی یہ حالت رسول اللہ ﷺ سے عرض کی گئی، حضور ﷺ نے فرمایا کسی دن اس کی نماز اس کو (ان گناہوں سے) روک دے گی چنانچہ کچھ ہی مدت کے بعد اس نے توبہ کر لی اور اس کی حالت ٹھیک ہو گئی۔

اسحاق نے مسند میں اور بزار و ابو یعلی نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا فلاں شخص رات کو نماز (یعنی تہجد) پڑھتا ہے پھر صبح کو چوری کرتا ہے۔ فرمایا اس کی نماز اس کو روک دے گی۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا نماز میں گناہوں سے باز داشت اور روکنے کی طاقت ہے اس لئے جس کی نماز اس کو بھلائی کا حکم نہ دے اور بری باتوں سے نہ روکے اس کی نماز اللہ سے دوری ہی پیدا کرتی ہے۔

حسن اور قتادہ نے کہا جس کو نماز فحشاء اور منکر سے نہ روکے اس کی نماز اس کے لئے وبال ہو گی۔

بعض اہل علم کے نزدیک صلوۃ سے مراد قرآن ہے جیسے وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ میں صلوۃ سے مراد ہے نماز میں قرآن پڑھنا اور اس میں شک نہیں کہ قرآن ہر فحشاء اور منکر سے روکتا ہے۔

بغوی نے حضرت جابرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں گزارش کی کہ ایک

آدمی رات میں قرآن پڑھتا ہے اور صبح کو چوری کرتا ہے۔ فرمایا عنقریب اس کا قرآن کو پڑھنا اس کو روک دے گا۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ عرض کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ فلاں شخص دن میں نماز پڑھتا ہے اور رات کو چوری کرتا ہے۔ فرمایا عنقریب نماز اس کو روک دے گی۔

وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۔ اور بے شک اللہ کا ذکر بہت بڑا ہے۔

ابن عطاء نے کہا یعنی ہر گناہ سے بڑا ہے کسی گناہ کو باقی چھوڑنے والا نہیں ہے۔ ذکر اللہ سے مراد ہے وہ نماز جو فحشاء اور منکر سے روکتی ہے۔ بجائے صلوٰۃ کے لفظ ذکر لانے سے اس طرف اشارہ ہے کہ نماز چونکہ ذکر خدا پر مشتمل ہوتی ہے اسی وجہ سے نیکیوں تک پہنچاتی ہے اور گناہوں سے روکتی ہے۔

فضائل ذکر

ذکر کی فضیلت میں بہت احادیث آئی ہیں جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں۔

حضرت ابو درداءؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تم کو ایسا عمل نہ بتاؤں جو تمہارے مالک کے نزدیک سارے اعمال سے بہتر اور پاکیزہ اور ہر عمل سے زیادہ اونچے درجہ پر پہنچنے والا، سونے چاندی کو راہ خدا میں خرچ کرنے سے تمہارے لئے بہتر اور (اس جہاد سے بھی) تمہارے لئے افضل ہے۔ جس میں دشمن کے مقابلہ میں تم دشمنوں کی گردنیں مارو اور وہ تمہاری گردنیں ماریں۔ صحابہؓ نے عرض کیا۔ کیوں نہیں (ضرور فرمائیے) فرمایا اللہ کا ذکر۔ امام مالک کے نزدیک یہ حدیث موقوف ہے (یعنی حضرت ابو درداءؓ نے اس کو مرفوعاً ذکر نہیں کیا)

حضرت ابو سعید خدری راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کون سا بندہ سب سے افضل اور اللہ کے نزدیک اعلیٰ مرتبہ والا ہے فرمایا اللہ کی بکثرت یاد کرنے والے اور یاد کرنے والیاں۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ کیا مجاہد فی سبیل اللہ سے بھی افضل ہیں، فرمایا اگر مجاہد اپنی تلوار سے کافروں کو اتنا مارے کہ تلوار ٹوٹ جائے اور خون سے رنگین ہو جائے تب بھی اللہ کی بکثرت یاد کرنے والے اس سے افضل درجہ والے ہیں۔ رواہ احمد والترمذی۔ ترمذی نے کہا یہ حدیث غریب ہے۔

حضرت عبد اللہ بن بسری راوی ہیں کہ ایک اعرابی نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا (یا رسول اللہ) کونسا آدمی سب سے بہتر ہے۔ فرمایا خوشی ہو اس کے لئے جس کی عمر طویل اور اعمال اچھے ہوں۔ اس شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ کون سا عمل سب سے افضل ہے فرمایا (سب سے افضل یہ ہے) کہ تم دنیا سے ایسی حالت میں جاؤ کہ تمہاری زبان اللہ کے ذکر سے تروتازہ ہو رہی ہو۔ رواہ احمد والترمذی۔

حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ مکہ کے ایک راستہ پر جا رہے تھے ایک پہاڑ کی طرف سے گزرے اس پہاڑ کا نام جمدان تھا فرمایا چلے چلو یہ جمدان ہے۔ اہل تفرید آگے بڑھ گئے، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ اہل تفرید سے کیا مراد ہے فرمایا اللہ کا بکثرت ذکر کرنے والے اور ذکر کرنے والیاں۔ رواہ مسلم۔

حضرت ابو موسیٰ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اپنے رب کا ذکر کرتا ہے اور جو ذکر رب نہیں کرتا اس کی مثال زندہ اور مردہ کی ہے۔ متفق علیہ۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اللہ کے کچھ فرشتے اہل ذکر کی تلاش میں راستوں میں گھومتے رہتے ہیں جب وہ کسی جماعت کو اللہ کا ذکر کرتے پاتے ہیں تو ایک دوسرے کو پکار کر کہتا ہے آؤ تمہارا مقصد یہ ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا۔ پھر آسمان تک ملائکہ ان لوگوں پر چھا جاتے ہیں اللہ ان ملائکہ سے دریافت فرماتا ہے (باوجودیکہ وہ خود ہی خوب واقف ہے) میرے بندے کیا کہہ رہے تھے۔ فرشتے عرض کرتے ہیں تیری پاکی بیان کر رہے تھے، تیری بڑائی بیان کر

رہے تھے تیری ثناء کر رہے تھے اور تیری بزرگی کا اظہار کر رہے تھے (یعنی الحمد للہ، اللہ اکبر، سبحان اللہ اور المجد للہ کہہ رہے تھے) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کیا انہوں نے مجھے دیکھا ہے۔ ملائکہ کہتے ہیں نہیں خدا کی قسم انہوں نے تجھے نہیں دیکھا۔ اللہ فرماتا ہے اگر وہ مجھے دیکھ لیتے تو ان کی کیا کیفیت ہوتی۔ ملائکہ عرض کرتے ہیں اگر وہ تجھے دیکھ لیتے تو تیری عبادت کرتے اور تیری بزرگی بیان کرتے ہیں اور زیادہ سرگرم ہو جاتے اور تیری پاکی اور زیادہ بیان کرتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وہ کیا مانگتے ہیں۔ فرشتے عرض کرتے ہیں وہ تجھ سے جنت مانگتے ہیں۔ اللہ فرماتا ہے کیا انہوں نے جنت دیکھی ہے فرشتے عرض کرتے ہیں۔ خدا کی قسم انہوں نے جنت نہیں دیکھی۔ اللہ فرماتا ہے اگر وہ دیکھ لیتے تو ان کی کیا حالت ہوتی۔ فرشتے عرض کرتے ہیں اگر وہ جنت دیکھ لیتے تو ان کو جنت کی خواہش اور طلب اور زیادہ شدت کے ساتھ ہو جاتی اور جنت کی رغبت بہت بڑھ جاتی۔ اللہ فرماتا ہے وہ پناہ کس چیز سے مانگتے ہیں۔ فرشتے عرض کرتے ہیں وہ دوزخ سے پناہ چاہتے ہیں۔ اللہ فرماتا ہے کیا انہوں نے دوزخ دیکھی ہے۔ فرشتے عرض کرتے ہیں نہیں بخدا انہوں نے دوزخ نہیں دیکھی۔ اللہ فرماتا ہے اگر وہ دوزخ کو دیکھ لیتے تو ان کی کیا کیفیت ہوتی۔ ملائکہ عرض کرتے ہیں اگر وہ دوزخ کو دیکھ لیتے تو اس سے اور زیادہ بھاگتے اور بہت زیادہ اس سے ڈرتے۔ اللہ فرماتا ہے تو میں تم کو گواہ کرتا ہوں کہ میں نے ان کو بخش دیا۔ ان ملائکہ میں سے ایک فرشتہ عرض کرتا ہے ان ذکر کرنے والوں میں فلاں شخص بھی موجود تھا جو ان میں سے نہیں تھا (یعنی ذکر میں شامل نہ تھا) کسی کام سے وہاں آیا تھا۔ اللہ فرماتا ہے وہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کے پاس بیٹھنے والا بھی محروم نہیں ہوتا۔ رواہ البخاری۔

مسلم نے بھی یہ حدیث اسی طرح نقل کی ہے اس روایت کے الفاظ یہ ہیں۔ اے رب ان میں ایک بندہ غلطی سے شامل ہو گیا ادھر سے گزر رہا تھا کہ ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اللہ فرماتا ہے میں نے اس کو بھی بخش دیا وہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کے ساتھ بیٹھنے والا (بھی) بد نصیب نہیں ہوتا۔

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم جنت کے باغوں کی طرف سے گزرو تو وہاں چر لیا کرو (یعنی ان میں حصہ لیا کرو) صحابہؓ نے عرض کیا جنت کے باغ کون سے ہیں فرمایا ذکر کرنے کے حلقے۔ رواہ الترمذی۔

معاویہ کی روایت سے مسلم نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ صحابہ کے حلقہ کی طرف سے گزرے فرمایا یہاں کیسے بیٹھے ہو۔ صحابہؓ نے عرض کیا اللہ کا ذکر کرنے بیٹھے ہیں اور اس کی ثناء کر رہے ہیں کہ اس نے ہم کو مسلمان ہونے کی توفیق دی اور مسلمان بنا کر ہم پر احسان فرمایا حضور ﷺ نے فرمایا اللہ ملائکہ پر تم کو بطور فخر پیش فرماتا ہے۔

امام مالکؒ کا بیان ہے مجھے اطلاع ملی ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ غافلوں میں (یعنی اللہ کی یاد سے غفلت کرنے والوں میں) اللہ کا ذکر کرنے والا ایسا ہے جیسے (کافروں کے مقابلہ سے) بھاگنے والوں میں (کافروں سے) لڑنے والا۔ اور غافلوں میں اللہ کا ذکر کرنے والا ایسا ہے جیسے اندھیرے گھر میں روشن چراغ اور غافلوں کے اندر رہ کر اللہ کی یاد کرنے والے کو زندگی ہی میں اللہ جنت کے اندر اس کی جگہ دکھا دیتا ہے اس کے گناہ اتنے بخش دیے جاتے ہیں جتنی تعداد تمام بولنے والوں اور نہ بولنے والوں یعنی آدمیوں اور چوپایوں کی ہے۔ رواہ رزین۔

حضرت معاذ بن جبلؓ کی روایت ہے اللہ کے ذکر سے زیادہ کوئی عمل آدمی کو اللہ کے عذاب سے نجات دینے والا نہیں ہے۔ رواہ مالک والترمذی وابن ماجہ۔

حضرت ابو سعید خدریؓ نے شہادت دی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جو لوگ بیٹھے ہوئے اللہ کا ذکر کرتے ہیں (یعنی ان کے بیٹھنے کی غرض سوائے یاد الٰہی کے اور کچھ نہیں ہوتی) ان پر فرشتے چھا جاتے ہیں (فرشتے ان کو گھیر لیتے ہیں) اور رحمت ان کو ڈھانک لیتی ہے اور ان پر سکینہ (دل اور روح کا چین) نازل ہوتا ہے اور اللہ ان (ملائکہ) میں جو اس کے مقرب ہوتے ہیں ان لوگوں کا ذکر فرماتا ہے۔ رواہ مسلم۔

حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ (اللہ نے ارشاد فرمایا) کہ بندہ میرے متعلق جیسا گمان رکھتا ہے

میں اسی کے گمان کے پاس ہوتا ہوں جب وہ میری یاد کرتا ہے تو میں..... اس کے ساتھ ہوتا ہوں اگر وہ میری یاد اپنے دل میں کرتا ہے تو میں بھی اس کو اپنے نفس میں یاد کرتا ہوں اور اگر وہ میری یاد جماعت کے ساتھ کرتا ہے (جماعت میں کرتا ہے) تو میں اس کا ذکر ایسی جماعت میں کرتا ہوں جو اس کی جماعت سے بہتر ہوتی ہے۔ متفق علیہ (یعنی فرشتوں کی جماعت میں اس کا ذکر کرتا ہوں)

بعض اہل تفسیر کے نزدیک وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ کا یہ مطلب ہے کہ اللہ جو تمہارا ذکر کرتا ہے وہ اس ذکر سے زیادہ عظمت والا ہے جو تم اس کا..... کرتے ہو (یعنی تم جو خدا کی یاد کرتے ہو اس سے بڑھ کر اللہ تمہارا ذکر کرتا ہے) مجاہد، عکرمہ اور سعید بن جبیر سے یہی تفسیر منقول ہے ایک روایت میں حضرت ابن عباسؓ کی طرف بھی اس قول کی نسبت کی گئی ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ موسیٰ بن عقبہ کی روایت میں بحوالہ نافع آیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے رسول اللہ ﷺ سے بھی مرفوعاً تفسیر نقل کی ہے۔ خلاصہ مطلب یہ ہے کہ تم خدا کی یاد میں کمی نہ کرو، کیونکہ جب تم خدا کی یاد کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارا ذکر کرے گا اور اللہ جب تمہارا ذکر کرے تو اس کا درجہ تمہارے ذکر خدا کرنے سے بہت بڑا ہے۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ۝ اور جو کچھ تم بناتے (یعنی کرتے) ہو اللہ اس کو جانتا ہے اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۖ اور اہل کتاب سے مباحثہ نہ کرو مگر اس طریقہ سے جو اچھا ہے۔

آیت میں خطاب رسول اللہ ﷺ اور مومنوں کو ہے۔ یعنی قرآن اور آیات قرآن کے ذریعہ سے اللہ کی طرف آنے کی دعوت دو۔ اور قرآن کی پیش کردہ دلائل پر متنبہ کرو۔ اس مطلب پر مستثنیٰ مفرغ ہوگا۔ یا استثناء منقطع ہے اور مطلب یہ ہے کہ کافروں کی بداخلاقی کے مقابلہ میں تم نرمی سے کام لو، مباحثہ کے وقت وہ غضب ناک ہو جائیں تو تم تحمل کرو، وہ شوروغل کریں تو تم ان کی خیر خواہی ظاہر کرو، چونکہ خیر خواہی اور نصیحت مجادلہ میں داخل نہیں ہے اس لئے مستثنیٰ منقطع ہوگا۔

اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ مگر ان میں سے جنہوں نے ظلم کیا ہو یعنی معاہدہ کو توڑ دیا ہو یا جزیہ ادا کرنا قبول نہ کیا ہو تو ان سے مباحثہ نہ کرو بلکہ لڑو یہاں تک کہ وہ مسلمان ہو جائیں یا ذلیل ہو کر جزیہ ادا کریں۔ سعید بن جبیرؒ نے کی تشریح کی ہے اور کہا ہے کہ حربی کافر مستثنیٰ ہیں اور استثناء کے بعد جو لوگ باقی رہ گئے وہ ذمی کافر ہیں۔

ظاہر ہے کہ حسن مجادلہ کا حکم جہاد کے حکم سے پہلے تھا (آیت قتال نازل ہونے سے منسوخ ہو گیا۔ کیونکہ یہ آیت مکی ہے (اور جہاد کا حکم مدینہ میں نازل ہوا) اس تقدیر پر اَلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا سے مراد ہوں گے وہ لوگ جو عناد اور دشمنی میں حد سے آگے بڑھ گئے تھے کوئی خدا کا بیٹا مانتا تھا۔ کوئی اللہ کے ہاتھ کو بندھا ہوا (یعنی کنجوس) کہتا تھا، کوئی کہتا تھا اللہ محتاج ہے ہم مالدار ہیں۔ اس صورت میں سختی اور درشتی کے ساتھ ان سے مجادلہ جائز قرار پائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قتادہ اور مقاتل نے اس آیت کو آیت قتال سے منسوخ قرار دیا ہے۔

وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ اور کہہ دو کہ ہم اس کتاب پر ایمان لائے جو ہماری طرف اتاری گئی اور اس پر بھی جو تمہاری طرف اتاری گئی۔

یہ حسن مجادلہ کا بیان ہے۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اگر اہل کتاب وہ باتیں کہیں جو ان کی کتابوں میں مذکور ہیں تو تم ان سے جھگڑا نہ کرو یعنی تکذیب نہ کرو، ہاں ان میں سے جو لوگ بیجا باتیں کہیں اور ایسی باتوں کا اظہار کریں جو یقیناً (ان کی اصل) کتابوں میں نہیں ہیں اور جھوٹی ہیں جیسے ان کا دعویٰ کہ شریعت موسیٰ ہمیشہ رہے گی یا عیسیٰ کو قتل کر دیا گیا یا مسیح خدا کے بیٹے تھے تو اس صورت میں ان کو جھوٹا قرار دینا واجب ہے اور مباہلہ ضروری ہے ان سے کہہ دو کہ ہم اپنی اور تمہارے پاس بھیجی گئی کتاب پر ایمان رکھتے ہیں (تمہاری ان غلط باتوں کو نہیں مانتے)۔

وَ اِلٰهُنَا وَ اِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ اور ہمارا معبود اور تمہارا معبود ایک ہے اور ہم اسی کے اطاعت گزار ہیں۔ اس میں تعریض ہے اس امر کی کہ اہل کتاب نے اپنے علماء و مشائخ کو اللہ کے سوا رب بنا رکھا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ اہل کتاب (یعنی یہودی) عبرانی میں توریت پڑھتے تھے اور مسلمانوں کے سامنے اس کی تشریح عربی میں کرتے تھے، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو نہ تکذیب اور کہو ہم ایمان لائے اس کتاب پر جو ہماری طرف اتاری گئی اور اس پر جو تمہاری طرف اتاری گئی الخ۔ رواہ البخاری۔

حضرت ابو نملہؓ انصاری کا بیان ہے میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک یہودی آیا اور اسی وقت ایک جنازہ بھی ادھر سے گزرا۔ یہودی نے کہا محمد ﷺ یہ میت کیا کلام کرتی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا مجھے نہیں معلوم۔ یہودی بولا یہ کلام کرتی ہے۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے (صحابہ سے) فرمایا اہل کتاب اگر تم سے کچھ بیان کریں (اور وہ تمہارے دین کے خلاف نہ ہو) تو تم نہ ان کی تصدیق کرو نہ تکذیب اور کہو اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ۔ (ہمارا ایمان اللہ پر اور اللہ کی کتاب اور اس کے پیغمبروں پر ہے) اب اگر وہ بات صحیح ہے تو تم نے اس کی تکذیب نہیں کی (اس لئے مجرم نہ ہو گے) اور اگر وہ بات غلط ہے تو تم نے اس کی تصدیق نہیں کی۔ (اس لئے مجرم نہ ہو گے)۔

وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ اور ایسے ہی ہم نے آپ کی طرف کتاب اتاری یعنی جس طرح آپ سے پہلے کتابیں نازل کیں اسی طرح آپ پر بھی کتاب نازل کی جو بذریعہ وحی آپ کے پاس پہنچی اور جو پچھلی ساری کتب الٰہیہ کو سچا بتاتی ہے۔

فَالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ پس جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان لوگوں سے مراد ہیں حضرت عبداللہ بن سلام اور دوسرے لوگ جو قرآن پر ایمان لے آئے تھے یا یہ مطلب ہے کہ جن کو ہم نے کتاب دی وہ بعثت رسول اللہ ﷺ سے پہلے اس کتاب پر ایمان رکھتے تھے۔

وَ مِنْ هٰۤؤُلَآءِ مَنْ یُّؤْمِنُ بِهٖ وَ مَا یَجْحَدُ بِاٰیٰتِنَاۤ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ۝ اور ان میں سے (یعنی مکہ والوں میں سے یا عرب میں سے یا ان اہل کتاب میں سے جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں موجود تھے) کچھ لوگ وہ ہیں جو قرآن پر ایمان رکھتے ہیں اور ہماری آیات کا انکار صرف کافر ہی کرتے ہیں۔ یعنی صرف وہ لوگ انکار کرتے ہیں جو اللہ کے اور اللہ کی ساری کتابوں کے منکر ہیں کیونکہ قرآن کی جو شخص تکذیب کرتا ہے وہ حقیقت میں توریت و انجیل کی بھی تکذیب کرتا ہے۔ اس لئے کہ توریت و انجیل نے قرآن کی تصدیق کی ہے پس جو شخص قرآن کا منکر ہے اور توریت پر ایمان رکھنے کا مدعی ہے اس کا دعویٰ غلط ہے۔ قتادہ نے کہا جحود پہچاننے کے بعد ہوتا ہے اہل کتاب جانتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ سچے نبی ہیں اور قرآن حق ہے اس کے بعد انہوں نے انکار کیا، یہ جحود ہو گیا۔

وَ مَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّ لَا تَخُطُّهٗ بِیَمِیْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝

آپ اس سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتے تھے نہ اپنے ہاتھ سے کوئی کتاب لکھتے تھے (اگر ایسا ہوتا تو) اس وقت باطل پرست (یہ کافر) شک میں پڑ جاتے۔

مِنْ قَبْلِهٖ اس کتاب کے نزول سے پہلے۔

بِیَمِیْنِكَ اپنے سیدھے ہاتھ سے۔ لکھنا تو ہاتھ سے ہی ہوتا ہے مگر اس لفظ کی صراحت بتا رہی ہے کہ مجازی معنی اس جگہ مراد نہیں ہے (لکھنے سے مراد ہے کبھی لکھوانا بھی مجازاً ہوتا ہے ایک بادشاہ نے دوسرے بادشاہ کو لکھا یعنی اپنے وزیر یا منشی سے لکھوایا) یمین کے لفظ سے عدم تحریر کی زیادہ تصور کشی ہے (بائیں ہاتھ سے تو شاید کوئی لکھ لیتا ہو دایاں ہاتھ ہی عام طور پر لکھنے کے کام آتا ہے)۔

اِذًا یعنی اگر گزشتہ کتابوں کو پڑھ لکھ سکتے۔ تو مُبْطِلُوْنَ یعنی اہل مکہ شک میں پڑ جاتے کہ شاید آپ نے متقدمین کی

کتابوں سے انتخاب کر لیا ہو۔

قتادہ نے بھی تفسیری مطلب بیان کیا ہے۔ کافروں کو اہل باطل کفر کی یا شک میں پڑنے کی وجہ سے کہا بکثرت معجزات کی موجودگی میں کوئی وجہ نہ تھی کہ کفر میں یا شک میں پڑتے۔

مقاتل نے کہا کہ مُبْطِلُوْنَ سے مراد ہیں اہل کتاب یعنی اہل کتاب چونکہ اپنی کتاب میں نبی آخر الزماں کی صفت امی پاتے ہیں اس لئے ان کو کوئی شک نہ تھا۔ اس مطلب پر اہل کتاب کا مبطل ہونا واقعی ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ امی تھے اور ان کی کتابوں میں آخری نبی کا امی ہونا ہی لکھا ہے۔

بَلْ هُوَ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ یہ قرآن رسول کا خود تراشیدہ اور خود مکتوبہ نہیں ہے بلکہ کھلی ہوئی آیات ہیں جو خود اپنی سچائی پر دلالت کر رہی ہیں ان لوگوں کے سینوں میں جن کو علم عطا کیا گیا ہے۔ یعنی اہل ایمان کے دلوں میں جو قرآن کے عامل اور حافظ ہیں کوئی بھی ان آیات میں تغیر نہیں کر سکتا۔ قرآن کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کی آیات کھلے ہوئے معجزات ہیں اور ہر تحریف و تبدیل سے محفوظ ہیں، اللہ نے خود فرمادیا ہے، وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ - پھر یہ قرآن اہل ایمان کے سینوں میں محفوظ ہے اہل ایمان اس کے حافظ ہیں۔ اس کے برخلاف دوسری آسمانی کتابیں چونکہ معجزہ نہ تھیں اس لئے لوگوں نے ان کی آیات و الفاظ کو تبدیل کر دیا تھا اور ان کو یاد سے نہیں پڑھا جاتا تھا بلکہ کتاب میں دیکھ کر پڑھا جاتا تھا۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہُوَ سے مراد ہے رسول اللہ ﷺ کی ذات اور اَلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ سے مراد ہیں اہل کتاب۔ یعنی رسول اللہ ﷺ کی شخصیت اتنی واضح علامات کی حامل ہے جو اہل کتاب کے سینوں میں محفوظ ہیں یعنی رسول اللہ ﷺ کے جو اوصاف ان کی کتابوں میں مذکور ہیں اور اہل کتاب ان سے واقف ہیں وہ اوصاف رسول اللہ ﷺ کی شخصیت میں موجود ہیں۔

وَمَا یَجْحَدُ بِاٰیٰتِنَاۤ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ۝ اور ہماری آیات کا انکار صرف ظالم ہی کرتے ہیں۔ ظلم کا معنی ہے کسی چیز کو بے محل رکھ دینا۔ آیات الٰہیہ ایک ایسا کھلا ہوا معجزہ ہیں جو اپنے الفاظ اور معانی کی سچائی واضح طور پر بتا رہا ہے ایسے کھلے ہوئے معجزہ کا انکار صرف وہی کر سکتا ہے جو بے جا کاوش اور جھگڑالو ہو۔

وَقَالُوْا لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ اٰیٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اور انہوں نے کہا کہ ان پر ان کے رب کی طرف سے معجزات کیوں نہیں اتارے گئے۔ یعنی ایسے محسوس معجزات کا نزول ان پر کیوں نہیں ہوا جیسے پچھلے انبیاء پر ہوا تھا۔ مثلاً حضرت صالحؑ کی اونٹنی، حضرت موسٰیؑ کی لاٹھی اور حضرت عیسٰیؑ کا آسمانی خوان۔

قُلْ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ آپ کہہ دیجئے کہ سارے معجزات تو اللہ کے پاس ہیں۔ یعنی اس کی قدرت میں ہیں اس کے ارادے سے وابستہ ہیں میرے قبضہ میں نہیں ہیں کہ تمہاری فرمائش کے مطابق پیش کر دوں۔

وَاِنَّمَاۤ اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ اور میں تو صرف واضح طور پر اللہ کے عذاب سے ڈرانے والا ہوں۔ یعنی میرا کام صرف مخالفت اور عذاب سے ڈرانا اور ان معجزات کو ظاہر کرنا ہے جو مجھے عطا کئے گئے ہیں۔

اَوَلَمْ یَكْفِهِمْ اَنَّاۤ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ یُتْلٰى عَلَیْهِمْ ؕ کیا یہ لوگ مزید معجزات طلب کرتے ہیں ان کے لئے یہ بات کافی ہے کہ باوجود آپ کے امی ہونے ہم نے آپ پر کتاب نازل کی جو ان کے سامنے پڑھی جاتی ہے۔

اَوَ ہمزہ انکار اور زجر کے لئے یعنی کیا ان کے لئے نزول کتاب کافی نہیں ہے کسی اور معجزہ کے طلب گار ہیں۔ حالانکہ یہ معجزہ اتنا قوی ہے کہ اس کی موجودگی میں دوسرے معجزات کی ضرورت نہیں ہے۔

اَلْكِتٰبَ، یعنی ہم نے یہ کتاب نازل کی جو معجزہ بھی ہے اور تمام اعلیٰ علوم کو حاوی بھی ہے اور امور دینیہ میں پچھلی کتابوں کے موافق بھی ہے۔

لَمْ يَكْتُبْ وَلَمْ يَقْرَأْ بِزَمَانٍ وَهِيَ تُخْبِرُنَا عَنِ الْمَعَادِ وَعَنْ عَادٍ وَعَنْ إِرَمٍ
دَامَتْ لَدَيْنَا وَفَاقَتْ كُلَّ مُعْجِزَةٍ مِنَ النَّبِيِّينَ إِذْ جَاءَتْ وَلَمْ تَدُمِ

رسول اللہ ﷺ اس سابق زمانہ میں نہیں تھے کتاب اللہ کی آیات ہی ہم کو قیامت کے متعلق اور قوم عاد وارم کے متعلق خبر دے رہی ہیں یہ آیات ہمارے پاس ہمیشہ سے موجود ہیں (یعنی وقت نزول سے اب تک موجود ہیں) اور پیغمبروں کے ہر معجزہ سے اعلیٰ وبالا ہیں کیونکہ یہ آیات کا معجزہ لازوال ہے۔ اور پیغمبروں کا کوئی معجزہ باقی نہیں رہا۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَرَحْمَةً وَّذِکْرٰی لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾ اس میں بلاشبہ بڑی نعمت اور نصیحت ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں۔ ع ۱

فِیْ ذٰلِکَ اس میں یعنی قرآن میں جو کھلا ہوا دائمی معجزہ ہے۔

لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ یعنی ان لوگوں کے لئے رحمت و نصیحت ہے جن کا مقصد ایمان لانا ہے ہٹ دھرمی اور ضد مقصود نہیں ہے۔

مسند میں دارمی نے اور ابوداؤد نے مراسیل میں اور ابن جریر وابن ابی حاتم نے بطریق عمرو بن دینار یحییٰ بن جعدہ کی روایت سے مرسلاً بیان کیا ہے کہ کچھ مسلمان شانہ کی ایک ہڈی لے کر آئے جس میں یہودیوں سے سنی ہوئی کچھ باتیں لکھی ہوئی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگوں کے گمراہ ہونے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ جو کچھ ان کا نبی لے کر آیا ہو اس سے تو گریز کریں اور دوسروں کے لئے جو دوسرے انبیاء لے کر آئے ہوں اس کی طرف راغب ہو جائیں۔ اس پر آیت اَوَلَمْ یَکْفِھِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ یُتْلٰی عَلَیْھِمْ نازل ہوئی۔

روایت میں آیا ہے کہ کعب بن اشرف نے کہا محمد تمہارے رسول خدا ہونے کا کون شاہد ہے۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

قُلْ کَفٰی بِاللّٰہِ بَیْنِیْ وَ بَیْنَکُمْ شَھِیْدًا ۚ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ

آپ کہہ دیجئے کہ میرے اور تمہارے درمیان گواہی دینے کے لئے اللہ کافی ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے سب سے وہ واقف ہے۔ یعنی اس سے کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہے۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَکَفَرُوْا بِاللّٰہِ ۙ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۵۲﴾

اور جن لوگوں نے باطل کو مانا اور اللہ کا انکار کیا وہی لوگ تجارت میں گھاٹا اٹھانے والے ہیں۔

کہ انہوں نے حق کو چھوڑ باطل کو پسند کیا دوزخ کو جنت کے عوض خریدا۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا۔ اَلْبَاطِلِ سے مراد ہے غیر اللہ یعنی وہ اللہ کے سوا دوسروں پر ایمان لائے۔ مقاتل نے کہا یعنی شیطان کی پوجا کی۔

وَیَسْتَعْجِلُوْنَکَ بِالْعَذَابِ ؕ وَلَوْلَآ اَجَلٌ مُّسَمًّی لَّجَآءَھُمُ الْعَذَابُ ؕ وَلَیَاْتِیَنَّھُمْ بَغْتَةً وَّھُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۵۳﴾

اور یہ آپ سے عذاب جلد آنے کی خواہش کرتے ہیں اگر مدت معین نہ ہوتی تو عذاب ان پر آچکا ان پر عذاب ضرور اچانک آئے گا اور ان کو پتہ بھی نہ ہوگا۔

نضر بن حارث نے کہا تھا۔ اَللّٰھُمَّ اِنْ کَانَ ھٰذَا ھُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِکَ فَاَمْطِرْ عَلَیْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اے خدا اگر تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر اوپر سے پتھروں کی بارش کر دے۔ اس کے جواب میں آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

اَجَلٌ مُّسَمًّی کی تشریح میں حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ سے میرا وعدہ نہ ہوتا کہ آپ کی قوم کو عذاب نہیں دوں گا اور ان کی جڑ نہیں اکھاڑوں گا بلکہ قیامت تک کے لئے ان کے عذاب کو ملتوی رکھوں گا تو عذاب آچکتا۔ اللہ نے فرمایا ہے بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُھُمْ بلکہ قیامت کی گھڑی ان کے عذاب کے لئے مقرر ہے۔

ضحاک نے کہا اَجَلٌ مُّسَمًّی سے مدت عمر مراد ہے جب وہ مر جائیں گے تو عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے بعض لوگوں

نے کہا جنگ بدر مراد ہے۔

لَجَآءَهُمُ الْعَذَابُ یعنی ان پر عذاب فوراً آجاتا۔

لَيَاْتِيَنَّهُمْ کی ضمیر عذاب کی طرف راجع ہے یا اَجَل کی طرف۔

بَغْتَةً ناگہاں۔ یعنی دنیا میں اچانک آجاتا۔ جیسے بدر کا واقعہ ہوا یا آخرت میں یعنی مرنے کے وقت۔

لَا يَشْعُرُوْنَ یعنی عذاب کے آنے کا ان کو پتہ بھی نہ ہوتا۔

يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ اور وہ عذاب جلد آجانے کی آپ سے درخواست کرتے ہیں اس جملہ کا دوبارہ ذکر تاکید کے لئے ہے۔

وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝ اور بلاشبہ جہنم کافروں کو بلاشبہ گھیرنے والی ہے یعنی جس روز عذاب آئے گا اس روز جہنم کافروں کو گھیر لے گی یا یہ مطلب ہے کہ اس وقت بھی کافروں کو جہنم گویا گھیرے ہوئے ہے کیونکہ کفر اور معاصی ان کو گھیرے ہوئے ہیں اور یہ داخلہ جہنم کے موجبات ہیں تو گویا اس وقت بھی دوزخ ان کو گھیرے ہوئے ہے۔

اَلْكَافِرِيْنَ میں الف لام عہدی ہے اور بجائے ضمیر کے لفظ اَلْكَافِرِيْنَ کو صراحت کے ساتھ اس لئے ذکر کیا تاکہ موجب احاطہ معلوم ہو جائے۔ یا الف لام جنسی ہے اور عام جنس کا حکم بیان کر کے خاص کافروں کے حکم پر استدلال کیا ہے (کیونکہ خاص اگر مخصوص الحکم نہ ہو تو عام کے ذیل میں آجاتا ہے۔ مترجم)

يَوْمَ يَغْشٰهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ جس روز کہ عذاب اوپر سے اور ان کے قدموں کے نیچے سے ان کو گھیرے گا یعنی ہر طرف سے احاطہ کرے گا۔

وَيَقُوْلُ اور (اللہ یا اللہ کے حکم سے کوئی فرشتہ) کہے گا۔

ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ جو کچھ تم کرتے تھے اس (اس سزا) کا مزہ چکھو۔

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ۝ اے میرے ایمان دار بندو میری زمین فراخ ہے سو خاص میری ہی عبادت کرو۔ یعنی اگر اپنے موجودہ مقام سکونت میں (کسی ممانعت کی وجہ سے) میری عبادت نہیں کر سکتے ہو تو میری زمین وسیع ہے دوسری جگہ جا کر میری ہی عبادت کرو۔

اِيَّايَ فعل محذوف کا مفعول ہے یعنی اُعْبُدُوْا اِيَّايَ اور فَاعْبُدُوْنِ اس کی تاکید ہے۔

مقاتل اور کلبی نے کہا اس آیت کا نزول ان کمزور مسلمانوں کے حق میں ہوا جو (کمزوری کی وجہ سے) مکہ میں رہ گئے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ مکہ کے اندر رہ کر اگر تم ایمان کا اظہار نہیں کر سکتے ہو تو وطن چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلے جاؤ جہاں آزادی کے ساتھ اظہار ایمان کر سکتے ہو جیسے مدینہ وغیرہ کیونکہ میری زمین تنگ نہیں ہے۔

مجاہد نے کہا میری زمین وسیع ہے ترک وطن کر کے چلے جاؤ۔ اور وہاں پہنچ کر جہاد کرو۔

سعید بن جبیر نے کہا جب کسی بستی میں گناہ کئے جاتے ہوں تو وہاں سے نکل جاؤ میری زمین وسیع ہے۔

عطاء نے کہا جب تم کو اپنی سرزمین میں گناہوں کا حکم دیا جاتا ہو تو وہاں سے بھاگ جاؤ میری زمین وسیع ہے۔ اگر کوئی ایسی بستی میں ہو جہاں گناہ کئے جاتے ہوں اور گناہوں سے بندش ممکن نہ ہو تو اس جگہ کو چھوڑ کر کسی ایسے مقام پر چلا جانا واجب ہے جہاں اللہ کی عبادت کی تیاری کی جا سکے۔

بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے اس آیت کا نزول ان لوگوں کے حق میں ہوا جنہوں نے ہجرت نہیں کی تھی۔ مکہ میں ہی رہ گئے تھے اور انہوں نے کہا تھا کہ اگر ہم ہجرت کر جائیں تو بھوکے مر جانے کا خوف ہے (پردیس میں بھوکے مر جائیں گے) اللہ نے ان کا یہ عذر قبول نہیں فرمایا۔

مطرف بن عبداللہ نے کہا زمین فراخ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ میرا رزق وسیع ہے تم وطن چھوڑ دو (تمام کو رزق میں

دوں گا) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ جو کسی زمین سے اپنے دین کو لے کر دوسری زمین کی طرف بھاگا۔ خواہ وہ ایک ہی بالشت بھاگ سکا ہو تب بھی جنت کا مستحق ہو گیا اور محمد ﷺ و ابراہیمؑ کا رفیق (ساتھی) ہو گیا۔ رواہ الثعلبی من حدیث الحسن مرسلاً۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۗ ہر شخص موت کا مزہ چکھنے والا ہے یعنی جس طرح چکھنے والا کسی چیز کا مزہ چکھتا ہے اسی طرح موت کی سختی اور تکلیف ہر شخص پائے گا۔ لہٰذا تم موت کے خوف سے شر کے مقام میں پڑے نہ رہو بلکہ اللہ کی عبادت کر کے موت کی تیاری کرو۔

ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ۝ پھر تم سب ہماری ہی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ یعنی ہم تمہارے اعمال کا بدلہ دیں گے اس لئے تم اللہ کی راہ میں ہجرت کرو اس کی جزا ہم تم کو عنایت کریں گے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے ہم ان کو جنت کے بلند و بالا محلوں میں ٹھکانہ دیں گے۔

تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۗ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی وہ ہمیشہ وہاں رہیں گے۔

نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ یہ بہت اچھا اجر ہے ان باعمل لوگوں کا جنہوں نے کافروں کی اذیت رسانی، ہجرت اور دوسری تکلیفوں اور مصیبتوں پر محض اللہ کی خوشنودی کے لئے صبر کیا اور اپنے رب پر ہی وہ اعتماد رکھتے ہیں یعنی اس بات پر ان کو اعتماد ہے کہ اللہ ان راستوں سے رزق پہنچائے گا جو ان کے گمان میں بھی نہ ہوں گے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ کچھ مومن مکہ میں رہ گئے تھے رسول اللہ ﷺ نے ان کو حکم دیا کہ ہجرت کر کے مدینہ پہنچ جاؤ۔ ان لوگوں نے جواب دیا وہاں نہ ہمارا گھر ہے نہ مال ہے، ہمارے کھانے پینے کا انتظام وہاں کون کرے گا۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖ اللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ۖ اور کتنے ہی جانور اپنی روزی اپنے اوپر اٹھائے نہیں پھرتے اللہ ہی ان کو بھی روزی دیتا ہے اور تم کو بھی۔

یعنی بہت سے چوپائے اور پرندے جو غذا کے محتاج ہیں اپنے ساتھ اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے اور نہ کل کے لئے جمع کرتے ہیں۔ سفیان بن علی بن ارقم نے کہا سوائے انسان اور چوہے اور چیونٹی کے اور کوئی مخلوق روزی جمع کر کے نہیں رکھتی۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ چوپائے اور پرندے جو کمزور ہیں اور اپنی روزی جمع کر کے نہیں رکھتے ان کو بھی اللہ ہی روزی دیتا ہے اور تم طاقتور ہو رزق جمع کر کے رکھتے ہو اللہ ہی تم کو بھی روزی دیتا ہے روزی ملنے کے معاملہ میں تم اور جانور سب برابر ہو تم بھی رزق کھا کر جیتے ہو وہ بھی جیتے ہیں تم بھی آخر مر جاتے ہو وہ بھی مر جاتے ہیں۔ پھر تمہاری کوشش بے کار ہے اس لئے ہجرت کرنے کی صورت میں معاش کی طرف سے تم کوئی اندیشہ نہ کرو۔

وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ اور وہی سننے والا جاننے والا ہے تمہاری باتوں کو سنتا ہے اس نے تمہارا یہ کلام سن لیا کہ ہجرت کریں گے تو کھائیں گے کہاں سے۔ وہ واقف ہے کہ تمہارے دلوں کے اندر یقین و ایمان کا ضعف ہے۔

عبد بن حمید، ابن ابی حاتم بیہقی اور ابن عساکر نے ضعیف سند سے نیز بغوی نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا: میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ انصار کے باغات میں سے ایک باغ میں گیا رسول اللہ ﷺ اپنے ہاتھ سے کھجوریں (تازہ خرمے) چن چن کر کھانے لگے اور فرمایا ابن عمر تم بھی کھاؤ۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھے خواہش نہیں ہے۔ فرمایا مجھے تو کھانے کی خواہش ہے یہ چوتھی رات کی صبح ہے چار دن ہو گئے کہ میں نے کھانا نہیں کھایا۔ مجھے ملا ملا نے کہا اِنَّا لِلّٰهِ الْمُسْتَعَان ۔ فرمایا ابن عمر اگر میں اپنے رب سے مانگتا تو وہ مجھے کسریٰ اور قیصر کے ملک سے بھی کتنے ہی گنا زیادہ عنایت فرما دیتا لیکن میں ایک دن بھوکا رہتا ہوں اور ایک دن پیٹ بھرتا ہوں۔ (یعنی ایک روز کھانا کھاتا ہوں) ابن عمرؓ اگر تمہاری

عمر ہوئی تو اس وقت تمہاری کیا حالت ہوگی جب تم ایسے لوگوں میں رہو گے جو سال بھر کا رزق چھپا کر رکھیں گے اور ان (کو اللہ کے رزاق ہونے کا) یقین کمزور ہوگا۔

حضرت ابن عمرؓ کا بیان ہے واللہ ہم وہاں سے بچے بھی نہ تھے اور نہ بچنے کا ارادہ کیا تھا کہ آیت وکاین من دابة الخ نازل ہوئی۔

حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ دوسرے دن کے لئے کچھ جمع کر کے نہیں رکھتے تھے۔ رواہ الترمذی و صحح۔

حضرت عمرؓ بن خطاب کا بیان ہے میں نے خود سنا کہ رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے اگر تم اللہ پر پورا پورا بھروسہ رکھتے تو وہ تم کو اسی طرح رزق عطا فرماتا جس طرح پرندوں کو عطا فرماتا ہے کہ صبح کو وہ بھوکے نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھرے واپس آتے ہیں۔ رواہ الترمذی وابن ماجۃ۔

حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی چیز تم کو جنت سے قریب کرنے والی اور دوزخ سے دور رکھنے والی ایسی نہیں رہی کہ میں نے اس کو کرنے کا تم کو حکم نہ دے دیا ہو اور کوئی چیز دوزخ سے قریب کرنے والی اور جنت سے دور رکھنے والی ایسی نہیں رہی کہ اس کو کرنے کی تم کو ممانعت نہ کر دی ہو، روح القدس (جبرئیل) نے میرے دل میں یہ بات پھونک دی ہے کہ کوئی شخص بھی جب تک اپنا رزق پورا نہ کرلے گا ہرگز نہیں مرے گا، پس تم لوگ متنبہ ہو جاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور رزق کی طلب میں اچھائی اختیار کرو (یعنی پاک ذرائع سے کماؤ) رزق ملنے میں دیر ہو جانے سے تم کو گناہوں کے راستے تحصیل رزق پر آمادہ نہ ہو جانا چاہئے کیونکہ اللہ کے پاس جو چیز ہے اس کو بغیر اللہ کی طاعت کے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ رواہ البغوی فی شرح السنۃ وذکرہ فی المعالم۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ

اور اگر آپ ان اہل مکہ سے دریافت کریں کہ آسمانوں کو اور زمین کو کس نے پیدا کیا اور سورج چاند کو کس نے زبردستی کام پر لگایا تو وہ یقیناً کہیں گے اللہ نے (ہی ایسا کیا ہے) یعنی وہ اقرار کریں گے کہ اللہ ہی نے زمین آسمان کو پیدا کیا اور چاند سورج کو کام میں لگایا ہے کیونکہ ہر عقل سلیم کی طرف فطری شہادت ہے کہ سلسلہ ممکنات (کا ابتدائی کنارا) واجب الوجود ہستی پر ختم ہوتا ہے (ممکن ہستی جس کا اپنا وجود اپنا نہیں وہ دوسرے ممکن کو وجود نہیں عطا کر سکتی اس لئے ہر ممکن کی علت موجدہ وہی ہستی ہے جو واجب الوجود ہے۔ جانب مبدء میں ممکنات کا غیر متناہی سلسلہ ہونا محال ہے۔ مترجم)

فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝ پھر وہ کہاں پھرے جا رہے ہیں۔

یعنی اللہ کے رب اور خالق ہونے کا اقرار کرتے ہوئے پھر توحید سے کس طرح ان کا رخ پھیرا جا سکتا ہے۔ (حضرت مفسر نے انّٰی کی تفسیر لفظ کَیْفَ سے کی ہے۔ مترجم)

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝

اللہ اپنے بندوں میں جس کا رزق (فراخ کرنا) چاہتا ہے فراخ کر دیتا ہے اور (جس کا رزق تنگ کرنا چاہتا ہے اس کا رزق) تنگ کر دیتا ہے۔ بلاشبہ اللہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔ یہ بھی ترجمہ (حسب قول مفسر) ہو سکتا ہے کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جس کا چاہتا ہے رزق کبھی فراخ اور کبھی تنگ کر دیتا ہے۔

اللہ ہر چیز سے بخوبی واقف ہے یعنی ہر چیز کی خوبیاں اور خرابیاں خوب جانتا ہے۔

حضرت انسؓ کی روایت سے ایک طویل حدیث بغوی نے ذکر کی ہے جس کو ہم سورۂ شوریٰ میں بیان کریں گے اس حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، میرے کچھ مومن بندے مجھ سے باب عبادت میں داخلہ کی دعا کرتے ہیں مگر باب عبادت میں داخل ہونے سے ان کو روک دیتا ہوں تاکہ ان میں اپنی فروعت آجائے جو ان کو تباہ کر دے۔ میرے کچھ بندے ایسے ہیں کہ دولت ہی ان کے ایمان کو درست رکھتی ہے اگر میں ان کو مفلس کر دوں تو افلاس ان کے ایمان کو بگاڑ دے اور میرے کچھ

بندے ایسے ہیں کہ ان کے ایمان کو سنبھالے رکھنے والا صرف افلاس ہوتا ہے اگر میں ان کو دولت مند بنادوں تو دولت ان کے ایمان کو بگاڑ دے اور میرے کچھ بندے ایسے ہیں کہ تندرستی ہی ان کے ایمان کو ٹھیک رکھنے والی ہے اگر میں ان کو بیمار کر دوں تو بیماری ان کے ایمان کو بگاڑ دے اور میرے کچھ بندے ایسے ہیں کہ ان کے ایمان کی درستی صرف بیماری سے ہوتی ہے۔ اگر میں ان کو تندرست کردوں تو صحت ان کے ایمان کو بگاڑ دے میں بندوں کے دلوں کی حالت جانتا ہوں اور اسی علم کے مطابق اپنے بندوں کا انتظام کرتا ہوں۔ بلاشبہ میں جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہوں۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُولُنَّ اللَّهُ ۚ اور اگر آپ ان (اہل مکہ) سے دریافت کریں کہ اوپر سے پانی کون اتارتا ہے پھر زمین کو اس کے مرجانے کے بعد پانی سے زندہ کون کردیتا ہے تو وہ یقیناً کہیں گے کہ اللہ ہی ایسا کرتا ہے۔

یعنی اہل مکہ مقر ہیں کہ تمام چیزوں کو پیدا کرنے والا اللہ ہی ہے۔ موجودات بسیط ہوں۔ یا عناصر کے مرکبات، اصول ہوں یا فروع سب کا موجد اللہ ہے اس کے سوا اور کوئی نہیں لیکن اس اقرار کے باوجود اللہ کی عبادت میں ایسی مخلوق کو شریک کرتے ہیں جو کچھ بھی اختیار نہیں رکھتی۔

قُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ ۚ آپ کہہ دیجئے اللہ کا شکر ہے۔ یعنی اللہ کا شکر ہے کہ اللہ نے آپ کو مشرکوں کی گمراہی سے محفوظ رکھا ہے یا اللہ کا شکر ہے کہ (کافر اس بات میں) آپ کی تصدیق کرتے ہیں اور آپ کی دلیل کو اللہ نے غالب کردیا ہے۔

بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿٦٣﴾ بلکہ ان میں سے اکثر لوگ سمجھتے نہیں کہ ان کا عمل کتنا برا ہے اور ان کے اپنے ہی اقوال میں اختلاف ہے اللہ کو ہر چیز کا موجد بھی کہتے ہیں اور پھر اس کی عبادت میں پست ترین مخلوق کو شریک بھی بناتے ہیں۔

وَمَا هَٰذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَهْوٌ وَلَعِبٌ ۚ وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۚ اور نہیں ہے یہ دنیاوی زندگی مگر جی کا بہلاوا اور کھیل اور دار آخرت ہی دار حیات ہے۔

هَٰذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا یعنی یہ حقیر دنیا۔ (اسم اشارہ قریب کے لئے مفید تحقیر ہے)

لَهْوٌ ہر وہ شے جو کسی مفید چیز سے باز رکھے (اور دل کو بہلا کر اپنی طرف مائل کرلے۔ مترجم) دنیا میں مشغولیت آدمی کو ان چیزوں سے روک دیتی ہے جو ابدی زندگی میں کام آنے والی ہیں۔

لَعِبٌ بےکار، کھیل، دنیا کو دنیا اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ فنا پذیر اور قریب زوال ہے۔ اللہ کی ساری عبادتیں اور فرماں برداریاں دنیا میں شامل نہیں ان کا شمار تو امور آخرت میں ہے کیونکہ ان کا نتیجہ اور پھل آخرت میں حاصل ہوگا۔

دار آخرت ہی مقام حیات ہے کیونکہ وہاں زندگی ہی زندگی ہے موت کبھی نہیں آئے گی۔

حَيَوَانٌ مصدر ہے اصل میں حَيَيَانٌ تھا حیات کے لفظ سے حیوان کا لفظ اپنے مفہوم یعنی حرکت پر زیادہ دلالت کرتا ہے۔

لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿٦٤﴾ اگر وہ جانتے ہوتے۔ کہ دنیا فانی ہے اور آخرت لازوال ہے تو دنیا کو آخرت پر ترجیح نہ دیتے۔ (شرط کی جزا محذوف ہے۔ مترجم)

فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ (وہ باوجود یہ کہ شرک کرتے ہیں اور اہل توحید سے عناد رکھتے لیکن) جب کشتی میں سوار ہوتے ہیں (اور ڈوبنے کا خطرہ ہوجاتا ہے) تو اللہ کو پکارتے ہیں خلوص کے ساتھ اس کی اطاعت کرتے ہوئے۔ یعنی جیسے مومن خالص طور پر اللہ ہی کی اطاعت کرتا ہے اور اللہ کے سوا کسی کو نہیں پکارتا اسی طرح مشرک بھی ڈوبنے کے خطرہ کے وقت صرف اللہ ہی کو پکارتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی اس مصیبت سے ان کو نہیں بچا سکتا اس وقت عبادت و اطاعت صرف اللہ کی کرتے ہیں۔

فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُونَ ﴿٦٥﴾ لیکن جب اللہ ان کو مصیبت سے بچا کر خشکی

تک لے جاتا ہے تو پھر وہ شرک کرنے لگتے ہیں۔ یک دم شرک کی طرف پلٹ جاتے ہیں۔
عکرمہ کا بیان ہے کہ دور جاہلیت والے جب سمندر میں سفر کرتے تھے تو اپنے بتوں کو ساتھ رکھتے تھے لیکن جب ہوا میں طوفان آتا تھا تو بتوں کو سمندر میں پھینک دیتے تھے اور پکارتے تھے اے رب اے رب۔ مطلب یہ کہ سخت مصائب کے وقت تو خالص طور پر دل سے اللہ کے اطاعت گزار ہو جاتے تھے اور شرک چھوڑ دیتے تھے اور نجات پا جاتے تو شرک کی طرف لوٹ آتے تھے۔

لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ ہم نے جو نعمت ان کو عطا کی ہے (اب تو) وہ اس کا انکار کرتے رہیں۔ یہ امر بمعنی تہدید (کفر کا حکم دینا مقصود نہیں ہے بلکہ کفر کے برے نتیجہ سے ڈرانا مقصود ہے) جیسے اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ جو کچھ چاہو کرو میں تمہارے اعمال کو خوب دیکھ رہا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ اب تو وہ اللہ کے اس احسان کا انکار کر دیں کہ اللہ نے ان کو ڈوبنے سے بچا لیا۔

بعض اہل تفسیر کے نزدیک لِيَكْفُرُوا میں لام کا معنی ہے تاکہ (یعنی یہ لام بمعنی کَیْ ہے اور کَیْ کا معنی ہے تاکہ) یعنی وہ شرک اس لئے کرتے ہیں کہ اللہ نے جو ان کو ڈوبنے سے نجات دے دی اس کا انکار کر دیں۔ یا یہ مطلب ہے کہ شرک کا نتیجہ صرف یہ ہے کہ اللہ کی نعمت کا انکار کریں اور فوری طور پر اس دنیا میں کچھ تمتع اندوز ہو جائیں آخرت میں اس کا کوئی فائدہ نہیں اس کے برخلاف مخلص اہل ایمان کی حالت ہے کہ اللہ جب ان کو نجات عطا فرماتا ہے تو وہ اللہ کی اس نعمت کا شکر ادا کرتے ہیں اور نجات کو مزید طاعت کا ذریعہ بناتے ہیں۔

وَلِيَتَمَتَّعُوا اور (کچھ عارضی) مزے اڑالیں۔

فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ﴿۶۶﴾ لیکن کچھ مدت کے بعد ان کو (اس کا برا انجام) معلوم ہو جائے گا۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا آمِنًا وَيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ

کیا ان اہل مکہ نے نہیں دیکھا کہ ہم نے مکہ کو پر امن حرم بنا دیا ہے (کہ مکہ والوں کو کوئی مکہ کے اندر نہیں لوٹتا اور طرح کی غارت گری سے وہ محفوظ ہیں اور قتل و قید سے امن میں ہیں نہ کوئی قتل کرتا ہے نہ گرفتار کر کے باندی غلام بناتا ہے) حالانکہ ان کے گرد اگرد لوگ اچک لئے جاتے ہیں (لوٹے جاتے ہیں مارے جاتے ہیں۔)

أَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُونَ وَبِنِعْمَةِ اللَّهِ يَكْفُرُونَ ﴿۶۷﴾ کیا باطل پر تو وہ یقین رکھتے ہیں اور اللہ کی نعمت کا ہی انکار کرتے ہیں۔

یعنی اللہ تو ان پر یہ احسان کرتا ہے اور وہ اس کھلی ہوئی نعمت کے بعد باطل پر یعنی بتوں پر یا شیطان پر ایمان رکھتے ہیں۔
اَلْبَاطِلِ سے مراد اللہ کے سوا ہر چیز ہو سکتی ہے (اس وقت باطل کا ترجمہ ہوگا بے حقیقت، بے اصل۔ مترجم) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سب سے اچھا قول لبید کا ہے۔

اَلَا کُلُّ شَیْءٍ مَا خَلَا اللّٰہَ بَاطِلٌ

متنبہ ہو جاؤ کہ اللہ کے سوا ہر چیز بے حقیقت ہے۔
اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں کیونکہ دوسروں کو عبادت میں اس کا شریک قرار دیتے ہیں، بعض علماء کے نزدیک نِعْمَةِ اللّٰهِ سے مراد ہے رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس یا قرآن۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا اور کون شخص زیادہ ظالم ہے اس شخص سے جس نے اللہ پر دروغ تراشی کی یعنی اللہ کا شریک قرار دیا۔

أَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُ یا حق (یعنی رسول ﷺ یا قرآن) کی تکذیب جب حق اس کے پاس آگیا۔

یعنی جوں ہی حق ان کے پاس آیا فوراً بلا سوچے اور بغیر غور کئے سنتے ہی تکذیب کر دی۔

أَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِلْكَافِرِينَ ﴿۶۸﴾ کیا جہنم کے اندر کافروں کا ٹھکانا نہیں ہے یعنی ضرور ہے

یہ استفہام تقریری ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب انہوں نے اللہ پر دروغ بندی کی اور حق کی تکذیب کر دی تو کیا جہنم کے اندر یہ قیام و قرار کے مستحق نہیں ہیں۔ یا یہ مطلب ہے کہ کیا ان کو معلوم نہیں کہ جہنم کے اندر کافروں کی قرارگاہ ہے کہ تکذیب حق اور اللہ پر افتراء بندی کی ان کو جرأت ہوئی۔ پہلے مطلب پر تقریر قیام ہوئی اور دوسرے مطلب پر تقریر جرأت۔

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ اور جن لوگوں نے اپنے مقدور بھر ہماری خوشنودی طلب کرنے ہمارے دین کی مدد کرنے اور ہمارے اوامر و نواہی کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کی ہم ان کو اپنے راستے بتا دیتے ہیں۔

الَّذِينَ جَاهَدُوا جہاد کا معنی ہے مقدور بھر کوشش کرنا۔ مراد یہ ہے کہ جن لوگوں نے اپنی انتہائی طاقت بھر کافروں سے لڑنے اور نفسانی خواہشات کی مخالفت کرنے کی کوشش کی۔

فِينَا ہمارے اندر یعنی ہماری مرضی کی طلب ہمارے دین کی مدد اور ہمارے اوامر و نواہی کی تعمیل کرنے میں۔

سُبُلَنَا اپنے راستوں کی یعنی اپنی بارگاہ تک پہنچنے کے راستوں کی۔ اللہ کی بارگاہ تک رسائی بے کیف ہے (اس کی کیفیت بیان نہیں کی جا سکتی) یا یہ معنی ہے کہ ہم نیکی کے راستے ان کو دکھا دیتے ہیں۔ اور ان راستوں پر چلنے کی توفیق عنایت کر دیتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا ہے وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى اور جو لوگ ہدایت پا لیتے ہیں اللہ ان کی ہدایت میں اضافہ کر دیتا ہے۔

حضرت ابو درداءؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، فرمان کا معنی یہ ہے کہ جو لوگ اپنے جانے ہوئے راستوں پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں ہم ان کو (آگے کے) وہ راستے بتا دیتے ہیں جن کو وہ نہیں جانتے۔

عطاء نے آیت کا یہ مطلب بیان کیا کہ جو لوگ ہماری رضامندی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں ہم ان کو اپنے عطا کردہ ثواب کے راستے بتا دیتے ہیں۔

جنید نے کہا جن لوگوں نے توبہ کی کوشش کی ہم ان کو اخلاص کے راستے بتا دیتے ہیں۔

سفیان بن عیینہ نے کہا جن لوگوں میں اختلاف ہو تو تم سرحد والوں کو دیکھو (یعنی ان کے راستوں پر چلو) کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (گویا آپ کے نزدیک آیت میں جہاد سے مراد کفار سے جہاد کرنا ہے)

حسن نے کہا سب سے اعلیٰ جہاد نفسانی خواہشات کی مخالفت ہے۔

فضیل بن عیاض نے کہا جن لوگوں نے طلب علم میں جہاد کیا ہم ان کو علم کے مطابق عمل کرنے کے راستے بتا دیتے ہیں۔

سہیل بن عبداللہ نے کہا جن لوگوں نے سنت کو قائم کرنے کی کوشش کی ہم ان کو جنت کے راستے بتا دیتے ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جن لوگوں نے ہماری طاعت کی کوشش کی ہم اپنے ثواب کے راستے ان کو بتا دیتے ہیں۔

حدیث شریف میں آیا ہے جو شخص عمل کرتا ہے اس پر جس کو وہ جانتا ہے تو اللہ نامعلوم چیز کا علم اس کو عطا فرما دیتا ہے۔

وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ ۝ اور بلاشبہ اللہ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے یعنی دنیا میں اللہ کی مدد اور اعانت اور آخرت میں ثواب اور مغفرت نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

صوفیہ نے کہا اہل احسان کے ساتھ اللہ ہے لیکن اس کی معیت کی کیفیت ناقابل بیان ہے۔ اہل بصیرت ہی اس کو وجدانی طور پر جانتے ہیں۔

بجائے ضمیر کے لفظ اللہ کی صراحت مفید تاکید ہے۔ واللہ اعلم۔

بحمد اللہ تفسیر مظہری کا سورۂ عنکبوت کی تفسیر کا حصہ ۹ رجب ۱۲۰۶ھ کو ختم ہوا۔

اللہ کریم کا شکر ہے اور اسی کے لئے حمد سزاوار ہے کہ اس نے اپنی رحمت سے سورۂ عنکبوت کی تفسیر مظہری کا ترجمہ پورا کرنے کی توفیق عنایت فرمائی اور ۱۳ ذی الحجہ ۱۳۹۰ھ کو یہ حصہ ختم ہوا۔

اس کے بعد تفسیر سورۂ روم کا ترجمہ آئے گا انشاء اللہ۔

سورة الروم

یہ سورت مکی ہے اس میں ساٹھ آیات ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

ابن ابی حاتم نے ابن شہاب زہری کی روایت سے اور ابن جریر نے عکرمہ اور یحیٰی بن یعمر اور قتادہ کی روایت سے بیان کیا کہ مسلمان جب مکہ میں تھے اور رسول اللہ ﷺ نے ہجرت نہیں کی تھی تو مشرک مسلمانوں سے جھگڑتے تھے اور کہتے تھے کہ تم شہادت دیتے ہو کہ رومی اہل کتاب ہیں لیکن ایران کے مجوسی ان پر غالب آگئے۔ اسی طرح تمہارا خیال ہے کہ تمہارے نبی ﷺ پر کتاب اتاری گئی ہے اور تم اس کتاب کی برکت سے ہم پر غالب آجاؤ گے اگر تمہارا یہ خیال ہے تو بتاؤ رومی تو اہل کتاب ہیں ان پر مجوسی کیسے غالب آگئے۔ پس جس طرح فارس والے رومیوں پر غالب آگئے اسی طرح ہم تم پر غالب آئیں گے۔[1]

الٓمّٓ ۝ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ قریب ترین زمین میں رومی مغلوب ہو گئے۔

اَدْنَی الْاَرْضِ سے مراد ہے سرزمین عرب کا وہ حصہ جو رومیوں کے علاقہ کے قریب ہے یا رومیوں کی وہ سرزمین جو ارض عرب کے قریب ہے۔ الارض میں الف لام عہدی ہے اور عربوں کے نزدیک ارض معہود انہی کی سرزمین تھی (اس لئے اول قول صحیح ہے) یا الْاَرْض میں الف لام مضاف الیہ کے عوض آیا ہے اس لئے دوسرا قول صحیح ہے۔

عکرمہ نے کہا اَدْنَی الْاَرْضِ سے اذرعات اور کسکر مراد ہے (یہ دونوں علاقے شام کے تھے) مجاہد نے کہا ارض جزیرہ مراد ہے (دوسری روایت میں) مجاہد کا قول آیا ہے کہ اردن اور فلسطین مراد ہے۔

وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۝ اور وہ (رومی) مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب آجائیں گے۔

فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ ط چند سال میں۔ بِضْع کا اطلاق تین سے نو تک یا سات تک یا دس سے کم پر ہوتا ہے۔ جوہری نے لکھا ہے کہ دس کے ساتھ (نیز دس سے کم کے لئے) تو لفظ بِضْع اور بِضْعَة کا استعمال ہوتا ہے بیس سے اوپر (کی

---

[1] ترمذی اور حاکم نے اس آیت کے ذیل میں حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے کہ مکہ کے مشرک چاہتے تھے کہ فارس والے رومیوں پر غالب آجائیں کیونکہ اہل فارس بت پرست تھے۔ اور مسلمان پسند کرتے تھے کہ رومی ایرانیوں پر غالب آجائیں کیونکہ رومی اہل کتاب تھے۔ جب رومی مغلوب ہو گئے تو مشرکوں نے بطور طنز حضرت ابو بکرؓ سے اس کا تذکرہ کیا اور حضرت ابو بکرؓ نے رسول اللہ ﷺ سے جا کر اس کا اظہار کیا حضور ﷺ نے فرمایا وہ (رومی) عنقریب غالب آجائیں گے۔ حضرت ابو بکرؓ نے مشرکوں سے یہی بات کہہ دی، مشرکوں نے کہا کوئی مدت مقرر کرو، اگر ہم شرط جیت گئے تو ہم تم سے اتنا اتنا مال لے لیں گے اور تم جیت گئے تو تم ہم سے اتنا اتنا لے لینا۔ غرض فریقین نے پانچ سال کی مدت باہم طے کی لیکن پانچ سال میں رومی غالب نہیں آئے۔ حضرت ابو بکرؓ نے یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا، حضور ﷺ نے فرمایا، تم نے دس سال کے اندر کی مدت کیوں مقرر نہیں کی۔ اس کے بعد رومی غالب آگئے۔ الم غلبت الروم میں اسی کا بیان ہے۔ سفیان نے کہا میں نے سنا ہے کہ رومی بدر کے دن غالب آئے تھے۔ یہ حدیث مختلف متعدد مشہور طریقوں سے حضرت ابن مسعودؓ، حضرت براء بن عازبؓ اور حضرت نیار بن مکرمؓ کی روایات سے بھی آئی ہے۔ (از مفسر رحمۃ اللہ)

انگلیوں پر) اس کا اطلاق نہیں ہوتا، لیکن جوہری کا یہ قول استعمال حدیث کے خلاف ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے اَلْاِیْمَانُ بِضْعٌ وَّسَبْعُوْنَ شُعْبَةً ایمان کی کچھ اوپر ستر شاخیں ہیں۔

بغوی نے لکھا ہے فارس اور روم میں جنگ تھی مشرک دل سے چاہتے تھے کہ اہل فارس رومیوں پر غالب آجائیں کیونکہ فارس والے مجوسی تھے، ان کے پاس کوئی آسمانی کتاب نہیں تھی اور مسلمان چاہتے تھے کہ رومی فتحیاب ہو جائیں کیونکہ رومی اہل کتاب تھے۔ کسریٰ پرویز بن ہرمز بن نوشیرواں نے ایک لشکر روم کی طرف بھیجا جس کی قیادت شہریراز کے سپرد کی اور قیصر نے ایک لشکر حنس کی زیر سرکردگی روانہ کیا دونوں فوجوں کا مقابلہ اذرعات علاقہ شام و بصریٰ کے مقام پر ہوا (یہ شامی علاقہ ارض عرب کے بہت قریب تھا اور حجاز سے بھی قریب تھا) آخر میں فارس والے رومیوں پر غالب آگئے۔ مسلمانوں کو مکہ میں اس کی اطلاع پہنچی تو ان کو بڑا رنج ہوا، اور کفار مکہ اس خبر کو سن کر بہت خوش ہوئے اور مسلمانوں سے کہنے لگے تم بھی اہل کتاب ہو اور عیسائی بھی اہل کتاب ہیں اور ہم امی (یعنی بے کتاب) ہیں، ہمارے فارسی بھائی تمہارے رومی بھائیوں پر غالب آگئے اگر تم ہم سے لڑو گے تو ہم بھی تم پر غالب آئیں گے، اس وقت اس آیت کا نزول ہوا۔ نزول آیت کے بعد حضرت ابو بکرؓ کفار کے پاس گئے اور فرمایا: اب تو تم اپنے بھائیوں کے غالب آجانے سے بہت خوش ہو لیکن واللہ عنقریب رومی فارسیوں پر غالب آجائیں گے، ہمارے نبی ﷺ نے ہم کو اس کی اطلاع دے دی ہے۔ ابی بن خلف جمحی بولا تم جھوٹے ہو، حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا او دشمن خدا تو بڑا جھوٹا ہے، ابی نے کہا، ہمارے درمیان ایک معین مدت کی شرط کر لو میں دس اونٹنیوں کی شرط باندھتا ہوں۔ اگر رومی فارس والوں پر غالب آگئے تو میں تاوان (یعنی دس اونٹنیاں) تم کو دوں گا اور اگر فارس والے رومیوں پر غالب رہے تو تم کو تاوان ادا کرنا ہوگا۔ شرط طے ہو گئی اور تین سال کی میعاد مقرر کر دی گئی۔ حضرت ابو بکرؓ نے خدمت گرامی ﷺ میں حاضر ہو کر یہ واقعہ عرض کر دیا (یہ واقعہ قمار کی حرمت سے پہلے کا ہے) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، میں نے تو یہ نہیں بیان کیا تھا، بضع تو تین سے نو تک ہوتا ہے اب تم مال کی مقدار میں اضافہ کرو اور میعاد بڑھا دو۔ حضرت ابو بکر خدمت گرامی ﷺ سے واپس آئے ابی سامنے دکھائی دیا۔ ابی نے کہا اب تو شاید تم کو پشیمانی ہوئی ہو گی۔ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا، پشیمانی نہیں بلکہ میں تو مال کی مقدار بڑھانا اور میعاد مقررہ میں توسیع کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ سو سو اونٹنیوں کی شرط ہو گئی اور نو سال کی مدت مقرر ہوئی۔ بعض روایات میں سات سال کی میعاد آئی ہے۔ ابی نے کہا میں نے مان لیا۔ کچھ مدت کے بعد ابی بن خلف کو جب یہ اندیشہ ہوا کہ ابو بکر مکہ سے چلے جائیں گے تو آکر آپ سے چمٹ گیا اور بولا مجھے اندیشہ ہے کہ تم مکہ سے چلے جاؤ گے اس لئے اپنا کوئی ضامن دو۔ (کہ جب میں شرط جیت جاؤں تو اس سے مال شرط وصول کر لوں) حضرت ابو بکرؓ نے اپنے بیٹے عبداللہ کو ضامن بنا دیا۔ حضرت عبداللہ ضامن ہو گئے۔

اس کے بعد ابی بن خلف (مسلمانوں کے مقابل) احد کی جنگ میں گیا اور مقابلہ کے وقت رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ سے زخمی ہو کر مکہ میں آکر مر گیا۔ ادھر حدیبیہ کے دن رومی فارس پر غالب آگئے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ بدر کے دن رومیوں کا فارسیوں پر غلبہ ہوا۔ یہ واقعہ یوم شرط سے ساتویں سال کے سرے پر پیش آیا۔

شعبی نے لکھا ہے، یہ مقررہ مدت گزرنے نہیں پائی تھی کہ رومی فارس والوں پر غالب آگئے، اور اپنے گھوڑے مدائن (ایرانیوں کی عراقی راجدھانی) میں لے جا کر باندھ دیئے (حرمت قمار سے پہلے کا یہ قصہ ہے) حضرت ابو بکر جمحی ابی بن خلف سے جیت گئے اور ابی بن خلف کے وارثوں سے آپ نے شرط کا مال وصول کر لیا اور خدمت گرامی ﷺ میں لے کر حاضر ہوئے، حضور ﷺ نے فرمایا، اس کو خیرات کر دو۔ ترمذی نے بھی حضرت ابو بکرؓ کی روایت سے ایسا ہی نقل کیا ہے۔

مسئلہ:۔ حضرت ابو بکرؓ کے اس قصہ سے استدلال کرتے ہوئے امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا کہ دار الحرب میں مسلمانوں اور کافروں کے درمیان تمام عقود فاسدہ جیسے سود کا لین دین وغیرہ جائز ہیں، اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ حربی کافروں کا مال ہر طرح سے لینا جائز ہے بشرطیکہ ذمہ داری کی شکست نہ ہو کافروں کو امان دے کر ان کا مال لینا جائز نہیں۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حسب بیان عکرمہ رومیوں کی فارس والوں پر غالب آنے کی صورت یہ ہوئی کہ شہریراز اور رومیوں پر

غالب آیا اور ان کے شہروں کو روندتا اجاڑتا ہوا خلیج تک پہنچ گیا۔ ایک روز شہریزاد کا بھائی فرخان شہریزاد کے تخت پر بیٹھا شراب پی رہا تھا کہ (مستی کی حالت میں) اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں کسریٰ کے تخت پر بیٹھنے والا ہوں، یہ بات کسریٰ تک پہنچ گئی۔ کسریٰ نے شہریزاد کو لکھا جس وقت میری یہ تحریر تم کو پہنچے فوراً فرخان کا سر کاٹ کر میرے پاس بھیج دو۔ شہریزاد نے جواب میں لکھا بادشاہ سلامت فرخان کے بڑے کارنامے ہیں اور دشمنوں پر اس کی دھاک ہے آپ کو ایسا شخص نہیں ملے گا۔ کسریٰ نے دوبارہ لکھا، فارس میں اور بہت سے لوگ ہیں جو اس سے بہتر ہیں فوراً میرے پاس اس کا سر بھیج دو۔ شہریزاد نے اس کا بھی ایسا ہی جواب لکھ دیا جس سے کسریٰ غضب ناک ہو گیا اور شہریزاد کو پھر کچھ نہیں لکھا بلکہ فوج کے پاس ڈاک سے یہ حکم بھیج دیا کہ میں نے شہریزاد کو ہٹا کر اس کی جگہ تمہارا افسر فرخان کو بنا دیا، پھر ایک چھوٹا سا پرچہ ڈاک لے جانے والے کو الگ سے دے دیا جس میں شہریزاد کو قتل کر دینے کا حکم لکھا ہوا تھا اور ڈاک والے سے کہا جب فرخان حکومت کا چارج لے لے اور اس کا بھائی اس کی اطاعت کرلے تو اس وقت یہ پرچہ فرخان کو دے دینا۔ غرض شاہی حکم ملنے کے بعد شہریزاد نے بسر و چشم اس کو قبول کیا اور تخت سے اتر آیا اس کی جگہ فرخان بیٹھ گیا۔ اس وقت ڈاک والے نے وہ پرچہ فرخان کو دیا، فرخان نے فوراً شہریزاد کو بلوانے کا حکم دیا اور گردن مار دینے کے لئے پیشی میں طلب کیا۔ شہریزاد نے کہا جلدی سے کام نہ لیجئے مجھے اتنی مہلت دیجئے کہ میں وصیت نامہ لکھ دوں۔ فرخان نے کہا اچھا، شہریزاد نے بستہ منگوایا اور اس میں سے تین تحریریں نکال کر دکھائیں اور فرخان سے کہا میں نے آپ کے سلسلے میں کسریٰ سے یہ ساری مراسلت کی تھی اور آپ صرف ایک تحریر ملنے پر مجھے قتل کرانا چاہتے ہیں۔ فرخان نے فوراً اقتدار حکومت شہریزاد کو واپس کر دیا۔

اس کے بعد شہریزاد نے قیصر روم کو لکھا مجھے آپ سے کام ہے لیکن وہ نہ پیام رساں کی معرفت زبانی کہلوایا جا سکتا ہے نہ تحریر اس کو پہنچایا جا سکتا ہے ملاقات ہی ضروری ہے۔ اس لئے میری خواہش ہے کہ آپ پچاس رومیوں کو ساتھ لے کر مجھ سے ملیے میرے ساتھ بھی اس وقت صرف پچاس ایرانی ہوں گے۔ قیصر نے یہ بات مان لی اور پچاس رومیوں کو ساتھ لے کر روانہ ہو گیا لیکن اس کو اندیشہ لگا ہوا تھا کہ شاید شہریزاد نے کوئی فریب کیا ہو اس لئے اپنے آگے آگے اس نے کچھ جاسوس بھیج دیئے۔ تاکہ صحیح اطلاع ہم پہنچائیں۔ جاسوسوں نے آکر کہا کہ شہریزاد کے ساتھ بھی صرف پچاس آدمی ہیں قیصر روم شہریزاد کے جانب چل دیا۔ پھر دونوں کے لئے ایک ریشمی خیمہ لگوایا گیا اور دونوں کی ملاقات اس طرح ہوئی کہ ہر ایک کے پاس خنجر تھا اور دونوں کے درمیان ترجمان تھا، شہریزاد نے کہا آپ کے شہر جن لوگوں نے ویران کئے وہ میں اور میرا بھائی ہیں ہم نے ہی اپنی تدبیر اور بہادری سے آپ کا ملک اجاڑا۔ اس سے کسریٰ کو ہم پر حسد ہو گیا اور اس نے میرے بھائی کو میرے ہاتھ سے قتل کرا دینا چاہا، میں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا تو کسریٰ نے میرے بھائی کو حکم دیا کہ وہ مجھے قتل کر دے ہم دونوں ساتھ پیدا ہوئے ہیں، (اس لئے ایک کے قتل ہو جانے سے دوسرا مر ہی جائے گا) اب ہم آپ کے ساتھ مل کر کسریٰ سے لڑنا چاہتے ہیں...... قیصر نے کہا، تم نے ٹھیک کیا، پھر ایک نے دوسرے سے (اشارۃً) کہا کہ راز دو آدمیوں کے درمیان رہتا ہے جب دو سے آگے بڑھتا ہے تو پھیل جاتا ہے۔ چنانچہ دونوں نے اپنے اپنے خنجروں سے ترجمانوں کو قتل کر دیا۔ اس وقت سے رومیوں کا فارسیوں پر غلبہ ہو گیا اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر رومیوں نے ایرانیوں کو قتل کر دیا۔ کسریٰ بھی مر گیا اور رسول اللہ ﷺ کے پاس اس کی اطلاع صلح حدیبیہ کے روز پہنچی جس کو سن کر مسلمان اور خود حضور ﷺ خوش ہوئے۔ اسی قصہ کی طرف غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِىْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ الخ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

بعض قراءتوں میں غَلَبَتِ الرُّوْمُ وَہُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِہِمْ سَیُغْلَبُوْنَ آیا ہے اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ رومی ارض فارس پر غالب آگئے لیکن اس غلبہ کے بعد عنقریب مغلوب ہوں گے یعنی مسلمان ان پر غالب آجائیں گے چنانچہ غلبۂ روم سے نویں سال مسلمانوں نے جنگ کر کے رومیوں کے کچھ شہر فتح کر لئے اس قراءت کی تائید اس بیان سے ہوتی ہے جو ترمذی نے حضرت ابو سعیدؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ بدر کے دن رومی ایرانیوں پر غالب آگئے اور مسلمان اس سے خوش

ہوئے اس پر آیت الٓمّٓ غُلِبَتِ الرُّوْمُ الخ نازل ہوئی۔

ابن جریر نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے اسی طرح نقل کیا ہے لیکن یہ قرأت شاذ ہے متواتر قرأت اول ہی ہے شاید رسول اللہ ﷺ کو وحی غیر متلو کے ذریعہ یہ بات معلوم ہو گئی ہو کہ اب تو رومی فارسیوں پر غالب آگئے لیکن عنقریب یہ مغلوب ہو جائیں گے۔ اس اطلاع کے بعد حضور ﷺ نے آیت کو اس طرح پڑھ دیا جو حضرت ابو سعیدؓ کی قرأت میں آیا ہے۔

لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ؕ وَیَوْمَىِٕذٍ یَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ۝ بِنَصْرِ اللّٰهِ ؕ پہلے پیچھے اللہ ہی کا حکم چلتا ہے اور اس روز اللہ کی مدد سے یا اللہ کی عنایت کردہ فتح کی وجہ سے مومن خوش ہوں گے۔ یعنی رومیوں کے غالب آنے سے پہلے اور رومیوں کے غالب آنے کے بعد بہر حال اللہ ہی کا حکم نافذ ہے۔ کوئی بات اس کے فیصلے اور اندازے کے بغیر نہیں ہوتی۔

یَوْمَىِٕذٍ یعنی جس روز رومیوں کو فارسیوں پر غلبہ حاصل ہو گا۔

بِنَصْرِ اللّٰهِ کہ اللہ نے اہل کتاب کو ان لوگوں پر فتح عنایت کی جو اہل کتاب نہیں۔ یعنی مومنوں نے جو بات مشرکوں سے کہی تھی اللہ نے اس کو سچ کر دکھایا اور شرط میں ان کو غالب کر دیا اور ان کے یقین و ثبات کو مزید استحکام عطا فرمایا۔

سدی نے کہا رسول اللہ ﷺ کو اس بات سے خوشی ہوئی کہ بدر کی لڑائی میں مسلمان مشرکوں پر غالب آئے اور اہل کتاب کو ان لوگوں پر غلبہ حاصل ہوا جو کتابی نہیں تھا۔

جلال الدین محلی نے کہا رومیوں کی فتح بدر کے دن ہوئی اسی روز مسلمانوں کو حضرت جبرئیلؑ کے ذریعہ سے خبر مل گئی اور مسلمانوں کو دوہری خوشی حاصل ہوئی ایک تو بدر میں مشرکوں پر فتح پا کر دوسری رومیوں کے ایرانیوں پر غلبہ کی خبر پا کر۔

یَنْصُرُ مَنْ یَّشَآءُ ؕ اللہ جس کو چاہتا ہے فتح یاب کرتا ہے۔ یعنی کبھی ایک فریق کو کبھی دوسرے فریق کو۔

وَهُوَ الْعَزِیْزُ اور وہی غالب ہے۔ دوسروں کو غالب کر کے اپنے (بعض) بندوں کو سزا دیتا ہے۔

الرَّحِیْمُ ۝ وہی رحمت والا ہے۔ مغلوبوں کو اپنی رحمت اور فضل سے غالب کر دیتا ہے۔

وَعْدَ اللّٰهِ ؕ اللہ نے پختہ وعدہ کیا ہے کہ مغلوب ہونے کے بعد رومی غالب آئیں گے۔

لَا یُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا، کیونکہ اس کے کلام میں کذب ناممکن ہے۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ لیکن اکثر لوگ (یعنی کفار مکہ اس کے وعدہ کو اور وعدہ کی سچائی کو) نہیں جانتے۔

یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚۖ یہ لوگ دنیا کے صرف ظاہر کو جانتے ہیں یعنی اپنے امور معاش سے واقف ہیں کہ کیسے کمائی کریں کیسے تجارت کریں کیسے کھیتی باڑی کریں وغیرہ۔

وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ۝ اور آخرت کی طرف سے وہ بالکل غافل ہیں یعنی ان کے دلوں میں آخرت کا خیال بھی نہیں آتا، دوسرا هُمْ پہلے هُمْ کی تاکید ہے۔ اس جملہ سے سابق جملہ لَا یَعْلَمُوْنَ کی تاکید ہو رہی ہے گویا کافروں کو جانوروں سے تشبیہ دی جن کو دنیا کی چیزوں کا ظاہری علم بھی پورا نہیں ہوتا صرف بعض چیزوں کا ہوتا ہے۔ اشیاء حقیقت، خصوصیات، نتائج، اسباب، افعال اور صفات، افعال کا اسباب سے صدور اور کیفیت صدور نیز اشیاء میں تصرفات، ناقص طور پر کسی قدر جانور جانتے ہیں اسی لئے ظاہرًا کو بصورت نکرہ ذکر کیا مراد دنیا کا اندرونی علم، یعنی یہ جاننا کہ دنیا آخرت کی گزرگاہ ہے، حصول آخرت کا ذریعہ ہے اور احوال آخرت کا نمونہ ہے اس سے تو جانور قطعاً ناواقف ہیں اسی طرح کافر بھی اس علم سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ آیت سے یہ بات مترشح ہو رہی ہے کہ دنیا کا ظاہری کچھ علم عدم علم کی طرح (بے مقدار) ہے۔

اَوَلَمْ یَتَفَكَّرُوْا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ ۫ کیا انہوں نے اپنے نفسوں میں غور نہیں کیا۔

یعنی کیا انہوں نے اپنے علم کو صرف ظاہری دنیا پر منحصر رکھا اور دلوں کے اندر باطن پر غور نہیں کیا کہ ان پر دنیا کے اندرونی گوشوں کا انکشاف ہوتا یا یہ مطلب ہے کہ انہوں نے کیا اپنے نفسوں کے متعلق غور نہیں کیا باوجودیکہ ان کے نفوس ان سے اتنے قریب ہیں کہ دوسری کوئی چیز اتنی قریب نہیں، اپنے نفس کے اندر غور کرنے والے کو وہ انکشافات ہوتے ہیں جو سارے عالم امکان پر غور کرنے والے کو ہوتے ہیں۔ انسان عالم صغیر ہے (اور عالم کبیر کا نمونہ ہے) اگر وہ اپنے دلوں میں غور کرتے تو ان کو معلوم ہو جاتا اور وہ کہہ اٹھتے کہ۔

مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى

اللہ نے آسمان و زمین اور ان کی درمیانی کائنات کو برحق ہی پیدا کیا ہے (یعنی حکمت و مصلحت کے ساتھ پیدا کیا ہے) اور یہ مقررہ مدت (بقاء) کو (اپنے ساتھ) لئے ہوئے پیدا کئے گئے ہیں یعنی بے کار لاحاصل بغیر کسی کامل حکمت کے نہیں پیدا کئے اور ان کی تخلیق دوامی نہیں ہے بلکہ ان کا ایک خاص مدت کے لئے ہے اس کے بعد قیامت آجائے گی اور حساب فہمی کا وقت آپہنچے گا اور سزا دی جائے گی۔ اللہ نے فرمایا اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ۔ کیا تم یہ خیال کئے ہوئے ہو کہ ہم نے تم کو فضول پیدا کیا اور ہماری طرف تم کو نہیں لوٹایا جائے گا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر اللہ کی طرف بازگشت نہ ہو اور اللہ سب کو یوں ہی چھوڑ دے تو تخلیق بے کار بے لاحاصل ہے۔

نظام عالم پر غور کرنے والے جانتے ہیں کہ اس کا خالق حکیم ہے اور حکیم بے کار کام نہیں کرتا۔ تخلیق عالم کی حکمت خالق کی ذات و صفات کی معرفت ہے۔ اب اگر قیامت نہ آئے اور جزاء سزا نہ ملے تو عارف و کافر دونوں برابر ہیں۔ اس کائنات پر غور کرنے والا ہی آخرت کو جانتا ہے اور علم آخرت حاصل ہونے کے بعد اس کے دل سے غفلت دور ہو جاتی ہے۔

وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ ۞　　اور بہت آدمی (یعنی کفار مکہ اپنی حماقت اور عدم تدبر کی وجہ سے) اپنے رب سے ملنے (یعنی دنیا کے ختم ہونے کے بعد جزاء سزا پانے) کے بلاشبہ منکر ہیں۔

یعنی وہ خیال کرتے ہیں کہ دنیا ہمیشہ رہے گی نہ قیامت ہوگی نہ حساب کتاب نہ جزاء سزا۔

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ

(کیا کفار مکہ، مکہ سے باہر نہیں نکلے) اور ملک میں چل پھر کر انہوں نے نہیں دیکھا کہ ان سے پہلے والے (کفار) کا انجام کیسا (عبرت انگیز) ہوا یعنی یہ لوگ باہر سفر پر گئے ہیں اور انہوں نے دیکھ لیا ہے کہ ان سے پہلے والے کفار جنہوں نے پیغمبروں کی تکذیب کی تھی۔ تکذیب انبیاء کی ہی وجہ سے تباہ کر دیے گئے پچھلے کافروں کے فرسودہ نشانات یہ دیکھ چکے ہیں۔

كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاَثَارُوا الْاَرْضَ وَعَمَرُوْهَآ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا

وہ لوگ ان سے زیادہ قوت والے تھے انہوں نے زمین کو الٹ کر رکھ دیا اور ان سے زیادہ زمین کو آباد کیا تھا، (بڑی بڑی اونچی عمارتیں بکثرت بنائی تھیں) زمین کو الٹنے کا یہ مطلب ہے کہ پانی نکالنے، معادن برآمد کرنے اور کھیتی کرنے کے لئے انہوں نے زمین کو کھود اتھا۔

اہل مکہ ایسی زمین پر آباد تھے جہاں کوئی کھیتی باڑی نہیں ہو سکتی تھی بالکل وادی غیر ذی زرع تھی۔ ادھر ادھر ان کا پھیلاؤ نہ تھا۔ آیت میں ایک طرح کا طعن ہے مکہ والوں پر کہ وہ دنیا پر ریجھے ہوئے ہیں فریفتہ ہیں، غرور سے سرمست ہیں باوجودیکہ ان کا حال کمزور ہے۔ دنیا کی فراخی ان کو حاصل نہیں۔ دنیا نام ہے وسعت ملک کا، تسلط عام کا تعمیرات کی کثرت کا اور ان کو کچھ بھی میسر نہیں ان کی کھیتی میں کسی چیز کی پیداوار نہیں اگر موسم سرما و گرما میں یمن و شام کا سفر نہ کریں اور وہاں سے غلہ کپڑا نہ لائیں تو بھوکے ننگے مرجائیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود اپنی حقیر دنیا پر پھولے نہیں سماتے۔

وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ　　اور ان کے پاس ان کے پیغمبر کھلے معجزات لے کر پہنچے۔

لیکن انہوں نے پیغمبروں کی تکذیب کی ان کو جھوٹا قرار دیا آخر اللہ نے ان کو تباہ کر دیا مٹا دیا۔

فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ سو اللہ ایسا تو نہیں کہ ان پر ظلم کرتا (اور بے قصور ان کو تباہ کر دیتا) بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے (کہ ہلاکت میں خود انہوں نے اپنے آپ کو ڈال دیا)۔

ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰى پھر (یعنی تباہی اور ہلاکت کے بعد) ان لوگوں کا انجام جنہوں نے بدی کی تھی بہت برا ہوا۔

اَلسُّوْٓاٰى اَسْوَءُ کا مونث ہے اور اَسْوَءُ اسم تفضیل ہے جیسے حُسْنٰی اَحْسَن کا مونث ہے یعنی بدترین عذاب یا بُشْرٰی کی طرح سُوْٓاٰى مصدر ہے بطور مبالغہ صیغہ صفت کی جگہ استعمال کیا گیا ہے۔ بعض کے نزدیک جہنم کے ناموں میں سے ایک نام ہے جیسے جنت کے ناموں میں سے حسنی ایک نام ہے۔

اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ اس وجہ سے کہ انہوں نے اللہ کے احکام کو جھٹلایا تھا اور ان کی ہنسی اڑایا کرتے تھے۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ان بدکاروں کا انجام برا ہوا انہوں نے اللہ کے احکام کی تکذیب کی۔ یعنی بدکاریوں نے ان کو اس بات پر آمادہ کر دیا کہ وہ اللہ کے احکام کے منکر ہو گئے۔

حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا مومن جب گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر سیاہی کا ایک نکتہ پیدا ہو جاتا ہے پھر اگر وہ توبہ کر لیتا ہے اور گناہ سے نکل آتا ہے اور مغفرت کا طلبگار ہو جاتا ہے تو (دل سے وہ سیاہ نکتہ دور ہو جاتا ہے)۔ دل صاف ہو جاتا ہے اور اگر مزید گناہ کرتا ہے تو سیاہی کا نکتہ بھی بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ (پورے) دل پر سیاہی چڑھ جاتی ہے یہی وہ زنگ ہے۔ جس کا ذکر اللہ نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ اور فرمایا كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ بلکہ جو اعمال وہ کرتے تھے ان کا زنگ ان کے دلوں پر چڑھ گیا۔ رواہ احمد والترمذی والنسائی۔

یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ان گناہ گاروں کا انجام یہ ہوا کہ اللہ نے ان کے دلوں پر چھاپ لگا دی یہاں تک کہ انہوں نے اللہ کے احکام کی تکذیب کی۔

اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ اللہ ہی مخلوق کو اول بار بھی پیدا کرتا ہے پھر وہی دوبارہ بھی اس کو پیدا کرے گا پھر اسی کے پاس واپس لائے جاؤ گے۔

اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ یعنی اللہ ہی شروع میں پیدا کرتا ہے۔

ثُمَّ يُعِيْدُهٗ پھر مرنے کے بعد وہی زندہ کر کے اٹھائے گا۔

ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ پھر جزاء کے لئے اسی کی طرف سب کو لوٹ کر جانا ہو گا۔

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝ اور جس روز قیامت برپا ہو گی (اس روز) مجرم ناامید ہوں گے۔

قتادہ اور کلبی نے کہا ہر بھلائی سے ناامید ہوں گے۔ مجاہد نے کہا رسوا ہوں گے۔ فراء نے کہا ان کا کلام اور عذر منقطع ہو جائے گا۔

صاحب قاموس نے لکھا ہے بَلَسٌ وہ شخص جس میں کوئی بھلائی نہ ہو۔ مُبْلِس وہ شخص جو اپنے دل کی بات دل میں گھونٹ رکھے اور چپ ہو۔ اَبْلَسَ ناامید ہو گیا۔ ہکابکا ہو گیا اسی سے لفظ ابلیس بنا ہے۔ یا ابلیس عجمی لفظ ہے۔ جزری نے النہایہ میں لکھا ہے کہ غم یا خوف کی وجہ سے جو شخص خاموش ہو اس کو مُبْلِس کہا جاتا ہے۔ اِبْلَاس متحیر ہونا۔

وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآئِهِمْ شُفَعٰٓؤُا اور جن کو انہوں نے اللہ کا شریک بنا رکھا ہے ان میں سے کوئی بھی ان کا سفارشی نہ ہو گا۔

یعنی اللہ کی عبادت میں جن کو انہوں نے اس خیال سے شریک قرار دے لیا تھا کہ وہ معبود ان کی سفارش کریں گے اور

اللہ کے عذاب سے بچالیں گے تو (ان کا یہ خیال غلط نکلے گا اور) کوئی شریک بھی ان کی شفاعت نہیں کرے گا۔ چونکہ آنے والا یہ واقعہ یقینی ہے اس لئے بصیغہ ماضی بیان کیا۔

وَكَانُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ كٰفِرِيْنَ ۝ اور وہ اپنے (بنائے ہوئے) شرکاء کے منکر ہو جائیں گے۔

یعنی شفاعت سے نراس ہو جائیں گے تو اپنے معبودوں کا انکار کر دیں گے۔ بعض اہل تفسیر نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ دنیا میں وہ اپنے ان شرکاء کی وجہ سے کافر ہوئے تھے۔

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ ۝ اور جس روز قیامت برپا ہوگی اس روز (لوگ) فریق فریق ہو جائیں گے۔ مقاتل نے کہا حساب کے بعد فریق فریق ہو جائیں گے۔ مومنوں کو جنت کی طرف اور کافروں کو دوزخ کی طرف بھیج دیا جائے گا پھر یہ دونوں فریق کبھی جمع نہیں ہوں گے۔ اس کی تفصیل اگلی آیت میں کی گئی ہے۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ ۝

سو جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے وہ باغ میں مسرور ہوں گے۔

فِيْ رَوْضَةٍ یعنی جنت کے چمن میں جہاں نہریں بہتی ہوں گی اور پھول کھلے ہوں گے۔

يُحْبَرُوْنَ کا ترجمہ حضرت ابن عباسؓ نے کیا ان کی عزت کی جائے گی۔ مجاہد اور قتادہ نے کہا عیش میں ہوں گے۔ ابو عبیدہ نے کہا وہ خوش ہوں گے۔ حَبْرَۃٌ کا معنی ہے خوشی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ حَبْرَۃٌ ہر اچھی نعمت کو کہتے ہیں اور تحبیر کا معنی ہے خوبصورت بنا دینا (آراستہ کرنا) جزری نے نہایہ میں لکھا ہے حَبْرَۃٌ بفتح حاء نعمت اور خوش حالی۔ حِبرۃ بکسر حاء نیز بفتح حاء خوبصورتی اور حسن شکل۔ صاحب قاموس نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضرت ابو موسیٰ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ حضور میری قرأت کو سن رہے ہیں تو میں تحبیر سے کام لیتا، یعنی مزید خوش آواز سے پڑھتا۔

بغوی نے بروایت اوزاعی یحییٰ بن کثیر کا قول نقل کیا ہے کہ يُحْبَرُوْنَ جنت کے آسمان کا نام ہے۔ ہناد اور بیہقی کی روایت میں بھی یحییٰ بن کثیر کا یہ قول آیا ہے۔

اوزاعی کا بیان ہے جب وہ گانا شروع کرتا ہے تو جنت کا کوئی درخت بغیر سرسبز ہوئے نہیں رہتا۔ یہ بھی امام اوزاعی کا بیان ہے کہ اللہ کی کوئی مخلوق اسرافیل سے زیادہ خوش آواز نہیں جب وہ گانا شروع کرتا ہے تو ساتوں آسمانوں کے رہنے والوں کی نماز اور تسبیح ختم ہو جاتی ہے۔

ابن عساکر نے اوزاعی کا بیان نقل کیا ہے يُحْبَرُوْنَ گانا ہے جب جنت والے کچھ طرب حاصل کرنا چاہتے ہیں (یعنی گانا سننا چاہتے ہیں) تو اللہ جنت کی ہوا کو جس کو مثاقہ کہا جاتا ہے حکم دیتا اور مثاقہ حسب الحکم تازہ موتیوں کے نیستاں میں داخل ہو کر اس کو حرکت دیتی ہے اور نیستاں کے درخت باہم لگ کر بجتے ہیں جس سے اہل جنت کو سماع کا لطف آتا ہے جب وہ درخت بجتے ہیں تو جنت کا ہر درخت ورق پوش ہو جاتا ہے۔

طبرانی اور بیہقی نے حضرت ابو امامہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو بندہ بھی جنت میں داخل ہوگا اس کے سرہانے اور پائنتی دو (دو) حوریں بیٹھی ایسی خوش آوازی سے گائیں گی جو کسی جن یا انسان نے نہ سنی ہو گی وہ شیطانی گانا نہ ہوگا بلکہ اللہ کی حمد و تقدیس ہوگی۔

میں کہتا ہوں گانے سے اور شعر سے اس دنیا میں لذت اندوزی کے لئے تین باتوں کی ضرورت ہے اشعار میں محبوب کا ذکر ہو، کلام موزوں ہو، آواز میں حسن ہو، لیکن جنت والوں کے لئے اللہ سے بڑی مرغوب تو کوئی چیز نہ ہوگی اس کے جمال سے زیادہ کسی کا حسن بھی نہیں ہے اس لئے جب اس کے دیدار سے بہرہ ور ہوں گے تو اسی کی یاد خوش الحانی کے ساتھ سن کر لذت اندوز ہوں گے۔

بعض احادیث میں آیا ہے کہ غزالہ چشم حوریں اپنے شوہروں کے سامنے ایسی حسین آوازوں سے گائیں گی جن کی مثل کسی نے کوئی گانا کبھی نہ سنا ہوگا۔ روایت میں آیا ہے کہ منجملہ دوسرے کلام کے یہ اشعار بھی گائیں گی (ترجمہ: ہم سب سے اعلیٰ ہیں، ہم عزت والے لوگوں کی بیبیاں ہیں، ہم ہمیشہ رہیں گی، کبھی نہیں مریں گی، ہم امن میں رہیں گی، ہم کو کسی بات کا ڈر نہ ہوگا، ہم یہاں مقیم رہیں گی، کبھی یہاں سے کوچ نہیں کریں گی۔ امام احمد نے الزہد میں مالک بن دینار کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ حضرت داؤدؑ سے فرمائے گا اسی خوش آوازی کے ساتھ میری مجد بیان کرو، داؤد ایسی آواز سے گانا شروع کر دیں گے جو جنت کی ساری نعمتوں پر غالب آجائے گی۔

اصبہانی نے حضرت ابوہریرہؓ کی مرفوع روایت نقل کی ہے کہ اللہ جنت کے درخت کو حکم دے گا کہ میرے ان بندوں کو گانا سنا جنہوں نے میری یاد میں تمام گانوں اور باجوں کو چھوڑ رکھا تھا۔ درخت اللہ کی تسبیح و تقدیس ایسی آواز سے گائے گا جس کی مثل کسی مخلوق نے کبھی نہیں سنی ہوں گی۔

اس موضوع کی احادیث بکثرت ہے۔ حکیم نے نوادر الاصول میں حضرت ابوموسیٰؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جس نے (دنیا میں) گانے کی آواز سنی اس کو روحانیات کی آواز سننے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ عرض کیا گیا رسول اللہ ﷺ روحانی کون؟ فرمایا اہل جنت کے سامنے پڑھنے والے۔

دینوری نے مجاہد کا بیان نقل کیا ہے کہ جو لوگ اپنی آوازوں کو اور کانوں کو بیہودہ گانوں اور شیطانی مزامیر سے پاک رکھتے ہیں قیامت کے دن اللہ ان کو مشکی باغوں میں قیام پذیر کرے گا اور فرشتوں کو حکم دے گا میرے بندوں کو میری ثناء و مجد سناؤ اور ان کو اطلاع دے دو کہ آئندہ ان کو نہ کسی طرح کا خوف ہوگا نہ یہ غمگین ہوں گے۔ دیلمی نے حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت سے بھی یہ بیان اسی طرح نقل کیا ہے۔

وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَلِقَاءِ الْآخِرَةِ فَأُولَٰئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُونَ ۝

اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیتوں کو اور آخرت کے پیش آنے کو جھٹلایا تھا وہی لوگ عذاب میں گرفتار ہوں گے۔

آخرت سے مراد ہے قبروں سے زندہ ہو کر اٹھ کھڑا ہونا۔ مُحْضَرُونَ یعنی عذاب میں داخل کئے جائیں گے عذاب سے کبھی غیر حاضر نہیں ہوں گے۔

فَسُبْحَانَ اللَّهِ حِينَ تُمْسُونَ وَحِينَ تُصْبِحُونَ ۝ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَعَشِيًّا وَحِينَ تُظْهِرُونَ ۝

سو تم اللہ کی پاکی بیان کرو جیسی اس کے لئے زیبا ہے شام کے وقت اور صبح کے وقت اور تمام آسمانوں میں اور زمین میں اسی کی حمد ہوتی ہے اور (پاکی بیان کرو) پچھلے پہر اور ظہر کے وقت۔

فَسُبْحَانَ اللَّهِ فعل محذوف کا مفعول مطلق (بیان نوع کے لئے) ہے اور فاء کا ما بعد نتیجہ ہے ما قبل کا یعنی اللہ ہی جب خالق اول اور معید آخر ہے تو اسی کی تسبیح بیان کرو۔ تسبیح سے نماز مراد ہے۔

حِينَ تُمْسُونَ - جب تم وقت شام میں داخل ہو جاتے ہو اس سے مراد مغرب کی نماز ہے تاریخ اور مہینوں کا حساب کرنے کے لئے شرعاً رات پہلے آتی ہے جس کا آغاز مغرب سے ہوتا ہے اس لئے نماز مغرب کا پہلے ذکر کیا۔ اللہ کے فضل سے دن سلامتی سے گزر گیا اور اللہ نے اپنی فطری (عام اور خصوصی) نعمتوں سے بہرہ اندوز کیا اور رات خیر و عافیت کے ساتھ آگئی اس لئے ادائے شکر کے لئے نماز پڑھنی لازم ہے۔

وَحِينَ تُصْبِحُونَ اور جب تم صبح کرتے ہو یعنی فجر کی نماز پڑھو رات سلامتی اور چین سے گزر گئی اور دن کسب معاش و معاد کے لئے آگیا۔ مغرب کے مقابلہ میں صبح کا ذکر کیا کیونکہ شام و صبح کا باہم تقابل فطری ہے۔

وَلَهُ الْحَمْدُ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا، آیت کی مراد یہ ہے کہ تمام باشندگان ارض و سماء اللہ کی حمد (تکوینی طور پر،

حتر جم) کرتے اور اسی کی عبادت کرتے ہیں۔

وَعَشِيًّا اور پچھلے پہر، آخر نہار، اس سے مراد ہے عصر کی نماز۔ عَشِيَ الْعَيْنُ آنکھ کی روشنی کم ہو گئی (اس وقت سورج کی بھی روشنی گھٹ جاتی ہے) یہ وقت بازاری کاروبار اور مشاغل میں معروف ہونے کا زیادہ ہوتا ہے اس لئے دنیوی مشاغل میں غرق نہ ہو جانا چاہئے بلکہ نماز پڑھنا بھی ضروری ہے تاکہ تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد سے غافل نہ بنادے۔ نماز عصر صلوٰۃ وسطیٰ (درمیانی نماز) ہے۔

وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ اور جب دوپہر کے وقت میں داخل ہوتے ہو یعنی سورج کی گرمی کا غلبہ ہوتا ہے (ظہر کے بعد اگر لفظ علیٰ آئے تو غلبہ کا معنی ہوتا ہے ظہر کو ظہر کہنے کی یہی وجہ ہے) اور جہنم کی گرمی کی یاد دلاتا ہے۔

اوقات مذکورہ کو نماز کے لئے اس لئے مخصوص کر دیا کہ ان اوقات میں اللہ کی قدرت کا ظہور ہوتا ہے۔ اللہ کی نعمتوں کی تجدید ہوتی ہے۔ ان اوقات میں ہم کو آفاقی ثبوت ملتا ہے اللہ کی پاکی اور ہر عیب و نقص سے منزہ ہونے کا اور اہل ارض و سماء کی طرف سے اللہ کا شکر ادا کرنے اور اسی کی حمد کرنے کا۔ آیت مذکورہ میں صرف چار نمازوں کا ذکر کیا (عشاء کا ذکر نہیں کیا) بعض اہل علم کے نزدیک تُمْسُوْنَ سے مغرب و عشاء دونوں کی طرف اشارہ ہے۔ ابن جریر طبرانی اور حاکم نے حضرت ابن عباسؓ کی طرف اس قول کی نسبت کی ہے کہ آیت میں پانچوں نمازوں کا ذکر ہے۔ تُمْسُوْنَ سے مغرب و عشاء دونوں مراد ہیں۔

بغوی نے لکھا ہے کہ نافع بن ازرق نے حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا کیا پانچوں نمازوں کا ذکر قرآن مجید میں کہیں ہے فرمایا ہاں پھر یہی دونوں آیتیں پڑھ دیں اور فرمایا یہ آیت پانچوں نمازوں اور ان کے اوقات کو حاوی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص صبح کو سُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ سے وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ تک پڑھے گا۔ اس سے رات میں جو کچھ فوت ہو گیا ہے (یعنی گناہ ہو گیا ہے) اس کا تدارک ہو جائے گا اور جو شخص شام کو پڑھے گا تو دن میں فوت شدہ امر کا تدارک ہو جائے گا۔

ثعلبی نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص چاہتا ہو کہ اس کو پورا پورا ناپ (یعنی کامل بھرپور ثواب) دیا جائے وہ پڑھے فَسُبْحَانَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ الخ۔

حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص رات دن میں سو مرتبہ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ پڑھے گا اس کے سارے گناہ ساقط کر دیئے جائیں گے خواہ سمندر کے جھاگوں کے برابر ہوں۔ متفق علیہ۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص صبح شام سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سو مرتبہ پڑھے گا قیامت کے دن اس سے بڑھ کر کوئی عمل اور کوئی نہیں لائے گا سوائے اس شخص کے جس نے اسی کی طرح پڑھا ہو یا اس سے زائد پڑھا ہو۔ متفق علیہ۔

رواہ ابوہریرہؓ

حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو کلمے ہیں جو زبان پر ہلکے ہیں (آسانی کے ساتھ ادا ہو جاتے ہیں) میزان میں (یعنی میزان قیامت میں یا وزن میں) بھاری ہوں گے رحمٰن کو پیارے ہیں سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم۔[1] متفق علیہ۔

حضرت جویریہ بنت الحارثؓ جن کا نام برہ تھا مسجد میں تھیں رسول اللہ ﷺ ان کے پاس سے ایک صبح کو اٹھ کر مسجد سے

---

[1] حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے ایک روز فرمایا الحمد للہ کو تو ہم جانتے ہیں لوگ ایک دوسرے کی تعریف کرتے ہیں اور لا الہ الا اللہ کو بھی ہم جانتے ہیں اللہ کے سوا جن کی پوجا ہوتی ہی تھی اور اللہ اکبر کو بھی جانتے ہیں نمازی تکبیر کہتا ہی ہے لیکن سبحان اللہ کا کیا مطلب ہے۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا اللہ اعلم۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اگر عمرؓ اتنا بھی نہ جانے کہ اللہ اعلم ہے تو بڑا بدنصیب ہے (یعنی اللہ کا عالم کل ہونا تو میں بھی جانتا ہوں) حضرت علیؓ نے فرمایا امیر المومنین یہ ایسا نام ہے کہ اس کو کوئی مخلوق اپنے لئے استعمال نہیں کر سکتی۔ ساری مخلوق کا اسی کی طرف رجوع ہے اسی کے واسطے یہ کلمہ کہنا واجب ہے۔ (از مفسر رحمۃ اللہ علیہ)

باہر چلے گئے پھر دن چڑھے واپس تشریف لائے اور فرمایا جب سے میں یہاں سے گیا ہوں اس وقت سے اب تک تم یہیں بیٹھی (وظیفہ پڑھ رہی) ہو۔ حضرت جویریہؓ نے کہا جی ہاں۔ فرمایا، میں نے تو تمہارے پاس سے جانے کے بعد چار کلمے تین بار پڑھے تھے اگر تمہارے (وظیفہ کے) الفاظ سے ان کا موازنہ کیا جائے تو وہ بھاری پڑیں گے (چار کلمے یہ ہیں) سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ عَدَدَ خَلْقِہٖ وَ رِضَاءَ نَفْسِہٖ وَزِنَۃَ عَرْشِہٖ وَ مِدَادَ کَلِمَاتِہٖ۔ رواہ مسلم۔

حضرت سمرہ بن جندبؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، سب سے بڑھیا چار جملے ہیں، سبحان اللہ اور الحمد للہ اور لا الہ الا اللہ اور اللہ اکبر

دوسری روایت میں آیا ہے کہ اللہ کو سب سے پیارے جملے چار ہیں۔ سبحان اللہ اور الحمد للہ اور لا الہ الا اللہ اور اللہ اکبر جس سے شروع کرو کوئی حرج نہیں (یعنی ترتیب ضروری نہیں ہے) رواہ مسلم۔

حضرت ابوذرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا سب سے افضل کونسا کلام ہے فرمایا (افضل کلام) وہی ہے جو اللہ نے اپنے فرشتوں کے لئے پسند فرمایا ہے (یعنی ملائکہ پڑھتے ہیں) سبحان اللہ وبحمدہ رواہ مسلم۔ حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے سبحان اللہ العظیم وبحمدہ کہا اس کے لئے جنت کے اندر ایک درخت خرما بو دیا گیا (یعنی جنت کے درختوں میں سے ایک درخت ان الفاظ کا بھی ہو گا)۔ رواہ الترمذی۔

یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَیُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وہ نکالتا ہے جاندار کو بے جان سے (جیسے انسان کو نطفہ سے اور پرندہ کو انڈے سے) اور نکالتا ہے بے جان کو جاندار سے (یعنی نطفہ اور انڈے کو حیوان سے) مطلب یہ کہ زندگی کے پیچھے موت اور موت کے پیچھے زندگی لاتا ہے۔ موت و حیات کا تبادل کرتا ہے۔

وَیُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِہَا اور زمین کو (سبزہ پیدا کر کے) زندہ کرتا ہے اس کے مرنے (یعنی خشک ہو جانے) کے بعد۔

وَکَذٰلِکَ تُخْرَجُوْنَ ﴿۱۹﴾ اور اسی طرح تم مرنے کے بعد زندہ کر کے قبروں سے نکالے جاؤ گے۔ یعنی جب تم مشاہدہ کر رہے ہو کہ بے جان کو اللہ جاندار بنا کر نکالتا ہے تو پھر مردوں کو زندہ کر کے قبروں سے اٹھائے جانے کا تم کیوں انکار کرتے ہو۔ یُخْرِجُ الْحَیَّ سے پورا کلام وقوع قیامت کی دلیل ہے۔

وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَکُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ﴿۲۰﴾

اور اللہ کی نشانیوں میں سے (یعنی اس امر کے دلائل میں سے کہ اللہ قیامت برپا کرنے پر قادر ہے) یہ بات ہے کہ اس نے تم کو (یعنی تمہاری اصل بنیاد آدم کو) خاک سے بنایا۔ پھر کچھ ہی مدت کے بعد تم آدمی بن کر پھیلے ہوئے پھرتے ہو۔

یعنی پہلے تم بالکل جماد تھے نہ تمہارے اندر حس تھی نہ حرکت بس مٹی تھے پھر اللہ نے تم کو انسان بنا دیا اور یکدم تم انسان ہو کر زمین پر پھیل گئے۔

وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْہَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً

اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہارے واسطے تمہاری جنس کی بیویاں بنائیں تاکہ تم کو ان کے پاس آرام ملے اور تم (میاں بیوی) میں محبت اور ہمدردی پیدا کی۔

مِنْ اَنْفُسِکُمْ میں مِنْ ابتدائیہ ہے کیونکہ حضرت حواؑ کو حضرت آدمؑ کی پسلی سے پیدا کیا پھر مردوں کے نطفہ سے عورت کو پیدا کرنے کا سلسلہ جاری کیا۔ یا مِنْ بیانیہ ہے کیونکہ عورتیں بھی مردوں ہی کی جنس سے ہیں کسی اور حیوان کی جنس سے نہیں ہیں۔

لِتَسْکُنُوْٓا یعنی تم عورتوں کی طرف مائل ہو اور ان سے انسیت کرو۔ اتحاد جنسیت موجب انسیت ہے اور اختلاف جنسیت باعث نفرت۔

بَيْنَكُمْ ۔ تمہارے درمیان یعنی مردوں اور عورتوں کے درمیان یا افرادِ جنس کے درمیان۔
مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً یعنی صنفی خواہش کے غلبہ کے وقت ازدواجی تعلق قائم کرنے کے ذریعہ سے۔ تمہارے اندر اللہ نے باہم محبت اور شفقت پیدا کر دی تاکہ معاشی نظم درست ہو جائے یا باہمی رحمت و محبت کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس پر تعاون موقوف ہے اور باہمی تعاون پر انسانی معیشت کا مدار ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱﴾ بلاشبہ اس میں (اللہ کی حکمت و قدرت میں) غور کرنے والوں کے لئے بہت نشانیاں ہیں کہ وہ جانتے ہیں کہ اس میں کیا حکمت ہے اور تناسل کا سلسلہ اس سے کس طرح جاری ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ﴿۲۲﴾ اور اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کرنا اور تمہاری بولیوں کا اور رنگوں کا مختلف ہونا اس میں بڑی نشانیاں ہیں اہل عالم کے لئے۔

اِخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ سے مراد ہے زبانوں اور بولیوں کا اختلاف۔ اللہ نے ہر قوم کو ایک خاص زبان سکھادی اور اس میں خاص الفاظ القاء کردیئے اور اس زبان کے بولنے پر اس کو قدرت عطا کی یا زبانوں کے اختلاف سے مراد ہے بولنے کے طریقوں کا اور آوازوں کی کیفیتوں کا اختلاف کہ ایک کی آواز دوسرے سے الگ ہے ایک کا دوسرے سے اشتباہ نہیں ہوتا۔

اَلْوَانِكُمْ سے مراد ہے جلد، بدن کے رنگ کا اختلاف کسی کا رنگ کالا ہے کسی کا گورا وغیرہ۔ یا اختلاف الوان سے مراد ہے ہر شخص کے اعضاء کی تشخص، اعضاء کی ہیئت، اعضاء کی ساخت، اعضاء کے رنگ اور حلیہ کا اختلاف۔ یہ اختلاف ایسا ہے کہ کوئی دوسرے کے کامل مشابہ نہیں۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ یعنی ہر ذی عقل کے لئے اس میں قدرت خدا کی نشانیاں ہیں نہ کسی فرشتہ سے یہ پوشیدہ ہیں نہ جنات سے نہ انسانوں سے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَاۗؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿۲۳﴾ اور اسی کے نشانہائے قدرت میں سے ہے، تمہارا رات کو اور دن کو سونا اور اللہ کے فضل کو (رات میں اور دن میں) طلب کرنا اس میں بہت نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو (بصیرت اور فہم کے کانوں سے) سنتے ہیں۔

اِبْتِغَاۗؤُكُمْ کا مفعول محذوف ہے یعنی معاش و معاد کو طلب کرنا۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ نفسانی قوتوں کے آرام اور طبعی قوتوں کو قوی بنانے کے لئے رات میں اور دن میں تمہارا سو جانا اللہ کی حکمت اور قدرت کی نشانی ہے۔

یا یہ مطلب ہے کہ رات میں تمہارا سونا اور دن میں روزی کو طلب اور تلاش کرنا قدرت و مصلحت کی نشانی ہے دو حروف عطف کے ساتھ دو فعلوں کو دو اوقات کے ساتھ ملا دیا تاکہ اس بات پر تنبیہ ہو جائے کہ اگرچہ ایک فعل دن کے ساتھ اور ایک فعل رات کے ساتھ (عادتاً) مخصوص ہے لیکن ہر کام ہر وقت ہو سکتا ہے (رات کو کمائی اور دن کو نیند بھی ہو سکتی ہے) اس کی تائید دوسری آیات سے بھی ہوتی ہے جو اسی مضمون کی حامل ہیں۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۲۴﴾
اور اسی کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ تم کو بجلی دکھاتا ہے جس سے ڈر بھی ہوتا ہے اور امید بھی اور وہی اوپر سے پانی برساتا ہے پھر اس پانی سے زمین کو اس کے مرجانے کے بعد زندہ کرتا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لئے بہت نشانیاں ہیں جو سمجھتے ہیں۔

خَوْفًا یعنی بجلی گرنے کا ڈر ہوتا ہے جب کہ سفر کی حالت ہو۔

وَّطَمَعًا اور بارش کی امید ہوتی ہے جب کہ اپنے اپنے گھروں میں ہو۔

خَوْفًا وَّطَمَعًا دونوں فعل مذکور یا محذوف کی علت ہیں یا حال۔ زمین کے مرنے سے مراد ہے خشک ہو جانا اور زندہ کرنے سے مراد ہے سرسبز کر دینا۔

یَّعْقِلُوْنَ یعنی ان لوگوں کے لئے یہ چیزیں صانع کی قدرت و حکمت کی نشانیاں ہیں جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں اور کمال قدرت و حکمت کو سمجھتے ہیں۔

وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ؕ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً ۖ مِّنَ الْاَرْضِ ۖ اِذَاۤ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ ۝ اور اسی کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ آسمان و زمین اس کے حکم سے (اپنے اپنے دائرہ میں) قائم ہیں پھر جب وہ تم کو بلائے گا تو یکدم تم زمین سے بر آمد ہو جاؤ گے۔

لفظ ثُمَّ تاخیر زمانہ کو بتا رہا ہے یا قیامت کی عظمت شان کو۔

بغوی نے لکھا ہے کہ اکثر اہل تفسیر کے نزدیک مِنَ الْاَرْضِ کا تعلق تَخْرُجُوْنَ سے ہے یعنی تم زمین سے بر آمد ہو جاؤ گے۔ بیضاوی نے لکھا ہے یہ غلط ہے کیونکہ اِذَا کا تعلق دعا سے ہے یعنی جب اللہ تم کو زمین کے اندر سے بلائے گا۔ ابن عساکر نے لکھا ہے کہ زید بن جابر شافعی نے آیت وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ کی توضیح میں بیان کی کہ اسرافیل صخرۂ بیت المقدس پر کھڑے ہو کر پکاریں گے، اے بوسیدہ ہڈیوں، اور پارہ پارہ کھالو اور کٹے ہوئے بالوں اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ فیصلہ حساب کے لئے جمع ہو جاؤ۔

دوسرا اِذَا مفاجات کے لئے ہے، یعنی یکدم اچانک تم بر آمد ہو جاؤ گے۔

وَلَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ۝ اور اسی کے (پیدا کئے ہوئے اور مملوک) ہیں وہ جو آسمانوں میں ہیں اور زمین میں ہیں سب کے سب اسی کے فرماں بردار ہیں۔

کلبی نے کہا آیت میں صرف وہ (اہل عقل) مراد ہیں جو اللہ کے اطاعت گزار اور فرماں بردار ہیں (کافر اور گنہگار مسلمان مراد نہیں ہیں) صحیح یہ ہے کہ اطاعت سے مراد ہے تخلیقی اور تکوینی فرمان پذیری (جس میں ارادہ اور اختیار کو دخل نہیں ہے، ہر سرکش کافر بھی حکم تکوینی سے سرکشی نہیں کر سکتا امر تشریعی کی خلاف ورزی کرتا ہے) آیت میں امر تکوینی کا عموم مراد ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا، ہر ایک (بغیر کسی اختیار کے) پیدا ہونے، جینے، مرنے اور قیامت کے دن اٹھنے میں حکم کا بندہ ہے۔ خواہ حکم عبادت سے سرکشی کرتا ہو۔

ابن ابی حاتم نے عکرمہ کی روایت سے لکھا ہے کہ مُردوں کو دوبارہ زندہ کر کے اٹھانے پر کافروں کو تعجب تھا اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَهُوَ الَّذِیْ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَیْهِ ؕ اور وہی تو ہے جو ابتدائی تخلیق کرتا ہے پھر دوبارہ اس کو پیدا کرے گا۔

اور دوبارہ پیدا کرنا اس کے لئے (ابتدائی تخلیق سے) زیادہ آسان ہے۔

ربیع بن خثیم، حسن، قتادہ اور کلبی نے کہا اَهْوَنُ (زیادہ آسان) سے اس جگہ هَیِّنٌ (سہل) مراد ہے کیونکہ اللہ کے لئے کوئی امر دشوار ہی نہیں ہے (کہ ایک فعل کے مقابلہ میں دوسرے فعل کو زیادہ آسان کہا جا سکے) وزن اسم تفضیل بمعنی صفت مشبہ عربی میں آتا ہے۔ عوفی کی روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا بھی یہی قول آیا ہے۔

مجاہد اور عکرمہ نے کہا، اس جگہ اَهْوَنُ کا استعمال بطور ضرب المثل کیا ہے (حقیقت مراد نہیں ہے) یعنی دوبارہ پیدا کرنا پہلی مرتبہ پیدا کرنے سے زیادہ آسان ہوتا ہے جیسا کہ تم جانتے ہو یہ بات تمہاری عقل کے بھی مطابق ہے۔

بعض نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ تمہارے نزدیک اعادہ ابتداء سے زیادہ آسان ہوتا ہے۔ بعض نے یہ مطلب بیان کیا کہ مخلوق کے لئے دوبارہ پیدا ہو جانا پہلی مرتبہ پیدا ہو جانے سے سہل ہوگا کیونکہ وہ صرف ایک آواز سے اٹھ کر نکل آئیں گے۔ پہلی

پیدائش دشوار تھی نطفہ بنا، پھر بستہ خون ہوا، پھر بوٹی بنا، پھر مردیا عورت بنا، پھر پیدا ہوا۔ حیان نے بحوالۂ کلبی اور صالح کی روایت سے حضرت ابن عباسؓ کا جو قول نقل کیا ہے اس کا یہی معنی ہے۔

وَلَهُ الْمَثَلُ الْأَعْلٰى اسی کی اعلیٰ شان ہے۔ یعنی اس کی صفات اتنی عالی ہیں کہ کسی دوسرے کی کوئی صفت نہ اس کی صفت کی ہم پلڑہ ہے نہ برابری کے قریب۔ جیسے اس کی قدرت ہمہ گیر ہے اور اس کی حکمت محیط کل ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اس کی مثل اعلیٰ یہی ہے کہ اس کی مثل اور کوئی نہیں۔ عبدالرزاق نے بروایت ابن ابی حاتم اس آیت کی تشریح میں قتادہ کا قول نقل ہے کہ مثل اعلیٰ لا الٰہ الا اللہ کی شہادت ہے۔ میں کہتا ہوں اس قول کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی وحدانیت مثل اعلیٰ ہے۔

فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ آسمانوں میں اور زمین میں۔ یعنی جو چیز زمین آسمان میں اس کی صفت بیان کرتی ہے۔ زبان مقال سے ہو یا زبان حال سے۔

وَهُوَ الْعَزِيْزُ اور وہی غالب ہے ملکیت اور خلاقیت میں غالب اور قادر ہے کوئی چیز اس کی قدرت اور غلبہ سے خارج نہیں، نہ ابتدائی تخلیق نہ اعادہ۔

الْحَكِيْمُ ۝ وہی حکیم ہے اپنی حکمت کے موافق کرتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کا بیان طبرانی نے نقل کیا ہے کہ اہل شرک حج کی لبیک کہنے کے موقع پر لبیک کے ساتھ کہا کرتے تھے۔ لا شریک لک الا شریکا ھو لک تملکہ وما ملک اے اللہ تیرا کوئی شریک نہیں سوائے اس شریک کے جس کو تو نے شریک کرلیا ہے تو اس کا مالک ہے وہ تیرا مالک نہیں۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اللہ ایک مضمون عجیب تمہارے ہی حالات میں سے بیان کرتا ہے جو تمہارے ہی حالت سے اخذ کی گئی ہے۔ یہ مثال تمہارے حالات سے بہت قریب ہے۔

هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ کیا تمہارے غلاموں میں سے کوئی غلام اس مال میں جو ہم نے تم کو دیا شریک ہے کہ تم اور وہ اس میں برابر ہوں جن کا تم ایسا خیال کرتے ہو جیسا اپنے آپس کا خیال کرتے ہو۔

ضَرَبَ اللہ نے بیان کیا۔

لَكُمْ یہ مشرکوں سے خطاب ہے۔

مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ یعنی تمہارے مملوکوں میں سے۔

فِيْهِ سَوَآءٌ کہ تم سب ملکیت اور تصرف میں برابر ہو وہ بھی تمہاری طرح تصرف کرتے ہوں۔

تَخَافُوْنَهُمْ کہ صرف کرنے میں تم کو ان کا اندیشہ لگا رہتا ہو۔

كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ جیسے تم کو اپنے لوگوں کا اندیشہ رہتا ہے جو تمہاری طرح آزاد ہیں۔ استفہام انکاری ہے یعنی ایسا نہیں ہوتا اس کو تم اپنے لئے عار سمجھتے ہو باوجودیکہ تم سب آدمی ہو پھر بھی غلاموں کے ساتھ مالی شرکت اور مساویانہ تصرف گوارا نہیں، پھر تعجب ہے کہ ان پتھروں کو جو عاجز ترین مخلوق ہیں اس اللہ کا شریک قرار دیتے ہو جو زمین آسمان کا خالق ہے۔

كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ اسی طرح ہم کھول کر دلائل بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ یعنی تمثیلات پر غور کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ طبرانی کی طرح جویبر نے بھی داؤد بن ہند کی روایت سے بوساطت حضرت ابو جعفر محمد بن علی زین العابدین آیت کا سبب یہی بیان کیا ہے۔

بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ (اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے) بلکہ ظالم اپنی خواہشات کے پیچھے بغیر جانے چلتے ہیں۔

اَلَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا یعنی جن لوگوں نے شرک کر کے اپنے اوپر خود ظلم کیا کہ اپنی جانوں کو عذاب کا مستحق بنایا۔

بِغَیْرِ عِلْمٍ یعنی ان باتوں کو جانے بغیر جن کو جاننا ان پر لازم تھا۔

فَمَنْ یَّهْدِیْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ سو جس کو اللہ نے گمراہ کر دیا اس کو کون ہدایت کر سکتا ہے۔ استفہام انکاری ہے۔ یعنی جب وہ خواہشات نفسانی کے پیرو ہو گئے اور اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایت کو انہوں نے ٹھکرا دیا تو اب کون ان کو ہدایت کر سکتا ہے۔

وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ۝ اور ان کا کوئی مددگار نہیں (کہ ان کو نفسانی آفات سے رہائی دلا سکے)

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا ۚ سو آپ اپنا رخ سیدھا دین کی طرف کر لیں۔

فاء سببیہ ہے۔ یعنی جب اللہ کی وحدانیت ثابت ہو گئی اور ظاہر ہو گیا کہ مشرک اپنی خواہشات کے پیرو ہیں تو آپ اپنا رخ خالص طور پر بغیر ادھر ادھر مڑے دین اسلام کی طرف کر لیجئے۔

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ۚ (اپنے اوپر لازم کر لو) اللہ کی فطرت (یعنی دین اسلام کو) جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ فطرت (بمعنی پیدائش) سے مراد حضرت ابن عباسؓ اور جماعت مفسرین کے نزدیک اسلام ہے۔ آیت میں براہ راست خطاب رسول اللہ ﷺ کو اور آپ کے ذیل میں ساری امت کو ہے۔ فطرت کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ساری مخلوق کے لئے اطاعت الٰہی لازم ہے۔

الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا یعنی تمام لوگوں کے اندر صلاحیت اور استعداد پیدا کر دی ہے کہ فطرت کو جان سکتے ہیں اور اس پر چل سکتے ہیں (گویا فطرت سے مراد ہے فطری استعداد جو ہر شخص میں پیدائشی ہے) بعض علماء کے نزدیک فطرت سے وہ وعدہ مراد ہے جو اللہ نے حضرت آدم اور آپ کی ساری نسل سے کیا تھا اور فرمایا تھا اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں، قَالُوْا بَلٰی تو سب نے جواب دیا کیوں نہیں تو ہی ہمارا رب ہے ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے اسی ازلی اقرار پر پیدا ہوتا ہے یہی حقیقت ہے جس پر سارے انسانوں کی تخلیق ہوتی ہے۔ سورۂ آل عمران میں آیت مذکورہ کی تفسیر کے ذیل میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے آئی ہوئی یہ حدیث گزر چکی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر بچہ فطرت ہی پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا عیسائی یا مجوسی بنا لیتے ہیں جیسے چوپائے سے چوپایہ سالم پیدا ہوتا ہے کیا تم کسی کو پیدائشی نکٹا بوچا پاتے ہو، پھر حضور ﷺ نے آیت فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ۚ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ تلاوت فرمائی۔ متفق علیہ۔

یعنی ہر بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو سالم سرشت لے کر آتا ہے اس کی طبیعت قبول حق کے لئے تیار ہوتی ہے اگر اس پر بیرونی اثر نہ ڈالا جائے تو وہ اپنی سلامتی پر قائم رہتی ہے کیونکہ سادہ عقل اور سالم فہم کے اندر دین اسلام مرکوز ہے۔ (دین اسلام سادگی اور سلامتی طبیعت ہی کا نام ہے) اب کسی بیرونی وجہ مثلاً ماں باپ کی پیروی یا کسی دوسرے سبب سے تبدیلی آتی ہے تو اس کی سلامتی (یعنی فطرت) زائل ہو جاتی ہے۔

لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۚ اللہ کی اس پیدا کی ہوئی چیز کو نہ بدلو۔

یعنی دین خدا کو تبدیل نہ کرو۔ مجاہد اور ابراہیم نخعی نے کہا فطرۃ اللہ پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہو اس کی پیروی کرو اور توحید کو شرک سے نہ بدلو۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ عبداللہ بن مبارک نے حدیث کل مولود یولد علی الفطرة کی تشریح میں کہا ہر بچہ کو اس سرشت پر پیدا کیا جاتا ہے جو اللہ کے علم میں ہے یعنی (بموجب علم الٰہی ہر بچہ کو خوش نصیب یا بدنصیب پیدا کیا گیا ہے۔ آخر میں ہر آدمی اسی سعادت یا شقاوت کی طرف لوٹ جاتا ہے جو اللہ نے اس کی سرشت میں پیدا کر دی ہے اور اس کا عمل فطرت کے مطابق آخر میں ہو جاتا ہے۔ اس مطلب پر آیت لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ کا معنی یہ ہو گا کہ جس سعادت یا شقاوت پر انسان کی فطری تخلیق ہوئی ہے وہ بدل نہیں سکتی۔ سعید شقی نہیں ہو سکتا اور شقی سعید نہیں بن سکتا۔

حضرت ابن مسعودؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو صادق مصدوق تھے فرمایا کہ تم میں سے ہر ایک کا مادۂ تخلیق بصورت نطفہ

ماں کے پیٹ میں جمع رہتا ہے پھر اتنی ہی مدت خون بستہ کی شکل میں رہتا ہے پھر اتنی ہی مدت بوٹی (یعنی گوشت کا لوتھڑا) رہتا ہے پھر اللہ چار باتوں کا حکم دے کر ایک فرشتہ کو اس کی طرف بھیجتا ہے۔ فرشتہ اس کے عمل، میعاد زندگی، مقدار رزق اور اس کا بدبخت یا سعادت مند ہونا لکھ دیتا ہے، پھر اس کے اندر روح پھونک دی جاتی ہے۔ قسم ہے اس کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ آدمی تمام عمر جنت والوں کے کام کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان ایک ہاتھ سے زیادہ فاصلہ نہیں رہتا کہ اس کا شکم مادر کے اندر کا لکھا غالب آتا ہے اور وہ دوزخیوں کا عمل کرنے لگتا ہے آخر دوزخ میں داخل ہو جاتا ہے اور کوئی ساری عمر دوزخیوں کے کام کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور دوزخ کے درمیان ایک ہاتھ سے زیادہ فاصلہ نہیں رہتا آخر وہی لکھا غالب آتا ہے اور وہ جنتیوں کا عمل کرنے لگتا ہے اور جنت میں چلا جاتا ہے۔ متفق علیہ۔ حضرت ابودرداؓ کا بیان ہے ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بیٹھے مذکرہ کر رہے تھے کہ کیا ہو گا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تم سنو کہ کوئی پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل گیا ہے تو یقین مان لینا اور اگر یہ سنو کہ کوئی آدمی اپنی جبلت (سرشت) سے بدل گیا ہے تو یقین نہ کرنا کیونکہ (آخر کار ہر) آدمی اسی کی طرف لوٹے گا جو اس کی سرشت ہے۔ رواہ احمد۔ اس تفسیر پر آیت کا معنی یہ ہو گا کہ اللہ نے ہر شخص کو ایک فطرت پر پیدا کیا ہے جس سے وہ بدل نہیں سکتا اور آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو خوش نصیب بنایا ہے لہٰذا اپنا رخ دین کی طرف سیدھا کر لیجئے اس صورت میں آیت مذکورہ کلام سابق کی علت ہو گی اور اخلاص دینی کی ترغیب اس سے مقصود ہو گی۔ عکرمہ اور مجاہد نے پوری آیت کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ تخلیق خداوندی کو مت بدلو یعنی جانوروں کو خصی نہ کرو۔

ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ یہ (دین جس کی اقامت کا حکم دیا گیا ہے یا یہ فطرت) ہی سیدھا دین ہے۔ یعنی دین مستقیم ہے جس میں کسی طرح کی کجی نہیں ہے۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ لیکن اکثر لوگ (یعنی کفار مکہ) نہیں جانتے (کہ یہ دین مستقیم ہے کیونکہ وہ غور ہی نہیں کرتے)۔

مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ تم خدا کی طرف رجوع ہو کر (فطرت کا اتباع کرو) اور اس سے ڈرو اور نماز کی پابندی کرو۔

مُنِيْبِيْنَ۔ اَنَابَ سے ماخوذ ہے یعنی اللہ کی طرف رجوع کرتے ہوئے یا سب کو چھوڑ کر اللہ ہی کی طرف کٹتے ہوئے۔

وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ﴿۳۱﴾ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿۳۲﴾ اور ان شرک کرنے والوں میں سے مت ہو جاؤ جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے کر لیا اور بہت سے گروہ ہو گئے ہر گروہ اپنے اس طریقے پر مگن ہے جو اس کے پاس ہے۔

الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ۔ اَلْمُشْرِكِيْنَ سے بدل ہے (یعنی مشرکوں سے مراد ہیں دین کو پارہ پارہ کرنے والے) مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے اپنی خواہشات کے زیر اثر اپنے اپنے معبود الگ الگ بنا لئے اور دین کے طریقہ کو بدل ڈالا تو ان مشرکوں میں سے نہ ہو۔ ان مشرکوں میں سے ہر گروہ مگن ہے اس طریقہ پر جس پر وہ قائم ہے ہر گروہ کا امام جدا ہے جس نے ان کے لئے دین تراش لیا ہے اور ہر گروہ اس کے پیچھے چل رہا ہے۔

بعض لوگوں کا قول ہے کہ دین کو ٹکڑے کرنے والوں سے مراد ہیں اس امت کے اہل بدعت جنہوں نے دین حق کو چھوڑ کر اپنی اپنی خواہشات کا اتباع اختیار کر لیا ہے۔ ان کو مشرک اس وجہ سے فرمایا کہ ان کے ہر گروہ نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی۔ سوائے ایک فرقہ کے باقی سب لوگ دوزخ میں ہوں گے۔ عرض کیا گیا وہ کونسا فرقہ ہو گا۔ فرمایا (جس (طریقہ) پر میں اور میرے صحابہؓ ہیں (اس پر چلنے والا فرقہ نجات یافتہ ہو گا) رواہ الترمذی۔

بِمَا لَدَيْهِمْ سے مراد ہے اپنا عقیدہ (یا طریقہ، مترجم) فَرِحُوْنَ خوش ہیں کیونکہ اپنے آپ کو حق پر سمجھتے ہیں۔ وری نے

بحوالہ ابراہیم بن اسحاق بروایت ابن مبارک اوزاعی کا قول نقل کیا ہے کہ ابلیس نے اپنے ساتھیوں سے کہا تم اولاد آدم کے پاس (بہکانے کے لئے) کس طریقے سے جاتے ہو، ساتھیوں نے کہا ہر طریقہ سے۔ ابلیس نے کہا استغفار کے راستے سے بھی جاتے ہو۔ ساتھیوں نے کہا یہ بات نہیں ہو سکتی، استغفار تو توحید سے وابستہ ہے۔ (یعنی ہر مومن استغفار کرتا ہے) ابلیس نے کہا میں ان کے اندر ایسی چیز پھیلادوں گا جس سے وہ بھی استغفار نہیں کریں گے۔ (کیونکہ اس چیز کو وہ گناہ نہیں خیال کریں گے بلکہ حق سمجھیں گے) چنانچہ ابلیس نے اولاد آدم کے اندر خواہشات (کا اختلاف) پھیلا دیا۔

وَإِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُنِيبِينَ إِلَيْهِ

اور جب لوگوں کو (یعنی کفار مکہ کو) کوئی دکھ (یعنی قحط اور تنگ حالی) چھوجاتی ہے تو اپنے رب کی طرف رجوع ہو کر اسی کو پکارتے ہیں یعنی دوسرے معبودوں سے خدا کی طرف لوٹ آتے ہیں اور اپنے کسی معبود کو سوائے خدا کے نہیں پکارتے۔

ثُمَّ إِذَا أَذَاقَهُمْ مِنْهُ رَحْمَةً إِذَا فَرِيقٌ مِنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُونَ ۝

پھر جب وہ اپنی طرف سے ان کو کسی قدر رحمت کا مزہ چکھا دیتا ہے تو ان میں سے ایک گروہ اپنے رب کے ساتھ (دوسروں کو عبادت میں) شریک قرار دینے لگتا ہے۔

رحمت سے مراد شدت و تنگ حالی سے خلاصی یا سرسبزی۔ يُشْرِكُونَ یعنی رحمت تو کرتا ہے رب اور خلاصی مل جاتی ہے تو خلاصی دینے میں ساجھی قرار دیتے ہیں وہ دوسروں کو۔

حضرت زید بن خالد جہنی کی روایت ہے کہ حدیبیہ میں رات کو بارش ہوئی صبح کو رسول اللہ ﷺ نے ہم کو نماز پڑھائی۔ نماز ختم کرنے کے بعد لوگوں کی طرف رخ کر کے فرمایا کیا تم کو معلوم ہے کہ تمہارے رب نے کیا فرمایا؟ صحابہؓ نے جواب دیا اللہ جانے اور اللہ کا رسول حضور ﷺ نے فرمایا اللہ نے فرمایا کہ صبح کو میرے بندوں میں سے کوئی مومن رہا کوئی کافر (یعنی میری نعمت کا منکر) ہو گیا جس نے کہا اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے ہم پر بارش ہوئی وہ مجھ پر ایمان رکھتا ہے اور ستاروں کا منکر ہے اور جس نے کہا ہم پر فلاں ستارے کے نکلنے سے بارش ہوئی وہ میرا منکر ہے اور ستاروں پر یقین رکھنے والا ہے۔ رواہ البخاری (مسلم و فی الصحیحین)

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب بھی اللہ اوپر سے برکت (بارش) نازل فرماتا ہے انسانوں کا ایک گروہ اللہ کی رحمت کا منکر ہو جاتا ہے۔ بارش نازل تو کرتا ہے اللہ اور وہ کہتا ہے کہ فلاں فلاں ستاروں کی وجہ سے یہ بارش ہوئی۔ رواہ مسلم۔

لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ

(جس کا حاصل یہ ہے کہ) ہم نے جو ان کو دیا ہے اس کی ناشکری کریں۔

لِيَكْفُرُوا میں لام عاقبت ہے یعنی اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی عطا کردہ رحمت کے منکر ہو جاتے ہیں۔ یا لام امر ہے اور امر سے مراد ہے دھمکی دینا یعنی وہ اب تو ہماری رحمت کا انکار کر لیں (اس کا نتیجہ جب عذاب کی شکل میں نکلے گا تو پتہ چلے گا)

فَتَمَتَّعُوا فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ۝

(اب تو) مزے کر لو آئندہ تم کو (اس کا برا انجام) معلوم ہو جائے گا۔

أَمْ أَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوا بِهِ يُشْرِكُونَ ۝

کیا ہم نے ان پر کوئی سند نازل کی ہے کہ وہ ان کو شرک کرنے کو کہہ رہی ہے۔

اَمْ منقطعہ ہے یا متصلہ ہے اور فعل محذوف پر عطف ہے یعنی کیا یہ لوگ بغیر کسی دلیل کے شرک کر رہے ہیں یا اللہ نے شرک کی کوئی سند نازل کی ہے استفہام انکاری ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے سلطانا کا ترجمہ کیا دلیل اور عذر۔ قتادہ نے کہا (آسمانی) کتاب۔ بعض نے کہا سلطان سے صاحب سلطان مراد ہے۔ یعنی فرشتہ جس کے ساتھ دلیل ہو یا پیغمبر جس کی تائید معجزہ سے کی گئی ہو۔ يَتَكَلَّمُ کہہ رہی ہو زبان سے یا بدلالت حال۔ دوسری آیت میں كِتَابُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ بِمَا كَانُوا بِهِ

یُشْرِکُوْنَ۔ مَا مصدریہ یعنی شرک اور صحت شرک کی شہادت دے رہی ہے یا مَا سے مراد ہے امر اور باء سببیہ ہے یعنی ایسا امر جس کی وجہ سے یہ شرک کر رہے ہیں اور اس کو معبود بنا رہے ہیں۔

وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوْا بِهَا ۭ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ اِذَا هُمْ يَقْنَطُوْنَ ۝ اور جب ہم لوگوں کو رحمت (یعنی صحت و کشائش) کا مزہ چکھا دیتے ہیں تو وہ (اس کی وجہ سے) اترا جاتے ہیں اور جب ان کے سابق کرتوت کی وجہ سے کوئی دکھ ان کو پہنچ جاتا ہے تو وہ یکدم نراس ہو جاتے ہیں۔

یعنی گناہوں کی نحوست کی وجہ سے جب کوئی بدحالی ان کو پہنچتی ہے۔ یہ بات مؤمن کی شان کے خلاف ہے مؤمن تو نعمت ملنے پر اپنے رب کا شکر کرتا ہے اور دکھ آنے پر صبر کرتا اور ثواب کی امید رکھتا ہے اور اپنے رب سے امید کو وابستہ رکھتا ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَقْدِرُ ۭ کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ جس شخص کا رزق فراخ کرنا چاہتا ہے فراخ کرتا ہے اور جس کی روزی نپی تلی کرنا چاہتا ہے نپی تلی کر دیتا ہے۔ یعنی کوئی وجہ نہیں کہ فراخی حال میں تو اترانے لگیں اور ناشکری کریں اور تنگ حالی میں ناامید ہو جائیں اللہ کی طرف نہ لوٹیں اور گناہوں پر پشیمان ہو کر توبہ نہ کریں اور گناہوں کو نہ چھوڑیں اور مومنوں کی طرح صبر نہ کریں اور مصیبت پڑنے پر ثواب کی امید نہ رکھیں۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ (رزق کی) اس (تنگی، فراخی) میں مومنوں کے لئے بہت نشانیاں ہیں۔ وہ اللہ کی قدرت اور حکمت پر اس سے استدلال کرتے ہیں۔

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۭ (جب یہ معلوم ہو گیا کہ رزق کی تنگی، فراخی اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے) تو قرابتداروں کو ان کا حق ادا کرو (یعنی ان کے ساتھ صلہ رحمی کرو، اچھا سلوک کرو اور جو حق ان کا واجب ہے اس کو ادا کرو اس کی تفصیل آیت وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ کی تفسیر میں گزر چکی ہے) اور مسکین و مسافر کو بھی اس کا حق ادا کرو۔

یعنی جس مسافر کے پاس پردیس میں کچھ نہ ہو اور وطن میں مال ہو اس کو اور دوسرے مسکینوں کو زکوٰۃ کے مال میں سے دو۔

ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ۡ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

یہ ان لوگوں کے لئے بہتر ہے جو اللہ کی خوشنودی چاہتے ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔

ذٰلِکَ خَیْرٌ یعنی قرابت داروں وغیرہ کو دینا خود لذت اندوز ہونے سے بہتر ہے۔

وَجْہَ اللّٰہِ اللہ کی ذات یا اللہ کی جنت۔ مراد یہ ہے کہ وہ اللہ ہی کی رضا کے طلبگار ہیں اسی سے ثواب چاہتے ہیں شہرت حاصل کرنے اور رجا ہونے کے لئے نہیں دیتے۔

ہُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وہی فلاح پانے والے ہیں کیونکہ انہوں نے فانی دنیا دے کر لازوال آخرت خریدی ہے۔ یعنی دوسرے لوگ فلاح یاب نہیں ہیں۔

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ اور جو چیز تم اس غرض سے دو گے کہ وہ لوگوں کے مال میں پہنچ کر زیادہ ہو جائے تو وہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا۔

وَمَآ اٰتَيْتُمْ یعنی جو کچھ تم سود خواروں کو دو گے۔

مِنْ رِّبًا۔ ربوٰا سے مراد ہے لین دین میں ایک طرف سے وہ زیادتی جو شرعاً حرام کر دی گئی ہے یا وہ مباح اور عطیہ اور ہدیہ مراد ہے جس کو دینے کی غرض یہ ہو کہ اس سے زیادہ واپس مل جائے گا۔ اس تشریح پر عطیہ کو ربوٰا کہنا مآل کے اعتبار سے ہے یعنی وہ زیادتی جو عطیہ کا اصل مقصد ہے۔ فِیْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ یعنی دینے والوں کے مال میں یا جن کو دیا جاتا ہے ان کے مال میں۔

فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰہِ یعنی اللہ کے نزدیک اس میں برکت نہیں ہوتی۔ اللہ کے نزدیک وہ بڑھتا نہیں۔

بغوی نے لکھا ہے آیت کا کیا معنی ہے۔ علماء تفسیر نے اس میں اختلاف کیا ہے۔ سعید بن جبیر، مجاہد، طاؤس، قتادہ اور اکثر اہل تفسیر نے مطلب بیان کیا ہے کہ جو شخص کسی کو کچھ عطیہ اس لالچ میں دیتا ہے کہ وہ لوٹا کر اس سے زیادہ دیدے تو گو شرعاً یہ فعل جائز ہے لیکن ایسے دینے کا قیامت کے دن کوئی ثواب نہیں ملے گا۔ لا یربوا عند اللّٰہ کا یہی معنی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے لئے یہ عمل کبھی ناجائز تھا۔ اللہ نے اپنے رسول سے فرمایا تھا ولا تمنن تستکثر ضحاک نے کہا اس سے مراد وہ آدمی ہے جو اپنے کسی رشتہ دار اور دوست کو اس کا مال بڑھانے کے لئے کچھ دیتا ہے۔ رضائے خداوندی کا حصول اس کے پیش نظر نہیں ہوتا۔

شعبی نے کہا اس سے مراد وہ شخص ہے جو دوسرے آدمی کے ساتھ چپٹا رہتا ہے اس کی خدمت کرتا ہے اور سفر میں بھی اس کے ساتھ رہتا ہے وہ آدمی اپنی تجارت کے نفع میں اس کا کوئی حصہ مقرر کر دیتا ہے تاکہ وہ کام میں مالک کا ہاتھ بٹاتا رہے ایسے دینے کا آخرت میں کوئی حاصل نہیں کیونکہ رضائے رب مطلوب نہیں ہے۔ (اپنا کام کرانا مقصود ہے عمل کا معاوضہ دینا ہے، مترجم) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اعمال کا مدار نیت پر ہے جس شخص کی جو نیت ہوگی وہی اس کو ملے گا جس شخص نے ہجرت اللہ اور رسول کے لئے کی ہوگی اس کی ہجرت اللہ اور رسول کے لئے ہوگی (یعنی وہ ثواب کا مستحق ہوگا) اور جس شخص نے دنیا پانے یا عورت سے نکاح کرنے کے لئے کی ہوگی۔ اس کی ہجرت (اللہ اور رسول کے لئے نہیں بلکہ) اسی چیز کے لئے قرار پائے گی جس کے لئے اس نے کی ہوگی۔ (متفق علیہ)

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ﴿۳۹﴾

اور جو اللہ کی خوشنودی طلب کرتے ہوئے زکوٰۃ دوگے تو ایسے ہی لوگ (خدا تعالیٰ کے پاس) بڑھاتے رہیں گے۔

مَآ اٰتَيْتُمْ یعنی زکوٰۃ دوگے یا خیرات دوگے۔

وَجْهَ اللّٰهِ اللہ کی ذات یا اللہ کا عطا کردہ ثواب یا اللہ کی خوشنودی۔

اَلْمُضْعِفُوْنَ یعنی ایسے لوگوں کو ثواب چند گنا ملے گا ایک نیکی کا ثواب دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک اور اس سے بھی زیادہ جس کی کوئی حد نہیں اور زکوٰۃ کی برکت سے ان کے مالوں میں بھی ترقی ہوگی۔ یا اَلْمُضْعِفُوْنَ کا ترجمہ ہے، چند گونہ ثواب والے جیسے مقوی قوت والا، موسر مال والا (یعنی باب افعال کی ہمزہ صاحب ماخذ ہونے پر دلالت کر رہی ہے۔ مترجم)

عبارت کا ظاہری تقاضا تھا کہ لَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ کے مقابلے میں يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ کہا جاتا لیکن طرز ادا میں تغیر مبالغے کے لئے کیا گیا اور اٰتَيْتُمْ اور تُرِيْدُوْنَ کے بعد خطاب سے ضمیر غائب کی طرف انتقال کیا اور ھم فرمایا امیاز کوٰۃ دینے والوں کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لئے کیا گویا ملائکہ اور اونچے خاص درجہ کی مخلوق کو خطاب کر کے زکوٰۃ دینے والوں کی عظمت شان سے واقف بنایا (گویا یوں فرمایا کہ فرشتو! تم جان لو کہ زکوٰۃ دینے والوں کا مرتبہ بڑا ہے وہ مضعف ثواب ہیں۔ مترجم) زجاج نے کہا اَهْلُهَا کا لفظ محذوف یعنی اہل زکوٰۃ مضعف اجر و ثواب ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ۭ هَلْ مِنْ شُرَكَاۗىِٕكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ

اللہ ہی تو ہے جس نے تم کو پیدا کیا پھر تم کو رزق دیا پھر تم کو موت دے گا کیا تمہارے (مفروضہ) شریکوں میں سے کوئی ایسا ہے کہ ان میں سے کچھ بھی کرتا ہو۔

هَلْ مِنْ شُرَكَاۗىِٕكُمْ یعنی بتوں وغیرہ کو جو تم شریک الوہیت قرار دیتے ہو ان میں سے کوئی ایسا کر سکتا ہے۔

اللہ نے پہلے لوازم الوہیت ذکر کئے پھر ان کو اپنی ذات کے لئے ثابت کیا اور دوسرے معبودوں سے ان کی نفی کر دی اور بطور تاکید استفہام انکاری کا طرز بیان اختیار کیا۔ عقلی دلائل، مشاہدہ اور اجماع (انسانی) کا یہی لازمی تقاضا ہے۔ اس کے بعد اگلی آیت میں اپنی ذات کے ہر شرک سے پاک ہونے کا نتیجہ نکالا اور فرمایا۔

منزل ۵

سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۴۰﴾ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ

وہ پاک ہے اور ان کی شرک آفرینیوں سے بالا ہے۔ خشکی اور سمندر میں فساد پھیل رہا ہے۔

یعنی اموات کی کثرت، غرقابی، آگ لگانا اور جلانا، جنگ و جدال، مار دھاڑ، خوں ریزی، ظلم، دکھ، ضرر، امراض اور گمراہی کی کثرت ہو گئی، سمندروں میں طوفان اور آندھیاں بکثرت آنے لگیں۔ سمندر کے جانور باہم لڑنے لگے۔

بغوی نے لکھا ہے بر سے مراد ہے صحرا، بیابان اور بحر سے مراد ہیں وہ شہر اور بستیاں جو نہروں اور دریاؤں کے کنارے پر آباد ہیں۔ عطیہ نے کہا روئے زمین پر جو شہر وغیرہ ہیں وہ بر ہیں اور بحر تو معروف ہی ہے (یعنی سمندر) بارش کی کمی کا اثر جس طرح خشکی پر پڑتا ہے اسی طرح سمندر پر بھی پڑتا ہے۔

بارش ہوتی ہے تو سمندر کی تہ سے سیپ اوپر سطح پر آجاتی ہے اور منہ کھول دیتی ہے اس کے منہ میں بارش کا جو قطرہ پڑ جاتا ہے وہ موتی ہو جاتا ہے۔ اگر بارش نہیں ہوتی تو سیپ اوپر نہیں آتی اور موتی نہیں بنتا۔ حضرت ابن عباسؓ اور مجاہد کا قول ہے کہ بر میں فساد سے مراد ہے آدم کے بیٹے (قابیل) کا اپنے بھائی (ہابیل) کو قتل کر دینا اور بحر میں فساد سے مراد ہے ظالم بادشاہ (جلندی) کا (حضرت موسیٰ کے زمانہ میں) کشتیوں کو چھین لینا جیسا کہ فرمایا یَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْبًا۔

فریابی، ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے مجاہد کا تفسیری قول اس طرح نقل کیا ہے کہ بر میں فساد ظاہر ہو گیا (یعنی پیدا ہو گیا) اس طرح کہ قابیل نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا اور بحر میں فساد کا ظہور جلندی شاہ عمان کی وجہ سے ہوا کہ وہ ہر کشتی کو چھین لیتا تھا۔ ضحاک نے کہا زمین پہلے سرسبز اور شاداب تھی جس درخت کے پاس آدمی جاتا تھا اس کو بار آور پاتا تھا اور سمندر کا پانی پہلے میٹھا تھا اور شیر، بھیڑئیے، بکری کو قتل کرنے کا ارادہ بھی نہیں کرتا تھا لیکن قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا تو زمین خشک ہو گئی درخت پر خار ہو گئے اور سمندر کا پانی شور ہو گیا اور جانور ایک دوسرے کو پھاڑنے لگے۔

بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لوگوں کے (برے) اعمال کی وجہ سے یعنی ان کے گناہوں کی نحوست کی وجہ سے یا ان کے برے عمل کرنے کی وجہ سے مطلب یہ ہے کہ اہل مکہ جو قحط میں مبتلا ہوئے کہ ہڈیاں اور مردار تک کھا گئے یہ انہی کے گناہوں کی نحوست کی وجہ سے ہوا۔

لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝ تاکہ اللہ ان کو ان کے اعمال کی کچھ سزا کا مزہ چکھا دے کہ وہ (اپنے گندے اعمال سے) توبہ کر لیں قتادہ نے کہا رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے زمین ظلم اور گمراہی سے بھری ہوئی تھی جب حضور ﷺ کی بعثت ہو گئی تو جو لوٹنے والے تھے گمراہی سے لوٹ آئے۔

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلُ ۚ كَانَ أَكْثَرُهُم مُّشْرِكِينَ ۝ آپ کہہ دیجئے زمین میں گھوم پھر کر دیکھو کہ (تم سے) پہلے لوگوں کا انجام کیا ہوا ان میں سے اکثر مشرک تھے (اس لئے ان پر عذاب آیا دیکھ لو ان کے گھر کھنڈر پڑے ہیں)

كَانَ أَكْثَرُهُم مُّشْرِكِينَ کا یہ مطلب ہے کہ (گو ان کے گناہ دوسرے بھی ہیں لیکن) شرک ان پر غالب تھا اس لئے تباہ کر دیئے گئے یا یہ مطلب ہے کہ شرک بہتوں میں تھا اور دوسرے گناہ کم لوگوں میں تھے لیکن ہلاک ان کو بھی کر دیا گیا کیونکہ مشرکوں کے ساتھ ان کی مصاحبت تھی یا اس لئے کہ انہوں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑ دیا تھا (خود مشرک نہ تھے لیکن مشرکوں کو نیکی کا حکم اور برائی سے باز داشت بھی نہیں کرتے تھے)

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ الْقَيِّمِ مِن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهُ مِنَ اللَّهِ سو آپ اپنا رخ دین قیم (یعنی اسلام) کی طرف کر لیجئے قبل اس کے کہ اللہ کی طرف سے وہ دن آجائے کہ جس کو لوٹانا ممکن نہیں۔

فَأَقِمْ وَجْهَكَ یعنی گزشتہ کافروں کی بد انجامی سے ڈر کر آپ اپنا رخ دین مستقیم کی طرف کر لیجئے۔

لَا مَرَدَّ لَهُ یعنی جس کو لوٹا دینے والا کوئی نہیں ممکن ہے اس دن سے مراد ہو دنیوی عذاب کا مقرر دن۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ اس سے قیامت کا دن مراد ہے۔

يَوْمَئِذٍ يَّصَّدَّعُوْنَ ۝ اس روز سب لوگ جدا جدا ہو جائیں گے یعنی آخرت کے روز ایک فریق جنت میں اور دوسرا فریق دوزخ میں چلا جائے گا۔ یا دنیا میں ایک فریق عذاب میں مبتلا کر دیا جائے گا اور دوسرا فریق عذاب سے محفوظ ہوگا جیسے بدر کے دن ہوا۔

مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ۚ جو کفر کر رہا ہے اسی پر اس کا کفر (یعنی دنیا اور آخرت میں کفر کا وبال) پڑے گا۔

وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ ۝ اور جو نیک عمل کر رہے ہیں سو وہ اپنے ہی لئے سامان کر رہے ہیں یعنی قبروں میں اور جنت میں اپنی اپنی اچھی فرودگاہیں تیار کر رہے ہیں۔

لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ جس کا حاصل یہ ہوگا کہ اللہ اپنے فضل سے ان لوگوں کو جزا دے گا جو ایمان لائے اور نیک کام کئے۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا تاکہ اعمال صالحہ سے زیادہ ان کو ثواب عنایت کرے (یعنی جتنے ثواب کے وہ اللہ کے مقررہ کردہ قانون سے مستحق قرار پاتے ہیں اس سے زیادہ اپنے فضل سے ان کو عطا کرے) صرف ثواب اعمال کا آیت میں ذکر کیا (سزائے کفر نہیں بیان کی)

اس میں اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ اللہ ثواب دینا ہی چاہتا ہے ہاں جو شخص خود انکار و کفر کر کے عذاب آخرت کو پسند کرے تو اللہ بھی ان کو عذاب دے گا۔

اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۝ بے شک اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔ بس وہ اپنے کفر کی وجہ سے مستحق فضل نہیں قرار پاتے۔

مذکورہ بالا تشریح اس صورت میں ہوگی جب لِيَجْزِيَ کا تعلق يَمْهَدُوْنَ سے قرار دیا جائے گا لیکن شیخ جلال الدینؒ نے لکھا ہے کہ لِيَجْزِيَ کا تعلق يَصَّدَّعُوْنَ سے ہے اس تفسیر پر دونوں فریقوں کے اعمال کے بدلے کا ذکر آیت میں ہو جائے گا۔ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ کا مراد ی مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کافروں کو سزا دے گا۔

آیت میں مِنْ فَضْلِهٖ کا لفظ دلالت کر رہا ہے کہ اعمال کا ثواب عطا فرمانا محض اللہ کی مہربانی ہے (اعمال صالحہ سے استحقاق ذاتی نہیں پیدا ہو جاتا۔ مترجم) اگر فضل سے مراد عطا ہو یا (اعمال کے واقعی) ثواب کی بیشی مراد ہو تو یہ بلا دلیل تاویل ہوگی۔

اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جو ابو الحارث کی روایت سے امام احمد نے الزہد میں بیان کی ہے کہ اللہ نے حضرت داؤدؑ کے پاس وحی بھیجی۔ میرے نیک بندوں کو ڈرا دو وہ مغرور نہ ہو جائیں اور اپنے اعمال پر بھروسہ نہ کرلیں۔ کیونکہ میرے بندوں میں کوئی ایسا بندہ نہ ہوگا کہ میں اس کو حساب فہمی کے لئے کھڑا کروں اور اس کے معاملہ میں عدل سے کام لوں (اور وہ میرے عذاب سے بچ جائے بلکہ جس نیک بندے کو حساب فہمی کے لئے کھڑا کروں گا اور عدل سے کام لوں گا) تو ضرور اس کو عذاب دوں گا۔

ابو نعیم نے حضرت علیؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے بنی اسرائیل کے ایک نبی کے پاس وحی بھیجی کہ اپنی امت کے ان بندوں سے جو اطاعت گزار ہیں کہہ دو کہ اپنے (نیک) اعمال پر بھروسہ نہ کرلیں۔ کیونکہ قیامت کے دن میں جس بندے کو حساب فہمی کے لئے کھڑا کروں گا اور اس کو عذاب دینا چاہوں گا تو عذاب دوں گا (اور یہ ظلم نہ ہوگا عدل ہوگا) اور اپنی امت کے گناہ گاروں سے کہہ دو کہ دعا یوس نہ ہو جائیں میں بڑے بڑے گناہوں کو بخشتا ہوں اور مجھے (کسی کے گناہ کی) پروا نہیں ہوتی۔

طبرانی نے حضرت واثلہ بن اسقع کا بیان نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ ایک ایسے بندے کو اٹھائے گا جس کا کوئی گناہ نہیں ہوگا اور اس سے فرمائے گا (بتا) تجھے دو باتوں میں سے کونسی بات پسند ہے کیا تو اپنے عمل کا بدلہ چاہتا ہے یا میرے فضل کا

خواستگار ہے۔ بندہ عرض کرے گا تو خوب واقف ہے کہ میں نے تیری نافرمانی نہیں کی۔ اللہ فرمائے گا میرے بندے (کے اعمال) کا میری ایک نعمت سے مقابلہ کرو۔ چنانچہ (جب نعمت کا مقابلہ عمل سے کیا جائے گا تو) تمام نیکیوں کو اللہ کی ایک نعمت (مقابلہ کے وقت) اپنے اندر سمالے گی اور کوئی نیکی باقی نہیں رہے گی آخر بندہ عرض کرے گا تیرے فضل ورحمت سے (میں مغفرت کا طلبگار ہوں)

بزار نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن آدمی کے تین رجسٹر سامنے لائے جائیں گے، ایک رجسٹر میں ساری نیکیوں کا اندراج ہوگا دوسرے رجسٹر میں سارے گناہ لکھے ہوں گے اور تیسرے رجسٹر میں اللہ کی نعمتیں درج ہوں گی۔ اللہ نعمتوں کے رجسٹر سے سب سے چھوٹی نعمت کو لے کر فرمائے گا اس بندہ کے تمام نیک اعمال کا مقابلہ کر چنانچہ ایک چھوٹی نعمت تمام اعمال کو گھیر لے گی۔ نعمتوں کا رجسٹر کہے گا تیری عزت کی قسم میں نے ابھی پورا پورا احاطہ کیا بھی نہیں ہے کہ سارے نیک اعمال ختم ہوگئے اور گناہ باقی ہیں۔ لیکن جب اللہ کسی بندے پر رحم کرنا چاہے گا تو فرمائے گا، میرے بندے میں نے تیری نیکیاں چند در چند کردیں (یعنی ہزاروں گناہ کردیں) اور تیرے گناہوں سے درگزر کرلی اور اپنی نعمتیں تجھے بخش دیں۔

طبرانی نے الاوسط میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے لا الہ الا اللہ کہہ لیا (یعنی یقین کے ساتھ اقرار کرلیا) اللہ کے نزدیک اس کے لئے (جنت میں داخل کرنے کا) ایک پختہ وعدہ ہوگیا اور جس نے سبحان اللہ کہا (یعنی اللہ کو ہر عیب اور برائی سے پاک سمجھا اور اس کا اقرار کیا) اس کے لئے اس کلمہ کی وجہ سے ایک لاکھ نیکیاں لکھدی جائیں گی، ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ پھر ہم ہلاک کیسے ہوسکتے ہیں (یعنی پھر ہم کو عذاب نہیں ہوسکتا) فرمایا قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے قیامت کے دن آدمی ایسے (وزنی) اعمال لے کر آئے گا جو پہاڑ پر بھی بھاری ہوں گے لیکن اللہ کی نعمتوں میں سے ایک ہی نعمت کے مقابلہ میں سب ختم ہوجائیں گے یہ سارا کچھ تو اس روز اللہ کی مہربانی سے ہوگا اللہ اس روز اپنی رحمت سے جس پر چاہے گا مہربانی فرمائے گا۔

بخاری اور مسلم نے حضرت عائشہؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سیدھی چال رکھو اور لگے لگے چلو اور خوش ہوجاؤ کیونکہ جنت کے اندر کسی کو اس کے اعمال نہیں لے جائیں گے صحابہؓ نے عرض کیا، کیا آپ بھی یا رسول اللہ (اپنے اعمال کی وجہ سے جنت میں نہیں جائیں گے) فرمایا اور نہ میں مگر یہ کہ اللہ مجھے اپنی مغفرت اور رحمت سے ڈھانک لے۔ مسلم نے یہ حدیث حضرت جابرؓ کی روایت سے بھی بیان کی ہے اور بزار نے حضرت ابو موسیٰؓ کے بیٹے اور شریک بن طارق کی روایت سے اور امام احمد نے حضرت ابو سعید خدری کی روایت سے اور طبرانی نے شریک بن طریف اور اسامہ بن شریک اور اسد بن کرز کی روایت سے یہ حدیث نقل کی ہے۔

دو شبہات

(۱) اگر یہ مضمون صحیح ہے تو پھر طاعت کی کیا ضرورت اور ترک معصیت کا کیا فائدہ کیونکہ اگر اللہ مہربانی نہیں کرے گا تو اطاعت گزاروں کو بھی جہنم میں بھیج دے گا۔ اور مہربانی فرمائے گا تو نافرمانوں کو بھی جنتی بنادے گا۔

(۲) اللہ نے فرمایا ہے اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ تم جو عمل کرتے تھے ان کے سبب سے جنت میں داخل ہوجاؤ۔ (اس سے معلوم ہوا کہ نیک مومن اپنے عمل کی وجہ سے جنت میں جائے گا) اور احادیث مذکورہ کا مطلب اس کے خلاف ہے۔

اول شبہ کا جواب یہ ہے کہ بندہ کی طرف سے اللہ کی اطاعت چاہتی ہے کہ اللہ بندے سے محبت کرے۔ اللہ نے اپنے

رسول ﷺ کو حکم دیتے ہوئے فرمایا ہے اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو، ایسا کرو گے تو اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا قول نقل کرتے ہوئے فرمایا تھا، میرا بندہ نوافل کے ذریعہ سے میرے قریب آجاتا ہے یہاں تک کہ مجھے اس سے محبت ہو جاتی ہے رواہ البخاری عن ابی ہریرۃ فی حدیث طویل۔ محبت، مہربانی چاہتی ہے اور مہربانی کا تقاضا ہے کہ ہر بھلائی عطا کی جائے اور ہر دکھ دور کر دیا جائے۔

دوسرے شبہ کا جواب یہ ہے کہ اعمال کے فرق کے لحاظ سے جنت کے درجات مختلف ہیں جن کا حصول اعمال کے ذریعہ سے ہوگا اگرچہ جنت میں ابتدائی داخلہ اور اس کے اندر ہمیشہ رہنا محض اللہ کے فضل و رحمت سے ہوگا اس کی تائید حضرت ابن مسعودؓ کے اس قول سے ہوتی ہے جو ہناد نے الزہد میں نقل کیا ہے، حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا تم پل صراط سے اللہ کے عفو کی وجہ سے پار ہو جاؤ گے اور جنت کے اندر اللہ کی رحمت سے داخل ہو گے اور درجات جنت کی تقسیم تمہارے اعمال کے مطابق ہو گی۔ ابو نعیم نے عون بن عبداللہ کی روایت سے بھی یہ قول نقل کیا ہے۔

وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ یُّرْسِلَ الرِّیَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّلِیُذِیْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَلِتَجْرِیَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ اور اسی کی نشانیوں میں سے (ایک) یہ ہے وہ ہواؤں کو بھیجتا ہے خوش خبریاں دیتی ہوئی اور اس لئے کہ تم کو اپنی رحمت کا مزہ چکھائے اور اس لئے کہ کشتیاں اس کے حکم سے (ہواؤں کی مدد سے) رواں ہوں اور اس لئے کہ تم اس کے فضل کی تلاش کرو اور تاکہ تم شکر ادا کرو۔

مِنْ اٰیٰتِهٖۤ یعنی اللہ کی قدرت کے دلائل میں سے ایک دلیل یہ ہے۔

اَنْ یُّرْسِلَ الرِّیَاحَ کہ وہ جنوب سے شمال کو اور شمال سے جنوب کو مغرب سے مشرق کو اور مشرق سے مغرب کو اپنے ارادے کے موافق ہوائیں چلاتا ہے۔ حس اور تجربہ بتاتا ہے کہ کوئی (ظاہری) محرک نہیں ہوتا (کہ ہوائیں ایک رخ سے دوسرے رخ کی طرف چلیں صرف اللہ کا ارادہ ہی اس کا محرک ہوتا ہے)

مُبَشِّرٰتٍ بارش کی خوش خبری دینے والیاں۔

وَّلِیُذِیْقَكُمْ تاکہ طرح طرح کے اناج اور پھلوں کے مزے چکھائے۔

وَلِتَجْرِیَ الْفُلْكُ اور اس غرض سے ہوائیں چلاتا ہے کہ ہواؤں کے ذریعہ سے بحکم خدا کشتیاں (اور جہاز) چلیں۔

وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ اور اس لئے ہوائیں چلاتا ہے کہ تم دریائی سفر کر کے تجارتی نفع حاصل کرو اور اللہ کے فضل کو طلب کرو۔

وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ اور اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرو اور دنیا و آخرت میں شکر کے ثمرات تم کو حاصل ہوں۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ اور آپ سے پہلے ہم بہت سے پیغمبر ان کی قوموں کے پاس بھیج چکے ہیں اور پیغمبر (اپنی سچائی کی) واضح نشانیاں لے کر ان کے پاس گئے۔ (قوم میں سے کسی نے ان کو سچا مانا اور کسی نے جھوٹا قرار دیا)

فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا ؕ تو ہم نے مجرموں سے انتقام لیا یعنی جن لوگوں نے انبیاء کو ماننے سے انکار کیا ان کو سزا دی۔

وَكَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ اور مومنوں کی مدد ہم پر لازم ہے یعنی جو لوگ پیغمبروں پر ایمان لائے ہم نے ان کی مدد کی کیونکہ مومنوں کی مدد کرنے کا ہم پر حق ہے مطلب یہ ہے کہ مومنوں کو فتحیاب کرنے کے لئے ہم نے کافروں کو عذاب دیا۔

ایک شبہ

آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ اللہ نے اپنی مہربانی سے مومنوں کو فتح یاب کرنا اپنے اوپر لازم کر لیا ہے یعنی کافروں کو مومنوں پر کبھی فتح حاصل نہیں ہو سکتی لیکن ہم اس کے خلاف کبھی کافروں کا مومنوں پر غلبہ دیکھتے ہیں۔

ازالہ

اَلْمُؤْمِنِيْنَ۔ الف لام عہدی ہے یعنی وہ مومن جو محض اللہ کا بول بالا کرنے کے لئے کافروں سے جہاد کرتے ہیں ان کی مدد کرنے کا حق اللہ نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے (اور پھر فوری غلبہ ضروری نہیں) کمال کار ان کو غلبہ اللہ کی طرف سے حاصل ہو گا۔

حضرت ابودرداءؓ کا بیان ہے میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے جو مسلم اپنے بھائی کی آبرو کی طرف سے دفاع کرتا ہے اللہ پر اس کا حق ہو جاتا ہے کہ وہ قیامت کے دن دوزخ کی آگ کو اس کی طرف سے لوٹا دے، پھر حضور ﷺ نے یہی آیت تلاوت فرمائی۔ ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ طبرانی اور اسحاق بن راہویہ نے یہ حدیث حضرت اسماءؓ بنت یزیدؓ کی روایت سے بیان کی ہے۔ بعض قراتوں میں حَقًّا پر وقف ہے اس صورت میں حَقًّا کا تعلق اِنْتَقَمْنَا سے ہو گا۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ وَيَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ اللہ ایسا ہے کہ وہ ہوائیں بھیجتا ہے پھر ہوائیں بادلوں کو اٹھا کر لاتی ہیں پھر اللہ جس طرح چاہتا ہے بادل کو (کبھی) آسمان میں پھیلا تا ہے (اور کبھی) اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے اور (دونوں صورتوں میں) تم کو مینہ اس کے اندر سے نکلتا دکھائی دیتا ہے۔

اَلسَّمَآءُ سے مراد ہے اوپر کی سمت جیسے دوسری آیت میں آیا ہے وَفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ

يَبْسُطُهٗ یعنی ایک طرف سے دوسری طرف کو رواں کرتا ہے۔ خواہ گھٹا کی شکل میں یا بغیر گھٹا کے۔ مقصد یہ ہے کہ کبھی پھیلا دیتا ہے اور کبھی ٹکڑے ٹکڑے الگ الگ کر دیتا ہے۔

فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۝ پھر جب وہ اپنے بندوں میں سے جن (کی بستی) پر اس کو پہنچا دیتا ہے وہ خوشیاں کرنے لگتے ہیں۔ یعنی کھیتیوں کے سرسبز ہو جانے سے خوش ہو جاتے ہیں۔

وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِيْنَ ۝ اور وہ لوگ (خوش ہونے سے پہلے) قبل اس کے کہ بارش ان پر نازل کی جائے یقیناً نا امید تھے۔

مِنْ قَبْلِهٖ پہلے مِنْ قَبْلِ کی تاکید ہے (بشرطیکہ مِنْ قَبْلِهٖ کی ضمیر کا مرجع بارش کے نزول کو قرار دیا جائے۔ لیکن مترجم نے جو ترجمہ کیا ہے اس کی بنا پر تاکید نہ ہو گی بلکہ مِنْ قَبْلِهٖ کی ضمیر استبعاد کی طرف راجع ہو گی) لفظ قبل کا تکرار بتا رہا ہے کہ بارش ہوئے بہت مدت گزر گئی تھی اور وہ بالکل نا امید ہو گئے تھے۔

مذکورہ تفسیر اس صورت میں ہو گی کہ وَاِنْ كَانُوْا میں اِنْ کو مخففہ مانا جائے لیکن بعض علماء نے اِنْ کو نافیہ قرار دیا ہے اور لَمُبْلِسِيْنَ کے لام کو اِلَّا (استثنائیہ) کے معنی میں کہا ہے یعنی وہ نہیں تھے مگر نا امید۔

فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ سو اللہ کی رحمت کے آثار دیکھو کہ وہ زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد کیسے زندہ کرتا ہے۔ کچھ شک

نہیں کہ وہی مردوں کو زندہ کرنے والا ہے۔

اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ یعنی بارش کے نتائج، سبزہ، درخت، غلہ، پھل

یُحْیِ الْاَرْضَ زمین کو سرسبز کر کے حیات بخشتا ہے۔

بَعْدَ مَوْتِهَا اس کے خشک ہونے کے بعد

اِنَّ ذٰلِكَ بیشک وہ، جو مردہ زمین کو زندہ کرنے پر قادر ہے۔

لَمُحْیِ الْمَوْتٰی ضرور مردوں کو زندہ کرے گا جب حیات بعد الموت نظروں کے سامنے ہے تو پھر اسی کی طرح دوبارہ زندہ ہونے کا انکار بے دلیل ہے۔

وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۝ اور وہ ہر چیز پر قادر ہے یعنی تمام ممکنات پر اس کی قدرت ایک جیسی ہے۔

وَلَئِنْ اَرْسَلْنَا رِیْحًا فَرَاَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ یَكْفُرُوْنَ۝

اور اگر ہم ان پر دوسری ہوا چلائیں پھر وہ کھیتی کو زرد شدہ دیکھیں تو وہ اس کے بعد ناشکری کرنے لگیں۔

رِیْحًا یعنی ایسی ہوا جو زمین کو خشک کر دے۔

فَرَاَوْهُ پھر وہ اس کا اثر یا کھیتی کو زرد دیکھیں۔

یَكْفُرُوْنَ اللہ کی نعمت کی ناشکری کرنے لگیں۔ کیونکہ ثبات حاصل نہیں، غور کرتے نہیں، عدم تفکر کی وجہ سے ان کی رائے متزلزل ہو جاتی ہے۔

اگر ان کی نظر درست ہوتی تو وہ اللہ پر اعتماد رکھتے، استغفار کرتے اور بارش نہ ہونے کی صورت میں اللہ سے التجا کرتے، رحمت سے مایوس نہ ہوتے، اگر اللہ اپنی رحمت سے ان پر مینہ برساتا تو طاعت خداوندی میں اور سرگرم ہو جاتے اور حد سے بڑھ کر خوشیاں نہ مناتے کہ خدا سے غافل ہو جاتے اور اگر ان کی کھیتی پر کوئی آفت آجاتی تو مصیبت پر صبر کرتے ناشکری نہ کرتے۔

فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی لہ بلاشبہ آپ مردوں کو نہیں سنا سکتے، یعنی انہوں نے حق کی طرف سے اپنے حواس باطنی اور آلات شعور معطل کر رکھے ہیں، اس لئے یہ بھی مُردوں کی طرح ہیں اور آپ مُردوں کو نہیں سنا سکتے۔

وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِیْنَ۝ اور نہ آپ نپٹ بہروں کو پکار سنا سکتے ہیں جب کہ وہ پیٹھ پھیر کر چل دیں۔

بہرے بہر حال پکار نہیں سنتے خواہ وہ پشت پھیرے جا رہے ہوں یا ان کا رخ پکارنے والے کی طرف ہو اور وہ متوجہ ہوں لیکن اگر متوجہ ہوں تو حرکات و اشارات سے مطلب سمجھ جاتے ہیں اور پشت پھیرے جا رہے ہوں تو سمجھ ہی نہیں سکتے، اسی لئے

لہ مسلم نے حضرت انس بن مالک کی روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بدر کے مقتولوں کو یوں ہی تین روز پڑا رہنے دیا جب ان کی لاشوں میں عفونت آگئی تو ان کی طرف تشریف لے گئے اور ان کو خطاب کر کے پکار کر فرمایا اے امیہ بن خلف اے ابو جہل بن ہشام اے عتبہ بن ربیعہ کیا تمہارے رب نے جو وعدہ کیا تھا وہ تم نے سچ پالیا۔ حضرت عمرؓ رسول اللہ ﷺ کی آواز سن کر فوراً آگئے اور عرض کیا "اے اللہ کے رسول ﷺ تین روز کے بعد بھی آپ ان کو پکار رہے ہیں کیا یہ سن رہے ہیں۔ اللہ نے تو فرمایا ہے اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی"۔ حضور ﷺ نے فرمایا "قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم ان سے زیادہ سننے والے نہیں لیکن یہ جواب نہیں دے سکتے"۔ حضرت ابن عمرؓ سے بھی ایسی ہی روایت آئی ہے۔ میں کہتا ہوں اگر یہ روایت صحیح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، مردے زندوں کا کلام سنتے ہیں تو اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ اپنے اختیار و قوت سے مردوں کو نہیں سنا سکتے کہ جب چاہو مردوں کو اپنا کلام سنا دو بلکہ اللہ جب چاہتا ہے مردوں کو زندوں کا کلام سنا دیتا ہے، یا یہ مطلب ہے کہ تم مُردوں کو ایسی بات نہیں سنا سکتے جو ان کو کوئی فائدہ پہنچا سکے (کیونکہ ہدایت پر عمل کرنے کا وقت گزر گیا)۔ از مفسر رحمۃ اللہ علیہ۔

عدم سماع کی شدت کو ظاہر کرنے کے واسطے اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ کی قید بڑھادی۔

وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِ الْعُمْىِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ اور نہ آپ اندھوں کو راستہ دکھا سکتے ہیں کہ ان کو گمراہی سے نکال دیں۔ اندھوں سے مراد کفار ہیں، کافروں کے پاس آنکھیں تھیں لیکن دیکھنے کا جو مقصد تھا وہ ان کو حاصل نہ تھا اس لئے ان کو نابینا قرار دیا یا اندھے پن سے مراد ہے دل کا اندھا ہونا۔

اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۵۳﴾ آپ تو بس انہی لوگوں کو سنا سکتے ہیں (یعنی ایسا سنا سکتے ہیں کہ وہ سمجھ جائیں اور مان لیں) جو ہماری آیات پر ایمان رکھتے ہیں، پس وہی (آپ کے حکم کی) اطاعت کرنے والے ہیں۔

یعنی جو ایمان لانے والے ہیں وہی آیات کے معانی پر غور کرتے ہیں (اس لئے آپ کے سنانے کا فائدہ انہیں کو پہنچتا ہے) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آیت میں مَنْ يُّؤْمِنُ سے مراد ہوں وہ لوگ جو قریب ایمان پہنچ چکے ہیں یا وہ لوگ مراد ہوں جن کے لئے اللہ نے مومن ہونا مقدر کر دیا ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضَعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضَعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضَعْفًا وَّشَيْبَةً ؕ اللہ ہی تو ہے جس نے تم کو ناتوانی کی حالت میں بنایا پھر ناتوانی کے بعد توانائی عطا کی پھر توانائی کے بعد ضعف اور بڑھاپا کر دیا۔

یعنی تمہاری ابتداء آفرینش ضعف طفولیت سے کی یا مراد یہ ہے کہ ضعف تمہاری زندگی کی بنیاد ہے (یعنی تمہاری تخلیق میں داخل ہے) جیسے دوسری آیت میں آیا ہے خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ یعنی عجلت انسان کی سرشت میں داخل ہے یا یہ مطلب ہے کہ تم کو ضعیف اصل یعنی نطفہ سے پیدا کیا ہے جیسے دوسری آیت میں آیا ہے اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ کیا حقیر پانی سے ہم نے تم کو نہیں پیدا کیا۔

مِنْۢ بَعْدِ ضَعْفٍ قُوَّةً یعنی ضعف طفولیت کے بعد جوانی دی۔

يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۚ اللہ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ یعنی ضعف، قوت، جوانی، بڑھاپا جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔

وَهُوَ الْعَلِيْمُ اور وہ ہی کامل مخلوق کی تدبیر کو خوب جانتا ہے۔

الْقَدِيْرُ ﴿۵۴﴾ (جو کچھ اس کی مشیت ہو اس پر وہ) قادر ہے۔

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اور جس روز قیامت برپا ہوگی۔ قیامت کو ساعت کہنے کی وجہ یہ ہے کہ قیامت دنیا کی آخری ساعت ہوگی یا یہ وجہ ہے کہ قیامت یکدم آجائے گی (یعنی اَلسَّاعَةُ کا معنی ہے فوراً یکدم آن کی آن میں۔ (مترجم)) اَلسَّاعَةُ غلبہ استعمال کی وجہ سے قیامت کا نام ہو گیا جیسے الکوکب زہرہ کو کہتے ہیں۔

يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۙ مجرم یعنی مشرک قسمیں کھائیں گے کہ۔

مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ ؕ وہ ایک ساعت سے سوا نہیں رہے۔ یعنی دنیا میں یا قبروں میں۔ آگے دوسری آیت میں آیا ہے۔ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ تم روز حشر تک قبروں میں رہے۔ اخروی عذاب کی مدت کے مقابلہ میں انہوں نے دنیا میں یا قبروں میں قیام کی مدت کو قلیل قرار دیا یا پچھلی طویل مدت قیام کو وہ بھول جائیں گے یا یوں کہا جائے کہ گزشتہ مدت تو بھولی بسری ہو گئی اس لئے اس کو ایک ساعت کہا۔

كَذٰلِكَ كَانُوْا يُؤْفَكُوْنَ ﴿۵۵﴾ دنیا میں اسی طرح الٹے چلا کرتے تھے۔ یعنی قیامت کے دن صداقت اور تحقیق مدت سے جس طرح دور و گردان ہوں گے اسی طرح دنیا میں حق کی طرف سے دور و گردان تھے اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک مانتے تھے اور قیامت کے منکر تھے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَالْاِيْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ٘
اور جن لوگوں کو علم اور ایمان دیا گیا ہے یعنی انبیاء اور مومن وہ کہیں گے تم اللہ کی کتاب میں (یعنی اللہ کی تحریر کے بموجب) روز حشر تک رہے۔

لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ یعنی جتنے زمانہ تک تمہارا قیام اللہ نے لکھ دیا تھا اتنی مدت تم رہے یا یہ معنی ہے کہ اللہ کی کتاب میں جتنی تمہاری مدت قیام لکھی ہوئی تھی اتنی مدت تک رہے۔ یا کتاب سے مراد ہے لوح محفوظ یا ان فرشتوں کی تحریر جو رحم مادر کے اندر بچہ بننے کے وقت تحریر پر مقرر ہوتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تمہارا تخلیقی مادہ ماں کے پیٹ میں چالیس روز تک بصورت نطفہ، پھر اتنی ہی مدت بصورت منجمد خون، پھر اتنی ہی مدت گوشت کے لوتھڑے کی شکل میں جمع رہتا ہے، پھر اللہ ایک فرشتہ کو چار باتیں لکھنے کے لئے مقرر کرتا ہے، فرشتہ اس شخص کے اعمال اور مدت زندگی وغیرہ لکھ دیتا ہے۔ یا کتاب اللہ سے مراد ہے قرآن مجید۔ اللہ نے فرمایا ہے وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ۔

فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَلٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝
سو یہ قیامت کا دن ہے مگر تم نہیں جانتے تھے۔ یعنی یہ وہی دن ہے جس کا انکار تم دنیا میں کرتے تھے۔ آج تمہارے انکار کا غلط ہونا ظاہر ہو گیا۔

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُهُمْ وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ۝
سو اس روز ظالموں کو ان کی معذرت فائدہ نہیں دے گی اور نہ ان سے خدا کی خفگی کا تدارک چاہا جائے گا۔

وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ - عتبیٰ کا معنی ہے رضامندی (قاموس) یعنی ان سے اللہ کو راضی کرنے والی باتیں نہیں کی جائیں گی دنیا میں اللہ کو راضی کرنے والے امور کا ان کو حکم دیا گیا تھا، آخرت میں موجبات رضا کی طلب نہ ہوگی۔ عربی محاورہ ہے، استعتبنی زید فارضیتہ زید نے مجھ سے ان باتوں کی طلب کی جن سے وہ راضی ہو جائے، میں نے زید کو راضی کرنے والی بات کر دی (یعنی اس کو راضی کر لیا) یا یہ مطلب ہے کہ قیامت کے دن ظالموں کی رضامندی مطلوب نہ ہوگی۔ مومنوں کو راضی رکھنا مطلوب ہوگا۔ حضرت ابو سعید خدری ؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ اہل جنت سے فرمائے گا، کیا تم راضی ہو، اہل جنت عرض کریں گے ہم کیسے راضی نہ ہوں گے جب کہ تو نے ہم کو وہ چیزیں عطا فرمائی ہیں جو کسی کو نہیں دیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں اس سے بھی بڑھیا چیز تم کو دیتا ہوں اہل جنت عرض کریں گے اس جنت سے بہتر اور کیا چیز ہے؟ اللہ فرمائے گا میں تم سے اپنی رضامندی (ہمیشہ کے لئے) لکھتا ہوں آئندہ (کبھی) تم سے ناراض نہیں ہوں گا۔ متفق علیہ۔ اللہ نے خود بھی فرمایا ہے، وَلَسَوْفَ يَرْضٰى۔

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ٘
اور ہم نے لوگوں کی ہدایت کے واسطے اس قرآن میں ہر طرح کے عمدہ مضامین بیان کئے ہیں۔

مَثَلٍ (کہاوت) سے مراد ہے ہر ایسا واقعی بیان جس کے اندر ندرت ہے۔ قیامت کے دن کافروں کو اٹھایا جائے گا۔ وہ کیا کہیں گے، ان سے کیا کہا جائے گا۔ ان کو کوئی عذر فائدہ نہیں پہنچائے گا۔ وغیرہ یا مثل سے مراد ہیں ایسی باتیں جو توحید۔ قیامت اور صداقت رسول کو ثابت کر رہی ہیں۔

وَلَئِنْ جِئْتَهُمْ بِاٰيَةٍ
اور اگر آپ ان کے سامنے کوئی آیت لے آئیں۔ یعنی قرآن کی کوئی آیت یا عصاء موسیٰ کی طرح کوئی (محسوس) معجزہ۔

لَّيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ ۝
تب بھی کافر کہیں گے کہ تم محض غلط کہتے ہو۔ یعنی رسول اللہ ﷺ کو اور مسلمانوں کو خطاب کر کے کہیں گے تم بیہودہ بے حقیقت باتیں کہتے ہو۔

كَذٰلِكَ
اسی طرح یعنی جس طرح ہم نے مکہ کے کافروں کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیا ہے اسی طرح اللہ ٹھپہ لگا دیتا ہے ان لوگوں کے دلوں

يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

پر جو (اللہ کی توحید کو) نہیں جانتے۔

لَا یَعْلَمُوْنَ سے مراد یہ ہے کہ اللہ کی توحید سے ناواقف ہیں یا یہ مراد ہے کہ ان کو علم کی طلب ہی نہیں ہے اپنے بے ہودہ عقائد پر جمے ہوئے ہیں، جہل مرکب معرفت حق سے روکتا اور تکذیب حق پر آمادہ کرتا ہے۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ سو آپ (ان کی اذیت رسانی پر) صبر کیجئے کیونکہ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ یعنی اللہ نے جب آپ کی مدد کرنے کا اور آپ کے مذہب کو تمام مذاہب پر غالب بنا دینے کا وعدہ کیا ہے وہ سچا ہے یہ وعدہ ضرور پورا ہو گا۔

وَّلَا یَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِیْنَ لَا یُوْقِنُوْنَ ۝ اور ایمان نہ رکھنے والے لوگ (آپ کو ایذائیں پہنچا کر اور آپ کی تکذیب کر کے) آپ کو غیر متحمل نہ بنا پائیں۔ ع

یا لَا یَسْتَخِفَّنَّكَ کا مطلب یہ ہے کہ یہ بے یقین لوگ آپ کو نادانی اور گمراہی کی پیروی پر آمادہ نہ کر پائیں۔

بحمد اللہ سورۂ روم کی تفسیر ۱۵ ر رجب ۱۲۰۶ھ کو ختم ہوئی اس کے بعد انشاء اللہ سورۂ لقمان کی تفسیر شروع ہو گی۔

الحمد للہ والمنۃ لہ کہ ۱۱ محرم الحرام ۱۳۹۱ھ کو تفسیر مظہری سورۂ روم کا ترجمہ ختم ہوا۔

فالشکر قبل لہ والشکر بعدلہ

سورۂ لقمان

یہ سورۃ مکی ہے اس میں ۳۴ آیات ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الٓمّٓ ۝ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۝ یہ حکمت والی کتاب کی آیات ہیں۔ حَكِيْمِ حکمت والی۔ یا حقیقت میں تو حکیم اللہ ہے اور کتاب کی طرف اس کی نسبت مجازاً کی گئی ہے۔

هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ جو کہ ہدایت اور رحمت ہے نیکوکاروں کے لئے جو نماز کی پابندی کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں کہ آخرت پر وہ پورا پورا یقین رکھتے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ سے آخر تک احسان کا بیان ہے یا یوں کہا جائے کہ اقامت صلوٰۃ، ادائے زکوٰۃ اور یقین آخرت احسان کی اہم شاخیں ہیں اس لئے صراحت کے ساتھ خاص طور پر ان کا ذکر کر دیا۔

هُمْ ضمیر کی تکرار مفید تاکید ہے۔

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے (نازل شدہ) ہدایت پر ہیں اور یہی (کامل طور پر، مترجم) کامیاب ہونے والے ہیں کیونکہ ان کے عقائد بھی صحیح ہیں اور اعمال بھی صالح ہیں۔

جو بیر نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ نضر بن حارث نے ایک مغنیہ خریدی تھی جب وہ سنتا کہ کوئی شخص مسلمان ہونے کا خواہشمند ہے تو جا کر اس کو مغنیہ کے پاس لے آتا اور باندی سے کہتا اس کو کھلا پلا اور گانا سنا پھر اس شخص سے کہتا محمد تو تم کو نماز پڑھنے روزہ رکھنے اور اپنے ہمراہی میں لڑنے کا حکم دیتے ہیں اور اسی کی دعوت دیتے ہیں یہ چیزیں (جن کی دعوت میں تم کو دے رہا ہوں) ان کی دعوت سے بہتر ہیں اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ اور بعض آدمی ایسا بھی ہے جو اللہ سے غافل بنا دینے والی باتوں کو خرید تا ہے تاکہ اللہ کی راہ سے بے سمجھے بوجھے گمراہ کر دے۔

لَهْوَ الْحَدِيْثِ یعنی بے اصل غلط سلط قصے غیر معتبر داستانیں، بے ہودہ باتیں اور ہنسانے والا لغو کلام جو مفید باتوں سے باز رکھتا ہے۔ لَهْوَ الْحَدِيْثِ میں اگر حدیث سے مراد ہو بری بات تو اضافت بیانیہ ہوگی، اور اگر حدیث سے عام باتیں مراد ہوں اچھی ہوں یا بری تو اضافت تبعیضیہ ہوگی۔

ابن جریر نے بروایت عوفی حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول ایک قریشی شخص کے حق میں ہوا جس نے ایک مغنیہ باندی خریدی تھی۔

بغوی نے حضرت ابو سلمہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا گانے والی عورتوں کو (گانے کی) تعلیم

دینا جائز نہیں اور ان کی قیمت حرام ہے (یعنی ان کو فروخت کرنا ناجائز ہے) اور ایسے ہی شخص کی بابت آیت وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْتَرِیْ لَهْوَ الْحَدِیْثِ الخ نازل ہوئی ہے۔ جو آدمی گانے کے لئے آواز اٹھاتا ہے اللہ دو شیطان اس پر مسلط کر دیتا ہے ایک اس مونڈھے پر اور دوسرا اس مونڈھے پر بیٹھے اپنی لاتیں اس وقت تک اس پر مارتے رہتے ہیں جب تک وہ خود ہی خاموش نہ ہو جائے۔ ترمذی وغیرہ نے حضرت ابوامامہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، گانے والی باندیوں کو نہ بیچو نہ خریدو ان کی تجارت میں کوئی بھلائی نہیں، ان کی قیمت حرام ہے اور ایسے ہی شخص کی بابت آیت وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْتَرِیْ لَهْوَ الْحَدِیْثِ نازل ہوئی۔

بغوی نے مقاتل اور کلبی کا بیان نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول نضر بن حارث بن کلدہ کے حق میں ہوا۔ نضر تجارت کرتا تھا، حیرہ کو جاتا اور وہاں سے عجمیوں کے افسانے خرید کر لاتا اور قریش سے بیان کرتا اور کہتا محمد تم سے عاد و ثمود کے قصے بیان کرتے ہیں اور میں رستم و اسفندیار کے قصے اور شاہان ایران کی حکایتیں بیان کرتا ہوں۔ لوگ اس کی باتیں مزے لے لے کر سنتے تھے اور قرآن سننا چھوڑ دیتے تھے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے اسی طرح نقل کیا ہے۔

مجاہد نے کہا لَهْوَ الْحَدِیْثِ سے مراد ہیں گانے والی عورتیں اور مرد۔ اس صورت میں لَهْوَ سے پہلے مضاف محذوف ہو گا، یعنی کچھ لوگ لہو والیاں اور لہو والے (گانے والیاں اور گانے والے) خریدتے ہیں یا یہ مطلب ہے کہ کچھ لوگ قرآن چھوڑ کر گانے بجانے کے آلات اور گانے کو پسند کرتے ہیں (اس مطلب پر خریدنے سے مراد ہو گا ترجیح دینا) مکحول کا قول ہے کہ جس نے گانے بجانے کی غرض سے کسی گانے بجانے والی باندی کو خرید اور اس پر مرتے دم تک قائم رہا اس کے جنازے کی نماز نہیں پڑھو گا کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْتَرِیْ لَهْوَ الْحَدِیْثِ الخ

حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابن عباسؓ، حسن، عکرمہ اور سعید بن جبیرؓ کے نزدیک لَهْوَ الْحَدِیْثِ سے گانا سننا مراد ہے اور غنا ہی کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔ ابوالصہباء بکری کا بیان ہے میں نے حضرت ابن مسعودؓ سے اس آیت کے متعلق دریافت کیا حضرت ابن مسعودؓ نے تین بار فرمایا قسم ہے اس کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں یہ (لَهْوَ الْحَدِیْثِ) غنا ہے۔ ابن جریج کے نزدیک لَهْوَ الْحَدِیْثِ سے طبل (ڈھول، طبلہ) مراد ہے۔

میں کہتا ہوں مورد نزول اگرچہ کوئی خاص چیز ہو غنا (گانا سننا) ہو یا عجمی قصے، داستانیں لیکن الفاظ عام ہیں اور عموم الفاظ ہی قابل اعتبار ہیں اسی لئے قتادہ نے کہا کہ آیت میں ہر لہو و لعب مراد ہے اور ضحاک کے نزدیک شرک مراد ہے۔

مسئلہ

باتفاق فقہاء ہر قسم کا باجا، طبلہ، ڈھول وغیرہ خواہ بغیر تار کے بجایا جائے یا تار کے ساتھ بہر حال حرام ہے[1] حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کتے کی قیمت اور بانسری و بین کی کمائی سے منع فرمایا ہے رواہ البغوی۔ حضرت ابومالک

---

[1] الحق میں ہے باجا بجانا اور سننا حرام ہے۔ فتاوی کبریٰ میں ہے طبل بجانا اور سننا حرام ہے کیونکہ ڈھول آلہ لہو ہے۔ ہاں لڑائی کے موقع پر یا قافلہ کے لئے اطلاع کی ڈھول پیٹنا جائز ہے۔ مجاہدین کو اور قافلہ کو نقارہ سے اطلاع دینا موجب ثواب ہے۔ ملتقط میں ہے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ خوشی کے موقع پر اور شادی کی تقریب میں گانا جائز ہے۔

دیکھو نکاح کے موقع پر دف بجانا جائز ہے۔ دف بھی ایک قسم کا لہو ہی ہے لیکن اس کا مقصد ہوتا ہے اعلان نکاح، اس لئے جائز ہے۔ اعلان نکاح کا حکم رسول اللہ ﷺ نے دیا ہے، ارشاد فرمایا ہے نکاح کا اعلان کرو خواہ دف ہی کے ذریعہ سے ہو۔ اسی پر فتویٰ بھی ہے۔ ذخیرہ میں ہے کچھ لوگ کہتے ہیں عید میں دف بجانے میں کوئی گناہ نہیں۔ روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ گھر کے اندر تشریف فرما تھے، عید کا دن تھا دو لڑکیاں دف بجا کر گا رہی تھیں۔ حضرت ابوبکرؓ باہر سے آ گئے اور فرمایا تم رسول اللہ ﷺ کی دہلیز پر گا رہی ہو۔ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا ابوبکرؓ ان کو چھوڑ دو آج عید کا دن ہے۔ (از مفسر قدس سرہ)

اشعری ؓ کا بیان ہے، میں نے خود سنا کہ رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے میری امت کے کچھ لوگ شرابیں پئیں گے اور ان کا نام کچھ اور رکھ دیں گے (عرق مقوی، آب حیات، سیرپ وغیرہ۔ مترجم) ان کے سامنے باجے بجائے جائیں گے اور گانے والیاں گائیں گی اللہ ان کو زمین میں دھنسا دے گا اور بعض کو بندر اور سور بنا دے گا، رواہ ابن ماجۃ۔ ابن حبان نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ اس کی اصل صحیح بخاری میں موجود ہے، حضرت علی بن ابی طالب ؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جب میری امت پندرہ باتیں کرے گی تو اس پر مصائب کا نزول ہوگا۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ وہ کیا باتیں ہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا،

(۱) جب مال غنیمت کو دولت سمجھ لیا جائے گا (یعنی لوگ مال غنیمت کمانے کے لئے جہاد کریں گے۔ مترجم)
(۲) جب امانت کے مال کو غنیمت کا مال سمجھا جائے گا۔
(۳) جب زکوٰۃ کو ڈانڈ سمجھا جائے گا۔
(۴) جب مرد اپنی بیوی کا فرماں بردار بن جائے گا۔
(۵) اور اپنی ماں کی نافرمانی کرے گا۔
(۶) اور دوست سے اچھا سلوک کرے گا۔
(۷) اور باپ پر ظلم کرے گا۔
(۸) اور جب مسجدوں میں آوازیں اٹھنے لگیں گی۔
(۹) اور سب سے رذیل آدمی قوم کا سردار بن جائے گا۔
(۱۰) اور (شریر) آدمی کی عزت اس لئے کی جائے گی کہ اس کی شر سے حفاظت ہو جائے۔
(۱۱) اور شراب پی جائے گی۔
(۱۲) اور ریشمی کپڑے پہنے جائیں گے (یعنی مرد پہننے لگیں گے۔ مترجم)
(۱۳) اور گانے والیاں رکھی جائیں گی۔
(۱۴) اور باجے، ڈھولک، طبلہ استعمال کئے جائیں گے۔
(۱۵) اور پیچھے آنے والے لوگ اسلاف پر لعنت بھیجیں گے۔ ایسے وقت میں لوگوں کو سرخ آندھی اور زمین میں دھنسائے جانے کا انتظار کرنا چاہئے (ایسا ضرور ہو کر رہے گا)۔ رواہ الترمذی وقال غریب۔

مسئلہ

فقہاء نے کہا اس آیت کی رو سے اور دوسرے احادیث کی وجہ سے گانا سننا حرام ہے۔
صوفیاء کا قول ہے کہ جس شخص کا دل یاد الٰہی میں ہر وقت مشغول ہو، ذکر خداوندی سے اس کو اطمینان حاصل ہو، غیر کی طرف التفات بھی نہ ہو، مجلس اغیار سے خالی ہو، نماز وغیرہ کا وقت بھی نہ ہو اور گانے والا محل شہوت بھی نہ ہو (یعنی عورت اور امرد، زنانہ وغیرہ نہ ہو) ایسے شخص کے لئے نہ فقط سماع جائز ہے بلکہ مستحب ہے، صوفی کے دل میں چھپی ہوئی افسردہ آتش محبت سماع سے بھڑک اٹھتی ہے اسی لئے عام لوگوں کے لئے سماع حرام ہے ان کی محبت کا مرکز عورتیں ہیں یا امرد لڑکے۔ سماع سے ان کی یہ (شہوانی) محبت تیز ہو جاتی ہے اور یاد خدا سے مزید غفلت پیدا ہو جاتی ہے ان لوگوں کے لئے حقیقت میں سماع لہو الحدیث ہے لیکن جس کے دل میں ہر وقت محبت مولیٰ کی لو لگی ہو، دل کا ہر گوشہ غیر اللہ کی محبت سے خالی ہو اس کے لئے تو سماع محبت الٰہی کی آگ کو اور مشتعل کر دیتا ہے۔ اس لئے اس کے لئے مستحب ہے۔[1] غنا کی ممانعت کی جو نصوص آئی ہیں ان کا جواب یہ ہے کہ آیت مذکورہ میں لہو الحدیث کی حرمت آئی ہے اور صوفیاء کا سماع لہو الحدیث نہیں ہوتا۔ رہیں وہ احادیث جن سے حرمت غنا

[1] شرح کافی میں ہے ہمارے علماء کے نزدیک وہ سماع مکروہ ہے جو گناہ کے ارادے بطور لہو ہو، کچھ فاسق لوگ جمع ہو جائیں گانے والی وغیرہ (واللہ اعلم)

ظاہر ہوتی ہے تو وہ مخصوص البعض ہیں کیونکہ بعض دوسری احادیث میں جو ذکر آیا ہے (اس سے معلوم ہوا کہ بعض قسم کے غنا حرام ہیں اور بعض سماع جائز ہیں) اس لئے ہم کہتے ہیں کہ حرمت سماع والی حدیثوں کا مطلب لہو الحدیث والے سماع کی ممانعت ہے جو دعوت گناہ دے رہا ہو شرعی غرض کے لئے نہ ہو۔

من جملہ ان احادیث کے جن سے غناء کا جواز بلکہ دف بجانے کی بھی اباحت ظاہر ہو رہی ہے ایک وہ حدیث ہے جس کی راوی ربیع بنت معوذ بن عفراؓ ہیں۔ حضرت ربیعؓ کا بیان ہے کہ میری شادی کے دن رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور اس طرح میرے پاس بیٹھ گئے جیسے تم میرے قریب بیٹھے ہو، کچھ لڑکیاں دف بجا کر ان لوگوں کا مرثیہ گانے لگیں جو بدر کے دن مقتول ہوئے تھے ایک لڑکی نے یہ مصرعہ گایا وَفِیْنَا نَبِیٌّ یَعْلَمُ مَافِیْ غَدٍ ہمارے اندر ایک ایسا نبی ہے جو آنے والے کل کی باتیں جانتا ہے، حضور ﷺ نے اس لڑکی سے فرمایا اس کو چھوڑ، جو کہہ رہی تھی وہی کہہ، رواہ البخاری۔ ابن ماجہ کی روایت میں اتنا زائد ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا یہ بات مت کہو آنے والے کل کی بات سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں جانتا۔

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ ایک انصاری شخص سے ایک عورت کی شادی ہوئی اور وہ دولہن ہو کے شوہر کے گھر گئی، حضور ﷺ نے فرمایا تمہارے پاس کوئی لہو (گانا بجانا) نہیں ہے ان کو لہو پسند ہوتا ہے۔ رواہ البخاری۔

حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس نکاح کا اعلان کیا کرو اور مسجدوں میں کرو اور اس پر دف بجاؤ (یعنی خوب شہرت دو) رواہ الترمذی و قال ہذا حدیث غریب۔

(گزشتہ سے پیوستہ) اور تلاوت قرآن کے تارک ہوں اور سب اکٹھے ہو کر گاتے ہیں لیکن جو لوگ نمازی متقی اور عامل بالقرآن ہوں ان کے لئے باتفاق علماء سماع سے ان کا مقصد توجہ الی اللہ اور حضور قلب ہوتا ہے، وہ آخرت کے خوف سے اللہ کی یاد کرتے ہیں اور یہ تمام امور مستحسن ہیں ان میں کوئی خرابی نہیں بلکہ اسی غرض سے وجد اور رقص بھی مذموم نہیں۔

نوری شرح بزدوی مصنفہ ابو القاسم بن محمد بن عبداللہ دمشقی میں آیا ہے کہ سماع کے متعلق علماء میں اختلاف ہے ان فاسق لوگوں کیلئے تو حرام ہے جو لہو و لعب جمع ہو جائیں شرابی ہوں اور نمازوں کے تارک۔ لیکن اس مرد صالح متقی کے لئے حلال ہے جو نماز کا پابند اور قرآن و ورد کا نگران ہو، مقررہ وظیفہ اور تلاوت قرآن کی مداومت کرتا ہو اس شخص کے لئے سماع کی حلت میں کسی عالم کا اختلاف نہیں۔ یہی حکم رقص اور وجد کا ہے۔

الاقناع میں ہے کہ سماع سے دل میں رقت اور خشوع پیدا ہوتا ہے، اللہ کے دیدار کا شوق برانگیختہ ہوتا ہے اللہ کی ناراضگی کا ڈر اور اس کے عذاب کا خوف دل پر چھا جاتا ہے۔ اس طرح کے سماع میں ہوائے نفسانی اور لہو خاطر کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔

شیخ شہاب الدین سہروردی نے العوارف میں لکھا ہے کہ سماع اللہ کریم کی رحمت کو کھینچ کر لاتا ہے۔ واللہ اعلم۔ فتاوی خلاصہ میں ذکر کیا گیا ہے کہ عام طور پر مشائخ کے نزدیک دوسروں کی وحشت دور کرنے (یعنی دوسروں کی تفریح اور لذت بخشی کے لئے گانا مکروہ ہے لیکن بعض مشائخ نے شادی اور خوشی کے موقع پر اس کو جائز قرار دیا ہے، اپنی وحشت خاطر اور کبیدگی کو دور کرنے کے لئے گانا بعض مشائخ کے نزدیک مکروہ نہیں ہے، امام سرخسی نے اسی قول کو اختیار کیا ہے ان لوگوں کے نزدیک وہ گانا مکروہ ہے جو لہو و لعب کے طور پر ہو۔ بعض علماء قائل ہیں کہ گانا ہر طرح مکروہ ہے امام خواہر زادہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

جامع المضمرات میں النافع اور ذخیرہ کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے کہ اگر مغنی دوسروں کو سنانے کے لئے نہ گائے بلکہ اپنی کبیدگی اور وحشت خاطر کو دور کرنے کے لئے گائے تو کوئی حرج نہیں۔ میں نے امام نجم الدین رحمۃ اللہ علیہ سے یہ بھی سنا ہے کہ اپنی لونڈی کا گانا بھی اگر (وحشت خاطر دور کرنے کے لئے) سنے تو کوئی گناہ نہیں۔ اس قول کو واقعات حسامیہ سے نقل کیا گیا ہے۔ عوارف میں لونڈی کے ساتھ اپنی بی بی کا لفظ بھی مذکور ہے (یعنی اگر اپنی بی بی سے بھی گانا سن لیا جائے تو مباح ہے)۔ فتاوی ابراہیم شاہی میں بھی اسی طرح مذکور ہے...... محیط میں (سرخسی نے ذکر کیا) ہے کہ امام محمدؒ نے سیر کبیر میں بیان کیا ہے کہ حضرت انسؓ بن مالک اپنے بھائی براء بن مالک کے پاس گئے اس وقت وہ گا رہے تھے۔

انتہی۔ (از مفسر رحمۃ اللہ)

حضرت عائشہؓ کا بیان ہے میرے پاس ایک انصاری لڑکی تھی میں نے اس کا نکاح کرا دیا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، عائشہ! کیا کوئی غنا نہیں ہے، انصاریوں کا یہ قبیلہ تو غنا کو پسند کرتا ہے، رواہ ابن حبان فی صحیحہ...... حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ حضرت عائشہؓ نے اپنی کسی قرابتدار لڑکی کا کسی انصاری سے نکاح کرا دیا رسول اللہ ﷺ اندر تشریف لائے تو فرمایا، کیا تم نے لڑکی کو رخصت کر دیا؟ حاضرین نے عرض کیا جی ہاں۔ فرمایا کیا تم نے اس کے ساتھ کسی گانے والے یا گانے والی کو بھیجا ہے؟ حضرت عائشہؓ نے کہا نہیں۔ فرمایا انصاری لوگوں کے اندر تغزل ہے (یعنی ان کو غناء پسند ہے) اگر تم لڑکی کے ساتھ کسی کو یہ گانے کے لئے بھیج دیتے اتینا کم اتینا کم فحیانا وحیا کم (تو بہتر ہوتا) ہم تمہارے پاس آگئے اللہ ہم کو بھی مبارک کرے اور تم کو بھی۔ رواہ ابن ماجہ۔

عامر بن سعدؒ راوی ہیں کہ ایک شادی میں، میں شریک ہوا وہاں حضرت قرظہ بن کعب اور حضرت ابو مسعود انصاری بھی موجود تھے اور لڑکیاں گا رہی تھیں۔ میں نے عرض کیا اے رسول اللہ ﷺ کے صحابہؓ اور اے اہل بدر تمہارے سامنے یہ کیا کیا جا رہا ہے، دونوں نے جواب دیا، اگر تم چاہو تو بیٹھ جاؤ اور ہمارے ساتھ تم بھی سنو، اور اگر جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ، ہم کو شادی میں لہو (گانا سننے) کی اجازت دے دی گئی ہے۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ میرے پاس حضرت ابو بکرؓ تشریف لائے، حج (یعنی عید) کا زمانہ تھا، میرے پاس دو لڑکیاں بیٹھی دف بجا رہی تھیں اور رسول اللہ ﷺ چہرے پر کپڑا ڈالے (لیٹے) ہوئے تھے۔ حضرت ابو بکرؓ نے لڑکیوں کو جھڑکا، حضور والا نے چہرہ کا کپڑا کھول دیا اور فرمایا ابو بکر ان کو رہنے دو یہ عید کے دن ہیں۔ رواہ البخاری۔ ابن ماجہ کی روایت میں اتنا زائد ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ہر قوم کا تہوار ہوتا ہے اور ہمارا یہ تہوار ہے۔

حضرت عمرو بن شعیبؒ کے دادا کی روایت ہے کہ ایک عورت نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! میں نے نذر مانی تھی کہ جب آپ تشریف لے آئیں گے تو اس خوشی میں آپ کے سر پر دف بجاؤں گی، حضور ﷺ نے فرمایا اپنی منت پوری کر لو۔ رواہ ابو داؤد۔ اور یہ بات طے شدہ ہے کہ حضور ﷺ نے ہی فرمایا اللہ کی نافرمانی کی نذر کو پورا نہ کیا جائے (اگر دف بجانا معصیت ہوتا تو آپ اجازت نہ دیتے) رواہ مسلم...... یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ میں تشریف لائے اور بنی نجار کے محلہ میں فروکش ہوئے تو بنی نجار کی لڑکیاں یہ شعر گانے اور کہنے لگیں۔

نحن جوار لنا بنی نجار　　یا حبذا محمدا من جار

(ہم بنی نجار کی لڑکیاں ہیں محمد بہترین مہمان ہیں۔) رواہ ابن ماجہ عن انس۔
اسی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جواب میں فرمایا، اللہ واقف ہے کہ میں تم سے محبت رکھتا ہوں۔
بیہقی نے حضرت عائشہؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ میں تشریف لائے تو عورتیں لونڈیاں اور بچے یہ شعر گانے لگے، طلع البدر علینا من ثنیات الوداع وجب الشکر علینا ما دع اللہ داع۔
وداع کی گھاٹیوں سے چودھویں کا چاند نکل آیا　　ہم پر اس کا شکر ادا کرنا ہمیشہ واجب ہے
اے نبی ﷺ مبعوث آپ واجب التعمیل احکام لے کر آئے۔
امام احمد نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ میں تشریف لائے تو حضور ﷺ کی آمد کی خوشی میں حبشیوں نے چھوٹے چھوٹے برچھوں کا کھیل کیا۔
محمد بن حاطب جمحی راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، گانا اور نکاح میں دف بجانا حلال و حرام میں امتیاز (کی علامت) ہے۔ رواہ احمد والترمذی ابن ماجہ والنسائی۔[1]

---

[1] احیاء العلوم میں امام غزالیؒ نے لکھا ہے خوشی کے اوقات میں سماع سے سرور میں ہیجان اور اضافہ ہوتا ہے اگر سرور مباح ہو تو ایسا سرور آفریں سماع و غنا بھی مباح ہے۔ جیسے عید، شادی، ولیمہ، پردیسی کی واپسی کے وقت یا عقیقہ اور بچہ پیدا ہونے اور ختنہ کے موقع پر یا حفظ قرآن کی تقریب پر ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں بچہ کو قرأت کیلئے قاری کے سپرد کرنے کے وقت غنا بھی اسی حکم میں ہے۔ (از مفسر رحمۃ اللہ)

تقریر مذکورہ بالا سے ظاہر ہو گیا کہ گانا سننا اور گانا وہ حرام ہے جو گناہ کی دعوت دے رہا ہو اور اللہ کی یاد سے غافل بنا رہا ہو اگر ایسا نہ ہو تو حلال ہے حرام نہیں ہے۔ ہاں یہ بات الگ ہے کہ رسول اللہ ﷺ یا صحابہ کا گانا سننا اور قربت الٰہی کے حصول کا ذریعہ قرار دینا ثابت نہیں ہے اسی لئے اکابر نقشبندیہ گانا نہیں سنتے لیکن اس کی تردید بھی نہیں کرتے۔

بِغَیْرِ عِلْمٍ (علم کا مفعول محذوف ہے۔ مترجم) یعنی وہ نہیں جانتا کہ جس چیز کو خرید رہا ہے وہ کیسی ہے یا تجارت کی کیفیت نہیں جانتا کہ اس نے قرات قرآن کے عوض لہو کو اختیار کیا۔ قتادہ نے کہا یہ آدمی کی بڑی گمراہی ہے کہ حدیث حق کو چھوڑ کر وہ کلام باطل کو پسند کرے۔

وَّ یَتَّخِذَهَا هُزُوًا ؕ اور اللہ کی آیات کو مذاق کی چیز بنالے۔

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ ۝ انہیں لوگوں کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَیْهِ اٰیٰتُنَا وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ یَسْمَعْهَا كَاَنَّ فِیْۤ اُذُنَیْهِ وَقْرًا ۚ

اور جب اس کے سامنے ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں تو غرور سے پشت پھیر لیتا ہے (ان کی طرف توجہ ہی نہیں کرتا) گویا اس نے آیات کو سنا ہی نہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے اس کے کانوں میں ڈاٹ لگی ہوئی ہے۔ ڈاٹ سے مراد ہے ثقل سماعت گراں گوشی جو سننے سے روکتی ہے۔

فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝ آپ اس کو دردناک عذاب کی خبر دے دیجئے۔ عَذَابٍ اَلِیْمٍ کی اطلاع خوش خبری نہیں ہوتی بطور استہزاء اس کو بشارت فرمایا (مطلب یہ کہ وہ ہر بشارت سے محروم ہے کسی بشارت کا مستحق نہیں۔ اگر اس کے لئے بشارت ہے تو بس یہی کہ وہ دردناک عذاب میں مبتلا ہوگا۔ مترجم)

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتُ النَّعِیْمِ ۝ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝ جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے ان کے لئے بلاشبہ راحت کے باغ ہوں گے جن کے اندر ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ نے یہ پکا سچا وعدہ کر لیا ہے اور وہی غالب حکمت والا ہے۔

وَ هُوَ الْعَزِیْزُ یعنی وہ ہی سب پر غالب ہے وعدہ ثواب اور وعید عذاب پورا کرنے سے اس کو کوئی روک نہیں سکتا۔

الْحَكِیْمُ، حکمت والا ہے، یعنی جیسا اس کی حکمت کا تقاضا ہوتا ہے ویسا ہی کرتا ہے، خلاف حکمت کچھ نہیں کرتا۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَ اَلْقٰى فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِكُمْ

اللہ نے آسمان بنائے بغیر ستونوں کے جو تم کو دکھائی دیتے ہوں اور زمین میں ڈال دیئے پہاڑ کہ وہ تم کو لے کر ڈانواڈول نہ ہونے لگے۔ رواسی زمین میں گڑے ہوئے پہاڑ۔

وَ بَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ؕ وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِیْمٍ ۝

اور اس میں ہر قسم کے جانور پھیلا رکھے ہیں اور ہم نے آسمان سے پانی اتارا اور پھر اس (زمین) میں ہر طرح کے عمدہ اقسام اگائے۔

هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ یہ تو اللہ کی بنائی ہوئی چیزیں ہیں اب تم مجھ کو دکھاؤ کہ اللہ کے سوا جو ہیں انہوں نے کیا چیز پیدا کی۔

یعنی جو کچھ تم کو دکھائی دے رہا ہے وہ سب تو خدا کا پیدا کردہ ہے پھر بتاؤ کہ دوسرے معبودوں نے کیا پیدا کیا کہ وہ مستحق عبادت قرار پا گئے۔

بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ (اور کوئی وجہ نہیں) بلکہ یہ کافر کھلی ہوئی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔ ع ۱

ترونھا عمد کی صفت ہے۔ ستون دکھائی نہ دینے کی دو صورتیں ہیں (۱) آسمانوں کو تھامنے والا کوئی سہارا ہو اور دکھائی

نہ دیتا ہو (۲) کوئی ستون ہی نہ ہو دونوں صورتوں میں جملہ صحیح ہے۔

اللہ نے آسمانوں کی بلا ستون تخلیق، زمین میں پہاڑوں کے ثبات، آسمان کی طرف سے بارش کے نزول اور پانی سے ہر عمدہ سبزہ کی روئیدگی کو ظاہر کر کے اپنی قدرت کاملہ اور ہمہ گیر علم پر استدلال کیا اور اس کو دعویٰ توحید کے ثبوت میں پیش کیا پھر دوسرے معبودوں کا عجز عن التخلیق ظاہر کر کے توحید کو ثابت کیا اور آخر میں مشرکوں کے گمراہ ہونے پر مہر ثبت کردی۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اور ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی۔

بغوی نے لکھا ہے لقمان بن باعور بن ناخور بن تارخ۔ تارخ ہی کو آزر کہا جاتا ہے۔ وہب بن منبہ نے کہا لقمان حضرت ایوب کے بھانجے تھے۔ مقاتل نے کہا خالہ کے بیٹے تھے۔ بیضاوی نے لکھا ہے لقمان حضرت داؤد کے زمانہ تک زندہ تھے اور فتویٰ دیا کرتے تھے لیکن حضرت داؤد کی بعثت کے بعد فتویٰ دینا چھوڑ دیا اور فرمایا اب میری ضرورت نہیں پھر کیوں فتویٰ دینے سے باز نہ رہوں۔ واقدی نے کہا لقمان بنی اسرائیل کے قاضی تھے۔ تفسیر در منثور میں ہے کہ ابن ابی شیبہ کی روایت ہے اور امام احمد نے الزہد میں بھی اس کو بیان کیا ہے اور کتاب المملوکین میں ابن ابی الدنیا نے بھی یہی لکھا ہے۔ نیز ابن جریر، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم کا بھی بیان ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا، لقمان ایک حبشی غلام تھے، جو بڑھئی کا پیشہ کرتے تھے بغوی نے خالد ربعی کی روایت سے بھی یہی لکھا ہے، مجاہد نے کہا لقمان حبشی غلام تھے ہونٹ بڑے بڑے تھے اور قدم پھٹے ہوئے تھے۔ سعید بن مسیب نے کہا درزی تھے۔ بعض کا قول ہے بھیڑیں بکریاں چرایا کرتے تھے۔

حکمت کا اطلاق انصاف، علم، حلم نبوت، قرآن اور انجیل سب پر ہوتا ہے کذا فی القاموس۔ حدیث ان من الشعر لحکمۃ میں حکمت سے مراد ہے علم۔ اور حدیث الاوفی راسہ حکمۃ میں حکمت سے مراد عقل ہے آیت مذکورہ میں سب معنی مراد ہو سکتے ہیں۔ بغوی نے لکھا علماء کا اتفاق ہے کہ لقمان نبی نہیں تھے ایک دانشور عالم تھے۔

عکرمہ تنہا لقمان کی نبوت کے قائل تھے۔ ابن ابی حاتم کا بیان ہے کہ وہب بن منبہ سے دریافت کیا گیا..... کیا لقمان نبی تھے؟ وہب نے کہا نہیں۔ ان کے پاس وحی نہیں آئی تھی ہاں دانشمند آدمی تھے۔ ابن جریر نے مجاہد کا بھی یہی قول بیان کیا ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت لقمان کو اختیار دے دیا گیا کہ وہ نبوت پسند کر لیں یا حکمت..... لقمان نے حکمت کو پسند کر لیا۔

بغوی نے لکھا ہے لقمان دوپہر کو سو رہے تھے۔ خواب میں ہاتف نے ندا دی، لقمان کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ تم کو زمین میں اپنا خلیفہ بنا دے اور لوگوں پر تم صحیح حکومت کرتے رہو؟ خواب ہی میں لقمان نے ہاتف کو جواب دیا، اگر میرے رب نے مجھے اختیار دیا ہے تو مجھے عافیت پسند ہے (میں حکومت کے جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتا) اور اگر یہ اللہ کا قطعی حکم ہے تو بسر و چشم۔ کیونکہ میں خوب جانتا ہوں کہ جب اللہ کا یہ قطعی حکم میرے لئے ہوگا تو وہی فیصلہ کرنے میں میری مدد بھی کرے گا اور غلطی سے مجھے محفوظ رکھے گا۔ ہاتف نے پردۂ غیب سے آواز دی لقمان ایسا تم نے کیوں اختیار کیا؟ (یعنی عافیت کو کیوں پسند کیا۔) لقمان نے کہا سخت ترین اور الجھے ہوئے غیر واضح مقامات میں فیصلہ پر ہر طرف سے تاریکی چھائی ہوتی ہے ایسے مقام پر اگر لقمان کا فیصلہ صحیح پڑ گیا تو وہ نجات کا مستحق ہے اور اگر اس سے فیصلہ میں غلطی ہو گئی تو جنت کا راستہ کھو گیا، دنیا میں نچلا رہنا، سردار ہونے سے بہتر ہے۔ جو شخص آخرت پر دنیا کو ترجیح دیتا ہے اس کے ہاتھ سے دنیا بھی جاتی ہے اور آخرت بھی ہاتھ نہیں آتی۔ ملائکہ کو لقمان کی خوش گفتاری پر تعجب ہوا۔ اس کے بعد لقمان کو کسی روز سوتے میں اللہ نے حکمت عطا فرما دی اور بیدار ہونے کے بعد آپ ہر بات پُر حکمت کرنے لگے۔

حضرت داؤد کو اس کے بعد (عطاء حکمت یا اختیار حکمت کی) غیبی ہاتف نے ندا دی تو حضرت داؤد نے بلا شرط اس کو قبول کر لیا۔ اسی کا نتیجہ ہوا کہ آپ کئی مرتبہ غلطی میں پڑ گئے مگر ہر مرتبہ اللہ نے معاف فرما دیا۔ حضرت لقمان اپنی حکمت سے حضرت داؤد کی مدد کرتے تھے۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت میں حکمت سے مراد عدل اور انصاف کے ساتھ کا فیصلہ کرنا نہیں ہے (کیونکہ حضرت لقمان نے اس بار کو اٹھانے سے تو انکار ہی کر دیا تھا۔)

جزری نے نہایہ میں کیا خوب کہا ہے کہ سب سے اعلیٰ چیز کا سب سے اعلیٰ علم حکمت ہے۔ میں کہتا ہوں سب سے اعلیٰ اور افضل چیز اللہ کی ذات ہے کوئی چیز اس کی طرح نہیں ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ دوسری جگہ فرمایا اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً قُلِ اللّٰهُ یعنی شئ کا اطلاق اللہ کی ذات پر ہوتا ہے۔ اللہ سب سے بڑی شئے ہے۔ گویا شئ بمعنی موجود کے ہے اور موجود دو طرح کا ہے۔ مخلوق اور خالق یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ شئ مصدر ہے شاء يشاء شيئا مستعمل ہے اور مصدر کبھی اسم فاعل کے معنی میں آتا ہے کبھی اسم مفعول کے معنی میں۔ اول صورت میں شئ کا اطلاق اللہ پر ہوگا اور دوسری صورت میں تمام ممکنات پر۔ بعض علماء نے شئ کی تعریف میں کہا ہے۔ ما يمكن ان يعلم ويخبر عنه۔ شئ وہ ہے جس کو جاننا اور اس کی حالت بیان کرنا ممکن ہو۔ (مترجم) اور سب سے اعلیٰ علم جس پر غفلت کا پردہ نہیں پڑسکتا علم حضوری ہے۔ علم حصولی غفلت سے خالی نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں اللہ کی ذات کا علم حصولی ممکن بھی نہیں ہے، علم حصولی نام ہے کسی چیز کی تصویر کا ذہن میں آجانے کا۔ اور اللہ کی نہ کوئی صورت ہے نہ وہ کسی چیز اور ہیئت میں آسکتا ہے بلکہ اللہ کی ذات کا علم تو علم حضوری سے بھی بالاتر ہے علم حضوری جو کسی عالم کو ہوتا ہے اس کی نسبت ذات الٰہی کے علم کی طرف تو ایسی ہے جیسے علم حضوری سے علم حصولی کی نسبت۔ حصولی علم میں ذہن کے آئینہ میں صرف صورت ہوتی ہے اور حضوری علم میں ذہن کے سامنے نفس شئ ہوتی ہے مبدء انکشاف نفس شئ ہوتی ہے عکس اور صورت کا حصول علم کا ناقص درجہ ہے اور نفس شئ اگر ذہن کے سامنے حاضر ہو جیسے ہر شخص اپنی ذات کو جانتا ہے اور سمجھتا ہے میں ایسا ہوں یہ علم کا کامل درجہ ہے لیکن اللہ تو شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے اس کا علم تو علم حضوری کے مقابلہ میں کامل نہیں اکمل ہے اعلیٰ اور افضل ہے کیونکہ علم حصولی ہو یا حضوری دونوں کا تعلق دماغ اور ذہن سے ہے اور ذات خداوندی کو جاننے کا تعلق قلب سے ہے۔ اسی لئے ایک حدیث قدسی میں آیا ہے کہ مجھے زمین و آسمان اپنے اندر نہیں سما سکتے۔ مگر مؤمن بندے کا دل مجھے اپنے اندر سما لیتا ہے۔

ذات الٰہی کا علم بہت ہی خاص خاص لوگوں کو ہوتا ہے حاکم نے اور شعب الایمان میں بیہقی نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ لقمان حضرت داؤد کے غلام تھے، حضرت داؤد زرہیں بنتے تھے لیکن حضرت لقمان حضرت داؤد سے اس کی بابت کوئی سوال نہیں کرتے۔ جب حضرت داؤد نے زرہ بنالی اور اس کو پہن لیا تو فرمایا یہ بہترین جنگی لباس ہے اس پر حضرت لقمان نے فرمایا، خاموش رہنا حکمت ہے۔ (بغیر دریافت کئے زرہ بنانے کی حکمت اور غرض حضرت لقمان کو معلوم ہو گئی) لیکن ایسا کرنے والے کم ہیں۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت لقمان سے دریافت کیا گیا سب سے برا کون آدمی ہے؟ فرمایا وہ آدمی سب سے برا ہے جو اس بات کی پرواہ بھی نہیں کرتا کہ لوگ مجھے گناہ کرتے دیکھ رہے ہیں یعنی (علی الاعلان بدکار)۔

ابن ابی شیبہ، امام احمد اور ابن جریر نے خالد ربعی کا قول نقل کیا ہے کہ لقمان حبشی غلام تھے، بڑھئی تھے۔ ایک بار آقا نے حکم دیا، ایک بکری ذبح کر کے اس کی بہترین دو بوٹیاں لے آ۔ حضرت لقمان نے زبان اور دل لے جاکر حاضر کر دیا۔ کچھ دنوں کے بعد آقا نے دوبارہ حکم دیا کہ ایک بکری کو ذبح کر کے اس کی دو بدترین پارچے لے آ۔ حضرت لقمان نے پھر زبان اور دل لاکر حاضر کر دیئے۔ آقا نے اس کی وجہ دریافت کی حضرت لقمان نے فرمایا، اگر یہ دونوں پاکیزہ ہیں تو سارے اعضاء سے بہتر ہیں اور اگر گندے ہوں تو سب سے زیادہ برے بھی یہی ہیں۔

اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ کہ اللہ کا شکر کر یعنی ہم نے لقمان کو حکمت دی اور کہا کہ اس عطیہ حکمت کا شکر ادا کر۔ اکثر اہل تفسیر نے اَنْ کو مفسرہ قرار دیا ہے۔ کیونکہ عطائے حکمت میں قول کا معنی آجاتا ہے۔ میں کہتا ہوں، عطائے حکمت کا مطلب ہے حکمت سکھانا اور تعلیم حکمت اکثر قول ہی کے ذریعہ سے ہوتی ہے اس صورت میں حکمت دینے کا معنی ہوگا شکر گزاری کا حکم دینا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حکمت ہی شکر ہے اور حکمت ادا کرنے کا معنی ہی شکر ادا کرنے کا حکم دینا ہے۔

آیت میں امر سے مراد ہے تکوینی (تخلیقی، فطری) حکم۔ کیونکہ تکلیفی (اور تشریعی) حکم تو سب ہی لوگوں کو دیا گیا ہے، لقمان ہی کی خصوصیت نہیں پھر شکر گزاری کا حکم دینا (یعنی تکلیفی حکم دینا اس بات کا قطعاً موجب نہیں کہ ہر شخص ادا

کرنے پر مجبور ہو اور ضرور ہی شکر کرے۔ البتہ تکوینی امر کے لئے مامور بہ کا وجود ضروری ہے اگر امر تکوینی مراد ہو تو پھر شکر گزاری لازم ہوگی جس طرح عطائے حکمت کے بعد حصول حکمت لازم ہے اسی طرح شکر کے امر تکوینی کے بعد لقمان کا شکر گزار ہو جانا ضروری ہے۔

حکمت سے شکر مراد لینا بطور مجاز ہے کیونکہ شکر حکمت کے لئے لازم ہے اور ملزوم سے لازم یا لازم سے ملزوم مراد ہو سکتا ہے۔

شکر کا معنی ہے منعم کی نعمت کا (اقرار) اظہار اور کفران کا معنی ہے منعم کی نعمت پر پردہ ڈال دینا، چھپا دینا (منعم کو منعم نہ قرار دینا)۔

صاحب قاموس نے لکھا ہے، شکر کا معنی ہے احسان شناسی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ لفظ شکر اصل میں کشر تھا۔ کشر کے حروف کو مقدم موخر کرکے شکر کر دیا گیا، کشر کا معنی ہے کھول دینا، شکر کا معنی بھی نعمت کو ظاہر کرتا ہے۔

شکر کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) دل سے شکر کرنا یعنی منعم کے انعام کا تصور کرنا۔

(۲) زبان سے شکر کرنا یعنی منعم کی نعمت پر اس کی ثناء کرنا۔

(۳) اعضاء جسم سے شکر کرنا یعنی نعمت کے بدلہ میں منعم کی اطاعت کرنا۔ بعض علماء کا قول ہے کہ لفظ شکر عَیْنٌ شَکْرٰی (بھرا ہوا چشمہ) سے ماخوذ ہے اس قول پر شکر کا معنی ہوگا۔ منعم کی نعمتوں کی یاد سے بھر جانا۔ اسی بنیاد پر اللہ نے فرمایا ہے، وَقَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّکُوْرُ۔ قرآن مجید میں اللہ نے دو مخصوص کو شکر گزار بندہ فرمایا ہے ایک حضرت ابراہیم جن کے متعلق فرمایا ہے۔ شَاکِرًا لِّاَنْعُمِهٖ دوسرے حضرت نوح جن کے متعلق فرمایا ہے۔ اِنَّهٗ کَانَ عَبْدًا شَکُوْرًا۔

نہایہ میں جزری نے لکھا ہے، نعمت کے مقابلہ میں شکر زبان سے بھی ہوتا ہے اور عمل سے بھی اور نیت سے بھی۔ زبان سے بھی منعم کی تعریف کرنی چاہئے اور اپنے اعضاء کو بھی ہمیشہ اس کی اطاعت میں لگا دیا جائے اور یقین بھی رکھا جائے کہ منعم ہی میرا اصولی ہے۔ لفظ شکر شَکِرَتِ الْاِبِلُ شَکْرًا (اونٹ خوب چر کر موٹے ہو گئے) سے ماخوذ ہے۔

وَمَنْ یَّشْکُرْ فَاِنَّمَا یَشْکُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ جو شکر کرے گا وہ صرف اپنے ہی فائدے کیلئے شکر کرے گا۔ شکر کرنے سے موجودہ اور حاصل شدہ نعمت زوال سے محفوظ ہو جاتی ہے اور آئندہ مزید نعمت حاصل ہو جاتی ہے اور اللہ کے قرب اور دوامی جنت کا حصول ہو جاتا ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ

وَمَنْ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ ۝ اور جو (اللہ کی نعمت کی) ناشکری کرے گا تو (ناشکری کا وبال اسی پر پڑے گا) اللہ تو کسی کے شکر کا ضرورت مند اور محتاج نہیں ہے اور (بہرحال) وہ مستحق ستائش ہے۔ خواہ ناشکرا اس کی حمد نہ کرے۔ تمام مخلوق بزبان حال اس کی شکر گزار ہے۔

وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ یَعِظُهٗ یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِکْ بِاللّٰهِ ۭؔ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ۝ اور یاد کرو جب لقمان نے اپنے بیٹے سے اس کو نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا، میرے پیارے بیٹے اللہ کا کسی کو ساجھی مت قرار دینا شرک بڑا ظلم ہے۔

لقمان کے بیٹے کا نام انعم یا اشکم یا ماثان تھا۔ بعض اقوال میں آیا ہے کہ لقمان کا بیٹا مشرک تھا پھر باپ کی نصیحت کی وجہ سے مؤمن ہو گیا۔ ظلم کا معنی ہے کسی چیز کو اس کے مخصوص (مناسب) مقام کے علاوہ کسی دوسری جگہ رکھ دینا خواہ اس میں کمی کر دی جائے یا بیشی یا مکان میں تغیر کر دیا جائے یا وقت بدل دیا جائے۔ ظلم کا اطلاق حق سے تجاوز کرنے پر بھی ہوتا ہے۔ تجاوز تھوڑا ہو یا بہت اسی لئے چھوٹے گناہ کو ظلم کہا جاتا ہے اور بڑے گناہ کو بھی اور ظاہر ہے کہ شرک (بڑا گناہ ہے اس لئے) بڑا ظلم ہے

جس میں معبود ہونے کی صلاحیت نہ ہو اس کی عبادت کرنا یقیناً حق سے تجاوز عظیم ہے حقیقی منعم کو اس کس کے ساتھ برابر قرار دینا جو منعم ہونے کی اہلیت نہیں رکھتا بڑا ظلم (اور بڑی بے جا حرکت) ہے۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ اور ہم نے انسان کو ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور ان کا شکر ادا کرنے کا حکم دے دیا ہے یہ لقمان کے قول کے درمیان (اللہ کا قول) بطور جملہ معترضہ آگیا ہے۔

حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اس کو پیٹ میں رکھا۔ ماں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی اس جملہ میں مؤکد ہدایت ہے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا میرے حسن معاشرت (یعنی حسن سلوک) کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ فرمایا، تیری ماں، پھر تیری ماں، پھر تیرا باپ اس کے بعد اقارب حسب درجہ۔ (متفق علیہ)

حضرت مغیرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے تمہارے لئے ماؤں کی نافرمانی حرام کر دی ہے (متفق علیہ) حضرت ابن عباسؓ نے وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ کا ترجمہ سختی پر سختی کیا ہے۔ ضحاک نے ضعف بالائے ضعف اور مجاہد نے مشقت بر مشقت۔ جب عورت حاملہ ہو جاتی ہے تو اس پر کمزوری اور مشقت طاری ہو جاتی ہے۔ حمل کا ضعف، خون چھوٹنے (وضع حمل) کا ضعف اور دودھ پلانے کا ضعف (اس طرح ضعف پر ضعف بڑھتا جاتا ہے)

وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ اور اس کی دودھ چھڑائی دو سالوں (کے اختتام) میں ہے۔ اس آیت سے امام شافعی امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ نے استدلال کیا ہے کہ دودھ پلانے کی (زیادہ سے زیادہ) مدت دو سال ہے۔ ہم نے سورۂ بقرہ کی آیت وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ الخ کی تفسیر کے ذیل میں مسئلہ رضاعت کو مفصل بیان کر دیا ہے۔

أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ کہ میرا شکر ادا کر اور اپنے ماں باپ کا۔

اس آیت کی تفسیر میں سفیان بن عیینہ نے کہا جس نے پانچوں نمازیں پڑھ لیں اس نے اللہ کا شکر ادا کر دیا اور جس نے نمازوں کے بعد ماں باپ کے لئے دعائے خیر کی اس نے ماں باپ کا شکر کیا۔

إِلَيَّ الْمَصِيرُ ﴿١٤﴾ میری ہی طرف لوٹنا ہے۔ اس فقرہ میں وعدہ بھی ہے اور وعید بھی یعنی میں شکر اور ناشکری دونوں کا بدلہ دوں گا۔

وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا اور اگر وہ دونوں تجھ پر زور ڈالیں کہ میرے ساتھ (عبادت میں) اس چیز کو شریک ٹھہرا جس کی تیرے پاس کوئی دلیل نہیں ہے تو ان کا کہنا نہ ماننا۔

لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ یعنی جس معبود باطل کے شریک الوہیت ہونے کا تجھے علم بھی نہ ہو اس کو اللہ کی معبودیت میں شریک بنانے پر اگر ماں باپ حکم دیں تو ان کا کہنا نہ مان۔ چہ جائیکہ دلائل قطعیہ سے شرک کا باطل ہونا جب تجھے معلوم ہے تو ایسی حالت میں ماں باپ کا حکم نہ ماننا تو بدرجۂ اولیٰ لازم ہے۔ اللہ کا حق ہر مخلوق کے حق پر غالب ہے اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا خالق کی نافرمانی (کی صورت) میں مخلوق کا حکم ناقابل اطاعت ہے۔ رواہ احمد والحاکم عن عمران والحکم ابن عمرو الغفاری حاکم نے اس روایت کی تصحیح کی ہے صحیحین، سنن ابو داؤد اور نسائی میں ایسی ہی حدیث حضرت علیؓ کی روایت سے آئی ہے۔

وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا اور دنیا میں ماں باپ کے ساتھ اچھے طور پر (جو عقلاً اور شرعاً پسندیدہ ہو) رہو۔

مسئلہ:۔ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ ماں باپ خواہ کافر ہوں لیکن اگر صاحب احتیاج ہیں تو ان کی مالی مدد کرنی اور قرابتداری کو نہ توڑنا واجب ہے۔

حضرت ابو بکرؓ کی صاحبزادی حضرت اسماءؓ کا بیان ہے میرے پاس میری ماں آئی اس زمانہ میں وہ مشرک تھی قریش کے

حلقہ میں داخل تھی۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میری ماں آئی ہے اور (مدد کی) خواہشمند ہے کیا میں اس کے ساتھ قرابتداری کا سلوک کر سکتی ہوں؟ فرمایا ہاں اس سے قرابت کا تعلق جوڑے رکھو۔ (متفق علیہ)

تفسیر سورۂ عنکبوت میں بیان کیا جاچکا ہے کہ یہ دونوں آیات حضرت سعد بن ابی وقاص اور ان کی والدہ کے متعلق نازل ہوئی تھیں۔

وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ۚ اور اسی کی راہ پر چلنا جو میری طرف رجوع ہو۔

سَبِيْلَ سے مراد دین ہے اور مَنْ اَنَابَ سے مراد ہیں رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ۔ عطاء نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ سے اللہ کی مراد حضرت ابو بکرؓ کی ذات ہے۔ واقعہ یوں ہوا کہ جب حضرت ابو بکرؓ اسلام لے آئے تو حضرت عثمان، طلحہ، زبیر، سعد بن ابی وقاص اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہم نے آکر حضرت ابو بکرؓ سے پوچھا، کیا آپ (مسلمان ہوگئے اور) اس شخص پر ایمان لائے اور اس کو سچا سمجھ لیا۔ حضرت ابو بکر نے جواب دیا ہاں وہ سچے ہیں تم بھی ان پر ایمان لے آؤ، پھر آپ سب کو ساتھ لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور یہ حضرات بھی مسلمان ہوگئے۔ یہی لوگ اسلام کے پیش رو جو حضرت ابو بکرؓ کی راہنمائی سے مسلمان ہوئے اللہ نے حضرت ابو بکر ہی کے متعلق فرمایا وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ۔

مسئلہ:۔ اگر والدین فریضہ خداوندی کو ترک کرنے یا فعل حرام کا ارتکاب کرنے کا حکم دیں تو ان کا کہا ماننا جائز ہے۔ اللہ کے حکم کی تعمیل کے ساتھ ساتھ اس کے مخالف مخلوق کے حکم کو ماننا شرک معنوی ہے۔ ہم حدیث مبارک نقل کر چکے ہیں کہ خالق کی نافرمانی ہوتی ہو تو مخلوق کے حکم کو ماننا جائز ہے ہاں والدین کے حکم کو ماننا اس وقت واجب ہے جب وہ کسی ایسے مباح کام کا حکم دیں جو خلاف عقل و شرع نہ ہو۔

اگر والدین کثرت ذکر و نوافل کو روکیں یا ضرورت سے زائد مال کمانے کا حکم دیں تو کیا ان کی بات ماننی واجب ہے؟

میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ ایسے حکم کو ماننا واجب نہیں ہے۔ کیونکہ اصحاب انابت کی راہ پر چلنے کا اللہ نے اس آیت میں حکم دیا ہے اور نوافل کی کثرت ترک دنیا اور اللہ کے سواسب کا ترک اور ہر وقت اللہ سے لو لگانا اہل انابت کا طریقہ ہے۔ یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ صحابہ کرامؓ نے اپنا وطن چھوڑا، ہجرت کی اور ماں باپ کی مرضی کے خلاف راہ خدا میں اپنی جانی اور مالی قربانی دی۔ اللہ نے فرمایا ہے قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ الخ آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے ماں باپ اور بیٹے اور بھائی اور بیبیاں اور کنبہ والے اور کمائے ہوئے مال اور وہ تجارت جس کے بگڑ جانے کا تم کو اندیشہ ہو اور تمہارے وہ مکانات جن کو تم پسند کرتے ہو تمہاری نظر میں اللہ کے رسول اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے ہوں تو منتظر رہو کہ اللہ اپنا حکم لے آئے۔ (اس سے معلوم ہوا کہ جہاد فی سبیل اللہ کے لئے ترک کل نہ فقط جائز ہے بلکہ فرض ہے) پھر اللہ کی راہ میں شیطان اور نفس امارہ سے، ماں باپ کے کہنے سے جہاد ترک کر دینا (یعنی نوافل و ذکر کی کثرت چھوڑ دینا اور ضرورت سے زائد کمائی کی طرف راغب ہونا۔ مترجم) کس طرح جائز ہو سکتا ہے۔

حاکم نے بوساطت عامر ابن عبداللہ حضرت عبداللہ بن زبیر کا بیان نقل کیا ہے کہ حضرت زبیر نے فرمایا ابو قحافہ (حضرت ابو بکر کے والد) نے حضرت ابو بکر سے کہا میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کمزور باندی غلاموں کو آزاد کرتے ہو اگر طاقتور غلاموں کو آزاد کرتے تو بہتر ہوتا کہ وہ تمہاری حفاظت کر سکتے۔ اور تمہاری طرف سے (دشمنوں کے مقابلہ میں) کھڑے ہو سکتے۔

حضرت ابو بکر نے فرمایا میں اس ثواب کا طلبگار ہوں جو اللہ کے پاس ہے۔ آیت وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى نازل ہوئی۔ یہ واقعہ اس زمانہ کا ہے جب حضرت ابو بکر نے حضرت بلال، حضرت عامر بن فہیرہ، حضرت ام عمیس اور حضرت زبیرہ وغیرہ کو (خرید کر) آزاد کیا تھا۔

حضرت ابو بکرؓ نے چار ہزار درہم ساتھ لے کر رسول اللہ ﷺ کے ہم رکاب ہجرت کی تھی گھر والوں کے لئے کچھ بھی

چھوڑ کر نہیں گئے تھے اور یہ بات باپ کی مرضی کے خلاف تھی۔ سورۂ توبہ کی آیت اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ الخ کی تفسیر میں ہم نے ہجرت کی تفصیل لکھ دی ہے۔

ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ اور تم سب کی آمد (یعنی تمہاری اور تمہارے والدین کی) میری ہی طرف ہوگی۔

فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵﴾ پھر تم جو کچھ کرتے رہے تھے میں تم کو بتادوں گا۔ یعنی بدلہ دوں گا تم کو اسلام کی جزا اور تمہارے والدین کو کفر کی سزا دوں گا۔

حضرت لقمان کے قصہ میں یہ دونوں جملے بطور معترضہ ذکر کر دیئے گئے ہیں۔ والدین کے کہنے سے شرک کی ممانعت کا حکم بطور مبالغہ کیا گیا ہے۔ اللہ کے بعد ماں باپ سب سے زیادہ تعظیم واطاعت کے مستحق ہیں لیکن شرک میں ان کی اطاعت بھی حرام ہے دوسروں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

یٰبُنَیَّ اِنَّهَاۤ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِیْ صَخْرَةٍ اَوْ فِی السَّمٰوٰتِ اَوْ فِی الْاَرْضِ یَاْتِ بِهَا اللّٰهُ اے میرے پیارے بیٹے بلاشبہ اگر رائی کے دانہ کے وزن کے برابر کوئی حرکت ہوگی اور وہ کسی پتھر کے اندر یا آسمانوں میں یا زمین میں ہوگی تو اللہ اس کو لا حاضر کرے گا۔

اِنَّهَا یعنی کوئی خصلت کوئی بات اچھی ہو یا بری بھلائی کی ہو یا برائی کی۔ قتادہ نے کہا اِنَّهَا کی ضمیر خطا کی طرف راجع ہے کیونکہ حضرت لقمان کے بیٹے نے حضرت لقمان سے کہا تھا اے میرے باپ اگر میں چھپ کر کوئی گناہ کروں کہ کسی کو اطلاع نہ ہو تو اس کو خدا کیسے جان لے گا اس کے جواب میں اِنَّهَاۤ اِنْ تَكُ حضرت لقمان نے فرمایا جس کو اللہ نے اس جگہ نقل فرمادیا۔

حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ سے مراد ہے حقیر ترین مقدار۔ پتھر یا آسمان یا زمین کے اندر ہونے سے مراد ہے پوشیدہ ترین انتہائی محفوظ مقام میں ہونا۔ جیسے پتھر کا جوف یا سب سے اونچا مقام آسمان یا زمین کی انتہائی پست ترین گہرائی۔

قتادہ نے کہا صَخْرَةٍ (پتھر) سے مراد ہے پہاڑ۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا صَخْرَةٍ سے مراد وہ پتھر ہے جو ساتوں زمینوں کے نیچے ہے۔ جس میں کافروں اور بدکاروں کے اعمال کا اندراج ہوتا ہے۔ آسمان کی نیل گونی اسی کے عکس کی وجہ سے ہے۔ سدی نے کہا اللہ نے زمین کو مچھلی کے اوپر پیدا کیا یہ مچھلی وہی نون (مچھلی) ہے جو آیت نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ میں مذکور ہے۔ یہ مچھلی پانی کے اندر پتھر کی ایک چٹان کے اوپر ہے اور چٹان ایک فرشتے کی پشت پر رکھی ہوئی ہے اور فرشتہ ایک پتھر پر قائم ہے۔ یہ وہی پتھر ہے جس کا ذکر حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرنے کے ذیل میں کیا ہے۔ یہ پتھر نہ آسمان میں ہے نہ زمین میں بلکہ ہوا پر ہے۔

یَاْتِ بِهَا اللّٰهُ اللہ اس کو لا کر حاضر کر دے گا یعنی اس کی حساب فہمی کرے گا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَطِیْفٌ خَبِیْرٌ ﴿۱۶﴾ اس میں شک نہیں کہ اللہ باریک بین باخبر ہے یعنی اس کے علم کی رسائی و احاطہ سے کوئی پوشیدہ و مخفی ترین چیز بھی خارج نہیں ہر چیز کی حقیقت کو خوب جانتا ہے۔

حسن نے کہا آیت میں ہر چھوٹی بڑی چیز کا کامل احاطہ مراد ہے (یعنی ہر چیز کو چھوٹی ہو یا بڑی اللہ گھیرے ہوئے ہے)

بغوی نے لکھا ہے بعض کتابوں میں آیا ہے کہ حضرت لقمان کے یہ آخری الفاظ تھے اس جملہ کے زبان سے نکلتے ہی ان پر ایسی دہشت اور ہیبت طاری ہوئی کہ پتہ پھٹ گیا۔

یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ اے میرے پیارے بیٹے (اپنے نفس کی تکمیل کے لئے) نماز قائم کر اور دوسروں کی درستی کے لئے نیک باتوں کا حکم دے اور بری باتوں کی ممانعت کر۔

وَاصْبِرْ عَلٰی مَاۤ اَصَابَكَ اور (امر و نہی کے راستہ میں) تجھ کو جو دکھ پہنچے (اور تکلیف اٹھانی پڑے) اس پر صبر رکھ۔

اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۷﴾ بلاشبہ یہ (ثبات و صبر) فرائض میں سے ہے یعنی ان امور میں سے ہے جو اللہ نے فرض کر دیئے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا خَیْرُ الْاُمُوْرِ عَوَازِمُهَا یعنی بہترین امور وہ ہیں جن کا کرنا

اللہ نے فرض کر دیا ہے۔

لغت میں عزم کا معنی ہے کسی کام کو کرنے کا اٹل ارادہ۔ اس تشریح پر آیت میں عزم (مصدر) بمعنی معزوم (اسم مفعول) کے ہوگا۔

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ اور اپنے گال لوگوں کے لئے نہ پھلا یعنی ان سے رخ نہ موڑ لوگوں سے اعراض نہ کر حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا یعنی غرور نہ کر دوسروں کو حقیر نہ سمجھ کہ وہ تجھ سے بات کریں اور تو ان کی طرف سے منہ پھیر لے۔

وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا اور زمین پر اترا کر نہ چل

إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ بلاشبہ اللہ کسی اترا کر چلنے والے شیخی باز کو پسند نہیں کرتا۔

مُخْتَالٍ اترا کر چلنے والا۔

فَخُورٍ دوسرے لوگوں پر فخر کرنے والا۔

وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ اور اپنی چال درمیانی رکھو یعنی نہ رینگتے چلو کہ یہ غرور کی علامت ہے اور اہل غرور کی چال ہے۔ نہ بہت لپک کر چلو کہ یہ چھچھوروں کی چال ہے۔ وقار کو زائل کرتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سرعت رفتار مومن کے وقار کو زائل کر دیتی ہے۔ اخرجہ ابن عدی وابو نعیم فی الحلیۃ عن ابی ہریرہ (واخرجہ ابن عدی من حدیث ابی سعید وابن عمر)

جس تیز رفتاری کی ممانعت کی گئی ہے اس سے مراد وہ سرعت رفتار ہے جو طبعی چال سے بڑھ کر کوشش کر کے اختیار کی جائے۔ معمولی تیزی رفتار جس کی عادت ہو وہ تو مستحب ہے۔ ابن سعد نے حضرت یزید بن مرثد کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب چلتے تھے تو اتنی تیزی سے چلتے تھے کہ آپ کے پیچھے لپکنے والا آپ تک پہنچ نہ سکتا تھا۔ طبرانی اور بیہقی نے حضرت ابو موسیٰ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وقار کو (چال میں) قائم رکھو اور جنازے لے جانے میں میانہ روی کو اختیار کرو۔ صحاح ستہ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جنازے کو تیز لے جاؤ کیونکہ اگر وہ نیک ہے تو تم اس کو بھلے پہنچا دو گے اور اگر بد ہے تو اپنے کندھوں سے (جلد) اتار دو گے۔ ان تمام احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رفتار کی تیزی حسب عادت قبیح نہیں ہے اور قصد سے مراد تیزی رفتار ہی ہے جو دوڑ سے کم درجہ کی ہو۔

ع ۱۰ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ إِنَّ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ اور اپنی آواز نیچی رکھو بلاشک و شبہ بڑی ناگوار آواز گدھوں کی آواز ہوتی ہے۔

مقاتل نے اُغْضُضْ کا ترجمہ کیا ہے پست رکھو یعنی گدھوں کی آواز بہت ہی مکروہ ہوتی ہے بالکل پھٹی ہوئی، دوزخیوں کی آواز بھی گدھوں کی آواز کی طرح ہوگی۔ ابتدا میں زفیر اور اختتام پر شہیق۔ (سینہ کے اندر ہی اندر گڑگڑی کی آواز)

سفیان ثوری نے آیت مذکورہ کی تشریح میں کہا اس سے مراد چھینک کی وحشت ناک قبیح آواز ہے۔ وہب نے کہا لقمان نے اپنے کلام میں حکمت کے بارہ ہزار دروازے کھول دیئے (یعنی بارہ ہزار پُر حکمت مقولے لقمان کے ہیں) جن کو لوگوں نے اپنے کلام اور معاملات میں شامل کر لیا ہے۔

أَلَمْ تَرَوْا أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ کیا تم لوگوں کو معلوم نہیں کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو اللہ نے تمہارے کام پر لگا رکھا ہے۔

مَا فِي السَّمَاوَاتِ یعنی اللہ نے تمہارے کام پر چاند، سورج اور ستاروں اور بادلوں کو لگا دیا ہے۔ وَمَا فِي الْأَرْضِ اور زمین میں جو کچھ ہے اس کو بھی تمہارے کام پر لگا دیا ہے۔ موجودات ارضی سے مراد ہیں کانیں، نباتات اور حیوانات ان سب کو اللہ نے براہ راست یا بالواسطہ انسانوں کے کام پر لگا دیا ہے یعنی انسانوں کو یہ قدرت عطا فرما دی ہے کہ بالواسطہ یا بلاواسطہ ان سے

فائدہ اندوز ہوں۔

وَاَسْبَغَ عَلَیْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ؕ اور اس نے اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں تم کو پوری دے رکھی ہے۔

ظاہری نعمتوں سے مراد ہیں محسوس نعمتیں خوبصورتی، اعضاء کی درستی، رزق، عافیت اور دوسری دنیوی نعمتیں۔ ان کے علاوہ دشمنوں پر غلبہ، اسلام، رسول، قرآن، ضوابط شریعت کا ثقیل نہ ہونا، اتباع رسول کی توفیق، اسلام کا غلبہ وغیرہ یہ سب بھی ظاہری نعمتوں میں شامل ہیں۔

باطنی نعمتوں سے مراد ہے دل، عقل، باطنی حواس، حسن اخلاق، اعتقاد حق، دل میں صحیح اعتقاد ڈال دینا، گناہوں کی فوری پکڑ نہ ہونا، ملائکہ کے ذریعہ سے مدد پہنچانا، معرفت الٰہی کا نور اللہ اور اللہ کے رسول سے محبت، رسول کی شفاعت وغیرہ۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّجَادِلُ فِی اللّٰهِ بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًی وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِیْرٍ ۝

اور بعض لوگ اللہ کے بارے میں بے دلیل اور بغیر (پیغمبر کی) رہنمائی کے اور بدون کسی روشن کتاب کے جھگڑا کرتے ہیں۔

یُّجَادِلُ یعنی اللہ کے رسول سے جھگڑا کرتے ہیں۔

فِی اللّٰهِ اللہ کی توحید اور صفات کے بارے میں۔

بِغَیْرِ عِلْمٍ کسی استدلال سے حاصل شدہ علم کے بغیر۔ بغوی نے لکھا ہے کہ اس آیت کا نزول نضر بن حارث اور ابی بن خلف اور ان جیسے لوگوں کے حق میں ہوا۔

وَّلَا هُدًی اور رسول کی ہدایت کے بغیر

وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِیْرٍ اور بغیر کسی روشن کتاب کے جو اللہ کی طرف سے نازل کی گئی ہو۔ غرض یہ کہ ان کے جھگڑے کی بناء محض باپ دادا کی پیروی پر ہے۔ (نہ ان کو عقلی علم حاصل ہے نہ نقلی)

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا ؕ

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس چیز کا اتباع کرو جو اللہ نے نازل فرمائی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ (نہیں) ہم تو اس پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو (چلتے) پایا۔

یعنی ہم اللہ کی اتاری ہوئی کتاب کی پیروی نہیں کریں گے بلکہ جس (دین) پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا اسی پر ہم چلیں گے۔ آیت میں اصول دین میں تقلید کی ممانعت ہے (فروعی اجتہادی مسائل میں تقلید کی ممانعت نہیں ہے)

اَوَلَوْ كَانَ الشَّیْطٰنُ یَدْعُوْهُمْ اِلٰی عَذَابِ السَّعِیْرِ ۝ کیا اگر شیطان ان (کے باپ دادا) کو بھڑکتی آگ کے عذاب کی طرف بلا رہا ہو (جب بھی یہ لوگ باپ دادا کے پیچھے چلے جائیں گے)

عذاب دوزخ کی دعوت یہ ہے کہ شیطان تقلید یا شرک کی خوبیاں ان کے دلوں میں ڈال دیتا ہے۔ سوال انکاری تعجبی ہے۔

وَمَنْ یُّسْلِمْ وَجْهَهٗۤ اِلَی اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰی ؕ وَاِلَی اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝ اور جو شخص اپنا رخ اللہ کی طرف جھکا دے اور مخلص بھی ہو تو اس نے بڑا مضبوط قبضہ تھام لیا اور اخیر سب کاموں کا اللہ ہی کی طرف پہنچے گا۔

وَمَنْ یُّسْلِمْ وَجْهَهٗۤ یعنی جو اپنی توجہ اللہ کی طرف کردے اور کامل طور پر ہمہ تن اللہ کا ہو جائے اپنے تمام کام اللہ کے سپرد کردے ہر کام کو کرنے یا نہ کرنے میں اللہ کی خوشنودی کا حصول اس کے پیش نظر ہو۔

وَهُوَ مُحْسِنٌ اور اپنے اعمال میں مخلص ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا احسان (اعمال کی خوبی) یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا (عبادت کے وقت وہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے اور) تم اس کو دیکھ رہے ہو یعنی کامل حضور قلب کے ساتھ۔

فَقَدِ اسْتَمْسَكَ یعنی اس نے مضبوط ترین قبضہ پکڑ لیا اور ایسا محکم ذریعہ اپنی گرفت میں لے لیا جس کے ٹوٹنے کا احتمال بھی نہ ہو۔ یہ نہایت لطیف تشبیہ ہے، متوکل کو اس شخص سے تشبیہ دی ہے جس نے کوئی مضبوط قبضہ پکڑ رکھا ہو۔

ہر کام کا آخیر انجام اللہ ہی کی طرف ہے یعنی سب کو آخر میں اللہ ہی کے پاس جانا ہے۔

وَمَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزُنْكَ كُفْرُهٗ ۭ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ فَنُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۲۳ اور جو شخص (اللہ کی طرف اپنا رخ نہ کرے اور) انکار کر دے تو اس کے انکار سے آپ کو رنجیدہ نہ ہونا چاہئے ان سب کی واپسی ہماری ہی طرف ہو گی۔ پھر ہم ان کو ان کے کئے ہوئے اعمال بتائیں گے (یعنی عذاب دیں گے) بیشک اللہ دلوں کی باتوں سے واقف ہے۔

فَلَا يَحْزُنْكَ كُفْرُهٗ پورا کلام اس طرح تھا جو شخص کفر کرے گا وہ اپنا نقصان خود کرے گا۔ آپ کو کچھ ضرر نہ پہنچا سکے گا نہ دنیا میں نہ آخرت میں۔ عدم ضرر عدم حزن کا موجب ہے اس لئے بجائے عدم ضرر کے عدم حزن کا ذکر کیا۔

عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ یعنی دلوں کے اندر چھپے ہوئے عقائد اور اندرونی خیالات سے اللہ بخوبی واقف ہے ظاہر کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ ہر شخص کے عقیدے اور عمل کے مطابق بدلہ دے گا۔

نُمَتِّعُهُمْ قَلِيْلًا ہم ان کو کچھ مدت تک (یعنی اجل مقرر آنے تک یا کسی قدر تھوڑے سے) مزے اڑانے دیں گے۔ یعنی تھوڑی مدت تک ان کو مہلت دیں گے۔

ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ اِلٰى عَذَابٍ غَلِيْظٍ ۲۴ پھر ہم مجبور کر کے ان کو بھاری عذاب کی طرف لے جائیں گے یعنی دوزخ کے عذاب کی طرف۔

عذاب غلیظ، بھاری عذاب، زیادہ بھاری چیزوں کا جس طرح دباؤ پڑتا ہے۔ سخت عذاب کا بھی ایسا ہی بھاری بار ان پر پڑے گا۔

وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۭ اگر آپ ان (کافروں) سے دریافت کریں کہ آسمانوں کو زمین کو کس نے پیدا کیا تو بلاشبہ کہیں گے کہ اللہ نے (ان سب کو پیدا کیا)

یعنی دوسروں کی طرف خلاقیت کی نسبت کرنے سے روکنے والی اتنی واضح دلیلیں موجود ہیں کہ جن کی روشنی میں ان کو صرف اللہ کی خلاقیت کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ۭ آپ کہہ دیجئے اللہ سزاوار ستائش ہے (اللہ کا شکر ہے) جس نے تم سے تمہارے عقیدے کے خلاف اقرار کرنے پر مجبور کر دیا۔

بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۲۵ بلکہ ان میں سے اکثر نہیں جانتے (کہ اللہ کی توحید کا اقرار ان پر لازم ہے اور جب ان کو متنبہ کیا جاتا ہے تو متنبہ نہیں ہوتے)

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔ یعنی اللہ ہی سب کا خالق اور مالک ہے اس لئے معبود ہونے کا مستحق بھی اس کے سوا کوئی نہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۲۶ یہی حقیقت ہے کہ ہر (تعریف کرنے والے کی) تعریف سے اللہ بے نیاز ہے اور وہ (فی نفسہ) ہر حمد کا مستحق ہے (خواہ کوئی اس کی تعریف کرے یا نہ کرے)

ابن اسحاق نے عطاء بن یسار کے حوالہ سے بیان کیا اور بغوی نے بھی یہی ذکر کیا ہے کہ آیت وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا مکہ میں نازل ہوئی پھر جب رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے تو علمائے یہود نے حاضر ہو کر دریافت کیا ہم کو اطلاع ملی ہے کہ آپ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا کہتے ہیں اس سے مراد آپ کی اپنی قوم ہے (جو واقعی جاہل اور امی ہے) یا ہم لوگ مراد ہیں (ہم تو بڑے بڑے علماء ہیں) حضور ﷺ نے فرمایا سب لوگ مراد ہیں (قریش بھی اور تم بھی) یہودی

بولے کیا وہ کلام جو تمہارے پاس (تمہارے دعوے کے مطابق اللہ کی طرف سے) آیا ہے اس میں یہ بات نہیں ہے کہ ہم کو توریت عطا کی گئی ہے اور توریت میں ہر چیز کا بیان ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا اللہ کے (بے پایاں) علم کے مقابلے میں توریت کا علم قلیل ہے۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ اور اگر زمین میں جتنے درخت ہیں سب قلم ہو جائیں اور (محیط کل) سمندر کو اس کے پیچھے سے مزید سات سمندر مدد پہنچائیں (یعنی سب سیاہی بن جائیں اور اللہ کے معلومات لکھے جائیں تو قلم گھس کر ختم ہو جائیں گے اور روشنائی تمام ہو جائے گی مگر) اللہ کے کلمات (معلومات) ختم نہیں ہوں گے۔

یَمُدُّهٗ یعنی اس محیط کل سمندر میں پیچھے سے مزید سات سمندر روشنائی بڑھائیں اور اس میں آکر گریں۔ یَمُدُّهٗ مَدَّ الدَّوَاتَ سے مشتق ہے۔ دوات میں روشنائی بڑھانے کو مد دوات کہتے ہیں۔

کَلِمٰتُ اللّٰهِ یعنی اللہ کی معلومات (غیر متناہی ہیں کتنے ہی قلم ہوں اور کتنی ہی روشنائی ہو اللہ کے قلیل معلومات لکھنے کے لئے کافی نہیں کثیر معلومات کا تو ذکر ہی کیا ہے)

اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ بلاشبہ اللہ غالب ہے (اس کو کوئی طاقت مغلوب نہیں کر سکتی) حکمت والا ہے (اس کے علم و حکمت کے دائرے سے کوئی چیز باہر نہیں)

ابن جریر نے عکرمہ کا بیان نقل کیا ہے کہ جب اہل کتاب (یعنی یہودیوں) نے رسول اللہ ﷺ سے روح کی بابت دریافت کیا تو آیت وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا نازل ہوئی۔ اہل کتاب نے کہا آپ کا ہمارے متعلق یہ خیال ہے کہ ہم کو قلیل علم دیا گیا ہے حالانکہ ہم کو توریت عطا کی گئی جو سراسر حکمت و علم ہے اور جس کو حکمت عطا کر دی گئی اس کو خیر کثیر عطا کر دی گئی (پھر ہمارا علم ناقص اور قلیل کیسے ہو سکتا ہے) اس پر آیت مذکورہ زیر تفسیر نازل ہوئی۔ مندرجہ بالا روایات کی بناء پر آیت کو مدنی کہا جائے گا۔

لیکن کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ آیت مذکورہ مکی ہے یہودیوں نے قریش کو مشورہ دیا تھا کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے روح کے متعلق دریافت کریں۔ اس وقت تک حضور نے مکہ نہیں چھوڑا تھا۔

ابن جریر نے نیز ابوالشیخ نے کتاب العظمۃ میں بیان کیا ہے کہ مشرکوں نے کہا تھا یہ کلام (قرآن مجید) عنقریب ختم ہو جائے گا اس پر آیت وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ الخ نازل ہوئی۔

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝ تم سب کو پیدا کرنا اور سب کو (قیامت کے دن زندہ کر کے) اٹھانا (اللہ کے لئے) بس ایک شخص (کے پیدا کرنے اور اٹھانے) کی طرح ہے بلاشبہ اللہ خوب سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

یعنی اللہ کے نزدیک تم سب کو پیدا کرنا اور پھر دوبارہ اٹھانا ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص کو پیدا کرنا اور اٹھانا اس کی ذاتی قدرت ہے جب اس کے ارادہ کا تعلق ہو جائے تو سب کو پیدا کرنے اور اٹھانے کے لئے بس یہی کافی ہے ایسا نہیں ہے کہ ایک کام میں مشغول ہونے کے وقت دوسرے کام سے غافل ہو جائے آن کی آن میں جس طرح ایک کی تخلیق اس کے ارادے سے ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ایک پل میں سب کی تخلیق بھی اس کے ارادے سے ہو سکتی ہے وہ ہر سنی جانے والی آواز کو سنتا اور ہر چیز کو دیکھتا ہے ایک شئے کی شنوائی اور بینائی اس کو دوسری چیزوں کی شنوائی اور بینائی سے مانع نہیں ہو سکتی۔

یا سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ مشرک جو قیامت کا انکار کرتے ہیں اللہ ان کے اس انکار قولی کو سننے والا اور ان کے اعمال کو دیکھنے والا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِی النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۡ كُلٌّ يَّجْرِيْٓ

اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى　کیا آپ کو نہیں معلوم کہ اللہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور سورج و چاند کو اس نے فرماں بردار بنا رکھا ہے ہر ایک مقررہ وقت تک چلتا رہے گا یعنی روز قیامت تک۔

وَّاَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ۝　اور (کیا تم کو نہیں معلوم) کہ اللہ بلاشبہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ　یہ (اللہ کی علمی وسعت احاطہ قدرت اور ندرت صنعت) اس سبب سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے (یعنی اس کا وجود اور تمام صفات کمالیہ محقق اور ثابت ہیں یا اس کی الوہیت ثابت شدہ ہے) اور اللہ کے سوا جن معبودوں کو وہ پکارتے ہیں وہ باطل ہیں (یعنی معدوم الاصل ہیں یا ان کی الوہیت کا دعویٰ بے حقیقت ہے)

وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ۝　اور (اس سبب سے ہے) کہ اللہ ہی سب سے بالا اور غالب ہے اور بزرگی والا ہے۔ اس کی بزرگی اور عظمت ظاہر ہے اور جس ذات کی یہ عظمت ہے یقیناً اس کے علم و قدرت کے احاطہ سے کوئی چیز باہر نہیں ہو سکتی۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِيُرِيَكُمْ مِّنْ اٰيٰتِهٖ

کیا آپ کو نہیں معلوم کہ سمندر میں کشتیاں اللہ کے کرم سے چلتی ہیں تاکہ اللہ تم کو اپنی قدرت کی کچھ نشانیاں دکھا دے۔ اللہ کی قدرت و کرم کے عموم پر یہ دوسری دلیل ہے۔ نعمت سے مراد ہے احسان یعنی اللہ کا یہ کرم کہ اس نے اسباب نعمت فراہم کر دیئے۔

مِنْ اٰيٰتِهٖ میں مِنْ تبعیضیہ ہے یعنی سمندر کے اندر بعض عجائب قدرت۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ۝　بے شک اس میں ہر ایسے شخص کے لئے جو صابر و شاکر ہو بہت نشانیاں ہیں۔

صَبَّارٍ سے وہ شخص مراد ہیں جو آفاق اور انفس (یعنی اندرون و بیرون یا اپنی ذات اور سارے جہاں) کا گہرا مطالعہ کرتا ہے اور اس سوچ بچار میں تکلیفیں برداشت کرتا ہے اور شَكُوْرٍ وہ شخص جو اللہ کی نعمتوں کو پہچانتا اور نعمتیں عطا فرمانے والے کا شکر ادا کرتا ہے۔ یا صَبَّارٍ و شَكُوْرٍ سے مراد ہیں اہل ایمان کیونکہ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ایمان کے دو نصف ہیں۔ آدھا ایمان صبر میں ہے اور آدھا شکر میں۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان یعنی مومن سکھ میں شکر کرتا ہے اور دکھ میں صبر کرتا ہے (اور انسان کی زندگی دکھ اور سکھ کا ہی نام ہے)

وَاِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۭ　اور جب ان پر کوئی لہر سائبانوں کی طرح چھا جاتی ہے تو اللہ کو خالص اطاعت کے ساتھ پکارتے ہیں پھر جب اللہ ان کو بچا کر خشکی تک پہنچا دیتا ہے تو (اس وقت) کچھ تو ان میں سے اعتدال پر رہتے ہیں۔

غَشِيَهُمْ ان کو ڈھانک لیتی ہے ان کے اوپر آجاتی ہے ظُلَلٌ ظُلَّةٌ کی جمع ہے (ظلۃ سائبان) مراد پہاڑ (مقاتل) یا بادل (کلبی)

مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ یعنی اللہ کے سوا کسی دوسرے کو نہیں پکارتے کیونکہ ان کے دماغوں میں فطری طور پر یہ بات جمی ہوئی ہے کہ مصیبتوں کو دور کرنے والا اللہ کے سوا اور کوئی نہیں سخت خطرے اور خوف کے وقت وہ میلان نفسانی اور تقلید اسلاف جو فطرت پر پردہ ڈالے ہوئے تھی یکدم زائل ہو جاتی ہے۔

فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ اس جملہ کو بعض اہل تفسیر نے شرط کی جزا قرار دیا ہے لیکن غلط ہے جزا محذوف ہے۔ اصل کلام اس

منزل ۵

طرح تھا جب اللہ ان کو بچا کر خشکی تک لے آتا ہے تو ان میں سے کچھ لوگ اللہ کی نعمت کا شکر ادا کرتے ہیں اور کچھ ناشکرے بن جاتے ہیں اور کچھ درمیانی حالت پر ہو جاتے ہیں سخت ناشکری نہیں کرتے کسی قدر کافر نعمت ہو جاتے ہیں کافروں کے کفران نعمت کے درجات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ بعض کا فر کفران نعمت میں دوسروں سے زیادہ سخت ہوتے ہیں۔ کلبی نے مُقْتَصِدٌ کا یہی معنی بیان کیا ہے (یعنی متوسط درجہ کا کافر) لیکن اکثر اہل تفسیر نے کہا کہ مُقْتَصِدٌ سے مراد ہے درمیانی راہ پر قائم رہنے والا یعنی توحید پر برقرار رہنے والا (قَصْدُ السَّبِيلِ درمیانی راہ چھوٹا راستہ صراط مستقیم یعنی راہ توحید) اس تفسیر کی وجہ یہ ہے کہ آیت کا نزول حضرت عکرمہ کے متعلق ہوا۔ فتح مکہ کے وقت حضرت عکرمہ بن ابو جہل مکہ سے بھاگ کر سمندر کے کنارے پہنچ گئے اور ایک کشتی میں سوار ہو گئے۔ راستہ میں طوفان آگیا حضرت عکرمہ نے کہا اگر اللہ مجھے اس طوفان سے محفوظ رکھ کر کنارے پر پہنچا دے گا تو میں اپنا ہاتھ محمد ﷺ کے ہاتھ میں جا کر دیدوں گا۔ حضرت عکرمہ کے اس قول سے طوفان رک گیا اور عکرمہ مکہ واپس آکر مسلمان ہو گئے اس تشریح پر پورا کلام اس طرح ہوگا۔ کچھ ان میں سے اعتدال پر رہتے ہیں اور کچھ کافر ہو جاتے ہیں۔

وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُورٍ ۝ اور ہماری آیات کا انکار بس ہر بد عہد ناشکرا ہی کرتا ہے۔

خَتَّارٍ، غدار۔ عہد شکن، جو عہد فطری کو توڑنے والا ہے یا وہ شخص مراد ہے جس نے مصیبت کے وقت اللہ سے وعدہ کیا تھا اور مصیبت دور ہو گئی تو عہد توڑ دیا۔

آیات سے مراد ہیں آیات نازل شدہ یعنی آیات قرآنی کے حق ہونے کا انکار صرف عہد شکن ناشکرا کرتا ہے یا آیات سے دلائل قدرت مراد ہیں۔ منجملہ دیگر دلائل قدرت کے طوفان سے نجات دینا بھی ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا لَا يَجْزِي وَالِدٌ عَنْ وَلَدِهِ وَلَا مَوْلُودٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَالِدِهِ شَيْئًا ۚ اے لوگو اپنے رب سے خوف کرو اور ڈرو اس دن سے جب کوئی باپ اپنی اولاد کی طرف سے بدلہ نہیں دے گا اور نہ کوئی بیٹا اپنے باپ کی طرف سے کچھ بدلہ دینے والا ہوگا۔

یعنی مومن باپ کافر بیٹے کی طرف سے اور مومن بیٹا کافر باپ کی جانب سے معاوضہ نہیں دے گا۔ البتہ مومن مومن کی شفاعت کرے گا۔ اللہ نے فرمایا ہے وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے جَنَّاتُ عَدْنٍ يَدْخُلُونَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ وَأَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ

بجائے وَلَد کے مولود کا لفظ ذکر کرنے سے مقصود نفی معاوضہ کا پرزور اظہار ہے کیونکہ مولود تو صرف بیٹے کو کہتے ہیں اور ولد کا اطلاق پوتے، پڑپوتے پر بھی ہوتا ہے۔ پس جب صلبی حقیقی بیٹا اپنے باپ کے کام نہیں آئے گا تو پوتے کا اپنے دادا کے کام نہ آنا ظاہر ہی ہے۔ ولد کا اطلاق بیٹے پوتے پڑپوتے بلکہ پوتی پڑپوتی پر بھی ہوتا ہے۔ دیکھو اللہ نے فرمایا ہے فَإِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُ وَلَدٌ وَوَرِثَهُ أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ یعنی اگر میت کی اولاد (بیٹا، پوتا، بیٹی، پوتی بلکہ ان کی نسل) نہ ہو اور صرف ماں باپ وارث ہوں تو کل ترکہ میں سے ایک تہائی ماں کا ہوگا۔

خطاب آیت رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے مومنوں کو ہے اس زمانہ میں بیشتر مسلمان وہ تھے جن کے باپ دادا کفر کی حالت پر مرے تھے اس لئے نہایت پختہ طور پر اور پرزور تاکید کے ساتھ فرمایا کہ تم لوگ اپنے باپ دادا کے کام نہیں آسکو گے اور کافر باپ دادا کی شفاعت نہ کر سکو گے۔

إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ بے شک اللہ کا وعدہ (یعنی قیامت حشر نشر اور ثواب عذاب کا وعدہ) حق ہے۔ یعنی اس کے خلاف ہونا ممکن نہیں۔

فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا ۖ پس دنیوی زندگی تم کو فریب نہ دے دے کیونکہ دنیا فانی ہے۔ اس کا عیش بھی مصائب آگیں ہے۔

وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴿۳۳﴾ اور اللہ کے متعلق تم کو کوئی فریب دینے والا دھوکہ نہ دے پائے۔ یعنی اللہ کے حلم اور عذاب کی تاخیر سے یہ دھوکہ نہ کھانا چاہئے کہ عذاب نہیں ہوگا، غرور سے مراد ہے شیطان۔ شیطان اللہ کی (عمومی) مغفرت دکھا کر گناہوں کی جرأت دلاتا ہے (یہ اس کا فریب ہوتا ہے تم اس کے فریب میں نہ آجانا)

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے مجاہد کی مرسل روایت نقل کی ہے کہ صحرا نشین لوگوں میں سے ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بغوی نے اس شخص کا نام حارث بن عمرو بن حارث بن محارب بن حفصہ بتایا ہے اور اس نے رسول اللہ ﷺ سے قیامت کے متعلق دریافت کیا یعنی یہ پوچھا کہ قیامت کب ہوگی؟ اس شخص نے یہ بھی کہا کہ میری بی بی حاملہ ہے بتائیے کیا پیدا ہوگا (لڑکا یا لڑکی؟) اور ہمارا ملک خشک سالی میں مبتلا ہے بتائیے بارش کب ہوگی؟ اور جس زمین پر میں پیدا ہوا تھا وہ تو مجھے معلوم ہے لیکن کس جگہ مروں گا یہ آپ بتائیے۔ اس پر آیات ذیل نازل ہوئیں۔

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ اللہ ہی کے پاس ہے (آخری) ساعت یعنی قیامت (برپا ہونے کے وقت) کا (تفصیلی) علم۔

وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ اور وہی (جب چاہتا ہے) بارش نازل کرتا ہے (اس کے سوا بارش کے وقت کو کوئی نہیں جانتا)

وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ۭ اور رحم کے اندر کی چیز کو بھی وہی جانتا ہے (کہ وہ لڑکا ہے یا لڑکی اس کے سوا کوئی نہیں جانتا)

وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۭ اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کرے گا۔

وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ۭ اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کس زمین میں مرے گا۔

حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا غیب کے خزانے پانچ ہیں جن سے سوائے خدا کے کوئی واقف نہیں۔ سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا کہ کل کیا ہوگا، سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا کہ رحم کے اندر کیا ہے، سوائے خدا کے کوئی واقف نہیں کہ قیامت کب برپا ہوگی، سوائے خدا کے کوئی شخص نہیں جانتا کہ اس کی موت کس سرزمین پر آئے گی اور سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا کہ بارش کب آئے گی۔ رواہ احمد والبخاری۔

بغوی نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے اس آیت کی تفسیر میں حدیث مذکور الفاظ ذیل کے ساتھ بیان کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا غیب کے خزانے (یا کنجیاں) پانچ ہیں پھر حضور ﷺ نے آیت اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ سے بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ تک تلاوت فرمائی۔

صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے سوال جبرئیلؑ والی حدیث میں آیا ہے۔ یہ پانچ چیزوں میں سے ہے یعنی قیامت کا علم ان پانچ چیزوں میں سے ہے جو آیت اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ الخ میں مذکور ہیں۔

ابن ابی شیبہ نے المصنف میں خیثمہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ملک الموت حضرت سلیمانؑ کے پاس آئے اور حضرت سلیمان کے پاس جو لوگ بیٹھے ہوئے تھے ان میں سے ایک شخص کی طرف گھور کر دیکھنے لگے۔ اس شخص نے پوچھا یہ کون شخص ہے۔ حضرت سلیمان نے فرمایا ملک الموت ہے۔ اس شخص نے کہا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مجھے (مارنا) چاہتا ہے آپ ہوا کو حکم دیجئے کہ وہ مجھے اٹھا کر ہندوستان پہنچا دے۔ حضرت سلیمان نے ہوا کو حکم دے دیا (ہوا نے اس شخص کو ہندوستان پہنچا دیا) ملک الموت نے کہا میں تعجب سے اس شخص کو برابر دیکھ رہا تھا کیونکہ یہ آپ کے پاس موجود تھا اور مجھے حکم دیا گیا تھا کہ ہندوستان میں اس کی روح قبض کروں۔ (واللہ اعلم)

اللہ نے اپنے علم کو ظاہر کرنے کے لئے لفظ عِلْمُ السَّاعَةِ اور يَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ فرمایا اور مخلوق سے علم کی نفی کے لئے ما تدری فرمایا علم اور درایت میں کیا فرق ہے؟

درایت اگرچہ علم ہی کو کہتے ہیں لیکن درایت کے اندر تدبیر کا مفہوم داخل ہے یعنی کسی تدبیر سے علم حاصل کرنا۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے دَرَیتُہٗ (یعنی) علمتہ بضرب من الحیلۃ میں نے کسی تدبیر سے اس کو جان لیا۔ گویا (آیت میں اشارہ اس طرف کیا گیا کہ) مخلوق کوئی تدبیر کرے اور جتنی طاقت ممکن ہو صرف کر دے پھر بھی اس کو معلوم نہیں ہو گا وہ کیا کرے گا اور اس کا خاتمہ کب (اور کہاں) ہو گا دوسروں کے عمل اور موت کو جاننے کا تو ذکر ہی کیا ہے ہاں اگر اللہ کے پیغمبروں کے ذریعہ سے یا دلائل کی روشنی میں اللہ اس کو علم عطا فرما دے تو یہ صورت مستثنیٰ ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بلاشبہ اللہ (تمام چیزوں سے) واقف ہے۔

خَبِيْرٌ ۝ (مکمل) باخبر ہے۔ ہر چیز کے ظاہر و باطن سے واقف ہے۔ ع ۱۴

ایک حکایت ہے کہ منصور (عباسی خلیفہ) نے خواب میں ملک الموت کو دیکھا، منصور نے اس سے اپنی عمر کی مدت دریافت کی۔ ملک الموت نے اپنی پانچ انگلیاں دکھا دیں۔ اہل تعبیر سے تعبیر دریافت کی تو کسی نے کہا پانچ برس کسی نے کہا پانچ مہینے کسی نے کہا پانچ دن۔

امام ابو حنیفہؒ سے دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا یہ اشارہ ہے اس آیت کی طرف کہ یہ پانچوں چیزیں سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا۔

بحمد اللہ سورۂ لقمان کی تفسیر ۲۲ رجب ۱۲۰۶ھ اور اس کا ترجمہ ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۹۱ھ کو ختم ہوا۔

سورۃ السجدۃ

یہ سورۃ مکی ہے اس میں ۳۰ آیات ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الٓمّٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ یہ (کتاب) رب العالمین کی طرف سے اتاری ہوئی کتاب ہے اس میں کوئی شک (کی بات) نہیں ہے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۚ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ کیا یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ پیغمبر نے یہ اپنے دل سے بنالیا ہے (ایسا نہیں ہے) بلکہ یہ سچی (کتاب) ہے آپ کے رب کی طرف سے۔

بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ کلام سابق کی تاکید ہے، مضمون آیت کی ترتیب اس طرح ہوئی کہ پہلے الٓمّٓ فرما کر قرآن کے معجزہ ہونے کی طرف اشارہ کیا (یعنی قرآن مجید کی ہر آیت اور عبارت کی ساخت انہی حروف سے ہے جو عام لغت عربی کی بنیاد ہیں لیکن اسلوب ادا اور طرز ترکیب ایسا ہے کہ کوئی مخلوق ایسا کلام نہیں بنا سکتی معلوم ہوا کہ ایسا کلام بنانا طاقت بشری سے خارج ہے اسی کا نام معجزہ ہے۔ مترجم) جب اعجاز کی طرف اشارہ کر دیا تو لازمی یہ نتیجہ نکلا کہ یہ اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہے۔ منزل من اللہ ہونے کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اس کے اندر کوئی قابل شک چیز نہیں۔ اس سے آگے کلام کا رخ بدل کر بطور انکار تعجب کے کافروں کا قول نقل کیا جو قرآن کو رسول اللہ ﷺ کا خود ساختہ قرار دیتے تھے، پھر کافروں کے اس قول پر تعجب آمیز انکار کے بعد قرآن کی حقانیت اور منزل من اللہ ہونے کی صراحت فرما دی، اس سے آگے کی آیت میں غرض تنزیل بیان فرمائی ہے۔ اور ارشاد فرمایا:

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝ کہ آپ ان لوگوں کو ڈرائیں جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی پیغمبر نہیں آیا تاکہ (آپ کے ڈرانے سے) وہ ہدایت پالیں۔

حضرت عیسیٰ کے بعد رسول اللہ ﷺ کی بعثت تک (عرب میں) کوئی پیغمبر نہیں آیا یہ دور فترت کا دور کہلاتا ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ اللہ وہی تو ہے جس نے آسمان و زمین اور ان دونوں کے درمیان کی کائنات چھ روز میں پیدا کی اتوار کے دن آغاز تخلیق کیا اور جمعہ کے دن فراغت۔

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۭ پھر تخت پر قائم ہوا۔

سورۂ یونس اور سورۂ اعراف میں اِسْتِوَاءٌ عَلَى الْعَرْشِ کی مکمل تشریح کر دی گئی ہے۔

مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ ۭ اس کے بغیر نہ تمہارا کوئی دوست ہوگا نہ سفارشی یعنی جب تم اللہ کی مرضی کو چھوڑ دو گے اور رضائے الٰہی سے ہٹ جاؤ گے تو ضرورت مدد کے مقام پر کوئی تمہارا مددگار نہ ہوگا نہ سفارشی۔

اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝ سو کیا تم سمجھتے نہیں ہو۔

ف حرف عطف ہے اس کا عطف ایک محذوف جملہ پر ہے پورا کلام اس طرح تھا اَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ فَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ کیا تم

غور نہیں کرتے اور سمجھتے نہیں ہو۔

يُدَبِّرُ الْأَمْرَ   وہ ہر امر کی تدبیر کرتا ہے۔ امر سے مراد ہے امر دنیا۔ (یعنی دنیوی انتظامات)

مِنَ السَّمَآءِ إِلَى الْأَرْضِ   آسمان سے زمین تک۔

یعنی اسباب سماویہ کے ذریعہ سے جن کی تاثیرات زمین کی طرف اترتی ہیں۔

ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ   پھر ہر امر اسی کے حضور میں پہنچ جائے گا۔

فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ ۝   ایک ایسے دن جس کی مقدار تمہاری گنتی کے ایک ہزار برس کے برابر ہوگی۔

ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ، حضرت مفسر نے اس کا ترجمہ اس طرح کیا ہر امر اس کی طرف چڑھتا ہے اور اس کے علم میں موجود رہتا ہے۔

يُدَبِّرُ الْأَمْرَ (کا معنی ایک تو وہ ہے جو اوپر ذکر کیا گیا دوسرا معنی یہ ہے کہ) وہ حکم دیتا ہے، جبرئیلؑ کے ذریعہ سے وحی نازل کرتا ہے یا خدمت پر مامور فرشتے کے ذریعہ سے حکم قضاء آسمان سے زمین کی طرف اتارتا ہے، پھر جبرئیل یا مامور فرشتہ چڑھ جاتا ہے اللہ کی طرف یعنی اس مقام کی طرف جو اللہ کی مرضی میں ہوتا ہے۔

فِي يَوْمٍ، یوم سے مراد دن نہیں ہے مطلق وقت مراد ہے۔ فرشتوں کا چڑھنا اترنا صرف دن کو ہی نہیں رات کو بھی ہوتا ہے۔

كَانَ مِقْدَارُهُ یعنی اس کے عروج و نزول کی مدت تمہاری گنتی کے ہزار برس کے برابر ہوتی ہے مطلب یہ کہ اگر کوئی آدمی اس مسافت کو طے کرے تو ہزار برس سے کم میں طے نہیں کر پائے گا لیکن اللہ کی قدرت کے کمال کے زیر اثر اس کا عروج و نزول پل بھر میں ہو جاتا ہے۔

بغوی نے لکھا ہے اس آیت میں آسمان سے زمین تک اور زمین سے آسمان تک ملائکہ کے عروج و نزول کا بیان ہے۔ لیکن دوسری آیت میں جو آیا ہے تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ تو اس میں زمین سے سدرۃ المنتہیٰ تک کی مسافت کا اظہار کیا گیا ہے۔ سدرۃ المنتہیٰ ہی جبرئیل کا مقام ہے اس تفسیر پر اس آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ جبرئیل اپنے مقامی ساتھی ملائکہ کو ہمراہ لے کر سدرۃ المنتہیٰ سے زمین تک کی مسافت بہت ہی تھوڑے وقت میں طے کر لیتے جو تمہاری رفتار کی گنتی کے پچاس ہزار برس کے برابر ہوتا ہے۔ لیکن اتنی بڑی مسافت جبرئیلؑ مع ملائکہ آن کی آن میں طے کر لیتے ہیں۔ یہ ساری تشریح حسب تفسیر مجاہد و ضحاک ہے۔ میرے نزدیک دونوں آیتوں میں زمین سے سدرۃ المنتہیٰ تک کی مسافت مراد ہو سکتی ہے لیکن ایک ہزار اور پچاس ہزار کی گنتی کا اختلاف چلنے والوں کی رفتار کی بناء پر بیان کیا گیا ہے کیونکہ ترمذی نے حضرت عباس بن مطلب کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا زمین اور آسمان کے درمیان کی مسافت اکہتر یا بہتر یا تہتر سال کی راہ کے برابر ہے۔ نیز ترمذی اور احمد نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا زمین و آسمان کے درمیان اور ہر آسمان سے دوسرے آسمان تک پانچ سو برس کی راہ ہے۔ یہاں بھی اختلاف مدت محض چلنے والوں کی رفتار کے تفاوت کی بناء پر ظاہر کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم

بعض اہل علم نے یہ مطلب بھی بیان کیا کہ اللہ دنیوی امور کا انتظام سماوی اسباب یعنی ملائکہ وغیرہ کے ذریعہ سے کرتا ہے جن کے آثار زمین تک آتے ہیں پھر جب دنیا فنا ہو جائے گی، حاکموں کا حکم اور اقتدار والوں کا اقتدار ختم ہو جائے گا تو ہر حکم و انتظام کا رجوع (براہ راست) اللہ کی طرف ہو جائے گا اور یہ اس روز ہوگا جس کی مقدار ہزار برس کے برابر ہوگی یعنی ایسا قیامت کے دن ہوگا اس تفسیر کی تائید حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کردہ اس حدیث سے ہوتی ہے جو ترمذی نے نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نادار لوگ مالداروں سے پانچ سو برس اور آدھے دن پہلے (یعنی قیامت کے آدھے دن کی بقدر پہلے) جنت میں داخل ہوں

گے۔ رہی آیت تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ الخ تو اس میں بھی قیامت ہی کا دن مراد ہے لیکن بخاری و مسلم نے صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو خزانہ والا اپنے خزانہ کی زکوٰۃ ادا نہیں کرے گا اس کا خزانہ جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا۔ پھر اس کی چٹانیں بنائی جائیں گی اور چٹانوں سے اس شخص کے دونوں پہلوؤں اور پیشانی پر داغ لگائے جائیں گے (اور ایسا) اس وقت تک ہوتا رہے گا جب تک اللہ اپنے بندوں کا فیصلہ اس دن کرے گا جس کی مقدار پچاس ہزار برس کی مدت کے برابر ہو گی (اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ قیامت ہی کا دن پچاس ہزار برس کے برابر ہو گا لیکن ترمذی کی روایت مندرجہ صدر اور اس روایت میں مدت کا اختلاف ہے، اول روایت میں ایک ہزار اور اس روایت میں پچاس ہزار برس کے برابر قیامت کے دن کی مدت بیان کی گئی ہے) دونوں حدیثوں کے تعارض کو دور کرنے کے لئے کہا جاتا ہے کہ مدت کا اختلاف اشخاص کے تاثر کے اختلاف پر مبنی ہے۔ بعض لوگوں کے لئے وہ پچاس ہزار برس کا دن ہو گا اور بعض کے لئے ایک ہزار برس کا اور بعض لوگوں کے لئے دنیا کے اس دن سے بھی کم مدت محسوس ہو گی۔ حاکم اور بیہقی نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے مرفوعاً اور موقوفاً بیان کیا ہے کہ مؤمنوں کے لئے قیامت کے دن کا طول اتنا ہو گا جتنی مدت ظہر و عصر کے درمیان ہوتی ہے۔

بغوی نے ابراہیم تیمی کا قول بھی یہی نقل کیا ہے اور ابویعلیٰ و ابن حبان و بیہقی نے حسن سند کے ساتھ حضرت ابوسعیدؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اس دن کے متعلق دریافت کیا گیا جس کی مدت پچاس ہزار برس کی ہو گی اور عرض کیا گیا یہ تو بڑا لمبا دن ہو گا۔ حضور ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے مؤمن کے لئے تو وہ اس فرض نماز سے بھی زیادہ خفیف ہو گا جو دنیا میں وہ پڑھا کرتا تھا۔

بغوی نے لکھا ہے کہ ابن ابی ملیکہ نے بیان کیا میں اور حضرت عثمانؓ کے آزاد کردہ غلام عبداللہ بن فیروز حضرت ابن عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس آیت نیز خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ والی آیت کی بابت دریافت کیا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جن ایام کا اللہ نے ذکر کیا ہے مجھے ان کی بابت کچھ معلوم نہیں اور بغیر جانے اللہ کے کلام کے متعلق کچھ کہنا میں مناسب نہیں سمجھتا۔

جلال الدین محلی نے اپنی تفسیر میں اسی روایت کو پسند کیا ہے۔ بعض علماء نے آیت کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ (یکدم) ایک ہزار تک ہونے والے امور کے فیصلے اللہ ایک وقت میں کر دیتا ہے۔ فرشتہ اس فیصلہ کو لے کر اترتا ہے پھر ہزار برس گزرنے کے بعد دوبارہ آنے والے ہزار کے فیصلے حاصل کرنے کے لئے اوپر کو چڑھتا ہے۔

ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ یہی (خالق مدبر عالم) مخلوق سے پوشیدہ امور کو اور ان امور کو بھی جو مخلوق کے سامنے حاضر ہیں جاننے والا ہے۔ اور اپنی حکمت کے موافق تمام امور کا انتظام کرتا ہے۔

الغالب (اپنے امر پر) غالب ہے۔

الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝ اپنی تدبیر و انتظام میں بندوں پر (زبردست) بہت مہربان ہے۔

اس لفظ میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اللہ اپنی مہربانی اور عنایت سے مصالح عباد کا لحاظ رکھتا ہے۔

الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ (اللہ) جس نے جو چیز بنائی خوب بنائی۔ یعنی ہر چیز کی استعداد اور قابلیت کے مطابق اللہ نے اس کی تخلیق باحسن وجوہ کی۔ قتادہ نے یہی مطلب بیان کیا لیکن حضرت ابن عباسؓ نے اَحْسَنَ کا ترجمہ اَحْكَمَ وَاَتْقَنَ کیا یعنی اللہ نے ہر چیز کو محکم بنایا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا بندروں کے سرینوں کا شگاف اللہ نے خوبصورت نہیں بنایا بلکہ محکم بنایا ہے۔ مقاتل نے اَحْسَنَ کا ترجمہ عَلِمَ کیا یعنی اللہ جانتا ہے کہ ہر چیز کو وہ کس طرح پیدا کرتا ہے۔ عرب کہتے ہیں فلان یحسن کذا۔ فلاں شخص خوب جانتا ہے کہ ایسا کام کس طرح کرے۔

وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۝ اور آدمی کی ابتدائی پیدائش مٹی سے کی۔ اَلْاِنْسَانِ سے مراد حضرت آدمؑ ہیں۔

ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ﴿۸﴾ پھر اس کی نسل کو ایک خلاصہ سے یعنی حقیر پانی سے بنایا۔

نسل کا لغوی معنی ہے جدا ہونا، آنے والی اولاد بھی باپ ہی کا جدا شدہ حصہ ہوتی ہے۔ سُلٰلَةٍ سے مراد ہے نطفہ (سل کا معنی ہے کھینچنا) نطفہ انسان (کے بدن) سے کھنچ کر آتا ہے اسی لئے اس کو سلالہ کہا گیا۔

ثُمَّ سَوّٰىهُ پھر اس کو (اعضاء کی شکل دیکر) ٹھیک کیا۔

وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ اور اس میں اپنی روح پھونکی۔

مِنْ رُّوْحِهٖ میں اضافت تخلیق انسانی کی عزت و بزرگی کو بتا رہی ہے۔ اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ انسان کی تخلیق ایسی عظیم الشان ہے۔ جس کی نسبت ایسی چیز کی طرف ہے۔ جس کی نہ کوئی نظیر ہے نہ کوئی کیفیت۔

وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ اور تمہارے کان اور آنکھیں اور دل بنائے۔

یعنی پہلے تم نطفہ بے جان تھے پھر اللہ نے سننے کے لئے کان دیکھنے کے لئے آنکھیں اور سمجھنے کے لئے دل تم کو عطا کئے تاکہ تم سنو، دیکھو اور سمجھو۔

قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿۹﴾ تم بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔ یعنی تھوڑا شکر کرتے ہو یا تھوڑے وقت شکر کرتے ہو۔

مَا (زائدہ ہے) قلت کے معنی کی تاکید کر رہا ہے۔ مطلب یہ کہ تم ان نعمتیں عطا کرنے والے کا شکر بہت کم ادا کرتے ہو اس کی توحید کا اقرار کم کرتے ہو اور اس کی عبادت کم کرتے ہو۔

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ ؕ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ

جب ہم زمین میں نیست و نابود ہو گئے تو کیا ہم پھر نئے جنم میں آئیں گے، یعنی جب ہم زمین میں غائب ہو جائیں گے اور مٹی بن کر مٹی میں مل جائیں گے۔ زمین کی خاک میں اور ہماری خاک میں کوئی فرق نہیں رہے گا تو کیا ہم کو دوبارہ از سر نو زندہ کیا جائے گا۔

ضل الماء فی اللبن عرب کا محاورہ ہے، یعنی دودھ میں پانی اس طرح مل کر کھو گیا کہ کوئی امتیاز باقی نہ رہا۔

یہ قول ابی بن خلف کا تھا لیکن اور سب لوگ اس کے موید تھے اس لئے سب کی طرف قول کی نسبت کر دی۔ استفہام انکاری ہے محض سوالیہ نہیں ہے۔

بَلْ هُمْ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۰﴾ (یہ لوگ صرف دوسری زندگی ہی کا انکار نہیں کرتے بلکہ اپنے رب کی پیشی کے منکر ہیں یعنی آخرت میں ہونے والی ہر جزا و سزا کے منکر ہیں۔

قُلْ یَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِیْ وُكِّلَ بِكُمْ آپ کہہ دیجئے کہ موت کا وہ فرشتہ تمہاری جانیں قبض کرے گا جو تمہارے لئے مقرر کیا گیا ہے۔

یَتَوَفّٰی بمعنی یَسْتَوْفِیْ ہے باب تفعل اور استفعال باہم ایک دوسرے کی جگہ استعمال کر لئے جاتے ہیں۔ جیسے تَقَضَّیْتُهُ اور اِسْتَقْضَیْتُهُ، تَعَجَّلْتُهُ اور اِسْتَعْجَلْتُهُ یعنی موت کا فرشتہ تمہاری جانوں کو پورا پورا لے لے گا، جان کا کوئی حصہ نہیں چھوڑے گا یا کسی کو نہیں چھوڑے گا۔

موت کے فرشتہ سے مراد عزرائیل ہیں۔ بغوی نے لکھا ہے کہ عکرمہؓ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمام درد دکھ موت کے قاصد ہیں۔ جب وقت مقرر آجاتا ہے تو موت کا فرشتہ آپہنچتا ہے اور کہتا ہے اے بندے کتنی ہی خبروں کے بعد خبریں آتی رہیں، قاصدوں کے بعد قاصد اور پیاموں کے بعد پیام بھی آتے رہے۔ اب میں آخری خبر ہوں میرے بعد (تیرے پاس) کوئی خبر نہیں آئے گی میں (آخری) قاصد ہوں میرے بعد کوئی قاصد نہیں آئے گا۔ اب چارہ

باچار حکم رب پر تجھے لبیک کہتا ہے۔ جب موت کا فرشتہ روح قبض کر لیتا ہے اور (اقرباء اعزہ) اس پر چیختے پیٹتے ہیں تو موت کا فرشتہ کہتا ہے تم کس پر چیختے ہو، کس پر روتے ہو۔ خدا کی قسم میں نے اس کی مدت حیات میں کوئی کمی نہیں کی نہ میں نے اس کا رزق کھایا بلکہ اس کے رب نے اس کو بلا لیا ہے، رونے والا اپنے اوپر روئے۔ خدا کی قسم میرے بار بار لوٹ لوٹ کر پھیرے ہوتے رہیں گے یہاں تک کہ میں تم میں سے کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔

اَلَّذِیْ وُکِّلَ بِکُمْ یعنی موت کا مقرر فرشتہ۔ ملک الموت کے مددگار اور بہت سے ملائکہ ہیں، سورۂ انعام کی آیت حَتّٰی اِذَا جَآءَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا الخ کی تفسیر کے ذیل میں ملک الموت اور اس کے مددگاروں کے متعلق جو احادیث ہیں ان کو ہم ذکر کر چکے ہیں۔

مسئلہ :۔ ملک الموت کو کسی کے مرنے کا مقرر وقت معلوم نہیں جب کسی کی روح قبض کرنے کا اس کو حکم ہوتا ہے اس وقت اس کو معلوم ہوتا ہے۔

ابن ابی الدنیا نے ابن جریج کا قول نقل کیا ہے ہم تک یہ بات یعنی حدیث پہنچی ہے کہ ملک الموت سے کہا جاتا ہے، فلاں شخص کی روح فلاں وقت فلاں دن قبض کر لے۔

مسئلہ :۔ موت کا فرشتہ مؤمن کے سامنے مرنے کے وقت خوبصورت ترین شکل میں آتا ہے اور کافر کے سامنے بدترین شکل میں۔ ابن ابی الدنیا کا بیان کہ حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جب اللہ نے ابراہیم کو اپنا خلیل چن لیا تو ملک الموت نے (بارگاہ الٰہی میں) درخواست کی کہ مجھے اجازت عطا فرمائی جائے میں ابراہیم کو جا کر یہ بشارت دیدوں، اللہ تعالیٰ نے اجازت عطا فرما دی۔ ملک الموت نے جا کر ابراہیم کو یہ بشارت سنائی، حضرت ابراہیم نے فرمایا، الحمد للہ۔ پھر فرمایا اے فرشتہ موت مجھے دکھا دے تو کافروں کی روحیں کیسے قبض کرتا ہے۔ ملک الموت نے کہا آپ اس کی تاب نہیں لا سکتے۔ حضرت ابراہیم نے کہا کیوں نہیں فرشتہ موت نے اپنا منہ ابراہیم کی طرف سے پھیر لیا اور فوراً پھر ابراہیم کی طرف رخ کیا تو ابراہیم نے دیکھا ایک سیاہ فام شخص سامنے کھڑا ہے جس کا سر آسمان کو چھو رہا ہے اور اس کے منہ سے آگ کے شعلے نکل رہے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر حضرت ابراہیم بے ہوش ہو گئے کچھ دیر کے بعد ہوش میں آئے تو دیکھا کہ ملک الموت اپنی پہلی شکل میں آ چکا تھا، حضرت ابراہیم نے فرمایا اے ملک الموت اگر (مرنے کے وقت) کوئی کافر سوائے آپ کی اس (ہیبت ناک) صورت کے کسی اور مصیبت و غم سے دوچار نہ بھی ہو تب بھی (اس کی مصیبت و غم کے لئے) یہ صورت ہی کافی ہے۔ اچھا اب بتائیے آپ مومنوں کی روحیں کیسے قبض کرتے ہیں۔ ملک الموت نے اپنا منہ پھیر لیا پھر فوراً دوبارہ حضرت ابراہیم کی طرف رخ موڑا تو ابراہیم نے دیکھا کہ وہ نہایت حسین جوان مرد تھے خوشبو پاکیزہ مہک رہی تھی اور لباس سفید تھا۔ حضرت ابراہیم نے فرمایا اے فرشتہ موت اگر مرنے کے وقت مؤمن آپ کی اس (حسین پاکیزہ) صورت کے سوا کوئی اور چشم نواز خنکی اور عزت نہ بھی دیکھے، تب بھی اس کے لئے یہی حسین صورت کافی ہو گی۔

حضرت کعب کا بیان ہے کہ حضرت ابراہیم کو ملک الموت نے اپنی وہ حسین صورت دکھائی جو مؤمن کی روح قبض کرتے وقت ان کی ہوتی ہے تو ان کی صورت پر ایسی چمک دمک اور رونق دیکھی جس کی کیفیت سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں جانتا اور کافروں، فاجروں کی روح قبض کرنے کے وقت جو صورت ان کی ہوتی ہے جب وہ دکھائی تو ابراہیم خوف زدہ ہو گئے، یہاں تک کہ آپ کے شانے لرزنے لگے اور پیٹ زمین کو لگا دیا، قریب تھا کہ آپ کی جان نکل جائے۔

مسئلہ :۔ جانوروں کی موت کس طرح ہوتی ہے۔ ابو الشیخ اور دیلمی نے اور عقیلی نے الضعفاء میں انسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا چوپایوں اور زمین کے کیڑوں مکوڑوں کی مدت زندگی اللہ کی پاکی بیان کرنے سے رہتی ہے۔ جب ان کی تسبیح ختم ہو جاتی ہے تو اللہ خود ان کی جانیں قبض کر لیتا ہے، موت کے فرشتہ کو اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ایک اور سند سے حضرت ابن عمر کی روایت سے خطیب نے بھی ایسی ہی حدیث نقل کی ہے۔ ابن عطیہ اور قرشی نے کہا اس کا مطلب یہ

ہے کہ ملک الموت کے وقل کے بغیر اللہ خود ان کی زندگیاں ختم کر دیتا ہے۔

میں کہتا ہوں آدمیوں کی روحیں قبض کرنے کے لئے ملک الموت اور اس کے مددگاروں کی وساطت مؤمنوں کی عزت افزائی اور کافروں کی توہین و سزا کے لئے قائم کی گئی ہے۔

خطیب نے اپنی تفسیر میں بوساطت ضحاک حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ملک الموت کو آدمیوں کی روحیں قبض کرنے کے لئے مقرر کیا گیا ہے اور ایک فرشتہ جنات کے لئے مقرر ہے اور ایک فرشتہ شیاطین کی موت پر اور ایک فرشتہ چرندوں، پرندوں، درندوں، مچھلیوں اور چیونٹیوں کی موت کے لئے مقرر ہے یہ چار فرشتے ہیں (تمام) فرشتے پہلی بے ہوشی میں (یعنی پہلا صور پھونکتے ہی) مر جائیں گے۔ ملک الموت ان کی روحیں قبض کرنے پر مقرر ہے پھر ملک الموت (خود) مر جائے گا لیکن (جہاد پر جانے والے) وہ لوگ جو سمندر میں شہید ہوتے ہیں اللہ ان کی روحیں خود قبض کرتا ہے ان کی عزت افزائی کے پیش نظر ملک الموت کو ان کا معاملہ سپرد نہیں کرتا وہ راہ خدا میں نکلنے والے ہوتے ہیں۔ جو سمندر میں شہید ہو جاتے ہیں، اس روایت کی سند میں جو یبر انتہائی ضعیف راوی ہے، پھر ضحاک کا حضرت ابن عباسؓ سے انقطاع بھی ہے، البتہ اثر مذکور کے آخری حصہ کا ایک شاہد مرفوع ہے۔

ابن ماجہ نے حضرت ابو امامہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے ملک الموت کو سوائے شہداء بحر کے سب کی روحیں قبض کرنے پر مقرر فرمایا ہے۔ شہداء بحر کی روحیں قبض کرنے کی ذمہ داری اللہ نے خود (اپنے ہاتھ میں) لی ہے..... میں کہتا ہوں عشق و معرفت کے سمندر میں ڈوبنے والے تو اس عزت افزائی کے زیادہ مستحق ہیں۔ واللہ اعلم۔

ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ۝ پھر تم سب اپنے رب ہی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

یعنی مرنے کے بعد مؤمن کی روح کو رحمت کے فرشتے آسمانوں پر چڑھا لے جائیں گے یہاں تک کہ ساتویں آسمان تک پہنچا دیں گے، اور کافر کی روح کو عذاب کے فرشتے لے کر چڑھیں گے اور جب پہلے ہی آسمان تک پہنچ کر (دروازہ) کھلوانا چاہیں گے تو کافر کی روح کے لئے آسمان کا دروازہ نہیں کھولا جائے گا، بلکہ اوپر سے اس کو پھینک دیا جائے گا (کہ وہ مقام سجین میں پہنچ جائے گی) پوری حدیث سورۂ انعام میں نقل کی جا چکی ہے۔

یا یہ مطلب ہے کہ قبروں سے اٹھا کر زندہ کر کے تم کو مقام حساب تک لے جایا جائے گا اور حساب کے بعد ہر شخص کو اس کے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔ حشر کے بعد کیا حال ہوگا؟ اس کا ذکر اللہ نے اگلی آیت میں فرمایا ہے۔

وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اور (اے محمد ﷺ) اگر آپ (وہ منظر) دیکھیں گے (تو بڑا ہیبت ناک منظر آپ کو دکھائی دے گا) جب کہ مجرم (یعنی وہ مشرک جو کہا کرتے تھے کہ جب ہم خاک میں مل جائیں گے تو کیا نئے جنم میں اٹھ سکیں گے ندامت اور غم کے مارے) اپنے رب کے سامنے سر جھکائے حاضر ہوں گے۔

رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ ۝ (کہیں گے) اے ہمارے مالک ہم نے دیکھ لیا اور سن لیا اب ہم کو (دنیا کی طرف) لوٹا دے ہم نیک کام کریں گے اب ہم کو یقین آ گیا۔

اَبْصَرْنَا یعنی تو نے جو ہم کو وعید سنائی تھی اور ہم اس کی تکذیب کرتے تھے وہ وعید آج ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔

سَمِعْنَا یعنی تو نے اپنے پیغمبروں کی تصدیق کر دی جن کو ہم جھوٹا کہتے تھے۔ ہم نے آج تیری طرف سے تصدیق سن لی۔ اَبْصَرْنَا اور سَمِعْنَا کا یہ مطلب بھی بیان کیا گیا ہے کہ ہم نے اپنے گناہ دیکھ لئے اور ہمارے متعلق جو کہا گیا ہم نے سن لیا۔

اِنَّا مُوْقِنُوْنَ یعنی جس چیز میں ہم کو پہلے شک تھا آج اس کا یقین آ گیا۔

وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۝ اور اگر ہم چاہتے تو جن و انس میں سے ہر

شخص کو اس کی ہدایت دیتے (یعنی ایسی چیز دے دیتے جس کے ذریعہ سے وہ قطعی ہدایت یاب ہو جاتا) لیکن میری طرف سے (جو) بات (طے ہو چکی تھی وہ) پوری ہو گئی کہ میں دوزخ کو جنات اور انسانوں سے سب سے بھر دوں گا۔

اَلْجِنَّةِ اور اَلنَّاسِ میں الف لام عہدی ہے اس سے مراد ہیں مجرم لوگ۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ نے کچھ لوگوں کو پیدائشی جنتی بنایا جب وہ اپنے آباء کی پشت میں تھے اسی وقت ان کو جنت کے لئے بنا دیا تھا اور کچھ لوگوں کو پیدائشی دوزخی بنایا جب وہ پشت پدر میں تھے اسی وقت ان کو دوزخ کے لئے بنا دیا تھا۔ رواہ مسلم۔

حضرت علیؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے ہر ایک کے لئے دوزخ میں ٹھکانا یا جنت میں ٹھکانا (پہلے سے) لکھ دیا گیا ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ پھر ہم اسی تحریر پر بھروسہ کیوں نہ کرلیں اور کیوں نہ عمل ترک کر دیں؟ فرمایا عمل کئے جاؤ، ہر ایک کو اسی کام کی توفیق دی جاتی ہے جس کے لئے اس کو پیدا کیا گیا ہے جو خوش نصیب لکھ دیئے گئے ہیں ان کے لئے اہل سعادت کے عمل آسان کر دیئے جاتے ہیں۔ اور جو بدبخت لکھ دیئے گئے ہیں ان کو بدنصیبوں کے اعمال کی توفیق دی جاتی ہے، اس کے بعد حضور ﷺ نے آیت فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى آخر تک تلاوت فرمائی۔ رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کی روایت ہے کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ دست مبارک میں دو تحریریں لئے برآمد ہوئے اور فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ یہ دونوں تحریریں کیسی ہیں؟۔ ہم نے عرض کیا ہم کو کچھ علم نہیں حضور ﷺ نے دائیں ہاتھ والی تحریر کے متعلق فرمایا یہ رب العالمین کی تحریر ہے اس میں تمام جنتیوں کے نام مع ان کے آباء و قبائل کے لکھے ہوئے ہیں پھر اس کو بند کر دیا گیا ہے آئندہ بھی اس میں کمی بیشی نہیں کی جا سکتی اور بائیں ہاتھ والی تحریر کے متعلق فرمایا یہ تحریر بھی رب العالمین کی ہے اس میں دوزخیوں کے نام ان کے آباء و قبائل سمیت لکھے ہوئے ہیں پھر آخر میں اس کو بند کر دیا گیا۔ آئندہ بھی اس میں کمی بیشی نہیں کی جا سکتی۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ جب معاملہ طے ہو چکا ہے تو پھر عمل کس غرض سے کیا جائے؟ فرمایا سیدھی چال چلتے رہو اور لگے کے چلو، جنتی کا خاتمہ اہل جنت کے عمل پر ہوتا ہے خواہ زندگی میں اس نے کوئی عمل بھی کیا ہو اور دوزخی کا خاتمہ دوزخیوں کے عمل پر ہوتا ہے خواہ زندگی میں اس نے کچھ بھی کیا ہو، پھر حضور ﷺ نے تحریروں کی طرف اشارہ کر کے پھینک دیا (یعنی ایسا اشارہ کیا جیسا کوئی پھینکنے والا کرتا ہے اور وہ تحریریں غائب ہو گئیں) پھر فرمایا تمہارا رب بندوں (کے فیصلے) سے فارغ ہو چکا ہے۔ ایک فریق جنتی اور دوسرا فریق دوزخی ہے۔ رواہ الترمذی۔

لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ الخ اَلْقَوْلُ کا بیان ہے۔ مقاتل نے کہا اَلْقَوْلُ سے مراد ہے اللہ کا یہ قول جس میں ابلیس سے خطاب کر کے فرمایا ہے لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ۔

آیت میں صراحت ہے کہ لوگوں کا ایمان نہ لانا اللہ کی مشیت کے زیر اثر ہے۔ حَقَّ الْقَوْلُ عدم مشیت کی تاکید ہے مطلب یہ ہے کہ میری ہی مشیت سے ان کا کافر ہونا اور جہنم میں داخل ہونا ہے۔

یا لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ الخ میں ایک سابق تقدیری فیصلہ کا اظہار کیا گیا ہے جو عدم مشیت ایمان کی علت ہے۔ عذاب کا مزہ چکھنے کا سبب نسیان قیامت کو اگلی آیت میں قرار دیا ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ تقدیری فیصلہ علت سابقہ نہ ہو۔

فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۚ پس تم چونکہ اس دن کے سامنے آنے کو بھول گئے تھے اس لئے عذاب کا مزہ چکھو ہم نے بھی (آج) تم کو بھلا بسرا کر دیا۔ بھولنے سے مراد ہے رحمت سے محروم کر دینا یا عذاب میں اس طرح چھوڑ دینا جیسے کوئی چیز بھولی بسری ہو جاتی ہے۔

لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا سے مراد ہے قبروں سے اٹھ کر اللہ کی طرف یعنی مقام حساب کی طرف جانا۔

اِنَّا نَسِيْنٰكُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

ہم نے تم کو بھلا دیا اور اپنے کرتوت کی پاداش میں دوامی عذاب کا مزہ چکھو۔

امر کی تکرار مفید تاکید ہے اس آیت میں کفر و معاصی کو ذوق عذاب کا سبب قرار دیا ہے، اور گزشتہ سابقہ آیت میں ذوق

عذاب کا سبب نسیان قیامت و حساب اور انجام پر عدم تفکر و تدبر کو قرار دیا ہے گویا اس سے اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ نسیان قیامت اور ارتکاب سیئات دونوں موجب عذاب ہیں۔

اس آیت میں جبریہ اور قدریہ کے مسلک کے خلاف دلیل موجود ہے (جبریہ انسان کو مجبور محض پتھر کی طرح خیال کرتے ہیں اور قدریہ انسان کو اپنے اعمال کا خود خالق قرار دیتے ہیں۔ مترجم) بِمَا نَسِيتُمْ سے جبریہ فرقہ کی تردید ہو رہی ہے۔ اللہ نے نسیان قیامت کو موجب عذاب قرار دیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ تدبر و تفکر کو چھوڑنا اور ایمان کو ترک کرنا اور معاصی کا ارتکاب کرنا انسان کے اختیار میں ہے۔ قدریہ قائل ہیں کہ اللہ بندوں سے ایمان اور نیک اعمال چاہتا ہے مگر انسان خود اپنی مشیت و اختیار سے ایمان اور اعمال صالحہ کو ترک کرتا ہے اور اپنی بد اعمالی کا خود خالق ہے اس کی تردید آیت وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدَاهَا سے ہو رہی ہے اور ثابت ہو رہا ہے کہ انسان کا کوئی عمل اللہ کی مشیت کے بغیر نہیں ہوتا، پس نہ کامل جبر کا قول صحیح ہے نہ تفویض مطلق کا، بلکہ دونوں کے بیچ کی راہ سیدھی ہے (یعنی کاسب بندہ ہے اور خالق اللہ ہے۔ انسان کفر و معاصی اللہ کے حکم کے خلاف کرتا ہے۔ مشیت خداوندی کے خلاف نہیں کر سکتا۔ مترجم)

إِنَّمَا يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا الَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِهَا خَرُّوا سُجَّدًا وَسَبَّحُوا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ۩

پس ہماری آیتوں پر تو وہ لوگ ایمان لاتے ہیں کہ جب ان کو وہ آیتیں یاد دلائی جاتی ہیں تو وہ سجدے میں گر پڑتے ہیں اور اپنے رب کی تسبیح و تحمید کرنے لگتے ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے۔

ذُكِّرُوا۔ یعنی ان کو نصیحت کی جاتی ہے۔ خَرُّوا منہ کے بل گر پڑتے ہیں اللہ کے عذاب کے خوف سے

سَبَّحُوا ہر نامناسب بات سے اللہ کے پاک ہونے کا اعتراف کرتے ہیں (اللہ ہر عیب، نقصان، عجز و جہالت سے پاک ہے)۔

بِحَمْدِ رَبِّهِمْ اللہ کی حمد کرتے ہوئے یعنی اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ان کو ایمان کی توفیق دی اور ہدایت نصیب کی، مطلب یہ کہ وہ (دل کی شہادت کے ساتھ زبانوں سے) سبحان اللہ وبحمدہ کہتے ہیں۔

لَا يَسْتَكْبِرُونَ اور ایمان و اطاعت سے غرور نہیں کرتے۔

تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا ز

ان کے پہلو خواب گاہوں سے دور رہتے ہیں وہ اپنے رب (کے عذاب و ناراضگی) کے خوف سے اور (رحمت و ثواب کی) امید رکھتے ہوئے اس کو پکارتے ہیں۔

خواب گاہوں سے پہلو دور رکھنے سے مراد یہ ہے کہ وہ بستروں سے جدا ہو جاتے ہیں۔ حضرت اسماءؓ بنت یزید راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، قیامت کے دن اللہ ایک ہموار میدان میں لوگوں کو جمع کرے گا، پکارنے والے کی آواز سب کو (ایک جیسی) سنائی دے گی اور چونکہ درمیان میں کوئی چیز حائل نہیں ہوگی اور نشیب و فراز نہیں ہوگا اس لئے نظر سب کے پار جائے گی۔ منادی پکارے گا کہاں ہیں وہ لوگ جو دکھ سکھ میں اللہ کی حمد کرتے تھے یہ آواز سن کر کچھ تھوڑے سے کھڑے ہو جائیں گے اور بلا حساب جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ پھر منادی پکارے گا کہاں ہیں وہ لوگ جن کے پہلو خواب گاہوں سے الگ رہتے تھے یہ آواز سن کر کچھ تھوڑے سے لوگ کھڑے ہو جائیں گے اور بلا حساب کے جنت میں چلے جائیں گے اس کے بعد باقی مخلوق اٹھے گی اور ان سے حساب لیا جائے گا (بیہقی) ابن راہویہ اور ابو یعلی نے اپنی مسندوں میں بھی حضرت اسماء کی روایت سے حدیث مذکور اسی طرح بیان کی ہے اس روایت میں اتنا تغیر ہے کہ منادی اول ایسی آواز سے جو سب لوگوں کو سنائی دے گی یہ الفاظ پکار کرے گا اس سے مجمع والوں کو بھی معلوم ہو جائے گا کہ کرم کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے۔

حسن بصری، مجاہد، امام مالک، اوزاعی اور علماء کی ایک جماعت کا قول ہے کہ آیت تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ میں تہجد گزار لوگ مراد ہیں جو تہجد کی نماز کے لئے اٹھتے ہیں۔

امام احمد، ترمذی، ابن ماجہ، ابن ابی شیبہ، ابن راہویہ اور حاکم نے حضرت معاذؓ کی روایت سے بیان کیا ہے۔ حضرت معاذؓ نے فرمایا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھے کوئی ایسا عمل بتا دیجئے جو مجھے جنت میں لے جائے دوزخ سے دور رکھے، فرمایا تو نے بڑی بات دریافت کی اور اللہ جس کو توفیق دے اس کے لئے دشوار بھی نہیں تو اللہ (ہی) کی عبادت کر اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ قرار دے۔ نماز قائم کر، زکوٰۃ ادا کر، رمضان کے روزے رکھ اور کعبہ کا حج کر، پھر فرمایا، کیا میں تجھے خیر کے دروازے نہ بتادوں (سن) روزہ ڈھال ہے گناہوں سے اور دوزخ سے بچانے والا۔ مترجم) خیرات گناہوں کو اس طرح بجھادیتی ہے جیسے پانی آگ کو اور وسط رات میں نماز پڑھنا بھی خیر کا دروازہ ہے) اس کے بعد حضور ﷺ نے آیت تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ ...... يَعْمَلُوْنَ تک تلاوت فرمائی۔ پھر فرمایا کیا میں تجھے امر (دین، مترجم) کا سر اور ستون اور کوہان کی چوٹی نہ بتادوں۔ میں نے عرض کیا کیوں نہیں۔ فرمایا امر (دین) کا سر اسلام ہے اور اس کا ستون نماز ہے اور اس کے کوہان کی چوٹی جہاد ہے۔ اس کے بعد فرمایا، کیا میں تجھے اس سب کی جڑ نہ بتادوں؟ میں نے عرض کیا کیوں نہیں۔ حضور ﷺ نے اپنی زبان پکڑ کر فرمایا، اس کو روکے رکھ۔ میں نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا زبان سے بات کرنے پر بھی ہماری پکڑ ہوگی۔ فرمایا معاذ تجھے تیری ماں روئے منہ کے بل یا ناک کے بل لوگوں کو دوزخ میں ڈالنے والے کی زبانوں کے نتائج (یعنی الفاظ) ہی تو ہوں گے۔

حضرت ابو مالک اشعریؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جنت میں کچھ بالا خانے ایسے ہیں جن کا اندرون باہر سے اور بیرون اندر سے نظر آتا ہے۔ اللہ نے یہ ان لوگوں کے لئے تیار کئے ہیں جو کلام میں نرمی اختیار کرتے ہیں، حاجت مندوں کو کھانا کھلاتے ہیں، پیاپا نفل روزے رکھتے ہیں اور رات میں ایسے وقت نمازیں پڑھتے ہیں جب دوسرے لوگ سوئے ہوتے ہیں۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔ ترمذی نے یہ حدیث اسی طرح حضرت علیؓ کی روایت سے بیان کی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رمضان کے بعد سب سے افضل روزے خدا کے مہینے یعنی محرم کے روزے ہیں اور فرض نماز کے بعد سب سے افضل نماز رات کی نماز ہے۔ رواہ مسلم۔

امام احمد کی روایت میں حدیث کے آخری جملہ میں اتنا تغیر ہے کہ فرض کے بعد سب سے افضل نماز جوف شب کی نماز ہے۔

بغوی نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ دو آدمیوں کو بہت پسند فرماتا ہے ایک تو وہ جو اپنے بستر و لحاف میں سے نکل کر محبوب بیوی بچوں کو چھوڑ کر نماز کو اٹھ کھڑا ہوتا ہے، اللہ ملائکہ سے فرماتا ہے میرے بندے کو دیکھو جو اپنے بستر و لحاف کے اندر سے نکل کر محبوب بیوی اور بچوں کو چھوڑ کر میرے ثواب کا امیدوار ہو کر اور میرے عذاب سے ڈر کر اٹھ کھڑا ہوا ہے دوسرا وہ شخص جو اللہ کی راہ میں لڑتا ہے، پھر شکست پا کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ بھاگ کھڑا ہوتا ہے، پھر فرار کی حالت میں اس کو خیال آتا ہے کہ جہاد سے بھاگنا کتنا بڑا جرم ہے اور لوٹ کر جہاد میں شریک ہونا کتنی بڑی نیکی ہے یہ خیال کرتے ہی وہ لوٹ پڑتا ہے (جہاد میں جا کر شریک ہوتا ہے) آخر اس کا خون بہا دیا جاتا ہے یعنی شہید ہو جاتا ہے اللہ ملائکہ سے فرماتا ہے کہ میرے بندے کو دیکھو کہ کس طرح وہ میرے ثواب کی طلب میں اور میرے عذاب سے ڈر کر (جہاد کی طرف) لوٹ پڑا یہاں تک کہ اس کا خون بہا دیا گیا۔

بغوی نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے حضرت عبداللہؓ ابن رواحہ (خزرجی انصاری صحابی) کے یہ شعر نقل کئے ہیں۔

وفینا رسول اللہ یتلو کتابہ ۔۔۔ اذا انشق معروف من الفجر ساطع
ارانا الھدی بعد العمی فقلوبنا ۔۔۔ بہ موقنات ان ما قال واقع
یبیت یجافی جنبہ عن فراشہ ۔۔۔ اذا استثقلت بالکافرین المضاجع

ہم میں اللہ کے رسول ﷺ ہیں کہ صبح کو پو پھٹنے کے وقت وہ اللہ کی کتاب پڑھتے ہیں ہمارے اندھے پن کے بعد انہوں نے ہمیں راستہ دکھایا۔ ہمارے دلوں کو یقین ہے کہ جو کچھ انہوں نے فرمایا وہ حق ہے وہ رات کو اپنا پہلو بستر سے جدا رکھتے ہیں جب کہ کافروں کے بستر کافروں کے (بار) سے بوجھل پڑے ہوتے ہیں۔

سورۂ مزمل کی تفسیر میں ہم نے نماز تہجد کی فضیلت کو ظاہر کرنے والی حدیثیں ذکر کر دی ہیں۔

ترمذی نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے اور اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے کہ آیت تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ۔ ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو (مغرب کی نماز پڑھ کر) عَتَمہ یعنی عشاء کی نماز کے انتظار میں رہتے تھے۔

بغوی نے حضرت انسؓ کا قول نقل کیا ہے حضرت انسؓ نے فرمایا یہ آیت ہمارے گروہ انصار کی بابت نازل ہوئی ہم مغرب کی نماز پڑھ کر گھروں کو نہیں لوٹتے تھے (اور مسجد میں انتظار کرتے رہتے تھے) یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عشاء کی نماز ادا کرتے تھے (پھر گھروں کو لوٹتے تھے)۔

یہ بھی حضرت انسؓ ہی کی روایت ہے کہ اس آیت کا نزول کچھ صحابہ کے متعلق ہوا تھا جو مغرب کی نماز پڑھ کر عشاء کی نماز تک مسجد میں رہتے تھے، یہ روایت ابن مردویہ نے نقل کی ہے اس کی اصل سنن ابوداؤد میں موجود ہے۔ ابن ابی حاتم اور محمد بن منکدر کا بھی یہی قول ہے ان دونوں بزرگوں کا قول ہے کہ (آیت میں جس نماز کا ذکر ہے) وہ صلوٰۃ الاوابین ہے۔

بزار نے کمزور سند سے بیان کیا ہے کہ حضرت بلالؓ نے فرمایا ہم مجلس میں بیٹھے ہوتے تھے اور کچھ صحابی مغرب سے عشاء تک نماز پڑھتے رہتے تھے اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابو درداءؓ، ابو ذرؓ اور حضرت عبادہ بن صامت عشاء اور فجر کی نماز رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جماعت سے پڑھتے تھے۔ مسلم اور امام احمد نے حضرت عثمانؓ کے حوالے سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے عشاء کی نماز جماعت سے پڑھی اس نے آدھی رات نماز پڑھی اور جس نے فجر کی نماز جماعت سے پڑھی اس نے گویا پوری رات نماز میں گزاری۔

حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اگر لوگ اذان دینے اور پہلی صف میں شریک ہونے کا ثواب جانتے اور پھر بغیر قرعہ اندازی اذان دینا اور پہلی صف میں شریک ہونا ان کو میسر نہ آتا تو وہ ضرور قرعہ اندازی کرتے۔ اور اگر ظہر کی (باجماعت) نماز کا ثواب ان کو معلوم ہو جائے تو دوڑتے ہوئے پہلے پہنچنے کی کوشش کریں اور اگر باجماعت عشاء اور فجر کی نمازوں کے ثواب سے وہ واقف ہو جائیں تو سرینوں کے بل گھسیٹ کر بھی پہنچیں۔ (رواہ الشیخان فی الصحیحین واحمد والنسائی)۔

وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۱۶﴾　اور ہماری دی ہوئی روزی میں سے کچھ راہ خدا میں صرف کرتے ہیں۔

بعض اہل علم نے کہا اس سے مراد فرض زکوٰۃ ہے۔ بعض کے نزدیک ہر صرف خیر مراد ہے۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ　کوئی نہیں جانتا کہ کیا کیا آنکھوں کی ٹھنڈک ان کے لئے پوشیدہ رکھی گئی ہے۔

نَفْسٌ یعنی نہ کوئی نبی مرسل نہ مقرب فرشتہ۔ حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ فرماتا ہے کہ میں نے اپنے صالح بندوں کے لئے ایسی نعمتیں تیار کر رکھی ہیں جو نہ کسی آنکھ نے دیکھیں نہ کسی کان نے ان کا ذکر سنا نہ کسی انسان کے دل میں ان کا تصور آیا، اگر تم چاہتے ہو تو پڑھو، فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ الخ۔ (متفق علیہ) حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا یہ وہ نعمت ہے جس کی کوئی تشریح نہیں بیان کی گئی۔

جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۷﴾　ان اعمال کے بدلے میں جو انہوں نے کئے تھے۔

واحدی اور ابن عساکر نے سعید بن جبیرؓ کی وساطت سے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ حضرت علیؓ اور ولید بن عقبہ بن ابی معیط کے درمیان کسی بات پر کچھ جھگڑا اور کلام کا رد و بدل ہوا ولید نے حضرت علیؓ سے کہا تو بچہ ہے اور خدا کی قسم میں تجھ سے زیادہ تیز زبان اور تیز نیزہ اور لشکری پہلوان ہوں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا چپ رہ تو اللہ کا نافرمان ہے اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ؕ　سو کیا جو مومن ہے وہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو کافر ہے۔

ابن جریر نے عطاء بن یسار کی روایت سے بھی واحدی اور ابن عساکر کی روایت کی طرح تخریج کی ہے۔ خطیب نے تاریخ میں نیز ابن عدی نے بوساطت کلبی از ابو صالح حضرت ابن عباس کا بیان اسی طرح نقل کیا ہے۔ خطیب اور ابن عساکر نے بوساطت ابن لہیعہ بحوالہ عمرو بن دینار حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول حضرت علی اور عقبہ بن ابی معیط کے حق میں ہوا اور دونوں میں کچھ گالم گلوچ ہو گئی تھی۔

فَاسِقًا سے مراد ہے خارج از ایمان یعنی کافر۔

لَا يَسْتَوُونَ ۝ یہ سب (شوق اور ثواب میں) برابر نہیں ہیں، عدم استواء کی تفصیل آئندہ آیات میں مذکور ہے۔

أَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ جَنَّاتُ الْمَأْوَىٰ نُزُلًا بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے سو ان کے لئے ہمیشہ کا ٹھکانہ جنتیں ہیں جو ان کے اعمال کے بدلہ میں بطور ان کی مہمانی کے ہیں۔

وَأَمَّا الَّذِينَ فَسَقُوا فَمَأْوَاهُمُ النَّارُ ۖ كُلَّمَا أَرَادُوا أَن يَخْرُجُوا مِنْهَا أُعِيدُوا فِيهَا وَقِيلَ لَهُمْ ذُوقُوا عَذَابَ النَّارِ الَّذِي كُنتُم بِهِ تُكَذِّبُونَ ۝ اور جنہوں نے کفر کیا ان کا ٹھکانہ دوزخ ہو گا جب اس سے نکلنا چاہیں گے تو دوبارہ اسی میں لوٹا دیے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ جس عذاب آتش کی تم تکذیب کرتے تھے (آج) اس کا مزہ چکھو۔

اصل قیام گاہ جنت ہے دنیا تو رہ گزر ہے مومنوں کا ٹھکانہ جنت میں ہی ہو گا اور کافروں نے چونکہ شرک اختیار کیا ہے اس لئے گویا جنت میں داخل ہونے سے منکر ہو گئے۔ اور دوزخ کو جنت کے بدلہ میں لے لیا۔

أُعِيدُوا فِيهَا سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔

وَقِيلَ لَهُمُ الخ یعنی کافروں کو ذلیل کرنے اور شدت غضب میں مبتلا کرنے کے لئے ان سے یہ بات کہی جائے گی۔

وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝ اور بڑے عذاب (یعنی عذاب آخرت) سے پہلے ہم ان کو کچھ عذاب دنیا چکھائیں گے تاکہ وہ (ایمان کی طرف) لوٹ آئیں۔

حضرت ابی بن کعب، ضحاک، حسن اور ابراہیم نے کہا عذاب دنیا سے مراد ہیں دنیاوی مصائب اور بیماریاں۔ والبی کی روایت میں حضرت ابن عباس کا بھی یہی قول آیا ہے۔ عکرمہ نے کہا حدود مراد ہیں۔ مقاتل نے کہا اس سے مراد وہ ہفت سالہ قحط ہے جس میں اہل مکہ مبتلا کئے گئے تھے یہاں تک کہ مردار اور ہڈیاں اور کتوں تک کو کھا گئے۔ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا بدر کے دن کافروں کا مارا جانا مراد ہے۔ قتادہ اور سدی کا بھی یہی قول مروی ہے۔

ایمان کی طرف لوٹ آنے کا یہ مطلب ہے کہ جو لوگ قحط اور بدر میں مارے جانے سے بچ رہے وہ شاید ایمان لے آئیں۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ ثُمَّ أَعْرَضَ عَنْهَا ۚ إِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِينَ مُنتَقِمُونَ ۝ اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہے جس کو اس کے رب کی آیات کے ذریعہ سے نصیحت کی گئی، پھر اس نے آیات کی طرف سے رخ موڑ لیا ہم مجرموں سے ضرور انتقام لیں گے۔

رخ موڑ لیا۔ یعنی آیات رب پر غور نہیں کیا۔ ثُمَّ (تراخی زمانہ کے لئے نہیں ہے بلکہ) اس بات پر تعجب کرنے کے لئے ہے کہ آیات کھلی ہوئی ہیں اور دنیاو آخرت کی کامیابی کا راستہ بتا رہی ہیں۔ پھر بھی یہ ظالم ان کی طرف سے کتراتا اور ان پر غور نہیں کرتا۔

مِنَ الْمُجْرِمِينَ یعنی ہم تو ہر مجرم سے انتقام لینے والے ہیں پھر یہ شخص تو سب سے بڑا مجرم ہے اس کو بغیر انتقام کے کیسے چھوڑ دیں گے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ اور بلاشبہ ہم نے موسیٰ کو کتاب دی۔ یعنی جس طرح آپ کو قرآن عطا کیا اسی طرح موسیٰ کو توریت عطا کی تھی۔

فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ سو آپ اس کے ملنے میں کچھ شک نہ کیجئے۔

یعنی قرآن کا نزول کوئی نئی بات نہیں اس سے پہلے کتاب نازل کی جاچکی ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ موسیٰ نے توریت اپنی رضامندی سے قبول کی تھی آپ کو اس بات میں شک نہ کرنا چاہیے۔ سدی نے یہی مطلب بیان کیا ہے طبرانی نے اس آیت کی تشریح میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے رسول اللہ ﷺ کا فرمان گرامی نقل کیا ہے تم شک نہ کرو کہ موسیٰ اپنے رب سے ملے تھے (یعنی طور پر حضرت موسیٰ اپنے رب سے بلاشبہ ملے تھے۔ مترجم) بعض نے کہا اس بات میں کوئی شک نہ کریے کہ آپ شب معراج میں موسیٰ سے ملے تھے۔ اس تشریح کی نسبت بعض روایات میں حضرت ابن عباس کی طرف کی گئی ہے۔ شیخین نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شب معراج میں میں نے موسیٰ کو دیکھا گندمی رنگ، دراز قامت، گھونگریالے بال ایسا معلوم ہوتا تھا کہ (قبیلہ ازد) شنواہ کے ایک مرد ہیں۔ میں نے عیسیٰ کو بھی متوسط القامت، سرخی سفیدی مائل رنگ اور سیدھے بالوں والا پایا۔ میں نے منجملہ دوسری آیات قدرت کے جو اللہ نے مجھے دکھائیں، دوزخ کے داروغہ مالک کو اور دجال کو بھی دیکھا۔ فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ یہ آیت حضور ﷺ نے بیان مذکور کے بعد تلاوت فرمائی۔

حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمرکاب ایک سفر میں چلے ایک وادی کی طرف سے ہمارا گزر ہوا، حضور ﷺ نے فرمایا یہ کونسی وادی ہے؟ صحابہ نے عرض کیا وادی ارزق ہے، فرمایا وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے آگیا کہ میں (شب معراج میں) اس وادی سے گزر رہا تھا تو موسیٰ میری نظر کے سامنے دونوں کانوں میں انگلیاں دیئے لبیک کہہ رہے تھے اور اللہ کو پکار رہے تھے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا، پھر ہم آگے چلتے چلتے ایک گھاٹی پر پہنچے حضور ﷺ نے فرمایا یہ کونسی گھاٹی ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا ہرشا۔ فرمایا وہ سین میری نظروں کے سامنے ہے کہ یونس سرخ اونٹنی پر سوار جبہ پہنے اونٹنی کی مہار پکڑے اس وادی میں لبیک کہتے ہوئے گزر رہے تھے۔ رواہ مسلم

سورۂ بنی اسرائیل میں حدیث معراج کے بیان میں ذکر کر دیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت موسیٰ کو چھٹے آسمان میں دیکھا اور نماز کی (تخفیف کی) بابت گفتگو کی تھی۔ حضرت انس راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب مجھے رات کو آسمان کی طرف لے جایا گیا تو (اثناء راہ میں) میں نے موسیٰ کو قبر میں نماز پڑھتے دیکھا۔

وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اور ہم نے اس کو بنی اسرائیل کے لئے راہ نما بنایا۔

یعنی جو کتاب موسیٰ پر نازل کی اس کتاب کو بنی اسرائیل کے لئے رہنمائی کا ذریعہ قرار دیا۔ قتادہ نے کہا مفعول کی ضمیر موسیٰ کی طرف راجع ہے یعنی ہم نے موسیٰ کو بنی اسرائیل کا ہادی بنایا، طبرانی نے حضرت ابن عباس کی طرف بھی اس قول کی نسبت کی ہے۔ بروایت طبرانی، حضرت ابن عباس نے فرمایا، ہم نے موسیٰ کو بنی اسرائیل کے لئے راہنما بنا دیا۔

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً اور ہم نے ان (بنی اسرائیل) میں سے کچھ لیڈر بنائے (یعنی انبیاء اور بقول قتادہ انبیاء کے پیرو) جن کی ہر بھلائی میں اقتدا کی جاتی تھی۔

يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وہ ہمارے حکم سے لوگوں کی رہنمائی کرتے یا ہماری دی ہوئی توفیق سے لوگوں کو ہدایت کرتے تھے۔

لَمَّا صَبَرُوْا جب کہ انہوں نے اپنے دین پر اور مصر کی سکونت کی حالت میں دشمن کی طرف سے پہنچنے والی مصیبتوں پر صبر کیا تھا۔ اس لفظ سے ثابت ہو رہا ہے کہ صبر موجب امامت ہے (شدائد و مصائب پر صبر کرنے والے لوگوں کے پیشوا بن جاتے ہیں)۔

وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ اور وہ ہماری آیات پر یقین رکھتے تھے۔ کیونکہ انہوں نے آیات الٰہیہ کا مطالعہ

گہری نظر سے کیا تھا۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ کوئی شبہ نہیں کہ آپ کا رب قیامت کے دن ان کے درمیان عملی فیصلہ کردے گا۔ یعنی اہل حق کو اہل باطل سے جدا کردے گا۔

فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۞ جن (دینی) امور میں وہ باہم اختلاف کرتے تھے (ان کا عملی فیصلہ قیامت کے دن اللہ کردے گا)۔

اَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ کیا اس بات سے ان کو ہدایت نہیں ہوئی کہ ان سے پہلے گزری ہوئی کتنی ہی امتوں کو ہم نے (ان کے کفر و عصیان کی وجہ سے) تباہ کردیا۔

يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ جن کے مکانوں میں یہ لوگ (یعنی مکہ والے اپنے سفر کے دوران) چلتے ہیں۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ اَفَلَا يَسْمَعُوْنَ ۞ بے شک اس میں (یعنی گزشتہ اقوام کی تباہی میں) بہت نشانیاں ہیں (جن سے ان قوموں کے کفر و معاصی کی ہلاکت آفرینی اور اللہ کی قدرت کی ہمہ گیری اور انتقامی طاقت ثابت ہوتی ہے) کیا یہ لوگ (نصیحت پذیر کانوں سے) نہیں سنتے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَى الْاَرْضِ الْجُرُزِ کیا انہوں نے نہیں دیکھا (یعنی کیا ان کو معلوم نہیں) ہم سوکھی زمین کی طرف پانی کو چلاتے ہیں۔

اَلْجُرُز وہ زمین جس کی سرسبزی کٹ گئی ہو، جاتی رہی ہو (لغت عربی میں جُرُز کا معنی ہے کاٹنا، اس جگہ مراد ہے سرسبزی کا کٹ جانا یعنی خشک ہو جانا۔ مترجم)

فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا تَاْكُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ وَاَنْفُسُهُمْ پھر پانی سے ہم کھیتی پیدا کرتے ہیں، جس (کے بھوسے اور پتوں وغیرہ) کو ان کے چوپائے کھاتے ہیں اور (غلہ پھل وغیرہ کو) یہ خود کھاتے ہیں۔

اَفَلَا يُبْصِرُوْنَ ۞ کیا ان کو (یہ سامنے کی بات بھی) نہیں سوجھتی مردہ (زمین کو زندہ کرنا پھر اس سے جانوروں اور آدمیوں کا رزق پیدا کرنا دلالت کر رہا ہے کہ اللہ کی قدرت ہمہ گیر ہے اس کا فضل وسیع ہے اور قیامت کے دن مردوں کو زندہ کرنے پر وہ قادر ہے۔

ابن جریر نے قتادہ کی روایت نقل کی ہے جس کو بغوی نے بھی ذکر کیا ہے کہ صحابہ نے مشرکوں سے کہا تھا عنقریب ہم سکھ پائیں گے، مزے اڑائیں گے اللہ ہمارے تمہارے درمیان (عملی) فیصلہ کردے گا۔ کلبی نے کہا صحابہ کی عنقریب فیصلہ میں کتا ہوں صحابہ کی مراد یہ تھی کہ اللہ قیامت کے دن بندوں کا فیصلہ کردے گا۔ کردینے سے مراد تھی مکہ کی فتح۔ سدی نے کہا بدر کی لڑائی مراد تھی، صحابہ کہا کرتے تھے کہ اللہ ہمارا مددگار ہے وہ ہم کو تم پر غلبہ عنایت فرمائے گا، کافر بطور مذاق کہتے تھے ایسا کب ہوگا اس کے متعلق آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۞ اور وہ (کفار مکہ) کہتے ہیں (یعنی بطور استہزاء کہتے ہیں) کہ تمہاری یہ فتح کب ہوگی اگر سچے ہو (تو اس کا وقت کھول کر بتاؤ)۔

قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِيْمَانُهُمْ اے محمد ﷺ! آپ کہہ دیجئے کہ جنہوں نے (ساری زندگی) کفر کیا ان کو فتح کے دن ایمان لے آنا مفید نہ ہوگا۔

اس آیت سے بظاہر یہی سمجھا جاتا ہے کہ یَوْمَ الْفَتْحِ سے مراد ہے قیامت کا دن کیونکہ قیامت ہی کے دن کافروں کا ایمان لانا مفید نہیں ہوگا۔ جو علماء کہتے ہیں کہ یوم الفتح سے مراد فتح مکہ کا یا جنگ بدر کا دن ہے، انہوں نے آیت کا یہ مطلب بیان کیا کہ جو لوگ کفر کی حالت میں مر گئے یا مارے گئے تو مرنے کے بعد جب ان کے سامنے عذاب آئے گا اس وقت ایمان لانے اور مان لینے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۲۹﴾ اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی۔

سوال تھا یوم الفتح کی تعیین کا اور جواب دیا گیا یوم الفتح میں ایمان کے غیر مفید ہونے کا۔ بظاہر سوال جواب میں کوئی مطابقت نہیں ہے اس کی توجیہ اس طرح کی جائے گی کہ کافروں کا سوال در حقیقت طلب علم کے لئے نہیں تھا بلکہ بطور استہزاء تھا وہ تو یوم الفتح کو مانتے ہی نہیں تھے اس لئے جواب کا رنگ بھی وہی اختیار کیا گیا جو غرض سوال کے مطابق تھا گویا جواب کا حاصل یہ ہوگا کہ عذاب کے لئے جلدی نہ مچاؤ جلد آنے کی طلب نہ کرو میں دیکھ رہا ہوں کہ یوم الفتح آگیا اور اس کو دیکھ کر تم ایمان لے آئے اور اس وقت ایمان لانا تمہارے لئے سود مند نہ ہوا پھر تم نے مہلت طلب کی تو مہلت بھی تم کو نہیں ملی۔

فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ (جب ان کا حال اور مآل آپ کو معلوم ہو گیا) تو اب ان کی پروا نہ کیجئے، (اور ان کی تکذیب کا کوئی خیال نہ رکھئے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا یہ جملہ منسوخ ہے آیت قتال سے اس کا حکم منسوخ کر دیا۔

وَانْتَظِرْ اِنَّهُمْ مُّنْتَظِرُوْنَ ﴿۳۰﴾ اور (جس فتح کا ہم نے وعدہ کیا ہے اس کا) انتظار کیجئے وہ بھی (اس بات ع ۱۶
کے) منتظر ہیں (کہ آپ حوادث زمانہ اور مصائب میں مبتلا ہو جائیں) بعض اہل علم نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ ہمارے عذاب کا آپ انتظار کیجئے وہ بھی عذاب ہی کے منتظر ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ فجر کی نماز میں رسول اللہ ﷺ الٓمّٓ تَنْزِيْلُ اور هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ پڑھتے تھے۔

حضرت جابر راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سوتے نہ تھے جب تک الٓمّٓ تَنْزِيْلُ اور تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ نہ پڑھ لیتے تھے۔ رواہ احمد والترمذی والدارمی ترمذی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

حضرت خالد بن معدان کا بیان ہے کہ الٓمّٓ تَنْزِيْلُ کے متعلق مجھے یہ خبر پہنچی ہے اور یہی اطلاع تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ کے متعلق بھی ملی ہے کہ ایک شخص یہی دونوں سورتیں پڑھتا تھا اور کچھ نہیں پڑھتا تھا اور تھا بڑا گناہ گار مرنے کے بعد انہی سورتوں نے اس کو اپنے سایہ میں لے لیا اس پر اپنے پر پھیلا دیئے اور دعا کی اے رب اس کو بخش دے یہ مجھے بہت پڑھا کرتا تھا اللہ نے ان سورتوں کی شفاعت قبول فرمائی (اور اس کو بخش دیا) اور فرمایا ہر بدی کے عوض اس شخص کے لئے نیکی لکھ دو اور اس کے درجہ کو اونچا کر دو۔

یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ یہ سورت قبر کے اندر اپنے پڑھنے والے کی طرف سے وکالت کرے گی اور عرض کرے گی اے رب اگر میں تیری کتاب کی سورت ہوں تو اس شخص کے متعلق میری شفاعت قبول فرما اور اگر میں تیری کتاب کا حصہ نہیں ہوں تو مجھے کتاب کے اندر سے مٹا دے۔ یہ سورۃ اپنے پڑھنے والے پر اپنے پر پھیلا دے گی اس کو اپنے سایہ میں لے لے گی اس کے لئے شفاعت کرے گی اور عذاب قبر سے اس کو بچائے گی۔

یہ بھی روایت ہے کہ قرآن کی ہر سورت پر ان دونوں سورتوں کی فضیلت ساٹھ نیکیوں کے برابر ہے۔ رواہ الدارمی۔

حضرت ابن عباس راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے الٓمّٓ تَنْزِيْلُ اور تَبٰرَكَ الَّذِيْ پڑھی اس کو اتنا ثواب ملا کہ گویا شب قدر میں اس نے رات بھر عبادت کی۔ رواہ الثعلبی وابن مردویہ۔ ابن مردویہ نے حضرت ابن عمر کی روایت سے بھی یہ حدیث اسی طرح بیان کی ہے۔ سیوطی نے کہا یہ حدیث موضوع ہے۔

الحمد للہ بروز دوشنبہ ۲۳ رجب ۱۲۰۶ھ کو الم تنزیل کی سورت ختم ہوئی اس سے آگے سورۃ احزاب کی تفسیر آئے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

سورۃ الاحزاب

یہ سورۃ مدنی ہے اس میں ۷۳ آیات ہیں۔

حضرت ابی بن کعب نے حضرت زر سے فرمایا سورۂ احزاب کی گنتی آپ کے نزدیک کتنی ہے؟ حضرت زر نے جواب دیا تہتر۔ حضرت ابی نے فرمایا، قسم ہے اس خدا کی جس کی قسم ابی کھایا کرتا ہے کہ یہ سورۃ سورۂ بقرہ کے برابر یا اس سے بڑی تھی ہم نے اس سورۃ میں یہ آیت بھی پڑھی تھی اَلشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ إِذَا زَنَيَا فَارْجُمُوْهُمَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جویبر نے بوساطت ضحاک حضرت ابن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ اہل مکہ نے جن میں ولید بن مغیرہ اور شیبہ بن ربیعہ بھی شامل تھے رسول اللہ سے گزارش کی تھی کہ آپ اپنے قول سے باز آجائیں۔ ہم آپ کو اپنے مال میں سے ایک حصہ دے دیں گے مدینہ میں منافقوں نے اور یہودیوں نے آپ کو دھمکی دی تھی کہ اگر آپ باز نہ آئے تو ہم آپ کو قتل کردیں گے اس پر آیات ذیل کا نزول ہوا۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ اے نبی اللہ سے ڈرتے رہو۔ نبی کے لفظ سے خطاب کر کے تقویٰ کا حکم دیا، محمد نہیں فرمایا اس سے تقویٰ کی اہمیت اور عظمت بتانا مقصود ہے کہ نبی ﷺ کو بھی اللہ سے ڈرنا اور تقویٰ رکھنا ضروری ہے۔

بغوی نے لکھا ہے ان آیات کا نزول ابو سفیان بن حرب، عکرمہ بن ابو جہل اور ابو الاعور، عمرو بن سفیان سلمی کے حق میں ہوا۔ جنگ احد کے بعد یہ تینوں شخص مدینہ میں آکر سر گروہ منافقین عبداللہ بن ابی کے پاس ٹھیرے (اور رسول اللہ ﷺ سے گفتگو کرنے کی درخواست کی) حضور ﷺ نے ان کو اجازت دے دی، چنانچہ عبداللہ بن ابی عبداللہ بن سعد اور طعمہ بن ابیرق خدمت گرامی میں حاضر ہوئے اور رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی آپ لات، عزیٰ اور مناۃ کا تذکرہ چھوڑ دیجئے ہمارے ان معبودوں کا ذکر برائی کے ساتھ نہ کیجئے اور یہ کہہ دیجئے کہ جو شخص ان کو پوجے گا یہ معبود اس کی شفاعت کریں گے اگر آپ ایسا کرلیں گے تو ہم آپ کے اور آپ کے رب کا ذکر برائی کے ساتھ نہیں کریں گے اور آپ کے کام میں مداخلت نہیں کریں گے۔ اس وقت حضرت عمرؓ بن خطابؓ رسول اللہ ﷺ کے پاس موجود تھے۔ حضور ﷺ کو کافروں کی یہ بات بہت شاق گزری۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا یا رسول اللہ ﷺ! مجھے اجازت دیجئے میں ان کو قتل کردوں، فرمایا، میں ان کو امن دے چکا ہوں۔ پھر فرمایا نکل جاؤ تم پر اللہ کی لعنت اور غضب۔ چنانچہ حضور ﷺ نے ان کو مدینہ سے نکال دینے کا حکم دے دیا اس پر اللہ کی طرف سے یہ آیت نازل ہوئی۔

بعض اہل علم نے لکھا ہے خطاب کا رخ اگرچہ رسول اللہ ﷺ کی طرف ہے لیکن تقویٰ کا حکم امت کو دینا مقصود ہے۔ ضحاک نے کہا، آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے نبی ﷺ آپ اللہ سے ڈریں اور ان لوگوں سے آپ نے جو عہد کیا ہے اس کو نہ توڑیں۔ بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ امر بالتقویٰ سے مراد ہے تقویٰ پر قائم رہنے کا حکم تاکہ دوسرے ممنوعات سے باز داشت

ہو جائے۔

وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ اور ان کافروں کا کہنا مانیں یعنی عکرمہ، ابو سفیان اور ابو الاعور کا کہنا مانیں۔

وَالْمُنٰفِقِيْنَ اور (مدینہ کے) منافقوں کا بھی کہنا مانیں، یعنی عبداللہ بن ابی، عبداللہ بن سعد اور طعمہ بن ابیرق کی بات نہ مانیں۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا بے شک اللہ علیم و حکیم ہے یعنی اپنی مخلوق کو جانتا ہے، مخلوق کے مصالح و مفاسد سے واقف ہے اور اپنی حکمت کے مطابق حکم دیتا ہے۔

وَّاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ اور آپ کے رب کی طرف سے جو وحی آپ کے پاس آتی ہے اس کی پیروی کیجئے۔ یعنی توحید و اخلاص پر قائم رہیں۔ یہ جملہ حکم تقویٰ کی تائید اور کفار کی بات ماننے کی ممانعت کی تاکید ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا اور کوئی شک نہیں کہ اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔

یہ خطاب رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ کو ہے کیونکہ تقویٰ کے حکم کا روئے سخن رسول اللہ ﷺ اور امت سب کی طرف تھا اگرچہ صیغہ مفرد کا استعمال کیا گیا تھا۔ اس تشریح پر یہ جملہ امتثال حکم کی تاکید کا حامل ہوگا تاکہ سزا کا خوف اور جزا کی رغبت پیدا ہو اور دونوں جذبات کے زیر اثر امتثال امر کیا جائے۔

وَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اور اللہ پر پورا بھروسہ رکھئے۔

وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا اور (تمام امور کا) اللہ پورا ذمہ دار ہے اور اس کی ذمہ داری کافی ہے۔ یہ حکم توکل کا تتمہ ہے۔ زجاج نے کہا یہ جملہ خبریہ ہے لیکن امر کے معنی میں ہے یعنی بمعنی انشاء ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کی ذمہ داری کافی ہے آپ اس پر پورا کامل اعتماد رکھیں یعنی اللہ کی قدرت کامل ہے اس کا علم کامل ہے اور اس کی رحمت کاملہ ہے تمام امور اسی کے سپرد ہیں کسی دوسرے کو سپرد کرنے کی ضرورت نہیں اگر یہ (تمام باتیں جانتے ہوئے بھی) کوئی اپنے امور کو کسی غیر کے سپرد کرتا ہے وہ احمق ہے سبک سر ہے۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ اللہ نے کسی کے سینہ میں دو دل نہیں بنائے۔

دل روح حیوانی اور تمام قوتوں کا سرچشمہ ہے اسی وجہ سے ایک آدمی کے دو دل نہیں ہو سکتے اگر بالفرض دو دل ہوں تو دو یا ایک دل سے ساری قلبی افعال سرانجام دے گا اس صورت میں دوسرا دل بے کار ہو گیا دونوں دلوں سے ایک ہی کام کرے گا تب بھی دو ہونے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی یا ایک دل سے ایک کام اور دوسرے دل سے پہلے کام کے خلاف کام لے گا اس سے افعال قلبی میں کھلا ہوا تناقض پیدا ہو جائے گا۔

بغوی اور ابن ابی حاتم نے سدی اور ابن نجیح کی روایت سے مجاہد کا قول بیان کیا ہے کہ ایک شخص تھا ابو معمر جمیل بن معمر فہری اس شخص کی سمجھ بھی تیز تھی اور حافظہ بھی اتنا قوی کہ جو کچھ سنتا تھا یاد کر لیتا تھا، قریش کہتے تھے ابو معمر کا جو حافظہ اتنا قوی ہے اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ اس کے دو دل ہیں۔ وہ خود بھی کہتا تھا کہ میرے دو دل ہیں محمد ﷺ جو کچھ سمجھتے ہیں اس سے زیادہ سمجھ تو میرے ہر ایک دل میں ہے میں ایک دل سے بھی ان سے زیادہ جانتا اور بہتر سمجھتا ہوں، اسی کے متعلق اس آیت کا نزول ہوا۔

بدر کے دن جب قریش کو شکست ہو گئی تو ابو معمر بھی بھاگ کھڑا ہوا ایک پاؤں میں جوتی تھی اور دوسری جوتی ہاتھ میں تھی۔ اسی حالت میں ابو سفیان کا سامنا ہو گیا ابو سفیان نے پوچھا ابو معمر لوگوں کا کیا حال ہے؟ ابو معمر نے کہا شکست کھا گئے۔ ابو سفیان نے کہا تیرا یہ کیا حال ہے کہ ایک جوتی پاؤں میں اور ایک ہاتھ میں ہے۔ ابو معمر نے کہا مارے میں تو دونوں جوتیاں پاؤں میں سمجھا تھا، اس وقت لوگوں کو معلوم ہوا کہ اس کے دو دل نہیں ہیں اگر دو دل ہوتے تو ہاتھ میں پکڑی ہوئی جوتی کو نہ بھولتا۔

ابن ابی حاتم نے بسند ضعیف سعید بن جبیر اور مجاہد اور عکرمہ کا بیان نقل کیا ہے کہ ایک شخص تھا جس کو دو دل والا کہا جاتا تھا اسی کے بارے میں اس آیت کا نزول ہوا۔ ابن جریر نے بوساطت عوفی حضرت ابن عباس اور بوساطت قتادہ حسن بصری کا بھی یہی بیان نقل کیا ہے۔ اس بیان میں اتنا زائد ہے کہ وہ شخص کہتا تھا کہ میرا ایک دل مجھے (کسی کام کو) کرنے کا حکم دیتا ہے اور دوسرا دل منع کرتا ہے۔

ترمذی نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا ہے اور اس کو حسن کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک بار کھڑے ہوئے اس وقت آپ کے دل میں کسی بات کا خطرہ پیدا ہوا، منافق جو آپ کے پاس اس وقت موجود تھے کہنے لگے دیکھو اس شخص کے دو دل ہیں ایک تمہارے ساتھ ہے اور دوسرا اپنے رفیقوں کے ساتھ۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

زہری اور مقاتل نے کہا آیت میں کوئی دو دل والا آدمی مراد نہیں ہے نہ ظاہری ترجمہ مراد ہے بلکہ بطور مثال اللہ نے اس شخص کی حالت بیان کی ہے جو اپنی بیوی سے ظہار کرتا ہے اور اس شخص کی کیفیت بیان کی ہے جو دوسرے کی اولاد کو اپنا بیٹا بنا لیتا ہے (ایک دل سے وہ بیوی اور دوسرے دل سے اسی کو ماں کہہ دیتا ہے اسی طرح کبھی کسی لڑکے کو اپنا بیٹا کہتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ وہ اس کا بیٹا نہیں کسی اور کا بیٹا ہے) گویا کنایہ مقصود ہے کہ جس طرح ایک آدمی کے دو دل نہیں ہو سکتے اسی طرح ظہار کرنے والے کی بیوی اس کی ماں نہیں ہو جاتی اور منہ بولا بیٹا حقیقی بیٹا نہیں بن جاتا۔ اور نہ اللہ نے

وَمَا جَعَلَ أَزْوَاجَكُمُ اللَّائِي تُظَاهِرُونَ مِنْهُنَّ أُمَّهَاتِكُمْ

تمہاری ان بیویوں کو جن سے تم ظہار کرتے ہو تمہاری مائیں کر دیا ہے۔ دور جاہلیت میں ظہار کو طلاق سمجھا جاتا تھا۔ اسلامی شریعت میں طلاق نہیں قرار دیا گیا بلکہ) ظہار کرنے والا جب تک کفارہ ادا نہ کرے اس وقت تک بیوی سے قربت صنفی کی ممانعت کر دی۔ ظہار کی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی بی بی کو کہہ دے تو میرے لئے ایسی ہے جیسے میری ماں کی پشت۔ ظہار کے مسائل ہم نے سورۂ مجادلہ میں بیان کر دیئے ہیں۔

بیضاوی نے لکھا ہے ظہار میں لفظ ظہر پشت سے بطور کنایہ پیٹ (شکم) مراد ہوتا تھا۔ پشت ہی شکم کا سہارا ہے اس لئے پشت بول کر بطن مراد لیا جاتا تھا یا لفظ ظہار سے شدت حرمت کا اظہار مقصود ہوتا تھا کیونکہ دور جاہلیت میں پشت اوپر کر کے (یعنی پٹ کر کے) عورت سے جماع کو حرام سمجھا جاتا تھا۔ اور نہ اللہ نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارے حقیقی بیٹے

وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَاءَكُمْ أَبْنَاءَكُمْ

قرار دیا ہے۔

اَدْعِیَاء، خلاف قیاس دَعِی کی جمع ہے اگر فعیل بمعنی مفعول ہو تو اس کی جمع فَعْلیٰ کے وزن پر آتی ہے جیسے جریح کی جمع جرحیٰ اس لئے دَعِی کی جمع قیاساً دَعویٰ آنی چاہئے تھی لیکن جو فعیل بمعنی فاعل ہو اس کی قیاسی جمع اَفعلاء کے وزن پر آتی ہے جیسے تقی کی جمع اتقیاء اور سخی کی جمع اسخیاء۔ دعی اگرچہ فعیل بمعنی مفعول ہے لیکن ایک گونہ اس فعیل سے مشابہت ہے جو بمعنی فاعل ہوتا ہے اس لئے اس کی جمع اَدعیاء آئی ہے۔ کسی کو بیٹا بنانے سے حقیقی بیٹے کے احکام اس پر جاری نہیں ہو جاتے نہ وہ میراث کا مستحق قرار پاتا ہے نہ اس سے نکاح حرام ہو جاتا ہے۔ آیت مذکورہ میں عرب کے ان جاہلی اقوال کی تردید کر دی گئی ہے کہ دانشمند قوی حافظہ والے کے دو دل ہوتے ہیں۔ اور ظہار کرنے سے طلاق بائنہ پڑ جاتی ہے۔ اور عورت شوہر کے لئے ہمیشہ کے واسطے ماں کی طرح حرام ہو جاتی ہے اور بنایا ہوا بیٹا حقیقی بیٹے کی طرح ہو جاتا ہے، میراث کا بھی مستحق بن جاتا ہے اور اس سے نکاح بھی حرام ہو جاتا ہے اور بناوٹی بیٹے کے وہ تمام رشتہ دار حرام ہو جاتے ہیں جو حقیقی بیٹے کے ہوتے ہیں اور حرام ہوتے ہیں (جیسے حقیقی بیٹے کی بیوی، بہن وغیرہ) نبوت سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے حضرت زید بن حارثہ بن شرحبیل کلبی کو آزاد کر کے بیٹا بنا لیا تھا اور حضرت حمزہ بن عبد المطلب سے ان کا

رشتۂ اخوت قائم کر دیا تھا۔ حضرت زید نے اپنی بیوی حضرت زینب بنت جحش کو طلاق دے دی اور رسول اللہ ﷺ نے ان سے نکاح کر لیا، منافق کہنے لگے کہ محمد ﷺ نے خود تو اپنے بیٹے کی بیوی سے نکاح کر لیا اور دوسروں کو منع کرتے تھے اس پر آیت ذیل اللہ نے نازل فرمائی اور فرمایا۔

ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ۖ یہ تمہاری زبانی باتیں ہیں۔ یعنی اس کی کوئی واقعی حقیقت نہیں (الفاظ سے حقیقت نہیں بدلتی)۔

وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ اور اللہ حق بات کہتا ہے جو واقعی اور سچی ہوتی ہے۔

وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ ④ اور وہی راہ حق دکھاتا ہے۔ حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ ابو حذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ کی بیوی سہلہ بنت سہل بن عمرو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ابو حذیفہ کا آزاد کردہ غلام جس کو ابو حذیفہ نے بیٹا بنا لیا ہے ہمارے گھر میں آتا ہے اور میں اس وقت ایک کپڑا پہنے ہوتی ہوں ہم سالم کو بیٹا ہی سمجھتے ہیں اس کا کیا حکم ہے؟ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ ان کو ان کے باپوں کی طرف منسوب کرو۔ یعنی حقیقی باپوں سے ان کا نسب ملاؤ۔

هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ یہی بات اللہ کے نزدیک بڑے انصاف کی ہے۔

اَقْسَطُ اسم تفضیل کا صیغہ ہے لیکن حقیقی زیادتی مراد نہیں ہے بلکہ فی نفسہ عدل کی زیادتی مراد ہے یعنی کامل سچی بات۔ بخاری نے حضرت ابن عمر کا قول نقل کیا ہے ہم زید کو زید بن حارثہ نہیں کہتے تھے بلکہ زید بن محمد کہتے تھے یہاں تک کہ آیت اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ نازل ہوئی (اس کے بعد ہم زید بن حارثہ کہنے لگے)۔

فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ ۭ پھر اگر تم کو ان کے باپوں (کے ناموں) سے واقفیت نہ ہو تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں اور دوست ان کو دینی بھائی اور اپنے دوست کہو۔

وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ ۙ اور (ممانعت سے پہلے) تم نے جو غلطی کی (یا ممانعت کی بھول سے بے ساختہ غلطی ہو گئی) اس کا تم پر کوئی گناہ نہیں۔

وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ ۭ گناہ تو اس کا ہے جو تمہارے دلوں نے قصداً غلطی کی ہو۔

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور حضرت ابو بکرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے جانتے ہوئے (اپنے باپ کو چھوڑ کر) کسی دوسرے کو اپنا باپ ظاہر کیا اس پر جنت حرام ہے رواہ الشیخان فی الصحیحین و احمد و ابو داؤد و ابن ماجۃ۔

حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے (اپنے باپ کو چھوڑ کر) کسی دوسرے کو اپنا باپ بتلایا یا کسی (آزاد کردہ غلام) نے اپنے مولیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف اپنا مولیٰ ہونے کی نسبت کی اس پر قیامت کے دن تک اللہ کی مسلسل لعنت ہو گی۔ رواہ ابو داؤد۔ سیوطی نے کہا یہ حدیث صحیح ہے۔

وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ⑤ اور اللہ بڑا معاف کرنے والا نہایت مہربان ہے۔ خطاکار سے درگزر فرماتا ہے۔

بیضاوی نے لکھا ہے منہ بولا بیٹا بنانا ہمارے یعنی امام شافعیؒ کے نزدیک ناقابل اعتبار ہے اس دعویٰ سے بیٹا ہونے کا حکم جاری نہیں ہوتا لیکن امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اگر غلام کو بیٹا بنایا تو غلام آزاد ہو جائے گا اور کسی مجہول النسب کو اپنا بیٹا ظاہر کیا اور وہ شخص ایسا ہے جس کا الحاق (عمر وغیرہ کے لحاظ سے) اس مدعی ابوت سے ہو سکتا ہے تو اس کو اس مدعی ابوت کا بیٹا مان لیا جائے گا۔ لیکن یہ قاضی بیضاوی کی بھول ہے۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک کسی غلام کو صرف اتنا کہہ دینے سے کہ میں نے تجھے بیٹا بنا لیا اس مجہول النسب کا نسب ثابت نہیں ہو جاتا بلکہ امام ابو حنیفہ کا قول یہ ہے کہ اگر کسی آقا نے اپنے غلام کو جو عمر میں آقا سے کم ہو یا زیادہ یہ بات کہہ دی کہ یہ میرا بیٹا ہے تو غلام آزاد ہو جائے گا اور آقا کے کلام کو درست قرار دینے کے لئے مجازی معنی پر محمول کیا

جائے گویا آقا نے جو غلام کے متعلق کہا یہ میرا بیٹا ہے اس کا مجازی معنی یہ ہے کہ آزاد ہے، سبب بول کر مجازاً مسبب مراد لیا جاسکتا ہے بنوت (بیٹا ہونا) آزادی کا سبب ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو اپنے محرم قرابتدار کا (وراثۃً یا خرید کر یا بطور ہبہ) مالک ہو گیا تو وہ محرم آزاد ہو جائے گا۔ رواہ احمد واصحاب السنن۔

صاحبینؒ کا قول امامؒ کے قول کے خلاف ہے امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کا قول ہے کہ اگر کسی آقا نے اپنے غلام کو جو آقا سے عمر میں زائد ہے یہ بات کہہ دی کہ یہ میرا بیٹا ہے تو غلام آزاد نہ ہوگا اس اختلاف کی بنیاد ایک دوسرا اختلافی ضابطہ ہے جس کی تفصیل اصول فقہ میں مذکور ہے۔ اصل اختلافی قاعدہ یہ ہے کہ امام صاحب کے نزدیک مجازی معنی مراد لینے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ حقیقی معنی ممکن بھی ہو فقط تکلم میں حقیقی معنی کی صحت مجازی معنی کی طرف رجوع کرنے کے لئے کافی ہے اس لئے آقا سے زیادہ عمر والے غلام کو اگر آقا نے اپنا بیٹا کہہ دیا تو غلام آزاد ہو جائے گا۔ صاحبین کے نزدیک مجاز حقیقت کے قائم مقام حکم میں ہوتا ہے اگر کسی جگہ حقیقی معنی کا امکان ہی نہ ہو تو مجاز کی طرف رجوع کرنا درست نہیں، پس صورت مذکورہ میں غلام آزاد نہ ہوگا۔

اور اگر کسی مجہول النسب کو اپنا بیٹا قرار دیا اور مجہول النسب ایسا ہے کہ اس کے نسب کا الحاق اس مقر سے ہو سکتا ہے یعنی آقا سے اتنا چھوٹا ہے کہ اس کا حقیقی بیٹا ہونا ممکن ہے تو چونکہ آقا نے خود اقرار کیا ہے اس لئے اس مجہول النسب کا بیٹا ہونا مقر کے حق میں مان لیا جائے گا مگر دوسرے کے حق میں اس مقر کے اقرار سے مجہول کی ابنیت ثابت نہ ہوگی اسی لئے اگر کسی مجہول النسب کو کسی نے اپنا بھائی ہونا ظاہر کیا تو نہیں مانا جائے گا اور مقر کے باپ سے مجہول النسب کا نسب نہیں جوڑا جائے گا۔ ہاں اگر مرتے وقت تک مقر اپنے اقرار پر قائم رہا اور کوئی دوسرا وارث بھی نہ ہوا نہ اصحاب فرائض میں سے نہ عصبات میں سے نہ ذوی الارحام میں سے تو مقر لہ کو مقر کا ترکہ دے دیا جائے گا، بیت المال پر ایسے مقر لہ کو مقدم قرار دیا جائے گا۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ اگر کسی کے متعلق پورے مال کی وصیت کی ہو تو اس پر بھی مقر لہ مذکور کو تقدم حاصل نہ ہوگا۔

بغوی نے لکھا ہے رسول اللہ ﷺ لوگوں کو جہاد کی دعوت دیتے تھے۔ کچھ لوگ اس کے جواب میں کہتے تھے ہم جہاد پر جانے کے لئے تیار ہیں لیکن اپنے والدین سے دریافت کر لیں اس پر ذیل کی آیت نازل ہوئی۔

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ

نبی مومنوں کے ساتھ خود ان کے نفسوں سے بھی زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔

یعنی مومنوں کو جو تعلق ایک دوسرے کے ساتھ ہے ان سب سے زیادہ نبی کا مومنوں سے تعلق ہے۔ اسی تعلق کی وجہ سے نبی کا حکم مومنوں پر نافذ ہے اور پیغمبر کی اطاعت سب پر واجب ہے ماں باپ کا حکم بھی اگر نبی کے حکم کے خلاف ہو تو اس کی مخالفت بھی لازم ہے پس پیغمبر کو ہی جہاد پر بھیجنے اور راہ خدا میں جان خرچ کرنے کا حکم دینے کا حق حاصل ہے۔

حضرت ابن عباسؓ اور عطاء نے آیت کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ جب نبی کسی کو کسی کام کی دعوت دیں اور اس کا نفس کسی دوسری بات کا خواہش مند ہو تو نفس کی اطاعت سے نبی کی اطاعت اولیٰ ہے کیونکہ نبی تمام مسلمانوں کے مصالح اور مفاسد سے پوری طرح خوب واقف ہیں۔ نبی مومنوں کے لئے اسی بات کو پسند کرتے اور اسی کام کا حکم دیتے ہیں جس میں مومنوں کی بہبودی اور کامیابی ہوتی ہے اللہ نے فرمایا ہے حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ۔

انسان کا نفس ہمیشہ بدی کا حکم دیتا ہے سوائے اس کے جس پر اللہ کا کرم ہو انسان کا نفس بڑا ناحق کوش اور بہت ہی نادان ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ مومنوں کو اللہ کے رسول ﷺ کی محبت اپنے نفسوں سے بھی زیادہ ہو اللہ کے رسول اللہ ﷺ کا حکم نفس کی حکومت پر غالب ہو اور رسول خدا کی مومنوں پر شفقت اتنی ہو کہ خود ان کی اپنے نفوس پر نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، تم میں سے کوئی مومن نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ میں اس کی نظر میں اس کے باپ اولاد اور تمام انسانوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں رواہ البخاری و مسلم فی صحیحیہما عن انسؓ۔

حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر مؤمن سے دنیا و آخرت میں میرا تعلق سب سے زیادہ ہے اگر اس کا ثبوت چاہتے ہو تو پڑھو آیت اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ پس جو مؤمن مال چھوڑ کر مرے تو اس کے مال کے وارث اس کے عصبات ہوں گے جو بھی ہوں۔ اور جو مؤمن نادار بیوی بچوں کو چھوڑ جائے تو وہ میرے پاس آجائیں میں ان کا متولی ہوں۔

وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ اور نبی کی بیویاں مومنوں کی مائیں ہیں، یعنی ان کا حق (ماؤں کی طرح) بڑا ہے ان سے ہمیشہ کے لئے (ہر مومن کا) نکاح حرام ہے یہ مطلب نہیں ہے جس طرح ماؤں کو دیکھنا اور ان کے ساتھ تنہائی میں بیٹھنا جائز ہے اسی طرح پیغمبر کی بیویوں کو دیکھنا اور انکے ساتھ تنہائی میں بیٹھنا جائز ہے۔ امہات المومنین کو دیکھنا اور خلوت میں ان کیساتھ بیٹھنا تو ایسا ہی ناجائز ہے جیسے اجنبی عورتوں کے ساتھ۔ اللہ نے فرمایا ہے وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اگر امہات المومنین سے تم کو کوئی سامان مانگنا ہو تو پردہ کی اوٹ سے مانگو۔

امہات المومنین کی بیٹیوں کو امت کی بہنیں نہیں کہا جاتا نہ ان کے بہن بھائی امت کی خالائیں اور ماموں ہیں (نسبی رشتہ نہیں ہے) امام شافعی نے فرمایا..... حضرت زبیرؓ نے اسماءؓ سے نکاح کیا اور اسماء حضرت عائشہ کی بہن تھیں لیکن کسی نے نہیں کہا کہ حضرت اسماء مومنوں کی خالہ تھیں۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے اپنی لڑکیوں کا نکاح حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ سے کیا تھا اور (اگر حضور ﷺ کی صاحبزادیاں امت کی بہنیں ہوتیں تو ان سے کسی کا نکاح نہیں ہوتا۔

شعبی نے مسروق کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ایک عورت نے حضرت عائشہؓ کو اماں کہا، آپ نے فرمایا، میں تمہاری ماں نہیں ہوں تمہارے مَردوں کی ماں ہوں۔ بیہقی نے سنن میں بھی یہ روایت نقل کی ہے۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ اللہ نے جو حضور ﷺ کی بیویوں کو مومنوں کی مائیں فرمایا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ ماؤں کی طرح ازواج مطہرات سے امت کا نکاح حرام ہے۔ حضرت ابی بن کعب کی قرأت میں کیا ہے وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ وَهُوَ اَبٌ لَّهُمْ۔ یعنی رسول اللہ ﷺ مومنوں کے دینی باپ تھے ہر پیغمبر اپنی امت کا دینی باپ ہوتا ہے۔ سب کی ابدی زندگی کی جڑ پیغمبر ہی ہوتا ہے اسی لئے سب مؤمن آپس میں دینی بھائی قرار دیئے گئے ہیں۔

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُهٰجِرِیْنَ

اور اللہ کی کتاب میں (دوسرے) مؤمنوں اور مہاجروں کی بہ نسبت رشتہ دار ایک دوسرے سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔

كِتٰبِ اللّٰهِ سے مراد ہے فیصلہ خداوندی یا لوح محفوظ یا قرآن کی یہی آیت یا آیت میراث۔ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ کا یہ مطلب ہے کہ میراث کے زیادہ مستحق ہیں، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا کہ جس نے مال چھوڑا تو اس کے وارث اس کے عصبات ہوں گے جو بھی ہوں۔

مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ میں مِنْ تفضیلیہ ہے ابتداء اسلام میں مہاجر مہاجر کا وارث ہوتا یا دینی موالات (انصار و مہاجرین کی اخوت دینی) موجب میراث تھی اس آیت سے وہ حکم منسوخ ہو گیا (اور دوسرے مہاجرین و مومنین کے مقابلہ میں قرابت دار اپنے قرابتدار کی میراث کا مستحق قرار دیا گیا) قتادہ نے کہا مسلمان ہجرت کی بنیاد پر ایک دوسرے کے وارث ہوتے تھے (بغوی) کلبی کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں میں باہم رشتہ اخوت قائم کرا دیا تھا حضور ﷺ دو دو مسلمانوں کو بھائی بنا دیتے تھے آخر یہ آیت نازل ہوئی (تو پچھلا دستور منسوخ ہو گیا)۔

اُولُوا الْاَرْحَامِ یعنی وہ قرابتدار جو ذوی الفروض بھی نہیں اور عصبات بھی نہیں ہیں۔ امام شافعیؒ کے نزدیک کسی حال میں وارث نہیں ہوتے ہمارے نزدیک ذوی الفروض اور عصبات کے موجود نہ ہونے کی صورت میں ترکہ کے وارث ذوی الارحام ہوتے ہیں۔ آیت مذکورہ سے ہمارے قول کا ثبوت ملتا ہے (ذوی الفروض وہ قرابتدار ہوتے ہیں جن کا میراثی حصہ قرآن میں مقرر کر دیا گیا ہے اور عصبات وہ لوگ ہیں جو ذوی الفروض کے موجود نہ ہونے کی صورت میں کل ترکہ کے وارث ہو جاتے ہیں۔

اور ذوی الفروض موجود ہوں تو ان کے مقررہ حصے دینے کے بعد اگر کچھ مال بچتا ہو تو اس کے وارث یہ عصبات ہو جاتے ہیں ان کے بعد اولوالارحام کا درجہ ہے امام شافعی کہتے ہیں کہ اولوالارحام وارث ہی نہیں ہوتے اگر عصبات موجود نہ ہوں تو ترکہ کا مال بیت المال میں داخل کر دیا جائے ہم کہتے ہیں کہ آیت میں اولوالارحام کو دوسرے مومنوں کے مقابلہ میں ترجیح دی گئی ہے اس لئے اگر عصبات نہ ہوں تو دوسرے رشتہ داروں کو ترکہ تقسیم کر دیا جائے اور کوئی رشتہ دار نہ ہو تو مجبوراً بیت المال میں داخل کیا جائے۔ مترجم)

إِلَّا أَنْ تَفْعَلُوا إِلَىٰ أَوْلِيَائِكُمْ مَعْرُوفًا ۚ　مگر یہ کہ تم اپنے دوستوں سے (یعنی مہاجر بھائیوں سے یا کسی مومن سے) سلوک کرنا چاہو (تو جائز ہے)۔

فعل معروف سے مراد وصیت ہے جس دوست کے متعلق وصیت کی جائے اس کا حق وارثوں سے مقدم ہے۔ یعنی معروف کا لفظ اگرچہ عام ہے لیکن سنت اور اجماع نے اس عموم کو کل ترکہ کے ایک تہائی کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے یعنی صرف ایک تہائی ترکہ کی وصیت کرنے کا حق میت کو ہے۔

أُولُوا الْأَرْحَامِ کو میراث کا سب سے زیادہ مستحق قرار دیا گیا اس سے وصیت والے دوستوں کو مستثنیٰ کر لیا (یعنی جن دوستوں کو مال دینے کی وصیت کی ہو ان پر قرابتدار ترجیح نہیں رکھتے)۔

یا استثناء منقطع ہے موالات اور ہجرت کو پہلے استحقاق میراث کا موجب قرار دیا گیا تھا اب اس کو منسوخ قرار دیا اور حسب منشاء دوستوں کے لئے ایک تہائی مال کی وصیت کرنے کو جائز کر دیا۔ بعض علماء نے مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ میں لفظ مِنْ کو بیانیہ کہا ہے یعنی جو مومن اور مہاجر میت کے رشتہ دار ہوں وہ میراث کے زیادہ مستحق ہیں مطلب یہ کہ کافر و مسلم اور مہاجر و غیر مہاجر کے درمیان سلسلۂ توارث قائم نہیں ہوگا ہاں اگر کافر یا غیر مہاجر قرابتدار ہوں تو ان کے لئے وصیت کی جا سکتی ہے۔ بغوی نے لکھا ہے یہ قول قتادہ، عطاء اور عکرمہ کا ہے۔

میں کہتا ہوں اگر مِنْ کو بیانیہ قرار دیا جائے گا تو اَوْلٰی (جو اسم تفضیل کا صیغہ ہے) کا استعمال عام افعل التفضیل کے خلاف ہو جائے گا۔ کیونکہ اَوْلٰی پر نہ تو الف لام ہے نہ یہ مضاف ہے نہ اس کے صلہ میں مِنْ ہے اور استعمال اسم تفضیل کے یہی تین طریقے ہیں اس کے علاوہ مِنْ کو بیانیہ قرار دینے سے مسلم و کافر کے درمیان توارث کی نفی پر نہ صراحۃً کوئی لفظ دلالت کر رہا ہے نہ معنوی مفہوم کے طور پر ہی یہ بات معلوم ہوتی ہے مومن کے اولیٰ بالمیراث ہونے سے یہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے کہ اگر مومن وارث موجود نہ ہو تو مومن کی میراث کافر کو (اس صورت میں بھی) نہ دی جائے۔

كَانَ ذَٰلِكَ فِي الْكِتَابِ مَسْطُورًا ۝　یہ (حکم) کتاب میں لکھا ہوا ہے یعنی لوح محفوظ میں یا قرآن میں بعض علماء کے نزدیک اَلْکِتَابِ سے مراد توریت ہے۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُوحٍ وَإِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۖ وَأَخَذْنَا مِنْهُمْ مِيثَاقًا غَلِيظًا ۝　اور یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے (تمام) انبیاء سے اور خصوصاً آپ سے اور نوح سے اور ابراہیم سے اور موسیٰ سے اور عیسیٰ بن مریم سے عہد لیا تھا اور ان (سب) سے پکا عہد لیا تھا۔

یہ عہد اس وقت لیا گیا تھا جب پشت آدم سے سب کو برآمد کیا گیا تھا۔ اللہ نے سب سے عہد لیا تھا کہ وہ اللہ ہی کی عبادت کریں گے دوسروں کو بھی اللہ ہی کی عبادت کی دعوت دیں گے اپنی اپنی امت کے بہی خواہ رہیں گے اور ہر ایک دوسرے کی مدد کرے گا۔

اَلنَّبِيِّينَ کا لفظ تمام انبیاء کو شامل ہے سب ہی پیغمبر اس میں آ گئے لیکن اس کے بعد چند پیغمبروں کا نام بنام خصوصی تذکرہ اس لئے کیا کہ یہ پیغمبر اولوالعزم تھے ان پر کتابیں اور صحیفے نازل کئے گئے تھے ان کو الگ الگ مستقل شریعتیں دی گئی تھیں۔ پھر

رسول اللہ ﷺ کی عظمت شان ظاہر کرنے کے لئے دوسرے پیغمبروں کے ذکر سے پہلے آپ کا ذکر بطور خطاب کیا گیا۔ اس تقدیم ذکر سے اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے جو رسول اللہ ﷺ نے فرمائی تھی کہ پیدائش کے آغاز کے لحاظ سے سب لوگوں سے مقدم ہوں اور بعثت و نبوت کے لحاظ سے سب سے پیچھے (آیا ہوں) رواہ سعد عن قتادہ مرسلاً۔ ولکن رواہ البغوی عن قتادہ عن الحسن عن ابی ہریرہ متصلاً (بروایت بغوی) قتادہ نے (حدیث مذکور بیان کرنے کے بعد) کہا یہی (مضمون) ہے آیت وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ الخ۔ اس میں اللہ نے رسول اللہ ﷺ کا ذکر نوح ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ سے پہلے کیا ہے۔

ابن سعد نے اور ابو نعیم نے حلیہ میں میسرہ فجر بن سعد کی وساطت سے بروایت ابو الجدعاء اور طبرانی نے کبیر میں حضرت ابن عباس کی روایت سے حدیث مذکور ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے حضور ﷺ نے فرمایا، میں اس وقت نبی تھا جب آدم روح اور جسم کے درمیان (کشاکش میں) تھے۔

مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا پکا وعدہ، عظیم الشان عہد یا وہ وعدہ جس کو ایمان کے ساتھ پختہ کیا گیا تھا۔

لِّيَسْـَٔلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ (ایسا اس لئے کیا) کہ (قیامت کے دن) سچوں سے ان کی سچائی کے متعلق سوال کرے۔

یعنی ایسا کرنے کی غرض یہ تھی کہ انبیاء صادقین سے دریافت کیا جائے گا کہ تم نے اپنی اپنی امتوں سے کیا کہا تھا کافروں کو ذلیل کرنے اور لاجواب بنانے کے لئے کافروں سے دریافت کیا جائے گا (کہ کیا تم نے انبیاء کی تصدیق کی تھی) کیونکہ سچے کی تصدیق کرنے والا بھی سچا ہوتا ہے یا ان مؤمنوں سے جنہوں نے اپنے وعدوں کو سچ کر دکھایا تھا ان کے صدق کی باز پرس ہو گی یہاں تک کہ ان کو خود اپنے اوپر گواہ بنایا جائے گا۔

وَاَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ اور کافروں کے لئے اس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا

اے ایمان والو یاد کرو اللہ کی عنایت کو جو تم پر اس وقت ہوئی تھی جب تم پر فوجیں آپڑی تھیں تو ہم نے ان پر ہوائی طوفان اور ایسے لشکر بھیجے جو تم کو دکھائی نہیں دیتے تھے۔ (اس آیت میں غزوہ خندق کی طرف اشارہ ہے)۔

جُنُوْدٌ سے مراد ہیں کفار قریش، بنی غطفان اور قبیلہ بنی قریظہ کے یہودی جن کی مجموعی تعداد تقریباً بارہ ہزار تھی، مدینہ کے مسلمانوں کا ان سب نے آکر محاصرہ کر لیا تھا اور رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کے گرد ایک خندق کھدوائی تھی۔

رِیْحًا یعنی پروا ہوا تھی، موسم بھی سردی کا تھا رات بھی بہت سرد تھی۔ پروا ہوا کا ایک طوفان آیا جو انتہائی سرد تھا جس کی وجہ سے ڈیروں اور خیموں کی میخیں اکھڑ گئیں رسیاں ٹوٹ گئیں، آگ (جو حملہ کرنے والوں نے اپنی فرودگاہ میں کھانا پکانے اور تاپنے کے لئے روشن کر رکھی تھی) بجھ گئی ہانڈیاں الٹ گئیں گھوڑے رسیاں توڑ کر بھاگ نکلے۔

جُنُوْدًا یعنی ملائکہ کا لشکر (جو غیبی امداد کے لئے بھیجا گیا تھا اور) جو لشکر کے گردا گرد تکبیر کی آوازیں بلند کر رہے تھے کافروں پر رعب چھا گیا خوف زدہ ہو گئے ہر قبیلہ کے سردار نے اپنے قبیلہ کو آواز دے کر اپنے پاس بلایا جب سب آگئے تو کہا جلد بھاگو جلد بھاگو نتیجہ میں بغیر لڑائی کے سب بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس روز فرشتوں نے لڑائی میں حصہ نہیں لیا تھا (صرف مسلمانوں کو اطمینان دلانے اور کافروں کے دلوں میں رعب ڈالنے کے لئے آئے تھے۔)

وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۝ اور (اے مسلمانوں) تم جو (لڑائی کی تیاری خندق کی کھدائی) کر رہے تھے اللہ اس کو دیکھ رہا تھا۔

بخاری نے حضرت ابن عباس کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پروا ہوا سے میری مدد کی گئی اور پچھی

ہوا سے قوم عاد کو تباہ کیا گیا۔

غزوۂ خندق کا واقعہ ماہ شوال ۵ھ میں ہوا، مواہب لدنیہ کے مصنف نے یہی لکھا ہے اور موسیٰ بن عقبہ کو اس کا راوی کہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بنی نضیر کو مدینہ سے نکال دیا تھا ان کی جلاوطنی سے آٹھ ماہ کے بعد یہ واقعہ ہوا تھا، بنی نضیر مدینہ سے نکل کر اطراف ملک میں گھومتے پھرے۔ سلام بن ابی الحقیق اور کنانہ بن ربیع اور حیی بن اخطب ربیع الاول ۴ھ میں خیبر میں پہنچے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ربیع الاول یا اس کے کچھ بعد کا ہے، لیکن مشہور یہ ہے کہ شوال ۵ھ میں غزوۂ خندق کا واقعہ ہوا (کذا قال محمد بن اسحاق۔)

بغوی نے لکھا ہے کہ محمد بن اسحاق نے کہا مجھ سے یزید بن رومان نے جو خاندان زبیر کے آزاد کردہ غلام تھے عروۃ بن زبیر کی روایت سے بیان کیا اور عبداللہ بن کعب بن مالک اور زہری اور عاصم بن عمر و بن قتادہ نیز عبداللہ بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم اور محمد بن کعب قرظی کا بھی بیان ہے اور یہ تمام روایات باہم ملتی جلتی ہیں (جن کا خلاصہ یہ ہے کہ) یہودیوں کی ایک جماعت جس میں رسول اللہ ﷺ کے خلاف قبائل عرب کو مدینہ پر چڑھا کر لانے والے سلام بن ابی الحقیق اور حیی بن اخطب اور کنانہ بن ربیع بن ابی الحقیق اور ھوذہ بن قیس اور ابو عامر الوائلی شامل تھے اور بنی نضیر و بنی وائل کے لوگوں کی کچھ تعداد بھی ساتھ تھی مدینہ سے نکل کر مکہ میں قریش کے پاس پہنچے اور رسول اللہ ﷺ کے خلاف جنگ کرنے کی ان کو دعوت دی اور یہ بھی کہا کہ رسول اللہ ﷺ کی بیخ کنی کرنے میں ہم تمہارے ساتھ رہیں گے۔ قریش نے جواب دیا اے گروہ یہود تم اہل علم ہو۔ تمہاری کتاب سابق ہے ہمارا محمد ﷺ سے مذہبی اختلاف ہے تم یہ بتاؤ کہ ہمارا مذہب بہتر ہے یا محمد کا۔ یہودیوں نے جواب دیا، تمہارا مذہب بہتر ہے تم حق پر ہو۔ انہی کے متعلق اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ ...... وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا۔ یہودیوں کا یہ فیصلہ سن کر قریش خوش ہو گئے اور رسول اللہ ﷺ سے جنگ کرنے کی یہودیوں کی دعوت ماننے پر تیار ہو گئے اور سب اس فیصلہ پر متفق ہو گئے۔ اس کے بعد یہ یہودی قبیلۂ غطفان کے پاس پہنچے قبیلہ غطفان قیس بن غیلان کی ایک شاخ تھی ان کو بھی وہی دعوت دی جو قریش کو دی تھی اور ان سے بھی کہا ہم تمہارے ساتھ شریک رہیں گے اور یہ بھی بتا دیا کہ قریش سے ہمارا اس پر معاہدہ ہو چکا ہے قریش نے مان لیا ہے یہ سن کر قبیلۂ غطفان نے بھی ان کی دعوت قبول کر لی۔

میں کہتا ہوں بعض روایات میں آیا ہے کہ بنی نضیر اور بنی وائل کے تقریباً بیس آدمیوں کی جماعت قریش کے پاس گئی ابوسفیان نے ان کو خوش آمدید کہا اور یہ بھی کہا تم سب سے زیادہ ہمارے منظور نظر ہو تم نے محمد کے خلاف ہم سے معاہدہ کیا ہے یہودیوں نے ابوسفیان سے کہا قبیلۂ قریش میں سے تم پچاس آدمی منتخب کر لو اور تم بھی ان کے ساتھ شامل رہو پھر ہم تم سب مل کر کعبہ کے پردوں کے اندر گھس کر کعبہ کی دیواروں سے سینہ چمٹا کر اس بات کی قسمیں کھائیں کہ محمد ﷺ کی عداوت پر ہم سب متفق اور یک زبان رہیں گے ہم باہم عہد کریں کہ جب تک ہم میں سے ایک آدمی بھی زندہ رہے گا ہم محمد ﷺ سے لڑتے رہیں گے، حسب مشورہ سب نے یہ معاہدہ کر لیا۔

قریش سے معاہدہ کرنے کے بعد یہودی قبیلہ غطفان کے پاس پہنچے اور ان کو رسول اللہ ﷺ کے خلاف جنگ پر ابھارا اور ان سے وعدہ کیا کہ اگر تم ہمارے ساتھ مل کر مسلمانوں سے جنگ کرو گے تو خیبر کے درختوں پر جتنے چھوارے ایک سال یا چھ ماہ تک آئیں گے وہ سب ہم تم کو دے دیں گے (یعنی نخلستان خیبر کی پوری فصل یا آدھی فصل تمہاری ہو گی) قبیلہ غطفان کے سردار عیینہ بن حصین فزاری نے شرط مذکور پر یہودیوں کی بات مان لی اور بنی اسد میں جو عیینہ کے حلیف (معاہد) تھے ان کو بھی بلوا لیا اس کے بعد قریش کو لے کر ان کا کمانڈر ابوسفیان بن حرب اور بنی غطفان کو مع بنی فزارہ کے لے کر ان کا قائد عیینہ بن حصین بن حذیفہ بن بدر اور بنی مرہ کو لے کر حارث بن عوف بن ابی حارثہ اور بنی اشجع میں سے اپنے ساتھیوں کو لے کر مسعر بن رحیلہ بن نویرہ بن طریف نکل کھڑے ہوئے۔

ابو سفیان نے چار ہزار کا لشکر جمع کیا اور اس لشکر کا جھنڈا عثمان بن ابی طلحہ کو دیا مکہ سے بر آمد ہونے کے وقت اس کے لشکر میں تین سو گھوڑے اور ایک ہزار اونٹ تھے یہ لشکر مکہ سے چل کر مر الظہران پہنچ کر اتر پڑا اسی جگہ بنی اسلم، بنی اشجع، بنی مرہ، بنی کنانہ، بنی فزارہ اور بنی غطفان کے لشکر آپہنچے۔ یہ ساری فوج دس ہزار ہو گئی، مر الظہران سے روانہ ہو کر سب مدینہ کو چل دیئے۔ (چونکہ مختلف جماعتیں اور گروہ اس لشکر میں شامل تھے) اسی لئے اس جنگ کا نام غزوۂ احزاب ہو گیا۔

بغوی نے لکھا ہے جب رسول اللہ ﷺ نے احزاب کے جمع ہونے اور معاہدہ کر کے چلنے کی خبر سنی تو مدینہ کے باہر آپ نے ایک خندق کھدوائی۔ خندق کھدوانے کا مشورہ رسول اللہ ﷺ کو حضرت سلمان فارسی نے دیا تھا۔

حضرت سلمان اس زمانہ میں آزاد تھے (غلام نہیں تھے) اور رسول اللہ ﷺ کے ہمرکاب رہ کر شریک معرکہ ہونے کا آپ کے لئے پہلا موقع تھا۔ حضرت سلمان نے عرض کیا تھا یا رسول اللہ ﷺ ہم جب فارس میں تھے اور دشمن ہمارا محاصرہ کر لیتا تھا تو ہم اپنے گرداگرد خندق کھود لیا کرتے تھے (دشمن کی پیش قدمی روکنے کی یہ تدبیر تھی) رسول اللہ ﷺ نے اس مشورہ کو مان لیا اور خندق کو مضبوط کر دیا۔

میں کہتا ہوں روایت میں آیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے قبائل عرب کے متفق ہو کر چڑھائی کرنے کی خبر سنی تو فرمایا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ اللہ ہمارے لئے کافی ہے وہی ہمارا اچھا کارساز ہے۔ پھر آپ نے مہاجرین و انصار کے سرداروں کو جمع کر کے مشورہ طلب کیا، حضرت سلمان نے خندق کھدوانے کا مشورہ دیا، حضور ﷺ نے یہ مشورہ پسند فرمایا، مدینہ (کے انتظام) پر حضرت عبداللہ بن ام مکتوم کو اپنا جانشین بنایا اور خود جہاد کے لئے نکل کھڑے ہوئے تین ہزار مہاجر اور انصار آپ کے ساتھ نکلے۔ حضرت زید بن حارثہؓ کو مہاجرین کا اور حضرت سعد بن عبادہؓ کو انصار کا جھنڈا عطا فرمایا۔

میں کہتا ہوں روایت میں آیا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ اس وقت (صرف) ۳۶ گھوڑے تھے۔ کچھ نابالغ لڑکے بھی جہاد میں شریک ہونے کے لئے آپ کے ساتھ نکلے آپ نے پندرہ سال سے کم عمر کے لڑکوں کو واپس کر دیا اور پندرہ سال کی عمر کے لڑکوں کو جہاد میں شریک ہونے کی اجازت دے دی۔ ان بالغوں میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضرت زید بن ثابت، حضرت ابو سعید خدری اور حضرت براء بن عازب بھی تھے۔ پھر حضور ﷺ نے خندق کھدوانے کے لئے مدینہ کے بعض اطراف میں جگہ تلاش کرائی آخر کوہ سلع کے قریب ایک جگہ مقرر کر دی گئی۔ پہاڑ کو لشکر کے عقب میں رکھا گیا اور خندق کے لئے حضور ﷺ نے خود خط کھینچ دیئے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ عبداللہ بن عمرو بن عوف کے والد نے بیان کیا کہ جنگ احزاب کے سال رسول اللہ ﷺ نے خود لائنیں ڈالی تھیں اور ہر دس آدمیوں کے لئے چالیس گز شرعی یعنی چالیس ہاتھ زمین کھودنے کے لئے کاٹ دی تھی۔ راوی کا بیان ہے کہ حضرت سلمان قوی آدمی تھے، مہاجرین و انصار کے درمیان حضرت سلمان کے متعلق کچھ اختلاف ہو گیا مہاجرین نے کہا سلمان ہم میں سے ہیں اور انصار نے کہا سلمان ہمارے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سلمان ہم میں سے یعنی ہمارے اہل بیت میں سے ہیں۔ عمرو بن عوف نے فرمایا، میں اور سلمان اور حذیفہ اور نعمان بن مقرن مزنی اور چھ انصاری چالیس گز زمین کھودنے میں شریک تھے چنانچہ ہم نے کھودنا شروع کر دیا، اچانک بحکم خدا خندق کے اندر ایک سخت ترین چٹان آگئی جس کو توڑنا ہمارے لئے سخت دشوار ہو گیا ایسی سخت چٹان تھی کہ اس نے ہمارے لوہے کے اوزاروں کو توڑ دیا، میں نے کہا سلمان ذرا اوپر چڑھ کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں جاؤ اور حضور ﷺ کو اس چٹان کی کیفیت بتاؤ اگر حضور ﷺ مناسب سمجھیں گے تو ہم اس پتھر کی طرف سے کھدائی کا رخ موڑ دیں گے، موڑنے کا مقام قریب ہی ہے یا جو بھی حکم دیں گے ہم اس کی تعمیل کریں گے کیونکہ حضور ﷺ کے ڈالے ہوئے خط سے ہٹنا ہم نہیں چاہتے۔ سلمان اوپر چڑھ کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچے آپ اس وقت ترکی خیمہ کے نیچے فروکش تھے۔ سلمان نے کہا یا رسول اللہ ﷺ خندق کے اندر ایک سخت سفید چٹان نکل آئی جس نے ہمارے آہنی اوزار کو توڑ ڈالا، ہمارے لئے سخت دشواری ہو گئی ہم کچھ بھی تو اس پر اثر نہیں ہوا نہ زیادہ نہ کم۔ اب حضور کا کیا حکم ہے ہم

حضور ﷺ کے ڈالے ہوئے خط سے ہٹنا پسند نہیں کرتے۔ رسول اللہ ﷺ (فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور جا کر) خندق کے اندر اتر گئے۔ سلمان بھی ساتھ تھے اور خندق کے اندر نو آدمی اور تھے پھر حضور ﷺ نے سلمان کے ہاتھ سے کدال لے کر چٹان پر ایک سخت ضرب لگائی فوراً پتھر میں شگاف ہو گیا اور پتھر سے ایک ایسی چمک نکلی جس سے مدینہ کے دونوں کنارے روشن ہو گئے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی تاریک ترین کوٹھری میں چراغ روشن کر دیا گیا ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے تکبیر فتح کہی مسلمانوں نے بھی آپ کے ساتھ اللہ اکبر کا نعرہ لگایا اس کے بعد آپ نے دوسری ضرب لگائی پتھر ٹوٹ گیا اور ایک بجلی چمکی جس سے مدینہ کے دونوں کنارے چمک اٹھے۔ ایسا معلوم ہوا جیسے کسی تاریک کوٹھری میں چراغ روشن کر دیا گیا ہو، حضور نے تکبیر فتح کہی اور مسلمانوں نے بھی اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ حضور ﷺ نے پھر پتھر پر ایک ضرب لگائی پھر سلمان کا ہاتھ پکڑ کر اوپر چڑھ آئے۔ سلمان نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! میرے ماں باپ قربان میں نے (آج) ایک بات دیکھی جو کبھی نہیں دیکھی تھی۔ حضور اقدس ﷺ نے لوگوں کی طرف رخ کر کے فرمایا تم نے دیکھا سلمان کیا کہہ رہے ہیں۔ صحابہ نے عرض کیا جی ہاں (صحیح کہہ رہے ہیں) فرمایا میں نے پہلی ضرب جو ماری تھی اور تم نے اس سے بجلی پیدا ہوتی دیکھی تھی اس کی روشنی میں حیرہ (یعنی شاہان عراق کے جن کی تخت گاہ حیرہ تھی) کے محلات اور کسریٰ کی (تخت گاہ) مدائن میرے سامنے آگئی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کتوں کے نوکیلے دانت ہیں جبرئیلؑ نے مجھے بتایا کہ میری امت وہاں (یعنی حیرہ اور مدائن) تک غالب آئے گی۔ پھر میں نے دوسری ضرب لگائی جس سے بجلی کوندی تم نے دیکھی اس کی چمک میں میں نے رومی سرخوں کے محلات دیکھ لئے جیسے کتوں کے نوکیلے دانت اور جبرئیلؑ نے مجھے بتایا کہ میری امت ان محلات پر قابض ہو جائے گی تم کو اس کی خوش خبری ہو یہ کلام سن کر مسلمانوں کے چہرے کھل گئے اور سب نے کہا ہر ستائش اسی اللہ کے لئے ہے جس کا وعدہ سچا ہے اس نے محصور ہونے کے بعد ہم سے فتح کا وعدہ فرمایا۔

منافق کہنے لگے لوگو کیا تمہارے لئے یہ بات اچنبھے کی نہیں ہے کہ محمد تم کو آرزو مند کر رہے ہیں تم سے جھوٹے وعدے کر رہے ہیں اور تم کو خبر دے رہے ہیں کہ یثرب سے حیرہ کے محلات اور کسریٰ کا مدائن ان کو دکھائی دے رہے ہیں اور ان سب پر تمہارا قبضہ ہو گا تمہارے اندر اتنی طاقت تو ہے نہیں کہ میدان میں نکلو۔ ڈر کے مارے خندق کھود رہے ہو۔ راوی کا بیان ہے اس پر آیت وَاِذْ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا نازل ہوئی اور اسی واقعہ کے سلسلہ میں اللہ نے فرمایا، قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ الخ

بخاری نے صحیح میں حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ خندق کی طرف تشریف لے گئے صبح سردی کی تھی مہاجرین اور انصار خود خندق کھود رہے تھے، غلام خادم ان کے پاس یہ کام کرنے کیلئے تھے نہیں حضور ﷺ نے ان کی بھوک اور تھکن کو ملاحظہ کیا تو فرمایا۔

ان العیش عیش الاخرۃ فاغفر الانصار و المھاجرہ

درحقیقت زندگی تو آخرت کی زندگی ہے، اے اللہ انصار اور مہاجرین کو بخش دے۔ صحابہؓ نے اس (شعر) کے جواب میں کہا۔

نحن الذین بایعوا محمدا علی الجھاد مابقینا ابدا

ہم وہی تو ہیں جنہوں نے محمد ﷺ کے ہاتھ پر ہمیشہ کے لئے جب تک زندہ ہیں جہاد کرنے کی بیعت کی ہے۔

صحیح میں یہ بھی کیا ہے کہ حضرت براء بن عازبؓ نے فرمایا، جنگ احزاب کا زمانہ آیا اور رسول اللہ ﷺ نے خندق کھدوائی تو میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ خود خندق کی مٹی نکال رہے ہیں اور غبار کی وجہ سے شکم مبارک کی جلد گرد آلود ہو کر چھپ گئی ہے حضور ﷺ کے پیٹ پر بال بہت تھے آپ مٹی ڈھونے میں ابن رواحہ کے یہ شعر بطور رجز کے پڑھ رہے تھے اور شعر کے قافیہ پر آواز کو کھینچتے تھے (یعنی کھینچ کر ادا کرتے تھے)۔

اَللّٰھُمَّ لَوْلَا اَنْتَ مَا اھْتَدَیْنَا وَلَا تَصَدَّقْنَا وَلَا صَلَّیْنَا

اے اللہ اگر تیری توفیق نہ ہو تو ہم ہدایت یاب نہ ہوتے نہ زکوۃ دیتے نہ نماز پڑھتے۔

فَاَنْزِلَنْ سَکِیْنَۃً عَلَیْنَا وَثَبِّتِ الْاَقْدَامَ اِنْ لَاقَیْنَا

ہم پر طمانیت خاطر نازل فرما اور مقابلہ کے وقت ہمارے قدم جمائے رکھ۔

اِنَّ الْاُلٰی قَدْ بَغَوْا عَلَیْنَا اِذَا اَرَادُوْا فِتْنَۃً اَبَیْنَا

انہی لوگوں نے ہم پر زیادتی کی ہے جب انہوں نے فساد برپا کرنے کا ارادہ کیا تو ہم نے انکار کر دیا۔ دوسری روایت میں پہلا مصرع اس طرح آیا ہے۔

وَاللّٰہِ لَوْلَا اللّٰہُ مَا اھْتَدَیْنَا

روایت میں آیا ہے کہ حضرت سلمان قوی آدمی تھے خندق میں دس آدمیوں کے برابر کام کرتے تھے۔ یہ بھی روایت ہے کہ تنہا پانچ ہاتھ گہرا اور پانچ ہاتھ لمبا چوڑا خندق روز کھودتے تھے۔ قیس بن ابی صعصعہ کی نظر آپ کو لگ گئی فوراً بے ہوش ہو کر گر گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے قیس کو حکم دیا کہ کسی برتن میں وضو کرو اور اس پانی سے سلمان کو غسل دو پھر اس برتن کو اپنی پشت کی طرف اوندھا کر کے پھینک دو، حکم کی تکمیل کی گئی اور حضرت سلمان اچھے ہو گئے۔

بخاری نے صحیح میں نیز امام احمد نے بیان کیا ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہ نے فرمایا ہم خندق کے دن رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے خندق کھودتے میں ایک بہت سخت پتھر آ گیا لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا پہاڑ کا یہ سخت پتھر سامنے آ گیا (اب کیا کیا جائے) فرمایا میں خود اندر اتروں گا یہ فرماتے ہی کھڑے ہو گئے اس وقت فاقہ کے سبب حضور ﷺ کے پیٹ پر پتھر بندھا تھا، تین روز سے ہم کو بھی کوئی چیز چکھنے تک کو نہیں ملی تھی، حضور ﷺ نے کدال ہاتھ میں لے کر پتھر پر ضرب لگائی، پتھر ریزہ ریزہ ریگ رواں کی طرح ہو گیا۔ پھر میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھے گھر جانے کی اجازت عطا فرما دیجئے، اجازت لے کر میں گھر پہنچا اور اپنی بیوی سے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو سخت بھوک کی حالت میں دیکھا ہے مجھ سے یہ دیکھ کر صبر نہ ہو سکا کیا تمہارے پاس کچھ ہے؟ بیوی ایک تھیلا نکال کر لائی جس میں چار سیر جو تھے ہمارا ایک چھوٹا سا بکری کا بچہ بھی تھا، میں نے اس کو ذبح کیا اور بیوی نے آٹا گوندھا جتنی دیر میں میں فارغ ہوا وہ بھی فارغ ہو گئی پھر میں نے گوشت ٹکڑے کر کے ہانڈی میں ڈالے اتنے میں گوندھا ہوا آٹا لس پا کر ٹھیک ہو گیا، گوشت کی ہانڈی پتھروں کے چولہے پر چڑھا دی جب ہانڈی پک چکنے کے قریب ہو گئی تو میں لوٹ کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا بیوی نے مجھ سے کہہ دیا کہ (زیادہ آدمیوں کو لا کر) مجھے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کے سامنے رسوا کرنا، خدمت گرامی میں پہنچ کر میں نے چپکے سے حضور ﷺ سے واقعہ عرض کر دیا اور کہہ دیا یا رسول اللہ ﷺ بہت تھوڑا کھانا ہے حضور ﷺ تشریف لے چلیں اور ایک یا دو آدمی اور بھی ساتھ لے لیں، فرمایا کتنا کھانا ہے؟ میں نے بتا دیا، فرمایا بہت ہے پاکیزہ ہے تم بیوی سے کہہ دو کہ جب تک میں نہ پہنچ جاؤں ہانڈی چولہے سے نہ اتارے اور روٹی تنور سے نہ نکالے (یعنی نہ پکائے) پھر آواز دے کر فرمایا، خندق والو، جابر نے تمہارے لئے کچھ کھانا تیار کیا ہے اور تمہاری دعوت کی ہے جلدی چلو، میں نے اپنی بیوی سے جا کر کہا ارے رسول اللہ ﷺ مہاجرین و انصار اور ان کے دوسرے ساتھیوں کو لے کر آ رہے ہیں (اب کیا ہوگا) بیوی نے کہا اللہ کا حکم تمہارے متعلق یہی ہے کیا رسول اللہ ﷺ نے تم سے کھانے کی مقدار بھی دریافت کی تھی؟ میں نے کہا ہاں بیوی نے کہا تو اللہ اور رسول (ہماری حالت) کو خوب جانتے ہیں۔ غرض رسول اللہ ﷺ گھر میں تشریف لے آئے اور صحابہؓ سے فرمایا، تم بھی اندر آ جاؤ لیکن بھیڑ نہ کرنا کسی کو دباؤ نہیں۔ میں نے گوندھا ہوا آٹا لا کر رکھ دیا۔ آپ نے اس میں تھو تھو کر دیا اور برکت کی دعا کی پھر ہانڈی کے پاس گئے اس میں تھو تھو کیا اور برکت کی دعا کی پھر فرمایا جابر پکانے والی کو بلا دو وہ آ کر پکانا شروع کرے اور تم ہانڈی سے سالن نکالو لیکن ہانڈی کو نیچے نہ اتارنا، حضور ﷺ خود روٹی کے ٹکڑے کرنے لگے اور روٹی پر گوشت رکھنے لگے مگر اس مدت میں ہانڈی کو اور چولہے کو ڈھانکے

رکھا، نکالتے جاتے تھے اور صحابہ کی طرف بڑھاتے جاتے تھے پھر نکالتے تھے اور صحابہ کو دیتے تھے یہاں تک کہ ایک ہزار آدمی تھے سب سیر ہو گئے۔ میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ سب نے اتنا کھایا کہ کھاتے کھاتے چھوڑ دیا اور رخ موڑ کر چل دیئے لیکن ہانڈی میں ویسا ہی ابال آ رہا تھا جیسا آ رہا تھا اور روٹی بھی برابر پکتی ہی رہی، پھر حضور ﷺ نے عورت سے فرمایا اب تو بھی کھالے اور دوسرے لوگوں کو بھی بھیج دے لوگ سخت بھوکے ہیں چنانچہ ہم کھانے لگے اور دن بھر دوسروں کو بھی بھیجتے رہے۔ میں کہتا ہوں صحیح روایت میں آیا ہے کہ خندق کھودنے سے صحابہ چھ روز میں فارغ ہوئے تھے۔

بغوی نے (اس کے بعد) لکھا ہے اب ہم پھر ابن اسحاق کے بیان کی طرف لوٹتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ خندق کی تکمیل سے فارغ ہو چکے تھے کہ قریش اپنے احابیش اور دوسرے اہل تہامہ کو ساتھ لے کر دس ہزار کی تعداد میں آ کر مجمع الاسیال میں فروکش ہو گئے اور بنی غطفان اپنے نجدی ساتھیوں کے ساتھ کوہ احد کے ایک جانب کمی کے پچھلے حصہ میں اترے۔ رسول اللہ ﷺ بھی تین ہزار مسلمانوں کے ساتھ بر آمد ہوئے اور کوہ سلع کو اپنی پشت پر لے کر حضور ﷺ نے اپنی لشکر گاہ بنائی خندق آپ کے اور دشمنوں کے درمیان حائل تھی مسلمانوں نے حسب الحکم بچوں اور عورتوں کو پہاڑیوں کے اوپر پہنچا دیا۔

دشمن خدا حیی بن اخطب نضیری اپنے مقام سے اٹھا اور کعب بن اسد قرظی کی طرف چل دیا کعب نے بنی قریظہ کی طرف سے اپنی قوم کے لئے رسول اللہ ﷺ سے امن کا معاہدہ کر لیا تھا اور مصالحت کر لی تھی اس لئے حیی کے لئے اس نے اپنی گڑھی کا دروازہ نہیں کھلوایا، کھولنے سے صاف انکار کر دیا حیی نے ہر چند دروازہ کھلوانے کی استدعا کی لیکن کعب ہرگز نہ مانا اور کہنے لگا حیی یہ بڑی بدبختی ہے میں محمد سے معاہدہ کر چکا ہوں اپنا معاہدہ ہرگز نہیں توڑوں گا محمد ﷺ کی طرف سے میں نے ہمیشہ عہد کی پابندی اور سچائی ہی پائی ہے اس لئے میں بھی نقض عہد کرنے والا نہیں۔ حیی نے کہا دروازہ تو کھولو میں تم سے بات کروں گا، کعب نے کہا میں ہرگز ایسا نہیں کروں گا۔ حیی نے کہا کعب تم مجھے باہر چھوڑ کر دروازہ بند کئے بیٹھے ہو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ تم کو اندیشہ ہے کہ اگر میں اندر آ جاؤں گا تو تمہارے ساتھ حصہ بانٹ کر لوں گا کعب کو یہ بات سن کر غصہ آ گیا اور جوش میں آ کر دروازہ کھول دیا حیی اندر آ گیا اور کہا کعب میں زمانہ بھر کی عزت لے کر تمہارے پاس آیا ہوں لہریں مارتا ہوا ایک سمندر چڑھا لایا ہوں۔ میں نے قریش کو ان کے کمانڈروں اور سرداروں کے ساتھ لا کر رومۃ الجندل کے مقام مجمع الاسیال میں اتار دیا ہے اور بنی غطفان کو ان کے سرداروں اور سپہ سالاروں کے ساتھ لا کر کوہ احد کے ایک پہلو پر کمی کے پچھلے حصہ میں شام کو پڑاؤ ڈلوا دیا ہے ان سب نے مجھ سے معاہدہ اور پختہ وعدہ کر لیا کہ جب تک محمد ﷺ اور ان کے ساتھیوں کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ کر نہ پھینک دیں گے یہاں سے نہیں ہٹیں گے کعب بن اسد نے کہا خدا کی قسم تم ابدی ذلت لے کر آئے یہ ایک ایسا بادل ہے جس کا پانی برس چکا ہے اب اس میں سوائے گرج اور چمک کے اور کچھ بھی نہیں ہے تم محمد ﷺ کے سلسلہ میں مجھے میرے حال پر چھوڑ دو میں نے محمد کی طرف سے سوائے اور پابندی عہد کے کبھی غداری نہیں دیکھی۔ حیی بن اخطب کعب کو برابر اتار چڑھاؤ اور فریب دیتا رہا یہاں تک کہ حیی نے کعب کے سامنے اللہ کی پختہ قسم کھائی کہ اگر قریش محمد پر کامیابی حاصل کئے بغیر واپس چلے گئے تو تمہاری اس گڑھی کے اندر میں بھی آ بسوں گا تاکہ جو دکھ تم کو پہنچے اس میں تمہارا شریک رہوں، آخر کعب نے رسول اللہ ﷺ سے کیا ہوا معاہدہ توڑ دیا اور پابندی عہد جو اس پر لازم تھی اس سے الگ ہو گیا۔

رسول اللہ ﷺ کو اور مسلمانوں کو جب یہ اطلاع ملی تو حضور ﷺ نے سعد بن معاذ اشہلی سردار اوس اور سعد بن عبادہ ساعدی سردار خزرج اور عبد اللہ بن رواحہ خزرجی اور خوات بن جبیر عمری کو تحقیق واقعہ کے لئے بھیجا اور فرمایا تم لوگ جا کر دیکھو کہ ان لوگوں کے متعلق جو اطلاع مجھے ملی کیا وہ صحیح ہے اگر خبر صحیح ہو تو آ کر ایسے الفاظ میں مجھے اطلاع دینا کہ میں سمجھ جاؤں (ایسا نہ کرنا کہ عام لوگوں کے سامنے اعلان کر دو جس سے ان کے دلوں میں خوف پیدا ہو جائے) اور لوگوں کے بازو نہ توڑ دینا اور اگر وہ ہم سے کئے ہوئے سابق معاہدہ پر قائم ہوں تو پھر علی الاعلان لوگوں کے سامنے اس کو بیان کر سکتے ہو۔ مذکورہ بالا حضرات حسب

نکل گئے یہودیوں کے پاس پہنچے اور جو خبر ان کے متعلق ملی تھی اس سے زیادہ بگڑی ہوئی حالت پر ان کو پایا رسول اللہ ﷺ کی طرف سے وہ بالکل ہی برگشتہ ہو گئے تھے اور صاف کہہ دیا تھا اب ہمارا اور محمد ﷺ کا کوئی معاہدہ نہیں حضرت سعد بن عبادہ کے مزاج میں تیزی تھی آپ نے یہودیوں کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا، حضرت سعد بن معاذ نے کہا، سعد بن عبادہ ان سے گالی گلوچ چھوڑو، ہمارا ان کا معاملہ اب اس سے بہت آگے بڑھ چکا ہے اس کے بعد دونوں سعد اور ان کے ساتھی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام کے بعد عرض کیا لاعلاج مرض ہے اور رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کے ساتھ غداری بہت سخت ہے اللہ اکبر اے گروہ اہل اسلام تم کو بشارت ہو۔ غرض (صحابہ کے لئے) سخت مصیبت آپڑی اور سخت خوف کا وقت آگیا دشمنوں نے اوپر (کڑھی کی طرف) سے اور نیچے (خندق کے پار کفار) کی طرف سے گھیر لیا مسلمانوں کے دلوں میں بھی برے برے خیالات آنے لگے، بعض منافقوں کی طرف سے تو اس کا ظہور بھی ہو گیا۔ یہاں تک کہ معتب بن قشیر عمری نے یہ الفاظ کہہ دیئے کہ محمد ہم سے تو وعدہ کر رہے ہیں کہ تم کسریٰ اور قیصر کے خزانے کھاؤ گے لیکن ہماری یہ حالت ہو گئی ہے کہ ہم میں سے کوئی شخص رفع ضرورت کے لئے جنگل کو بھی نہیں جا سکتا، اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ہم سے جو وعدہ کیا ہے وہ محض فریب ہے۔ اوس بن قیظی (منافق) نے کہا یا رسول اللہ ﷺ ہمارے گھروں میں کوئی نگراں نہیں اور گھر شہر کے باہر ہیں آپ ہم کو اجازت دے دیجئے کہ واپس گھروں کو چلے جائیں اس شخص نے یہ بات غلط کہی تھی) ان لوگوں کے گھروں کی نگہبان انہیں کے قبیلہ کے مردوں کی ایک جماعت موجود تھی۔

میں کہتا ہوں کعب نے جب رسول اللہ ﷺ سے کیا ہوا معاہدہ توڑ دیا اور نقض عہد پر قائم رہنے کا پختہ ارادہ کر لیا تو اپنی قوم کے سرداروں کو جمع کیا جن میں زبیر بن باطا، نباش بن قیس اور عقبہ بن زید وغیرہ شامل تھے اور سب کو نقض عہد کی اطلاع دی یہ خبر سنتے ہی لوگوں نے اس کو سخت ملامت کی اور عہد شکنی کو پسند نہیں کیا اس وقت کعب اپنی حرکت پر پشیمان ہوا لیکن اس وقت پشیمانی سے کوئی فائدہ نہ تھا اس کے ہاتھ سے باگ ڈور نکل چکی تھی اللہ نے اسی سبب سے بنی قریظہ کو تباہ کر دینا چاہا۔

شیخین نے صحیحین میں بیان کیا ہے کہ حضرت زبیرؓ بن العوام نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک روز ارشاد فرمایا کوئی شخص ہے جو جا کر بنی قریظہ کی خبر مجھے لا کر دے ارشاد گرامی سن کر میں روانہ ہو گیا اور واپس لوٹ کر بنی قریظہ کی خبریں حضور کو پہنچائیں حضور ﷺ نے فرمایا، تجھ پر میرے ماں باپ قربان۔ حضور ﷺ نے اس کلام میں اپنے ماں اور باپ دونوں لفظ فرمائے۔

میں کہتا ہوں حضرت زبیر کا بنی قریظہ کی طرف جانا، حضرت سعد بن معاذ اور حضرت سعد بن عبادہ کے واپس آجانے کے بعد ہوا تھا (یعنی پہلے خبر کی تحقیقات کے لئے حضرت سعد وغیرہ کو بھیجا گیا جب وہ تحقیق خبر کے بعد واپس آگئے تو حضرت زبیر کو بنی قریظہ کی تیاری کی کیفیت معلوم کرنے کے لئے روانہ کیا گیا)...... روایت میں آیا ہے کہ حضرت زبیر جب بنی قریظہ کی طرف سے واپس آکر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اطلاع دی کہ وہ لوگ قلعوں کو درست کر رہے ہیں راستے اور سرحدیں بند کر رہے ہیں چوپایوں کو گڑھیوں کے اندر جمع کر رہے ہیں۔ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا ہر نبی کا حواری ہوتا ہے اور میرا حواری (مخلص دوست) زبیرؓ ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ کچھ اوپر بیس روز رسول اللہ ﷺ اپنی فرودگاہ میں اور مشرک اپنے پڑاؤ پر قائم رہے کوئی لڑائی نہیں ہوئی سوائے تیر یا پتھر پھینکنے کے کسی طرف سے کچھ نہیں ہوا۔ رسول اللہ ﷺ کو جب تکلیف زیادہ ہوئی تو آپ نے بنی غطفان کے دو سرداروں یعنی عیینہ بن حصین اور ابو الحارث بن عمرو کو پیام صلح دے کر بلوایا اور ان سے فرمایا تم اپنے غطفانی ساتھیوں کو لے کر اس شرط پر واپس چلے جاؤ کہ تم کو مدینہ کے نخلستانوں کی کل پیداوار یعنی کھجوروں کا ایک تہائی حصہ دے دیا جائے گا وہ لوگ اس پر راضی ہو گئے۔ تحریر لکھ دی گئی لیکن ابھی دستخط ہونا باقی تھا کہ حضور ﷺ نے سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ سے اس کا تذکرہ کیا اور مشورہ طلب کیا دونوں نے جواب دیا یا رسول اللہ ﷺ کیا ایسا کرنے کا اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس کی تعمیل ہم پر واجب ہے یا آپ نے خود یہ تدبیر مناسب سمجھی ہے اور آپ اس کو پسند کرتے ہیں تب بھی ہمارے لئے مجبوری ہے یا

حضور ﷺ نے ہمارے فائدے کے لئے ایسا کرنا چاہا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا اور کوئی وجہ نہیں صرف تمہارے فائدے کے لئے میں نے ایسا ارادہ کیا ہے میں نے دیکھا کہ سارے عرب تمہارے خلاف ہو گئے اور ایک کمان سے سب تیر پھینکنا چاہتے ہیں اور ہر طرف سے وہ تم پر بھڑک اٹھے ہیں تو میں نے ارادہ کیا کہ تمہارے خلاف ان کی اجتماعی طاقت کو توڑ دوں۔ حضرت سعد بن معاذ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ایک وقت تھا کہ ہم اور یہ لوگ سب بت پرست اور مشرک تھے نہ ہم اللہ کو جانتے تھے نہ اس کی پرستش کرتے تھے اس زمانہ میں ان لوگوں میں یہ طاقت نہ تھی کہ ہمارا ایک چھوارا بھی بغیر خریدے یا بدوں مہمانی کھا سکیں۔ اب جبکہ اللہ نے ہم کو اسلام کی وجہ سے عزت عطا فرما دی اور آپ کی ذات مبارک کے سبب ہماری عزت افزائی کر دی تو کیا ہم ان کو اپنا مال مفت دے دیں۔ ہمیں ایسے معاہدے کی ضرورت نہیں بخدا ہم ان کو تلوار کے سوا اور کچھ نہیں دیں گے یہاں تک کہ اللہ ہمارے اور ان کے درمیان (آخری) فیصلہ فرما دے۔ حضور والا نے یہ تقریر سن کر فرمایا تم کو اختیار ہے (ایسا ہی کرو) سعد نے کاغذ لے کر تحریر مٹا دی اور کہا اب یہ ہمارے خلاف جو کوشش کر سکتے ہیں کریں۔

میں کہتا ہوں بعض روایت میں آیا ہے کہ یہ بات اول حضرت اسید بن حضیر نے کہی تھی پھر حضرت سعد بن عبادہ نے بھی یہی کہا۔ عیینہ بن حصین اس وقت مجلس میں ٹانگ پھیلائے بیٹھا تھا، حضرت سعد نے اس سے فرمایا او بندر اپنی ٹانگ سمیٹ لے اگر رسول اللہ ﷺ کی مجلس کا وقار مانع نہ ہوتا تو میں برچھا تیری کوک میں پیوست کر دیتا، غرض عیینہ اور حارث دونوں ناکام واپس چلے گئے اور سمجھ گئے کہ ان کا تسلط مدینہ پر نہیں ہو سکتا انصار کی قوت اور جرأت کو دیکھ کر ان کے قدم ڈگمگانے لگے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ دشمن رسول اللہ ﷺ کا محاصرہ کئے پڑے رہے کوئی لڑائی نہیں ہوئی صرف قریش کے چند شہسوار جن میں عمرو بن عبدود عامری، عکرمہ بن ابی جہل مخزومی، ہبیرہ بن وہب مخزومی، نوفل بن عبداللہ، ضرار بن خطاب اور مرد اس بن لوی محاربی شامل تھے گھوڑوں پر سوار ہو کر بنی کنانہ کی طرف سے گزرے اور ان سے کہا لڑائی کے لئے تیار ہو جاؤ آج تم کو معلوم ہو جائے گا کہ کون شہسوار ہے پھر خندق کی طرف رخ موڑا اور خندق کو دیکھ کر بولے خدا کی قسم یہ تدبیر ایسی ہے جس کو عرب پہلے نہیں کرتے تھے اس کے بعد خندق میں ایک تنگ جگہ تلاش کر کے اس میں گھوڑوں کو داخل کر دیا، گھوڑے ان کو لے کر خندق اور کوہ سلع کے درمیانی گڑھے میں گردش کرنے لگے حضرت علیؓ نے جو یہ بات دیکھی تو کچھ مسلمانوں کو ساتھ لے کر اس سرحدی مقام پر جا پہنچے جہاں سے دشمن نے اپنے سواروں کو داخل کیا تھا وہ سوار بھی تیزی کے ساتھ ان کے سامنے آ گئے۔ حضرت علی نے اس مقام کو بند کر دیا۔ عمرو بن عبدود بدر کی لڑائی میں شریک اور زخمی ہو گیا تھا اس لئے جنگ احد میں شریک نہ تھا، جب خندق کا واقعہ ہوا تو اپنی اہمیت جتلانے کے لئے وہ بھی ساتھیوں کو ٹریننگ دینے کی غرض سے ساتھ آ گیا۔ حضرت علی کے مقابلہ پر جب وہ خود دوسرے سواروں کے ساتھ مل کر آ کھڑا ہوا تو حضرت علی نے اس سے فرمایا عمرو تو نے اللہ کو گواہ کر کے کہا تھا کہ جب کوئی قریشی تیرے سامنے کوئی سی دو باتیں (ایک مثبت دوسری منفی) رکھے گا تو دونوں میں سے ایک بات کو تو اختیار کرے گا، عمرو نے کہا بے شک یہی بات ہے حضرت علی نے فرمایا تو میں تجھے اللہ، اللہ کے رسول ﷺ اور اسلام کی طرف آنے کی دعوت دیتا ہوں کہنے لگا اس کی مجھے ضرورت نہیں، حضرت علی نے فرمایا تو پھر میں تجھے میدان میں اترنے کی دعوت دیتا ہوں۔ بولا بھتیجے ایسا کیوں کرتے ہو خدا کی قسم میں تم کو قتل کرنا نہیں چاہتا حضرت علی نے فرمایا بخدا میں تو تجھے قتل کرنا چاہتا ہوں یہ سنتے ہی عمرو گرما گیا اور گھوڑے سے اتر کر اس کی ہاتھوں کو زخمی کر دیا اس کے منہ پر ایک ضرب رسید کی پھر حضرت علی کی طرف چل پڑا دونوں نے ایک دوسرے کی پکڑی اور کشتی لڑنے لگے آخر حضرت علی نے اس کو قتل کر دیا دوسرے سوار شکست کھا کر خندق میں گھس کر بھاگ گئے اس روز عمرو کے دو سپاہی بھی مارے گئے۔ منبہ بن عثمان بن عبدالسباق بن عبدالدار کے ایک تیر لگ گیا تھا جس سے مکہ میں پہنچ کر اس کا انتقال ہو گیا اور نوفل بن عبداللہ بن مغیرہ مخزومی خندق کے اندر گھس کر جب درمیان میں پہنچا تو مسلمانوں نے اس پر سنگ باری کی۔ کہنے لگا اے گروہ عرب (لڑائی کا یہ کیا طریقہ ہے) جنگ کا طریقہ اس سے بہتر ہونا چاہئے یعنی دو بدو لڑائی ہونی چاہئے فوراً حضرت علی میدان میں اتر پڑے اور عبداللہ کو قتل کر دیا اور مسلمان غالب آ گئے۔ کافروں

نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ مقتول کی لاش ہم کو قیمت واپس دے دیجئے فرمایا ہم کو نہ اس کی لاش درکار ہے نہ قیمت کی ضرورت، لاش کو لے جاؤ۔ چنانچہ آپ نے لاش لے جانے کی اجازت دے دی۔

ام المومنین حضرت عائشہؓ کا بیان ہے خندق کی لڑائی کے دن ہم بنی حارثہ کی گڑھی میں تھے مدینہ کے قلعوں میں یہ سب سے محفوظ قلعہ تھا سعد بن معاذ بھی ہمارے ساتھ گڑھی کے اندر تھے۔ یہ واقعہ پردہ کا حکم نازل ہونے سے پہلے کا ہے۔ سعد بن معاذ ایک چھوٹی زرہ پہنے ہوئے قلعہ سے باہر نکلے ہاتھ کی بانہہ کھلی ہوئی تھی۔ ہاتھ میں چھوٹا برچھا تھا اور یہ شعر پڑھ رہے تھے۔

کاش لڑائی کو میر اونٹ پالیتا جب موت کا مقرر وقت آجائے تو مرنے میں کوئی باک نہیں۔

سعد کی ماں نے کہا بیٹے بہت جلد (رسول اللہ ﷺ تک) جا پہنچ۔ بخدا تو نے دیر کردی تو پیچھے رہ گیا میں نے کہا سعد کی اماں سعد جو زرہ پہنے ہیں میں چاہتی ہوں کہ اس سے بڑی زرہ ان کے بدن پر ہو مجھے اندیشہ ہے کہیں ان کے (برہنہ حصہ پر) کوئی تیر نہ آلگے۔ سعد کی ماں نے کہا اللہ کا جو حکم ہوگا وہ پورا ہو کر رہے گا (آخر) سعد کے ایک تیر لگ گیا جس سے اکحل رگ کٹ گئی یہ تیر حبان بن قیس غرقہ عامری نے مارا تھا۔ سعد نے ابن غرقہ کو بددعا دی کہ اللہ تجھے دوزخ میں درد رسید کرے پھر کہا اے اللہ اگر تو نے قریش سے لڑائی آئندہ باقی رکھی ہو تو مجھے اس میں شریک ہونے کے لئے باقی رکھ کیونکہ کسی قوم سے لڑنے کی مجھے اتنی خواہش نہیں جتنی اس قوم سے لڑنے کی ہے جس نے تیرے رسول ﷺ کو ستایا اور جھٹلایا اور وطن سے نکالا اور اگر تو نے ہماری اور قریش کی لڑائی ختم کردی ہو تو اسی زخم کو میرے لئے سبب شہادت بنادے لیکن جب تک میری آنکھیں بنی قریظہ کی تباہی کو دیکھ کر ٹھنڈی نہ ہوجائیں مجھے موت سے محفوظ رکھ۔ دور جاہلیت میں حضرت سعد بن معاذ اور بنی قریظہ باہم حلیف اور معاہد تھے۔

مجاہد اور محمد بن اسحاق نے بحوالہ یحییٰ بن عباد بن عبداللہ بن زبیر عباد کا بیان نقل کیا ہے کہ حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب نے فرمایا، ہم حسان بن ثابت کی گڑھی میں تھیں حسان بھی عورتوں اور بچوں کے ساتھ موجود تھے، ہم نے دیکھا کہ ایک یہودی گڑھی کے آس پاس چکر لگا رہا ہے، اس وقت بنی قریظہ کی رسول اللہ ﷺ سے جنگ تھی (معاہدہ ٹوٹ چکا تھا) بنی قریظہ کے اور ہمارے درمیان کوئی محافظ موجود نہ تھا کہ یہودیوں کی ہماری طرف سے مدافعت کرسکتا کیونکہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کافروں کے مقابلہ میں مشغول جنگ تھے دشمن کی طرف سے منہ موڑ کر ہماری طرف متوجہ نہیں ہوسکتے تھے ایسی حالت میں وہ یہودی (گھومتا اور لوہ لیتا نظر) آیا تھا۔ میں نے حسان سے کہا حسان تم دیکھ رہے ہو کہ یہ یہودی گڑھی کے آس پاس چکر لگا رہا ہے مجھے اندیشہ ہے کہ یہ شخص کسی غیر محفوظ جگہ سے یہودیوں کو اندر لے آئے گا رسول اللہ ﷺ اور صحابہ مشغول مقابلہ ہیں (یہاں پہنچ کر ہماری مدد نہیں کرسکتے) تم گڑھی سے اتر کر جاؤ اور اس کو قتل کردو حسان نے کہا اے بنت عبدالمطلب اللہ آپ کی مغفرت کرے آپ تو واقف ہی ہیں کہ بخدا میں ایسا کرنے کا اہل نہیں ہوں جب میں نے حسان کا یہ جواب سن لیا اور سمجھ گئی کہ حسان کے اندر یہودی کو قتل کرنے کی بالکل جرأت نہیں ہے تو میں نے خود تہبند کسی اور خیمہ کی ایک میخ لے کر گڑھی سے نکلی اور اس کی گردن پر ایسی ماری کہ وہ مر گیا قتل کرکے گڑھی میں لوٹی تو میں نے حسان سے کہا اب تم جا کر اس کے کپڑے اور ہتھیار اتار لو یہ اجنبی مرد ہے اس لئے میں خود ایسا نہیں کرسکتی۔ حسان نے کہا بنت عبدالمطلب مجھے اس کے سامان کی ضرورت نہیں۔

میں کہتا ہوں بعض روایت میں آیا ہے کہ بنی قریظہ نے مدینہ پر شب خون مارنا چاہا تھا اور قریش سے اس کام کے لئے مدد کی خواہش کی تھی رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع ملی تو آپ نے سلمہ بن اسلم کی سیادت میں دو سو آدمیوں کو اور زید بن حارثہ کی قیادت میں تین سو آدمیوں کو مقرر کردیا کہ مدینہ کے مختلف مقامات اور گڑھیوں کی حفاظت رکھیں یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ عباد بن بشیر اپنے ساتھیوں کو لے کر ہر رات رسول اللہ ﷺ کے خیمہ کی چوکیداری کرتے تھے۔ مشرک چاہتے تھے کہ خندق کے پار آجائیں اور مسلمان سنگ باری کرکے اور تیر مار مار کر ان کو روک رہے تھے۔ اور رسول اللہ ﷺ خود بنفس نفیس بھی

چوکسائی رکھتے تھے۔

مسلم و بخاری نے صحیحین میں بیان کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ جب مدینہ میں تشریف لائے تو ایک رات کو بیدار رہے اور فرمایا کاش کوئی نیک مرد ایسا ہوتا جو میری چوکسائی کرتا اچانک ہم نے ہتھیاروں کی آواز سنی، حضور ﷺ نے فرمایا کون ہے؟ جواب ملا سعد ہے فرمایا کیوں آئے ہو؟ سعد نے کہا میرے دل میں رسول اللہ ﷺ کے متعلق ایک اندیشہ پیدا ہوا اس لئے میں حضور ﷺ کی چوکسائی کے لئے فوراً حاضر ہو گیا رسول اللہ ﷺ نے سعد کو دعا دی پھر سو گئے۔ ایک دوسری روایت میں آیا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا، خندق کے زمانہ میں جس روز سے سعد نے رسول اللہ ﷺ کی چوکسائی کرنی شروع کی تھی جب ہی سے مجھے سعد سے محبت ہو گئی تھی۔

خندق میں ایک مقام ایسا تھا جہاں سے کافروں کے عبور کر آنے کا اندیشہ تھا رسول اللہ ﷺ خود اس جگہ کی نگرانی کرتے تھے اور جب سخت سردی محسوس ہونے لگتی تو میرے پاس آجاتے اور مجھ سے (مل کر) گرمی حاصل کرتے پھر چلے جاتے اور چوکسائی کرنے لگتے تھے۔ اور فرماتے تھے مجھے صرف اس جگہ سے لشکر (کے گھس آنے) کا اندیشہ ہے ایک بار جو میرے پاس سردی سے سکون حاصل کرنے کیلئے آئے تو فرمایا کاش کوئی نیک مرد ایسا ہوتا جو آج رات میری چوکیداری کرتا کہ میں سو جاتا اچانک ہم نے ہتھیاروں کی آواز سنی۔ حضور ﷺ نے فرمایا کون ہے؟ جواب ملا سعد۔ سعد نے کہا ہم (لوگ) اس جگہ کی نگرانی کر رہے ہیں یہ جواب سن کر حضور ﷺ سو گئے۔ یہاں تک کہ میں نے آپ کی سانس کی آواز سن لی (یعنی خراٹے لینے لگے)۔

حضرت ام سلمہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ خود بنفس نفیس چوکسائی کرتے تھے اور سردی سخت ہوتی تھی ایک رات آپ نے اپنے ڈیرے میں نماز پڑھی پھر جا کر چوکسائی کرنے لگے اور فرمایا، مشرکوں کے سوار خندق کے گرد اگرد گھوم رہے ہیں پھر آواز دی عباد بن بشیر عباد نے جواب دیا حاضر یا رسول اللہ ﷺ فرمایا کیا تمہارے ساتھ کوئی ہے؟ عباد نے کہا جی ہاں میرے قبیلے کے کچھ لوگ چوکیداری کر رہے ہیں فرمایا اپنے قبیلے کے آدمیوں کو لے جاؤ خندق کے آس پاس کچھ مشرک موجود ہیں جو شبخون مارنا چاہتے ہیں جا کر ہماری طرف سے ان کی شرارت کو دور رکھو اور ان کو دور رکھنے کے لئے ہماری مدد کرو۔ فوراً عباد اپنے آدمیوں کو لے کر خندق کی طرف چلے گئے جا کر دیکھا کہ ابو سفیان اور کچھ دوسرے مشرک خندق کے تنگ مقام میں گھس آئے ہیں اور مسلمان تیر مار مار کر اور پتھر برسا کر ان کو روک رہے ہیں اتنے میں عباد جا پہنچے، عباد کا بیان ہے میں نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر ان لوگوں پر پتھر برسائے آخر شکست کھا کر مشرک بھاگ گئے پھر میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں واپس آیا، آپ نماز میں مشغول تھے نماز سے فارغ ہوئے تو میں نے واقعہ بیان کیا۔

حضرت ام سلمہؓ کا بیان ہے اس کے بعد رسول اللہ ﷺ سو گئے کہ میں نے آپ (کی سانس) کی آواز سن لی اور بلالؓ کی اذان فجر دینے تک بیدار نہیں ہوئے۔ اذان کے بعد باہر نکلے اور لوگوں کو نماز پڑھائی۔ حضرت ام سلمہؓ فرمایا کرتیں اے اللہ عباد بن بشیر پر رحمت نازل فرما۔

حضرت ام سلمہؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے خیمہ کے اندر سو رہے تھے آدھی رات ہوئی تو کچھ آوازیں اٹھیں میں نے سنا لوگ کہہ رہے تھے اے شہسواران خدا سوار ہو جاؤ۔ اس جہاد میں مہاجروں کا یہ امتیازی نعرہ (مقرر) تھا۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا۔ جب کافر رات کو تم پر چھاپہ ماریں تو تمہارا امتیازی نعرہ حٰمٓ لَا یُنْصَرُوْنَ ہونا چاہیے۔ دونوں روایتوں کے اختلاف کو اس طرح دور کیا جا سکتا ہے کہ یہ نعرہ انصار کا تھا اور پہلا نعرہ مہاجرین کا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نیند سے بیدار ہو کر خیمہ کے باہر تشریف لے گئے اور ملاحظہ فرمایا کہ کچھ لوگ جن میں عباد بن بشیر بھی تھے رسول اللہ ﷺ کے خیمہ کی چوکیداری کر رہے ہیں عباد سے دریافت فرمایا یہ آوازیں کیسی تھیں؟ حضور ﷺ نے عباد کو حکم دیا کہ جا کر خبر لاؤ عباد چلے گئے اور حضور ﷺ ان کا انتظار کرتے رہے کچھ دیر کے بعد عباد آگئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ عمرو بن عبدود مشرکوں کی ایک ٹولی لے کر مسلمانوں سے لڑ رہا ہے باہم تیر اندازی اور سنگ باری کر رہے ہیں یہ خبر سن کر رسول اللہ ﷺ خیمہ کے اندر تشریف لے

گئے اور ہتھیار اٹھا کر برآمد ہوئے پھر گھوڑے پر سوار ہو کر صحابہ کی ایک جماعت کو ساتھ لے کر میدان جنگ کی طرف روانہ ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد خوش خوش واپس آگئے اور فرمایا اللہ نے ان کی شرارت کو دفع کر دیا اور وہ بہت زخم کھا کر شکست پا کر بھاگ گئے اس کے بعد حضور ﷺ لیٹ کر سو گئے کہ مجھے آپ کے سانس کی آواز سنائی دینے لگی کچھ مدت کے بعد پھر دوبارہ آوازیں اٹھیں رسول اللہ ﷺ بیدار ہو گئے اور فرمایا عباد دیکھو یہ کیسی آوازیں ہیں، عباد گئے اور واپس آکر عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ضرار بن خطاب مشرکوں کا ایک ٹولہ لے کر مسلمانوں سے تیر اندازی اور سنگ باری کی جنگ کر رہا ہے، حضور مسلح ہو کر خیمہ سے برآمد ہوئے اور کافروں سے لڑتے رہے اسی میں صبح ہو گئی اور حضور ﷺ واپس آگئے اور فرمایا وہ لوگ بہت سے زخم کھا کر بھاگ گئے۔

حضرت ام سلمہؓ کا بیان ہے کہ میں غزوہ مریسیع، خیبر، حنین اور فتح مکہ کے زمانہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہی لیکن کوئی غزوہ بھی رسول اللہ ﷺ پر اتنا شاق اور دشوار نہیں گزرا جتنا غزوۂ خندق شدید گزرا اس غزوہ میں مسلمانوں کو بھی بہت زخم آئے اور زمانہ بھی یہ سخت سردی اور تنگ حالی کا تھا۔

روایت میں آیا ہے کہ ایک روز کافر جمع ہوئے اور پورے خندق کو گھیر لیا اور سخت لڑائی کی یہاں تک کہ سورج چھپ گیا اور رسول اللہ ﷺ کو کسی نماز کی فرصت نہیں ملی ظہر کی نماز بھی فوت ہو گئی اور عصر کی بھی اور مغرب کی بھی پھر عشاء کے وقت یہ نمازیں ادا کیں۔

ترمذی اور نسائی نے ابو عبیدہ کی روایت سے ان کے والد حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ خندق کی لڑائی کے دن مشرکوں نے رسول اللہ ﷺ کو چار نمازیں ادا کرنے کی فرصت نہیں دی جب حسب مشیت ایزدی رات کا کچھ حصہ گزر گیا تو حسب الحکم بلال نے اذان کہی پھر اقامت پڑھی پھر رسول اللہ ﷺ نے ظہر کی نماز ادا کی پھر بلال نے اقامت کہی اور رسول اللہ ﷺ نے عصر کی نماز ادا کی پھر بلال نے اقامت کہی اور رسول اللہ ﷺ نے مغرب کی نماز ادا کی پھر بلال نے اقامت کہی اور حضور ﷺ نے عشاء کی نماز پڑھی۔ ترمذی نے کہا اس حدیث کی سند میں کوئی اور خرابی نہیں صرف اتنی بات ہے کہ ابو عبیدہ نے یہ حدیث اپنے باپ سے نہیں سنی اس لئے یہ روایت منقطع ہے۔

نسائی نے سنن میں لکھا ہے کہ حضرت ابو سعید خدریؓ نے بیان کیا خندق کے دن ہم کو ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نمازوں کی فرصت نہیں مل سکی آخر اللہ نے ہمارا کام پورا کر دیا اسی کے متعلق اللہ نے آیت وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ نازل فرمائی۔ پھر رسول اللہ ﷺ نماز کے ارادے سے کھڑے ہوئے بلال نے اقامت کہی اور آپ نے اسی طرح ظہر کی نماز پڑھی جس طرح پہلے پڑھتے تھے، پھر اقامت کہی اور حسب سابق عصر کی نماز پڑھی پھر اقامت کہی اور عشاء کی نماز معمول سابق کے مطابق ادا کی۔ یہ واقعہ آیت فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا کے نزول سے پہلے کا ہے (اس آیت کے نزول کے بعد تو صلوٰۃ خوف کا حکم اور اس کا طریقہ بتا دیا گیا) ابن حبان نے اپنی صحیح میں یہ روایت بیان کی ہے لیکن صلوٰۃ عشاء کا اس میں ذکر نہیں کیا۔ کیونکہ نماز عشاء تو اپنے وقت میں ادا کی تھی لیکن دوسری روایت میں جو عشاء کی نماز کا بھی ذکر ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عشاء کی نماز بھی اپنے معمول سے موخر ہو گئی تھی۔

بزار نے حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ خندق کے دن رسول اللہ ﷺ چار نمازوں کی مشغولیت جنگ کی وجہ سے فرصت نہ پا سکے۔ ظہر، عصر، مغرب، عشاء یہاں تک کہ ایک پہر رات گزر گئی تو حضور ﷺ نے حضرت بلالؓ کو اذان دینے اور اقامت کہنے کا حکم دیا بلال نے اذان دی اور اقامت کہی حضور ﷺ نے ظہر کی نماز ادا کی پھر بلال کو حکم دیا اور انہوں نے اذان دی اور اقامت کہی حضور ﷺ نے عصر کی نماز پڑھی پھر بلال کو حکم دیا اور بلال نے اذان دی اور اقامت کہی اور حضور ﷺ نے مغرب کی نماز ادا کی۔ پھر حکم دیا اور بلال نے اذان دی اور اقامت کہی اور حضور ﷺ نے عشاء کی نماز ادا کی، اس کے بعد فرمایا، اس وقت روئے زمین پر کوئی قوم تمہارے سوا ایسی نہیں جو اللہ کی یاد کر رہی ہو۔ اس سند میں عبدالکریم بن ابی

الخارق راوی ہے جس کو ضعیف قرار دیا گیا ہے۔
صحیحین میں حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت سے آیا ہے کہ غروب آفتاب کے بعد حضرت عمر بن خطاب کفار قریش کو برا بھلا کہتے ہوئے آئے اور عرض کیا یارسول اللہ ﷺ میں تو (عصر کی) نماز بھی نہیں پڑھ سکا یہاں تک کہ اب سورج ڈوبنا ہی چاہتا ہے حضور ﷺ نے فرمایا، میں نے بھی ابھی نماز نہیں پڑھی اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہم بطحان میں اترے حضور ﷺ نے نماز کے لئے وضو کیا اور حضور ﷺ نے عصر کی نماز غروب آفتاب کے بعد پڑھی پھر نماز عصر کے بعد مغرب کی نماز پڑھی۔
صحیحین میں حضرت علیؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خندق کے دن فرمایا اللہ ان کے گھروں کو اور ان کی قبروں کو آگ سے اسی طرح بھر دے جس طرح انہوں نے غروب آفتاب تک ہم کو درمیانی نماز (عصر کی نماز) پڑھنے کی فرصت نہیں دی۔ مسلم کی روایت میں آیا ہے پھر عصر کی نماز حضور ﷺ نے مغرب و عشاء (کی نمازوں) کے درمیان پڑھی۔
واقعہ خندق کے متعدد ایام تھے اس لئے ممکن ہے کہ مختلف احادیث کا تعلق جدا جدا اوقات سے ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہی واقعہ سے تمام احادیث کا تعلق ہو۔ اختلاف احادیث کو دور کر کے سب کے درمیان موافقت پیدا کرنے کی تاویل مشکل نہیں۔
مسئلہ:۔ اگر چند نمازیں فوت ہو گئی ہوں تو پہلی نماز لوٹانے کے لئے اذان دی جائے (اور اقامت کہی جائے) پھر باقی نمازوں میں سے ہر نماز کی قضاء کے لئے صرف اقامت کہے۔ بہتر یہ ہے کہ ہر نماز کو لوٹانے کے وقت اذان بھی دی جائے اور اقامت بھی کہی جائے۔ بزار کی روایت کردہ حدیث سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔
جب مسلمانوں پر تکلیف بہت زیادہ ہو گئی تو رسول اللہ ﷺ نے کافروں کے لئے بددعا کی اور اللہ نے آپ کی دعا قبول بھی فرمائی، چنانچہ بخاری نے صحیح میں حضرت عبداللہ بن ابی اوفی کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے احزاب (وہ قبائل جو متفق ہو کر مدینہ پر چڑھ آئے تھے) کے لئے بددعا کی اور فرمایا اے اللہ اے کتاب نازل کرنے والے اے جلد حساب فہمی کرنے والے احزاب کو شکست دیدے اور ان کو جھنجوڑ دے (ان کے قدم اکھاڑ دے۔)
میں کہتا ہوں، حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے احزاب کے لئے تین روز تک مسجد فتح میں بددعا کی۔ بعض اقوال میں آیا ہے کہ دوشنبہ، سہ شنبہ اور چہار شنبہ کے دن بددعا کی، چہار شنبہ کے دن ظہر اور عصر کے درمیان اللہ نے آپ کی دعا قبول فرمائی اور ہم نے خوشی کے آثار چہرہ مبارک پر دیکھ لئے۔ راوی کا بیان ہے اس کے بعد جو مصیبت ہم پر آئی اور ہم نے اس ساعت میں (یعنی ظہر و عصر کے درمیان) اللہ سے دعا کی تو اللہ نے ہماری دعا ضرور قبول فرمائی۔
بغوی کا بیان ہے اس کے بعد نعیم بن مسعود بن عامر بن غطفان نے پوشیدہ طور پر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یارسول اللہ ﷺ میں مسلمان ہو گیا ہوں لیکن میری قوم والوں کو میرا مسلمان ہو جانا معلوم نہیں ہے اب آپ ہم کو جو چاہیں حکم دیں (ہم اس کی تعمیل کریں گے) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم ہماری جماعت میں تنہا ہو اگر کر سکتے ہو تو (ان جماعتوں میں پھوٹ ڈال دو اور) ایسا کر دو کہ ہماری طرف سے ان کا رخ مڑ جائے اور ایک جماعت دوسری کی مدد نہ کرے کیونکہ لڑائی خفیہ تدبیر (کا نام) ہے۔
میں کہتا ہوں دوسری روایت میں آیا ہے کہ نعیم نے عرض کیا تھا یارسول اللہ ﷺ مجھے یہ اجازت دے دیجئے کہ میں ان سے جو کچھ چاہوں کہوں (خواہ بات جھوٹی ہو) حضور ﷺ نے اجازت دے دی۔ اجازت پا کر نعیم بنی قریظہ کے پاس پہنچے (اسلام سے پہلے نعیم بنی قریظہ کے ہم نشین تھے۔) اور کہا اے بنی قریظہ تم واقف ہو کہ میں تمہارا خاص دوست ہوں۔ بنی قریظہ نے کہا تم نے سچ کہا، ہماری نظر میں تم مشکوک نہیں ہو۔ نعیم نے کہا تو سنو قریش اور غطفان لڑائی کے لئے آئے ہیں اور تم ان کے مددگار ہو لیکن ان کی حالت تمہاری حالت کی طرح نہیں ہے یہ شہر تمہارا شہر ہے اس میں تمہارا مال ہے اہل و عیال ہیں تم اس کو چھوڑ کر

دوسرے شہر کو نہیں جا سکتے رہے قریش و غطفان (وہ یہاں کے باشندے نہیں ہیں) ان کے مال اور اہل و عیال یہاں سے دور ہیں اگر کامیابی کا موقع اور مال غنیمت ان کے ہاتھ آ گیا تو بہتر ورنہ اپنے شہروں کو چلے جائیں گے اور تم کو اس شخص کے مقابلہ پر تنہا چھوڑ دیں گے اور یہ شخص تمہارے شہر میں رہتا ہے تنہا اس کا مقابلہ کرنے کی تم میں طاقت نہیں۔ مناسب یہ ہے کہ تم اعتماد حاصل کرنے کے لئے ان لوگوں کے کچھ سرداروں کو اپنی تحویل میں بطور رہن رکھ لو تاکہ وہ تم کو چھوڑ کر بھاگ نہ جائیں اگر وہ ایسا کرلیں تو ان کے ساتھ مل کر تم محمد سے لڑو اور کھل کر ان کا مقابلہ کرو اگر وہ ایسا نہ کریں تو سمجھ لو کہ ان کی نیت بری ہے۔ بنی قریظہ نے کہا تم نے صحیح مشورہ دیا۔ پھر نعیم یہاں سے نکل کر قریش کے پاس پہنچے اور ابوسفیان و سرداران قریش سے کہا تم لوگ جانتے ہو کہ میں تمہارا دوست ہوں اور محمد کے متعلق جو رائے رکھتا ہوں اس سے بھی تم واقف ہو مجھے ایک اطلاع ملی ہے۔ میں بطور خیر خواہی اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ وہ خبر تم تک پہنچا دوں لیکن اس کو پوشیدہ رکھنا قریش نے کہا ہم ایسا ہی کریں گے نعیم نے کہا تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ گروہ یہود اب اپنے کئے پر پشیمان ہیں اور محمد کے پاس انہوں نے پیام بھیجا ہے کہ ہم نے جو کچھ کیا ہم اس پر نادم ہیں اس کی تلافی میں اگر ہم قریش و غطفان کے کچھ سرداروں کو پکڑ کر تمہارے حوالے کر دیں تاکہ تم ان کی گردنیں اڑا دو تو کیا تم ہم سے راضی ہو جاؤ گے پھر ہم اور تم مل کر باقی لوگوں کا مقابلہ کریں گے محمد نے جواب میں کہلا بھیجا بہتر ہے بلا ہم اس شرط پر تم سے مصالحت کے لئے تیار ہیں لہٰذا یہودی اگر تمہارے پاس پیام بھیجیں اور تمہارے سرداروں کو اپنے پاس بطور گروی رکھنا چاہیں تو تم اپنا ایک آدمی بھی ان کے حوالے نہ کرنا۔ اس کے بعد نعیم غطفان کے پاس پہنچے اور کہا اے گروہ غطفان تم میرا کنبہ قبیلہ ہو اور میرے پیارے ہو میرا خیال ہے کہ تم مجھے مشکوک نہیں سمجھتے ہو بنی غطفان نے جواب دیا تم نے سچ کہا واقعی تم ہمارے دوست ہو نعیم نے کہا تو بات چھپی رکھنا (ظاہر نہ ہونے پائے) بنی غطفان نے کہا ایسا ہی کریں گے اس کے بعد نعیم نے جو بات قریش سے کہیں تھی وہی بنی غطفان سے بھی کہہ دی اور جس بات کا ان کو اندیشہ دلایا تھا اسی بات کا خوف بنی غطفان کو بھی دلایا۔

شنبہ کی رات ماہ شوال ۵ھ کو اللہ نے اپنے رسول ﷺ کی کارسازی اس طرح کی کہ ابوسفیان نے ورقہ بن غطفان اور عکرمہ بن ابی جہل کے ساتھ قبیلہ غطفان و قریش کے چند آدمیوں کو بنی قریظہ کے پاس بھیجا ان لوگوں نے جا کر بنی قریظہ سے کہا کہ ہم یہاں قیام کرنے تو آئے نہیں۔ ہمارے اونٹ اور گھوڑے ہلاک ہوئے جا رہے ہیں آپ لوگ لڑائی کے لئے تیار ہو جائیں تاکہ ہم کھل کر باہر نکل کر محمد سے جنگ کریں اور اس جھگڑے سے فارغ ہو جائیں جو ہمارا محمد سے ہے۔ یہودیوں نے پیام بھیجا آج سنیچر کا دن ہے سنیچر کے دن ہم کوئی کام نہیں کرتے ہم میں سے بعض لوگوں نے سنیچر کے دن کچھ بدعت کی تھی اس کی جو سزا ان کو ملی وہ تم سے پوشیدہ نہیں ہے پھر ایک بات یہ ہے کہ جب تک ہمارے پاس اپنے کچھ آدمی بطور رہن نہ چھوڑ دو گے ہم تمہارے ساتھ مل کر لڑنے والے نہیں ہیں اگر ایسا کرو گے تو ہم کھل کر محمد سے لڑیں گے ہم کو اندیشہ ہے کہ اگر لڑائی سے تم کو کچھ نقصان پہنچا اور جنگ کی شدت ہوئی تو تم ہم کو چھوڑ کر اپنے شہروں کو لوٹ جاؤ گے اور یہ لوگ ہمارے اسی شہر کے باشندے ہیں ہم تنہا ان سے لڑنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ قاصد جب بنی قریظہ کا یہ جواب لے کر لوٹے تو قریش و غطفان نے کہا تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ نعیم بن مسعود نے جو کچھ کہا وہ بالکل صحیح ہے اس کے بعد ان لوگوں نے بنی قریظہ کو کہلا بھیجا کہ اپنا ایک آدمی بھی ہم تمہارے قبضہ میں نہیں دیں گے اگر بلا شرط تم محمد سے لڑنا چاہتے ہو تو نکلو اور جنگ کرو قاصد یہ پیام لے کر بنی قریظہ کے پاس پہنچے تو انہوں نے کہا نعیم بن مسعود نے جو بات کہی تھی وہ بالکل سچ تھی یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اگر فتح کا ان کو موقع مل جائے تو اس کو غنیمت سمجھیں ورنہ سٹ کر اپنے شہروں کو چلے جائیں اور تم کو تمہارے گھروں میں اس شخص کے مقابل تنہا چھوڑ جائیں اس کے جواب میں بنی قریظہ نے قریش اور غطفان کو وہی پیام بھیجا کہ یا تو اطمینان کیلئے تم اپنے کچھ سرداروں کو ہمارے پاس بطور رہن چھوڑ دو لیکن قریش نے نہ مانا اس طرح اللہ نے ایک کو دوسرے کی مدد سے محروم کر دیا شدید سردی کی رات تھی اور بہت ہی سخت ٹھنڈک تھی اللہ نے ایک طوفانی ہوا بھیج دی جس سے کافروں کی (چڑھائی ہوئی) ہانڈیاں الٹ گئیں اور ہوا نے برتنوں کو پھینک دیا۔

رسول اللہ ﷺ کو کافروں کی پھوٹ کی اطلاع ملی تو رسول اللہ ﷺ نے حذیفہ بن یمان کو یہ بات معلوم کرنے کے لئے

بھیجا کہ رات کو کیا واقعہ ہوا؟ محمد بن اسحاق نے بوساطت یزید بن زیاد محمد بن کعب قرظی کا بیان نقل کیا ہے اور بعض اہل روایت نے ابراہیم تیمی کے والد کا قول بھی بیان کیا ہے دونوں کی روایت ہے کہ ایک کوفی جوان نے حضرت حذیفہ بن یمان سے دریافت کیا ابو عبداللہ کیا آپ (حضرات) نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا تھا اور حضور ﷺ کی صحبت میں رہے تھے حضرت حذیفہ نے فرمایا ہاں بھتیجے (ہم حضور ﷺ کے ساتھ رہے تھے) جوان نے کہا پھر تمہارا سلوک حضور ﷺ سے کیا تھا، حضرت حذیفہ نے فرمایا، ہم تیاری کرتے تھے جوان بولا اگر ہم اللہ کے رسول اللہ ﷺ کو پالیتے تو حضور ﷺ کو زمین پر پیدل نہ چلنے دیتے اپنی گردنوں پر اٹھائے رہتے اور آپ کی ہر وقت خدمت کرتے حضرت حذیفہ نے فرمایا، بھتیجے (تم کو کیا معلوم کہ وہ زمانہ کتنی مصائب کا تھا) خدا کی قسم وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے ہے کہ احزاب کی ایک رات کو ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ (اور انتہائی سخت سردی تھی) حضور ﷺ نے فرمایا کیا کوئی ایسا ہے کہ اٹھ کر جائے اور ہم کو ان لوگوں کی خبر لا کر دے جو کوئی ایسا کریگا، اللہ اس کو جنت میں داخلہ عطا فرمائے گا یہ بات سن کر (بھی) ہم میں سے کوئی نہیں اٹھا پھر رسول اللہ ﷺ نے دیر تک نماز پڑھی اور نماز کے بعد ہماری طرف رخ موڑ کر وہی پہلی بات فرمائی لیکن سب لوگ خاموش رہے ہم میں سے کوئی بھی نہیں اٹھا، حضور ﷺ پھر دیر تک نماز پڑھتے رہے اور نماز کے بعد فرمایا جو شخص اٹھ کر جائے گا اور دیکھ کر ہم کو آکر بتائے گا کہ ان لوگوں نے کیا کیا تو وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا، یہ سننے کے بعد بھی سخت سردی، سخت بھوک اور شدت خوف کی وجہ سے کوئی شخص بھی نہیں اٹھا جب کوئی نہیں اٹھا تو حضور ﷺ نے مجھے طلب فرمایا اور پکار کر کہا حذیفہ اب میرے لئے اٹھے بغیر کوئی چارہ نہ رہا، میں نے عرض کیا لبیک یا رسول اللہ ﷺ پھر اٹھ کر حضور ﷺ کے پاس پہنچا اس وقت سردی کی وجہ سے میرے دونوں پہلو کپکپا رہے تھے حضور ﷺ نے میرے سر اور چہرے پر ہاتھ پھیرا پھر فرمایا ان لوگوں کے پاس پہنچ کر ان کی خبر لاؤ لیکن میرے پاس پہنچنے تک کچھ (چھیڑ چھاڑ) کر نہ بیٹھنا اس کے بعد فرمایا اے اللہ آگے پیچھے دائیں بائیں اور اوپر نیچے سے اس کو اپنی حفاظت میں رکھ۔

میں نے اپنے تیر لئے ہتھیار باندھے اور پیدل ان کی طرف روانہ ہو گیا۔ نکلا ہی ہوں تو ایسا معلوم ہوا کہ حمام میں چل رہا ہوں ساری سردی غائب ہو گئی چلتے چلتے ان لوگوں کے اندر داخل ہو گیا۔ اللہ کے حکم سے ان لوگوں پر ایک ہوا کا طوفان اور فوجی لشکر آ گیا اور اللہ کے اس لشکر نے ان کے ساتھ ایسا سلوک کیا کہ ان کی ایک ہانڈی کو (چولہے پر) اور آگ کو (چولہے میں) اور ڈیرے چھولداری کو (زمین پر) قائم نہ رہنے دیا اس وقت ابو سفیان آگ کے پاس بیٹھا تاپ رہا تھا میں نے تیر نکالا کمان کے چلہ پر چڑھایا اور چھوڑنا چاہتا ہی تھا کیونکہ اگر اس وقت میں تیر چھوڑ دیتا تو ٹھیک ابو سفیان کے لگ جاتا۔ لیکن مجھے اللہ کے رسول کا یہ فرمان یاد آ گیا کہ کوئی حرکت نہ کر بیٹھنا جب تک میرے پاس واپس نہ پہنچ جائے۔ اس لئے میں نے تیر واپس نکال کر رکھ لیا۔ ابو سفیان نے جو یہ ہوا دیکھی تو کہا اے گروہ قریش تم میں سے ہر ایک اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی کا ہاتھ پکڑ لے اور دیکھ لے کہ وہ کون ہے؟ (تاکہ کوئی جاسوس ہمارے لشکر میں نہ گھس آئے۔ شناخت ہو جائے) یہ سن کر میں نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی کا ہاتھ پکڑ لیا اور پوچھا تو کون ہے؟ اس نے جواب دیا سبحان اللہ کیا تو مجھے نہیں جانتا میں فلاں بن فلاں ہوں وہ قبیلہ ہوازن کا آدمی تھا ابو سفیان نے کہا اے گروہ قریش تمہارے قیام کی یہ جگہ نہیں ہے (کہ ہمیشہ یہاں رہنا ہو) اونٹ اور گھوڑے ہلاک ہو گئے بنی قریظہ نے بھی ہم سے غداری کی اور ان کی طرف سے ہم کو وہ (پیام) ملا جو ہمارے لئے ناگوار تھا ادھر اس طوفان کی وجہ سے جو پیام ہم پر پڑی وہ تم لوگ دیکھ ہی رہے ہو لہٰذا کوچ کر چلو میں تو روانہ ہو رہا ہوں اس کے بعد ابو سفیان اٹھ کھڑا ہوا اور اونٹ کے پاس پہنچا اونٹ کے پاؤں میں اس وقت دھنگنا بندھا ہوا تھا (اور وہ بیٹھا ہوا تھا) ابو سفیان اس پر سوار ہو گیا اور اس کو مارا اونٹ فوراً تین ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا چوتھی ٹانگ کا دھنگنا کھڑا ہونے کی حالت میں کھولا گیا۔ میں نے سنا ہے کہ جو عمل قریش نے کیا وہی غطفان نے بھی کیا اور سب اپنے شہروں کو لوٹ پڑے میں رسول اللہ ﷺ کی طرف لوٹ آیا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں حمام میں چل رہا ہوں۔ خدمت گرامی میں پہنچا تو آپ اس وقت کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ جب آپ نے سلام پھیرا تو میں نے ان لوگوں کا واقعہ عرض کیا۔ حضور ﷺ ہنس پڑے اتنے کہ رات کی تاریکی میں (سفید چمکدار) کچلیاں نمودار ہو گئیں۔ جب میں اطلاع دے

چکا تو وہ سینک (جو اس آمد و رفت اور ٹوہ لگانے کے دوران حمام کی گرمی جیسی محسوس ہو رہی تھی) وہ بھی غائب ہو گئی (اور حسب سابق سردی محسوس ہونے لگی) حضور ﷺ نے مجھے اپنے قریب اپنے قدموں کے پاس کر لیا اور اپنے کپڑے کا ایک پلہ میرے اوپر ڈال دیا اور میرا سینہ اپنے تلووں سے چمٹا لیا اس طرح میں برابر سوتا رہا جب صبح ہو گئی تو حضور ﷺ نے فرمایا اے سونے والے اب اٹھ جا۔

میں کہتا ہوں ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے قتادہ کی روایت سے بیان کیا کہ جب مشرکوں کے لشکر پر اللہ نے ہوائی طوفان مسلط کر دیا اور اطراف لشکر میں فرشتوں نے تکبیر کہی (یعنی اللہ اکبر کا نعرہ لگایا) تو طلیحہ بن خویلد اسدی نے کہا (لوگو) محمد ﷺ نے تم پر جادو کرنا شروع کر دیا اس لئے تیزی کے ساتھ نکل جاؤ جلدی کرو یہ سنتے ہی بغیر لڑے لوگ بھاگ نکلے۔

میں کہتا ہوں شیخ عمادالدین ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے اگر رسول اللہ ﷺ رحمۃ للعالمین نہ ہوتے تو ہوا ہر کافر کو چورا چورا کئے بغیر نہ چھوڑتی جیسا عاد کی قوم کے ساتھ ریح عقیم نے کیا تھا۔

دوسری روایت میں آیا ہے کہ حضرت حذیفہ نے فرمایا جب میں کافروں کے لشکر کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کی طرف لوٹ تو آ رہا تھا تو راہ میں میں نے بیس سوار دیکھے جن کے عمامے سفید تھے انہوں نے مجھ سے کہا اپنے ساتھی سے جا کر کہہ دینا کہ اللہ نے تمہارا کام پورا کر دیا اور تمہارے دشمنوں کے شر کو دفع کر دیا۔

شیخین نے صحیحین میں حضرت جابرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے احزاب کے دن فرمایا ان لوگوں (یعنی لشکر کفار) کی خبر کون ہم کو لا کر دے سکتا ہے؟ حضرت زبیر نے کہا میں، حضور نے پھر فرمایا ان لوگوں کی خبر کون ہم کو لا کر دے سکتا ہے؟ حضرت زبیر نے کہا میں، تیسری بار پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ان لوگوں کی خبر ہم کو کون لا کر دے سکتا ہے؟ حضرت زبیر نے کہا میں، اس پر حضور ﷺ نے فرمایا ہر نبی کے حواری ہوتے ہیں اور میرا حواری زبیر ہے۔

بخاری نے صحیح میں لکھا ہے کہ حضرت سلیمان بن صرد نے فرمایا جب کافروں کی جماعتیں احزاب کے دن نکل کر چلی گئیں تو میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا (آئندہ) ہم ان سے جا کر جہاد کریں گے وہ آکر ہم سے نہیں لڑیں گے ہم ان کی طرف جائیں گے۔

صحیح بخاری میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے یہ بھی آیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کسی جہاد یا حج یا عمرہ سے لوٹ کر شہر میں پہنچتے تو تین بار اللہ اکبر کہہ کر فرماتے لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ لہ الملک و لہ الحمد وھو علی کل شئی قدیر ۔ ائبون تائبون عابدون ساجدون لربنا حامدون صدق اللہ وعدہ و نصر عبدہ و ھزم الاحزاب وحدہ۔

تنہا اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اس کا کوئی شریک نہیں اسی کی حکومت ہے اسی کیلئے ہر طرح کی حمد مناسب ہے وہی ہر چیز پر قابو رکھتا ہے ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں اسی کی طرف رجوع کرنے والے ہیں اسی کی عبادت اور سجدہ کرنے والے ہیں اپنے رب ہی کی ہم حمد کرنے والے ہیں اللہ نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اپنے بندہ کو فتح یاب کیا اور تمام جماعتوں کو تنہا شکست دے دی۔

محمد بن عمر کا قول ہے کہ جنگ خندق میں چھ مسلمان شہید ہوئے اور چھ مشرک بھی مارے گئے۔

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ جب کہ وہ تمہارے بالائی جانب سے تم پر آگئے یعنی مشرق کی طرف سے وادی کے بالائی جانب سے۔ یہ آنے والے بنی اسد بنی غطفان اور بنی قریظہ تھے مالک بن عوف نضری اور عیینہ بن حصین فزاری ایک ہزار غطفانیوں کو لے کر مشرق کی طرف سے چڑھ آئے تھے طلیحہ بن خویلد اسدی بھی قبیلہ بنی اسد کو لے کر ان کے ساتھ موجود تھا۔ بنی قریظہ کا لیڈر حیی بن اخطب تھا۔

وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ اور تمہارے نشیبی جانب سے یعنی بطن وادی سے مغرب کی طرف سے۔

مغرب کی طرف سے بنی کنانہ اور قریش اور ان کے ساتھی آئے تھے ابو سفیان ان کا کمانڈر تھا۔ اور ابو اعور عمرو بن سفیان سلمی خندق کی جانب تھا۔

وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ اور جب کہ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔

وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ اور کلیجے منہ کو آنے لگے تھے۔

خوف کی وجہ سے پھیپھڑے پھول جاتے اور پھیپھڑوں کے پھولنے کی وجہ سے دل اوپر کو حلق کی طرف اٹھنے لگتا ہے۔ کلیجے کامنہ کو آنا ایک مثل ہے جو شدت خوف کو ظاہر کرتی ہے۔

وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا۝ اور تم لوگ اللہ کے متعلق طرح طرح کے گمان کرنے لگے تھے۔ منافق گمان کرنے لگے تھے کہ اب محمد ﷺ کی اور مسلمانوں کی جڑ اکھڑ جائے گی اور پختہ ایمان والے اللہ کے وعدہ کو سچا جانتے تھے اور فتح و ظفر کا ان کو یقین تھا اور ضعیف الایمان لوگ تذبذب میں مبتلا ہو گئے تھے کہ جانے کیا ہو گا۔

هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا۝ اس موقع پر مسلمانوں کا امتحان لیا گیا اور ان کو سخت جھنجوڑی دی گئی۔ امتحان اس لئے لیا گیا کہ مخلص قوی ایمان والوں کو چھانٹ لیا جائے اور منافقوں کو اور کمزور ایمان والوں کو الگ کر دیا جائے۔

وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ اور جب کہ منافق کہہ رہے تھے۔

یہ منافق معتب بن قسیر اور عبداللہ بن ابی وغیرہ تھے۔

وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اور وہ لوگ بھی جن کے دلوں میں مرض تھا (کہہ رہے تھے) یعنی اعتقاد کی کمزوری اور بزدلی تھی۔

مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا۝ کہ ہم سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے جو وعدہ کیا تھا وہ محض دھوکہ تھا۔

بغوی نے لکھا ہے یہ قول اہل نفاق کا تھا منافقوں نے کہا تھا کہ محمد ﷺ ہم کو ملک شام و فارس کے محلات کی فتح کا وعدہ دے رہے ہیں باوجودیکہ ہماری حالت یہ ہے کہ ڈر کے مارے ہم میں سے کوئی بھی اپنے پڑاؤ سے ہٹ نہیں سکتا خدا کی قسم یہ وعدہ محض فریب ہے۔ ابن ابی حاتم نے بھی سدی کی روایت سے یہ واقعہ نقل کیا ہے اس روایت میں یہ قول ایک انصاری منافق بشیر بن معتب کا بیان کیا گیا ہے۔

وَاِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اور جب کہ ان (منافقوں) کی ایک پارٹی (یعنی اوس بن قیظی اور اس کے ساتھیوں) نے کہا۔

يٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ اے یثرب والو (یہاں) تمہارے قیام کا کوئی موقع نہیں۔

یثرب سے مراد ہے مدینہ، ابو عبیدہ نے کہا یثرب ایک قطعہ زمین کا نام ہے جس کے ایک حصہ میں مدینہ موصول واقع ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ بعض روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کو یثرب کہنے کی ممانعت فرمائی اور ارشاد فرمایا یہ طابہ ہے حضور ﷺ نے مدینہ کو یثرب کہنا اس لئے پسند نہیں فرمایا کیوں کہ یثرب کا لفظ ثَرَبَہٗ یَثْرِبُہٗ اور ثَرَّبَہٗ اور ثَرَّبَ عَلَیْہِ اور اَثْرَبَہٗ سے مشتق ہے (یعنی مادہ سب کا ایک ہے لیکن استعمال فعل یفعل اور تفعیل اور افعال سے ہوتا ہے) اور ثَرَّبَ ہویا اِثْرَاب یا تَثْرِیْب سب کا معنی ہے ملامت کرنا، عار دلانا، کسی جرم پر ذلیل کرنا اور مُثْرِب اس شخص کو کہتے ہیں جو بخشش میں دراز دست نہ ہو۔ (قاموس)۔ مقام یا اسم ظرف ہے ٹھہرنے کا موقع یا مصدر ہے (باب افعال کا)

فَارْجِعُوْا اس لئے (میدان جنگ سے گھروں کی طرف) لوٹ چلو محمد کی رفاقت چھوڑ دو۔ یا یہ مطلب ہے کہ اسلام پر تمہارا قیام نہیں ہو سکتا اس لئے شرک کی طرف لوٹ جاؤ۔ محمد ﷺ کی مدد چھوڑ دو تاکہ تم سالم رہو یا یہ مطلب ہے کہ یثرب میں تمہارا مقام نہیں ہو سکتا اس لئے اسلام اور محمد ﷺ کو چھوڑ دو تاکہ تم سالم رہو۔

وَيَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ اور ان میں کا ایک گروہ (یعنی قبیلۂ بنی حارثہ و بنی سلمہ) نبی سے اجازت مانگ رہا تھا۔

مع يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ کہ رہا تھا کہ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں یعنی ان پر دشمن حملہ کر سکتا ہے اور چور بھی آکر مال لے جا سکتے ہیں۔

وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ۝ باوجودیکہ وہ غیر محفوظ نہیں ہیں (جھوٹی باتیں بنا کر) وہ محض فرار ہونا چاہتے ہیں۔

وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَاٰتَوْهَا اور اگر مدینہ میں اس کے اطراف سے کوئی ان پر آگھسے پھر ان سے فتنہ کی درخواست کی جائے تو وہ ضرور فتنہ کے مرتکب ہو جائیں۔

دُخِلَتْ یعنی اگر مدینہ میں احزاب کا داخلہ ہو جائے۔

عَلَيْهِمْ ان پر یعنی ان کے گھروں میں۔

اَلْفِتْنَةَ یعنی شرک یا مسلمانوں سے جنگ۔

لَاٰتَوْهَا یعنی ضرور فتنہ کے مرتکب ہو جائیں۔

وَمَا تَلَبَّثُوْا بِهَا اِلَّا يَسِيْرًا ۝ اور ان گھروں میں بہت ہی کم ٹھیریں۔

یعنی صرف اتنی دیر توقف کریں کہ ان سے درخواست کی جائے اور وہ جواب دے دیں۔ اکثر اہل تفسیر نے یہی تفسیر کی ہے۔ بعض علماء نے کہا بہا کی ضمیر مدینہ کی طرف راجع ہے یعنی مدینہ میں صرف تھوڑی مدت ٹھیریں پھر ان کو جلاوطن کر دیا جائے یا ہلاک کر دیا جائے۔

وَلَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ حالانکہ (غزوۂ خندق سے) پہلے انہوں نے اللہ سے معاہدہ کیا تھا کہ پیٹھ نہیں دکھائیں گے۔ یعنی میدان سے نہیں بھاگیں گے۔

یزید بن رومان کا بیان ہے کہ جنگ احد کے دن بنی حارثہ نے ارادہ کیا کہ بنی سلمہ کو قتل کر دیں گے لیکن جب ان کے حق میں آیت کا نزول ہوا تو انہوں نے عہد کیا کہ آئندہ ایسی بات نہیں کریں گے۔

قتادہ نے کہا کچھ لوگ غزوۂ بدر سے غیر حاضر تھے لیکن جب (لڑائی کے بعد) انہوں نے اہل بدر کی خدا داد عزت و برتری دیکھی تو کہنے لگے کہ آئندہ اگر اللہ نے ہم کو کسی لڑائی میں شریک ہونے کی توفیق دی تو ہم ضرور ضرور لڑیں گے انہی لوگوں کی طرف اللہ نے آیت مذکورہ میں اشارہ کیا ہے۔

وَكَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْئُوْلًا ۝ اور اللہ سے کئے ہوئے عہد کی باز پرس ہوگی یعنی پوچھا جائے گا کہ پورا کیوں نہیں کیا مطلب یہ کہ عہد خدا کی خلاف ورزی کی سزا دی جائے گی۔

قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ (اے محمد ﷺ) آپ کہہ دیجئے کہ اگر (میدان جنگ سے) تم بھاگو گے تو یہ فرار موت یا قتل سے (بچانے کے لئے) تمہارے لئے مفید نہ ہوگا کیونکہ جس کا وقت مقرر آگیا وہ ضرور مرے گا قتل ہو یا اپنی معمولی موت سے مرے اور مقرر وقت نہیں آیا تو موت (کسی طرح) نہیں آئے گی۔

وَاِذًا لَّا تُمَتَّعُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ اور ایسی حالت میں بجز تھوڑے سے یا تھوڑے دنوں کے فائدہ سے زیادہ متمتع نہیں ہو سکتے یعنی دنیا میں زندہ رہ کر تم تھوڑی مدت تک یا تھوڑا سا مزہ حاصل کر سکو گے (زیادہ مدت فائدہ اندوز نہ ہو سکو گے) آیت کا مطلب یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اگر بالفرض میدان جنگ سے فرار تمہارے لئے مفید بھی ہو تو یہ فائدہ زیادہ مدت تک باقی نہیں رہے گا کیونکہ دنیا بہر حال فناپذیر ہے۔

قُلْ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَعْصِمُكُمْ مِّنَ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَ بِكُمْ سُوْٓءًا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً ؕ آپ کہہ دیجئے وہ کون ہے جو تم کو اللہ سے بچاسکے اگر وہ تمہارے ساتھ برائی کرنا چاہے یا وہ کون ہے جو خدا کے فضل کو تم سے روک سکے اگر وہ تم پر فضل کرنا چاہے۔

سُوْٓءًا سے مراد ہے عذاب اَوْ اَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً سے پہلے جملہ محذوف ہے جس کا ذکر ترجمہ میں کردیا گیا ہے۔ عرب کہتے ہیں متقلدا سیفاو رمحا یوں کہا جائے (کہ رحمت اگرچہ بری چیز نہیں جس سے بچاؤ کیا جائے لیکن) بچاؤ کے اندر روکنے کا مفہوم ہے تو گویا بچانے سے مراد ہو اروکنا (ہم نے بھی یَعْصِمُ کا ترجمہ روک سکتا ہے کیا ہے)

وَلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ⑰ اور وہ بجز خدا کے اپنے لئے نہ کارساز پائیں گے نہ مددگار۔

وَلِيًّا کارساز، نفع رساں، قرابتدار

نَصِيْرًا مددگار برائی کو دفع کرنے والا۔

قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الْمُعَوِّقِيْنَ مِنْكُمْ وَالْقَآئِلِيْنَ لِاِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ اِلَيْنَا ۚ اور اللہ تم میں سے ان لوگوں کو جانتا ہے جو مانع ہوتے ہیں اور اپنے (نسبی یا وطنی) بھائیوں سے کہتے ہیں کہ ہمارے پاس آجاؤ۔

اِخْوَان سے مراد ہیں مدینہ کے باشندے یعنی ہمارے پاس آجاؤ محمد ﷺ کا ساتھ چھوڑ دو ان کے ساتھ مل کر جنگ نہ کرو ہم کو تمہارے مارے جانے کا اندیشہ ہے۔ عَائِق موڑ دینے والا عوق پھیر دینا عائق سے مراد ہوتا ہے خیر سے مانع یہاں مُعَوِّقِيْنَ سے مراد وہ منافق ہیں جو لوگوں کو رسول اللہ ﷺ کا ساتھ دینے اور آپ کے ہمراہ رہنے سے روکتے۔ قتادہ نے کہا یہ لوگ منافق تھے جو انصار کو رسول اللہ کا ساتھ دینے سے روکتے تھے اور اپنے بھائی بندوں سے کہتے تھے محمد اور ان کے ساتھی گوشت (کی طرح) ہیں۔ ابوسفیان اور اس کے ساتھی ان کو لقمہ بنالیں گے۔ یہ شخص تو تباہ ہونے والا ہی ہے اس کو چھوڑ دو۔

مقاتل کا بیان ہے کہ یہودیوں نے منافقوں کے پاس پیام بھیجا اور کہا تم ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھوں سے اپنے آپ کو کیوں قتل کرانا چاہتے اس بار اگر ابوسفیان اور اس کے ساتھی قابو پاگئے تو تم میں سے ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے تم لوگ ہمارے بھائی ہو ہمارے ہمسائے ہو ہم کو تمہارے متعلق (عام ہلاکت کا) اندیشہ ہے۔ ہمارے ساتھ آملو (تو ہلاکت سے بچ جاؤ گے) یہ پیام سن کر عبداللہ بن ابی اپنے ساتھیوں کو لے کر مومنوں کی طرف متوجہ ہوا ان کو (شرکت جنگ سے) روکنے لگا اور ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کا خوف مسلمانوں کے دلوں میں بٹھانے لگا۔ ان منافقوں نے مسلمانوں سے کہا اگر ابوسفیان وغیرہ نے تم پر قابو پالیا تو تم میں سے ایک کو بھی جیتا نہیں چھوڑیں گے۔ تم کو محمد ﷺ سے کیا لالچ ہے ان کے پاس تو خیر نہیں ہے بس وہ تو ہم کو قتل کرانا چاہتے ہیں۔ ہمارے ساتھ مل کر ہمارے بھائیوں یعنی یہودیوں کے پاس چلے چلو۔ منافقوں کے اس اغواء سے مسلمانوں کے ایمان میں کوئی کمزوری نہیں آئی بلکہ ایمان کی پختگی اور ثواب کی امید اور بڑھ گئی۔ اسی کے متعلق آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَلَا يَاْتُوْنَ الْبَاْسَ اِلَّا قَلِيْلًا ⑱ اور منافق لڑائی میں صرف تھوڑی دیر کے لئے شریک ہوتے ہیں۔

کیونکہ وہ (طرح طرح کی) عذر تراشی کرتے اور جہاں تک ممکن ہوتا مؤمنوں کو بھی روکتے تھے۔

یا یہ مطلب ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ میدان جنگ کی طرف نکلتے تو تھے ان کا مقصد صرف دکھاوٹ اور بناوٹ تھا لڑتے نہیں تھے اگر لڑنا ہی پڑ گیا تو خفیف حصہ لیتے تھے ان کو ثواب کی امید ہی نہ تھی اگر یہ خفیف شرکت جنگ بھی بوجہ اللہ ہوتی تو اللہ اس کا کثیر ثواب عطا فرمادیتا اور قلیل کو کثیر قرار دے دیتا مگر ان کی قلیل شرکت بھی دکھاوٹ اور نمود کے لئے تھی۔ بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ یہ آیت منافقوں کے کلام کا تتمہ ہے مطلب یہ ہے کہ محمد اور ان کے ساتھی جنگ خندق زیادہ جاری

نہیں دکھ سکیں گے اور لڑائی میں تھوڑی ہی دیر رک سکیں گے۔

اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ ۚ تمہارے حق میں سخت بخیلی لئے ہوئے۔

یعنی تمہاری مدد کرنے میں یا راہ خدا میں مال صرف کرنے میں یا تمہاری فتح اور مال غنیمت حاصل ہو جانے میں بڑے کنجوس ہیں (یعنی تمہاری مدد اور راہ خدا میں خرچ کرنا نہیں چاہتے اور تمہاری فتح ان کو گوارا نہیں ہے) اَشِحَّةً شَحِيحٌ کی جمع ہے۔

فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۚ

پھر جب خوف پیش آتا ہے تو آپ ان کو دیکھتے ہیں کہ وہ آپ کی طرف اس طرح دیکھنے لگتے ہیں کہ ان کی آنکھیں چکرائی جاتی ہیں جیسے کسی پر موت کی بے ہوشی طاری ہو۔

تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ یعنی خوف کے مارے حلقوں کے اندر ان کی آنکھیں چکرانے لگتی ہیں۔

كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ میں مشبہ بہ یا مد ہوش ہونے والے کی نظر ہے یعنی كَنَظَرِ الَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ یا مشبہ بہ آنکھوں کا چکراتا ہے یعنی كَدَوَرَانِ عَيْنِ الْمُغْشٰى عَلَيْهِ یا مشبہ بہ دونوں وصف ہیں بے ہوش ہونے والے کی نظر اور آنکھوں کا چکراتا۔ یا مشبہ بہ بے ہوش ہونے والے کی آنکھیں ہیں جب موت کے اسباب چھا جاتے ہیں اور موت کے پسینے آنے لگتے ہیں تو حواس معطل ہو جاتے ہیں عقل زائل ہو جاتی ہے آنکھیں متحیر ہو جاتی ہیں اور ٹکٹکی بندھ جاتی ہے۔

فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ پھر جب وہ خوف دور ہو جاتا ہے تو تم کو تیز تیز زبانوں سے طعنے دیتے ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا یعنی تمہاری تنقیص کرتے ہیں تمہاری غیبت کرتے ہیں۔ بعض اہل تفسیر نے کہا سَلَقُوْكُمْ سے مراد ہے دکھ پہنچانا یعنی تم کو اذیت پہنچاتے ہیں اور حالت امن میں زبان کے تیر تم پر چلاتے ہیں۔ قتادہ نے کہا مال غنیمت کی تقسیم کے وقت تم سے زبان درازی کرتے ہیں اور کہتے ہیں ہم لڑائی میں تمہارے ساتھ تھے۔ تم ہم سے زیادہ مال غنیمت کے حقدار نہیں ہو۔

اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ ۭ مال پر حرص لئے ہوئے۔

اُولٰٓئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا وہ (خلوص نیت کے ساتھ شریک) مومن نہیں تھے۔

فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ ۭ اس لئے اللہ نے ان کے اعمال اکارت کر دیئے یعنی اخلاص اور حسن نیت نہ ہونے کی وجہ سے ان کے اعمال کا اعتبار نہیں کیا۔ اعمال نیتوں کے ساتھ ہوتے ہیں (کذا فسرہ مجاہد)

وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝ اور یہ (اعمال کی بربادی) اللہ کے لئے آسان ہے کیونکہ ارادۂ الٰہیہ کا کسی چیز سے متعلق ہو جانا ہی اس چیز کے وجود کے لئے کافی ہے اس کے فعل کو کوئی رد نہیں کر سکتا۔

يَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ يَذْهَبُوْا ۚ وہ خیال کر رہے ہیں کہ قبائل (عرب جو حملہ کرنے آئے تھے ابھی) نہیں گئے ہیں۔

اسی لئے یہ لوگ بھاگ کر مدینہ کے اندر گھس گئے۔

وَاِنْ يَّاْتِ الْاَحْزَابُ يَوَدُّوْا لَوْ اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِي الْاَعْرَابِ اور اگر وہ گروہ (دوبارہ) آجائیں تو پھر تو یہ یہی پسند کریں کہ کاش ہم دیہاتیوں میں باہر صحراء میں جا رہیں۔

يَسْاَلُوْنَ عَنْ اَنْۢبَاۗىِٕكُمْ ۭ (مدینہ سے آنے والوں سے) تمہاری خبریں پوچھتے رہیں۔ (کہ مسلمانوں کا کیا ہوا)

وَلَوْ كَانُوْا فِيْكُمْ مَّا قٰتَلُوْٓا اِلَّا قَلِيْلًا ۝ۧ اور اگر وہ تمہارے اندر شامل رہتے (اور بھاگ نہ جاتے اور لڑائی ہوتی) تب بھی تھوڑا ہی قتال کرتے (یعنی محض دکھاوٹ کے لئے اور عار سے بچنے کے لئے بہت کم ہی لڑتے زیادہ قتال نہ کرتے)

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ تمہارے لئے رسول اللہ ﷺ (کی سیرت میں) اسوۂ حسنہ (عمدہ نمونہ) موجود ہے۔

اُسْوَة بمعنی قُدْوَة یعنی وہ طریقہ جس کی اقتدا کی جائے، اس جگہ مراد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت میں تمہارے لئے خصائل حمیدہ موجود ہیں جو تمہارے لئے واجب العمل ہیں مثلاً لڑائی میں ثابت قدم رہنا اور شدائد کو برداشت کرنا۔

یا یہ مطلب ہے کہ رسول اللہ ﷺ تمہارے مقتدا ہیں تمہارے لئے ان کی اقتدا ہی مناسب ہے۔ یہ مطلب عربی محاورہ کے موافق ہے عرب کہتے ہیں فی البیضۃ عشرون منا حدید یعنی خود میں بیس سیر لوہا ہے[1]۔ بعض نے کہا اُسْوَة بروزن فُعْلَة ایتساء (باب افتعال) سے مشتق ہے جیسے قدوہ اقتداء سے بنا ہے یہ اسم ہے جو مصدر کا قائم مقام ہے یعنی تم لوگوں کے لئے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اچھی ہمدردی (لازم) ہے۔ جیسے رسول اللہ ﷺ نے دین کی مدد کی تم بھی ویسی ہی دین کی مدد کرتے رہو۔ ان کا دانت جنگ میں ٹوٹا، چہرہ زخمی ہوا، ان کے چچا شہید ہوئے، ان کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچائی گئیں مگر انہوں نے ہر دکھ پر صبر کیا اور تمہاری ہمدردی کی لہٰذا تم بھی ان کی طرح مصائب و شدائد پر صبر رکھو اور ان سے ہمدردی کرو اور ان کے طریقہ پر چلو۔

لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ اس شخص کے لئے جو اللہ اور روز آخرت کی امید رکھتا ہے یعنی اللہ کے ثواب اس کی ملاقات اور نعمت آخرت کا امیدوار ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے آیت کی یہی تفسیر فرمائی۔

بعض اہل علم نے کہا اللہ سے مراد ہے ایام اللہ یعنی ان لوگوں کے لئے جو ایام اللہ خصوصاً روز آخرت کی امید رکھتے ہیں جیسے عرب کہتے ہیں ارجو زیدا و فضلہ میں زید سے امید رکھتا ہوں خصوصاً اس کی مہربانی کی۔ مقاتل نے ترجمہ کیا جو اللہ سے ڈرتا ہے اور روز حشر سے جب کہ اعمال کا بدلہ ملے گا (گویا مقاتل کے نزدیک آیت میں رجاء بمعنی خوف ہے)

وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا ۝ اور اللہ کی بہت یاد کرتا ہے۔

دکھ میں بھی اور سکھ میں بھی کثرت ذکر دوام طاعت کا سبب ہے اسی لئے رجاء کے ساتھ کثرت ذکر کا ذکر کیا۔ رسول اللہ ﷺ کی اقتداء کرنے والا وہی ہو سکتا ہے جو امید بھی رکھتا ہو اور اللہ کا ہمیشہ اطاعت گزار بھی ہو۔

وَلَمَّا رَأَى الْمُؤْمِنُونَ الْأَحْزَابَ قَالُوا هَٰذَا مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَصَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ اور جب ایمان والوں نے (کافروں کے) لشکروں کو دیکھا تو کہنے لگے یہ وہی ہے جس کا وعدہ اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ فرمایا تھا۔ وعدہ سے اشارہ سورۂ بقرہ کی اس آیت کی طرف ہے۔ أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ سے أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ۔ اس آیت میں صراحت ہے کہ مسلمانوں کا کڑا امتحان لیا جائے گا، بڑی شدائد ان پر آئیں گی (لیکن آخر میں اللہ ان کی مدد کرے گا اور اللہ کی مدد قریب ہی ہے) شاید رسول اللہ ﷺ نے واقعہ احزاب کی اطلاع پہلے سے ہی دے دی ہو۔

وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَانًا وَتَسْلِيمًا ۝ اور (کافروں کی اس لشکر کشی نے) مومنوں کے ایمان اور

---

[1] حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ حضرت عمرؓ نے حجر اسود پر سر جھکا کر فرمایا میں بلا شبہ جانتا ہوں کہ تو پتھر ہے لیکن اگر میں نے اپنے پیارے ﷺ کو تجھے بوسہ دیتے اور چومتے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھے نہ چومتا نہ بوسہ دیتا۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

یعلی بن منیہ کا بیان ہے میں نے حضرت عمر کے ساتھ طواف کیا جب میں حجر کے متصل دروازہ کے پاس رکن کے قریب پہنچا تو میں نے حضرت عمر کا ہاتھ پکڑ لیا تاکہ آپ بھی چوم لیں۔ حضرت عمر نے فرمایا کیا تم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ طواف نہیں کیا؟ میں نے جواب دیا کیوں نہیں حضرت عمر نے فرمایا تو کیا تم نے رسول اللہ ﷺ کو اس کو چومتے دیکھا ہے میں نے کہا نہیں۔ فرمایا تو پھر اپنے سے اس کو دور رکھو لک فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔

تسلیم کو اور پختہ کر دیا۔

ایمان سے مراد ہے رسول اللہ ﷺ کے قول کی تصدیق اور تسلیم سے مراد ہے اللہ کے حکم اور تقدیر کے سامنے سر جھکا دینا (اپنے آپ کو امر اور قضاء الٰہی کے سپرد کر دینا)

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ مؤمنوں میں سے وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ سے کئے معاہدہ کو سچا کر دیا (یعنی سچ کر دکھایا)

اللہ کے رسول سے انہوں نے معاہدہ کیا تھا کہ ہم معرکہ جنگ میں آپ کے ساتھ ثابت قدم رہیں گے اور آپ کی معیت میں کافروں سے لڑیں گے عرب کہتے ہیں صَدَقَنِی اس نے مجھ سے سچ کہا۔ صَدَقُوْا بھی اسی محاورہ سے ماخوذ ہے وعدہ پورا کرنے والا اپنے وعدہ کو سچا ثابت کر دیتا ہے (کہ جو کچھ میں نے معاہدہ کیا تھا دیکھو اس کو پورا کر دیا)

فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ پس ان میں سے کچھ لوگوں نے تو اپنی نذر پوری کر دی اور عہد کو کامل طور پر پورا کر دیا اب کئے ہوئے وعدہ کا کوئی بار اس پر باقی نہیں رہا مطلب یہ کہ اس نے جہاد و طاعت پر صبر کیا یہاں تک کہ شہید ہو گیا یا مر گیا۔

نَحْبٌ کا معنی نذر بھی ہے اور موت بھی۔ قَضٰى نَحْبَهٗ اس نے اپنی میعاد زندگی پوری کر لی یعنی مر گیا۔ نَحْب اگر بمعنی موت لیا جائے تو یہ مطلب ہو گا کہ اس نے اپنا عہد پورا کر دیا اور اسی حالت میں اس کی موت آ گئی جیسے حضرت حمزہ وغیرہ تھے۔

بعض علماء کے نزدیک قَضٰى نَحْبَهٗ کا یہ معنی ہے کہ اس نے ایفاء عہد کے لئے اپنی پوری کوشش صرف کر دی۔ عرب کہتے ہیں نحب فلان فی مسیرۃ یومہ ولیلتہ اس نے شب و روز چلنے میں اپنی پوری کوشش خرچ کر دی۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ اور کچھ ان میں سے وہ ہیں جو انتظار کر رہے ہیں یعنی نذر سے فارغ ہونے کا انتظار کر رہے ہیں اور وفاء عہد پر مر جانے کے امیدوار ہیں۔

وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا اور انہوں نے (کئے ہوئے عہد میں) کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی۔

شیخین، ترمذی، ابن ابی شیبہ، ابوداؤد ابن سعد اور بغوی نے حضرت انسؓ بن مالک کی روایت سے بیان کیا کہ انس بن مالک کے چچا حضرت انس بن نضر بدر کی لڑائی سے غیر حاضر رہے تھے ان کو یہ بات بڑی تکلیف دہ تھی اس لئے انہوں نے کہا تھا کہ سب سے پہلا معرکہ جس میں رسول اللہ ﷺ موجود تھے اور میں غیر حاضر رہا۔ (بڑے افسوس کی بات ہے) آئندہ اگر اللہ نے مشرکوں سے جنگ کرنے میں مجھے حاضر ہونے کی توفیق دی تو میری کارگزاری اللہ دیکھ لے گا چنانچہ احد کے دن جب مسلمانوں کو شکست ہوئی تو حضرت انس بن نضر نے کہا اے اللہ ان لوگوں نے یعنی ساتھیوں نے جو کچھ کیا میں تیرے سامنے اس کا عذر خواہ ہوں اور انہوں نے (یعنی مشرکوں) نے جو کچھ کیا اس سے تیرے سامنے اظہار بیزاری کرتا ہوں کچھ انصار و مہاجرین نے اپنے ہتھیار اپنے ہاتھوں سے پھینک دیئے تھے (اور فکر و غم میں ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے) حضرت ابن نضر ان کے پاس پہنچے اور کہا یہاں آپ لوگ کیوں بیٹھے ہیں۔ صحابہ نے جواب دیا رسول اللہ ﷺ شہید ہو گئے۔ ابن نضر نے کہا رسول اللہ ﷺ کے بعد جی کر کیا کرو گے اٹھو اور جس دین کی خاطر رسول اللہ شہید ہوئے تم بھی اسی پر مر جاؤ اس کے بعد مشرکوں کی فوج کی طرف رخ کر کے چل دیئے احد سے ورے حضرت سعد بن معاذ سے ملاقات ہوئی سعد نے کہا میں آپ کے ساتھ ہوں۔

حضرت سعد کا بیان ہے کہ انس کافروں کی طرف متوجہ ہوئے اور وہ کام کیا جو میں نہیں کر سکا مجھ سے کہا سعد (دوسری روایت میں آیا ہے کہ حضرت انس نے کہا اے ابو عمرو) ہا ہا یہ جنت کی ہوا ہے قسم ہے رب نضر کی مجھے احد کے قریب جنت کی ہوا محسوس ہو رہی ہے پھر آگے بڑھے اور اتنا لڑے کہ شہید ہو گئے آپ کے جسم پر تلوار تیر اور بھالے کی ضربوں کے کچھ اوپر اسی زخم لوگوں نے پائے۔ حضرت انس بن مالک کا بیان ہے آپ کی لاش کو کافروں نے مثلہ کر دیا تھا (یعنی ناک کان پیشاب گاہ کو کاٹ

ڈالا تھا) لوگوں نے لاش کو شناخت بھی نہیں کیا صرف آپ کی بہن بنانہ نے انگلیوں کے پورے دیکھ کر پہچانا۔ ہمارا خیال تھا کہ آیت رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ حضرت انس بن نضر اور ان جیسے لوگوں کے حق میں ہی نازل ہوئی تھی۔

بغوی کی روایت ہے کہ حضرت خباب بن ارت نے فرمایا ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہجرت کی ہم میں سے بعض لوگ تو چلے گئے (مر گئے) اور اپنی کوشش کا کوئی پھل (دنیا میں) نہ کھا پائے جن میں سے ایک مصعب بن عمیر بھی تھے احد کے دن شہید ہو گئے تو سوائے ایک نمدہ کے اتنا کپڑا نہ تھا کہ ہم ان کو کفن دے سکتے، نمدہ بھی اتنا تھا کہ سر چھپاتے تھے تو قدم کھلے رہتے تھے اور پاؤں پر ڈالتے تھے تو سر کھلا رہتا تھا حضور ﷺ نے فرمایا سر پر ڈال دو اور پاؤں کو اذخر (ایک قسم کی گھاس مرچیا گند) سے چھپا دو اور کچھ لوگوں کی کوشش کا پھل پختہ ہو گیا جس کو (دنیا میں) وہ کھا سکے۔

ترمذی نے حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ (ایک بار) رسول اللہ ﷺ نے حضرت طلحہ بن عبید اللہ کو دیکھ کر فرمایا جو شخص پسند کرتا ہو کہ روئے زمین پر (زندہ) چلتے پھرتے ایسے آدمی کو دیکھے جس نے اپنی نذر پوری کر دی ہے (اور جنتی ہو گیا ہے) تو وہ اس کو دیکھ لے۔

بخاری کا بیان ہے کہ قیس بن حازم نے فرمایا میں نے حضرت طلحہ کا (ایک) ہاتھ شل دیکھا جنگ احد کے دن رسول اللہ ﷺ کو کافروں کے حملے سے انہوں نے اس ہاتھ کے ذریعہ محفوظ رکھا تھا (جس کی وجہ سے ہاتھ اتنا زخمی ہو گیا کہ شل ہو گیا)[1]

لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ تاکہ اللہ سچوں کو ان کی سچائی کا بدلہ عطا فرمائے۔ یا ان کی سچائی کے سبب ثواب عنایت کرے۔ صِدْق سے مراد ہے عہد کا پورا کرنا۔

وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اور منافقوں کو اگر چاہے تو عذاب دے یا ان کو توبہ کی توفیق عطا فرما دے۔ یعنی اگر اللہ کو منظور ہو کہ منافق کفر پر ہی مر جائیں تو ان کو عذاب دے اور اگر وہ چاہے کہ منافق توبہ کر لیں اور مخلص الایمان ہو جائیں تو ان کو توبہ کی توفیق عطا فرما دے۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۚ بے شک اللہ (توبہ کرنے والے کو) بہت بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔

وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ اللہ نے کفار (قریش و غطفان) کو غصہ میں بھرا ہوا لوٹا دیا۔ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سے مراد ہیں کفار قریش و بنی غطفان وہ اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہو سکے اس لئے غصہ میں بھرے ہوئے لوٹ گئے۔

لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ۭ انہوں نے کوئی بھلائی نہیں پائی یعنی نہ فتح ملی نہ مال۔

وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ۭ اور (ہوائی طوفان و ملائکہ کو بھیج کر) اللہ نے مؤمنین کی جنگ میں پوری پوری مدد کی۔

وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ۚ اور اللہ ہے قوی غالب یعنی اللہ کا اقتدار قوی ہے وہ اپنے ملک میں جیسا چاہتا ہے کرتا ہے اور (نافرمانوں سے) انتقام لینے میں غالب ہے۔

---

[1] عیسیٰ بن طلحہ کا بیان ہے میں اور عائشہ بنت طلحہ (یعنی میری بہن) ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کے پاس گئے عائشہ بنت طلحہ حضرت اسماء بنت صدیق اکبر سے کہنے لگیں میں آپ سے اور میرے باپ آپ کے باپ سے افضل ہیں۔ حضرت اسماء عائشہ بنت طلحہ کو برا بھلا کہنے لگیں اور بولیں تم مجھ سے افضل ہو حضرت عائشہ نے فرمایا میں تم دونوں کا جھگڑا طے کر دوں؟ دونوں نے کہا کیوں نہیں حضرت عائشہ نے فرمایا ایک بار ابوبکر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضور ﷺ نے فرمایا تم دوزخ سے آزاد ہو اسی روز سے حضرت ابوبکر کا لقب عتیق (آزاد) ہو گیا پھر حضرت طلحہ آئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا طلحہ تم ان لوگوں میں سے ہو جو اپنی نذر پوری کر چکے۔ مِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ معاویہ راوی ہیں میں نے سنا رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے طلحہ ان لوگوں میں سے ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے۔ از مظہر رحمۃ اللہ

وَأَنزَلَ الَّذِينَ ظَاهَرُوهُم مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِن صَيَاصِيهِمْ اور جن اہل کتاب (یعنی بنی قریظہ) نے ان کی (یعنی قریش و غطفان کی جماعتوں کی) پشت پناہی کی تھی ان کو ان کی گڑھیوں (اور قلعوں) سے نیچے اتار لایا۔

صَيَاصِي صِيصَةٌ کی جمع ہے صِيصَة گڑھی، قلعہ، مکان حفاظت، بیل اور ہرن کے سینگ، مرغ کا کانٹا اور جولاہے کا تانا ٹھیک کرنے کا اوزار ان سب کو اسی مناسبت سے صیصہ کہا جاتا ہے۔

وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيقًا تَقْتُلُونَ وَتَأْسِرُونَ فَرِيقًا ۝ اور ان کے دلوں میں (مسلمانوں کا) رعب ڈال دیا چنانچہ ان کے ایک فریق کو تم قتل کر رہے تھے اور ایک فریق کو قید کر رہے تھے۔ یعنی مردوں کو قتل کر رہے تھے اور عورتوں اور بچوں کو قید کر رہے تھے۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ مردوں کی تعداد چھ سو تھی۔ ترجمۂ سعد بن معاذ میں ابو عمرو نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ ابن عائذ نے قتادہ کا مرسل قول بیان کیا ہے کہ مرد سات سو تھے۔ سہیل نے کہا زیادہ سے زیادہ تعداد بیان کرنے والوں کا قول ہے کہ آٹھ سو اور نو سو کے درمیان تھے۔ ابن حبان نے صحیح سند کے ساتھ بیان کیا ہے کہ چار سو جنگ جو تھے۔ ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ ان کی تعداد نو سو بھی بتائی گئی ہے تمام اقوال کے اختلاف باہمی کو دور کرنے کے لئے یہ توجیہ کی جا سکتی ہے کہ جنگ جو چار سو تھے باقی ان کے تابع تھے۔

عورتوں اور بچوں کی تعداد سات سو پچاس یا نو سو تھی۔ سبیل الرشاد میں ذکر کیا گیا ہے کہ ایک ہزار تھے۔

وَأَوْرَثَكُمْ أَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ اور تم کو اللہ نے انکی زمینوں کا (یعنی کھیتوں اور باغوں کا) اور ان کے گھروں کا (یعنی قلعوں اور گڑھیوں کا) اور ان کے مالوں کا (یعنی نقد جنس اور مویشی کا) مالک بنادیا۔

وَأَرْضًا لَّمْ تَطَئُوهَا اور (اس) زمین کا بھی مالک بنادیا جس پر تم نے قدم (بھی) نہیں رکھا تھا۔

مقاتل اور ابن زید کے نزدیک أَرْضًا سے مراد خیبر ہے۔ قتادہ نے کہا ہم سے بیان کیا جاتا ہے کہ اس سے مراد مکہ ہے حسن کے نزدیک فارس و روم مراد ہے۔ عکرمہ کے قول پر وہ ساری زمین مراد ہے جس کو قیامت تک مسلمان فتح کرتے رہیں گے۔

وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا ۝ اور اللہ ہر چیز پر قابو رکھتا ہے لہٰذا اس پر بھی (یعنی اس زمین کی فتح پر بھی جس پر تمہارے قدم ابھی نہیں پہنچے ہیں) قدرت رکھتا ہے۔ ربع

غزوہ بنی قریظہ کا واقعہ

محمد بن عمر نے اپنے شیوخ کی سند سے بیان کیا کہ جب مشرک خندق سے واپس چلے گئے تو بنی قریظہ کو (اپنے تمرد و جانے کی وجہ سے) بڑا خوف ہوا۔

امام احمد اور شیخین نے مختصر طور پر اور بیہقی و حاکم نے صحیح سند سے تفصیل کے ساتھ حضرت عائشہؓ کی روایت سے بیان کیا۔ ابو نعیم اور بیہقی نے دوسری سند سے بھی یہ واقعہ نقل کیا۔ ابن عابد نے حمید بن ہلال کے واسطے سے بیان کیا۔

ابن جریر نے حضرت ابن ابی اوفی کی روایت سے اور بیہقی نے عروہ کے حوالے سے اور ابن سعد نے ماجشون و یزید بن اصم کی وساطت سے بیان کیا، نیز محمد بن عمر نے اپنے شیوخ کے سلسلے سے یہ واقعہ اس طرح بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور مسلمان جب تھکے ہارے خندق سے لوٹے تو ہتھیار کھول دیئے۔ رسول اللہ ﷺ حضرت عائشہ کے مکان میں تشریف لے گئے اور پانی طلب کر کے سر دھونے لگے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضور ﷺ حضرت زینب بنت جحش کے مکان میں تشریف لے گئے اور حضرت زینب آپ کا سر دھونے لگیں اور ایک طرف کا سر دھو بھی دیا تھا۔

حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ (باہر) کسی شخص نے ہم کو سلام کیا ہم گھر کے اندر تھے۔

محمد بن عمر نے کہا وہ شخص جنازوں کے رکھنے کے مقام میں کھڑا تھا اس نے پکار کر کہا اے جنگ کرنے والے (ہتھیار

کھول دینے کا) تمہارے پاس کیا عذر ہے؟ حضور آواز سنتے ہی گھبرا کر اچھل پڑے اور یک دم تیزی سے کود کر باہر نکل گئے، میں بھی آپ کے پیچھے کھڑی ہو گئی اور کیواڑوں کے سوراخ میں سے دیکھنے لگی مجھے دحیہ کلبی کی صورت نظر آئی جو اپنے سر سے غبار جھاڑ رہے تھے۔

ابن اسحاق نے کہا وہ شخص عمامہ لپیٹے ہوئے تھا۔ اس شخص نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ آپ نے بہت جلد ہتھیار کھول دیئے اللہ آپ کو معاف فرمائے آپ نے ہتھیار کھول کر رکھ دیے حالانکہ جب سے دشمن اترا ہے ملائکہ نے اس وقت سے اب تک اسلحہ نہیں کھولے۔ دوسری روایت میں ہے چالیس دن سے ملائکہ نے اسلحہ نہیں کھولے، ہم نے حمراء الاسد تک ان کا تعاقب کیا اس وقت انہیں کے تعاقب سے لوٹ کر آئے ہیں اللہ نے ان کو بھگادیا اور آپ کو حکم دیا ہے کہ بنی قریظہ سے جا کر جنگ کروں میں اپنے ساتھ والے ملائکہ کو لے کر انہیں کی طرف جا رہا ہوں تا کہ ان کے قلعوں میں زلزلہ پیدا کر دوں۔ آپ بھی لوگوں کو لے کر نکل کر (میرے بعد) آ جیے۔

حمید بن ہلال کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے ساتھی تھک چکے ہیں اگر آپ چند روز کی انہیں مہلت دے دیں تو بہتر ہے۔ جبرئیل نے کہا آپ ﷺ اٹھ کر ان پر چڑھائی تو کریں میں ان کو اس طرح دے پٹکوں گا جیسے انڈا پتھر کی چٹان پر پٹکا جاتا ہے پھر ان کو ہلا ڈالوں گا (یعنی قلعوں سے باہر نکل پڑنے پر مجبور کر دوں گا اور ان کے دلوں میں رعب ڈال دوں گا)

حضرت عائشہؓ کا بیان ہے جب رسول اللہ ﷺ اندر تشریف لائے تو میں نے عرض کیا آپ جس شخص سے باتیں کر رہے تھے وہ کون تھا؟ فرمایا کیا تم نے اس کو دیکھا تھا؟ میں نے عرض کیا جی ہاں فرمایا تمہارے خیال میں اس کی شکل کس کے مشابہ تھی میں نے عرض کیا دحیہ کلبی کے مشابہ تھی۔ فرمایا وہ جبرئیل تھے انہوں نے مجھے حکم دیا کہ بنی قریظہ کی طرف جاؤں۔

حمید کا بیان ہے کہ پھر جبرئیل اور ان کے ساتھ کے ملائکہ پشت پھیر کر چل دیئے یہاں تک کہ بنی غنم کے کوچوں میں (ان کی رفتار سے اٹھا ہوا) غبار اڑنے لگا۔ بخاری کی روایت ہے کہ حضرت انسؓ نے فرمایا گویا اٹھتا ہوا غبار اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ قتادہ نے ابن عابد کی روایت کے بموجب بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس روز ایک منادی کو (مسلمانوں کی بستیوں میں) یہ ندا کرنے کے لئے بھیج دیا اے سواران خدا سوار ہو جاؤ اور حضرت بلال کو اعلان کرنے کا حکم دیا کہ جو سننے والے فرمان بردار ہوں ان کو عصر کی نماز بنی قریظہ تک پہنچنے سے پہلے نہ پڑھنی چاہئے (یعنی ہر شخص پر لازم ہے کہ عصر کی نماز بنی قریظہ کی بستی میں پہنچ کر ہی پڑھے) شیخین نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بیہقی نے حضرت عائشہ اور ابن عقبہ کی روایت سے اور طبرانی نے حضرت کعب بن مالک کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا میں تم کو تاکیدی حکم دیتا ہوں کہ عصر کی نماز (بنی قریظہ کی بستی تک پہنچنے سے پہلے نہیں) نہ پڑھنا۔ مسلم نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ حضور ﷺ نے ظہر کی نماز کے متعلق حکم دیا تھا چنانچہ راستہ میں جب عصر کی نماز یا حسب روایت مسلم ظہر کی نماز کا وقت آ گیا تو بعض لوگوں نے کہا ہم تو بنی قریظہ میں پہنچ کر عصر کی نماز پڑھیں گے اس سے پہلے نہیں پڑھیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو تاکیدی حکم دیا ہے (اگر نماز میں تاخیر ہو گئی تو) ہم پر کوئی گناہ نہ ہوگا۔ غروب آفتاب کے بعد جب بنی قریظہ میں پہنچے تو ان لوگوں نے عصر کی نماز پڑھی۔ کچھ لوگوں نے کہا رسول اللہ ﷺ کا مقصد یہ نہ تھا کہ ہم نماز نہ پڑھیں (بلکہ جلد پہنچنے کی تاکید مقصود تھی) اس لئے ہم تو راستہ میں ہی نماز پڑھیں گے۔ رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع پہنچ گئی مگر آپ نے کسی فریق کو تنبیہ نہیں کی۔

فائدہ

ظہر اور عصر کی تعیین میں روایات کا اختلاف ہے۔ اختلاف کو دور کرنے کی یہ توجیہ ہو سکتی ہے کہ یقیناً ایک فریق پہلے روانہ ہوا ہو گا اور دوسرا کچھ (تیاری کے) بعد۔ اول فریق کو حکم ہوا کہ ظہر کی نماز بنی قریظہ میں پہنچ کر پڑھیں اور دوسرے فریق کو حکم

ہوا تم عصر کی نماز بنی قریظہ میں پہنچ کر پڑھنا۔ یہ بھی تاویل کی گئی ہے کہ جو لوگ طاقتور تھے یا ان کے مکان قریب تھے ان کو بنی قریظہ میں پہنچ کر ظہر پڑھنے کا حکم ہوا اور جو کمزور تھے یا ان کے گھر دور تھے ان کو عصر کی نماز پہنچ کر پڑھنے کا حکم ہوا۔

مسئلہ:۔ اس حدیث سے مستفاد ہوتا ہے کہ مجتہد سے اگر اجتہاد میں غلطی ہو جائے تب بھی وہ گناہ گار نہ ہوگا دیکھو رسول اللہ ﷺ دونوں فریقوں میں کسی پر درشتی نہیں کرتے۔ جس نے راستہ میں نماز پڑھ لی اس کو بھی برا نہیں کہا اور جس نے پہنچ کر (مغرب ہونے کے بعد) پڑھی اس کو بھی تنبیہ نہیں کی۔

صاحب زاد المعاد نے لکھا ہے کہ ہر فریق نیت کے مطابق ثواب کا حقدار ہو گیا لیکن جس فریق نے راستہ میں نماز پڑھ لی اس کو دوہرا ثواب ہوا ایک بروقت نماز پڑھنے کا اور دوسرا تعمیل حکم میں تیزی کرنے کا کیونکہ بنی قریظہ میں پہنچنے سے پہلے نماز نہ پڑھنے کے حکم کا مقصد ہی یہی تھا کہ تعمیل حکم میں تاخیر نہ کی جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ کو طلب فرمایا اور اپنا جھنڈا ان کے سپرد کر دیا۔ خندق سے واپسی کے بعد جھنڈا کھولا نہیں گیا تھا۔

محمد بن عمرو اور ابن ہشام و بلاذری کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن ام مکتوم کو مدینہ کا حاکم (اپنی جگہ) بنایا۔ محمد بن عمر کا قول ہے کہ ۲۳ ذی القعدہ کو مدینہ سے برآمد ہوئے۔ بغوی نے کہا یہ واقعہ ۵ھ کا ہے حضور والا نے ہتھیار لگائے زرہ پہنی خود اوڑھا بھالا ہاتھ میں لیا ڈھال گلے میں لٹکائی اور نحیف گھوڑے پر سوار ہو گئے جلو میں صحابہ نے گھیر ڈال لیا جو مسلح تھے گھوڑوں پر سوار تھے اور تعداد میں چھتیس تھے۔ یہ سوار اور پیادے آپ کے گرداگرد تھے اس شان سے صحابہ کے ہجوم میں آپ روانہ ہو گئے۔

ابن سعد کی روایت کے بموجب ہم رکاب صحابی تین ہزار تھے۔

مسئلہ:۔ اس قصہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ماہ حرام میں ابتداءً جہاد جائز ہے (کیونکہ خیبر کا واقعہ ذی القعدہ کے آخر کا ہے) لیکن حجۃ الوداع کے خطبہ میں حضور ﷺ نے ماہ حرام میں قتال کی ممانعت فرما دی تھی مگر یہ ممانعت اباحت کے بعد ہوئی تھی (فتح مکہ کا واقعہ فتح خیبر سے بعد کا ہے)۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح حرم مکہ میں ایک ساعت کے لئے حضور ﷺ کے لئے خصوصیت کے ساتھ قتال حلال کر دیا گیا تھا اسی طرح آپ کے لئے خصوصیت کے ساتھ خیبر کی فتح کے موقع پر بھی ماہ حرام میں جہاد کو مباح کر دیا گیا۔ یہ بھی توجیہ ہو سکتی ہے کہ یہ ابتداءً جنگ نہ تھی بلکہ لڑائی کی ابتداء بنی قریظہ کی طرف سے ہو چکی تھی انہوں نے لڑائی میں قریش کی مدد اس سے پہلے کی تھی۔ واللہ اعلم۔

طبرانی نے حضرت ابو رافع و ابن عباس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب بنی قریظہ پر (یعنی ان کی بستی کے قریب) پہنچے تو ایک برہنہ پشت گدھے پر جس کا نام یعفور تھا سوار ہو گئے۔ لوگ آپ کے گرداگرد تھے۔

حاکم، بیہقی اور ابو نعیم نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے نیز محمد بن عمر اور ابن اسحاق نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ صورین کی طرف سے گزرے وہاں بنی نجار کے کچھ لوگ جمع تھے جن میں حارثہ بن نعمان بھی تھے سب مسلح اور صف بند تھے۔

حضور ﷺ نے دریافت کیا کیا تمہاری طرف سے کوئی گزرا تھا؟ انصار نے کہا جی ہاں دحیہ کلبی خچر پر سوار ادھر سے گزرے تھے۔ خچر پر دیبز ریشم کی جھول بھی پڑی تھی ہم کو حکم دے گئے تھے کہ ہم بھی ہتھیار اٹھا لیں (مسلح ہو جائیں) چنانچہ ہم مسلح اور صف بند ہو گئے وہ یہ بھی کہہ گئے تھے کہ رسول اللہ ﷺ بھی ابھی برآمد ہونے والے ہیں۔ حارثہ بن نعمان نے بیان کیا ہم نے دو صفیں بنائی تھیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا وہ جبرئیل تھے جن کو بنی قریظہ کی طرف ان کے قلعوں میں زلزلہ برپا کرنے اور ان کے دلوں میں رعب ڈالنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ حضرت علی کچھ مہاجرین و انصار کی جماعت کو لے کر پہلے آ گئے تھے انہیں میں حضرت ابو قتادہ بھی تھے۔

محمد بن عمر کی روایت ہے کہ حضرت ابو قتادہ نے فرمایا جب ہم بنی قریظہ پر پہنچے تو ہم نے محسوس کیا کہ ان لوگوں کو لڑائی کا

یقین ہو چکا ہے۔ حضرت علی نے جا کر قلعہ کی جڑ میں جھنڈا گاڑ دیا ان لوگوں نے اپنی گڑھیوں کے اندر سے ہی گالیوں سے ہمارا استقبال کیا۔ رسول اللہ ﷺ اور آپ کی بیویوں کو گالیاں دینے لگے مگر ہم خاموش رہے اور ہم نے کہہ دیا ہمارا تمہارا فیصلہ تلوار سے ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ بھی پہنچ گئے اور ان کے قلعہ کے قریب بنی قریظہ کے پتھریلے میدان کے نشیبی جانب چاہ انا پر نزول فرمایا۔ حضرت علی نے حضور ﷺ کو دیکھا تو مجھے حکم دیا کہ میں جھنڈا پکڑ لوں میں نے جھنڈا پکڑ لیا حضرت علی کو یہ بات پسند نہیں تھی کہ رسول اللہ ﷺ کے کان میں ان لوگوں کی گالیاں اور گندے الفاظ پہنچیں اس لئے عرض کیا یا رسول اللہ اگر آپ ان خبیثوں کے قریب نہ پہنچیں تو کچھ حرج نہیں ہے حضور ﷺ نے فرمایا کیا تم مجھے واپس جانے کا مشورہ دے رہے ہو میرا خیال ہے کہ تم نے ان کی طرف سے کچھ گندے الفاظ سن لئے ہیں۔ حضرت علی نے کہا جی ہاں فرمایا اگر وہ مجھے دیکھ لیتے تو کچھ بھی اس طرح کی بات نہ کہتے غرض رسول اللہ ﷺ آگے بڑھے آگے آگے اسید بن حضیر تھے اسید نے کہا اے اللہ کے دشمنو! جب تک تم بھوکے نہ مر جاؤ گے ہم تمہارے قلعوں سے نہیں ہٹیں گے (یعنی رسد نہ ملنے کی وجہ سے تم بھوکے مر جاؤ گے ہم محاصرہ نہیں اٹھائیں گے) تم (اس وقت) ایسے (گڑھیوں میں محصور اور بند) ہو جیسے بھٹ کے اندر لومڑی بنی قریظہ نے کہا اے ابن حضیر خزرج کے مقابلہ میں ہم نے تم سے معاہدہ کیا تھا (ہم تمہارے حلیف تھے) حضرت اسید نے کہا اب میرے تمہارے درمیان نہ کوئی معاہدہ باقی ہے اور نہ رشتہ۔

(اس کے بعد) رسول اللہ ﷺ (یہودیوں کی گڑھی کے) قریب پہنچ گئے اور اتنی اونچی آواز سے یہودیوں کے کچھ سرداروں کو پکارا کہ انہوں نے آواز سن لی اور فرمایا اے بندروں اور سوروں کے بھائیو اور اے بتوں (یا شیطان) کی پرستش کرنے والو جواب دو کیا اللہ نے تم کو رسوا کر دیا اور تم پر اپنا عذاب نازل فرما دیا۔ کیا تم مجھے گالیاں دیتے ہو (اندرون حصن سے) ان لوگوں نے قسمیں کھا کر کہا ابو القاسم ہم نے ایسا نہیں کیا آپ تو جاہل نہیں ہیں۔ دوسری روایت میں جاہل کی جگہ فحش گو کا لفظ آیا ہے۔

شام کو مسلمان رسول اللہ ﷺ کے پاس جمع ہو گئے حضرت سعد بن عبادہ نے رسول اللہ ﷺ کے لئے چھواروں کی کچھ بوریاں بھیج دیں یہی اس روز سب کا کھانا ہوا حضور اقدس ﷺ نے فرمایا چھوارے اچھا طعام ہیں۔ صبح کو رسول اللہ ﷺ سحر سے اٹھ گئے اور تیر اندازوں کو آگے بھیج دیا۔ تیر اندازوں نے جا کر یہودیوں کے قلعوں کا محاصرہ کر لیا اور تیر چلانا اور پتھر پھینکنا شروع کر دیا۔ قلعوں کے اندر سے یہودی بھی تیر اور پتھر پھینکتے رہے۔ دن اسی طرح گزر گیا جب شام ہو گئی تو رات بھی مسلمان قلعوں کا محاصرہ کئے رہے اور باری باری سے ڈیوٹی دیتے رہے۔ رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق مسلمانوں کی طرف سے یہ تیر افگنی برابر جاری رہی۔ یہاں تک کہ یہودیوں کو اپنی ہلاکت کا یقین ہو گیا اور انہوں نے تیر افگنی چھوڑ دی اور مسلمانوں سے کہا (لڑائی بند کرو) ہم تم سے کچھ گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بہتر ہے۔ یہودیوں نے گڑھی کے اوپر سے نباش بن قیس کو اتار کر بھیجا۔ نباش نے آ کر رسول اللہ ﷺ سے بات چیت کی اور یہ شرط پیش کی کہ جن شرائط پر بنی نضیر نے صلح کی تھی ہم بھی انہی شرائط پر صلح کرنا چاہتے ہیں۔ شرائط یہ ہیں کہ اپنا مال (نقد، جنس وغیرہ) اور اسلحہ لے جائیں گے اور عورتوں اور بچوں سمیت تمہاری بستیاں چھوڑ جائیں گے اور سوائے اسلحہ کے باقی مال جتنا اونٹوں پر لادا جائے گا لاد کر لے جائیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے انکار کر دیا یہودیوں نے کہا تو خیر ہم کو مال کی ضرورت نہیں ہم مال نہیں لے جائیں گے البتہ عورتوں اور بچوں کو اپنے ساتھ بحفاظت لے جائیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ شرط ماننے سے بھی انکار کر دیا اور فرمایا بلا شرط تم کو گڑھیوں سے اتر کر آنا ہوگا۔ ہم جو فیصلہ کر دیں گے اس کو ماننا پڑے گا۔ نباش یہ جواب لے کر بنی قریظہ کے پاس لوٹ گیا اور قوم سے جا کر جو گفتگو ہوئی وہ نقل کر دی۔ کعب بن اسد نے کہا اے گروہ بنی قریظہ جو مصیبت تم پر نازل ہوئی ہے وہ تمہاری نظروں کے سامنے ہے اب میں تین باتیں تمہارے سامنے رکھتا ہوں تم ان میں سے جو چاہو اختیار کر لو بنی قریظہ نے کہا وہ باتیں کونسی ہیں؟ کعب نے کہا۔

نمبر ا۔ یہ ہے کہ تم اس شخص کی بیعت کر لو اور اس کو سچا مان لو کیونکہ بخدا یہ وہی نبی مرسل ہے جس کا ذکر تمہاری کتاب میں موجود ہے یہ بات تمہارے سامنے واضح طور پر آ چکی ہے اس صورت میں تمہاری جانیں اور مال اور عورتیں محفوظ رہیں گی۔

بخدا تم خوب جانتے ہو کہ محمد نبی ہیں ہم کو ان کا ساتھی ہونے سے سوائے اس حسد کے اور کوئی امر مانع نہیں تھا کہ یہ عرب میں سے ہیں۔ بنی اسرائیل میں سے نہیں ہیں مگر اللہ نے یہ مقام (نبوت) ان کو عطا فرما دیا مجھے عہد شکنی اور وعدہ کی خلاف ورزی پہلے ہی پسند نہ تھی لیکن یہ مصیبت اور نحوست اس شخص (یعنی حیی بن اخطب) کی وجہ سے آئی جو بیٹھا ہوا ہے جب قریش اور بنی غطفان واپس چلے گئے تو حیی کعب بن اسعد سے کئے ہوئے وعدہ کے مطابق بنی قریظہ کے پاس قلعہ میں آگیا تھا (اسی کی طرف کعب نے اشارہ کیا) کیا ابن جواس کی بات تم کو یاد ہے جو اس نے تم سے کہی تھی۔ یہودیوں نے پوچھا کیا کہا تھا؟ کعب نے جواب دیا ابن جواس نے کہا تھا کہ اس بستی میں ایک نبی کا خروج ہوگا اگر میری زندگی میں اس کا خروج ہو گیا تو میں اس کی پیروی اور مدد کروں گا اور اگر میرے بعد وہ پیدا ہوا تو تم اس کا اتباع کرنا۔ خبردار کسی کے بہکاوے میں نہ آجانا اس کے مددگار اور دوست رہنا اگر تم ایسا کرو گے تو دونوں کتابوں پر تمہارا ایمان ہو جائے گا اول کتاب پر بھی اور آخری کتاب پر بھی۔ ان کو میرا سلام کہہ دینا اور بتا دینا کہ میں ان کو سچا جانتا ہوں اور ان پر ایمان رکھتا ہوں۔ کعب نے کہا (اے معشر یہود) آؤ ہم اس سے بیعت کرلیں اور اس کے سچے ہونے کا اعتراف کرلیں۔ بنی قریظہ نے کہا ہم توریت کا حکم تو کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ اور شریعت توریت کی بجائے دوسری شریعت کو نہیں اختیار کریں گے۔ کعب نے کہا جب تم یہ بات نہیں مانتے۔

نمبر ۲۔ تو آؤ ہم پہلے اپنے بیوی بچوں کو قتل کردیں پھر محمد اور ان کے ساتھیوں کے مقابلہ میں تلواریں سونت کر نکل آئیں یہاں تک کہ اللہ ہمارا اور محمد کا فیصلہ کردے اگر ایسی حالت میں مر جائیں گے تو اپنے پیچھے کسی کو چھوڑ کر نہیں جائیں گے کہ ہمیں اس کے متعلق اندیشہ ہو اور اگر غالب آجائیں گے تو یقیناً ہم کو اور بیویاں اور بچے مل جائیں گے یہودیوں نے کہا ہم ان بے چاروں کو کیسے قتل کرسکتے ہیں ان کے بعد جینے میں کیا لذت رہ جائے گی۔ کعب نے کہا جب یہ بات بھی تم تسلیم نہیں کرتے۔

نمبر ۳۔ تو یہ سمجھ لو کہ آج شنبہ کی رات ہے محمد اور انکے ساتھی بے فکر ہوں گے (کہ یہودی آج حملہ نہیں کرسکتے) تم نیچے اترو ممکن ہے غفلت کی حالت میں محمد اور ان کے ساتھیوں پر حملہ کرنے میں ہم کو کامیابی مل جائے۔ یہودیوں نے جواب دیا ہم یوم السبت (کے حکم) کو بگاڑ نہیں سکتے تم جانتے ہو کہ ہم سے پہلے (ہمارے اسلاف میں سے) جن لوگوں نے یوم السبت میں بدعت (خلاف شرع حرکت) کی تھی ان پر کیسا مسخ شکل کا عذاب آیا تھا اس لئے ہم ایسی حرکت نہیں کرسکتے کہ ہم پر بھی وہ عذاب آجائے۔ کعب نے کہا تم میں سے کوئی بھی جب سے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے اب تک ایک دن کے لئے کبھی بھی سمجھدار (دانشمند) نہیں ہوا۔

ثعلبہ بن سعید اور اسید بن سعید اور اسد بن عبید نے کہا (یہ خاندان نہ تو بنی قریظہ میں سے تھے نہ بنی نضیر میں سے بلکہ ہذیل میں سے تھے اوپر کسی جگہ بنی قریظہ سے ان کا رشتہ ملتا تھا) اے گروہ بنی قریظہ بخدا تم خوب جانتے ہو کہ یہ اللہ کے رسول ہیں اور انکا حلیہ اور اوصاف ہمارے پاس (ہماری کتابوں میں) موجود ہیں جو ہمارے علماء اور بنی نضیر کے علماء بیان کرتے رہے ہیں۔ ابن بیان ہمارے نزدیک بڑا سچا آدمی تھا یہ حیی بن اخطب جو بنی نضیر کا اول شخص ہے اس کے حالات سے واقف ہے اس نے مرتے وقت اللہ کے رسول کے صفات (حلیہ، اخلاق وغیرہ) بیان کئے تھے۔ بنی قریظہ نے کہا ہم (شریعت) توریت کو نہیں چھوڑیں گے۔ جب ثعلبہ اور اسید وغیرہ نے دیکھا کہ بنی قریظہ نے ان کی بات نہیں مانی تو اسی تاریخ کو صبح ہوتے ہی گڑھی سے اتر گئے اور جا کر مسلمان ہو گئے اور اپنی جانوں مالوں اور اہل و عیال کو محفوظ کرلیا۔

عمرو بن مسعود نے کہا اے گروہ یہود تم نے محمد سے جن باتوں پر قسم معاہدہ کیا تھا اس سے تم واقف ہو تم نے اس معاہدہ کو توڑ دیا میں تمہارا شریک نہ تھا نہ معاہدہ میں داخل تھا نہ معاہدہ شکنی میں۔ اب اگر (مسلمان ہونے سے) تم انکار کرتے ہو تو جزیہ قبول کرو اور یہودیت پر قائم رہو۔ بنی قریظہ نے کہا ہم عرب کو جزیہ دینے کا بار اپنی گردنوں پر نہیں لیں گے اس سے تو قتل ہو جانا بہتر ہے عمرو نے کہا تو میں تم سے الگ ہوں یہ کہہ کر اسی رات سعیہ کے دونوں بیٹوں کے ساتھ نکل کر چلا گیا۔ اسلامی لشکر کے محافظوں کے کمانڈر محمد بن مسلمہ تھے عمرو بن مسعود جب یہودیوں کے پاس سے نکل کر اسلامی لشکر کے محافظوں تک پہنچا تو محمد

بن مسلمہ نے کہا کون ہے؟ عمرو بن مسعود نے کہا عمرو بن مسعود۔ محمد بن مسلمہ نے کہا اے اللہ مجھے عزت والوں کی صحبت سے محروم نہ کرنا پھر (عمرو کو داخلہ کی اجازت دے دی) راستہ چھوڑ دیا عمرو آ گیا اور رسول اللہ ﷺ کی مسجد تک پہنچ گیا اور وہیں رات گزاری صبح ہوئی تو یہ کسی کو معلوم نہ ہوا کہ وہ اس وقت تک کہاں رہا۔ بہر حال رسول اللہ ﷺ سے اس کے متعلق دریافت کیا گیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا اس آدمی کو اللہ نے وفاعہد کی وجہ سے بچا لیا (محفوظ رکھا)

اہل مغازی کا بیان ہے کہ یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیام بھیجا کہ ہم ابو لبابہ سے اپنے معاملہ میں مشورہ کرنا چاہتے ہیں آپ ان کو ہمارے پاس بھیج دیجئے۔ حضرت ابو لبابہ خاندان عمرو بن عوف کے ایک فرد تھے اور یہودی قبیلہ اوس کے حلیف تھے۔ حضور ﷺ نے ابو لبابہ کو ان کے پاس بھیج دیا ابو لبابہ پہنچے تو یہودی مرد ان کے استقبال کے لئے کھڑے ہو گئے اور عورتوں اور بچوں نے ان کے سامنے رونا شروع کر دیا، ابو لبابہ کو ان پر رحم آ گیا۔ یہودیوں نے کہا ابو لبابہ آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا محمد کے کہنے سے ہم گڑھیوں سے اتر آئیں؟ ابو لبابہ نے (زبان سے تو) کہا ہاں (لیکن) ہاتھ سے اپنے حلق کی طرف اشارہ کر دیا مراد یہ تھی کہ قتل کر دیئے جاؤ گے حضرت ابو لبابہ کا بیان ہے کہ میں اس جگہ سے ہٹنے بھی نہ پایا تھا کہ مجھے خیال آ گیا کہ میں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ خیانت (بدعہدی) کی حضرت ابو لبابہ وہاں سے چل کر سیدھے مسجد میں آئے اور ایک ستون سے اپنے کو بندھوا دیا۔ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوئے اور کہنے لگے میں اس جگہ سے نہیں ہٹوں گا یہاں تک کہ مر جاؤں یا جو حرکت مجھ سے ہوئی ہے اللہ اس کو معاف فرما دے۔ میں نے اللہ سے عہد کر لیا ہے کہ بنی قریظہ کی سرزمین پر قدم نہیں رکھوں گا اور جس آبادی میں میں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے بدعہدی کی ہے اس میں کبھی مجھے کوئی نہیں دیکھے گا۔ رسول اللہ ﷺ کو میرے جانے کی اور اس عمل کی جو مجھ سے سرزد ہو گیا تھا اطلاع پہنچی تو فرمایا اس کو اس وقت تک یونہی رہنے دو جب تک اللہ اس کے بارے میں کوئی جدید حکم نازل نہ فرما دے وہ اگر میرے پاس آ جاتا تو میں اللہ سے اس کے لئے معافی کی دعا کرتا لیکن جب وہ میرے پاس نہیں آیا اور خود چلا گیا تو اس کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دو۔ اسی واقعہ کے سلسلہ میں آیت یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ وَ تَخُوْنُوْۤا اَمٰنٰتِكُمْ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ نازل ہوئی۔ اس کے بعد ابو لبابہ کے توبہ قبول ہونے کی وحی رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی اس وقت حضور ﷺ حضرت ام سلمہؓ کے مکان میں تھے۔ حضرت ام سلمہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول ﷺ کو ہنستے سنا تو عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اللہ آپ کو ہنستا رکھے آپ کس وجہ سے ہنس رہے ہیں؟ فرمایا ابو لبابہ کی توبہ قبول ہو گئی میں نے عرض کیا میں اس کو اس کی بشارت دے دوں فرمایا اگر تم چاہتی ہو (تو ایسا کر لو) میں اٹھ کر حجرہ کے دروازہ پر پہنچی (یہ واقعہ حکم پردہ نازل ہونے سے پہلے کا ہے) اور کہا ابو لبابہ تم کو بشارت ہو اللہ نے تمہاری توبہ قبول فرما لی یہ سنتے ہی لوگ ابو لبابہ کو کھولنے کے لئے دوڑے لیکن ابو لبابہ نے کہا نہیں۔ خدا کی قسم (مجھے کوئی نہ کھولے) رسول اللہ ﷺ ہی مجھے اپنے ہاتھ سے کھولیں تو خیر فجر کی نماز کے لئے حضور ﷺ برآمد ہوئے اور ابو لبابہ کی طرف سے گزرے اور ان کو آزاد کیا۔

حماد بن سلمہ نے علی بن زید بن جدعان کی وساطت سے بروایت حضرت علی زین العابدین بن امام حسین بیان کیا کہ حضرت سیدہ فاطمہ زہراؓ کھولنے کے لئے تشریف لے گئی تھیں تو حضرت ابو لبابہ نے کہا میں نے اللہ کی قسم کھائی ہے کہ سوائے اللہ کے رسول ﷺ کے اور کوئی مجھے نہ کھولے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا فاطمہ میرا ہی ٹکڑا ہے۔ امام زین العابدین کی یہ روایت مرسل ہے (درمیان کا راوی بیان نہیں کیا گیا اور خود امام زین العابدین صحابی نہیں تھے) ابو لبابہ کا بیان ہے جب ہم بنی قریظہ کا محاصرہ کئے ہوئے تھے تو میں نے ایک خواب دیکھا میں نے دیکھا تھا کہ میں بدبودار سیاہ کیچڑ میں اندر گیا ہوں اور اس کی بدبو سے مرا جاتا ہوں مگر نکل نہیں پاتا۔ پھر میں نے ایک بہتی نہر دیکھی اور اس میں غسل کرنے لگا یہاں تک کہ پاک صاف ہو گیا اور مجھے پاکیزہ خوشبو محسوس ہونے لگی میں نے اس کی تعبیر حضرت ابو بکر صدیق سے دریافت کیا حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا تم کسی غم آگیں بات میں پھنس جاؤ گے پھر اللہ کشائش عطا فرما دے گا۔ میں جس وقت ستون سے بندھا ہوا تھا اس وقت مجھے حضرت ابو بکر

کی بات یاد تھی اس لئے مجھے امید تھی کہ اللہ میری توبہ کی قبولیت نازل فرمادے گا۔
چنانچہ میں مسلسل اسی حالت میں رہا اور تکلیف کی وجہ سے نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ کانوں سے آواز بھی نہیں سنائی دیتی تھی اور رسول اللہ ﷺ میری حالت دیکھ رہے تھے۔ ابن ہشام کا بیان ہے کہ ابو لبابہ چھ رات بندھے رہے ہر نماز کے وقت بیوی آکر کھول دیتی تھی آپ وضو کر کے نماز پڑھ لیتے تھے بیوی پھر باندھ دیتی تھی۔
ابن عقبہ کا بیان ہے لوگوں کا قول ہے کہ تقریباً بیس رات بندھے رہے بدایہ میں اس کو زیادہ صحیح قول قرار دیا ہے۔ ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ پچیس دن بندھے رہے نماز کے وقت یا قضاء حاجت کے لئے بیٹی آکر کھول دیتی تھی فراغت کے بعد بیٹی دوبارہ باندھ دیتی تھی۔
معلوم ایسا ہوتا ہے کہ کبھی بیوی کھول دیتی ہوگی کبھی بیٹی۔
ابو لبابہ کی توبہ کے قبول ہونے کے سلسلہ میں اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی تھی وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ
بغوی نے لکھا ہے مسلمانوں نے بنی قریظہ کا محاصرہ پچیس روز جاری رکھا یہاں تک کہ محاصرہ کی تکلیف سے وہ تنگ آگئے اور اللہ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا تو اللہ کے رسول کے حکم کے مطابق وہ اتر آئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کی مشکیں کسنے کا حکم دے دیا اور محمد بن مسلمہ کو اس خدمت پر مامور فرمایا پھر ان کو ایک طرف کو لے گئے اور عورتوں بچوں کو قلعوں سے باہر لایا گیا اور یہ خدمت عبداللہ بن سلام کے سپرد کی گئی پھر ان کا سامان جمع کیا جس میں پندرہ سو تلواریں، تین سو زرہیں، دو ہزار بھالے، پندرہ سو چمڑے کی چھوٹی بڑی ڈھالیں، بہت سا اثاث البیت، بکثرت ظروف اور شراب اور شمشی شربت ملا۔ شراب ساری بہادی گئی اس میں سے پانچواں حصہ نہیں نکالا گیا۔ آب کش اونٹوں کی کافی تعداد اور مویشی بکثرت دستیاب ہوئے یہ سب مال جمع کیا گیا اور رسول اللہ ﷺ ایک گوشہ میں جا کر بیٹھ گئے پھر قبیلہ اوس والے قریب آئے اور انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ یہ ہمارے حلیف ہیں خزرج کے حلیف نہیں ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ابن ابی (سردار خزرج) کے حلیفوں یعنی بنی قینقاع کے معاملہ میں آپ نے کیا سلوک کیا، خزرج کی وجہ سے تین سو غیر مسلح اور چار سو زرہ پوش لوگوں کو آپ نے معاف کر دیا۔ اب ہمارے حلیف بھی اپنی گزشتہ عہد شکنی پر پشیمان ہیں ان کو ہماری وجہ سے معاف فرما دیجئے۔ رسول اللہ ﷺ خاموش رہے کوئی بات نہیں کی اوس والوں نے جب زیادہ اصرار کیا تو فرمایا کیا تم اس بات کو پسند نہیں کرو گے کہ یہ فیصلہ تمہارے ہی ایک آدمی کے سپرد کر دیا جائے۔ اوس والوں نے کہا کیوں نہیں حضور ﷺ نے فرمایا تو فیصلہ سعد بن معاذ کے سپرد ہے۔ ابن عقبہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میرے صحابہ میں سے جس شخص کا چاہو (اس فیصلہ کے لئے) انتخاب کر لو۔ سفارش کرنے والوں نے حضرت سعد بن معاذ کو منتخب کر لیا۔
ایک مسلمان عورت تھی جس کو رفیدہ کہا جاتا ہے وہ زخمیوں کا علاج کرتی تھی اور جس زخمی کا کوئی دیکھ بھال کرنے والا تیماردار نہیں ہوتا تھا امید ثواب اس کی خدمت خود کرتی تھی۔ اس کا خیمہ رسول اللہ ﷺ کے حکم سے مسجد کے اندر لگا دیا گیا تھا اور حضرت سعد جب جنگ خندق میں زخمی ہو گئے تھے تو حضور ﷺ نے حکم دے دیا تھا کہ سعد کو رفیدہ کے خیمہ میں رکھو تاکہ قریب سے میں ان کی عیادت اور خبر گیری کر سکوں چنانچہ اس محاصرہ کے زمانہ میں حضرت سعد مسجد کے اندر رفیدہ کے ڈیرے میں مقیم تھے جب حضور ﷺ نے حضرت سعد کو بنی قریظہ کے معاملہ کا حَکَم بنادیا تو یہیں رفیدہ کے خیمہ میں قبیلہ اوس والے حضرت سعد کے پاس آئے اور آپ کو ایک عربی گدھے پر سوار کیا گدھے پر ریشوں سے بنا ہوا پچار جامہ رکھا گیا تھا اور چار جامہ کے اوپر ایک کمبل ڈال دیا گیا تھا گدھے کی لگام بھی کھجور کے ریشوں کی تھی حضرت سعد جسم دار آدمی تھے قبیلہ اوس والے آپ کو اپنے گھیرے میں لے کر چلے اور راستہ میں حضرت سعد سے کہنے لگے ابو عمرو اللہ کے رسول نے آپ کے بھائیوں (یعنی حلیفوں) کا معاملہ آپ کے سپرد کر دیا ہے تاکہ آپ ان کے معاملہ میں اچھا سلوک کریں اس لئے آپ بھی ان کے ساتھ بھلائی

کریں (یعنی سخت فیصلہ نہ کریں) آپ دیکھ چکے ہیں کہ ابن ابی نے اپنے حلیفوں کے ساتھ کیسا اچھا سلوک کیا تھا۔ یہ لوگ حضرت سعد سے بہت زیادہ سفارش کرتے رہے مگر آپ خاموش تھے کوئی بات زبان سے نہیں نکال رہے تھے آخر جب ان لوگوں نے زیادہ زور دیا تو آپ نے فرمایا اب سعد کے لئے وقت آگیا ہے کہ اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے کی اس کو پرواہ نہ ہو۔ یہ سن کر ضحاک بن خلیفہ بن ثعلبہ انصاری اور دوسرے لوگ بول اٹھے۔ افسوس قوم والوں کی تباہی آگئی سعد کے منہ سے نکلی ہوئی بات ابھی اوس والوں کو پہنچی بھی نہ تھی کہ ضحاک نے ان کو جا کر بنی قریظہ کی موت کی (یعنی فیصلہ موت کی) اطلاع دے دی۔

صحیحین میں آیا ہے کہ جب حضرت سعد مسجد کے قریب پہنچے یعنی اس مسجد کے قریب پہنچے جو محاصرہ کے زمانہ میں بنی قریظہ کے احاطہ میں رسول اللہ ﷺ نے نماز کے لئے تیار کرائی تھی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے سردار کے (استقبال) کیلئے اٹھو۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ اپنے بہترین (سب سے اچھے) آدمی کے لینے کے لئے اٹھو مہاجرین قریش کے نزدیک یہ خطاب صرف انصار کو تھا اور انصار کہتے تھے رسول اللہ کا یہ خطاب تمام مسلمانوں کو تھا۔ امام احمد کی روایت میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا اپنے سردار کو لینے کے لئے کھڑے ہو جاؤ اور اس کو اتارو۔ بنی عبدالاشہل کا بیان ہے کہ (اس حکم کی تعمیل میں) ہم نے اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر دو قطاریں بنالیں۔

بوساطت حضرت جابرؓ کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سعد ان کے بارے میں فیصلہ کرو حضرت سعد نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول فیصلہ کرنے کا زیادہ حق رکھتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا اللہ ہی نے تم کو حکم دیا ہے کہ اپنے حلیفوں کے معاملہ کا فیصلہ کرو اور اچھی طرح کرو۔ حضرت سعد نے (انصاریان اوس سے) کہا کیا بنی قریظہ کے معاملہ میں میرے فیصلہ پر تم راضی ہو سب نے کہا ہاں ہم تو اس وقت بھی راضی تھے جب آپ یہاں موجود نہ تھے ہم نے آپ کا انتخاب کیا تھا اور یہ امید تھی کہ آپ ہم پر احسان کریں گے جیسے دوسروں نے (یعنی ابن ابی نے) اپنے حلیفوں کے ساتھ یعنی بنی قینقاع کے ساتھ کیا تھا۔ سعد نے کہا کیا تم اللہ کے عہد و میثاق کے ساتھ کہتے ہو کہ جو کچھ میں فیصلہ کروں گا تم اس کو واجب النفاذ قرار دو گے سب نے کہا ہاں۔ سعد نے اس گوشہ کی جانب جہاں رسول اللہ ﷺ تشریف فرما تھے اشارہ کرتے ہوئے کہا (یہ فیصلہ) کیا ان پر بھی ہوگا جو یہاں ہیں عظمت رسول اللہ ﷺ کا احترام کرتے ہوئے حضرت سعد کا رخ اس وقت رسول اللہ ﷺ کی طرف سے مڑا ہوا تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہاں سعد نے کہا تو میں فیصلہ کرتا ہوں کہ ان کے بالغ مرد قتل کر دیئے جائیں اور عورتوں بچوں کو باندی غلام بنالیا جائے اور ان کے مال کو بانٹ لیا جائے اور ان کے گھر مہاجرین و انصار کو دے دیئے جائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم نے یہ فیصلہ اس حکم خداوندی کے مطابق کیا جو سات ٹکڑوں (یعنی سات آسمانوں) کے اوپر سے اللہ نے نازل فرمایا ہے۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سحر کو ہی یہ حکم لے کر فرشتہ میرے پاس آچکا تھا۔

جس رات کی صبح کو رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق بنی قریظہ اپنے قلعوں سے اترے تھے اسی رات کو حضرت سعد نے یہ دعا کی تھی کہ اے اللہ اگر قریش سے جنگ کرنے کے لئے مجھے زندہ رکھنا چاہتا ہے تو باقی رکھ کیونکہ جن لوگوں نے تیرے رسول کی تکذیب کی ان کو ستایا اور جلاوطن کیا ان سے زیادہ کسی قوم سے لڑنے کی مجھے خواہش نہیں اور اگر قریش کی لڑائی ختم ہو چکی ہے تو اسی (زخم) کو میرے لئے باعث شہادت بنادے لیکن جب تک بنی قریظہ کی طرف سے (یعنی ان کی شکست و تباہی کو دیکھ کر) میری آنکھیں ٹھنڈی نہ ہو جائیں میرے لئے موت مقرر نہ فرما۔

اللہ نے بنی قریظہ کی طرف سے سعد کی آنکھیں ٹھنڈی کر دیں۔

رسول اللہ ﷺ وہاں سے بروز پنجشنبہ نو یا پانچ ذی الحجہ کو واپس ہوئے اور حسب الحکم رملہ بنت حارث بخاریہ کے گھر میں یہودیوں کو بند کر دیا گیا۔ صبح ہوئی تو رسول اللہ ﷺ مدینہ کے بازار کی طرف تشریف لے گئے وہ بازار وہی تھا جو آج بھی ہے۔ وہاں ایک گڑھا کھودنے کا حکم دیا چنانچہ ابو الجہم عدوی کے مکان کے پاس سے احجار الزیت تک بازار میں گڑھا صحابہ کھودنے لگے۔

رسول اللہ ﷺ تشریف فرما ہے پھر آپ نے بنی قریظہ کے مردوں کو بلوایا اور اس گڑھے میں ان کی گردنیں ماری جانے لگیں۔ کعب بن اسد سے جو یہودیوں کو دستہ دستہ (قطار در قطار) رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے جا رہے تھے۔ یہودیوں نے کہا کعب تمہارا کیا خیال ہے محمد ہمارے ساتھ کیا سلوک کرنے والے ہیں؟ کعب نے جواب دیا کم بختو! تمہارے ساتھ وہ معاملہ کریں گے جو تم کو پسند نہ ہوگا بہر حال تم کو دیت لے کر چھوڑا نہیں جائے گا تم میں سے جو جائے گا وہ لوٹ کر نہیں آئے گا۔ خدا کی قسم (اب تو تمہارے لئے) تلوار ہی ہے میں نے تم کو پہلے جس بات کی دعوت دی تھی (یعنی عہد شکنی نہ کرنے کی) تم نے اس کو نہ مانا۔ کہنے لگے یہ وقت عتاب (برا بھلا کہنے) کا نہیں ہے اگر ہم تمہاری رائے کو برا سمجھ کر نظر انداز نہ کر دیتے تو جو معاہدہ ہمارے اور محمد کے درمیان تھا اس کو توڑنے میں شریک نہ ہوتے۔ حی بن اخطب نے کہا اب ایک دوسرے کو برا بھلا کہنا چھوڑو اس وقت اس سے کچھ فائدہ نہیں مرنے پر تیار ہو جاؤ۔

حضرت علی بن ابی طالبؓ اور حضرت زبیر بن عوام نے بنی قریظہ کو قتل کیا تھا (یعنی قتل کرنے کی خدمت ان ہی دونوں بزرگوں نے انجام دی تھی) پھر حیی بن اخطب کو لایا گیا اس وقت گردن سے اس کے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے اور قتابی جوڑا اس نے قتل ہونے کے لئے پہن رکھا لیکن پھر اس کو پھاڑ دیا اور انگل انگل برابر ٹکڑے کر دیے تاکہ اس کو اتار کر کوئی پہن نہ سکے۔

جب رسول اللہ ﷺ کے سامنے آیا تو حضور ﷺ نے فرمایا دشمن خدا کیا اللہ نے تجھے میرے قابو میں نہیں کر دیا؟ کہنے لگا کیوں نہیں لیکن آپ سے دشمنی رکھنے پر میں اپنے آپ کو قابل ملامت نہیں قرار دیتا کیونکہ اپنے خیال میں میں آپ پر غالب آجانے کا خواستگار تھا لیکن اللہ کو یہ منظور نہ تھا اس کو یہی منظور تھا کہ مجھ پر آپ کو قابو عطا کر دے میں نے ہر چند دوڑ لگائی لیکن جس کی مدد اللہ نہ کرے اس کی مدد کوئی نہیں کرتا۔ پھر لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا لوگو! اللہ کے حکم میں کوئی خرابی نہیں بنی اسرائیل پر یہ خدا کی طرف سے لکھا ہوا اور مقدر کیا ہوا امر ہے۔ یہ کہنے کے بعد بیٹھ گیا پھر اس کی گردن مار دی گئی۔

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ اپنے قیدیوں سے بھلائی کرو اور دوپہر کا وقفہ دو اور پانی پلاؤ تاکہ ان کو کچھ ٹھنڈک مل جائے۔ پھر جو باقی رہ گئے ہیں ان کو قتل کر دینا۔ دوہری گرمی کی مار ان پر نہ ڈالو۔ ایک تلوار کی گرمی دوسری سورج کی گرمی۔

گرمی کا موسم تھا اور وہ دن گرم بھی تھا لوگوں نے یہودیوں کو دوپہر کا کچھ وقفہ دیا اور پانی پلایا جب ٹھنڈک ہو گئی تو رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے اور جو لوگ باقی رہ گئے تھے ان کو قتل کر دیا گیا۔

کعب بن اسد کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا حضور ﷺ نے اس سے فرمایا ابن جواس نے تم کو نصیحت کی تھی اور میرے متعلق اس نے سچ کہا تھا مگر تم نے اس کی نصیحت سے فائدہ نہیں اٹھایا کیا اس نے تم کو میرا اتباع کرنے کا مشورہ نہیں دیا تھا اور یہ نہیں کہا تھا کہ اگر تمہاری ملاقات مجھ سے ہو جائے تو مجھے اس کی طرف سے سلام پہنچا دینا۔ کعب نے کہا بے شک ابو القاسم توریت کی قسم (اس نے یہی کہا تھا) اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ یہودی مجھے عار دلائیں گے اور کہیں گے تلوار سے ڈر گیا تو میں آپ کا اتباع ضرور کرتا لیکن اب تو دین یہودیت پر قائم ہوں۔ حضور ﷺ نے حکم دیا اس کو بھی (قتل گاہ میں) پیش کرو۔ چنانچہ اس کی بھی گردن مار دی گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے ہر اس مرد کو قتل کر دینے کا حکم دیا تھا جس کے زیر ناف بال آگئے ہوں۔ امام احمد اور اصحاب السنن نے بیان کیا ہے کہ عطیہ قرظی نے کہا میں (اس زمانہ میں) لڑکا تھا زیر ناف بال نہیں جمے تھے اس لئے مجھے چھوڑ دیا۔

طبرانی نے حضرت اسلم انصاری کا بیان نقل کیا ہے حضرت اسلم انصاری نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے مجھے بنی قریظہ کے قیدیوں پر مامور فرمایا تھا میں لڑکے کی شرمگاہ دیکھتا تھا اگر زیر ناف بال اگے ہوئے نظر آتے تو میں اس کی گردن مار دیتا تھا اگر زیر ناف بال نہ ہوتے تو اس کو میں مسلمانوں کے مال غنیمت میں شامل کر دیتا تھا۔

رفاعہ بن شموال قرظی بالغ ہو چکا تھا لیکن اس نے اسلیط بن قیس کی بہن ام المنذر سلمیٰ بنت قیس کی پناہ حاصل کر لی۔ ام

اور رسول اللہ ﷺ کی خالاؤں میں سے تھی یعنی آپ کے دادا عبدالمطلب کی خالہ تھی۔ عبدالمطلب کی ماں قبیلہ بنی نجار میں سے
تھی سلمیٰ (قدیم الاسلام تھی اس) نے دونوں قبلوں کی طرف نماز پڑھی تھی سلمیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں گزارش کی
اے اللہ کے نبی آپ پر میرے ماں باپ قربان مجھے رفاعہ کو بخش دیجئے اس نے خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ آئندہ نماز پڑھے گا اور
اونٹ کا گوشت بھی کھائے گا (یعنی مسلمان ہو جائے گا اور اونٹ کے گوشت کو شریعت اسلامیہ کے مطابق حلال سمجھے گا)
حضور ﷺ نے رفاعہ کو بطور ہبہ سلمیٰ کو دے دیا۔ رفاعہ کو زندہ چھوڑ دینے کا سبب سلمیٰ ہوئی اس کے بعد رفاعہ مسلمان ہو گیا۔ یہ
سلسلۂ قتل (دن بھر) قائم رہا۔ یہاں تک کہ شفق چھپ گئی۔ اس کے بعد خندق کے اندر مقتولین پر مٹی ڈال دی گئی۔ یہ سب
کچھ حضرت سعد بن معاذ کی نظر کے سامنے ہوا اور اللہ نے ان کی دعا قبول فرمائی۔

(اس روز) سوائے بنی نضیر کی ایک عورت کے اور کسی عورت کو قتل نہیں کیا گیا۔ یہ عورت بنانہ تھی جو بنی قریظہ کے کسی
مرد کے نکاح میں تھی اور زوجین میں بڑا پیار تھا جب یہودیوں کا محاصرہ سخت ہو گیا بنانہ شوہر کے سامنے روئی اور کہا تم مجھ سے جدا
ہو جاؤ گے شوہر نے کہا توریت کی قسم تو اور کسی کام نہیں آسکتی صرف اس چکی کے پاٹ کو اوپر سے مسلمانوں پر لڑکا دے کیونکہ
اب تک ہم ان میں سے کسی کو قتل نہیں کر سکے ہیں تو عورت ہے اگر محمد ہم پر غالب آگئے تو تجھے قتل نہیں کریں گے کیونکہ وہ
عورتوں کو قتل نہیں کرتے ہیں اور یہ مجھے گوارا نہیں کہ تجھے باندی بنا لیا جائے میں چاہتا ہوں کہ (میرے بعد) تجھے قتل کر دیا
جائے۔ بنانہ اس وقت زبیر بن باطا کے قلعہ میں تھی اس نے قلعہ کے اوپر سے چکی کا پاٹ لڑکا دیا مسلمان سایہ لینے کے لئے
قلعہ (کی دیوار) کے نیچے بیٹھ جایا کرتے تھے مسلمانوں نے جب یہ حرکت دیکھی تو منتشر ہو گئے خلاد بن سوید کے اوپر چکی گر پڑی
اور ان کا سر پھٹ کے ٹکڑے ہو گیا اسی سے ان کی وفات ہو گئی۔ عروہ کا بیان ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا واللہ بنانہ میرے پاس
موجود تھی اور خوب ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی اور رسول اللہ ﷺ بنی قریظہ کو تلواروں سے قتل کر رہے تھے۔ دوسری روایت
میں آیا ہے کہ بنانہ (ہنس ہنس کر) کہہ رہی تھی کہ بنی قریظہ کے سردار مارے جا رہے ہیں ایک دم کسی پکارنے والے نے بنانہ کا نام
لے کر آواز دی فلاں عورت کہاں ہے؟ بنانہ نے کہا میں ہوں خدا کی قسم۔ میں نے کہا کم بخت تجھے اس سے کیا تعلق۔ کہنے لگی۔
(اب) میں ماری جاؤں گی میں نے کہا کیوں۔ کہنے لگی میں نے ایک بات کی ہے۔ چنانچہ وہ چلی گئی اور خلاد بن سوید کے عوض اس
کی گردن مار دی گئی۔ حضرت عائشہ فرماتی تھیں میں بنانہ کی خوش طبعی اور ہنسی کی زیادتی نہیں بھولوں گی جب کہ وہ جان چکی تھی کہ
اس کو قتل کیا جائے گا۔ (پھر بھی خوب ہنس رہی تھی)

مسئلہ:- جمہور کا مسلک ہے کہ کسی بھاری چیز سے کوئی کسی کو قتل کر دے تو قصاص لیا جائے گا بنانہ کا واقعہ اس کی
شہادت دے رہا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا بھاری چیز سے قتل کا کوئی قصاص نہیں خواہ کوہ ابو قبیس کسی پر پھینک مارا ہو قتل ہوا یا
زخم اس کا قصاص صرف اس وقت ہو گا جب آلہ دھار والا ہو۔ سورۂ توبہ کی آیت كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ کی تفسیر کے
ذیل میں ہم اس مسئلہ کی تنقیح کر چکے ہیں۔

محمد بن اسحاق نے بروایت زہری بیان کیا ہے کہ دور جاہلیت میں جنگ بعاث کے دن زبیر بن باطا قرظی جس کی کنیت
ابو عبدالرحمن تھی ثابت بن قیس بن شماس کو پکڑ کر لے گیا اور (بجائے قتل کرنے یا غلام بنانے کے) اس کی پیشانی کے بال کاٹ
کر چھوڑ دیا جب بنی قریظہ کا یہ دن آیا تو زبیر قرظی بہت بوڑھا تھا ثابت نے اس سے کہا ابو عبدالرحمن کیا تم مجھے پہچانتے ہو؟ زبیر
نے جواب دیا مجھ جیسا آدمی آپ جیسے آدمی سے کس طرح انجان رہ سکتا ہے ثابت نے کہا آپ نے جو احسان مجھ پر کیا تھا میں آج
اس کا بدلہ دینا چاہتا ہوں زبیر نے کہا شریف لوگ بھلائی کا اچھا بدلہ دیتے ہی ہیں اس کے بعد ثابت رسول اللہ ﷺ کی خدمت
میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ زبیر کا مجھ پر ایک احسان تھا میں چاہتا ہوں کہ اس کا بدلہ اتار دوں۔ حضور ﷺ زبیر کی
جان مجھے عطا فرما دیں فرمایا وہ تم کو بخش دیا گیا۔ ثابت یہ اختیار لے کر زبیر کے پاس آئے اور کہا رسول اللہ ﷺ نے میرے لئے
تمہاری جان بخشی کر دی زبیر نے کہا ایک بڑا بوڑھا جس کے نہ بیوی نہ بچے زندہ رہ کر کیا کرے گا یہ بات سن کر ثابت پھر رسول

اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ زبیر کے بال بچوں کو معاف کر دیجئے۔ فرمایا وہ بھی تمہیں دے دیئے گئے۔ ثابت زبیر کے پاس پہنچے اور کہا تمہارے اہل و عیال رسول اللہ ﷺ نے مجھے ہبہ کر دیئے اور اب میں وہ تم کو دیتا ہوں زبیر نے کہا وہ گھر والے جو حجاز میں ہوں اور ان کے پاس کچھ مال نہ ہو کس طرح جی سکتے ہیں۔ ثابت پھر رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچے اور عرض کیا یا رسول اللہ اس کا مال بھی عطا فرما دیجئے فرمایا وہ بھی تم کو دے دیا گیا۔ ثابت نے زبیر سے جا کر کہا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے تمہارا مال مجھے بخش دیا اب وہ تمہارا ہے۔ زبیر نے کہا ثابت اس شخص کا کیا ہوا جو خوبصورت چینی آئینہ تھا جس کے اندر (پورے) قبیلہ کا چہرہ دکھائی دیتا تھا یعنی کعب بن اسد ثابت نے کہا اس کو قتل کر دیا گیا۔ زبیر نے کہا اچھا اس کا کیا ہوا جو شہریوں کا بھی سردار تھا اور صحرا نشین لوگوں کا بھی دونوں کا سرگروہ تھا۔ لڑائی کے موقع پر لوگوں کو سواریاں عطا کرتا ہے اور قحط کے زمانہ میں کھانا کھلاتا تھا یعنی حیی بن اخطب کہاں گیا ثابت نے کہا وہ بھی مارا گیا۔ زبیر نے کہا عزال بن شمول کا کیا ہوا جو حملہ کرنے کے وقت ہمارا ہراول تھا اور حملے سے مڑنے کے وقت ہمارے لئے حاشیہ ہوتا تھا (یعنی میمنہ اور میسرہ ہو جاتا تھا تاکہ ہماری حفاظت ہو سکے) ثابت نے کہا وہ بھی قتل ہو گیا۔ زبیر نے کہا دونوں نشست گاہوں یعنی بنی کعب بن قریظہ اور بنی عمرو بن قریظہ کی مجلسوں کا کیا ہوا ثابت نے کہا (دونوں مجلسوں کے) لوگ چلے گئے اور مارے گئے زبیر کہنے لگا ثابت میں نے جو بھلائی تیرے ساتھ کی تھی اس کا واسطہ دے کر تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ تو مجھے بھی انہیں لوگوں کے پاس پہنچا دے۔ خدا کی قسم ان کے بعد زندگی کا کوئی مزہ نہیں جس گھر میں وہ لوگ فروکش اور مقیم تھے میں اس گھر میں جا کر ان کے بعد ہمیشہ رہوں مجھے اس کی ضرورت نہیں لیکن ثابت میرے بعد میرے اہل و عیال کا لحاظ رکھنا اپنے ساتھی سے درخواست کرنا کہ وہ ان کو آزاد کر دے اور ان کا مال ان کو دیدے چنانچہ ثابت کی درخواست پر رسول اللہ ﷺ نے زبیر کی بیوی بچوں کو اور باستثناء اسلحہ باقی مال واپس کر دیا۔ زبیر نے کہا ثابت میرا جو حق تجھ پر ہے تجھے اس کا واسطہ مجھے (جلد) ان دوستوں سے ملادے مجھ سے اب اتنی دیر بھی صبر نہیں ہو سکتا جتنی دیر بھرے ہوئے ڈول کو حوض میں الٹ کر دوبارہ ڈول کو کنویں میں ڈالنے میں ہوتی ہے۔ ابن اسحاق کا بیان ہے ثابت نے لے جا کر زبیر کی گردن مار دی۔

محمد بن عمر کا بیان ہے کہ ثابت نے کہا زبیر مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ میں تجھے قتل کر دوں۔ زبیر نے کہا مجھے پرواہ نہیں کہ میرا قاتل کون ہو (تیرے ہاتھ سے مارا جاؤں یا کسی اور کے ہاتھ سے میرے لئے دونوں برابر ہیں) آخر حضرت زبیر بن عوام نے اس کو قتل کر دیا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کو جب زبیر قرظی کے اس قول کی اطلاع ملی کہ میں اپنے دوستوں سے ملوں گا تو آپ نے فرمایا جہنم کی آگ میں وہ اپنے دوستوں سے ہمیشہ ہمیشہ ملاقات کرتا رہے گا۔

اس کے بعد بنی قریظہ کا مال متاع اور عورتوں کی تقسیم کی گئی۔ یہ سب سے پہلا مال مفت تھا جس میں (بعض لوگوں کو دوہرا حصہ ملا۔ مسلمانوں کی تعداد تین ہزار تھی اور ان میں ۳۶ گھوڑے (سوار) تھے۔ کل مال کے ۳۰۷۲ تین ہزار بہتر حصے کئے گئے ہر آدمی کا ایک حصہ اور گھوڑے کا دوہرا حصہ۔

رسول اللہ ﷺ کے تین گھوڑے تھے لیکن حصہ صرف ایک ہی گھوڑے کا مقرر کیا گیا۔ امام ابو حنیفہ، امام مالک اور امام شافعی کا یہی قول ہے اور اسی واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک سوار کے گھوڑے خواہ ایک سے زائد ہوں لیکن حصہ صرف ایک ہی گھوڑے کا لگایا جائے گا۔ صاحبین کے نزدیک ایک سے زائد اگر کسی سوار کے گھوڑے ہوں تو صرف دو گھوڑوں کا حصہ لگایا جائے گا دو سے زائد گھوڑوں کے حصے لگانا باتفاق ائمہ ممنوع ہے۔ سورۂ انفال میں اس کی بحث گزر چکی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت خلاد بن سوید شہید کا بھی حصہ لگایا تھا خلاد کو چکی کا پاٹ اوپر سے گرا کر بنانہ نے شہید کر دیا تھا۔ حضور ﷺ نے سنان بن محصن کا بھی حصہ لگایا جو محاصرہ کے دوران مسلمانوں کے ساتھ شریک تھے پھر وفات پا گئے تھے۔ سنان کے حصہ کا تقرر ائمہ ثلاثہ کے اس قول کو ثابت کر رہا ہے کہ معرکہ میں جو مسلمان شریک ہوا ہو خواہ کافروں کے شکست کھانے اور ان کا مال دار الاسلام میں لا کر جمع کرنے سے پہلے اس کا انتقال ہو جائے اس کا حصہ ضرور لگایا جائے گا۔

ابن ابی شیبہ نے صحیح سند سے حدیث موقوف نقل کی ہے کہ مال غنیمت ان کا ہے جو معرکہ میں حاضر ہوئے ہوں۔ طبرانی نے اس حدیث کو مرفوعاً بھی نقل کیا ہے اور موقوفاً بھی لیکن اس کو موقوف کہنا زیادہ صحیح ہے۔ یہ حدیث حضرت عمرؓ پر موقوف ہے شافعی نے بھی یہ حدیث نقل کی ہے جو حضرت ابو بکرؓ پر موقوف ہے اور منقطع بھی ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے کہ مال غنیمت میں مجاہدین کا استحقاق اس وقت پختہ ہوتا ہے جب دار الاسلام میں لاکر مال جمع کر دیا جائے جو مجاہد اس سے پہلے مر جائے گا یا مارا جائے گا اس کا حصہ مقرر نہیں کیا جائے گا اور اس کے وارثوں کو میراث میں تقسیم نہیں کیا جائے گا اور وہ کمک جو دار الحرب میں مسلمانوں کو مال غنیمت جمع کرنے سے پہلے پہنچ گئی ہو ان کا حصہ مقرر کیا جائے گا۔ کمک کا مسئلہ سورۂ انفال میں گزر چکا ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ:۔ جمہور کے نزدیک سوار کو تین حصے دیے جائیں گے ایک سوار کا دو گھوڑے کے۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک سوار کو دو حصے دیے جائیں گے ایک سوار کا اور ایک گھوڑے کا بنی قریظہ کے مال کی تقسیم کا طریقہ جمہور کے قول کو ثابت کر رہا ہے۔

فائدہ:۔ رسول اللہ ﷺ نے قیدیوں میں سے خمس لے لیا تھا ان ہی میں سے آپ آزاد بھی کرتے تھے اور کسی کو ہبہ بھی کرتے تھے۔ اسی طرح آپ نے نخلستانوں میں سے بھی خمس لیا تھا۔ اس میں سے ہر ایک کے پانچ حصے کئے جاتے اور (رسول اللہ ﷺ کا) پانچواں حصہ محمیہ بن جزز بیدی کے قبضہ میں دے دیا جاتا تھا باقی چار حصے ۵/۴ لوگوں کو تقسیم کر دیئے۔

رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کا کوئی حصہ تو مقرر نہیں کیا تھا لیکن کچھ کچھ مال دیا ضرور تھا۔ اس معرکہ میں مندرجہ ذیل عورتیں موجود تھیں۔ حضرت صفیہ بنت عبد المطلب، حضرت ام عمارہ نسیبہ، حضرت ام علاء انصاریہ، حضرت ام سلیط، حضرت سمیری بنت قیس، حضرت ام سعد بن معاذ، حضرت کبعہ بنت رافع۔

رسول اللہ ﷺ نے کچھ قیدی سعد بن عبادہ کے ساتھ فروخت کرنے کے لئے بھیج دیئے تاکہ ان کی قیمت سے اسلحہ اور گھوڑے خرید لئے جائیں۔ یہ روایت محمد بن عمر کی ہے لیکن ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ سعید بن زید انصاری کے ساتھ بنی قریظہ کے کچھ قیدی بھیجے تھے جن کی قیمت سے سعد نے گھوڑے اور اسلحہ خریدے تھے۔

حضرت عثمان بن عفان اور حضرت عبد الرحمٰن بن عوف نے کچھ قیدی عورتیں شرکت میں خریدی تھیں پھر حضرت عبد الرحمٰن نے خریدی ہوئی عورتیں دو حصوں میں بانٹ دیں۔ بوڑھی عورتوں کو ایک طرف کیا اور جوان عورتوں کو دوسری طرف۔ پھر حضرت عثمان کو اختیار دے دیا کہ جو حصہ آپ چاہیں لے لیں۔ حضرت عثمان نے بوڑھی عورتوں والا حصہ لے لیا اور اس کی وجہ سے بڑے مالدار ہو گئے کیونکہ بوڑھی عورتوں کے پاس سے کثیر مال برآمد ہوا۔

ابن سیرہ نے کہا بوڑھی عورتوں کے پاس سے ایک یا دو ماہ کے بعد مال برآمد ہوا تھا اس لئے ان سے مال لے کر مال غنیمت میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔ حضرت عثمان نے اپنی خریدی ہوئی عورتوں میں سے ہر عورت سے کہہ دیا کہ اتنے وقت میں اتنا مال جو عورت دے گی وہ آزاد کر دی جائے گی چنانچہ جس عورت نے مقررہ مدت میں مال کی مقدار دے دی وہ آزاد کر دی گئی حضرت عثمان نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا۔

عورتوں سے ان کے بچوں کو جدا کرنے کی رسول اللہ ﷺ نے ممانعت فرمادی تھی۔ تقسیم کے وقت بھی اور فروخت کے وقت بھی اور فرمادیا تھا ماں اور اس کے بچہ میں تفریق نہ کی جائے جب تک بچہ بالغ نہ ہو جائے دریافت کیا گیا یا رسول اللہ بالغ ہونے سے کیا مراد ہے فرمایا لڑکی کو حیض آنے لگے اور لڑکے کو احتلام ہونے لگے۔ رواہ الحاکم و صححہ عن عبادۃ بن الصامت۔ حضرت عبادہ بن صامت کی روایت ان الفاظ کے ساتھ بھی آئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ماں اور اس کے بچہ میں جدائی نہ کرو۔ عرض کیا گیا کب تک فرمایا جب تک لڑکا بالغ ہو جائے اور لڑکی کو حیض آنے لگے۔

ابن جوزی نے دار قطنی کا قول نقل کیا ہے کہ اس سند میں عبد اللہ بن عمر بن حسان راوی ضعیف ہے، علی بن مدینی نے اس کو متہم بالکذب کیا ہے۔

ترمذی نے لکھا ہے کہ حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے فرمایا میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ فرمارہے تھے جس نے ماں اور اس کے بچہ میں جدائی کی قیامت کے دن اللہ اس کے اور اس کے پیاروں کے درمیان جدائی کر دے گا۔ ترمذی نے اس روایت کو حسن غریب کہا ہے اور حاکم نے بر شرط مسلم صحیح قرار دیا ہے لیکن اس قول میں کچھ ضعف ہے کیونکہ اس کی سند میں ایک راوی حیی بن عبداللہ بھی ہے جس کے متعلق اختلاف ہے اسی وجہ سے ترمذی نے اس روایت کو صحیح نہیں کہا۔

حاکم نے مستدرک میں حضرت عمران بن حصین کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ملعون ہے وہ جس نے ماں اور اس کے بچہ میں جدائی کر دی ہو۔ حاکم نے کہا اس حدیث کی سند صحیح ہے لیکن اس کی سند میں طلیق بن محمد شامل ہے حاکم نے کبھی یہ روایت از طلیق بن محمد از عمران بن حصین بیان کی ہے کبھی از طلیق از ابی بردہ اور کبھی از طلیق عن رسول اللہ ﷺ (براہ راست)

میں کہتا ہوں اس تضاد بیان کی توفیق اس طرح ہو سکتی ہے کہ طلیق نے کبھی یہ حدیث عمران سے سنی ہو کبھی ابوبردہ سے اور تیسری روایت میں کسی صحابی کا ذکر نہ کیا ہو جس کی وجہ سے یہ روایت مرسل ہو گئی۔

ابن قطان نے کہا یہ روایت صحیح نہیں ہے کیونکہ طلیق نامعلوم ہے۔

ابن ہمام نے کہا ابن قطان کی مراد صرف اس سلسلہ روایت کی تغلیط ہے ورنہ یہ حدیث مختلف طریقوں سے روایت کی گئی ہے الفاظ کے اختلاف کی وجہ سے معنی مشترک ہیں جو صحیح ہے یعنی ماں کو بچہ سے جدا کرنے کی ممانعت کر دی گئی ہے۔

دارقطنی نے بوساطت میمون بن ابی شبیب حضرت علی کا قول نقل کیا ہے کہ میں نے ایک باندی اور اس کے بچہ میں جدائی کر دی (یعنی ایک کو فروخت کر دیا دوسرے کو اپنے پاس رکھا) رسول اللہ ﷺ نے اس کی ممانعت فرمادی اور بیع لوٹا دی۔ ابوداؤد نے منقطعاً یہ لفظ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کو واپس کر دیا ابن ہمام نے کہا مرسل ہونا ہمارے نزدیک ضعف نہیں پیدا کرتا۔ حاکم نے اس کو صحیح سند کے ساتھ بیان کیا ہے اور بیہقی نے اس کو ترجیح دی ہے۔

مسئلہ: اسی حدیث سے امام ابوحنیفہ نے استنباط کیا ہے کہ بیع یا ہبہ وغیرہ کے ذریعہ سے ان دو چھوٹے غلاموں میں تفریق کرنا جو باہم قرابت دار محرم ہوں ناجائز ہے اسی طرح نابالغ اور بالغ میں تفریق کرنا بھی ناجائز ہے جو ایک دوسرے کے قرابت دار محرم ہوں۔ امام احمد کے نزدیک اگر دو بالغ باہم محرم ہوں تو ان کو جدا کرنا بھی جائز نہیں۔

امام مالک نے کہا عدم تفریق کا یہ حکم صرف ماں اور اس کے بچہ سے تعلق رکھتا ہے کیونکہ حدیث مذکور میں اتنا ہی آیا ہے۔

امام شافعی نے کہا بچہ کو اس کے ماں باپ سے جدا نہ کیا جائے خواہ کتنے ہی اونچے ہوں (یعنی دادا پر دادا نانا پر نانا دادی پر دادی نانی پر نانی وغیرہ) تمام اصول کا حکم وہی ہے جو ماں کا ہے۔

امام ابوحنیفہ اور امام احمد نے باہم محرم ہونے کو مانع تفریق قرار دیا ہے کیونکہ بعض احادیث میں اصول و فروع کے علاوہ بھی تفریق کرنے کی ممانعت آئی ہے۔ حضرت علیؓ کا بیان ہے مجھے رسول اللہ ﷺ نے دو غلام (نابالغ) عطا فرمائے جو بھائی بھائی تھے میں نے ایک کو فروخت کر دیا حضور ﷺ نے دریافت فرمایا علی وہ لڑکا کیا ہوا؟ میں نے واقعہ عرض کر دیا فرمایا اس کو واپس لے لو۔ ترمذی نے لکھا ہے یہ حدیث حسن غریب ہے لیکن ابوداؤد نے اس پر گرفت کی اور کہا یہ حدیث میمون بن شبیب نے حضرت علی کی روایت سے بیان کی ہے اور میمون نے حضرت علی کو نہیں پایا اس لئے یہ حدیث مرسل ہوئی اور ہمارے نزدیک مرسل حدیث قابل استدلال ہے حاکم اور دارقطنی نے ایک اور طریق سے بوساطت عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ حضرت علی کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس کچھ قیدی آئے حضور ﷺ نے مجھے فرمایا کہ ان میں سے دو بھائیوں کو فروخت کر دوں میں نے دونوں کو الگ الگ فروخت کر دیا پھر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اطلاع دے دی۔ حضور ﷺ نے فرمایا (جلد) پہنچو اور ان کو واپس لے لو اور یکجا کر کے ان کو فروخت کرو۔ ایک کو دوسرے سے جدا نہ کرو۔ حاکم نے اس روایت کو بر شرط شیخین صحیح کہا ہے اور ابن قطان نے بھی کہا ہے اس سند میں کوئی عیب نہیں اس مبحث میں یہ روایت سب سے زیادہ قابل

اعتماد ہے۔ ایک اور طریق سے امام احمد اور بزار نے بھی اس کو بیان کیا ہے ابن ہمام نے کہا اس روایت میں انقطاع ہے لیکن ہمارے معروف ضابطہ کے بموجب اس میں کوئی نقص نہیں ہے۔

دار قطنی نے بوساطت طلیق بن عمران از ابی بردہ حضرت ابو موسیٰؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس شخص پر لعنت فرمائی جو ماں کو اس کے بچے سے اور بھائی کو بھائی سے جدا کر دیتا ہے۔ جب بھائی کو بھائی سے جدا کرنے کی ممانعت (اس حدیث سے) ثابت ہو گئی تو معلوم ہوا کہ تفریق سے مانع قرابت مع محرمیت ہے اگر دودھ پینے کی وجہ سے محرمیت پیدا ہو گئی ہو یا قرابت ہو مگر محرمیت نہ ہو مثلاً دونوں باہم چچازاد ہوں تو تفریق کی ممانعت ان پر لاگو نہ ہو گی۔

مسئلہ:۔ اگر ماں اور اس کے بچے میں جدائی کر دی اور ایک کو فروخت کر دیا تو امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک بیع نافذ ہو جائے گی لیکن ایسا کرنے والا گناہ گار ہو گا۔

امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک بیع ہی باطل ہو گی نافذ نہیں ہو گی۔ اسی طرح امام احمدؒ کے نزدیک اس صورت میں بھی بیع باطل ہو گی جس میں قرابت ولادت کا تعلق نہ ہو (بلکہ رضاعت وغیرہ کا رشتہ ہو) امام ابو یوسفؒ کے نزدیک صرف قرابت ولادت کی صورت میں بیع فاسد ہو گی دوسری روایت میں امام ابو یوسف کے نزدیک دونوں صورتوں میں بیع فاسد ہو گی خواہ دونوں میں قرابت ولادت ہو یا کوئی دوسری محرمیت ہو (جیسے رشتۂ رضاعت وغیرہ)

ائمہ کے اس اختلاف کی بناء ایک بنیادی ضابطہ کے اختلاف پر ہے اگر بغیر کسی قرینہ کے مشروعات سے ممانعت کر دی گئی ہو تو ایسی ممانعت مشروعات کو باطل کر دیتی ہے یہ تینوں اماموں کا قول ہے۔

امام ابو حنیفہؒ اور صاحبینؒ کے نزدیک ایسی ممانعت موجب فساد ہونا چاہئے (موجب بطلان نہیں۔ ارکان بیع موجود ہیں تراضی طرفین بھی ہے پھر بیع کے باطل ہونے کی کوئی وجہ نہیں) لیکن طرفین کے نزدیک تفریق کن بیع کی ممانعت ایک بیرونی وجہ سے کر دی گئی ہے۔ جیسے اذان جمعہ کے وقت بیع کی ممانعت کر دی گئی ہے اور امر خارجی کی وجہ سے اگر ممانعت ہو تو اس سے نفس بیع میں فساد نہیں ہوتا ہاں اگر کسی وصف لازم کی وجہ سے ممانعت کی گئی ہو تو موجب فساد ہے۔

امام ابو یوسف کے قول کی یہ وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی کو واپسی بیع کا حکم دیا تھا اور واپسی اسی وقت ممکن ہے جب عقد فاسد ہو۔ امام ابو حنیفہ نے حکم واپسی کو طلب اقالہ قرار دیا ہے (اور طلب اقالہ سابق بیع کے فسخ کرنے کی طلب ہوتی ہے اور سابق بیع کو فسخ کر دینے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ پہلی بیع فاسد ہو)

مسئلہ:۔ حضرت عبادہ بن صامت کی حدیث اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ اگر دونوں غلام یا باندیاں بالغ ہوں (خواہ دونوں کے درمیان کیسا ہی قریبی رشتہ ہو تو) دونوں کو الگ الگ کر دینا جائز ہے۔

امام احمد کے نزدیک ناجائز ہے کیونکہ احادیث کے الفاظ مطلق ہیں اور ابن جوزی نے حضرت عبادہ کی روایت کا رد کر دیا ہے۔

ہماری دلیل حضرت سلمہ بن اکوع کی حدیث ہے حضرت سلمہ نے بیان کیا کہ ہم حضرت ابو بکرؓ کے ہمراہ بنی فزارہ سے جہاد کرنے کو نکلے۔ اس بیان میں ہے کہ میں ان کو گرفتار کر کے لایا ان میں ایک عورت بھی تھی جس کے ساتھ اس کی بیٹی بھی جو عرب کی حسین ترین لڑکی تھی۔ حضرت ابو بکر نے وہ لڑکی مجھے عطا فرما دی جب میں (اس کو لے کر) مدینہ میں آیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سلمہ یہ عورت مجھے دے دے۔ میں نے عرض کیا یہ آپ کی ملک ہو گئی۔ حضور ﷺ نے اس لڑکی کو دے کر تین (مسلمان) قیدیوں کو رہا کرا لیا۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ مقوقس شاہ اسکندریہ نے دو باندیاں بطور ہدیہ رسول اللہ کی خدمت میں بھیجیں ایک ماریہ قبطیہ دوسری سیرین۔ حضور ﷺ نے سیرین تو حسان بن ثابت کو عطا فرما دی جس کے بطن سے عبدالرحمن بن حسان پیدا ہوئے اور حضرت ماریہ کو اپنے پاس رکھا جن کے بطن سے حضور کے صاحبزادے حضرت ابراہیم پیدا ہوئے۔

ابن عبدالبر نے یہ حدیث استیعاب میں ذکر کی ہے بزار نے کہا یہ حدیث صحیح ابن خزیمہ میں بھی آئی ہے۔

مسئلہ :- اگر چھوٹے بچہ کے ساتھ اس کے ماں باپ دونوں ہوں تو تینوں میں سے کسی ایک کو الگ فروخت نہیں کر سکتا اگر بچہ کے ساتھ اس کی ماں اور بھائی ہو یا ماں اور پھوپھی ہو یا ماں اور خالہ ہو یا ماں اور بھائی (بڑا) ہو تو ماں (اور بچہ) کے علاوہ سب کی بیع انفرادا صحیح ہے کیونکہ ماں کی شفقت کے بعد کسی دوسرے قرابت دار کی نگہداشت کی ضرورت نہیں رہتی اگر چھ بھائی ہوں تین بڑے تین چھوٹے اور ہر چھوٹے کے ساتھ ایک بڑے کو فروخت کر دے تو جائز ہے۔

اگر چھوٹے بچے کے ساتھ اس کی دادی اور پھوپھی اور خالہ ہو تو پھوپھی اور خالہ کو الگ کر کے فروخت کر دینا جائز ہے۔

اگر بچہ کے ساتھ صرف اس کی پھوپھی اور خالہ ہو دادی نہ ہو تو تنہا خالہ اور پھوپھی کو بیچنا جائز نہیں۔

اس کا ضابطہ یہ ہے کہ اگر بچہ کے ساتھ اس کے رشتہ داروں کی ایک تعداد ہو جس میں کچھ قریب ترین رشتہ رکھتے ہوں کچھ دور کا تو دور والے کو الگ فروخت کرنا جائز ہے اور تنہا اقرب کی بیع درست نہیں اور سب ایک ہی درجہ میں ہوں اور مختلف الجنس ہوں جیسے ماں اور باپ ہوں اور خالہ پھوپھی ہوں تو الگ کر کے کسی کو فروخت کرنا صحیح نہیں یا سب کو فروخت کیا جائے یا کسی کو نہ بیچا جائے اور اگر ایک ہی جنس کے ہوں جیسے دو بھائی ہوں دو چچا ہوں تو چھوٹے بچے کے ساتھ ایک کو چھوڑ دینا اور باقی کو فروخت کر دینا جائز ہے۔

مسئلہ :- تکمیل الارشاد میں بیان کیا گیا ہے کہ بنی قریظہ کی قیدی مائیں اور ان کے چھوٹے بچے ساتھ ساتھ عرب کے مشرکوں اور یہودیوں کے ہاتھ فروخت کئے جاتے تھے لیکن جس چھوٹے بچے کے ساتھ اس کی ماں نہ ہوتی تو اس کو سوائے مسلمان کے نہ یہودی کے ہاتھ فروخت کیا جاتا تھا نہ مشرک کے ہاتھ۔ کیونکہ چھوٹا بچہ اگر اپنے کافر باپ یا ماں کے ساتھ گرفتار ہو کر آئے تو اس کو کافر قرار دیا جاتا ہے اس لئے اس کی فروخت کافر کے ہاتھ بھی درست ہے اور جو بچہ تنہا گیا ہو نہ ماں اس کے ساتھ ہو نہ باپ تو تبدیل دار ہونے کی وجہ سے اس کو مسلمان سمجھا جائے گا۔

واقعہ بنی قریظہ کے دن خلاد بن سوید اور منذر بن محمد شہید ہو گئے۔

فائدہ :- بنی نضیر کے خاندان کی ایک عورت تھی جس کا نام ریحانہ بنت زید بن عمرو بن خنافہ تھا یہ بنی عمرو بن قریظہ میں بیاہی گئی تھی عورت تھی خوبصورت۔ رسول اللہ ﷺ کو بھا گئی آپ نے اس کے سامنے اسلام پیش کیا لیکن اس نے مسلمان ہونے سے انکار کر دیا۔ حضور ﷺ اس سے کنارہ کش ہو گئے لیکن دل میں اس کا خیال رہا۔ اس لئے ابن سعیہ کو طلب فرما کر ان سے اس کا تذکرہ کیا ابن سعیہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ پر میرے ماں باپ قربان وہ مسلمان ہو جائے گی۔ ابن سعیہ یہاں سے نکل کر ریحانہ کے پاس پہنچے اور اس سے کہنے لگے اب اپنی قوم کی طلب چھوڑ دو تم نے دیکھ لیا کہ حیی بن اخطب کیسی مصیبت ان پر لے آیا اب مسلمان ہو جاؤ رسول اللہ ﷺ تم کو اپنے لئے پسند فرمالیں گے۔ ریحانہ نے ابن سعیہ کی بات مان لی۔ ادھر رسول اللہ ﷺ صحابہ کے ساتھ تشریف فرما تھے اچانک حضور ﷺ کو جوتوں کی آواز سنائی دی فرمایا یہ تو ابن سعیہ کے جوتوں کی آواز ہے مجھے ریحانہ کے مسلمان ہونے کی بشارت دینے آرہا ہے۔ چنانچہ ابن سعیہ آگئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ریحانہ مسلمان ہو گئی یہ بات سن کر حضور ﷺ خوش ہو گئے۔ ریحانہ حضور ﷺ کی وفات تک آپ کے پاس رہی اور مملوک ہونے کی حالت میں ہی رہی۔ رسول اللہ ﷺ چاہتے تھے کہ ریحانہ سے نکاح کر لیں اور اس کو پردہ میں رکھیں لیکن ریحانہ نے کہا یا رسول اللہ ﷺ مجھے یوں ہی اپنی ملکیت میں ہی رہنے دیجئے (آزاد نہ کیجئے) میرے اور آپ کے لئے یہی بات آسان ہے (نہ اس میں آپ کو کوئی تکلیف نہ مجھے) اس لئے حضور ﷺ نے ان کو باندی (ہی کی صورت میں) رہنے دیا۔

فائدہ :- جب بنی قریظہ کا قصہ ختم ہو گیا تو حضرت سعد بن معاذؓ کا زخم بھی کھل گیا۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ سب سعدؓ کے پاس (ان کو دیکھنے) گئے (عمر رونے لگے) اس وقت میں اپنے حجرہ میں تھی اس خدا کی قسم جس کے قبضہ میں محمد ﷺ کی جان ہے میں نے عمر کے رونے کی آواز ابو بکر کے رونے کی آواز سے الگ

پہچان لی اور یہ لوگ ایسے ہی تھے جیسا اللہ نے فرمایا ہے۔ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ

مناقب سعد بن معاذ

حضرت انسؓ راوی ہیں کہ جب سعد کا جنازہ اٹھایا تو منافقوں نے کہا سعد کا جنازہ کتنا ہلکا ہے اس کی وجہ وہ فیصلہ تھا جو بنی قریظہ کے متعلق حضرت سعد نے کیا تھا۔ حضور ﷺ کو یہ اطلاع پہنچی تو فرمایا فرشتے اس کو اٹھائے ہوئے ہیں۔ رواہ الترمذی

حضرت جابرؓ کا بیان ہے کہ میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے سعد بن معاذ کے مرنے سے رحمٰن کے عرش میں لرزہ آگیا رواہ الشیخان فی صحیحیہما۔

حضرت براء بن عازبؓ کی روایت ہے کہ کپڑوں کا ایک جوڑا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں (کہیں سے) بطور ہدیہ آیا صحابہؓ اس کو ہاتھوں سے چھونے لگے اور اس کی نرمی پر تعجب کرنے لگے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم لوگ اس کی نرمی پر کیا تعجب کرتے ہو۔ جنت میں سعد بن معاذ کے رومال اس سے اچھے اور نرم ہیں۔ متفق علیہ۔

بغوی وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ امہات المومنینؓ نے رسول اللہ ﷺ سے کچھ دنیوی ساز و سامان مانگا اور مصارف میں کچھ وسعت کی طلب گار ہوئیں۔ اس سے رسول اللہ ﷺ کو کچھ اذیت ہوئی اس لئے آپ سب بیویوں سے کنارہ کش ہو گئے اور قسم کھائی کہ ایک ماہ تک کسی کے پاس نہیں جائیں گے اور کاشانۂ نبوت سے برآمد بھی نہیں ہوئے۔ صحابہ کو فکر ہوئی کہ جانے کیا بات ہے کچھ لوگ کہنے لگے رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی۔ حضرت عمرؓ نے کہا میں تم کو بتاؤں گا کہ اصل بات کیا ہے۔ حضرت عمرؓ کا بیان ہے میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور عرض کیا یا رسول اللہ کیا حضور نے بیویوں کو طلاق دے دی۔ فرمایا نہیں۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ مسجد میں مسلمان کہہ رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے طلاق دے دی کیا میں اب جا کر ان سے کہہ دوں کہ حضور نے طلاق نہیں دی۔ فرمایا ہاں اگر تم چاہو تو میں جا کر مسجد کے دروازہ پر کھڑا ہو گیا اور انتہائی اونچی آواز سے پکار کر کہا رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیویوں کو طلاق نہیں دی ہے۔ اور یہ آیت نازل ہوئی وَاِذَا جَآءَھُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ اور اگر ان کے پاس خوف یا امن کی کوئی خبر آتی ہے تو (بلا تحقیق) اس کو پھیلاتے ہیں اور اگر اس خبر کو رسول کی جانب اور اپنے سمجھدار لوگوں کی جانب راجع کر دیتے تو اصل واقعہ کا استنباط کرنے والوں کو اس کا (صحیح) علم ہو جاتا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا میں نے اس خبر کی حقیقت دریافت کی تھی۔ امہات المومنینؓ کے اس واقعہ کے متعلق اللہ نے آیات ذیل نازل فرمائیں۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا۝ اے نبی اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تم دنیوی زندگی اور اس کی سجاوٹ کی خواستگار ہو تو آؤ میں تم کو سامان دے دوں اور خوبصورتی کے ساتھ تم کو رخصت کر دوں۔

زِيْنَتَهَا یعنی روزی کی وسعت، راحت اور دنیوی آرائش کی چیزیں۔

فَتَعَالَيْنَ اس کا اصل لغوی ترجمہ ہے اوپر چڑھ آؤ لیکن عرف عام میں اس کا معنی ہو گیا آؤ اس جگہ مطلب یہ ہے کہ اپنے ارادے اور اختیار سے طلاق مانگنے آ جاؤ۔

اُسَرِّحْكُنَّ میں تم کو آزاد کر دوں یعنی طلاق دے دوں۔

سَرَاحًا جَمِيْلًا یعنی بغیر ضرر پہنچائے تم کو آزاد کر دوں۔

وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ اور اگر تم اللہ (کے قرب و رضامندی) کی اور اس کے رسول (کے قرب) کی اور دار آخرت (کی راحت و آسائش کی) خواستگار ہو۔

فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا۝ تو بلاشبہ اللہ نے تم میں سے نیکوکاروں کے لئے اجر عظیم تیار کر رکھا ہے یعنی ان عورتوں کے لئے اجر عظیم تیار کر رکھا ہے جو اللہ اس کے رسول اور دار آخرت کی طلبگار

ہیں ایسی ہی عورتیں محسنہ ہیں احسان کا معنی ہی یہ ہے کہ رب کی عبادت اتنے حضور قلب سے کی جائے کہ گویا رب نظروں کے سامنے ہے۔

بغوی نے لکھا ہے اس زمانہ میں رسول اللہ ﷺ کی نو بیویاں تھیں پانچ قریشی حضرت عائشہ بنت صدیق اکبر، حضرت حفصہ بنت عمر فاروق، حضرت ام حبیبہ بنت ابو سفیان، حضرت ام سلمہ بنت امیہ، حضرت سودہ بنت زمعہ، باقی چار قریشی نہیں تھیں۔ حضرت زینب بنت جحش اسدی، حضرت میمونہ بنت حارث ہلالی، حضرت صفیہ بنت حی ابن اخطب خیبری اسرائیلی، حضرت جویریہ بنت حارث مصطلقی۔

جب آیت تخییر (مندرجہ بالا) نازل ہوئی تو سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا آپ رسول اللہ ﷺ کی سب سے زیادہ چہیتی بی بی تھیں۔ حضور نے ان کے سامنے آیت پڑھی اور ان کو (طلاق حاصل کرنے یا ساتھ رہنے کا) اختیار دیا۔ حضرت عائشہؓ نے اللہ اس کے رسول اور دار آخرت کو اختیار کیا اور اس بات سے حضور کے چہرہ پر خوشی محسوس کی۔ دوسری بیویوں نے بھی حضرت عائشہؓ کی پیروی کی۔

قتادہ کا بیان ہے کہ جب امہات المومنین نے اللہ اس کے رسول اور دار آخرت کو اختیار کیا تو اللہ نے بھی ان کی قدر افزائی کی اور رسول اللہ ﷺ کو انہیں بیویوں پر بس کرنے کا اور آئندہ نکاح نہ کرنے کا حکم دے دیا اور فرمایا لَا یَحِلُّ لَکَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ ان کے بعد تمہارے لئے اور عورتوں سے نکاح جائز نہیں۔

مسلم احمد اور نسائی نے بوساطت ابو الزبیر حضرت جابرؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے بارگاہ نبوت میں داخلہ کی اجازت طلب کی لیکن آپ کو اجازت نہیں ملی، پھر حضرت عمر آئے اور انہوں نے اجازت طلب کی ان کو بھی اجازت نہیں ملی، کچھ دیر کے بعد دونوں کو اجازت دے دی۔ دونوں حضرات اندر پہنچ گئے۔ رسول اللہ ﷺ اس وقت غمگین خاموش بیٹھے ہوئے تھے، گردا گرد آپ کی بیویاں موجود تھیں۔ حضرت عمر نے (اپنے دل میں) کہا مجھے کوئی ایسی بات کہنی چاہئے جس سے رسول اللہ ﷺ ہنس پڑیں حضرت عمر کا بیان ہے (یہ خیال کر کے) میں نے عرض کیا دیکھئے اگر خارجہ کی بیٹی (یعنی میری بی بی) مجھ سے (زائد خرچ) مانگتی تو میں اٹھ کر اس کی گردن توڑ دیتا۔ یہ بات سن کر رسول اللہ ﷺ کو ہنسی آ گئی اور فرمایا تم دیکھ رہے ہو کہ میرے گردا گرد یہ عورتیں جمع ہیں اور مجھ سے زیادہ خرچ دینے کی خواستگار ہیں اس بات سنتے ہی حضرت ابو بکر عائشہ کی گردن پر ضرب رسید کرنے اٹھ کھڑے ہوئے اور حضرت عمر بھی حفصہ کی طرف گردن پر ضرب لگانے کے لئے بڑھے اور دونوں نے کہا رسول اللہ کے پاس جو چیز نہیں ہے اس کا سوال رسول اللہ ﷺ سے ہرگز کبھی نہ کرنا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ سب عورتوں سے ایک مہینہ یعنی انتیس روز کنارہ کش رہے پھر یہ آیت نازل ہوئی۔

راوی کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابتداء حضرت عائشہ سے کی اور فرمایا عائشہ میں ایک بات تمہارے سامنے رکھنا چاہتا ہوں اور میری خواہش ہے کہ اپنے والدین سے مشورہ کئے بغیر تم جواب دینے میں جلدی نہ کرنا۔ حضرت عائشہ نے کہا اے اللہ کے رسول وہ کیا بات ہے؟ حضورؐ نے آیات مذکورہ پڑھ کر سنا دیں۔ حضرت عائشہ نے کہا یا رسول اللہ کیا آپ کے بارے میں میں اپنے ماں باپ سے مشورہ کروں (ایسا نہیں ہو سکتا) میں تو اللہ اس کے رسول اور دار آخرت کو اختیار کرتی ہوں لیکن آپ سے میری درخواست ہے کہ اپنی بیویوں میں سے کسی کو میرے اس فیصلہ کی اطلاع آپ نہ دیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا مجھ سے تو جو عورت بھی پوچھے گی میں اس کو بتادوں گا اللہ نے مجھے فتنہ انگیز بنا کر نہیں بلکہ سعادت دہندہ اور معلم بنا کر مبعوث کیا ہے۔

صحیح میں زہری کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک ماہ تک اپنی بیویوں کے پاس نہ جانے کی قسم کھائی تھی۔ مجھ سے عروہ نے حضرت عائشہ کا قول نقل کیا ہے کہ ۲۹ روز کے بعد رسول اللہ ﷺ سب سے پہلے میرے پاس تشریف لائے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ نے تو قسم کھائی تھی کہ ہمارے پاس ایک ماہ تک نہیں آئیں گے اور آج تو ۲۹ دن ہوئے ہیں گن رہی ہوں فرمایا مہینہ ۲۹ دن کا ہے۔

فائدہ:۔ بغوی نے لکھا ہے کہ علماء میں اختلاف ہے کہ یہ اختیار جو رسول اللہ ﷺ نے بیویوں کو دیا تھا کیا یہ تفویض طلاق تھی کہ اگر عورتیں اپنے نفس کو اختیار کر لیتیں تو فوراً طلاق پڑ جاتی (مزید طلاق دینے کی ضرورت نہیں ہوتی) یا ایسا نہ تھا (بلکہ) اس سے محض عورتوں کی مرضی کا اظہار ہو جاتا اور پھر بھی طلاق کا اختیار رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں رہتا) بعض علماء کہتے ہیں یہ تفویض طلاق تھی لیکن حسن، قتادہ اور اکثر اہل علم کا قول ہے کہ یہ تفویض طلاق نہ تھی بلکہ طلب طلاق کا اختیار دیا گیا تھا اگر عورتیں دنیا کو پسند کر لیتیں تو رسول اللہ ﷺ ان کو چھوڑ دیتے (یعنی طلاق دے دیتے) کیونکہ آیت میں آیا ہے فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ (اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ اگر عورتیں دنیا کو اختیار کر لیتیں تب بھی آزاد کرنے کا اختیار رسول اللہ ﷺ کے ہی ہاتھ میں رہتا)

مسئلہ:۔ اگر شوہر نے بیوی سے کہا تجھے اپنا اختیار ہے اور اس جملہ سے اس کا مطلب تفویض طلاق ہو یعنی یہ مقصود ہو کہ عورت چاہے تو خود اپنے کو طلاق دے لے تو اس مجلس میں عورت جب تک رہے گی اس کو اختیار رہے گا کہ اگر چاہے تو اپنے آپ کو خود طلاق دے لے لیکن اگر اس جگہ سے اٹھ جائے گی یا کسی اور کام میں مشغول ہو جائے گی تو طلاق کا اختیار ہاتھ سے نکل جائے گا کیونکہ یہ تملیک فعل ہے اور تملیک فعل کا تقاضا ہے کہ اسی مجلس میں جواب دیا جائے جیسے بیع میں (قبول کا اختیار اسی مجلس عقد میں رہتا ہے) صاحب ہدایہ نے لکھا ہے عورت کو خیار مجلس باجماع صحابہ ثابت ہے۔

ابن ہمام کا بیان ہے کہ ابن منذر نے کہا اگر مرد عورت کو اختیار (یعنی تفویض طلاق) دے دے تو یہ اختیار کب تک رہتا ہے، اس میں علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت ابن مسعودؓ کا قول ہے کہ عورت کو آخر مجلس تک اختیار رہتا ہے مجلس سے اٹھ جائے گی تو اختیار ساقط ہو جائے گا، مختلف اسنادوں سے ان بزرگوں کا یہ قول مروی ہے لیکن ان سندوں میں کلام کیا گیا ہے۔

حضرت جابر بن عبداللہ، عطا، مجاہد، شعبی، نخعی، امام مالک، سفیان ثوری، اوزاعی، شافعی، ابو ثور اور اصحاب رائے کا یہی مسلک ہے لیکن زہری، قتادہ، ابو عبیدہ، ابن نصر اور بعض دوسرے علماء کہتے ہیں کہ عورت کو اختیار اس مجلس کے بعد بھی رہتا ہے۔ ابن منذر نے کہا ہم بھی اسی کے قائل ہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ سے فرمایا تھا اپنے والدین سے مشورہ کئے بغیر (جواب دینے میں) جلدی نہ کرنا۔ صاحب مغنی نے یہی قول حضرت علی کا روایت کیا ہے۔

ابن ہمام نے ابن المنذر کے جواب میں کہا ہے کہ حضرت علی کا قول مذکور متفق علیہ نہیں ہے۔ دوسری روایت میں حضرت علیؓ کا قول بھی جماعت صحابہ کے قول کے موافق آیا ہے۔ امام محمد نے بلاغات میں اس کی صراحت کی ہے لکھا ہے ہم کو یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت ابن مسعود اور حضرت جابر نے فرمایا جو شخص اپنی بیوی کو اس کے نفس کا اختیار دے دے تو عورت کو اختیار اس وقت تک رہتا ہے جب تک وہ اس مجلس میں رہے جب مجلس سے اٹھ جائے گی تو اس کو اختیار نفس نہیں رہے گا۔ کسی دوسرے صحابی کا قول بھی اس کے خلاف منقول نہیں لہٰذا اس پر اجماع سکوتی ہو گیا۔ رہی یہ بات کہ روایات کی اسنادوں میں کلام کیا گیا ہے تو اس سے اصل مسئلہ پر اثر نہیں پڑتا کیونکہ امت اسلامیہ نے اس قول کو بالاتفاق قبول کر لیا ہے اس کے علاوہ عبدالرزاق نے جو حضرت جابر بن عبداللہ اور حضرت ابن مسعود کا قول جس سند سے نقل کیا ہے وہ کھری ہے (اس سند میں کوئی کلام نہیں) رہا ابن منذر کا حدیث کے لفظ لَا تَسْتَعْجِلِي سے استدلال تو یہ بھی غلط ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے طلاق کی تفویض نہیں کی تھی (طلب طلاق کا اختیار دیا تھا) اور ہماری بحث اس مسئلہ میں ہے جب کہ شوہر نے تفویض طلاق کر دی اور خود اپنے آپ کو طلاق دے لینے کا اختیار دے دیا ہو) آیت فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا بھی اس پر دلالت کر رہی ہے۔

مسئلہ:۔ اگر شوہر نے بیوی سے کہا تجھے اپنا اختیار ہے تو تفویض طلاق کی نیت ضرور اس وقت ہونی چاہئے کیونکہ ممکن ہے کہ شوہر بیوی کو کسی اور چیز کا اختیار دے رہا ہو اور یہ مقصود ہو کہ تجھے خود اس کام کو کرنے یا نہ کرنے کا اختیار ہے)

مسئلہ:۔ اگر شوہر نے بیوی سے کہا تجھے اپنا اختیار ہے اور اس نے جواب میں کہا میں نے اپنے نفس کو اختیار کر لیا تو حضرت عمر، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت ابن عباس کے نزدیک ایک رجعی طلاق ہو جائے گی کیونکہ شوہر کی طرف سے تفویض اختیار کا معنی ہے تفویض طلاق اور جب عورت نے اختیار نفس کا اظہار کر دیا تو ایسا ہو گیا جیسے اس نے یہ لفظ کہہ دیے کہ میں نے اپنے آپ کو طلاق دے لی اور اس طرح لفظ طلاق سے طلاق رجعی واقع ہوتی ہے اس کے علاوہ آیت قرآنی سے بھی ثابت ہے کہ تیسری طلاق کے بعد تو خیر رجوع نہیں کیا جا سکتا البتہ پہلی اور دوسری طلاق کے بعد رجوع کا حق باقی رہتا ہے۔

حضرت زید بن ثابت کا قول آیا ہے کہ صورت مذکور میں تین طلاقیں پڑ جاتی ہیں۔ جس عورت سے قربت کی جا چکی ہو اس کے معاملہ میں امام مالک کا قول بھی حضرت زید کے قول کے موافق ہے اور غیر مدخولہ کے معاملہ میں اگر ایک طلاق مراد ہونے کا دعویٰ کیا جائے تو قبول کر لیا جائے گا۔ حضرت زید کے قول کی وجہ یہ ہے کہ تفویض اختیار کی صورت میں اختیار طلاق کا حق صرف عورت کو ہونا ضروری ہے عورت کی رضامندی کے بغیر شوہر کو اس پر حق تسلط باقی نہ رہنا چاہئے اگر مرد کو رجوع کا حق رہتا ہو تو عورت کو تفویض طلاق کا کیا فائدہ عورت چاہے یا نہ چاہے مرد بہر طور رجوع کر سکے گا اور عورت کو اس قسم کا خصوصی حق اس وقت ہو سکتا ہے جب عورت کی اختیار کردہ طلاق کو بائن کہا جائے غیر بائن طلاق کے بعد تو تین طلاقوں کے علاوہ اور کسی صورت سے حق رجوع ساقط نہیں ہوتا لہٰذا عورت کی اختیار کردہ طلاق کو تین طلاقیں قرار دینا ضروری ہے۔

حضرت علی کا قول روایۃً ثابت ہے کہ ایک بائنہ طلاق واقع ہو گی، یہی امام ابو حنیفہ کا قول ہے کیونکہ تفویض اختیار کے بعد طلاق کا اختیار صرف عورت ہی کو مل جاتا ہے (مرد کو رجوع کا حق نہیں رہتا) اور یہ جب ہی ہو گا کہ عورت کی اختیار کردہ طلاق کو بائنہ کہا جائے اور طلاق بائن بغیر تین طلاقوں کے بھی ہوتی ہے جیسے طلاق بالمال ہو یا طلاق قبل الدخول ہو اس لئے اس طلاق بائنہ کو تین طلاقیں قرار دینے کی کوئی ضرورت نہیں (کیونکہ بائنہ ایک ہو یا تین اس کے بعد بینونت ہو جاتی ہے اور حق رجوع بہر نوع ساقط ہو جاتا ہے) ترمذی کی روایت میں حضرت ابن مسعود اور حضرت عمر کا قول آیا ہے کہ صورت مذکورہ میں طلاق بائنہ ہو گی۔

دوسری روایت میں ان دونوں بزرگوں کی طرف طلاق رجعی ہونے کی نسبت کی گئی ہے پس روایات میں اختلاف ہو گیا (اور کوئی ایک روایت بھی قابل استدلال نہیں رہی)

میں کہتا ہوں بینونت دو طرح کی ہوتی ہے غلیظ اور خفیف۔ اگر شوہر نے بینونت غلیظہ کی نیت کی ہو تو لامحالہ تین طلاقیں پڑ جائیں گی لیکن امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ تجھے اپنا اختیار ہے کہنے سے بینونت پر دلالت نہیں ہوتی بلکہ یہ کلام تو صرف اس مفہوم کے لئے مفید ہے کہ خاص طور پر عورت کو اختیار حاصل ہو گیا کہ وہ اپنے آپ کو طلاق دے لے بینونت تو تقاضاء کلام (یعنی بدلالت التزامی) سمجھی جاتی ہے لہٰذا بینونت عمومی نہیں بلکہ بقدر ضرور لینا کافی ہے۔ برخلاف انت بائن یا اس جیسے دوسرے کلام کے (کہ یہ صراحۃً بدلالت مطابقی بینونت پر دلالت کر رہا ہے) اگر ایسے کلام میں تین طلاقوں کی نیت کی تو تین طلاقیں پڑ جائیں گی لیکن جو جملہ مابہ النزاع ہے اس میں تو بینونت پر صراحۃً دلالت ہی نہیں ہے اس لئے اگر صورت مذکورہ میں شوہر نے تین طلاقیں تفویض کرنے کی نیت بھی کی ہو تب بھی ایک بائنہ پڑے گی کیونکہ نیت وہیں عمل کرتی ہے جہاں نیت کے مطابق معنی مراد لینے کا لفظ برداشت کر سکے اور لفظ میں اس مرادی معنی کا احتمال ہو اور اگر تین مرتبہ اختاری (تجھے اپنا اختیار ہے) کہا تو چونکہ الفاظ تفویض تین بار کے اس لئے مقصود کا تعدد معلوم ہوتا ہے (پس ایسی صورت میں اگر عورت نے طلاق کو اختیار کر لیا اور اخترت کہہ دیا تو تین طلاقیں پڑ جائیں گی)

مسئلہ:۔ اگر شوہر کے جواب میں عورت نے کہا میں نے اپنے شوہر کو اختیار کر لیا تو جمہور کے نزدیک کوئی طلاق واقع نہیں ہو گی کیونکہ شوہر نے طلاق نہیں دی تھی بلکہ عورت کو تفویض طلاق کی تھی اور عورت نے طلاق کو اختیار نہیں کیا بلکہ بقاء نکاح کو اختیار کیا۔

ایک روایت میں حضرت علیؓ کا قول آیا ہے کہ ایک رجعی طلاق واقع ہو جائے گی گویا آپ نے لفظ اختیار کو ایقاع طلاق قرار دیا (مفعول کا لحاظ نہیں کیا) ابن ہمام نے لکھا ہے کہ حضرت عائشہ کا قول (جمہور کے مسلک کی تائید کرتا ہے حضرت عائشہ کا یہ قول) ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو اختیار دیا تھا مگر ہم نے رسول اللہ ﷺ ہی کو اختیار کیا اور حضور ﷺ نے اس اختیار کو کچھ نہیں قرار دیا۔

میں کہتا ہوں پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے امہات المومنینؓ کو طلاق کا اختیار نہیں دیا تھا بلکہ طلب طلاق کا اختیار دیا تھا لہٰذا حضرت عائشہ کے قول سے حضرت علی کے قول کے خلاف استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ:۔ (تفویض طلاق کے لئے) نفس کا لفظ ذکر کیا جانا ضروری ہے اگر مرد نے کہا تجھے اختیار ہے اور عورت نے جواب میں کہا میں نے اختیار کر لیا تو طلاق واقع نہ ہو گی کیونکہ اختیار کا لفظ طلاق کا لفظ نہیں ہے کیونکہ کسی کو کسی چیز کا مالک بنانے کا تقاضا ہے کہ وہ چیز پہلے مالک بنانے والے کی ملک میں ہو (جب خود ہی مالک نہ ہو گا تو دوسرے کو اس چیز کا مالک کیسے بنا سکے گا) اور لفظ اختیار کہہ کر شوہر خود ہی طلاق واقع نہیں کر سکتا تو اس لفظ کو استعمال کر کے ایقاع طلاق کا مالک کیسے کر سکتا ہے۔ قیاس کا یہی تقاضا ہے لیکن اجماع صحابہ ہے کہ عورت اگر اپنے نفس کو اختیار کر لے تو طلاق واقع ہو جاتی ہے اس لئے ہم خلاف قیاس بھی اجماع صحابہ کی وجہ سے وقوع طلاق کے قائل ہیں مگر وقوع طلاق پر اجماع صحابہ اسی وقت ہے جب زوجین میں سے کسی نے لفظ نفس استعمال کیا ہو (یا شوہر نے کہا ہو تجھے اپنے نفس کا اختیار ہے یا عورت نے کہا ہو میں نے اپنے نفس کو اختیار کر لیا) لفظ اختیار کا لفظ تو مبہم ہے اختیار نفس بھی مراد ہو سکتا ہے اور کسی دوسرے کام کا اختیار بھی اور جب زوجین میں سے ہر ایک نے اختیار کا لفظ مبہم بولا تو تعیین مفہوم نہیں ہوئی مبہم کی تشریح نہیں بن سکتا۔

(اگر نص کتاب یا حدیث یا اجماع کی وجہ سے کوئی حکم خلاف قیاس ہو تو اس کا انحصار اس کے مورد پر کیا جاتا ہے اس پر کسی دوسرے مسئلہ کو قیاس نہیں کیا جا سکتا یہ ضابطہ تفسیری فقہی ہے) اور اختیار نفس کے لفظ سے طلاق کا وقوع خلاف قیاس ہے اس لئے اس حکم کو اسی مقام پر محصور رکھا جائے گا جس پر اجماع ہوا ہو لہٰذا قرینہ حال کی موجودگی میں بھی باوجود نیت کے بغیر لفظ نفس کے استعمال کے طلاق واقع نہ ہو گی کہ زوجین کی طرف سے صرف لفظ اختیار کو استعمال کرنے سے طلاق کے وقوع پر اجماع نہیں ہے۔

امام شافعی اور امام احمدؒ کہتے ہیں کہ اگر قرینہ حال موجود ہو اور لفظ اختیار سے شوہر کی مراد وقوع طلاق ہو اور زوجین اس مفہوم کے مراد ہونے پر متفق ہوں تو شوہر کی نیت کافی ہے (مطلق لفظ اختیار استعمال کر کے طلاق واقع ہو جائے گی)

امام ابو حنیفہؒ کہتے ہیں اگر لفظ میں کسی مفہوم کے مراد ہونے کا احتمال ہی نہ ہو تو نیت بیکار ہے ورنہ کسی لفظ کو بھی بول کر کوئی مفہوم مراد لینا صرف اس وجہ سے صحیح قرار پائے گا کہ بولنے والے کی نیت میں وہ مفہوم تھا مثلاً کوئی شخص بیوی سے کہے مجھے پانی پلا دے اور اس لفظ سے اس کی مراد ایقاع طلاق ہو تو کیا طلاق ہو جائے گی؟ پس لفظ اختیار سے بھی طلاق مراد نہیں ہو سکتی خواہ طلاق کی نیت ہی ہو مگر اس قیاسی نظریہ کو ہم نے اجماع صحابہ کی وجہ سے چھوڑ دیا ہے۔

میں کہتا ہوں دوسرے الفاظ کو لفظ اختیار کے مساوی قرار دینا بے محل ہے کیونکہ بغیر نیت کے لفظ اختیار میں تو دونوں احتمال ہیں۔ اختیار نفس بھی مراد ہونے کا احتمال ہے اور کسی دوسرے کام کے اختیار کا بھی احتمال ہے اب اگر شوہر نے اس لفظ سے تفویض طلاق کی نیت کی ہو اور عورت کہہ دے میں نے اپنے نفس کو اختیار کر لیا تو طلاق ہو جائے گی کیونکہ عورت کا کلام شوہر کے کلام کی تفسیر ہو جائے گا اور حسب نیت شوہر لفظ اختیار میں تو تفویض طلاق کا احتمال موجود تھا ہی۔

مسئلہ:۔ اگر شوہر نے کہا تجھے اختیار ہے اور عورت نے مضارع کا صیغہ بولا تو طلاق ہو جائے گی قیاس کا تقاضا تھا کہ طلاق واقع نہ ہو کیونکہ عورت کا لفظ یا تو مستقبل میں وعدہ اختیار کو ظاہر کر رہا ہے یا ایسا لفظ ہے جس میں وعدہ مستقبل کا احتمال ہے اور اختیار مستقبل سے طلاق واقع نہیں ہوتی جیسے شوہر نے اگر صراحتاً کہہ دیا ہو کہ تو اپنے نفس کو طلاق دے لے اور عورت

جواب میں کہے میں اپنے کو طلاق دے لوں گی تو طلاق واقع نہ ہو گی۔

صاحب ہدایہؒ نے لکھا ہے ظاہری قیاس کے خلاف استحسان کی وجہ حضرت عائشہؓ کا وہ قول ہے جس میں آپ نے فرمایا تھا لابل اختار الله و رسوله (حضرت عائشہ نے اس کلام میں لفظ اختار بصیغہ مضارع بولا تھا اور) رسول اللہ ﷺ نے اس کو حضرت عائشہؓ کی طرف سے صحیح جواب مان لیا۔

ایک شبہ:- پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ رسول اللہ کی طرف سے حضرت عائشہ کو تخییر خود طلاق دے دینے کی تخییر نہ تھی بلکہ طلب طلاق کی تخییر تھی پھر حضرت عائشہ کے جواب سے کس طرح استدلال کیا جا سکتا ہے۔

جواب شبہ:- موضوع بحث سے ہی امہات المومنین کو حاصل شدہ خیار خارج ہے، اس شبہ کو زائل کرنے کے لئے کہا جا سکتا ہے کہ اس سے ہمارے مقصد میں کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ کے قول کو تخییر کا جواب مان لیا خواہ تخییر کا تعلق طلاق سے تھا یا طلب طلاق سے۔

اس کے علاوہ اختار اور اطلق میں یہ فرق بھی ہے کہ لفظ اختار نفسی کو حالت موجودہ کی تعبیر قرار دیا جا سکتا ہے یعنی اس کلام کو اختیار نفس کی حکایت کہتے ہیں لیکن لفظ اطلق نفسی کو حالت موجودہ کی حکایت نہیں کہا جا سکتا۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ

اے نبی کی بی بیو! جو تم میں سے کھلی ہوئی بیہودگی کرے گی اس کو دوہری سزا دی جائے گی۔

حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک فاحشہ سے مراد ہے نافرمانی بد خلقی (چڑھ کر بولنا)

ضِعْفَيْنِ یعنی دوسری عورتوں کے مقابلہ میں دوگنا۔ لفظ ضعف اضافی اور نسبتی الفاظ میں سے ہے جن میں سے ہر ایک کا سمجھنا دوسرے لفظ کے سمجھنے پر موقوف ہوتا ہے (جیسے فوق و تحت میں تضایف ہے باپ ہونا اور بیٹا ہونا اضافی مفہوم رکھتا ہے) جیسے نصف (اور کل میں تضایف ہے) اور زوج (مرد کا جوڑا عورت، عورت کا جوڑا مرد، جوڑا کا لفظ اضافی ہے) ضعف کا معنی ہے دو مساوی مقدار والی چیزوں کا مجموعہ اضعفت الشئی اور ضعفت الشئی دونوں ہم معنی ہیں (باب افعال و تفعیل میں اس جگہ کوئی فرق نہیں) یعنی اس چیز کے ساتھ اس کی مثل چیز کو جمع کر دیا ملا دیا (یہ ترجمہ اضعفت کا بھی ہے اور ضعفت کا بھی اور ضاعفت کا بھی) ضِعْفَيْنِ ایسی دو ہم مثل چیزیں جن میں سے ہر ایک کو دوسری سے ملا دیا گیا ہو جمع کر دیا گیا ہو ان کو ضِعْفَيْنِ کہا جاتا ہے جیسے زوجین بھی ایک مقدار اور ایک طرح کی دو چیزوں کے مجموعہ کو ضعف کہا جاتا ہے جیسے اللہ نے کافروں کے زبردست لوگوں کے اس قول کو جو وہ دوزخ کے اندر کہیں گے بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ان کو دوزخ کا دوگنا عذاب دے کیونکہ یہ خود بھی گمراہ ہوئے اور ہم کو بھی گمراہ کیا یعنی جتنا عذاب ہم پر ہے اس سے دوچند عذاب ان کو دے۔

اگر لفظ ضعف کی اضافت کسی عدد کی طرف کی جائے تو دوگنا عدد مراد ہوتا ہے جیسے دس کا ضعف بیس اور سو کا ضعف دو سو۔ ایک کا ضعف دو۔ اگر ضعفین کی اضافت واحد کی طرف ہو تو ایک عدد دو ہم مثل عددوں سے مل کر ان کو تین بنا دیتا ہے۔

قاموس میں ہے کسی چیز کا ضعف یعنی اس کی مثل دو مرلہ۔ کسی چیز کے ضعفین یعنی اس جیسے دو اور۔

یا ضعف شئی کا معنی ہے ایک چیز کا مثل (ایک گناہ اور ہو یا دو گنا یا تین گنا یا کتنے ہی گنا) عرب کہتے ہیں لک ضعفه تمہارے لئے اس کا ضعف ہے یعنی دوگنا تین گناہ چار گناہ وغیرہ۔ زیادتی محدود نہیں۔ ابو صداح کی روایت میں جو لفظ ضعف آیا ہے اس کی تشریح جزری نے نہایہ میں دو مثل کی ہے اور تائید میں کہا ہے کہ عرب جب ان اعطيتنى درهما فلك ضعفه کہتے ہیں دو درہم مراد ہوتے ہیں اگر تو مجھے ایک درہم دے گا تو تجھے دو درہم ملیں گے۔

زہری نے لکھا ہے کلام عرب میں ضعف شئی سے مراد ہوتی ہے اس کی طرح اور صرف دوگنا ہی مراد نہیں ہوتا۔ ضعف کا کم سے کم درجہ ایک گنا ہے اور زیادہ کی کوئی حد نہیں۔ ایک حدیث آئی ہے يضعف صلوة الجماعة على صلوة

الفذ خمسا و عشرین درجة جماعت کی نماز (کا ثواب) منفرد کی نماز سے پچیس درجہ زائد ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے یُضٰعِفُ لَہٗ اَضْعَافًا کَثِیْرَۃً اس کے لئے بہت گنا بڑھا دیا جائے گا۔ اضعاف (باب افعال) تضعیف (باب تفعیل) اور مضاعفة (باب مفاعلة) سب کے معنی ہیں زیادہ کر دینا بڑھا دینا۔

بغوی نے لکھا ہے ضعف اور ضاعف (یعنی تفعیل و مفاعلة) دونوں آتے ہیں اور ہم معنی ہیں جیسے بعد اور باعد

لیکن ابو عمرو اور ابو عبیدہ کا کہنا ہے کہ باب تفعیل سے تضعیف کا معنی ہے دو گنا کر دینا اور باب مفاعلت سے مضاعفة کا معنی ہے چند گنا کر دینا چونکہ آیت مذکورہ میں لفظ ضِعْفَیْنِ آیا ہے اس لئے ابو عمرو نے اس جگہ بجائے یضاعف کے یضعف کی قرأت کی ہے۔

امہات المومنینؓ کو ارتکاب فاحشہ پر دوہری سزا کی تجویز اس لئے کی گئی کہ اللہ کے انعامات ان پر زائد تھے اور انعامات کی زیادتی کی صورت میں گناہ کا ارتکاب زیادہ برا ہوتا ہے۔ اس لئے (زنا وغیرہ کی) آزاد آدمی کے لئے سزا غلام کی سزا سے دوگنی مقرر کی گئی ہے اس کے علاوہ دوہرے عذاب کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس سے رسول اللہ ﷺ کی مصاحبت کی آبرو پر بٹا لگتا ہے جو بہت ہی بری حرکت ہے۔

وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝ اور یہ (دوہرا عذاب دینا) اللہ کے لئے آسان ہے۔ یہ جملہ معترضہ ہے۔

بائیسواں پارہ

وَمَنْ يَّقْنُتْ

وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ ۙ وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا۝ اور تم میں سے جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گی اور نیک کام کرے گی ہم (دوسری عورتوں کے مقابلہ میں) اس کو دوبارہ (یعنی دوگنا) اجر دیں گے اور اس کے لئے ہم نے بہت عمدہ روزی تیار کر رکھی ہے۔ دوہرا ثواب دیا جائے گا ایک تو اللہ اور رسول کی اطاعت کا دوسرا اس بات کا کہ قناعت اور حسن معاشرت کے ساتھ وہ اللہ کے رسول کی مرضی کی طلبگار ہوئیں۔ مقاتل نے کہا ہر نیکی کا ثواب دس نیکیوں کے برابر ہوگا۔

رزق کریم: عالی قدر روزی یعنی جنت جو اصل ثواب کے بعد مزید عطا کی جائے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی متابعت میں ان کو وہ ملے گا جو رسول اللہ کو عطا کیا جائے گا۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اے نبی کی عورتوں تم کسی دوسری عورت کی طرح نہیں ہو۔

یعنی نہ تم میں سے کوئی ایک کسی غیر عورت کی طرح ہے اور نہ تمہاری جماعت دوسری عورتوں کی جماعت کی طرح۔ یہ یعنی فضیلت میں کوئی دوسری عورت تمہاری طرح نہیں ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے یہ مطلب بیان کیا کہ دوسری نیک مؤمن عورتوں کے برابر میرے نزدیک تمہارا مرتبہ نہیں ہے بلکہ میرے نزدیک تمہاری عزت اور تمہارا ثواب بہت زیادہ ہے۔

اَحَد کی اصل وحد تھی اور وحد بمعنی واحد ہے۔ لفظ احد کی وضع ثانوی عمومی نفی کے لئے ہے مذکر مونث اور واحد جمع سب کے لئے اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔

آیت مذکورہ دلالت کر رہی ہے کہ امہات المومنینؓ کو تمام دوسری عورتوں پر فضیلت حاصل ہے۔ لیکن ایک اور آیت میں حضرت مریم کو سارے جہان کی عورتوں پر فضیلت عطا فرمانے کا ذکر کیا گیا۔ فرمایا ہے اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ اے مریم اللہ نے تجھے چن لیا اور پاک کر دیا اور دنیا کی عورتوں پر تجھے برتری عطا کی۔

اگر اس کے جواب میں کہا جائے کہ سارے جہان کی عورتوں سے مراد ہیں حضرت مریم کے زمانہ کی عورتیں (یعنی فضیلت جزئیہ زمانیہ مراد ہے اور امہات المومنین کی برتری عمومی ہے) تو یہ جواب اس حدیث کے خلاف ہوگا جو ترمذی نے نقل کی ہے۔

حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سارے جہان کی عورتوں سے تمہارے لئے کافی ہیں (یعنی سب پر برتری رکھتی ہیں) مریم بنت عمران خدیجہ بنت خویلد، فاطمہ بنت محمد ﷺ اور آسیہ فرعون کی بی بی۔ آیت کا مناسب مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی زوجیت کا شرف تم کو حاصل ہے اس شرف میں اور کوئی عورت تمہاری شریک اور مساوی نہیں ہے۔

جمہور کا بالاتفاق طے شدہ مسئلہ ہے کہ تمام عورتوں سے افضل حضرت فاطمہ بنت رسول اللہ ﷺ اور ازواج مطہرات

میں سب سے بہتر حضرت خدیجہ بنت خویلد نیز حضرت مریم بنت عمران اور حضرت آسیہ زوجہ فرعون اور حضرت عائشہ بنت صدیق اکبرؓ تھیں۔

شیخین نے صحیحین میں اور احمد و ترمذی و ابن ماجہ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مردوں میں تو بہت لوگ کامل ہوئے مگر عورتوں میں سوائے آسیہ زوجہ فرعون اور مریم بنت عمران کے اور کوئی عورت کامل نہیں ہوئی۔ اور عائشہ کی فضیلت عورتوں پر ایسی ہے جیسے دوسرے کھانوں پر ثرید کی فضیلت۔ صحیحین میں آیا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ اس ۱؎ کی برترین عورت مریم بنت عمران اور خدیجہ بنت خویلد تھیں۔ کریب کی روایت میں ہے کہ وکیع نے یہ حدیث بیان کرتے وقت آسمان اور زمین کی طرف اشارہ کیا یعنی آسمان و زمین کی برترین عورتیں۔ صحیحین میں حضرت عائشہؓ کی روایت سے آیا ہے کہ حضرت فاطمہ نے بیان کیا (مجھ سے) کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم اس پر خوش نہیں ہو کہ اہل جنت (یا فرمایا مومنوں) کی عورتوں کی تم سردار ہو۔

حضرت حذیفہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ فرشتہ (آیا ہے جو) اس رات سے پہلے کبھی زمین پر نہیں اترا اس نے اپنے رب سے اجازت مانگی کہ مجھے (آکر) سلام کرے اور مجھے اس بات کی بشارت دے کہ فاطمہ اہل جنت کی سردار ہے اور حسن و حسین جوانان اہل جنت کے سردار ہیں (اجازت طلب کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو اجازت مل گئی اور اس نے آکر یہ پیام سنادیا) رواہ الترمذی، ترمذی نے اس کو حدیث غریب کہا ہے۔

إِنِ اتَّقَيْتُنَّ اگر تم اللہ کے حکم اور اللہ کے رسول کی رضامندی کی مخالفت سے بچو گی۔

اس جملہ شرطیہ کی جزاء پر کلام سابق دلالت کر رہا ہے اس لئے اس جگہ جزاء ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ سو تم چبا کر بات نہ کیا کرو۔ مطلب یہ کہ جب بشرط تقویٰ تمہاری فضیلت دوسری عورتوں پر ثابت ہے تو تقویٰ کے خلاف تم سے کوئی حرکت سرزد نہ ہونی چاہئیں۔ (دوسرے) مردوں سے چبا چبا کر بات نہ کیا کرو (یہ تقویٰ کے خلاف ہے) یعنی اگر عورت کسی غیر مرد سے چبا چبا کر باتیں کرے گی تو اس کے دل میں لالچ پیدا ہوگا لہٰذا تم ایسا نہ کرو۔

جزری نے نہایہ میں لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مرد کو غیر عورت سے اس طرح نرم نرم باتیں کرنے کی ممانعت فرمائی ہے کہ عورت اس کی طرف کچھ رغبت رکھنے لگے۔ خضوع کا معنی ہے اطاعت۔ جزری نے یہ بھی نہایہ میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں ایک شخص کسی مرد و عورت کی طرف سے گزرا جو باہم نرم نرم باتیں کر رہے تھے اس شخص نے اس مرد کے سر پر ایسی ضرب لگائی کہ اس کا سر پھٹ گیا۔ حضرت عمرؓ نے اس کو کچھ بدلہ نہ دلوایا (ضرب کو بلا قصاص قرار دیا)

طبرانی نے اچھی سند سے حضرت عمرو بن عاص کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کو بغیر شوہروں کی اجازت کے (غیر مردوں سے) کلام کرنے کی ممانعت فرمادی ہے۔

دار قطنی نے افراد میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ممانعت فرمادی ہے کہ کوئی مرد نماز میں یا اپنی بیوی اور باندیوں کے علاوہ دوسری عورتوں کے سامنے انگڑائی لے۔

فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ (کہیں) اس شخص کو جس کے دل میں بیماری ہے کچھ لالچ ہونے لگے۔

مرض سے مراد ہے نفاق کا شائبہ۔ مومن کامل کا دل تو ایمان پر مطمئن ہوتا ہے اس کو تو اپنے رب کی شان ہر وقت نظر آتی ہے وہ تو کبھی بھی حرام بات کی طرف مائل ہی نہیں ہو سکتا۔ ہاں جس کے ایمان میں ضعف ہوتا ہے اس کے دل میں نفاق کا شائبہ ہوتا ہے وہ ممنوعات خداوندی کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔

مسئلہ:۔ اجنبی مردوں سے کلام کرنے کے وقت عورت کو حکم ہے کہ لہجہ میں درشتی اختیار کرے تاکہ میلان و لالچ کا

۱؎ اس کی یعنی آسمان و زمین کی۔

احتمال ہی نہ پیدا ہونے پائے۔

وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿۳۲﴾ اور قاعدہ (عفت) کے مطابق بات کرو۔ یعنی اس طرح بات کرو کہ شک نہ پیدا ہو۔

وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ اور اپنے گھروں میں ٹھہری رہو۔ یہ گھروں میں ٹھہرے رہنے کا اور گناہ کے ارادہ سے گھروں سے باہر نہ نکلنے کا حکم ہے اگلی آیت سے اسی کی تاکید و تائید ہو رہی ہے۔

وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى اور قدیم زمانہ جاہلیت کے موافق مت پھرو۔

امہات المومنین کے گھروں سے باہر نکلنے کی ممانعت عمومی نہیں کہ نماز یا حج یا ضرورت انسانی کے لئے بھی باہر نہ نکلیں۔ وہ لوگ جن کے دلوں میں نفاق کی بیماری ہے یعنی شیعہ آیت میں عمومی ممانعت سمجھ بیٹھے ہیں اس لئے حضرت صدیقہ الکبریٰ بنت صدیق اکبر حبیبہ رسول اللہ ﷺ پر طعن کرتے ہیں کہ وہ اپنے گھر سے نکل کر مکہ کو پہنچیں پھر مکہ سے بصرہ پہنچیں جہاں جنگ جمل کا واقعہ ہوا یہ سارا سفر ممانعت آیت کے خلاف ہوا کیا ان لوگوں کو نہیں معلوم کہ اس زمانہ میں مدینہ کی فضا پر امن نہیں رہی تھی۔ ام المومنین کے مدینہ سے نکلتے ہی حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا گیا اور مصر والوں نے مدینہ میں ایسا فساد مچایا کہ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر بھی خروج پر مجبور ہو گئے اور مدینہ کو چھوڑ کر مکہ کو پہنچے اور انہیں دونوں بزرگوں نے حضرت عائشہ کو مشورہ دیا کہ مسلمانوں کی خانہ جنگی دور کرنے کے لئے بصرہ کو تشریف لے جائیں جب حضرت عائشہ نے انکار کیا تو آیت لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۭ بَيْنَ النَّاسِ سے استدلال کرتے ہوئے خروج کو ضروری قرار دیا۔ اس مشورہ کے بعد حضرت عائشہ بصرہ کو تشریف لے گئیں اور اس خروج ہی کے سبب حضرت عائشہ کے ساتھیوں میں اور حضرت علی کے رفقاء میں صلح ہو گئی لیکن عبداللہ بن سبا یہودی منافق نے جو اپنے کو شیعان علی میں سے کہتا تھا صلح قائم نہ رہنے دی اور دونوں جماعتوں میں فتنہ کی آگ ایسی بھڑکائی کہ جنگ جمل کا واقعہ ظہور پذیر ہو گیا اور مسلمانوں میں باہم بڑا کشت و خون ہوا۔ ہم نے اس واقعہ کا تذکرہ اپنی کتاب سیف مسلول میں مفصل طور پر کر دیا ہے۔

تَبَرُّج کا لفظ بُرُوْج سے نکلا ہے بُرُوج کا معنی ہے ظہور، اس جگہ تَبَرُّج سے مراد ہے اظہار زینت اور مردوں کے سامنے بناؤ سنگھار کر کے نکلنا۔ ابن نجیح نے کہا تبرج کا معنی ہے اٹھلا کر چلنا۔ اس لئے لَا تَبَرَّجْنَ کا تفسیری ترجمہ کیا ہے اٹھلا کر نہ چلو۔

جاہلیت اولیٰ سے مراد ہے دور اسلامی سے پہلے کا زمانہ جاہلیت اور جاہلیت دوم ہے اسلام کے بعد گناہ کبیرہ کا ارتکاب۔

شعبی نے کہا رسول اللہ ﷺ سے اوپر حضرت عیسیٰ کے زمانہ تک جاہلیت اولیٰ کا دور تھا۔ ابو العالیہ نے کہا حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا زمانہ جاہلیت اولیٰ کا زمانہ تھا۔ عورتیں ایسی قمیصیں پہن کر نکلتی تھیں جو دونوں طرف سے بغیر سلے ہوئے ہوتے تھے اور ان کا بدن دونوں طرف سے برہنہ دکھتا تھا۔

عکرمہ نے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ جاہلیت اولیٰ کا وہ زمانہ تھا جو حضرت نوحؑ اور حضرت ادریسؑ کے درمیان تھا حضرت آدمؑ کی نسل سے دو قبیلے ہوئے ایک پہاڑ پر رہتا تھا دوسرا میدانی علاقہ میں پہاڑی مردوں کے چہرے شگفتہ اور گورے تھے مگر عورتیں بدصورت تھیں اور میدانی باشندوں کی عورتیں حسین تھیں اور مرد بدصورت

ایک بار ابلیس انسانی شکل میں ایک میدانی باشندے کے پاس آیا اور اس کے پاس نوکر ہو گیا اور خدمت کرنے لگا پھر اس نے چرواہوں کی بانسری جیسی ایک چیز بنائی اور ایسی آواز سے بجانے لگا جو لوگوں نے کبھی نہیں سنی تھی۔ آس پاس کے لوگوں کو آواز پہنچی تو وہ سننے کے لئے جمع ہو گئے اور اس کو ایک تیوہار بنا لیا جہاں مقررہ وقت پر جمع ہونے لگے اس طرح بن سنور کر عورتیں مردوں کے سامنے آنے لگیں اور مرد عورتوں کے سامنے۔ ایک روز کوئی پہاڑی اس تیوہار میں پہنچ گیا اور اس نے مردوں عورتوں کو یکجا دیکھا اور عورتوں کا حسن اسکی نظر کے سامنے گیا اس نے جا کر پہاڑی باشندوں سے اس کا تذکرہ کیا اس کے بعد پہاڑی باشندے بھی اپنے مسکن چھوڑ کر میدانی لوگوں کے ساتھ ہی آ بسے اور آپس میں بدکاریاں ہونے لگیں۔ آیت میں

تبرج جاہلیت اولیٰ سے یہی مراد ہے لیکن اولیٰ کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ جاہلیت دوئم بھی کوئی گزری ہے۔ کبھی اولیٰ کا لفظ بغیر آخری کے بھی استعمال کیا جاتا ہے جیسے آیت اَهْلَكَ عَادَنِ الْاُوْلٰى میں اولیٰ کا لفظ ہے (عاد اخری کوئی قوم نہیں ہوئی پھر بھی قوم عاد کو عَادَنِ الْاُوْلٰى فرمایا۔

یا جاہلیت سے مراد قبل از اسلام کا دور ہے۔ (جس کی کوئی حد بندی نہیں)

وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ اس کے رسول کی فرماں برداری کرو یعنی تمام اوامر و نواہی کی پابندی کرو یہی تقوی ہے جو تمہاری فضیلت یاب ہونے کی ضروری شرط ہے۔

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ۝

اے اہل بیت (نبی) اللہ تم سے گندگی کو دور کرنا اور کامل طور پر تم کو پاک کرنا چاہتا ہے۔

کلام جداگانہ ہے (پہلے کلام سے وابستہ نہیں ہے) اس کلام کا حکم امہات المومنینؓ کو بھی شامل ہے اور اولاد رسول اللہ ﷺ کو بھی اسی لئے مذکر کا خطابی صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔

کلام سابق کلام کی علت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے گویا یوں فرمایا کہ تم کو جو اوامر و نواہی کی پابندی کرنے اور تقوی اختیار کرنے کا حکم دیا گیا وہ تم سے اور تمہارے علاوہ دوسرے اہل بیت سے رجس یعنی عمل شیطانی کو دور کرنے کے لئے دیا گیا ہے۔

رجس سے مراد ہے عمل شیطانی یعنی گناہ اور ہر وہ حرکت جس میں کوئی شر ہو یا ایسی طبعی برائی ہو جو اللہ کو ناپسندیدہ ہو۔

اَهْلَ الْبَيْتِ رسول اللہ ﷺ کے گھر کے لوگ۔ عکرمہ اور مقاتل کے نزدیک امہات المومنین مراد ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ کا قول سعید بن جبیرؓ کی روایت سے بھی یہی آیا ہے حضرت ابن عباسؓ نے (اہل البیت کے مفہوم کے تعیین کے لئے) آیت وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ تلاوت فرمائی رواہ ابن ابی حاتم وروی ابن جریر عن عکرمہ نحوہ۔ ان حضرات نے آیت کے سیاق و سباق سے بھی اسی پر استدلال کیا ہے لیکن عورتوں کے ساتھ حکم کی تخصیص کیسے ہو سکتی ہے جب کہ کم ضمیر مذکر مخاطب کی استعمال کی گئی ہے (اس سے معلوم ہوا کہ آیت کا حکم مردوں کو بھی شامل ہے اور بطور تغلیب مذکر کی ضمیر ذکر کی گئی ہے۔ مترجم)

حضرت ابو سعید خدری اور تابعین کی ایک جماعت کا قول ہے جن میں مجاہد اور قتادہ بھی شامل ہیں کہ اہل بیت ہیں، حضرت علی حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حضرت حسین کیونکہ حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سیاہ بالوں کی اونی چادر اوڑھے باہر تشریف لے گئے۔ چادر پر کجاوے کے نقوش تھے اتنے میں حسن بن علی آئے حضور ﷺ نے ان کو چادر میں لے لیا پھر حسین بن علی آئے حضور ﷺ نے ان کو بھی چادر میں لے لیا۔ پھر (سیدہ) فاطمہ آئیں حضور نے ان کو بھی چادر میں داخل کر لیا۔ پھر علی آئے آپ نے ان کو بھی داخل کر لیا پھر فرمایا اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا رواہ مسلم۔

حضرت سعد بنؓ ابی وقاصؓ راوی ہیں کہ جب آیت نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے علی، فاطمہ، حسن اور حسین کو طلب فرمایا۔ اور فرمایا اے اللہ یہ میرے اہل بیت ہیں۔ رواہ مسلم۔

حضرت واثلہ بن اسقع راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے آیت اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ الخ تلاوت فرمائی اور حضرت علی، حضرت فاطمہ اور دونوں صاحبزادوں کے متعلق فرمایا اے اللہ یہ میرے گھر والے اور میرے خاص لوگ ہیں ان سے گندگی کو دور فرما دے اور ان کو کامل طور پر پاک کر دے۔

حضرت ام سلمہؓ کی روایت ہے کہ جب آیت اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ الخ نازل

ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے علی اور فاطمہ اور حسن اور حسین کو طلب کیا اور کملی میں داخل کر لیا، پھر فرمایا اے اللہ یہ میرے اہل بیت ہیں ان سے گندگی کو دور کر دے اور ان کو کامل طور پر پاک کر دے۔

مذکورہ احادیث اور ان جیسی دوسری اخبار سے آیت تطہیر کی حضرات اربعہ (حضرت علی، حضرت سیدہ، حضرت حسن، حضرت حسین کے ساتھ تخصیص ثابت نہیں ہوتی۔ ماقبل اور مابعد کا کلام بھی اس تخصیص سے انکار کر رہا ہے اور عرف و لغت کی شہادت بھی اسکے خلاف ہے۔ اصل میں اہل بیت کے لفظ کا اطلاق صرف بیویوں پر ہوتا ہے اولاد اور دوسرے گھر والے ذیلی طور پر اس میں آجاتے ہیں۔ بیویوں کے ہی رہنے کے مکان (یا کمرے) عام طور پر الگ الگ ہوتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی سارہ کو خطاب کر کے ملائکہ نے کہا تھا اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اَهْلَ الْبَیْتِ کیا تجھے اللہ کے حکم پر تعجب ہو رہا ہے، اے گھر والو تم پر اللہ کی رحمت ہے۔

حق بات یہ ہے کہ رفتار کلام اگرچہ امہات المومنین پر دلالت کر رہی ہے لیکن آیت تطہیر سب کو شامل ہے۔ حضرت ام سلمہؓ نے فرمایا تھا میرے گھر میں آیت اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ نازل ہوئی، تو رسول اللہ ﷺ نے فاطمہؓ اور علیؓ اور حسنؓ اور حسینؓ کو بلوایا پھر فرمایا یہ لوگ میرے اہل بیت ہیں۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں بھی اہل بیت میں سے ہوں؟ فرمایا کیوں نہیں۔ انشاء اللہ۔

رواہ البغوی وغیرہ یہ حدیث دلالت کر رہی ہے کہ اہل بیت میں سب داخل ہیں اور انشاء اللہ کا لفظ (امید مستقبل کے لئے نہیں بلکہ تحقیق اور) تبرک کے لئے استعمال ہوا ہے۔

حضرت زید بن ارقم نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کے اہل بیت وہ سب لوگ تھے جن پر صدقہ کا مال (لینا) حرام کر دیا گیا تھا یعنی اولاد علی، اولاد جعفر، اولاد عقیل، اولاد عباس اور اولاد حارث بن عبد المطلب۔

تَطْهِیْرًا سے مراد ہے دنیا میں گناہوں کی نجاست سے پاک کرنا اور آخرت میں مغفرت فرمانا۔

اللہ نے آیات مذکورہ میں امہات المومنین کو بعض چیزوں سے منع فرمایا۔ بعض باتوں کے کرنے کا حکم دیا تاکہ رسول اللہ ﷺ کا گھر والا کسی گناہ کا ارتکاب نہ کرے اور سب کے سب متقی ہو جائیں۔ بطور استعارہ گناہوں کو گندگی اور تقویٰ کو طہارت فرمایا کیونکہ گناہ کرنے والے کی گناہوں سے اسی طرح آلودگی ہو جاتی ہے جس طرح جسم نجاست سے آلودہ ہوتا ہے اور متقی ایسا ہی پاک صاف ہوتا ہے جس طرح کپڑا پاک صاف ہوتا ہے۔

چونکہ گناہ اور گندگی میں بہت گہری مناسبت ہے اسی لئے امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا کہ پانی کا استعمال خواہ دفع حدث کے لئے کیا گیا ہو یا بطور ثواب (و قربت) بہر حال مستعمل پانی نجس ہو جاتا ہے۔

حضرت عثمانؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو اچھی طرح خوب وضو کرتا ہے اس کے گناہ اس کے بدن سے نکل جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ناخنوں کے نیچے سے بھی خارج ہو جاتے ہیں (اور پانی کے ساتھ بہہ جاتے ہیں)۔ متفق علیہ۔

حضرت ابوہریرہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو مسلم بندہ (یا فرمایا مومن بندہ) وضو کرتا ہے اور منہ دھوتا ہے تو اس کے چہرے سے پانی کے ساتھ آنکھ کے گناہ نکل جاتے ہیں۔ الحدیث رواہ مسلم۔

شیعہ کہتے ہیں کہ یہ آیت ثابت کر رہی ہے کہ علیؓ اور فاطمہؓ اور حسنؓ اور حسینؓ معصوم تھے اور رسول اللہ ﷺ کے خلفاء یہی تھے دوسرا کوئی خلیفہ نہیں ہو سکتا اور انہیں حضرات اربعہ کا اور ان کے بعد (ان کی نسل کے) دوسرے اماموں کا ہی اجماع معتبر ہے۔ شیعہ کہتے ہیں اللہ کا ارادہ مراد سے منفک نہیں ہوتا (یعنی اللہ جس چیز کا ارادہ کرتا ہے اس کا پورا ہونا لازم ہے) اور حسب صراحت آیت اللہ اہل بیت کو طاہر بنانا چاہتا تھا اس لئے اہل بیت کا معصوم ہونا ضروری ہے۔ گناہ گار پاک نہیں ہوتا اور عصمت امامت (یعنی خلافت) کی شرط ہے اور چونکہ ابو بکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ بالاجماع معصوم نہ تھے (نعوذ باللہ) اس لئے خلافت کا استحقاق صرف اہل بیت کو تھا۔ شیعہ فرقہ کا یہ استدلال غلط ہے۔

نمبر ۱۔ آیت کا نزول امہات المومنین کے لئے ہوا۔ پس یہ چاروں بزرگ ہستیاں حکم آیت میں داخل ہیں۔

نمبر ۲۔ آیت عصمت پر دلالت نہیں کرتی (ارادۂ تطہیر کا معنی عطاء عصمت نہیں) دیکھو آیت وضو میں تمام امت کو خطاب کر کے فرمایا ہے مَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیَجْعَلَ عَلَیْکُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰکِنْ یُّرِیْدُ لِیُطَہِّرَکُمْ الخ اللہ تم پر کوئی تنگی ڈالنا نہیں چاہتا بلکہ تم کو پاک کرنا چاہتا ہے (تو کیا ساری امت اسلامیہ کو اس آیت کی روشنی میں معصوم قرار دیا جاسکتا ہے۔)

اگر شبہ کیا جائے کہ آیت تطہیر کا تقاضا تو گناہوں سے پاک کرنے کا ارادہ اللہ یہ ہے (یعنی اللہ گناہوں سے تم کو پاک کرنا چاہتا ہے) اور آیت وضو کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تم کو نجاست اور غلاظت بدنیہ سے پاک صاف کرنا چاہتا ہے اگر تم وضو کرو گے (تو بدنی نجاست دور ہو جائے گی) دونوں آیتوں میں ایک قسم کی تطہیر نہیں ہے مگر یہ شبہ بے اصل ہے دونوں آیتوں میں اللہ کا ارادۂ تطہیر مشروط ہے آیت وضو میں مشروط بالوضو ہے اور آیت تطہیر میں مشروط بالتقویٰ یعنی اگر وضو کرو گے تو نجاست بدنی سے پاک ہو جاؤ گے اسی طرح اے اہل بیت تم تقویٰ اختیار کرو گے تو گناہوں سے پاک ہو جاؤ گے یہی وجہ ہے کہ جس طرح طہارت بدنی حاصل کرنے کے لئے اللہ نے پانی کے استعمال کا طریقہ بتا دیا اسی طرح گناہوں سے طہارت حاصل کرنے اور باطن کو پاک رکھنے کے لئے اس نے تقویٰ کا طریقہ بتا دیا اور فرمادیا فَلَا تَخْضَعْنَ پس جس طرح طہارت بدن پانی کے استعمال سے وابستہ ہے اسی طرح طہارت باطن تقویٰ پر موقوف ہے۔

نمبر ۳۔ امامت (یعنی خلافت ارضی) کے لئے عصمت شرط نہیں ہے، معصوم کی موجودگی میں غیر معصوم خلیفہ ہو سکتا ہے۔ دیکھو حضرت شمویل اور حضرت داؤد کے موجود ہونے کے باوجود طالوت کو خلیفہ (بادشاہ) بنا دیا گیا تھا۔ آیت میں گیا ہے اِذْ قَالَ لَہُمْ نَبِیُّہُمْ اِنَّ اللّٰہَ قَدْ بَعَثَ لَکُمْ طَالُوْتَ مَلِکًا

وَاذْکُرْنَ مَا یُتْلٰی فِیْ بُیُوْتِکُنَّ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰہِ وَالْحِکْمَۃِ　　اور تم ان آیات خداوندی کو اور اس علم (احکام) کو جس کا چرچا تمہارے گھروں میں ہوتا ہے یاد رکھو۔

اٰیٰتِ اللّٰہِ سے مراد قرآن اور حِکْمَت سے مراد وحی غیر متلو یعنی حدیث ہے۔ مقاتل کے نزدیک آیات اللہ سے مراد ہیں قرآن کے احکام و مواعظ۔

بیضاوی کے نزدیک (مَا یُتْلٰی سے مراد قرآن ہے) مطلب یہ ہے کہ قرآن کو یاد رکھو جس کے اندر دونوں امر ہیں۔ اللہ کے انعام کی یادداشت کہ اللہ نے تم کو نبی کا اہل بیت بنایا، تمہارے گھروں کو نزول گاہ وحی قرار دیا نمبر ۲۔ اور وحی آنے کے وقت جو تکلیف ہوتی ہے وہ تمہاری نظر کے سامنے ہوتی ہے جس سے تمہارے ایمان میں پختگی اور جذبہ اطاعت میں برانگیختگی اور اوامر و نواہی کی پابندی کی رغبت پیدا ہوتی ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ کَانَ لَطِیْفًا خَبِیْرًا　　بے شک اللہ راز داں ہے اور پورا باخبر ہے۔ ع

یعنی تم پر مہربان ہے دینی اصلاح کی تم کو تعلیم دے رہا ہے اور خوب واقف ہے کہ کون نبوت کی قابلیت رکھتا ہے اور کون نبی کا اہل بیت ہونے اور ان کی صحبت میں رہنے کا اہل ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے۔

اَلطَّیِّبٰتُ لِلطَّیِّبِیْنَ وَالطَّیِّبُوْنَ لِلطَّیِّبٰتِ

بغوی نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ کی (بعض) بیویوں نے عرض کیا یا رسول اللہ۔ اللہ نے قرآن میں مردوں کا ذکر تو اچھائی کے ساتھ بیان کیا ہے عورتوں کا ذکر اچھائی کے ساتھ نہیں کیا تو کیا ہمارے اندر کوئی قابل ذکر بھلائی نہیں ہم کو اندیشہ ہے کہ اللہ ہماری طاعت کو بھی قبول نہیں کرتا۔ اس پر آیت اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ الخ نازل ہوئی۔

طبرانی اور ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بھی اسی طرح بیان کیا ہے۔ اسی طرح ابن سعد نے قتادہ کی روایت سے بیان کیا ہے طبرانی نے قابل قبول سند سے بروایت ابن عباس یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ عورتوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا وجہ ہے کہ اللہ ایماندار مردوں کا تو ذکر کرتا ہے اور ایماندار عورتوں کا ذکر (قرآن میں) نہیں کرتا۔ اس پر یہ

آیت نازل ہوئی۔ یہ سبب نزول ابن جریر نے قتادہ کی روایت سے مرسلاً ذکر کیا ہے۔

ترمذی نے بسند حسن حضرت ام عمارہ انصاریہ کا واقعہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر انہوں نے کہا تھا کیا وجہ ہے کہ میں (قرآن میں) ہر چیز مردوں ہی کے لئے دیکھتی ہوں اور عورتوں کا تذکرہ کسی (اچھی) چیز کے ساتھ (قرآن میں) مجھے نظر نہیں آتا۔ اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

بغوی نے بروایت مقاتل ذکر کیا ہے کہ حضرت ام سلمہ بنت ابی امیہ اور حضرت انیسہ بنت کعب انصاریہ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا تھا یا رسول اللہ ہمارا رب (قرآن میں) مردوں کا تو ذکر کرتا ہے اور عورتوں کا کہیں ذکر نہیں کرتا اس سے ہم کو اندیشہ ہے کہ عورتوں میں کوئی بھلائی ہی نہیں ہے۔ اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

بعض روایت میں آیا ہے کہ حضرت اسماء بنت عمیس جب اپنے شوہر حضرت جعفر بن ابو طالب کے ہمراہ حبش سے واپس آئیں اور رسول اللہ ﷺ کی بیویوں کے پاس گئیں تو ان سے دریافت کیا کیا ہمارے معاملہ میں قرآن کی کوئی آیت اتری ہے؟ امہات المومنین نے جواب دیا نہیں۔ اسماء فوراً رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچیں اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ عورتیں بڑے گھاٹے میں ہیں بڑی نامراد ہیں۔ فرمایا کس وجہ سے یہ بات (کہہ رہی ہو) عرض کیا حضور مردوں کا جس طرح ذکر کیا جاتا ہے عورتوں کا اچھائی کے ساتھ (قرآن میں) کہیں ذکر ہی نہیں ہوتا اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِينَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ
وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِينَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّائِمِينَ
وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُم مَّغْفِرَةً وَ
أَجْرًا عَظِيمًا ﴿٣٥﴾

بے شک اسلام کے کام کرنے والے مرد اور اسلام کے کام کرنے والی عورتیں اور ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں اور فرماں برداری کرنے والے مرد اور فرماں برداری کرنے والی عورتیں اور راست باز مرد اور راست باز عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور خشوع کرنے والے مرد اور خشوع کرنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت رکھنے والے مرد اور حفاظت رکھنے والی عورتیں اور بکثرت اللہ کو یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں ان سب کے لئے اللہ نے گناہوں کی بخشش اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔

إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ یعنی اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کے فرماں بردار اپنے سارے کام اللہ کے سپرد کر دینے والے اور اللہ ہی پر بھروسہ رکھنے والے مرد ہوں یا عورتیں۔

الْقَانِتِينَ وَالْقَانِتَاتِ یعنی طاعت کے پابند لوگ مرد ہوں یا عورتیں۔

الصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ یعنی قول و عمل کے سچے اور ایسے عمل کرنے والے کہ جو شخص وہ کام کرتا ہو اس کی تعریف کرنے والے کو سچا مانا جائے مرد ہوں یا عورتیں۔

الصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ (راہ حق میں) مصائب پر صبر رکھنے والے اور طاعتوں پر جمے رہنے والے اور نفسانی ناجائز خواہشات اور تمام گناہوں سے رک جانے والے مرد ہوں یا عورتیں۔

الْخَاشِعِينَ وَالْخَاشِعَاتِ یعنی تواضع اور فروتنی کرنے والے غرور نہ کرنے والے مرد ہوں یا عورتیں۔

الْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ یعنی خدا کے عطا کردہ رزق میں سے محض اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے خیرات کرنے والے مرد ہوں یا عورتیں۔

الصَّائِمِينَ وَالصَّائِمَاتِ اور فرض و نفل روزے رکھنے والے مرد ہوں یا عورتیں۔

الحفظین فروجھم والحفظت یعنی فعل ممنوع سے اپنی شرمگاہوں کی حفاظت رکھنے والے مرد اور عورتیں۔
الذکرین اللہ کثیرا والذکرت یعنی بکثرت دلوں اور زبانوں سے اللہ کی یاد کرنے والے مرد اور عورتیں۔[1]
بغوی نے مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ بندہ اسی وقت اللہ کی بکثرت یاد کرنے والوں میں شمار کیا جاتا ہے جب کھڑے بیٹھے لیٹے ہر وقت اللہ کی یاد کرتا ہو کسی وقت اللہ کی یاد میں سستی نہ کرتا ہو اس کے بغیر کثیر الذکر بندوں میں سے نہیں ہوتا۔
میں کہتا ہوں یہ بات اسی وقت ہوتی ہے جب فناء قلب حاصل ہو جائے ذکر میں دل ڈوبا رہے اور ہر وقت حضور دوامی حاصل رہے۔
رسول اللہ ﷺ نے فرمایا افراد والے (سب سے) آگے بڑھ گئے عرض کیا گیا افراد والے کون فرمایا اللہ کو بکثرت یاد کرنے والے مرد اور عورتیں۔ رواہ مسلم من حدیث ابی ہریرۃؓ
رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ذکر خدا سے زیادہ عذاب الٰہی سے نجات دینے والی اور کوئی چیز نہیں۔ صحابہ نے عرض کیا نہ جہاد فی سبیل اللہ؟ فرمایا نہ جہاد فی سبیل اللہ ہاں اگر جہاد میں اتنی شمشیر زنی کرے کہ تلوار ٹوٹ جائے۔ (ایسی حالت میں مجاہد کا درجہ زیادہ ہو جائے گا) رواہ البیہقی فی الدعوات الکبیر من حدیث عبداللہ بن عمر۔
حضرت ابو سعید خدریؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا قیامت کے دن اللہ کے نزدیک کون سا بندہ سب سے افضل اور عالی مرتبہ ہوگا۔ فرمایا اللہ کو بکثرت یاد کرنے والے مرد اور عورتیں۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ کیا اللہ کی راہ میں لڑنے والے سے بھی۔ فرمایا اگر (مجاہد) کافروں اور مشرکوں میں اتنی شمشیر زنی کرے کہ تلوار ٹوٹ جائے اور خون سے رنگ جائے تب بھی اللہ کو یاد کرنے والا اس سے مرتبہ میں افضل ہوگا۔ رواہ احمد والترمذی وقال ہذا حدیث غریب۔
امام مالک نے فرمایا مجھے یہ خبر ملی ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے یاد خدا سے غفلت کرنے والوں میں اللہ کی یاد کرنے والا ایسا ہوتا ہے جیسے (جہاد سے منہ موڑ کر) بھاگنے والوں کے پیچھے (کافروں سے) لڑتا رہنے والا اور غافلوں میں اللہ کی یاد کرنے والا ایسا ہے جیسے سوکھے درخت میں سبز ٹہنی اور غافلوں میں اللہ کی یاد کرنے والا ایسا ہے جیسے تاریک گھر میں (روشن) چراغ، غافلوں میں اللہ کی یاد کرنے والے کو (دنیا میں ہی) جنت کے اندر اس کا مقام اللہ دکھا دیتا ہے اور غافلوں میں اللہ کی یاد کرنے والے کے گناہ سارے بولنے والوں اور گونگوں کی گنتی کے برابر بخش دیے جاتے ہیں۔ بولنے والوں سے مراد ہیں تمام بنی آدم اور گونگے سے مراد ہیں چوپائے۔ (رواہ رزین)
بغوی نے لکھا ہے کہ عطاء بن ابی رباح نے کہا جس نے اپنے کام اللہ کے سپرد کر دیے وہ اَلْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ کے تحت آ گیا اور جس نے اقرار کیا کہ اللہ میرا رب ہے اور محمد ﷺ اس کے رسول ہیں اور دل زبان کے مخالف نہ ہو تو وہ اَلْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ کی فہرست میں آ گیا اور جس نے فرائض میں، اللہ کی اور سنت میں رسول کی اطاعت کی (یعنی فرائض خداوندی کو ادا کیا اور سنت رسول پر چلا) وہ اَلْقٰنِتِيْنَ وَ الْقٰنِتٰتِ میں شامل ہو گیا اور جس نے اپنے کلام کو جھوٹ سے محفوظ رکھا وہ اَلصّٰدِقِيْنَ وَ الصّٰدِقٰتِ میں آ گیا اور جو طاعت پر جما رہا اور گناہ سے ڈرتا رہا اور دکھ پر صبر کیا وہ اَلصّٰبِرِيْنَ وَ الصّٰبِرٰتِ میں شامل ہو گیا اور جس نے (اتنے استغراق سے) نماز پڑھی کہ دائیں بائیں کی بھی اس کو شناخت (یعنی خبر) نہ ہوئی وہ اَلْخٰشِعِيْنَ وَ الْخٰشِعٰتِ میں داخل ہو گیا اور جس نے ہر ہفتہ ایک درہم خیرات کیا وہ اَلْمُتَصَدِّقِيْنَ وَ الْمُتَصَدِّقٰتِ میں شامل ہو گیا اور جس نے ہر ماہ چاندنی راتوں کے (یعنی ۱۳، ۱۴، ۱۵ تاریخوں کے) روزے رکھے وہ اَلصّٰٓئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ

---

[1] حضرت معاذؓ راوی ہیں ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کون سا مجاہد سب سے بڑے ثواب کا مستحق ہے فرمایا جو اللہ کی یاد سب سے زیادہ کرنے والا ہو، عرض کیا کس روزہ دار کو سب سے بڑا ثواب ملے گا فرمایا جو اللہ کو سب سے زیادہ یاد کرتا ہو، پھر اس شخص نے نماز، زکوٰۃ، حج اور خیرات کا ذکر کیا اور حضور ﷺ نے سب کے جواب میں یہی فرمایا کہ جو اللہ کی یاد سب سے زیادہ کرتا ہو، یہ سن کر حضرت ابو بکرؓ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا ابو حفص اللہ کا ذکر کرنے والے ہر بھلائی کو لے گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک۔ (از مفسر رحمۃ اللہ علیہ)

میں داخل ہو گیا اور جس نے حرام سے اپنی شرمگاہ کو محفوظ رکھا وہ اَلْحَافِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَ الْحَافِظٰتِ کے ذیل میں آ گیا اور جس نے پانچوں نمازیں ادا کیں وہ وَالذّٰکِرِیْنَ اللّٰهَ کَثِیْرًا وَّالذّٰکِرٰتِ کے تحت آ گیا۔

اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً یعنی جو گناہ ان سے سرزد ہو گئے ہوں گے ان کی مغفرت اللہ نے تیار کر رکھی ہے۔

وَّاَجْرًا عَظِیْمًا یعنی طاعت کا بڑا ثواب۔

طبرانی نے صحیح سند سے بروایت قتادہ بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت زینب بنت جحش کو پیام نکاح بھیجا یہ پیام حضرت زید بن حارثہ کے لئے تھا لیکن حضرت زینب نے خیال کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے ساتھ نکاح کا پیام بھیجا ہے جب معلوم ہوا کہ زید کا پیام بھیجا ہے تو انکار کر دیا اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَمَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَی اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ یَّکُوْنَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ اور جب اللہ اور اس کے رسول نے کسی بات کا قطعی حکم دے دیا ہو تو پھر کسی مؤمن مرد اور مؤمن عورت کو اپنے امر کا خود اختیار نہیں رہتا۔

نزول آیت کے بعد حضرت زینب راضی ہو گئیں اور انہوں نے مان لیا۔ بغوی نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے زید کو بازار عکاظ سے خریدنے کے بعد آزاد کر کے بیٹا بنا لیا تھا، پھر حضرت زینب کو پیام نکاح بھیجا۔ حضرت زینب نے خیال کیا کہ اپنے ساتھ نکاح کا پیام بھیجا ہے اس لئے راضی ہو گئیں لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ زید کی طرف سے پیام بھیجا ہے تو آپ کو ناگوار ہوا اور انکار کر دیا اور زینب کے بھائی عبداللہ بن جحش نے بھی یہ رشتہ پسند نہیں کیا حضرت زینب اور ان کے بھائی عبداللہ کی ماں امیمہ بنت عبدالمطلب تھی امیمہ رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی تھی۔

ابن جریر نے بطریق عکرمہ و عوفی حضرت ابن عباس کی یہ روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے زینب بنت جحش کو زید بن حارثہ کے لئے نکاح کا پیام بھیجا تھا۔ زینب نے یہ رشتہ پسند نہیں کیا اور کہا میں زید سے نسب میں بہتر اور اعلیٰ ہوں اس پر آیت وَمَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ نازل ہوئی۔ مؤمن سے مراد ہیں عبداللہ بن جحش اور مؤمنہ سے مراد ہیں زینب بنت جحش یعنی کسی کے لئے جائز نہیں ہے۔

اَنْ یَّکُوْنَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ کہ ان کو اپنے معاملہ کا اختیار خود اپنے ہاتھ میں رہے کہ جب چاہیں اپنی مرضی کے مطابق کریں بلکہ حکم خدا کی تعمیل ان کے لئے ضروری ہے اور اپنے اختیار کو اللہ اور رسول کی پسندیدگی کے تابع بنانا لازم ہے۔

خِیَرَۃ اور خیار دونوں ہم معنی ہیں۔ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ مطلق (اگر کسی دوسرے معنی کے قرینہ سے خالی ہو تو) وجوب کے لئے آتا ہے۔ ایک بات یہ بھی معلوم ہو رہی ہے کہ عالم اور وہ لوگ جن کو دینی شرف حاصل ہے وہ ہر علوی اور شریف النسب شخص کا کفو ہے (خواہ اس کی ذات اور قوم عرف عام کے لحاظ سے کچھ بھی ہو)

ابن ابی حاتم نے ابن زید کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ یہ آیت حضرت ام کلثوم کے حق میں نازل ہوئی۔ ام کلثوم عقبہ بن ابی معیط کی بیٹی تھیں اور سب سے پہلی عورت تھیں جنہوں نے راہ خدا میں ہجرت کی تھی انہوں نے اپنی جان رسول اللہ ﷺ کو ہبہ کر دی تھی (یعنی رسول اللہ ﷺ کو اپنے ساتھ نکاح کرنے کا اختیار دے دیا تھا) لیکن حضور ﷺ نے ان کا نکاح زید بن حارثہ سے کر دیا اس پر وہ اور ان کا بھائی ناراض ہو گئے اور کہا ہماری مراد تو یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ اپنے ساتھ نکاح کر لیں اور حضور ﷺ نے دوسرے سے نکاح کر دیا اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِیْنًا ﴿۳۶﴾ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کا حکم نہ مانے گا وہ صریح گمراہی میں پڑے گا۔

ضَلٰلًا مُّبِیْنًا راہ صواب سے کھلا ہوا انحراف۔ امر سے انحراف دو طرح کا ہوتا ہے۔ ا۔ امر کو ماننے سے انکار اور تردید کیا

انحراف کفر ہے۔ اور انحراف عمل مع اعتقاد وجوب یعنی امر کے واجب ہونے کا عقیدہ تو ہو لیکن عمل اس کے مطابق نہ ہو اس کی نافرمانی کو فسق کہتے ہیں۔

بغوی نے لکھا ہے اس آیت کے نزول کے بعد حضرت زینب اور ان کا بھائی دونوں راضی ہو گئے اور دونوں نے مان لیا اور زینب کے نکاح کا اختیار رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں دے دیا۔ حضور ﷺ نے زید سے ان کا نکاح کر دیا۔ حضور ﷺ نے زید کی طرف سے زینب کو دس دینار ساٹھ درہم ایک اوڑھنی ایک کرتہ ایک تہبند ایک چادر پچاس سیر غلہ اور تقریباً چار من چھوارے دیئے۔ حضرت زینب حضرت زید کے پاس ایک مدت تک رہیں ایک روز رسول اللہ ﷺ کسی کام سے (حضرت زینب کی طرف) گئے زینب گوری اور قریش کی حسین ترین عورت تھیں اس وقت صرف کرتہ اور دوپٹہ پہنے کھڑی تھیں حضور ﷺ کی جو نظر ان پر پڑی تو اچھی معلوم ہوئیں اور دل کو بھا گئیں فوراً زبان سے نکلا سبحان اللہ۔ اللہ دل کو پلٹنے والا ہے۔ اس کے بعد لوٹ آئے جب حضرت زید آئے تو ان سے حضور ﷺ نے اس بات کا تذکرہ کر دیا۔ زید سمجھ گئے اور اسی وقت سے ان کے دل میں زینب کی طرف سے کراہت پیدا ہو گئی۔ کچھ مدت بعد حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ میں اپنی بیوی کو الگ کرنا چاہتا ہوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا ایسا کیوں۔ کیا زینب کی تم نے کوئی ناشائستہ حرکت دیکھی۔ زید نے کہا نہیں خدا کی قسم میں نے تو ان کی طرف سے نیکی کے سوا اور کچھ نہیں دیکھا مگر وہ اپنی شرافت نسب کی وجہ سے مجھ پر اپنی بڑائی جتلاتی ہیں اور زبان سے مجھے دکھ دیتی ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھو اور اس کے معاملہ میں اللہ سے ڈرتے رہو۔ ابن جریر نے ابوزید کی روایت سے یہ واقعہ یوں ہی بیان کیا ہے۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِيْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَيْهِ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ اور جب آپ اس شخص سے جس پر اللہ نے بھی انعام کیا اور آپ نے بھی اس پر انعام کیا تھا کہہ رہے تھے کہ اپنی بیوی کو اپنے پاس ہی رہنے دے اور اللہ سے ڈر۔

یہ خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے۔ حاکم نے حضرت انس کی روایت سے بیان کیا کہ زید بن حارثہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں زینب بنت جحش کی شکایت کرنے آئے تو آپ نے فرمایا اپنی بیوی کو اپنے پاس ہی رکھو تو یہ آیت نازل ہوئی۔

اَنْعَمَ اللّٰهُ اللہ نے اس پر فضل کیا کہ اسلام کی اور آپ کے ساتھ رہنے کی اس کو توفیق دی اور آپ کے دل میں اس کی محبت پیدا کر دی (جس کی وجہ سے آپ نے اس کو آزاد کر کے اپنا بیٹا بنا لیا)

زَوْجَكَ یعنی زینب بنت جحش

وَاتَّقِ اللّٰهَ اور اللہ سے اس کے معاملہ میں ڈر۔ اس کو طلاق نہ دے طلاق اگرچہ جائز ہے لیکن تمام جائز احکام میں سب سے زیادہ بری اور قابل نفرت چیز ہے۔

وَتُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ اور آپ اپنے دل میں وہ بات (بھی) چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ (آخر میں) ظاہر کرنے والا تھا۔

بخاری نے حضرت انس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ اس آیت کا نزول زینب بنت جحش اور زید بن حارثہ کے معاملہ میں ہوا۔ حسن نے کہا زید کی بات رسول اللہ ﷺ کو دل سے تو پسند آئی مگر شرم اور شرف ذاتی کی وجہ سے اس بات کو دل میں چھپائے رکھا۔

بعض نے کہا آپ نے دل میں یہ بات چھپائے رکھی کہ جب وہ اس کو چھوڑ دے گا تو اس سے نکاح کر لوں گا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا زینب کی محبت دل میں چھپائے رکھی۔ قتادہ نے کہا رسول اللہ ﷺ نے دل سے چاہا کہ زید زینب کو طلاق دے دیگا۔

بغوی نے بروایت سفیان بن عیینہ بیان کیا کہ علی بن زید بن جدعان نے کہا مجھ سے امام زین العابدین علی ابن امام حسین

نے پوچھا آیت وَ تُخْفِیْ فِیْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِیْهِ وَ تَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ کے متعلق حسن کیا کہتے ہیں؟ میں نے کہا حسن کہہ رہے تھے کہ جب زید نے آکر رسول اللہ ﷺ سے کہا اے اللہ کے نبی میں زینب کو چھوڑنا چاہتا ہوں۔ حضور ﷺ کو زید کی یہ بات (دل سے تو) پسند آئی لیکن (ظاہر میں) زبان سے فرمایا اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ امام زین العابدین نے فرمایا ایسا نہیں ہے۔ اللہ نے آپ کو پہلے سے اطلاع دے دی تھی کہ زید زینب کو طلاق دے دیں گے اور زینب آپ کی بیوی ہو جائیں گی چنانچہ جب زید نے آکر کہا میں زینب کو طلاق دینا چاہتا ہوں تو اللہ کے رسول نے فرمایا اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ یہ بات اللہ کو پسند نہ آئی اور بطور عتاب اللہ نے فرمایا جب ہم نے آپ کو جتا دیا تھا کہ زینب آپ کی بیوی ہو گی تو پھر آپ نے زید سے کیوں کہا کہ اپنی بیوی کو اپنے پاس رہنے دو طلاق نہ دو۔ آیت کا یہ مطلب شان انبیاء کے موافق ہے (اس سے نبی پر کوئی دھبہ نہیں آتا) اور عبارت بھی اسی کے مطابق ہے کیونکہ اللہ نے فرمادیا کہ جو بات تم نے چھپائی تھی ہم اس کو ظاہر کرنے والے ہیں لیکن سوائے اس کے کہ زَوَّجْنٰكَهَا ہم نے تمہارا نکاح زینب سے کر دیا) فرمادیا اور کوئی بات ظاہر نہیں کی۔ اگر رسول اللہ ﷺ نے اپنے دل میں زینب کی محبت چھپائے رکھی ہوتی یا دل کے اندر یہ بات مخفی کر لی ہوتی کہ زینب کو زید طلاق دے دے تو اللہ (حسب وعدہ) اس کو ضرور ظاہر کر دیتا حقیقت میں (جب بوحی الٰہی آپ کو معلوم ہو گیا کہ زید زینب کو طلاق دے دیں گے اور زینب سے آپ کا نکاح ہو جائے گا تو) آپ کو زید سے یہ بات کہتے ہوئے شرم محسوس ہوئی کہ جو بیوی تیرے نکاح میں اور تیرے پاس ہے وہ میری بیوی ہو جائے گی۔

بغوی نے لکھا ہے امام زین العابدین کا بیان کیا ہوا یہ مطلب نہایت خوبصورت اور پسندیدہ ہے لیکن یہ مطلب بھی غلط نہیں ہے اور نہ شان انبیاء کے خلاف ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے دل میں زینب کی محبت پیدا ہو گئی اور آپ نے اس کو چھپائے رکھا یا یہ بات پوشیدہ رکھی کہ زید طلاق دے دیں گے تو میں نکاح کر لوں گا کیونکہ دل میں جو بات بغیر اختیار کے پیدا ہو جائے اس کو قابل ملامت اور برا نہیں قرار دیا جا سکتا، اس طرح کی واردات قلبی میں کوئی گناہ نہیں دل کا جھکاؤ اور وجدان محبت تو طبعی اور فطری چیز ہے۔ باقی اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ الخ فرمایا تو یہ ایک اچھے کام کا مشورہ ہے، امر بالمعروف ہے اس میں کوئی گناہ نہیں۔

میں کہتا ہوں بلکہ یہ مشورہ اور حکم اجر عظیم کا موجب ہے کیونکہ اپنی طبیعت کے خلاف امر بالمعروف تو (جہاد نفس کی) نہایت اعلیٰ (صورت) ہے اللہ نے فرمایا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وہ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ ان کو بھی سخت حاجت ہو اور جو شخص حرص نفس سے محفوظ رہتے ہیں وہ ہی کامیاب ہونے والے ہیں۔

حسن کے قول کی تائید رسول اللہ ﷺ کے اس قول سے بھی ہوتی ہے جس میں حضور ﷺ نے فرمایا تھا سبحان اللہ مقلب القلوب۔ یہ قول دلالت کر رہا ہے کہ پہلے تو رسول اللہ ﷺ کے دل میں یہ خیال تھا کہ زینب سے زید کا نکاح کرا دیں (چنانچہ ایسا کرا دیا اور باوجود زینب کے میلان طبع اور اقرار کے حضور ﷺ کے دل میں خود نکاح کر لینے کا خیال ہی نہیں ہوا) پھر اللہ نے دل پلٹ دیا اور زینب سے نکاح کرنے کی طرف دل موڑ دیا۔

وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ ۖ اور آپ لوگوں (کے طعن) سے ڈرتے تھے اور ڈرنا تو آپ کو صرف اللہ ہی سے سزاوار ہے یعنی آپ کو یہ اندیشہ تھا کہ لوگ کہیں گے اللہ کے رسول نے زید سے اس کی بیوی کو طلاق دلوا دی حالانکہ اللہ ہی سے ڈرنا مناسب ہے۔

حضرت عمرؓ اور حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا اس آیت سے زیادہ اور کوئی آیت رسول اللہ ﷺ پر دشوار نہیں ہوئی۔ مسروق کی روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا اگر رسول اللہ ﷺ خدا کی فرستادہ وحی میں سے کوئی حصہ چھپاتے تو اس آیت وَتُخْفِیْ فِیْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِیْهِ وَ تَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ کو پوشیدہ رکھتے۔

بغوی نے لکھا ہے اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے دل میں اللہ کا خوف و خشیہ نہیں تھا۔ حضور ﷺ نے خود فرمایا تھا انی اخشاکم واتقکم میں تم سب سے زیادہ اللہ کا خوف و خشیہ رکھتا ہوں۔

میں کہتا ہوں اللہ نے تمام انبیاء کی شان میں فرمایا ہے یَخْشَوْنَهٗ وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ وہ اللہ سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔ لیکن اس جگہ جب لوگوں سے ڈرنے کا ذکر کیا تو (بطور عموم ضابطہ) یہ بھی فرمادیا کہ تمام امور و احوال میں خدا سے ڈرنا ہی سزاوار ہے میں کہتا ہوں اس تشریح پر آیت کا مطلب اس طرح ہوا آپ لوگوں کے طعن سے ڈرتے ہیں اور جتنا لوگوں سے ڈرتے ہیں اس سے زیادہ خدا کا خوف رکھتے ہیں کیونکہ اللہ ہی سے ڈرنا سزاوار ہے پس لوگوں کے ڈر اور خوف سے آپ نے دل میں ایک بات چھپائی اور اللہ کے خوف سے (زید کو) نیکی اور بھلائی کا حکم بھی دیا اور حکم خدا کی تعمیل میں کوئی کمی نہیں کی۔ یہی مطلب ہے آیت لَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ کا کہ انبیاء لوگوں کا خوف و لحاظ ایسا نہیں رکھتے کہ اس کی وجہ سے اللہ کے حکم کی تعمیل چھوڑ دیں یا اس میں کمی کر دیں۔ رہا عام طور پر لوگوں سے ڈرنا اور ان کے طعن کا لحاظ رکھنا تو یہ بات بری نہیں بلکہ اچھی ہے حیا تو ایمان کا جز ہے۔ (متفق علیہ)

صحیحین میں حضرت عمران بن حصین کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حیا سراسر خیر ہے۔

حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ حیاء اور ایمان دونوں کو جوڑ دیا گیا ہے (ہر ایک دوسرے کا ساتھی ہے) جب ایک کو اٹھالیا جاتا ہے تو دوسرے کو بھی اٹھالیا جاتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں ہے جب ایک کو سلب کرلیا جاتا ہے تو دوسرا اول کے پیچھے آجاتا ہے رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔

امام مالک نے مرسلاً بروایت زید بن طلحہ اور بیہقی نے شعب الایمان میں نیز ابن ماجہ نے حضرت انسؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر چیز کی ایک سرشت ہوتی ہے اور اسلام کی سرشت حیاء ہے۔

مسلم، احمد، نسائی ابو یعلی، ابن ابی حاتم طبرانی اور بغوی نے حضرت انس کا بیان نقل کیا ہے اور روایت مندرجہ ذیل الفاظ کے ساتھ بغوی نے ذکر کی ہے کہ جب حضرت زینب کی عدت پوری ہو گئی تو رسول اللہ ﷺ نے زید سے فرمایا جا کر زینب سے میرا ذکر کرو (یعنی پیام پہنچاؤ) زید گئے اور جس وقت پہنچے ہیں اس وقت زینب آٹا خمیر کر رہی تھیں۔ زید کا بیان ہے میں نے زینب کو دیکھا تو ان کی اتنی عظمت میرے دل میں پیدا ہوئی کہ میں سامنے سے ان کو دیکھنے کی تاب نہ لاسکا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے نکاح کے ارادہ سے ان کا ذکر کیا تھا۔ چنانچہ میں نے فوراً ان کی طرف اپنی پشت کرلی اور ایڑیوں کے بل مڑ کر کہا زینب مجھے رسول اللہ ﷺ نے بھیجا ہے۔ حضور ﷺ نے تم کو یاد کیا ہے۔ حضرت زینب نے کہا میں اپنے رب سے مشورہ کے بغیر کچھ کرنے والی نہیں۔ یہ جواب دینے کے بعد حضرت زینب اٹھ کر مسجد (یعنی اندرون خانہ جو نماز کی جگہ مقرر کر رکھی تھی اس) کی طرف گئیں اور آیت ذیل نازل ہوئی۔

فَلَمَّا قَضٰى زَیْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا پھر جب زید کا اس سے دل بھر گیا (اور اس نے طلاق دے دی) تو ہم نے اس کو آپ کی بیوی بنا دیا۔

مِنْهَا کی ضمیر زینب بنت جحش کی طرف راجع ہے وَطَرٌ کا معنی ہے حاجت، حاجت پوری کرنے سے مراد ہے دل بھر جانا یعنی جب زینب سے زید کا دل بھر گیا اور زید کو زینب کی حاجت نہ رہی اور انہوں نے طلاق دے دی اور زینب کی عدت گزر گئی۔ بعض علماء تفسیر نے کہا کہ قضاء وطر (حاجت پوری کرنے) سے بطور کنایہ طلاق مراد ہے۔

حضرت انسؓ کا بیان ہے رسول اللہ (باہر سے) آئے اور بغیر اذن طلب کئے زینب کے پاس اندر تشریف لے گئے ہم کو یاد ہے کہ (حضرت زینب کے ولیمہ میں) رسول اللہ ﷺ نے ہم کو گوشت روٹی کھلایا تھا۔ آدھا دن گزر گیا لوگ کھانے کے بعد نکل کر چلے گئے لیکن دو آدمی باتوں میں مشغول حجرہ میں بیٹھے رہے۔ رسول اللہ ﷺ (مجبوراً خود) باہر نکل گئے میں بھی حضور ﷺ کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ حضور والا کے بعد دیگر امہات المومنین کے حجروں میں تشریف لے گئے ان کو سلام کیا انہوں نے بھی

سلام کیا اور دریافت کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ نے اپنی بیوی کو کیسا پایا۔

حضرت انسؓ نے کہا مجھے یاد نہیں کہ کچھ دیر کے بعد میں نے جا کر اطلاع دی یا دوسرے لوگوں نے کہ وہ لوگ چلے گئے یہ سن کر حضور تشریف لے آئے اور حجرہ میں چلے میں بھی آپ کے ساتھ اندر گھسنے لگا تو میرے اور حضور ﷺ کے درمیان پردہ کھینچ دیا گیا اور حجاب کا حکم نازل ہو گیا۔ بخاری، احمد، ترمذی، حاکم، ابن مردویہ، عبد بن حمید اور بیہقی نے سنن میں حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ حضرت زینب رسول اللہ ﷺ کی دوسری بیویوں پر فخر کرتی اور فرماتی تھیں تمہارا نکاح رسول اللہ ﷺ سے تمہارے گھر والوں نے کرایا اور میرا نکاح سات آسمانوں کے اوپر سے اللہ نے کر دیا۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ حضرت زینب کہتی تھیں میرے نکاح کا تو اللہ ولی ہوا اور تمہارا نکاح تمہارے اولیاء نے کرایا۔

بغوی نے بحوالہ شعبی بیان کیا ہے کہ زینب رسول اللہ ﷺ سے کہتی تھیں مجھے آپ کے سلسلہ میں (دوسری بیویوں پر) تین چیزوں سے امتیاز حاصل ہے وہ امتیاز کسی بی بی کو حاصل نہیں میرا اور آپ کا دادا ایک تھا۔ میرا نکاح آپ کے ساتھ اللہ نے آسمان پر کیا۔ میرے نکاح کے سفیر جبرئیل ہیں۔

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جیسا ولیمہ حضرت زینب کا کیا ایسا کسی اور بی بی کا نہیں کیا۔ زینب کے ولیمہ میں ایک بکری ذبح کی۔ یہ بھی حضرت انس ہی کا بیان ہے کہ زینب بنت جحش کے زفاف میں رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو پیٹ بھر گوشت روٹی کھلایا۔

لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآىِٕهِمْ تاکہ بنائے ہوئے بیٹوں کی بیویوں (سے نکاح کرنے میں) مسلمانوں کے لئے (ممانعت کی) کوئی تنگی نہ رہے۔

اَدْعِيَآء کا مفرد دَعِیّ ہے۔ دَعِی بنایا ہوا بیٹا۔ یعنی زینب زوجۂ زید سے ہم نے آپ کا نکاح اس لئے کرایا تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ منہ بولے بیٹوں کی (مطلقہ) بیویوں سے نکاح حلال ہے خواہ وہ بیٹے اپنی بیویوں سے قربت کر چکے ہیں حقیقی بیٹے کی بیوی کا حکم اس کے خلاف ہے (اس سے خسر کا نکاح نہیں ہو سکتا خواہ بیٹا مر گیا ہو یا اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہو۔ مترجم)

آیت میں اس امر کی دلیل ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کسی حکم کی خصوصیت پر دلیل قائم نہ ہو تو امت کے لئے بھی وہی حکم ہو گا (بلا دلیل اس حکم کی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تخصیص نہ ہو گی)

اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا جب منہ بولے بیٹے اپنی بیویوں سے حاجت پوری کر چکے ہوں (یعنی ان کا دل بھر گیا ہو اور طلاق دے دی ہو۔ مترجم)

وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا۝ اور اللہ کا فیصلہ تو (لا محالہ) پورا ہونے والا تھا۔ جیسے زینب کے معاملہ میں ہوا۔

مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيْمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ اور پیغمبر کے لئے جو بات اللہ نے مقرر کر دی تھی اس میں ان پر کوئی الزام نہیں۔

حَرَجٍ تنگی فِيْمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ یعنی عورتوں کی جو تعداد اللہ نے پیغمبر کے لئے مقرر اور مقدر کر دی تھی۔ عرب کہتے ہیں فرض له في الديوان رجسٹر میں اس کے لئے حصہ مقرر کر دیا گیا۔ فروض العسكر فوج کی مقرر تنخواہیں۔ بعض علماء نے آیت میں فَرَضَ کا معنی اَحَلَّ (پیغمبر کے لئے اللہ نے جو کچھ حلال کر دیا تھا) بیان کئے ہیں۔

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۭ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَا۝ اللہ نے ان (پیغمبروں) کے لئے بھی یہی معمول کر رکھا ہے جو پہلے گزر چکے ہیں اور اللہ کا فیصلہ (پہلے سے) تجویز کردہ ہوتا ہے۔

کلبی نے کہا اس سے مراد ہیں حضرت داؤد۔ حضرت داؤد بھی ایک عورت کی طرف مائل ہو گئے تھے جس سے انہوں نے

نکاح کرلیا۔ اسی طرح اللہ نے حضرت زینب سے رسول اللہ ﷺ کا نکاح کردیا۔

بعض کے نزدیک سُنَّۃَ اللّٰہِ سے مراد ہے نکاح۔ کیوں کہ نکاح سنت انبیاء ہے۔ بعض کے نزدیک کثرت ازواج کی طرف اشارہ ہے جیسے حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کی بیویاں کثرت سے تھیں۔

الَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰہِ وَیَخْشَوْنَہٗ وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰہَ ؕ وہ (سب پیغمبر ایسے تھے کہ) اللہ کے احکام (امت کو) پہنچایا کرتے تھے اور اس باب میں اللہ سے ڈرتے تھے اور اللہ کے سوا اور کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔

جس طرح آپ اللہ کے احکام امر و نہی میں اللہ سے ہی ڈرتے اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔

وَکَفٰی بِاللّٰہِ حَسِیْبًا ۝ اور اللہ حساب لینے کے لئے کافی ہے۔

اس لئے اسی سے ڈرنا ضروری ہے یا یہ مطلب ہے کہ اللہ ہر مقام خوف کے لئے کافی ہے (اس لئے اس کے سوا کسی سے نہ ڈرنا چاہئے۔ مترجم)

مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں۔ یعنی محمد زید کے باپ نہیں ہیں کہ زید کی بیوی سے نکاح کرنا ان کے لئے حرام ہو۔

ایک سوال :- قاسم، طیب، طاہر، ابراہیم رسول اللہ ﷺ کے صاحبزادے تھے اور حسن و حسین بھی حضور کے صاحبزادے (مانے گئے) تھے پھر نفی ابوت کیسے صحیح ہے۔

جواب :- چاروں صاحبزادوں کی وفات بچپن میں ہو چکی تھی کوئی بھی حد بلوغ کو نہیں پہنچا کہ اس کو رجل کہا جاتا۔ رہی یہ بات کہ حضرت حسن کو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ میرا بیٹا سردار ہے اسی طرح حضرت حسین کا رسول اللہ ﷺ کا بیٹا ہونا تو یہ بطور مجاز ہے (نہ واقع میں یہ دونوں بزرگ حضور ﷺ کے صلبی بیٹے تھے نہ بنائے ہوئے بیٹے۔ مترجم کے خیال میں صحیح جواب یہ ہے کہ رجالکم میں مخاطبین کی طرف اضافت ہے جو بتارہی ہے کہ اس زمانہ میں جو لوگ آیت کے مخاطب تھے ان میں سے کسی کے باپ رسول اللہ ﷺ نہیں تھے۔ یہ مطلب نہیں کہ کبھی کسی مرد کے باپ نہیں تھے نہ آئندہ کسی مرد کے باپ ہوں گے۔ یہ مفہوم آیت کا ہرگز نہیں ہے۔ واللہ اعلم)

وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ ؕ اور لیکن اللہ کے رسول ہیں اور سب انبیاء کے لئے خاتم ہیں (سب کے ختم ہونے کے بعد آئے ہیں) اور ہر رسول شفقت و خیر خواہی کے لحاظ سے اپنی امت کا باپ ہوتا ہے۔ سب امت کا نسبی باپ نہیں ہوتا کہ امت کی کسی عورت سے اس کا نکاح نہ ہوسکے۔

خَاتَم بفتح تاء بمعنی آخر اور بکسر تاء بروزن فاعل ختم کرنے والا۔ آخری نبی جس کے بعد کوئی نبی نہ آئے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا مراد یہ ہے کہ اگر میں سلسلۂ انبیاء کو محمد ﷺ پر ختم نہ کردیتا تو ان کے بعد ان کے بیٹے کو نبی بنا دیتا۔ عطاء نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ جب اللہ نے یہ فیصلہ کردیا کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی کو نبی بنانا نہیں ہے تو حضور ﷺ کو کوئی لڑکا یعنی مرد (اولاد) عنایت نہیں کیا۔ ابن ماجہ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صاحبزادہ ابراہیم کے متعلق فرمایا اگر وہ زندہ رہتا تو نبی ہوتا۔

کیا حضرت عیسیٰ قریب قیامت نازل نہیں ہوں گے : ضرور نازل ہوں گے لیکن رسول اللہ ﷺ کی شریعت پر ہوں گے اس لئے نزول عیسیٰ سے رسول اللہ ﷺ کے خاتم النبیین ہونے پر کوئی جرح نہیں کی جاسکتی۔ اس کے علاوہ حضرت عیسیٰ کو تو رسول اللہ ﷺ سے پہلے پیغمبر بنا کر بھیجا گیا تھا پھر رسول اللہ ﷺ پر جدید نبوت کو ختم کردیا اگر گزشتہ نبی باقی رہے تو اس سے جدید نبوت کی نفی پر کیا اثر پڑتا ہے۔

وَکَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا ۝ اور اللہ ہر چیز سے بخوبی واقف ہے۔

اس لئے وہ جانتا ہے کہ کس پر نبوت کا خاتمہ کیا جائے اور اس کی کیا حالت ہونی چاہئے۔ حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری اور دوسرے انبیاء کی مثال ایسی ہے جیسے ایک خوبصورت قصر ہو اس کی عمارت حسین ہو لیکن ایک اینٹ (لگانے) کی جگہ اس میں چھوڑ دی گئی ہو دیکھنے والے آکر اس کے گرداگرد گھومتے ہوں اور اس کے حسن تعمیر پر تعجب کرتے ہوں لیکن (ساتھ ہی) یہ بھی کہیں کہ ایک اینٹ کی جگہ خالی ہے۔ (حضور ﷺ نے فرمایا) پس اس ایک اینٹ کے مقام کو میں نے درست کر دیا اور مجھ پر پیغمبروں کا خاتمہ ہو گیا۔ دوسری روایت میں آیا ہے میں ہی وہ اینٹ ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں۔ متفق علیہ۔

حضرت جبیر بن مطعمؓ کا بیان ہے میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے میرے (بہت) نام ہیں میں محمد ہوں، احمد ہوں، میں ماحی ہوں کہ اللہ میرے ذریعہ سے کفر کو مٹائے گا، میں حاشر ہوں لوگوں کا حشر میرے قدموں پر ہوگا، میں عاقب ہوں (سب سے پیچھے آنے والا) میرے بعد کوئی نبی نہیں۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنے مختلف نام (صفات) بیان کرتے تھے آپ نے فرمایا تھا میں محمد ہوں، احمد ہوں، مقفی ہوں، حاشر ہوں، نبی التوبہ ہوں، نبی الرحمۃ ہوں۔ رواہ مسلم۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ۝ اے ایمان والو اللہ کا ذکر بہت کیا کرو۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ذکر کے علاوہ اللہ نے ہر فرض کی ایک حد مقرر کر دی ہے اور عذر کے وقت معذور لوگوں کو چھوڑ دیا ہے مگر ذکر کی کوئی آخری حد مقرر نہیں کی اور سوائے دیوانہ کے کسی کو معذور نہیں قرار دیا بلکہ تمام حالتوں میں ذکر کا حکم دیا ہے اور فرمایا ہے فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ اللہ کی یاد کرو کھڑے بیٹھے اور پہلو کے بل لیٹے ہوئے اور فرمایا ہے اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا اللہ کی بکثرت یاد کیا کرو رات میں، دن میں، خشکی میں، سمندر میں، صحت میں، بیماری میں، پوشیدہ اور ظاہر۔ مجاہد نے کہا ذکر کثیر یہ ہے کہ کبھی اللہ کو نہ بھولے۔ میں کہتا ہوں یہ حالت فناء قلب اور دوامی حضور کے بعد ہوتی ہے۔

وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝ اور صبح شام (یعنی ہمیشہ) اس کی پاکی بیان کرتے رہو۔

سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً یعنی فجر کی نماز پڑھو۔

وَّاَصِيْلًا کلبی نے کہا یعنی ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں پڑھو مجاہد نے کہا تسبیح سے مراد ہے سبحان اللہ والحمدللہ ولا الہ اللہ واللہ اکبر ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم پڑھنا لفظ تسبیح سے تمام سارے ہی جملے مراد ہیں (یعنی تسبیح، تحمید، تہلیل، تکبیر وغیرہ) ان الفاظ کو باوضو بے وضو اور جنب سب پڑھیں۔

میں کہتا ہوں اول اللہ نے عمومی ذکر کا حکم دیا کہ کسی وقت خدا کی یاد نہ بھولے پھر مخصوص اوقات میں ذکر کا حکم دیا اول سے مراد ہے ذکر خفی قلبی دوامی اور دوسرے سے مراد ہے ذکر جلی اور مقررہ فرض وسنت عبادات۔

بعض اہل علم نے کہا تسبیح کے لئے صبح شام کے اوقات کی تخصیص اس لئے کی کہ ان اوقات میں رات اور دن کے ملائکہ جمع ہوتے ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رات کے ملائکہ اور دن کے ملائکہ باری باری سے تمہارے اندر آتے ہیں اور فجر و عصر کی نماز دن میں سب جمع ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ ملائکہ جو رات کو تمہارے پاس رہے اوپر چڑھ جاتے ہیں تمہارا رب ان سے پوچھتا ہے (حالانکہ وہ خود بخوبی واقف ہے) تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا۔ ملائکہ عرض کرتے ہیں ہم نے ان کو نماز پڑھتے چھوڑا اور جب ہم ان کے پاس پہنچے تھے تب بھی وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ متفق علیہ۔

بعض علماء تفسیر نے کہا بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا دونوں فعلوں کے معمول ہیں وَاذْكُرُوا کے بھی اور سَبِّحُوْا کے بھی۔ تنازع فعلین ہے اس وقت یہ مطلب ہوگا کہ نمازیں اور تمام عبادتیں حضور قلب کے ساتھ بغیر غفلت کے ادا کرو۔ حضرت ابوذرؓ کی

روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب بندہ نماز میں ہوتا ہے تو اللہ اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے جب تک بندہ ادھر ادھر توجہ نہ کرے لیکن بندہ جب ادھر ادھر توجہ کرنے لگتا ہے تو اللہ بھی اس کی طرف سے رخ پھیر لیتا ہے رواہ احمد وابوداؤد والنسائی والدارمی۔

بغوی نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جب آیت اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ نازل ہوئی تو حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ اللہ نے جو شرف خصوصیت کے ساتھ آپ کو عطا فرمایا ہم کو اس میں ضرور شریک فرمادیں۔۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔ عبد بن حمید نے اس روایت کی نسبت مجاہد کی طرف بھی کی ہے۔

هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ وہ (خود بھی) اور اس کے فرشتے (بھی) تم پر رحمت بھیجتے رہتے ہیں۔

بغوی نے لکھا ہے اللہ کی طرف سے صلوٰۃ کا معنی ہے رحمت اور ملائکہ کی صلوٰۃ کا معنی ہے دعاء مغفرت۔ بعض کے نزدیک اللہ کی بندہ پر صلوٰۃ کا معنی ہے بندہ کے ذکر خیر کو لوگوں میں پھیلانا۔ بعض نے کہا اللہ کی طرف سے بندہ کی ثناء ہونا صلوٰۃ اللہ ہے۔

قاموس میں ہے صلوٰۃ (کا معنی ہے) دعا اور رحمت، استغفار، اللہ کی طرف سے رسول کی اچھی تعریف۔ وہ عبادت جس میں رکوع اور سجود بھی ہوتا ہے۔ صاحب قاموس کی اس عبارت کا تقاضا ہے کہ لفظ صلوٰۃ چند معانی میں مشترک ہے جس جو اہل ادب عموم مشترک جائز قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک ہی وقت اور ایک ہی جملہ میں ایک لفظ کا متعدد معانی میں استعمال درست ہے ان کے نزدیک آیت کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ نے تم پر رحمت نازل فرماتا ہے اور اس کے فرشتے تمہارے لئے دعا مغفرت کرتے ہیں۔

جمہور کے نزدیک عموم مشترک جائز نہیں بلکہ آیت میں عموم مجاز ہوگا یعنی لفظ صلوٰۃ کو ایک مجازی معنی کے لئے استعمال کیا گیا اور وہ معنی مجازی دو حقیقی معانی میں مشترک ہے۔ یعنی تمہارے کاموں کی درستی اور تمہارے شرف کو ظاہر کرنے کی طرف توجہ (یہ کام فرشتے بھی کرتے ہیں کہ تمہارے لئے استغفار کرتے ہیں اور اللہ بھی کرتا ہے کہ تم پر رحمت نازل فرماتا ہے)

بکثرت اہل لغت کا بیان ہے کہ صلوٰۃ کا معنی ہے دعا۔ صَلَّيْتُ عَلَيْهِ میں نے اس کے لئے دعا کی۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے اگر کسی کو کھانا کھلانے بلایا جائے تو دعوت قبول کرے اور اگر روزہ دار ہو تو دعوت کرنے والوں کیلئے صلوٰۃ (دعا) کرے۔ اللہ نے فرمایا ہے صَلِّ عَلَيْهِمْ اے نبی آپ ان کے لئے دعا کریں اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ آپ کی دعا ان کے لئے باعث تسکین ہے۔

نماز کو صلوٰۃ اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے اندر دعا پڑھی جاتی ہے یعنی اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ پڑھا جاتا ہے جزء پر کل کا اطلاق کردیا گیا (ایک شبہ کیا جاسکتا ہے کہ جب صلوٰۃ بمعنی دعا ہے تو صلوٰۃ اللہ کا کیا معنی۔ کیا اللہ دعا کرتا ہے اس کا جواب یہ ہے) کہ بندوں کے لئے اللہ کی طرف سے دعا یہ ہے کہ اللہ خود اپنی ذات سے بندوں کے لئے رحمت اور مغفرت طلب فرماتا ہے چونکہ خود اپنی ذات سے بندوں کے لئے رحمت طلب کرتا ہے تو اس سے مستفاد ہوتا ہے کہ اس نے بندوں پر رحمت کرنا اپنی ذات پر لازم کرلیا ہے معنی ہے كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ کا ایجاب (لازم کرلینا) اور طلب دونوں کا معنی ایک ہی ہے قطعی طلب ایجاب ہی ہوتی ہے لیکن ایجاب (کا معنی یہ نہیں ہے کہ اللہ پر کوئی چیز واجب ہے اور کسی کا خدا پر کوئی لازمی حق ہے جس کو ادا کرنا اس پر لازم ہے بلکہ اس کا یہ معنی ہے کہ اللہ نے اپنی مہربانی سے ذمہ لے لیا ہے اگر صلوٰۃ کو بمعنی دعا قرار دیا جائے تو عموم مشترک کا قول لازم نہیں آئے گا۔ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے کہا تھا کیا ہمارا رب صلوٰۃ کرتا ہے حضرت موسیٰ پر یہ سوال نہایت شاق گزرا۔ اللہ نے موسیٰ کے پاس وحی بھیجی ان سے کہہ دو کہ میں صلوٰۃ کرتا ہوں مگر میری صلوٰۃ (بمعنی) رحمت ہے جو ہر چیز کو اپنے اندر سمائے ہوئے ہے۔

لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا تاکہ تم کو تاریکیوں

سے (نکال کر) نور کی طرف لے آئے اور اللہ مؤمنوں پر بہت مہربان ہے یعنی اپنی رحمت اور ملائکہ کی دعا سے کفر و معاصی سے نکال کر ایمان و طاعت کے نور کی طرف ہمیشہ تم کو لاتا ہے۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے تاکہ تم کو وقتاً فوقتاً ہمیشہ ظلمات (فراق و) بعد سے نکال کر نور قرب کی طرف لاتا رہے۔

اللہ مؤمنوں پر بڑا مہربان ہے کیونکہ اس نے مؤمنوں کے سارے امور کو درست کیا ان کے مرتبہ کو اونچا کیا اور ملائکہ مقربین کی دعا ان کے شامل حال کی۔

تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ ۚ وَاَعَدَّ لَهُمْ اَجْرًا كَرِيْمًا ۝ جس روز وہ اللہ سے ملیں گے تو ان کا دعائیہ کلمہ السلام علیکم ہو گا اور اللہ نے ان کے لئے (جنت میں) عمدہ صلہ تیار کر رکھا ہے۔

تَحِيَّتُهُمْ یعنی اللہ کی طرف سے جو تحیت ان کو کی جائے گی۔

يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ جس روز وہ اللہ سے ملیں گے یعنی مرنے کے وقت یا قبر سے نکلنے کے وقت یا جنت میں داخلہ کے وقت یا دیدار خداوندی ہونے کے وقت۔

سَلٰمٌ یعنی اللہ کی طرف سے بطور تحیت ان کو سلام کیا جائے گا اور اللہ ان کو تمام ناگوار باتوں سے امن و سلامتی میں رکھے گا۔

اَجْرًا كَرِيْمًا یعنی جنت یا اللہ کا دیدار اور اس کی خوشنودی۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا اے نبی ہم نے آپ کو (آپ کی امت کا) گواہ بنا کر بھیجا

ابن مبارک نے سعید بن مسیب کا قول بیان کیا ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا کہ صبح شام رسول اللہ ﷺ کی امت کو آپ کے سامنے نہ لایا جاتا ہو۔ آپ اپنی امت کو ان کے چہروں سے (یا خصوصی علامات سے) پہنچانتے ہیں۔ اسی لئے آپ ان پر شہادت دیں گے (یعنی گواہی دیں گے کہ یہ میری امت والے ہیں) یا شاہد ہونے کا یہ مطلب ہے کہ جب امت اسلامیہ شہادت دے گی کہ تمام پیغمبروں نے اپنی اپنی امتوں کو اللہ کا پیغام پہنچا دیا تھا تو رسول اللہ ﷺ اپنی امت کی تصدیق کریں گے۔

بخاری، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن نوحؑ کو بلوا کر پوچھا جائے گا کیا تم نے (میرا پیام) پہنچا دیا تھا۔ نوحؑ کہیں گے جی ہاں پھر ان کی امت کو طلب فرما کر دریافت کیا جائے گا کیا تم کو میرا پیام نوحؑ نے پہنچا دیا تھا وہ کہیں گے ہمارے پاس تو کوئی ڈرانے والا نہیں پہنچا۔ ہمارے پاس کوئی نہیں آیا۔ اس پر نوحؑ سے کہا جائے گا تمہارا شاہد کون ہے۔ کون تمہاری گواہی دے سکتا ہے حضرت نوحؑ کہیں گے محمد ﷺ اور ان کی امت۔ الحدیث۔ اس موضوع کی احادیث بکثرت آئی ہیں۔

وَّمُبَشِّرًا اور انبیاء پر ایمان لانے والوں کو جنت کی بشارت دینے والا۔

وَّنَذِيْرًا ۝ اور (انبیاء کی تکذیب کرنے والوں کو) دوزخ سے ڈرانے والا۔

وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ اور اللہ کے حکم (اور اس کی توفیق) سے اللہ کی (توحید اور طاعت یا جنت یا بے کیف دیدار کی) طرف بلانے والا۔

بِاِذْنِهٖ کی قید کا اضافہ کرنے سے اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اللہ کی توحید و اطاعت کی دعوت دینا بڑا سخت کام ہے۔ اللہ کی مدد اور توفیق کے بغیر اس کی تکمیل ناممکن ہے۔ خصوصاً اللہ کے دیدار کی دعوت تو انتہائی دشوار ہے کہ بغیر خاص فضل خداوندی کے بندہ کی رسائی بارگاہ الٰہی تک محال ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ آپ اگر کسی کو ہدایت یاب کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے بلکہ اللہ جس کو سیدھے راستہ پر چلانا چاہتا ہے اس کو راہ راست پر چلنے کی توفیق دیتا ہے۔

حضرت ربیعہ جرشیؓ کا بیان ہے کہ (خواب میں) کوئی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور اس نے کہا تمہاری آنکھیں سوئیں (مگر) کان سنیں اور دل سمجھے۔ حضور ﷺ نے فرمایا چنانچہ میری آنکھ سو رہی تھی دونوں کان سن رہے تھے اور دل سمجھ رہا تھا کہ کسی

نے کہا۔ ایک سردار نے ایک مکان بنوایا اس میں دستر خوان لگوایا اور (دعوت عام دینے کے لئے) ایک بلانے والے کو بھیجا۔ پکارنے والے کی آواز پر جو آگیا اس نے مکان کے اندر داخل ہو کر دستر خوان پر (کھانا) کھالیا اور گھر والا سردار بھی اس سے خوش ہو گیا اور جس نے داعی کی دعوت قبول نہیں کی وہ نہ گھر میں آیا نہ دستر خوان سے کچھ کھاسکا اور سردار اس سے ناراض ہو گیا (اس کی تعبیر یہ ہے کہ) سردار اللہ ہے، گھر (جو سردار نے بنایا ہے) اسلام ہے، محمد ﷺ داعی ہیں اور دستر خوان جنت ہے۔ رواہ الدارمی۔

وَسِرَاجًا مُّنِيرًا ۝ اور روشن چراغ (بنا کر بھیجا ہے) رسول اللہ ﷺ کو روشن چراغ کہنے کی یہ وجہ ہے کہ جس طرح رات کی تاریکی میں چراغ جلایا جاتا ہے اور اس کی روشنی سے راستہ دکھ جاتا ہے اسی طرح رسول اللہ ﷺ سے بھی (اسلام کی) روشنی اور ہدایت حاصل کی جاتی ہے۔

مراد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی زبان سے تو اللہ کی طرف آنے کی دعوت دیتے تھے اور دل کے اعتبار سے روشن چراغ کی طرح تھے کہ تمام مؤمن آپ ہی کے نور سے استفادہ کرتے اور آپ ہی کے رنگ میں رنگ جاتے تھے (ایسا ہی بنا کر اللہ نے آپ کو بھیجا تھا) جیسے یہ عالم سورج کی روشنی سے اور ایک گھر چراغ کی روشنی سے منور ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام کو ساری امت پر فضیلت حاصل تھی علوم نبوت جو حضور ﷺ کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ سے امت نے حاصل کئے اس میں تو صحابہ کے ساتھ ساری امت شریک ہے۔ کچھ صحابہ ہی کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اصل سننے والا بھول جاتا ہے اور جس کو حکم پہنچایا جاتا ہے وہ زیادہ یاد رکھتا ہے۔ امتیاز صحابہ یہ ہے کہ وہ براہ راست انوار نبوت کے خوشہ چیں تھے۔ دوسروں کو جو روشنی ملی وہ صحابہ کے توسط سے پھر تابعین سے تبع تابعین کو اسی طرح قیامت تک نور نبوت امت کے دلوں کو روشن کرتا رہے گا لیکن اس خوشہ چینی میں سننے والا مشاہدہ کرنے والے کی طرح نہیں ہو سکتا جیسے صحن مکان میں سورج کی شعاعیں براہ راست پڑتی ہیں اور صحن روشن ہو جاتا ہے پھر کمروں کے اندر یہ روشنی صحن کی روشنی کے ذریعہ سے پہنچتی ہے دونوں کی روشنی اور کیفیت انجلائی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

عطاء بن یسار کا بیان ہے میں نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے ملاقات کی اور کہا رسول اللہ ﷺ کے وہ اوصاف جو توریت میں (آپ نے پڑھے) ہوں بیان فرمائیے۔ حضرت عبداللہ نے فرمایا ہاں بخدا توریت میں آپ کے جو اوصاف بیان کئے گئے ہیں ان میں سے کچھ قرآن میں بھی موجود ہیں۔ توریت میں کہا گیا ہے اے نبی ہم نے تجھ کو شاہد اور بشارت دہندہ اور عذاب کی وعید سنانے والا اور امیوں کی پناہ بنا کر بھیجا ہے تو میرا بندہ اور میرا رسول ہے۔ میں نے تیرا نام متوکل رکھا ہے۔ وہ بد خو اور درشت مزاج نہ ہوگا، بازاروں میں چیختا نہ پھرے گا، برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دے گا بلکہ عفو و درگزر سے کام لے گا جب تک کج رو ملت کی کجی دور نہ ہو جائے گی اللہ اس کی روح قبض نہیں کرے گا۔ اس کی وفات اس وقت ہوگی جب لوگ لا الٰہ الا اللہ کے قائل ہو جائیں گے اللہ اس کے ذریعہ سے اندھی آنکھوں کو بہرے کانوں اور غلاف پوش دلوں کو کھول دے گا۔ رواہ البخاری۔ دارمی نے عطا بن سلام کی روایت سے ایسا ہی بیان کیا ہے۔

بیہقی نے دلائل النبوۃ میں حضرت ربیع بن انسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جب آیت مَآ اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ نازل ہوئی (مجھے نہیں معلوم کہ مرنے کے بعد میرے ساتھ کیا کیا جائے گا نہ مجھے یہ معلوم کہ تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا) اور اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔ لِیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ (تاکہ اللہ آپ کی گزشتہ اور آئندہ فروگزاشتوں کو بخش دے) تو کچھ مسلمانوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ کو مبارک ہو جو سلوک آپ کے ساتھ کیا جائے گا۔ وہ تو ہم کو معلوم ہو گیا لیکن یہ نہیں معلوم ہوا کہ ہمارے ساتھ کیا کیا جائے گا۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا ۝ اور اہل ایمان کو خوش خبری دے دیجئے کہ اللہ کی طرف سے ان پر بڑا فضل (ہونے والا) ہے۔

ابن جریر نے عکرمہ اور حسن کی روایت سے بیان کیا ہے کہ فضل کبیر جنت ہے۔

وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ اور کافروں اور منافقوں کا کہنا نہ کیجئے۔ یعنی شریعت اسلامیہ کے خلاف کافروں اور منافقوں کی بات نہ مانیے یہ کافروں اور منافقوں کے قول کی مخالفت پر مجھے ہیں ہے کی ترغیب ہے

وَدَعْ اَذٰىهُمْ اور ان کی طرف سے جو ایذا پہنچے اس کا خیال نہ کیجئے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا مطلب یہ ہے کہ کافروں اور منافقوں کی طرف سے پہنچنے والی تکلیف پر صبر کیجئے۔

دَعْ چھوڑ دیجئے یعنی ایک طرف کو پھینک دیجئے، اس کی پرواہ نہ کیجئے، اس کا خوف نہ کیجئے۔ زجاج نے آیت کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ان سے جھگڑا نہ کیجئے، ان کو دکھ پہنچانے کا خیال نہ کیجئے۔ خلاصہ یہ کہ کافروں اور منافقوں کو (ان کی ایذا رسانی کے عوض) ایذا نہ دیجئے اس توجیہی مطلب پر بعض اہل علم کے نزدیک یہ آیت منسوخ الحکم ہے۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اور اللہ پر بھروسہ رکھیے۔ وہی آپ کے لئے کافی ہے۔

وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۴۸﴾ اور اللہ کی کارسازی کافی ہے یعنی جب تم اللہ کو اپنے تمام امور سپرد کر دو گے تو وہ تمہارے سارے امور کے لئے کافی ہوگا۔ تم کو دوسروں کا محتاج نہ چھوڑے گا۔

بیضاوی نے لکھا ہے کہ اللہ نے اپنے نبی کے پانچ اوصاف بیان فرمائے۔ شاہد، مبشر، نذیر، داعی الی اللہ، سراج منیر پھر ہر صفت کے مناسب ترتیب وار حکم دیا صرف شاہد کے مقابل کوئی حکم نہیں دیا کیونکہ مابعد کا کلام تمام احکام نگہداشت کی تفصیل کر رہا ہے (گویا شاہد کا لفظ چاہتا تھا کہ نگہداشت کی جائے لیکن نگہداشت کس بات کی کی جائے اس کی تفصیل بعد والے کلام میں کر دی گئی) بشر کے مقابل (یعنی مناسب) مؤمنوں کو بشارت دینے کا حکم دیا گیا اور نذیر کے مقابل کافروں کی طرف سے پہنچنے والی اذیت کی پرواہ نہ کرنے کا حکم دیا گیا اور ان کا لحاظ کرنے کی ممانعت کر دی گئی اور داعی الی اللہ کے مقابل اللہ پر بھروسہ رکھنے کا حکم دیا گیا اور سراج منیر کے مناسب فرمایا کہ اللہ کی کارسازی کافی ہے اسی کی کارسازی پر اکتفا کی جائے۔ کیونکہ وہ ذات جس نے تمام مخلوق سے زیادہ روشن دلائل آپ کو عنایت کئے ہیں اسی ذات پر اکتفا کرنا مناسب ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ

اے ایمان والو جب تم مسلمان عورتوں سے نکاح کرو پھر ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے (کسی وجہ سے) طلاق دے دو۔

یہ حکم مسلمان عورتوں کا بھی ہے اور کتابی عورتیں جن سے مسلمانوں نے نکاح کر لیا ہو ان کا بھی یہی حکم ہے۔ لیکن خصوصیت کے ساتھ صرف مؤمنات کا ذکر کرنے سے اس امر کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ مسلمان عورتوں سے ہی نکاح کرنا مسلمانوں کے لئے مناسب ہے۔

ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ پھر (یعنی نکاح کے بعد) تم نے ان کو طلاق دے دی ہو۔

بغوی نے کہا اس فقرہ سے ثابت ہو رہا ہے کہ نکاح سے پہلے طلاق قابل اعتبار نہیں ہے کیونکہ نکاح پر طلاق کو متفرع کیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی غیر عورت سے اس طرح کہا کہ جب میں تجھ سے نکاح کروں تو تجھے طلاق ہے پھر اس سے نکاح کر لیا تو (نکاح سے) پہلے دی ہوئی طلاق کا اعتبار نہیں کیا جائے گا اور اگر اس طرح کہا جس عورت سے میں نکاح کروں اسے طلاق ہے پھر کسی عورت سے نکاح کر لیا تو طلاق واقع نہ ہوگی۔ حضرت علی، حضرت ابن عباس، حضرت معاذ، حضرت جابر اور حضرت عائشہؓ کا یہی قول ہے۔ سعید بن مسیب، سعید بن جبیر، عروہ قاسم، طاؤس، حسن، عکرمہ، عطا، سلیمان بن یسار، مجاہد، شعبی، قتادہ اور اکثر علماء رحمہم اللہ تعالیٰ اسی کے قائل ہیں امام شافعیؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔

اگر آزادی کو ملک کے ساتھ معلق کر دیا ہو (مثلاً یوں کہا ہو جب میں کسی باندی غلام کا مالک ہوں تو وہ آزاد ہے۔ یا کسی معین باندی غلام سے کہا ہو جب میں تیرا مالک ہوں تو تو آزاد ہے) تو اس کا بھی یہی حکم ہے حضرت ابن مسعود نے فرمایا (مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں) طلاق واقع ہو جائے گی۔ ابراہیم نخعی اور اصحاب الرای یعنی امام ابو حنیفہ اور صاحبین کا یہی قول ہے۔

ربیعہ، اوزاعی اور امام مالک نے کہا اگر کسی معین عورت کے متعلق جملہ مذکورہ کہا (جیسا اول الذکر صورت میں ہے) تو

طلاق واقع ہو جائے گی اور اگر عورت کی تعیین نہیں کی بلکہ عام جملہ بولا (جیسا دوسری مثال میں ہے) تو طلاق نہ ہو گی۔

عکرمہ کی روایت ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا لوگوں نے ابن مسعود کی طرف غلط نسبت کی ہے اور اگر واقعی انہوں نے ایسا کہا ہے تو یہ ایک عالم سے لغزش ہوئی خواہ ان کا یہ قول کسی ایسے شخص کے متعلق ہی ہو جس نے کسی متعین عورت کے متعلق کہا ہو کہ فلاں عورت سے میں نکاح کروں تو اسے طلاق ہے۔ اللہ فرمارہا ہے یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ اس نے اِذَا طَلَّقْتُمُوْهُنَّ ثُمَّ نَكَحْتُمُوْهُنَّ نہیں فرمایا (یعنی نکاح کے بعد طلاق کا ذکر کیا۔ طلاق کے بعد نکاح کا ذکر نہیں کیا) بغوی نے (مسلک شافعی پر) ایک حدیث سے بھی استدلال کیا ہے جو حضرت جابر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نکاح سے پہلے طلاق نہیں ہوتی۔ میں کہتا ہوں حاکم نے مستدرک میں یہ حدیث بیان کی ہے اور اس کو صحیح کہا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ شیخین پر مجھے تعجب ہے کہ کیونکہ انہوں نے یہ حدیث صحیحین میں ذکر نہیں کی باوجودیکہ ان کی شرائط کے مطابق (اس کے راوی ثقہ، عادل، حافظ و ضابط ہیں)

امام احمد نے کہا اگر طلاق کو معلق بالنکاح کیا ہے تو نکاح کے بعد طلاق واقع ہو جائے گی اور اگر باندی غلام کی آزادی کو معلق بالملک کیا ہے تو مالک ہونے کے بعد غلام باندی کے آزاد ہونے یا نہ ہونے کے متعلق امام احمد کے دو قول مروی ہیں۔ امام مالک نے کہا کسی خاص شہر کا یا قبیلہ یا کسی خاص صنف کا یا کسی خاص عورت کا نام لیا ہے اور اس کی طلاق کو معلق بالنکاح کیا ہے تو نکاح کے بعد طلاق واقع ہو جائے گی اور اگر بالکل تعمیم کی ہے نہ عورت کو نامزد کیا ہے نہ کسی شہر قبیلہ یا صنف کو (اور یوں کہا کہ میں کسی عورت سے نکاح کروں تو اسے طلاق ہے) تو طلاق نہیں ہو گی۔

ابن جوزی نے امام احمد کے قول کو ثابت کرنے کے لئے چھ احادیث پیش کی ہیں۔ (۱) عمرو بن شعیب نے بوساطت شعیب اپنے دادا کی روایت سے رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان نقل کیا کہ غیر مملوک (یعنی غیر منکوحہ) کو طلاق (نافذ) نہیں نہ غیر مملوک کو آزاد کرنا (جائز) ہے نہ غیر مملوک کو فروخت کرنا (درست) ہے۔ ابن جوزی نے یہ حدیث امام احمد کے طریق سے نقل کی ہے اصحاب السنن نے بھی اس کو بیان کیا ہے۔ ترمذی نے کہا اس باب میں جو روایات آئی ہیں سب سے بہتر یہ روایت ہے۔ بزار کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں نکاح سے پہلے طلاق نہیں اور نہ ملکیت سے پہلے آزادی ہے۔ بیہقی نے خلافیات میں لکھا ہے کہ بخاری نے اس موضوع کی روایات میں مذکورہ روایت کو سب سے زیادہ صحیح کہا ہے۔

(۲) عمرو بن شعیب نے بوساطت طاؤس حضرت معاذ بن جبل کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ غیر مملوک کو نہ طلاق جائز ہے نہ آزاد کرنا نہ فروخت کرنا نہ اس نذر کو پورا کرنا جائز ہے جو غیر مملوک چیز کی ہو۔ رواہ الدار قطنی۔

دار قطنی نے ایک اور طریقہ سے از ابراہیم ابو اسحاق ضریر از یزید بن عیاض از زہری از سعید بن مسیب از معاذ بن جبلؓ بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا طلاق (جائز) نہیں ہے مگر نکاح کے بعد خواہ مقررہ عورت کو نامزد کر کے (دی گئی) ہو۔

حافظ ابن حجر نے کہا یہ روایت منقطع ہے اور یزید بن عیاض متروک ہے۔ ذہبی نے استیعاب اسماء الرجال میں ذکر کیا ہے کہ امام مالک نے کہا یزید بن عیاض بڑا جھوٹا ہے۔ یحییٰ بن معین نے کہا ضعیف ہے ہیچ ہے۔ احمد بن صالح نے کہا لوگوں کے لئے یہ (احادیث) بنالیتا تھا۔ بخاری اور مسلم نے اس کو منکر الحدیث کہا ہے ابوداؤد نے کہا اس کی (بیان کی ہوئی) حدیث ترک کر دی جائے۔ نسائی نے اس کو متروک کہا ہے اور ایک مقام پر کذاب کہا ہے۔

(۳) دار قطنی کی روایت ہے ہم سے بقیہ بن ولید نے بیان کیا بحوالہ ثور بن یزید از روایت خالد بن معدان کہ حضرت ابو ثعلبہ خشنی نے کہا مجھ سے میرے چچا نے کہا تو میرے ساتھ مل کر کام کر میں اپنی لڑکی کا تجھ سے نکاح کر دوں گا میں نے (جواب میں) کہا اگر میں نے اس سے نکاح کیا تو اس کو (میری طرف سے) تین طلاقیں۔ کچھ مدت کے بعد اس سے نکاح کرنے کا میرا خیال ہوا تو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر میں نے (یہ مسئلہ) دریافت کیا۔ فرمایا تو اس سے نکاح کر لے کیونکہ طلاق (جائز) نہیں مگر نکاح کے بعد حسب اجازت میں نے اس سے نکاح کر لیا اور اس سے میرے دو بیٹے پیدا ہوئے اسعد اور

سعید۔

ذہبی نے میزان میں لکھا ہے کہ نسائی وغیرہ نے کہا اگر بقیہ بن ولید لفظ حدثنا (ہم سے بیان کیا) کہے تو قابل اعتماد ہے لیکن بہت سے اہل روایت کہتے ہیں کہ بقیہ مدلس تھا جب وہ کسی حدیث کو از فلاں کہہ کے بیان کرے تو قابل استدلال نہیں۔

ثور بن یزید ضرور ثقہ ہے صحیح الحدیث ہے لیکن فرقہ قدریہ میں اس کا داخل ہونا مشہور ہے۔ اس جگہ بقیہ نے یہ حدیث از ثور بن یزید کے لفظ سے بیان کی ہے (اس لئے قابل استدلال نہیں) ابن ہمام نے اس کی سند پر طعن کیا ہے کہ اس سلسلہ میں علی بن قرین ایک راوی ہے۔ جس کو امام احمد نے جھوٹا قرار دیا ہے۔

میں کہتا ہوں ابن جوزی نے جس سلسلہ میں یہ حدیث بیان کی ہے وہ دار قطنی کے طریق سے نہیں ہے اور نہ اس میں علی بن قرین آتا ہے۔

(۴) حضرت ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا ایک آدمی نے کہا جس روز میں فلاں عورت سے نکاح کروں اس کو (میری طرف سے) طلاق ہے (کیا نکاح کے بعد طلاق پڑ جائے گی فرمایا اس نے ایسی طلاق دی جس کا وہ مالک نہیں تھا۔ (رواہ دار قطنی) اس کی سند میں ابو خالد واسطی یعنی عمرو بن خالد واقع ہے۔ جس کو بقول ذہبی ابو حاتم نے ضعیف کہا ہے اور بقول ابن ہمام امام احمد اور یحیٰی بن معین نے کذاب قرار دیا ہے۔

ابن عدی نے بروایت نافع بیان کیا کہ حضرت ابن عمر نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا طلاق (جائز) نہیں مگر نکاح کے بعد۔ ابن حجر نے کہا اس سند کے راوی ثقہ ہیں۔

(۵) طاؤس نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نذر (واجب الاداء) نہیں مگر اسی صورت میں جس میں اللہ کے حکم کی پابندی کی گئی ہو اور قطع قرابت کی قسم (واجب الوفا) نہیں اور (نافذ نہیں) غیر مملوک کو نہ طلاق دینا نہ آزاد کرنا (رواہ الدار قطنی) ابن حجر نے کہا حاکم نے اس کو دوسرے طریق سے نقل کیا ہے۔ جس کے بعض راوی غیر معروف ہیں۔

حاکم نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ابن مسعودؓ نے یہ بات (یعنی وقوع طلاق قبل از نکاح کی) نہیں کہی اور اگر کہی ہو تو یہ ایک عالم کی لغزش ہے۔ اللہ نے تو فرمایا ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ اس طرح نہیں فرمایا۔ اِذَا طَلَّقْتُمُوْهُنَّ ثُمَّ نَكَحْتُمُوْهُنَّ۔

بعض اہل علم کا قول ہے کہ لا طلاق قبل نکاح کی کوئی روایت مرفوع صحیح نہیں۔ سب سے زیادہ صحیح مرسل روایت ہے۔ جو معمر نے بحوالہ طاؤس بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (ظاہر ہے کہ طاؤس صحابی نہ تھے اور کسی صحابی کے حوالہ سے انہوں نے بیان نہیں کیا اس لئے یہ روایت مرسل الصحابی ہے)

(۶) حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ابو سفیان بن حرب کو نجران (علاقہ) یمن کا حاکم بنا کر بھیجا اور منجملہ دیگر ہدایات کے یہ ہدایت بھی کی کہ جو نکاح میں نہ ہو اس کو آدمی طلاق نہ دے اور نہ اس کو آزاد کرے جس کا مالک نہ ہو۔

ابن حجر نے کہا ابن ابی حاتم نے علل میں لکھا ہے کہ یہ حدیث منکر ہے۔ حاکم نے بطریق حجاج بن منہال از روایت ہشام دستوائی از عروہ از عائشہ اس کو مرفوعاً ذکر کیا ہے۔ ابن جوزی نے لکھا ہے اسی طرح کی حدیث حضرت علیؓ اور حضرت جابرؓ کی روایت سے بھی آئی ہے لیکن سارے حلیے قطعاً واجب الاجتناب ہیں (کوئی قابل اعتبار نہیں)

میں کہتا ہوں حضرت علیؓ کی روایت سے مرفوعاً ابن ماجہ نے بیان کیا ہے کہ نکاح سے پہلے طلاق (جائز) نہیں اس کی سند میں جو یبر ضعیف راوی آیا ہے۔ حضرت جابر کی روایت کردہ حدیث میں نے پہلے ذکر کر دی ہے۔

اس سلسلہ کی ایک حدیث حضرت مسور بن مخرمہ کی بیان کردہ آئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نکاح سے پہلے طلاق نہیں اور نہ مالک ہونے سے پہلے آزاد کرنا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کے قول کی دلیل یہ ہے کہ جو طلاق معلق بالشرط ہو وہ حقیقت میں طلاق ہی نہیں ہے جب تعلیق بالشرط کر دی گئی تو سبب موجب نہیں رہا ان دخلت الدار فانت طالق اور ان نکحتک فانت طالق دونوں جملوں میں کسم ہے جو دخول دار اور نکاح سے مانع ہے اور دخول دار اور نکاح وقوع طلاق کی شرط ہے لہذا تعلیق بالشرط طلاق سے مانع ہے اس لئے یہ تعلیق موجب طلاق نہیں ہو سکتی۔ مانع طلاق ہونا اور موجب طلاق ہونا دو متضاد چیزیں ہیں ہاں وجود شرط کے بعد طلاق بننے کی اس میں صلاحیت ہے اور جب طلاق معلق طلاق نہیں ہے تو آیت سے استدلال بھی صحیح نہیں ہے۔ باقی وہ احادیث جن سے قبل از نکاح طلاق دینے کے جواز کی نفی کی گئی ہے تو ان احادیث میں حضرت ابن عمر اور حضرت ابو ثعلبہ خشنی کی روایات صحیح نہیں ہیں۔ عدم صحت کی وجہ اوپر ذکر کر دی گئی ہے۔

ایک شبہ: جب مشروط طلاق طلاق ہی نہیں ہے تو پھر اگر کوئی شخص کسی غیر عورت سے کہے اگر تو گھر میں گئی تو تجھے طلاق ہے اور کوئی شخص غیر عورت سے کہے اگر میں نے تجھ سے نکاح کیا تو تجھے طلاق ہے۔ دونوں جملے ایک ہی طرح کے ہیں (دونوں میں طلاق مشروط ہے اور مشروط طلاق تمہارے نزدیک طلاق ہی نہیں ہے) تو پھر اول صورت میں انعقاد نہ ہونا اور دوسرے جملہ میں انعقاد ہو جانا کیوں ہے (یعنی موخر الذکر جملہ کہنے کے بعد اگر نکاح کرے گا تو طلاق ہو جائے گی اور اول الذکر جملہ کہنے کے بعد اگر عورت گھر میں داخل ہو گی تو مکان میں اس کے داخلہ کا اس کے نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑے گا اور طلاق واقع نہ ہو گی)

جواب: دونوں جملوں کے حکم میں فرق یہ ہے کہ قسم یا تو اللہ کے خوف کی وجہ سے مانع فعل ہوتی ہے کہ اگر وہ کام کرے گا تو گناہ ہو گا یا یہ خوف ہوتا ہے کہ اگر وہ کام کیا تو ایسا ناگوار نتیجہ نکلے گا جو قائل کو پسند نہیں مثلاً طلاق پڑ جائے گی یا غلام آزاد ہو جائے گا اب اگر وقوع طلاق و عتق کو ملکیت کے ساتھ مشروط کیا گیا ہو تو ڈر کی وجہ سے یقیناً مالک ہونے سے رک سکتا ہے (یعنی نکاح کرنا یا غلام کو خریدنا چونکہ قائل کا اپنا فعل ہے اس لئے ڈر کے مارے نہ نکاح کرے گا نہ غلام کو خریدے گا) لیکن طلاق و عتاق کو کسی غیر عورت کے گھر میں داخل ہونے سے مشروط کیا ہو تو اس جملہ میں اجنبی عورت کے لئے گھر میں داخل ہونے سے کوئی مانع نہیں لہذا اس قسم کے جملہ میں نہ قسم ہونے کی صلاحیت ہے نہ وقوع طلاق کا سبب بننے کی بلکہ ایک لغو کلام ہے۔

ابن ہمام نے لکھا ہے ہمارے مسلک کے مطابق حضرت عمرؓ، حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کے اقوال بھی مروی ہیں۔ ابن ابی شیبہ نے مصنف میں سالم، قاسم بن محمد، عمر بن عبدالعزیز، شعبی، نخعی، زہری، اسود، ابو بکر بن عبدالرحمن اور مکحول شامی کے اقوال بھی یہ نقل کئے ہیں۔ اگر کسی نے کہا فلاں عورت سے اگر میں نے نکاح کیا تو اس کو طلاق ہے یا یوں کہا اگر میں فلاں عورت سے نکاح کروں اس کو طلاق ہے یا یوں کہا جس عورت سے میں نکاح کروں اس کو طلاق ہے۔ تینوں صورتوں میں ان علماء کے نزدیک طلاق بعد النکاح پڑ جائے گی۔ ہمارے مسلک کی تائید سعید بن مسیب، عطاء، حماد بن ابی سلیمان اور شریح کے اقوال سے بھی ہوتی ہے۔

امام شافعیؒ نے فرمایا جو طلاق معلق بالشرط ہو وہ طلاق ہی ہے تعلیق بالشرط سبب کو سبب ہونے سے نہیں روکتی بلکہ حکم سے روکتی ہے جیسے بیع بشرط خیار (بیع ہی ہوتی ہے اختیار مشتری یا اختیار بائع بیع ہونے سے مانع نہیں ہوتا بلکہ حکم بیع اور ملکیت کا حصول مدت خیار ختم ہونے یا خیار کے فسخ کر دینے سے ہوتا ہے) حضرت ابو ثعلبہ خشنی کی حدیث میں اس کی کھلی ہوئی تصریح ہے۔ ابن جوزی نے اس کو ذکر کیا ہے اور سند پر کوئی طعن نہیں کیا باوجودیکہ وہ بے باک تنقید کرتے ہیں اور اظہار حق میں تامل نہیں کرتے۔ اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد لا طلاق قبل النکاح یا اسی کے ہم معنی الفاظ تو اس میں طلاق کو نکاح کے ساتھ معلق کرنے کی یا ممانعت ہے (اگر نہی کا معنی لیا جائے) یا نفی ہے۔

تنجیز طلاق قبل النکاح کا تو کوئی مفہوم ہی اس کے اندر نہیں ہے اور ایسے کلام سے تنجیز طلاق کا تصور کوئی عاقل کر ہی نہیں سکتا اگر تنجیز کی طرف کلام کا رخ پھیرا جائے گا تو یہ کلام ایسا ہی ہو جائے گا جیسے کوئی کہے کہ پیدائش سے پہلے نماز فرض

نہیں۔

آیت مذکورہ میں مس (چھونے اور ہاتھ لگانے) سے مراد ہے جماع کرنا۔

فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّونَهَا ۚ تو تمہارے لئے ان پر کوئی عدت (واجب) نہیں جس کو شمار کرنے لگو۔ عدت یعنی وہ ایام جن میں عورت کے لئے نکاح کرنا ممنوع ہے۔ اس حکم پر تمام امت کا اتفاق ہے۔

لَكُمْ کا لفظ بتا رہا ہے کہ عورتوں (بیوہ ہوں یا مطلقہ) پر عدت کرنے کا حق مردوں کا ہے اپنے پانی کی حفاظت اور نسب میں شک نہ ہونا عدت کا فائدہ ہے اور نسب مردوں سے ہوتا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ نے کہا اگر کسی ذمی مرد نے کسی ذمی عورت کو طلاق دے دی اور ان کے مذہب میں عدت کا قانون نہیں ہے تو ذمی عورت پر عدت لازم نہ ہوگی اور اگر ان کے مذہب میں وجوب عدت کا قانون ہے تو عورت پر عدت لازم ہوگی۔

حربی عورت اگر مسلمان ہو کر ہمارے ملک میں آجائے گی تو اس کے لئے کوئی عدت نہیں اگر وہ فوراً نکاح کرنا چاہے تو کر سکتی ہے کیونکہ حربی کافر کا از روئے شرع کوئی حق نہیں وہ بے جان جمادات کی طرح ہے کہ مسلمان (دوسرے سامان کی طرح) اس کا مالک ہو سکتا ہے ہاں اگر وہ حاملہ ہوگی تو عدت پوری کرنی ہوگی کیونکہ اس کے پیٹ میں بچہ ہے۔ وہ ثابت النسب ہے امام ابوحنیفہؒ کا ایک قول اس صورت میں یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ حاملہ سے نکاح تو ہو سکتا ہے لیکن قربت نہیں کی جا سکتی جیسے کسی عورت کو زنا سے حمل ہو تو حالت حمل میں اس سے نکاح تو کیا جا سکتا ہے مگر صحبت نہیں کی جا سکتی۔ امام کا اول قول زیادہ صحیح ہے۔

فَمَتِّعُوهُنَّ تو ان کو کچھ متاع (مال) دے دو۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا یہ حکم اس وقت ہے جب مہر کی مقدار مقرر نہ کی ہو اگر مہر مقرر ہو تو آدھا واجب الادا ہوگا متاع لازم نہ ہوگا۔ حضرت ابن عباسؓ کے اس قول پر یہ آیت مخصوص البعض ہوگی۔ قتادہ نے کہا یہ آیت منسوخ ہے آیت فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اس کی ناسخ ہے۔ دونوں قولوں کا مآل ایک ہی ہے کہ اگر بغیر جماع کئے کسی نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور مہر کی مقدار مقرر تھی تو آدھا مہر ادا کیا جائے گا اس صورت میں متاع دینا نہ واجب ہے نہ مستحب۔ بعض کے نزدیک نصف مہر کے ساتھ ساتھ متاع دینا مستحب ہے اس قول پر مَتِّعُوهُنَّ کا امر استحباب کے لئے ہوگا۔

حسن اور سعید بن جبیر کے نزدیک اس آیت سے متاع دینا واجب ہو رہا ہے اور سورۂ بقرہ کی آیت فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ سے آدھا مہر ادا کرنا لازم قرار پاتا ہے۔

متاع واجب ہے یا مستحب اور متاع کی مقدار کیا ہے، اس میں علماء کے اقوال میں کیا اختلاف ہے اس کی پوری تفصیل ہم سورۂ بقرہ میں کر چکے یہاں مکرر ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

وَسَرِّحُوهُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ﴿٤٩﴾ اور خوبصورتی کے ساتھ ان کو رخصت کر دو۔ یعنی اپنے گھروں سے باہر جانے دو اور ان کی راہ نہ روکو کیونکہ ان پر عدت لازم نہیں۔

جَمِيلًا سے مراد ہے بغیر دکھ پہنچائے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ اللَّاتِي آتَيْتَ أُجُورَهُنَّ اے نبی ہم نے آپ کے لئے آپ کی یہ بیویاں جن کا مہر آپ دے چکے حلال کر دی ہیں۔

أُجُور (اجر کی جمع ہے) سے مراد ہیں مہر کیونکہ مہر تمتع اندوزی کا بدل ہے۔ مہر ادا کر دینے کی قید (احترازی نہیں بلکہ) ایک واقعہ کا بیان ہے، رسول اللہ ﷺ کی عادت ہی تھی کہ ہر بیوی کا مہر آپ نے فوراً ادا کر دیا تھا یایوں کہا جائے کہ آتَيْتَ أُجُورَهُنَّ کی صراحت اس لئے کی کہ مہر معجل یعنی مہر کی فوراً ادائیگی افضل ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اسی کو اختیار کیا تھا۔ بہر حال باتفاق علماء (یعنی ان علماء کے نزدیک بھی جو مفہوم مخالف کے قائل ہیں) اس جگہ مفہوم مخالف نہیں ہے (یعنی یہ

مطلب نہیں اخذ کیا جاسکتا کہ اگر کسی بیوی کا مہر نقد نہ ادا کیا گیا ہو تو رسول اللہ ﷺ کے لئے وہ حلال نہ تھی)

وَمَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ مِمَّا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَيْكَ اور وہ عورتیں بھی آپ کے لئے حلال کر دی ہیں جو آپ کی مملوکہ ہیں اور غنیمت میں اللہ نے آپ کو دلوا دی ہیں۔

مِمَّا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَيْكَ کی قید بھی احترازی نہیں ہے جو علماء مفہوم (مخالف) کے قائل ہیں ان کے نزدیک اس کا کوئی مفہوم (مخالف) نہیں ہے۔ صاحبزادہ حضرت ابراہیم کی والدہ حضرت ماریہ کسی جہاد کے موقع پر گرفتار کر کے نہیں لائی گئی تھیں بلکہ مقوقس شاہ مصر نے بطور ہدیہ رسول اللہ ﷺ کے لئے ان کو بھیجا تھا۔

اَفَاءَ یعنی جن باندیوں کو کافروں سے لوٹا کر آپ کو عطا کیا ہے مطلب یہ کہ جو گرفتار کر کے لائی گئی ہوں اور آپ ان کے مالک ہو گئے ہوں جیسے حضرت صفیہ اور حضرت جویریہ تھیں۔

وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ اور (اللہ نے آپ کے لئے حلال کر دی ہیں) آپ کے چچا کی بیٹیاں اور پھوپھیوں کی بیٹیاں۔ یعنی قریش کی بیٹیاں (آپ قریش کی بیٹیوں سے نکاح کر سکتے ہیں۔ مترجم)

وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ اور آپ کے ماموں کی بیٹیاں اور آپ کی خالاؤں کی بیٹیاں یعنی خاندان بنی زہرہ کی بیٹیاں۔

الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ جنہوں نے آپ کی موافقت میں ہجرت کی ہو۔ معیت سے مراد معیت زمانی نہیں ہے (یعنی یہ مطلب نہیں کہ آپ کے ساتھ آپ کے ہمراہ اور ہم رکاب ہجرت کی ہو) بلکہ معیت سے مراد ہے نفس فعل میں موافقت (یعنی فعل ہجرت میں وہ آپ کے ساتھ ہوں ہجرت ترک نہ کی ہو) جیسے اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ میں لفظ مع استعمال کیا گیا ہے گویا قریش اور بنی زہرہ کی ہجرت کرنے والیاں مراد ہیں (خواہ رسول اللہ ﷺ کی ہجرت سے پہلے انہوں نے ہجرت کی ہو یا بعد کو)

بغوی نے لکھا ہے کہ ہجرت کی قید سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ جن عورتوں نے ہجرت نہیں کی ان سے رسول اللہ ﷺ کا نکاح جائز نہ تھا۔ ترمذی اور حاکم نے بوساطت سدی ابو صالح کی روایت سے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے۔ ترمذی نے اس کو حسن اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے کہ حضرت ام ہانی بنت ابو طالب نے فرمایا جب مکہ فتح ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے نکاح کا پیام دیا میں نے معذرت کی آپ نے میرا عذر قبول کر لیا پھر جب اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی تو میں رسول اللہ ﷺ کے لئے حلال ہی نہیں رہی کیونکہ میں مہاجرات میں سے نہیں تھی۔[1] طلقاء میں سے تھی (یعنی ان لوگوں میں داخل تھی جن کو فتح مکہ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے آزادی عطا کر دی تھی اور گرفتار نہیں کیا تھا اور فرما دیا تھا جاؤ تم سب آزاد ہو۔ مترجم)

ابن ابی حاتم نے بطریق اسماعیل بن ابو خالد بروایت ابو صالح حضرت ام ہانی کا بیان نقل کیا ہے کہ آیت وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ میرے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے نکاح کرنا چاہا تھا پھر آپ کو میرے ساتھ نکاح کرنے کی ممانعت کر دی گئی کیونکہ میں نے ہجرت نہیں کی تھی۔

بغوی نے لکھا پھر کچھ مدت کے بعد شرط ہجرت منسوخ کر دی گئی بعض کے نزدیک آیت میں ہجرت سے مراد اسلام ہے یعنی آپ کے ساتھ مسلمان ہو گئی ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مہاجر وہ ہے جس نے وہ تمام امور چھوڑ دیے ہوں جن کی

---

[1] حضرت ام ہانی کے آزاد کردہ غلام ابو صالحؒ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ام ہانی بنت ابو طالب کو نکاح کا پیام دیا ام ہانی نے کہا یا رسول اللہ میری حالت شکستہ ہے میرے بچے چھوٹے ہیں جب ام ہانی کے لڑکے بڑے ہو گئے تو پھر ام ہانی نے خود نکاح کی درخواست کی لیکن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اب تو نہیں ہو سکتا اللہ نے یہ آیت مجھ پر نازل فرما دی يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّآ اَفَاۗءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ حضرت ام ہانی مہاجرات میں سے نہیں تھیں۔ (از مفسر قدس سرہ)

اللہ نے ممانعت فرمادی ہے۔ (رواہ البخاری) آیت کی اس طرح تشریح دلالت کر رہی ہے کہ غیر مسلمہ (خواہ یہودی ہو یا عیسائی) کا نکاح رسول اللہ ﷺ سے جائز نہیں تھا۔

وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا

اور وہ مسلمان عورت بھی حلال کر دی ہے جو بلا عوض اپنے کو پیغمبر کو دے دے بشرطیکہ پیغمبر اس کو اپنے نکاح میں لانا چاہیں۔

بغوی نے لکھا ہے اگر غیر مسلمہ خود اپنے کو رسول اللہ ﷺ کو ہبہ کر دیتی تو آپ کے لئے اس کو نکاح میں لانا جائز نہ تھا (مؤمنہ کی قید اس پر دلالت کر رہی ہے)

علماء کے اقوال اس مسئلہ میں مختلف ہیں کہ کسی غیر مسلمہ سے رسول اللہ ﷺ کا نکاح جائز تھا یا نہیں تھا۔ علماء کی ایک جماعت عدم جواز کے قائل ہے کیونکہ اللہ نے وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً فرمایا ہے اور هَاجَرْنَ مَعَكَ کا معنی اَسْلَمْنَ مَعَكَ ہم اوپر بیان کر ہی چکے ہیں (جس سے ثابت ہوتا ہے کہ غیر مسلمہ عورتوں سے نکاح حضور ﷺ کے لئے حلال نہیں کیا گیا۔)

اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا کا یہ مطلب ہے کہ اگر اتفاق سے کوئی مسلمان عورت بغیر مہر کے اپنی ذات کو رسول اللہ ﷺ کو ہبہ کر دے تو ایسی عورت کو ہم نے نبی کے لئے حلال کر دیا ہے اگر وہ نکاح میں لانا چاہیں تو اس کو اپنے نکاح میں لا سکتے ہیں۔

ہبہ نفس نکاح کا رکن ہے گویا قبول سے پہلے جو ایجاب ہوتا ہے یہ ہبہ اس کے قائم مقام ہو جائے گا لیکن صرف ہبہ کرنے سے وہ عورت حلال نہیں ہو جائے گی بلکہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اس کو نکاح میں لانے کا ارادہ ضروری ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے نکاح کرنے کی مرضی قبول کے قائم مقام ہو جائے گی اس طرح نکاح کے دونوں رکن پورے ہو جائیں گے اور نکاح مکمل ہو جائے گا۔

خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ یہ سب آپ کے لئے مخصوص کئے گئے ہیں نہ اور مؤمنوں کے لئے۔

یعنی دوسرے مسلمانوں پر مہر واجب ہے۔ قربت کے بعد یا مرنے کے بعد۔ خواہ نکاح کے وقت مہر کا ذکر بالکل نہ کیا گیا ہو۔ یہ اظہار ہے رسول اللہ کی عزت اور شرف نبوت کا جس کی وجہ سے نکاح بلا مہر آپ کے لئے جائز کر دیا گیا۔ خَالِصَةً بروزن عَافِيَةً مصدر ہے۔ آیت کی یہ تفسیر اس وقت ہو گی جب مذکورہ شرطوں کو احترازی قرار دیا جائے۔ خَالِصَةً کو موصوف محذوف کی صفت بھی قرار دیا جا سکتا ہے یعنی ہبہ خالص آپ کے لئے ہو دوسرے مسلمانوں کے لئے نہ ہو۔

ابن سعد نے آیت وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً کی بابت عکرمہ کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول ام شریک دوسیہ کے بارے میں ہوا۔ ابن سعد نے منیر بن عبداللہ دوسی کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ام شریک عزیہ بنت جابر بن حکیم دوسی نے رسول اللہ ﷺ کو اپنے نفس کی پیش کش کی تھی عورت خوبصورت تھی رسول اللہ ﷺ نے اس کو قبول فرمالیا۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا جو عورت اپنی ذات کو کسی مرد کو ہبہ کر دے اس کے اندر کوئی بھلائی نہیں۔ ام شریک نے کہا میں ہوں (کہ اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ کے لئے میں نے ہبہ کیا) اللہ نے ان کو مومنہ فرمایا۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت عائشہؓ نے کہا اللہ آپ کو آپ کی خواہش جلد عطا کر دیتا ہے۔

ابن سعد نے بروایت ابورزین بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی کسی بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ کیا تھا۔ عورتوں نے جب یہ دیکھا تو اپنے حقوق سے آپ کو آزاد کر دیا کہ آپ جس بیوی کو چاہیں (اپنی قربت کے لئے) دوسری پر ترجیح دیں (یعنی ہر عورت نے اپنی باری کے استحقاق سے آپ کو سبکدوش کر دیا) اس پر اللہ نے آیات اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ سے تُرْجِيْ مَنْ تَشَآءُ الخ تک نازل فرمائیں۔

خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ (الآیہ) کے الفاظ دلالت کر رہے ہیں کہ بغیر (وجوب) مہر کے نکاح کر لینے کی اجازت حضور ﷺ کے لئے مخصوص تھی یہی مطلب ہے کہ آیت اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا کا یعنی اگر کوئی عورت اپنے آپ کو بغیر

مہر کے آپ کے نکاح میں دے دے (نکاح بلا مہر کو ہبۂ نفس فرمایا ہے) ایک زمانہ میں چار عورتوں سے زیادہ سے نکاح کرنا اور نکاح میں رکھنا بھی رسول اللہ ﷺ کے لئے خاص تھا۔

خالصۃ کا یہ معنی بھی بیان کیا گیا ہے کہ لفظ ہبہ استعمال کر کے نکاح کا انعقاد رسول اللہ ﷺ کے لئے مخصوص تھا دوسروں کے لئے جائز نہیں۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک بلفظ ہبہ نکاح کا انعقاد رسول اللہ ﷺ کے ہی لئے مخصوص نہ تھا بلکہ ہر شخص کا نکاح بلفظ ہبہ ہو سکتا ہے۔ بغوی نے لکھا پہلا قول سعید بن مسیب، زہری، مجاہد، عطاء رحمہم اللہ، مالک اور شافعی کا ہے۔ سب کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی کا نکاح بھی بغیر لفظ نکاح یا تزویج کے نہیں ہو سکتا۔

میں کہتا ہوں یہی قول امام احمد کا بھی ہے لیکن اختلاف ائمہ کے ذیل میں امام احمد کا قول یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہر شخص کا نکاح بلفظ ہبہ ہو سکتا ہے۔

امام ابو حنیفہ نے فرمایا جو لفظ دوامی انتقال ملکیت پر دلالت کرتا ہو (اس کو اگر عورت نے استعمال کیا تو) اس سے نکاح ہو جاتا ہے۔ لفظ ہبہ، بیع، صدقہ، تملیک وغیرہ۔

اگر لفظ عاریت یا اجرت استعمال کیا ہو (مثلاً یہ کہا ہو کہ میں نے اجرت پر یا بغیر اجرت کے صرف عاریۃً اپنا نفس تجھے دیا) تو اس سے نکاح نہیں ہوگا (کیونکہ ان الفاظ سے دوامی انتقال ملکیت نہیں ہوتا بلکہ عارضی تملیک منفعت ہو جاتا ہے) کرخی کے نزدیک مذکورہ بالا دونوں لفظوں سے نکاح ہو جاتا ہے کیونکہ ان دونوں لفظوں سے منفعت اندوزی کا تو اختیار حاصل ہو جاتا ہے اور نکاح میں منفعت اندوزی کی ہی ملکیت ہوتی ہے (ملکیت رقبہ حاصل نہیں ہوتی) ہم کہتے ہیں ان لفظوں سے ملکیت متعہ بھی (دوامی) حاصل نہیں ہوتی اس لئے ان لفظوں کو بطور استعارہ نکاح کے لئے نہیں استعمال کیا جا سکتا۔ اسی طرح لفظ وصیت سے بھی نکاح نہیں ہوتا کیونکہ وصیت سے انتقال ملکیت مرنے کے بعد ہوتا ہے۔ طحاوی نے لکھا ہے لفظ وصیت سے کسی قدر ملکیت رقبہ کا حصول تو ہو ہی جاتا ہے اس لئے لفظ وصیت سے نکاح ہو جائے گا۔

کرخی نے کہا اگر لفظ وصیت کو ایسے لفظ سے مشروط کر دیا جو موجودہ حال پر دلالت کر رہا ہو تو نکاح ہو جانا چاہیے (نکاح کے وقت) یوں کہا اوصیت لک بنتی ہذہ الآن میں تیرے لئے اپنی اس لڑکی کی اس وقت وصیت کر دی یعنی اس وقت تیرے نکاح میں دے دیا۔ اس صورت میں لفظ وصیت بمعنی نکاح مجازاً ہو جائے گا۔ ہم کہتے ہیں لفظ وصیت میں (موت کی طرف) اضافت داخل ہے (یعنی وصیت کے لفظ میں ہی تملیک بعد الموت کا مفہوم ماخوذ ہے) اور لفظ نکاح میں عدم اضافت ماخوذ ہے (یعنی لفظ نکاح کے اندر دوامی غیر موقت تملیک ماخوذ ہے) دونوں میں تضاد ہے (اس لئے دوسرے کی جگہ نہیں استعمال کیا جا سکتا)

بعض لوگ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے لئے بھی دوسرے افراد امت کی طرح بغیر لفظ نکاح یا تزویج کے کسی دوسرے لفظ سے نکاح جائز نہیں تھا اس لئے کہ اللہ نے اِنْ اَرَادَ النَّبِیُّ اَنْ یَّسْتَنْکِحَهَا فرمایا ہے آیت میں لفظ ہبہ کا نکاح پر اطلاق مجازی ہے۔

بیضاوی نے اس آیت سے امام شافعی کے مسلک پر استدلال کیا ہے اور لکھا ہے کہ لفظ معنی کے تابع ہوتے ہیں اور (نکاح بلا مہر کا) رسول اللہ ﷺ کے ساتھ معنوی اختصاص تو باتفاق علماء ہے (لہٰذا لفظ ہبہ سے نکاح کا انعقاد بھی رسول اللہ ﷺ کے لئے ہی مخصوص تھا)

بیضاوی کا یہ قول صحیح نہیں ہے۔ لفظ ہبہ کا نکاح پر اطلاق تو بہر حال مجازی ہے پھر کوئی وجہ نہیں کہ الفاظ مجازی کے استعمال کی خصوصیت صرف رسول اللہ ﷺ کے لئے ہو اور لفظ ہبہ سے نکاح مراد لینا فقط رسول اللہ ﷺ ہی کے لئے ہو۔ لفظ ہبہ میں نکاح کا معنی مراد ہونے کی تو صلاحیت مجازاً موجود ہی ہے۔

شبہ:- ہبہ کا حقیقی معنی تو بہر حال مراد نہیں ہے ہبہ کا حقیقی معنی تملیک عین (اصل شئی میں ہر طرح کا تصرف

کرنا شئی مملوک سے کام لینا یا فروخت کر دینا یا کسی کو بلا معاوضہ بخش دینا وغیرہ) ہے اور یہاں تملیک عین (یعنی اپنی ذات کو مملوک بنا دینا) مراد نہیں ہے بلکہ بلا عوض (اور بغیر مہر کے) تمتع اندوزی کا اختیار دینا مراد ہے پس اس جگہ جب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خاص طور پر لفظ ہبہ کا مجازی معنی کے لئے استعمال کیا گیا ہے تو دوسروں کے لئے لفظ ہبہ سے نکاح مراد نہیں ہو سکتا۔

ازالہ :- ہبہ کا مجازی معنی تملیک منافع (یعنی تمتع اندوزی کا اختیار دے دینا) ہے بالعوض ہو یا بلا عوض۔ صرف بلا عوض تملیک منفعت ہی لفظ ہبہ کا مجازی معنی نہیں ہے (اس لئے رسول اللہ ﷺ کے لئے ہبہ بمعنی نکاح بلا مہر ہو گیا اور دوسروں کے لئے بمعنی نکاح بعوض مہر ہو گا) کوئی وجہ نہیں کہ ہبہ بمعنی نکاح مطلقاً (بالعوض اور بلا عوض) رسول اللہ ﷺ کے لئے مخصوص مانا جائے۔

ابن ہمام نے لکھا ہے اصل میں کلام طریق مجاز کے تحقق میں ہے۔ امام شافعی کے نزدیک چونکہ مجاز کی مجوز کوئی وجہ موجود نہیں ہے اس لئے انہوں نے تحقق مجاز کی نفی کی ہے اور اس پر دو دلیلیں قائم کی ہیں ایک اجمالی دوسری تفصیلی۔

مجمل دلیل یہ ہے کہ اگر مجازی معنی مراد لینا صحیح ہو گا تو دونوں طرف سے تجویز مجاز جائز قرار دینی ہو گی جب ہبہ کو بمعنی نکاح کرنا جائز ہو گا تو نکاح کو بمعنی ہبہ لینا بھی درست ہو گا اور بجائے وھبتک ھذا الثوب کے نکحتک ھذا الثوب بھی صحیح ہو گا اور ایسا کرنا لغت کے خلاف ہے۔

تفصیلی دلیل یہ ہے کہ لغت میں تزویج کا لغوی معنی ہے دو چیزوں کو باہم ملا دینا، جوڑ دینا اور نکاح کا معنی بھی ملا دینا، جمع کر دینا ہے اور مالک و مملوک میں جوڑ اور جمع ممکن نہیں اسی وجہ سے اگر زوجین میں سے ایک دوسرے کا مالک ہو جائے تو نکاح فاسد ہو جاتا ہے لہٰذا لفظ ہبہ (جو بمعنی تملیک ہے) بول کر نکاح مراد لینا صحیح نہیں ہے۔

شافعی کے خلاف ہماری مجمل دلیل یہ ہے کہ اگر ہبہ اور نکاح میں کوئی مجازی علاقہ نہیں ہے تو رسول اللہ ﷺ کا نکاح بھی بلفظ ہبہ صحیح نہ ہونا چاہئے اس سے معلوم ہوا کہ دونوں لفظوں میں مجازی علاقہ ہے پس جب نکاح بلا عوض اور لفظ ہبہ کے درمیان مجازی علاقہ ہونا ضروری ہوا تو مطلق نکاح اور ہبہ میں بھی یہی علاقہ ضرور ہو گا کیونکہ عام خاص کے اندر پایا جاتا ہے۔

ہماری دوسری دلیل یہ ہے کہ ہبہ کا حقیقی معنی ہے تملیک عین (نفس شئی کا مالک بنا دینا) اور ملکیت عین حاصل ہونے سے ملکیت منفعت حاصل ہو جاتی ہے۔ تملیک عین تملیک فوائد کا سبب ہے اور ملک منافع منفعت کے محل میں نکاح سے حاصل ہوتی ہے اور ایسا بطریق مجاز ہوتا (گویا قیاس یوں بنا) ہبہ سے ملکیت نفس شئی حاصل ہوتی ہے اور ملکیت عین ملکیت منفعت فی محلہا کا سبب ہے اور نکاح سے ملک منفعت فی محلہا حاصل ہوتی ہے لہٰذا ہبہ اور نکاح میں مجاز کا علاقہ سببیت ہوا۔ رہی یہ بات کہ جب نکاح اور ہبہ کے درمیان سببیت اور مسببیت کا علاقہ ہے تو پھر لفظ نکاح بول کر ہبہ مراد لینا بھی درست قرار پائے گا اس کا جواب یہ ہے کہ اصول فقہ میں یہ مسئلہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ مسبب بول کر سبب مراد لینا ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے ہاں اگر مشروعیت سبب مقصود ہو تو خیر۔

اور ملکیت تمتع کا حصول جو مقتضاء نکاح ہے مقصود تملیک نہیں ہے بلکہ تملیک کا مقصد ہے ملکیت عین کا حصول۔

رہا شافعی کا یہ قول کہ مالک و مملوک کے درمیان نہ جوڑ ہو سکتا نہ ازدواج تو یہ بات نا قابل تسلیم ہے اس کی کوئی دلیل نہیں۔

بغوی نے لکھا ہے کیا رسول اللہ ﷺ کے پاس کوئی ایسی عورت تھی جس نے اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ کو ہبہ کر دیا ہو یا نہیں تھی، علماء روایت کے اس کے متعلق اقوال مختلف ہیں۔ حضرت ابن عباس اور مجاہد کا قول ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس کوئی عورت ایسی نہیں تھی جس سے آپ نے عقد نکاح نہ کیا ہو یا وہ آپ کی ملک میں نہ ہو (یعنی باندی نہ ہو) رہی آیت اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا یہ کلام بطور شرط ہے۔

دوسرے علماء قائل ہیں کہ حضور ﷺ کے پاس ایسی واہبات النفس عورتوں میں سے ایک (بر قول شعبی) زینب بنت خزیمہ انصاریہ تھیں جن کو ام المساکین کہا جاتا تھا اور بر قول قتادہ میمونہ بنت حارث بھی ایسی ہی تھیں۔ حضرت امام زین العابدین

بن امام حسین اور ضحاک و مقاتل نے کہا ام شریک بنت جابر اسدیہ بھی ایسی ہی تھیں۔

ابن سعد ؒ ابن ابی شیبہ ابن جریر ابن المنذر اور طبرانی نے حضرت علی بن حسین کی روایت سے اور ابن سعد نے عکرمہ کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ ایسی عورت ام شریک بنت جابر تھیں۔ عروہ بن زبیر نے کہا ایسی عورت قبیلہ بنی سلیم کی خولہ بنت حکیم تھیں۔

قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِي أَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُونَ عَلَيْكَ حَرَجٌ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۝ ہم (وہ احکام) جانتے ہیں جو ہم نے ان کی بیویوں اور ان کی باندیوں کے بارے میں ان پر واجب کئے اور اللہ بڑا بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔

فَرَضْنَا ہم نے واجب کئے ہیں۔ فِيْ أَزْوَاجِهِمْ یعنی نکاح مہر، باری کی تقسیم اگر مہر مقرر نہ کیا ہو تو جماع کے بعد مہر کا وجوب۔ ایک وقت میں چار عورتیں رکھنے کی اجازت وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ اور ان کے بارے میں جو ان کی مملوکہ ہوں خواہ خریدی ہوں یا کسی اور طریقہ سے مالک بنے ہوں۔ مگر وہ ایسی ہوں کہ مالک کے لئے حلال ہوں یعنی کتابیہ (یہودی یا عیسائی) ہوں مجوسی اور بت پرست نہ ہوں اور قربت سے پہلے استبراء اور رحم کر لیا جائے۔ ان کی تعداد معین نہیں کی نہ ان کی کوئی باری مقرر کی۔

لِكَيْلَا يَكُونَ یعنی خاص طور پر آپ کے لئے حلال کی ہیں تاکہ آپ کے لئے تنگی نہ ہو وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا یعنی جن باتوں سے پرہیز کرنا اور بچاؤ دشوار ہے ان کو بخشنے والا ہے۔

رَّحِيمًا یعنی جہاں تنگی کا خیال ہو وہاں اس نے گنجائش رکھ دی ہے۔ شیخین نے صحیحین میں لکھا ہے کہ حضرت عائشہ فرماتی تھیں کیا عورت کو شرم نہیں آتی کہ وہ اپنی جان کو ہبہ کرتی ہے اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

تُرْجِي مَنْ تَشَاءُ مِنْهُنَّ وَتُؤْوِي إِلَيْكَ مَنْ تَشَاءُ ۖ ان میں سے آپ جس کو چاہیں (اور جب تک چاہیں) اپنے سے دور رکھیں اور جس کو چاہیں (اور جب تک چاہیں) اپنے پاس رکھیں یہ آیت سن کر حضرت عائشہ نے کہا میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ کا رب آپ کی خواہش جلد پوری کر دیتا ہے دوسری روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا مجھے ان عورتوں پر غیرت آتی تھی جو اپنی ذات کو رسول ﷺ کے لئے ہبہ کرتی تھیں اور میں کہتی تھی کیا عورت اپنے آپ کو ہبہ کر سکتی ہے لیکن جب آیت تُرْجِي مَنْ تَشَاءُ الخ نازل ہوئی تو میں نے کہا مجھے دکھائی دے رہا کہ آپ کا رب آپ کی خواہش جلد پوری کر دیتا ہے۔

تُرْجِي کا معنی ہے آپ جس کو چاہیں پیچھے کر دیں۔

بغوی نے لکھا ہے اس آیت کی تفسیر میں اہل تفسیر کا اختلاف ہے سب سے زیادہ مشہور قول یہ ہے کہ اس آیت کا نزول باری تقسیم کرنے کے سلسلہ میں ہوا۔ پہلے عورتوں میں برابری کرنا رسول اللہ ﷺ پر واجب تھا اس آیت کے نزول کے بعد برابری رکھنے کا حکم ساقط کر دیا گیا اور عورتوں کے معاملہ میں رسول اللہ ﷺ کو پورا اختیار دے دیا گیا۔

ابو زید اور ابن زید نے کہا اس آیت کا نزول اس وقت ہوا جب بعض امہات المومنینؓ نے رسول اللہ ﷺ کے سلسلہ میں رشک کیا اور بعض نے زیادہ مصارف طلب کئے تو رسول اللہ ﷺ نے ایک ماہ تک سب سے ترک تعلق کر لیا تھا یہاں تک کہ آیت تخییر نازل ہوئی اور اللہ نے حکم دے دیا کہ عورتوں کو اختیار دیدو وہ دنیا کو پسند کر لیں یا آخرت کو جو دنیا کو پسند کریں ان کے راستہ میں رکاوٹ نہ پیدا کرو (ان کو آزاد کر دو) اور جو اللہ اور اس کے رسول کو اختیار کریں ان کو اپنے پاس رکھو لیکن شرط یہ ہے کہ وہ مومنوں کی مائیں ہوں گی کبھی کسی اور سے (آپ کے بعد) نکاح نہیں کر سکیں گی اور ایک شرط یہ بھی ہے کہ اللہ کے رسول کو اختیار ہوگا کہ ان میں سے جس کو چاہیں گے رسول خدا اپنے پاس رکھیں گے اور جس کو چاہیں گے دور رکھیں گے رسول اللہ کو یہ بھی اختیار ہوگا کہ جس کی باری چاہیں مقرر کریں چاہیں نہ کریں اور مصارف و باری کی تقسیم میں جس کو چاہیں ترجیح دیں یہ سارے اختیارات رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں ہوں گے یہ خصوصیت صرف رسول اللہ ﷺ کو عطا کی گئی تھی۔ امہات المومنین

نے یہ تمام شرائط مان لیں اور ان شرائط پر آپ کے ساتھ رہنے پر راضی ہو گئیں۔

میں کہتا ہوں یہ امتیازی حکم صرف رسول اللہ ہی کے لئے نہیں بلکہ ساری امت کے لئے اس کا جواز ہے اگر کسی کے پاس چند عورتیں ہوں اور وہ اپنے حقوق نکاح مثلاً مصارف اور باری کی تقسیم میں مساوات کی طلب گار ہوں اور شوہر ان سے کہہ دے کہ اگر تم چاہو تو آؤ میں تم کو سامان دے کر خوبصورتی کے ساتھ تم کو رخصت کر دوں اور تم میں سے جو عورت میرے نکاح میں بغیر طلب مصارف کے ان شرائط پر رہنا چاہئے کہ میں جس کو چاہوں گا اپنے پاس رکھوں گا اور جس کو چاہوں گا دور رکھوں گا مجھے اختیار ہو گا کہ میں باری مقرر کروں یا نہ کروں یا کسی کی کروں اور کسی کی نہ کروں اور یہ بھی اختیار ہو گا کہ مصارف طعام و لباس ایک کو کم دوں دوسری کو زیادہ دوں اور ان تمام شرائط پر عورتیں کہہ دیں کہ ہم کو یہ سب شرطیں منظور ہیں ہم تو تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہیں ہم اپنے حقوق سے دست بردار ہوتی ہیں آپ جیسا چاہیں کریں تو اس صورت میں شوہر کو پورا اختیار ہو جاتا ہے اور کسی کے حقوق نکاح اس پر باقی نہیں رہتے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ نے کیا کسی بیوی کو باری کی تقسیم سے خارج کر دیا تھا یا نہیں اس میں روایات کا اختلاف ہے بعض کا قول ہے کہ باوجود کامل اختیار مل جانے کے رسول اللہ ﷺ نے سواء حضرت سودہ کے اور کسی بیوی کو باری کی تقسیم سے خارج نہیں کیا حضرت سودہ خود اپنے حقوق سے دستبردار ہو گئیں اور انہوں نے اپنی باری کا دن حضرت عائشہؓ کو دے دیا۔

بعض لوگوں کا قول ہے کہ اختیار ملنے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے بعض بیویوں کو باری کی تقسیم سے خارج کر دیا تھا۔ ابن جریر نے بوساطت منصور ابورزین کی روایت بیان کی ہے کہ جب آیت تخییر نازل ہوئی تو امہات المومنین کو اندیشہ ہوا کہ کہیں رسول اللہ ﷺ ہم کو طلاق دیدیں اس لئے سب نے کہا یا رسول اللہ ﷺ آپ اپنی ذات اور مال میں جتنا چاہیں ہم کو دیں اور ہم کو ہمارے حال پر رہنے دیں (طلاق نہ دیں) اس پر آیت تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ الخ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے بعض عورتوں کو پیچھے ڈال دیا اور بعض کو اپنے قرب میں رکھا۔ جن کو قریب رکھا۔ ان میں عائشہ، حفصہ اور ام سلمہ تھیں آپ نے ان تینوں کے لئے باری کی تقسیم برابر برابر کر دی اور پانچ بیویوں کو دور رکھا۔ ام حبیبہ، سودہ، صفیہ، میمونہ، جویریہؓ ان کے لئے جب آپ چاہتے تھے باری تقسیم کر دیتے تھے۔

بخاری نے حضرت معاذہ کی روایت سے حضرت عائشہ کا بیان نقل کیا ہے کہ کسی عورت کی باری کے دن رسول اللہ ﷺ ہم سے (کسی بیوی کے پاس رہنے کی) اجازت طلب کرتے تھے اور یہ واقعہ آیت تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ الخ کے نزول کے بعد کا ہے۔ حضرت معاذہ نے کہا میں نے پوچھا آپ کیا کہتی تھیں، حضرت عائشہؓ نے فرمایا میں کہتی تھی اگر اس کا اختیار میرے ہاتھ میں ہے تو میں کسی کو آپ کے معاملہ میں اپنے اوپر ترجیح نہیں دوں گی۔

مجاہد نے کہا تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ کا مطلب یہ ہے کہ آپ جس بیوی سے بغیر طلاق دیئے کنارہ کش رہنا چاہیں کنارہ کش رہیں اور کنارہ کش ہونے کے بعد اگر پھر اس کو بغیر تجدید نکاح کے اپنے پاس واپس لانا چاہیں تو لا سکتے ہیں۔

بعض کے نزدیک یہ مطلب ہے کہ جس بیوی کو چاہیں آپ طلاق دیدیں اور جس کو چاہیں اپنے عقد میں باقی رکھیں۔

حسن نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اپنی امت کی جس عورت سے آپ نکاح کرنا چاہیں کر سکتے ہیں اور نکاح نہ کرنا چاہیں تو نہ کریں چنانچہ رسول اللہ ﷺ جب کسی عورت کو اپنا پیام بھیجتے تھے تو جب تک خود ہی اپنے پیام سے دست بردار نہ ہو جائیں کسی دوسرے شخص کے لئے اس عورت کو پیام بھیجنا جائز نہ تھا۔

بعض نے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ جو مومن عورتیں اپنے آپ کو آپ کے لئے ہبہ کر دیں آپ ان میں سے جس کو چاہیں قبول کر لیں اور اپنے پاس جگہ دیں اور جس کو قبول نہ کرنا چاہیں رد کر دیں۔

بغوی نے لکھا ہے ہشام نے اپنے باپ کی روایت سے بیان کیا کہ جن عورتوں نے اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ کے لئے

ہبہ کردیا تھا ان میں سے خولہ بنت حکیم بھی تھیں حضرت عائشہؓ نے کہا کیا عورت کو شرم نہیں آتی کہ مرد کے لئے اپنے کو ہبہ کرتی ہے پھر جب آیت تُرْجِيْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ الخ نازل ہوئی تو میں نے کہا یا رسول اللہ میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ کا رب آپ کی خواہش جلد پوری کردیتا ہے۔

وَمَنِ ابْتَغَيْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكَ اور جن سے آپ کنارہ کش ہوگئے اگر ان میں سے پھر کسی کو طلب کرلیں تب بھی آپ پر کوئی گناہ نہیں۔ یعنی جن بیویوں کو (بغیر طلاق کے) آپ نے اپنے سے دور کردیا تھا اگر ان میں سے کسی کو پھر اپنے پاس رکھنا چاہیں تو کوئی گناہ نہیں۔

ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ تَقَرَّ اَعْيُنُهُنَّ وَلَا يَحْزَنَّ وَيَرْضَيْنَ بِمَآ اٰتَيْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ اس میں زیادہ توقع ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں گی اور وہ آزردہ خاطر نہ ہوں گی اور جو کچھ بھی آپ ان کو دیدیں گے اس پر سب کی سب راضی رہیں گی۔

ذٰلِكَ یعنی یہ اختیار جو آپ کو دیا گیا ان کی آنکھوں کی ٹھنڈی رکھنے اور آزردہ خاطر نہ ہونے اور سب کے راضی رہنے سے بہت زیادہ قریب (تعلق رکھنے والا) ہے کیونکہ اس میں سب برابر ہیں (سب کا اختیار آپ کو ہے کوئی خود مختار نہیں رہی) پھر اگر آپ ان میں سے کسی کو اپنے پاس بلالیں گے تو وہ آپ کے اس فعل کو آپ کی مہربانی سمجھے گی اور جس سے کنارہ کش ہوجائیں گے وہ اس کو حکم خدا سمجھے گی بلکہ اس میں بھی آپ کی مہربانی سمجھے گی کہ آپ نے اس کو صرف اپنے قرب سے ہٹادیا نکاح سے تو خارج نہیں کیا حالانکہ آپ کو اس کی ضرورت نہیں تھی (طلاق دے سکتے تھے)

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ اور اللہ کو تم لوگوں کے دلوں کی باتیں معلوم ہیں۔ اس میں اس بی بی کے لئے وعید ہے جو رسول اللہ ﷺ کی مشیت پر راضی نہ ہو۔ بعض اہل علم نے اس آیت کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ تمہارے دلوں کے اندر جو بعض عورتوں کی طرف جھکاؤ اور میلان ہوتا ہے اللہ اس سے واقف ہے اور ہم نے رسول ﷺ کی آسانی کے لئے یہ اختیار ان کو دیا ہے۔

وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَلِيْمًا۝ اور اللہ (سب کچھ) جاننے والا اور حلم والا ہے یعنی جاننے کے باوجود فوری سزا نہیں دیتا اس سے ڈر تا رہنا ضروری ہے۔

ابن سعد نے عکرمہ کی روایت سے لکھا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے بیویوں کو (آپ کے ساتھ رہنے نہ رہنے کا) اختیار دیا اور بیویوں نے اللہ اور اس کے رسول کو اختیار کرلیا تو اللہ تعالیٰ نے آیت ذیل نازل فرمائی۔

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ ان کے علاوہ اور عورتیں آپ کے لئے حلال نہیں ہیں اور نہ یہ درست ہے کہ آپ ان (موجودہ) بیویوں (کو چھوڑ کر ان) کی جگہ دوسری بیویاں کرلیں خواہ آپ کو ان کا حسن دل پسند ہو مگر جو آپ کی باندیاں ہوں (ان کو گھٹا بڑھا سکتے ہیں۔)

مِنْۢ بَعْدُ یعنی آج کے بعد یہاں تک کہ اگر موجودہ عورتوں میں سے کوئی مر جائے تو اس کی جگہ بھی دوسری کرنا درست نہیں۔

وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ یعنی یہ بھی آپ کے لئے جائز نہیں کہ ان میں سے کسی ایک کو طلاق دے کر کسی اور عورت سے اس کی بجائے نکاح کرلیں۔

بغوی نے لکھا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے بیویوں کو اختیار دے دیا اور بیویوں نے اللہ اور اس کے رسول کو ہی اختیار کیا تو اللہ نے ان کی قدر دانی فرمائی اور پیغمبر کے لئے موجودہ بیویوں کے علاوہ دوسری عورتوں کو حرام کردیا اور اس کی بھی ممانعت کردی کہ ان بیویوں میں کسی کو طلاق دے کر کسی اور عورت سے نکاح کرسکیں۔ حضرت ابن عباس اور قتادہ کا یہی قول ہے اس امر

میں علماء کا اختلاف ہے کہ اس ممانعت کے بعد کیا پھر دوسری عورتوں سے نکاح کرنے کی اباحت کا کوئی حکم نازل کیا گیا یا نہیں۔
عطاء نے حضرت عائشہ کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات سے پہلے اللہ نے آپ کے لئے حلال کر دیا تھا کہ جن عورتوں سے سوائے محرم کے آپ نکاح کرنا چاہیں کرسکتے ہیں آیت تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَتُؤْوِیْٓ اِلَیْكَ مَنْ تَشَآءُ میں اسی کی اجازت دیدی گئی تھی کیونکہ یہ آیت اگرچہ ترتیب قرأت میں پہلے ہے لیکن نزول میں مؤخر ہے (لَا یَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ کے بعد آیت تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ نازل ہوئی تھی۔

بغوی نے لکھا ہے کہ عکرمہ اور ضحاک نے کہا آیت کا معنی یہ ہے کہ جن عورتوں کا صفات حقدمہ کے ساتھ ذکر کر دیا گیا ہے ان کے بعد دوسری عورتوں سے آپ کے لئے نکاح حلال نہیں۔ حضرت ابی بن کعب سے دریافت کیا گیا۔ اگر رسول اللہ ﷺ کی (ساری) بیبیاں وفات پا جاتیں تو کیا آپ کے لئے جدید نکاح کرنا جائز تھا؟ فرمایا اس کی ممانعت کرنے والی کیا چیز تھی عرض کیا گیا اللہ نے فرمایا تھا لَا یَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ فرمایا آیت یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الخ میں اللہ نے ایک خاص قسم کی عورتیں آپ کے لئے حلال کر دی تھیں پھر (اور قسم کی عورتیں حرام کرنے کے لئے) فرمایا لَا یَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ (یعنی ایسی عورتوں کے علاوہ دوسری طرح کی عورتیں آپ کے لئے حلال نہیں۔ مترجم) ابو صالح نے کہا رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا تھا کہ نہ کسی اعرابی عورت سے نکاح کریں نہ کسی (عام) عربی عورت سے بلکہ اپنے قبیلہ کنبہ کی عورتوں سے نکاح کریں۔ چچا پھوپھی کی بیٹیاں ہوں یا ماموں خالہ کی قبیلہ والی تین سو عورتوں سے بھی نکاح کرسکتے ہیں۔

مجاہد نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ مسلم عورتوں کے بعد کسی یہودن یا عیسائی عورت سے نکاح کرنا آپ کے لئے حلال نہیں نہ یہ جائز ہے کہ مسلمان عورتوں کو چھوڑ کر ان کی جگہ غیر مسلمہ سے نکاح کریں۔ مطلب یہ ہے کہ ام المومنین نہ کوئی یہودی عورت ہو سکتی ہے نہ عیسائی عورت۔ ہاں کتابی مذہب کی باندیاں اس حکم سے مستثنیٰ تھیں۔

ضحاک نے اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ کا یہ مطلب بتایا کہ جو بیبیاں آپ کے نکاح میں ہیں ان کو طلاق دے کر دوسری عورتوں سے نکاح کرنا آپ کے لئے حلال نہیں یعنی موجودہ بیویوں کو طلاق دینے کی ممانعت کر دی کیونکہ ان کو امہات المومنین بنا دیا گیا اور دوسروں کے لئے ان کو حرام کر دیا گیا۔ دوسری عورتوں سے نکاح کرنے کی ممانعت نہیں کی۔

ابن زید نے آیت وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ کی تشریح میں کہا جاہلیت کے زمانہ میں لوگ بیویوں کی بدلی کر لیتے تھے ایک شخص دوسرے سے کہتا تھا اپنی بیوی سے میری بیوی بدل لو مجھے اپنی بیوی دیدو میں اپنی بیوی تم کو دیدوں گا۔ اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ بیویوں کا تبادلہ آپ کے لئے حلال نہیں۔ اپنی بیوی دوسرے کو دیدو اور دوسرے کی بیوی خود لے لو یہ جائز نہیں۔ ہاں باندیاں اس حکم سے مستثنیٰ ہیں کوئی حرج نہیں اگر اپنی باندی دے کر اس کے بدلہ میں دوسرے کی باندی لے لو بیویوں کا تبادلہ حرام ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ عیینہ بن حصن بغیر اجازت لئے رسول اللہ ﷺ کے پاس اندر آگیا حضور ﷺ کے پاس اس وقت حضرت عائشہ موجود تھیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا اجازت داخلہ کیوں نہیں لی۔ عیینہ نے کہا یا رسول اللہ جب سے میں جوان ہوا ہوں میں نے مضر (حجازی عرب) کے کسی شخص سے داخلہ کی اجازت نہیں لی پھر کہنے لگا یہ آپ کے پہلو میں گوری عورت کون ہے؟ فرمایا ام المومنین عائشہ ہیں بولا کیا ایک حسین ترین عورت دے کر آپ سے اس کا تبادلہ نہ کرلوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا اللہ نے یہ حرام کر دیا ہے۔ عیینہ جب نکل کر چلا گیا تو حضرت عائشہ نے کہا یا رسول اللہ یہ کون تھا فرمایا یہ ایک احمق ہے جس کا حکم مانا جاتا ہے جو حالت تم نے اس کی دیکھی اس کے باوجود یہ اپنی قوم کا سردار ہے۔

وَلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ یعنی ان عورتوں کا حسن جن سے تم نکاح کرنے کے خواہشمند ہو۔ بغوی نے کہا مطلب یہ ہے کہ آپ کے لئے حلال نہیں کہ اپنی بیویوں میں سے کسی کو طلاق دے دو اور اس کی جگہ دوسری سے نکاح کر لو خواہ اس کی

خوبصورتی آپ کو کیسی ہی بھلی معلوم ہو۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ایسی (حسین) عورت جعفر بن ابی طالب کی بیوی بنت عمیس خثعمیہ تھی جب جعفر شہید ہوگئے تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے پاس اپنا پیام بھجوانا چاہا لیکن آپ کو اس کی ممانعت کردی گئی۔

اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اس آیت کے نزول کے بعد صاحبزادہ ابراہیم کی والدہ حضرت ماریہ حضور ﷺ کی ملک میں داخل ہوئیں (مقوقس شاہ مصر نے دو لونڈیاں خدمت گرامی میں بطور ہدیہ بھیجی تھیں ایک سیرین دوسری ماریہ۔ انہیں ماریہ کے شکم سے حضور گرامی ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم پیدا ہوئے تھے)

ربع

وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيْبًا ۟ اور اللہ ہر چیز کا پورا نگراں ہے۔ اس لئے تم اللہ کے احکام کی پابندی کرو اور اس کی قائم کی ہوئی حد سے تجاوز نہ کرو۔

مسئلہ:۔ بغوی نے لکھا ہے آیت میں دلیل ہے اس امر کی کہ جس عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہو اس کو دیکھنا جائز ہے۔

حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تم میں سے کوئی کسی عورت کو نکاح کا پیام دینا چاہتا ہو اور اس کے ایسے اعضاء کو دیکھنا جو نکاح کی دعوت دیں ممکن ہو تو ایسا کرلے (رواہ ابوداؤد)۔

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کا بیان ہے میں نے ایک عورت کو نکاح کا پیام بھیجا حضور ﷺ نے فرمایا کیا تم نے اس کو دیکھ لیا ہے میں نے کہا نہیں۔ فرمایا اس کی طرف دیکھ لو تم دونوں میں اتفاق قائم رکھنے کے لئے یہ بات زیادہ مناسب ہے۔ رواہ احمد و الترمذی والنسائی وابن ماجہ والدارمی۔

حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ ایک شخص نے کسی انصاری عورت سے نکاح کرنا چاہا حضور ﷺ نے فرمایا اس کی طرف دیکھ لو انصار کی عورتوں کی آنکھوں میں کچھ ہوتا ہے (یعنی پیلاپن) رواہ مسلم۔

حمیدی نے کہا ان کی آنکھوں میں کچھ پیلاپن ہوتا ہے۔

شیخین نے صحیحین میں حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت زینب بنت جحش سے نکاح کیا تو لوگوں کی دعوت کی لوگ آئے کھانا کھایا پھر بیٹھے باتیں کرتے رہے (تنگ آکر) رسول اللہ نے ایسی صورت اختیار کی جیسے اٹھنے کی تیاری کر رہے ہیں لیکن لوگ پھر بھی نہیں اٹھے حضور ﷺ نے یہ دیکھا کہ (لوگ اٹھتے ہی نہیں ہیں) تو خود اٹھ کھڑے ہوئے آپ کے کھڑے ہونے کے ساتھ ہی لوگ اٹھ کھڑے ہوئے مگر تین آدمی پھر بھی بیٹھے رہے (رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لے گئے) کچھ دیر کے بعد (واپس آئے اور اندر داخل ہونے کا ارادہ کیا تو وہ لوگ) اس وقت بھی بیٹھے ہوئے تھے (حضور ﷺ پھر تشریف لے گئے) کچھ دیر کے بعد وہ لوگ اٹھ گئے میں نے جاکر حضور ﷺ کو اطلاع دیدی کہ اب وہ لوگ چلے گئے آپ فوراً تشریف لے آئے اور اندر داخل ہوگئے میں بھی اندر جانے لگا تو آپ نے میرے اور اپنے درمیان پردہ چھوڑ دیا اور آیت ذیل نازل ہوئی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ ۙ

اے ایمان والو نبی کے گھر میں (بن بلائے) مت جایا کرو۔ مگر جس وقت تم کو کھانے کے لئے اجازت دیدی جائے ایسے طور پر کہ اس کے پکائے جانے کے منتظر نہ رہو۔ بغوی نے ابن شہاب (زہری) کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت انسؓ نے بیان کیا جس وقت رسول اللہ ﷺ مدینہ میں تشریف لائے میں اس وقت دس سال کا تھا۔ میری مائیں رسول اللہ ﷺ کی خدمت پر میری موافقت کرتی تھیں، میں نے دس سال حضور ﷺ کی خدمت کی اور حضور ﷺ کی وفات کے وقت میری عمر بیس سال تھی۔ حجاب کے واقعہ کا علم مجھے سب لوگوں سے زیادہ ہے آیت حجاب کا نزول رسول اللہ ﷺ اور زینب بنت جحش کی خلوت گاہ میں ہوا صبح کو رسول اللہ ﷺ حضرت زینب کے شوہر ہونے کی حیثیت میں تھے آپ نے لوگوں کو کھانا کھانے بلایا لوگوں نے آکر کھانا کھایا، الی آخر الحدیث۔ زہری کی یہ روایت بھی بخاری کی روایت کی طرح ہے۔ بخاری کی دوسری

روایت ہے کہ حضرت انسؓ نے فرمایا اس آیت کو یعنی آیت حجاب کو میں سب لوگوں سے زیادہ جانتا ہوں جب حضرت زینب کو رسول اللہ ﷺ کے پاس بیوی کی حیثیت میں بھیجا گیا تو آپ کے گھر کے اندر وہ موجود تھیں اور آپ نے کچھ کھانا تیار کرایا تھا اور لوگوں کو کھانے کے لئے بلوایا تھا۔ (کھانے کے بعد بھی) لوگ بیٹھے باتیں کرتے رہے اس پر اللہ نے آیت حجاب نازل فرمائی تو لوگ اٹھ گئے اور پردہ چھوڑ دیا گیا۔

حضرت انسؓ کی دوسری روایت میں آیا ہے کہ حضرت زینب کے ولیمہ میں رسول اللہ ﷺ نے گوشت روٹی تیار کرائی اور مجھے لوگوں کو کھانے کی دعوت دینے کے لئے بھیج دیا گیا لوگ آنے لگے اور کھانے لگے اور نکل کر جانے لگے پھر دوسرے لوگ آنے کھانے اور جانے لگے میں لوگوں کو بلاتا رہا جب کوئی آدمی ایسا نہ رہا کہ میں اس کو بلاتا، تو میں نے عرض کردیا یا نبی اللہ اب تو کوئی آدمی مجھے نہیں ملتا کہ میں اس کو بلاؤں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کھانا اٹھالو تین آدمی وہاں گھر کے اندر بیٹھے باتیں کرتے رہے رسول اللہ ﷺ حجرہ سے نکل کر حضرت عائشہؓ کے حجرہ کی طرف تشریف لے گئے اور (حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں جاکر) فرمایا السلام علیکم اہل البیت و رحمۃ اللہ (اے اہل خانہ تم پر سلام اور اللہ کی رحمت ہو) حضرت عائشہ نے جواب دیا وعلیک السلام و رحمۃ اللہ آپ نے اپنی بیوی کو کیسا پایا اللہ آپ کو مبارک کرے (اس طرح) حضور ﷺ سب بیویوں کے حجروں کی طرف تشریف لے گئے اور وہی بات فرماتے رہے جو حضرت عائشہ سے فرمائی تھی اور بیویوں نے بھی وہی جواب دیا جو حضرت عائشہ نے دیا تھا کچھ دیر کے بعد واپس آئے تو دیکھا تینوں آدمی باتیں کررہے ہیں رسول اللہ ﷺ بڑے شرمیلے تھے (آدمیوں کو کچھ نہیں فرمایا اور) مڑ کر گھر سے نکل کر حضرت عائشہؓ کے حجرہ کی طرف چل دیئے مجھے یاد نہیں کہ میں نے اطلاع دی یا حضور ﷺ کو (کسی اور سے) اطلاع ملی کہ لوگ چلے گئے آپ فوراً لوٹ پڑے اور گھر کے اندر داخل ہونے کے لئے ایک قدم چوکھٹ کے اندر رکھا تھا دوسرا قدم باہر ہی تھا کہ میرے اور اپنے درمیان پردہ چھوڑ دیا اور آیت حجاب نازل ہوئی۔

بخاری کی ایک اور روایت میں آیا ہے کہ حضرت انسؓ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت زینب سے خلوت کی تو ولیمہ کیا اور لوگوں کو پیٹ بھر کر گوشت روٹی کھلایا پھر نکل کر حسب معمول امہات المومنین کے حجروں کی طرف تشریف لے گئے سب کو سلام کرتے دعا دیتے چلے گئے اور امہات المومنین بھی آپ کو دعا دیتی اور سلام کا جواب دیتی رہیں دیر کے بعد جب اپنے گھر کو لوٹے تو دو آدمیوں کو آپس میں باتیں کرتا پایا یہ منظر ملاحظہ فرماکر پھر گھر سے نکل کر چل دیئے ان دونوں نے جب رسول اللہ ﷺ کو (جاتا) دیکھا تو اٹھ کھڑے ہوئے آپ واپس آکر گھر کے اندر داخل ہوگئے اور میرے اور اپنے درمیان پردہ چھوڑ دیا۔

ترمذی نے لکھا ہے کہ حضرت انسؓ نے فرمایا میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا آپ اس عورت کے دروازہ پر پہنچے جس سے شادی کی تھی وہاں اس کے پاس کچھ لوگ موجود تھے آپ وہاں سے چل دیئے وہ لوگ چلے گئے تو آپ لوٹ آئے اور اندر چلے گئے اور میرے اور اپنے درمیان پردہ چھوڑ دیا میں نے یہ واقعہ ابو طلحہ سے بیان کیا ابو طلحہ نے کہا جیسا تو کہہ رہا ہے اگر واقعہ یہی ہے تو اس کے متعلق کچھ ضرور نازل ہوگا چنانچہ آیت حجاب نازل ہوگئی۔ اس روایت کو ترمذی نے حسن کہا ہے۔

طبرانی نے صحیح سند سے بیان کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک قاب میں کھارہی تھی اتنے میں ادھر سے عمر گزرے رسول اللہ ﷺ نے ان کو بلالیا وہ بھی آکر کھانے لگے (اتفاقاً) ان کی انگلی میری انگلی سے لگ گئی فوراً ان کے منہ سے نکلا اوہ اگر تم عورتوں کے بارے میں میرا کہا مان لیا جاتا تو کوئی آنکھ تم کو نہیں دیکھ پاتی۔ اس کے بعد آیت حجاب نازل ہوگئی۔ نسائی نے اور ادب المفرد میں بخاری نے بھی اسی طرح نقل کیا ہے، ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس اندر آیا اور بہت دیر تک بیٹھا رہا رسول اللہ ﷺ تین بار اٹھ کر باہر چلے گئے تاکہ وہ شخص بھی چلا جائے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اتنے میں حضرت عمر اندر آگئے اور چہرہ مبارک پر ناگواری دیکھ کر اس شخص سے کہا تم نے رسول اللہ ﷺ کو دکھ دیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا میں تین مرتبہ اٹھا تاکہ یہ بھی میرے پیچھے اٹھ کھڑا ہو لیکن اس نے

ایسا نہیں کیا۔ حضرت عمر نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ اگر آپ (عورتوں کے لئے) پردہ اختیار کر لیتے تو مناسب تھا کیونکہ آپ کی بیویاں دوسری عورتوں کی طرح تو ہیں نہیں۔ یہ عمل ان لوگوں کے دلوں کو بھی پاک رکھنے والا ہے اس پر آیت حجاب نازل ہو گئی۔ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں بخاری کی یہ روایت ذکر کر دی گئی ہے کہ حضرت عمر نے فرمایا تین باتوں میں میری (رائے کی) مطابقت اپنے رب کے (حکم کے) ساتھ ہو گئی میں نے عرض کیا کاش آپ مقام ابراہیم کو مقام نماز بنا لیتے اس پر آیت وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى نازل ہوئی میں نے عرض کیا تھا یارسول اللہ آپ کی عورتوں کے پاس نیک بد ہر طرح کے آدمی آتے ہیں کاش آپ اپنی عورتوں کو پردہ میں رہنے کا حکم دیدیتے اس پر آیت حجاب نازل ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس رقابت کی وجہ سے آپ کی عورتیں جمع تھیں۔ میں نے کہا عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ یُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَیْرًا مِّنْكُنَّ یہ عبارت اسی طرح نازل ہو گئی۔ نسائی نے حضرت انسؓ کی روایت سے بھی اسی طرح بیان کیا ہے۔ بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بھی یونہی یہ واقعہ نقل کیا ہے۔ قضاء حاجت کے لئے جب رسول اللہ ﷺ کی بیویاں باہر نکلتی تھیں تو رات کو باہر نکل کر وسیع میدان میں جاتی تھیں۔ حضرت عمر رسول اللہ ﷺ سے عرض کرتے تھے کہ امہات المومنین کا پردہ کرا دیجئے لیکن حضور ﷺ ایسا نہیں کرتے تھے ایک رات کو عشاء کے وقت حضرت سودہ بنت زمعہ گھر سے برآمد ہوئیں عورت قد آور تھیں (اس لئے پہچان لی جاتی تھی) حضرت عمر کو چونکہ پردے کا حکم نازل ہونے کی انتہائی خواہش تھی اس لئے آپ نے پکار کر کہا ہم نے آپ کو پہچان لیا اس پر اللہ نے آیت حجاب نازل فرما دی۔ بغوی نے لکھا آیت حجاب کے سبب نزول کا یہ صحیح واقعہ ہے۔

حافظ ابن حجر نے لکھا ہے مختلف روایات میں اس طرح مطابقت دی جا سکتی ہے کہ حضرت زینب کے قصہ سے کچھ ہی پہلے حضرت عمر کا یہ واقعہ ہوا ہو گا اس لئے اس واقعہ کو نزول آیت کا سبب بتا دیا گیا۔ ایک آیت کے اسباب نزول متعدد ہو سکتے ہیں۔

اِلَّاۤ اَنْ یُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ یعنی کھانے کے لئے اگر تم کو اجازت داخلہ مل جائے تو نبی کے گھر میں داخل ہو سکتے ہو۔ یُؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ سے اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ خواہ اجازت دیدی گئی ہو لیکن بغیر بلائے کھانے پر نہ جانا چاہئے یہی اشارہ مستفاد ہو رہا ہے آئندہ غَیْرَ نٰظِرِیْنَ اِنٰىهُ کے فقرہ سے یعنی کھانا تیار ہونے کا انتظار کرتے رہو۔

اِلَّاۤ اَنْ یُّؤْذَنَ لَكُمْ کے استثناء کا تعلق صرف ان لوگوں سے ہے جو کھانا کھانے کے لئے داخل ہونا چاہتے ہوں۔

اِنٰى مصدر ہے انی الطعام کھانا پک گیا تیار ہو گیا۔ انی الحمیم پانی خوب گرم ہو گیا کھولنے لگا۔ انی ان یفعل کذا اس کام کو کرنے کا وقت آ گیا۔ بغوی نے لکھا ہے اِنٰى بکسر ہمزہ مقصورہ آتا ہے اور اَنَاہ بفتح ہمزہ ممدودہ آتا ہے۔ باب ضرب سے اَنٰى یَاْنِیْ اور آنَ یَئِیْنُ جیسے بَاعَ یَبِیْعُ دونوں طرح مستعمل ہے۔ قاموس میں ہے اَنٰى الشیئ یَاْنِیْ (از ضرب) اَنْیًا و اِنًا جیسے غنیٰ وقت آ گیا وہ چیز تیار ہو گئی۔ اَنٰى الحمیمُ انتہائی گرم ہو گیا کھولنے لگا۔ آنی کھولنے والا بلغ ھذا اَنَاہ اور اِنَاہ یہ چیز اپنی انتہا کو پہنچ گئی یا پختگی کو پہنچ گئی یا تیاری کو پہنچ گئی۔

وَلٰكِنْ اِذَا دُعِیْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا لیکن جب تم کو (کھانے کے لئے) بلایا جائے تو اندر چلے جاؤ پھر جب کھانا کھا چکو تو منتشر ہو جاؤ یعنی رسول اللہ ﷺ کے گھر سے باہر چلے جاؤ کھانے کے بعد وہاں نہ ٹھہرو۔

ل حضرت ابن مسعود نے فرمایا چار باتوں کی وجہ سے عمر بن خطاب کو لوگوں پر فضیلت حاصل تھی۔ (۱) آپ نے بدر کے قیدیوں کو قتل کر دینے کا مشورہ دیا تھا۔ اس پر آیت لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ الخ نازل ہوئی۔ (۲) آپ نے رسول اللہ ﷺ کی بیویوں کو پردے میں رہنے کا مشورہ دیا تھا جس پر حضرت زینب نے فرمایا خطاب کے بیٹے اب تم کو ہم پر بھی غیرت آنے لگی حالانکہ وحی ہمارے گھروں میں اترتی ہے اس پر آیت وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ نازل ہوئی۔ (۳) رسولؐ نے آپ کے متعلق دعا کی تھی اے اللہ تعالیٰ عمرؓ کے ذریعہ سے اسلام کو مضبوط کر دے۔ (۴) حضرت ابو بکرؓ کی خلافت کے بارے میں آپ نے رائے دی تھی آپ نے ہی سب سے پہلے حضرت ابو بکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ (از مفسر رحمۃ اللہ)

وَلَا مُسْتَأْنِسِينَ لِحَدِيثٍ ۚ اور (کھانے کے بعد) باتوں میں دل بہلانے کے لئے مت بیٹھے رہا کرو۔

اس جملہ میں کھانے کے بعد بھی دیر تک باتیں کرنے کے لئے تفریحاً بیٹھے رہنے کی ممانعت فرما دی۔

إِنَّ ذَٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيِي مِنكُمْ ۖ وَاللَّهُ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ ۚ تمہارا یہ فعل (یعنی دیر تک ٹھہرا رہنا) نبی کو تکلیف دیتا ہے (کیونکہ ان کے اور ان کے گھر والوں کے لئے گھر تنگ ہو جاتا ہے اور ان کو بیکار باتوں میں مشغول رہنا پڑتا ہے) اور وہ تم سے شرم کرتے ہیں اور اللہ حق بات (کو ظاہر کرنے) سے نہیں جھجکتا ہے۔

یعنی تم کو ادب سکھانا حق ہے اور حق بات سے اللہ نہیں جھجکتا اس لئے تم کو ادب سکھانا ترک نہیں کرتا۔ بیضاوی نے یہ مطلب لکھا ہے کہ نبی کے گھر سے تمہارا نکالنا حق ہے اور حق بات کو اللہ ترک نہیں کرتا اس لئے تم کو نکلنے کا حکم دے رہا ہے۔

وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَاسْأَلُوهُنَّ مِن وَرَاءِ حِجَابٍ ۚ اور جب نبی کی بیویوں سے تم کچھ سامان مانگو تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو۔

مَتَاعًا یعنی کوئی کام کی چیز بطور عاریت یا بطور بخشش مانگو یا مانگی ہوئی چیز دینے جاؤ۔

بغوی نے لکھا ہے کہ آیت حجاب کے نزول کے بعد کسی کو اجازت نہیں تھی کہ رسول اللہ ﷺ کی کسی بیوی کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے خواہ وہ نقاب پوش ہوں یا بغیر نقاب کے۔

ذَٰلِكُمْ أَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِنَّ ۚ تمہارا یہ عمل (پردے کے پیچھے سے مانگنا شیطانی وسوسوں سے) تمہارے دلوں کو بھی پاک رکھنے والا ہے اور ان کے دلوں کو بھی۔

ابن ابی حاتم نے ابن زید کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو اطلاع ملی کہ کسی شخص نے کہا ہے اگر رسول اللہ ﷺ کی وفات ہو گئی تو (آپ کے بعد) فلاں (بیوی) سے میں نکاح کر لوں گا اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَمَا كَانَ لَكُمْ أَن تُؤْذُوا رَسُولَ اللَّهِ وَلَا أَن تَنكِحُوا أَزْوَاجَهُ مِن بَعْدِهِ أَبَدًا ۚ إِنَّ ذَٰلِكُمْ كَانَ عِندَ اللَّهِ عَظِيمًا ﴿۵۳﴾ اور تمہارے لئے اللہ کے رسول کو دکھ پہنچانا جائز نہیں اور نہ ان کی بیویوں سے کبھی نکاح کرنا تمہارے لئے جائز ہے (نہ رسول ﷺ کی وفات کے بعد نہ طلاق دینے کے بعد) تمہارا یہ فعل اللہ کے نزدیک بڑا جرم ہے۔

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ اس آیت کا نزول اس شخص کے متعلق ہوا جس نے کہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد میں آپ کی کسی بیوی سے نکاح کر لوں گا۔ سفیان نے کہا ایسی بات حضرت عائشہؓ کے متعلق کہی گئی تھی۔ سدی کا بیان ہے ہم کو اطلاع ملی ہے کہ طلحہ بن عبید اللہ نے کہا تھا کیا محمد ہماری چچا کی بیٹیوں سے تو ہم سے پردہ کرا رہے ہیں اور ہمارے بعد ہماری بیویوں سے خود نکاح کر لیتے ہیں اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو ہم ان کے بعد ان کی بیویوں سے نکاح کریں گے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

ابن سعد نے ابو بکر بن محمد بن عمرو بن حزم کی روایت سے لکھا ہے کہ یہ آیت طلحہ بن عبید اللہ کے بارے میں اتری طلحہ نے کہا تھا کہ جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہو جائے گی تو عائشہؓ سے میں نکاح کر لوں گا۔ جویبر نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی ایک بیوی کے پاس گیا اور ان سے باتیں کرنے لگا یہ شخص ان بی بی کے چچا کا بیٹا تھا رسول اللہ نے فرمایا آج کے بعد اس جگہ نہ کھڑا ہونا۔ اس شخص نے کہا وہ میرے چچا کی بیٹی ہے خدا کی قسم نہ میں نے اس سے کوئی بری بات کہی تھی نہ اس نے مجھ سے کوئی بری بات کی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ سے زیادہ کوئی غیرت مند نہیں اور مجھ سے بھی زیادہ کوئی غیرت والا نہیں وہ شخص چلا گیا اور جانے کے بعد کہا مجھے میری چچا کی بیٹی سے بات کرنے سے روکتے ہیں ان کے بعد میں اس سے ضرور نکاح کروں گا اس پر یہ آیت اتری۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا پھر اس شخص نے اپنی زبان سے نکلے ہوئے ان الفاظ کی توبہ میں ایک بردہ آزاد کیا دس اونٹ راہ خدا میں سوار ہونے کے لئے دیئے اور پیدل حج کیا۔

بغوی نے لکھا ہے کہ معمر نے زہری کی روایت سے بیان کیا کہ عالیہ بنت ظبیان نے ایک شخص سے نکاح کر لیا تھا اور اس کے پیٹ سے اس شخص کی اولاد بھی ہوئی تھی عالیہ وہی عورت تھی جس کو رسول اللہ ﷺ نے طلاق دیدی تھی اور یہ واقعہ پہلے کا ہے جب کہ رسول اللہ ﷺ کی بیویوں سے نکاح کی ممانعت نہیں ہوئی تھی۔

بیضاوی نے لکھا حرمت نکاح ازواج سے وہ عورت مستثنیٰ ہے جس کو بغیر قربت کئے رسول اللہ ﷺ نے طلاق دیدی۔

یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ (خلافت) میں اشعث بن قیس نے مستعیذہ (جونیہ کلبیہ) سے نکاح کر لیا حضرت عمر نے اس کو سنگسار کرانے کا ارادہ کیا لیکن آپ کو بتایا گیا کہ مستعیذہ کو رسول ﷺ نے بغیر صحبت کے چھوڑ دیا تھا۔ حضرت عمر نے یہ بات سن کر اشعث کو چھوڑ دیا اور حضرت عمر کے اس فیصلہ کے خلاف کسی نے کچھ نہیں کہا (مستعیذہ پناہ طلب کرنے والی اس کا نام جونیہ کلبیہ تھا رسول اللہ ﷺ نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس نے کہا میں آپ سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں حضور ﷺ نے یہ سنتے ہی اس کو چھوڑ دیا)

عَظِيْمًا یعنی بڑا جرم ہے۔ میں کہتا ہوں تحریم ازواج کی یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی قبر میں زندہ ہیں اسی لئے آپ کے مال کا کوئی وارث نہیں قرار پایا اور نہ آپ کی بیویاں بیوہ ہوئیں۔ حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص میری قبر کے پاس مجھ پر درود پڑھے گا تو میں اس کو سن لوں گا اور جو شخص دور سے مجھ پر درود پڑھے گا تو مجھے وہ درود پہنچا دی جائے گی۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔

إِنْ تُبْدُوْا شَيْئًا أَوْ تُخْفُوْهُ فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا۝ اگر تم کسی چیز کو ظاہر کرو گے یا پوشیدہ رکھو گے اللہ (تو بہر حال) ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔

یعنی رسول اللہ ﷺ کو ایذا دیا ان کی بیویوں سے نکاح (کا ارادہ) ظاہر کرو گے یا دلوں میں چھپائے رکھو گے۔ بغوی نے لکھا ہے اس آیت کا نزول اس شخص کے حق میں ہوا جس نے رسول اللہ ﷺ کے بعد حضرت عائشہ سے نکاح کرنے کا ارادہ دل میں پوشیدہ رکھا تھا۔ اللہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے یعنی تم کو اس (ظاہر اور پوشیدہ) گناہ کی سزا دے گا۔

اس تعمیم میں اور امہات المؤمنین سے صراحتاً نکاح کی ممانعت کے بعد برہان بیان کرنے میں مزید زور وعید عذاب اور تخویف سزا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس شخص نے حضور ﷺ کی کسی بیوی سے نکاح کرنے کا لفظ زبان سے نکالا تھا اس نے اس بات سے توبہ کی اور گناہ کے کفارے میں ایک بردہ آزاد کیا اور جہاد میں سواری کے کام آنے کے لئے دس اونٹ دیئے اور پیدل حج کیا جیسا کہ حضرت ابن عباس کے مذکورہ بالا بیان میں آیا ہے۔

بغوی نے لکھا جب آیت حجاب نازل ہو گئی تو امہات المؤمنین کے باپوں بھائیوں اور دوسرے قریب ترین رشتہ داروں نے کہا آئندہ ہم بھی رسول اللہ ﷺ کی بیویوں سے کلام کریں گے تو پردے کی آڑ سے اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِيْ آبَائِهِنَّ وَلَا أَبْنَائِهِنَّ وَلَا إِخْوَانِهِنَّ وَلَا أَبْنَاءِ إِخْوَانِهِنَّ وَلَا أَبْنَاءِ أَخَوَاتِهِنَّ وَلَا نِسَائِهِنَّ وَلَا مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ وَاتَّقِيْنَ اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا۝

نبی کی بیویوں پر کوئی گناہ نہیں باپوں سے (بے پردہ باتیں کرنے) میں نہ اپنے بیٹوں سے نہ اپنے بھائیوں سے نہ اپنے بھتیجوں سے نہ اپنے بھانجوں سے نہ اپنی عورتوں سے نہ اپنے مملوک لوگوں سے اور خدا سے ڈرتی رہو اللہ ہر چیز پر حاضر (ناظر) ہے۔

چچا اور ماموں کا ذکر آیت میں نہیں کیا کیونکہ بھتیجوں اور بھانجوں کا ذکر کرنے کے بعد دلالت النص سے چچا اور ماموں کا حکم معلوم ہو جاتا ہے کیونکہ بھتیجوں کے رشتہ سے امہات المؤمنین پھوپھیاں ہوں گی اور بھانجوں کے رشتہ سے خالائیں اور چچا پھوپھی کا ایک ہی رشتہ ہے اسی طرح ماموں اور خالہ بھی ہم رشتہ ہیں (باپ کا بھائی چچا اور بہن پھوپھی ہوتی ہے اور ماں کا بھائی ماموں اور بہن خالہ ہوتی ہے)

بخاری نے حضرت عروہ بن زبیرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا آیت حجاب نازل ہونے کے بعد ابو القعیس کے بھائی افلح نے میرے پاس آنے کی اجازت طلب کی میں نے کہا جب تک رسول اللہ ﷺ سے اجازت نہیں لے لوں گی خود اجازت نہیں دے سکتی۔ ابو القعیس کے بھائی نے دودھ نہیں پلایا ابو القعیس کی بیوی نے پلایا تھا جب رسول اللہ ﷺ اندر تشریف لائے تو میں نے کہا ابو القعیس کے بھائی نے میرے پاس اندر آنے کی اجازت طلب کی تھی مگر آپ کی اجازت کے بغیر میں نے اجازت دینے سے انکار کر دیا فرمایا تم اپنے چچا کو اجازت دیدو میں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ مجھے اس مرد نے دودھ نہیں پلایا بلکہ ابو القعیس کی بیوی نے پلایا تھا فرمایا تیرا ہاتھ خاک آلود ہو وہ تیرا چچا ہے اس کو اجازت دیدے۔ حضرت عروہ نے کہا اسی لئے حضرت عائشہؓ فرماتی تھیں جن نسبی رشتوں کو تم محرم قرار دیتے ہو انہیں رضاعی رشتوں کو بھی محرم قرار دو۔

وَلَا نِسَآئِهِنَّ اپنی عورتوں سے مراد ہیں آزاد مسلمان عورتیں (غیر ہوں یا اپنی رشتہ دار)

وَلَا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اس میں باندی غلام دونوں آ گئے بعض نے کہا صرف باندیاں مراد ہیں سورۂ نور میں ہم اس کا ذکر کر چکے ہیں۔

وَاتَّقِيْنَ اللّٰهَ یعنی بے پردہ غیروں کے سامنے نکلنے سے اور جو احکام تم کو دیئے گئے ہیں ان کی خلاف ورزی سے اللہ کا خوف کرو۔

عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ یعنی بندہ کے ہر فعل پر اللہ حاضر ہے اس کو اس کے فعل کا (اچھا برا) بدلہ دے گا۔

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ؕ اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اللہ رحمت نازل فرماتا ہے اور فرشتے آپ کے لئے دعا (رحمت) کرتے ہیں دوسری روایت میں حضرت ابن عباس کا قول آیا یصلون یعنی برکت دیتے ہیں، بعض نے کہا اللہ کی طرف سے صلوٰۃ کا معنی ہے رحمت اور صلوٰۃ ملائکہ سے مراد ہے استغفار۔ لفظ صلوٰۃ کی مکمل تشریح آیت هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ کی تفسیر کے ذیل میں کر دی گئی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ اے ایمان والو تم (بھی) ان پر درود پڑھو اور خوب سلام بھیجو۔

یعنی تم بھی رسول اللہ ﷺ کے لئے دعا کرو اور آپ کے لئے اللہ سے رحمت نازل کرنے کی درخواست اور ان کو سلام کا تحفہ دو اور کہو اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ

آیت دلالت کر رہی ہے کہ صلوٰۃ و سلام بھیجنا مسلمانوں پر واجب ہے خواہ عمر میں ایک ہی بار ہو۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کا یہی قول ہے طحاوی نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ ابن ہمام نے کہا امر کا مقتضیٰ فقط عمر بھر میں ایک بار (تعمیل) ہے کیونکہ امر تکرار کو نہیں چاہتا اور ہم اسی کے قائل ہیں۔

بعض کا قول ہے کہ ہر نماز کے آخری قعدہ میں تشہد کے بعد درود پڑھنا واجب ہے امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا یہی قول ہے۔ رحمۃ الامۃ فی اختلاف الائمۃ میں ہے کہ آخری تشہد میں درود پڑھنا امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک سنت ہے اور امام شافعی کے نزدیک فرض ہے اور مشہور ترین روایت میں امام احمد کا قول آیا ہے کہ درود کو ترک کرنے سے نماز نہیں ہوتی۔ ابن جوزی نے لکھا ہے کہ تشہد کے بعد قعدۂ اخیرہ میں درود پڑھنا امام احمد کے نزدیک فرض ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ امام احمد کے نزدیک سنت ہے۔

بعض علماء کا یہ بھی خیال ہے کہ جب بھی رسول اللہ ﷺ کا ذکر آئے درود پڑھنا واجب ہے۔

کرخی نے لکھا جو علماء نماز میں درود پڑھنے کو واجب کہتے ہیں وہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں جو حضرت سہل بن سعدؓ کی روایت سے بطریق دار قطنی ابن جوزی نے نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے نبی پر درود نہیں پڑھی اس کی

نماز نہیں۔ اس حدیث کی سند میں ایک راوی عبدالمہیمن ہے۔ دار قطنی نے کہا عبدالمہیمن بن عباس بن سہل بن سعد قوی نہیں ہے۔ ابن حبان نے کہا اس کی حدیث سے استدلال نہ کیا جائے۔

ابن جوزی کی روایت مندرجہ ذیل الفاظ کے ساتھ ہے جس کا وضو نہیں اس کی نماز نہیں جس نے اللہ کا نام (وضو شروع کرنے کے وقت) نہیں لیا اس کا وضو نہیں۔ جس نے رسول اللہ ﷺ پر درود نہیں پڑھی اس کی نماز نہیں۔ جو انصار سے محبت نہیں رکھتا اس کی نماز نہیں۔ اس حدیث کی روایت میں عبدالمہیمن راوی کمزور ناقابل حجت ہے۔ طبرانی نے بروایت ابی بن عباس بن سہل بن سعد عن ابیہ (عباس) عن جدہ (سہل بن سعد) اسی کی طرح حدیث کو مرفوعاً روایت کیا ہے۔

علماء نے کہا عبدالمہیمن کی حدیث صحت کے زیادہ قریب ہے اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ علماء کی ایک جماعت نے ابی بن عباس کے بارے میں کلام کیا ہے۔

ایک حدیث حضرت ابو مسعود انصاری کی روایت سے آئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے نماز پڑھی لیکن نہ مجھ پر درود پڑھی نہ میرے اہل بیت پر اس کی نماز مقبول نہیں۔ رواہ ابن الجوزی من طریق الدارقطنی ابن جوزی نے کہا اس حدیث کی سند میں جابر جعفی کمزور راوی ہے پھر جابر نے اس حدیث (کی روایت) میں خود اختلاف کیا ہے۔ کبھی حضرت ابن مسعود پر پہنچ کر حدیث کی روایت کو ٹھہرا دیا یعنی موقوفاً بیان کیا ہے۔ کبھی رسول اللہ ﷺ کا قول بتایا ہے یعنی مرفوعاً بیان کیا ہے۔

ابن ہمام نے اس کو حضرت ابن مسعود کی روایت سے بیان کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ ابن جوزی نے کہا اس کی روایت میں جابر ضعیف ہے اور روایت میں اختلاف ہے۔ کبھی موقوفاً بیان کیا ہے کبھی مرفوعاً۔

حاکم اور بیہقی نے بروایت یحیی بن سباق قبیلہ بنی حارث کی وساطت سے حضرت ابن مسعود کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی تشہد پڑھ چکے تو کہے اللھم صل علی محمد و علی آل محمد وبارک علی محمد و علی آل محمد وارحم محمد اوآل محمد کما صلیت و بارکت و ترحمت علی ابراھیم و علی آل ابراھیم انک حمید مجید۔ حافظ ابن حجر نے کہا اس حدیث کے راوی سوائے حارثی شخص کے ثقہ ہیں حارثی قابل نظر ہے۔

ابن ہمام نے لکھا ہے حدیث لَا صَلٰوۃَ لِمَنْ لَمْ یُصَلِّ عَلَیَّ کو تمام اہل حدیث نے ضعیف قرار دیا ہے اور اگر اس کو صحیح بھی مان لیا جائے تو اس سے مراد کامل نماز کی نفی ہے (یعنی جس نے مجھ پر نماز کے اندر درود نہیں پڑھی اس کی نماز کامل نہیں ہوئی) یا یہ مطلب ہے کہ جس نے عمر میں ایک بار بھی درود نہیں پڑھی اس کی نماز نہیں۔

حافظ ابن حجر نے کہا اس حدیث سے زیادہ قوی حضرت فضالہ بن عبید کی حدیث ہے فضالہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز میں دعا کرتے سنا مگر اس نے رسول اللہ پر درود نہیں پڑھی حضور ﷺ نے فرمایا اس نے (دعا مانگنے میں) عجلت کی پھر اس کو بلایا اور اس کو نیز دوسرے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا تم میں سے جو شخص نماز پڑھے تو پہلے اللہ کی حمد و ثناء کرے پھر مجھ پر درود بھیجے پھر جو کچھ چاہے دعا کرے۔

رواہ ابو داؤد والنسائی والترمذی وابن خزیمہ وابن حبان والحاکم ترمذی کی روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ فضالہ نے کہا رسول اللہ ﷺ بیٹھے ہوئے تھے ایک آدمی آیا اور اس نے نماز پڑھی پھر کہا اے اللہ تو مجھے بخش دے اور مجھ پر رحم فرما حضور ﷺ نے فرمایا اے نماز پڑھنے والے تو نے عجلت کی جب تو نماز پڑھے اور بیٹھ جائے تو (اول) ان صفات کے ساتھ اللہ کی حمد کر جن کا وہ مستحق ہے پھر مجھ پر درود پڑھ پھر اللہ سے دعا کر۔

راوی کا بیان ہے پھر ایک اور آدمی آیا ہے اور اس نے نماز پڑھی اور اللہ کی حمد کی اور رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجی حضور ﷺ نے فرمایا اے نماز پڑھنے والے اب تو دعا کر تیری دعا قبول ہو گی (رواہ الترمذی) ابو داؤد اور نسائی نے بھی ایسی ہی حدیث بیان کی ہے۔ میں کہتا ہوں نماز میں تشہد کے بعد رسول اللہ ﷺ پر درود پڑھنے کے وجوب پر اس طرح بھی دلیل قائم کی جا سکتی ہے کہ آیت مذکورہ میں جس درود کا حکم دیا گیا ہے اس سے مراد نماز کے اندر درود پڑھنا ہے جیسے آیت وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ میں تکبیر سے

مراد تکبیر تحریمہ اور آیت قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ میں قیام سے مراد نماز میں کھڑا ہونا اور آیت وَاسْجُدُوْا وَارْكَعُوْا میں سجدہ اور رکوع سے مراد نماز میں سجود اور رکوع اور آیت فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ میں قرأت قرآن سے مراد نماز کے اندر قرآن پڑھنا ہے۔ کعب بن عجرہ کی حدیث جس کو بخاری نے نقل کیا ہے اسی پر دلالت کرتی ہے۔ حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ سے عرض کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ آپ پر سلام (کا طریقہ) تو ہم کو معلوم ہے مگر درود بھیجنے کا کیا طریقہ ہے؟ فرمایا کہو اللھم صل علی محمد الخ یعنی تشہد میں سلام کا طریقہ تو ہم کو معلوم ہو چکا ہے تشہد میں السلام علیک ایھا النبی و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ پڑھا ہی جاتا ہے مگر درود اس وقت کس طرح پڑھیں اس سوال کے جواب میں (نماز کے اندر) درود پڑھنے کا طریقہ حضور ﷺ نے بتایا کہ اللھم صلی علی محمد الخ پڑھا کرو۔ امت اسلامیہ نے بالاتفاق اس حدیث کو تسلیم کیا ہے اور بلا اختلاف تشہد کے بعد درود پڑھنے کی صراحت کی ہے البتہ واجب اور سنت ہونے میں اختلاف ہے اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جس درود کا حکم آیت مذکورہ میں دیا گیا ہے اس سے مراد تشہد کے بعد نماز کے اندر درود پڑھنا ہے (اور امر کا تقاضا وجوب ہے۔ اس لئے نماز میں تشہد کے بعد درود پڑھنا واجب قرار پایا۔ مترجم)

جو لوگ کہتے ہیں کہ جب بھی رسول اللہ ﷺ کا نام آئے درود پڑھنا واجب ہے انہوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں آیا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس شخص کی ناک خاک آلود ہو جس کے سامنے میرا تذکرہ کیا ہو اور اس نے مجھ پر درود نہ پڑھی ہو اور اس شخص کی ناک خاک آلود ہو کہ اس پر رمضان آکر گزر بھی جائے اور اس کی مغفرت نہ ہو اور اس شخص کی ناک خاک آلود ہو کہ اس کے ماں باپ یا دونوں میں سے ایک اس کی زندگی میں بوڑھے ہو جائیں اور اس شخص کے جنت میں داخلہ کا ذریعہ نہ بنیں (یعنی بیٹا بوڑھے ماں باپ کی خدمت نہ کرے اس لئے وہ ناراض رہیں اور یہ شخص جنت سے محروم ہو جائے) رواہ الترمذی و ابن حبان فی صحیحہ۔

حضرت جابر بن سمرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے اور وہ مجھ پر درود نہ پڑھے اور دوزخ میں چلا جائے اللہ اس کو دور رکھے۔

حضرت ابن عباسؓ کی مرفوع حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے پاس جبرئیل آئے (اور انہوں نے کہا) جس شخص کے سامنے آپ کا تذکرہ ہو اور وہ آپ پر درود نہ پڑھے اور (اس وجہ سے) دوزخ میں داخل ہو جائے پس اللہ اس کو دور رکھے یہ دونوں حدیثیں طبرانی نے نقل کی ہیں۔

ابن سنی نے حضرت جابرؓ کی مرفوع حدیث ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جس کے سامنے میرا ذکر ہو اور اس نے مجھ پر درود نہیں پڑھی وہ بدنصیب ہو گیا۔

حضرت علی راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کے سامنے میرا ذکر آئے اور وہ مجھ پر درود نہ پڑھے وہ بخیل ہے۔ رواہ الترمذی ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح غریب کہا ہے امام احمد نے یہ حدیث حضرت امام حسین کی روایت سے بیان کی ہے۔

طبرانی نے اچھی سند کے ساتھ حضرت امام حسین کی مرفوع روایت اس طرح بیان کی ہے جس کے سامنے میرا تذکرہ کیا اور اس نے مجھ پر درود پڑھنی چھوٹ گئی اس سے جنت کا راستہ چھوٹ گیا۔ نسائی نے صحیح سند سے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے۔ جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے اس کو چاہئے کہ مجھ پر درود پڑھے کیونکہ جو شخص مجھ پر (ایک بار) درود پڑھے گا اللہ اس پر دس رحمتیں نازل فرمائے گا (یا دس بار رحمت نازل فرمائے گا)

فصل رسول اللہ ﷺ پر صلوٰۃ و سلام کی فضیلت و کیفیت

عبد الرحمن بن ابی لیلی کا بیان ہے میری ملاقات حضرت کعب بن عجرہ سے ہوئی تو انہوں نے مجھ سے کہا کیا (حدیث کا) ایک تحفہ میں تم کو پیش نہ کروں جو رسول اللہ ﷺ سے میں نے خود سنی ہے میں نے کہا کیوں نہیں ضرور وہ تحفہ مجھے عنایت

فرمائیے، کعب نے کہا ہم نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ آپ کو سلام کرنا تو اللہ نے ہمیں بتادیا ہے لیکن آپ (اور آپ کے) اہل بیت پر ہم درود کس طرح پڑھیں فرمایا کہو۔

اللھم صل علی محمدو علی ال محمد کما صلیت علی ابراھیم وعلی ال ابراھیم انک حمید مجید۔ اللھم بارک علی محمدو علی ال محمد کما بارکت علی ابراھیم وعلی ال ابراھیم انک حمید مجید مسلم کی روایت میں دونوں جگہ علی ابراہیم کا لفظ نہیں ہے (صرف علی آل ابراہیم ہے) حضرت ابو حمید ساعدی راوی ہیں کہ صحابہ نے کہا یا رسول اللہ ہم آپ پر درود کیسے پڑھیں فرمایا کہو۔

اللھم صل علی محمد و ازواجہ وذریتہ کما صلیت علی آل ابراھیم وبارک علی محمد وازواجہ وذریتہ کما بارکت علی آل ابراھیم انک حمید مجید۔ متفق علیہ۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو ایک بار مجھ پر درود پڑھے گا اللہ دس بار رحمت اس پر نازل فرمائے گا۔ رواہ مسلم۔

حضرت انس راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو مجھ پر ایک درود پڑھے گا اللہ اس پر دس رحمتیں نازل فرمائے گا اور دس خطائیں ساقط کرے گا اور دس درجے بلند کرے گا۔ رواہ احمد والبخاری فی الادب والنسائی والحاکم۔ حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن مجھ سے سب سے زیادہ قریب وہ ہوگا جو مجھ پر سب سے زیادہ درود پڑھتا ہوگا۔ رواہ الترمذی۔

حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کے کچھ فرشتے زمین پر گھومتے پھرتے ہیں وہ مجھے میری امت کا سلام پہنچاتے ہیں رواہ النسائی والدارمی۔

حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں جو کوئی (جب بھی) مجھ پر سلام پڑھے گا اللہ میری روح مجھے لوٹا دے گا کہ میں سلام کا جواب دوں گا۔ رواہ ابوداؤد والبیہقی فی الدعوات الکبیر۔

حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے اپنے گھروں کو قبریں نہ بناؤ (کہ وہاں نماز نہ پڑھو۔ مترجم) اور نہ میری قبر کو میلہ بناؤ اور مجھ پر درود پڑھنا تمہارا درود مجھے پہنچے گا تم جہاں بھی ہو۔

حضرت ابوطلحہ راوی ہیں ایک روز رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اس وقت حضور ﷺ کے چہرہ پر شگفتگی تھی فرمایا مجھ سے جبرئیل نے آکر کہا کہ آپ کا رب فرماتا ہے محمد کیا تم اس بات پر خوش نہ ہو گے کہ تمہاری امت میں سے جو کوئی تم پر درود پڑھے گا میں اس پر دس رحمتیں نازل کروں گا اور تمہاری امت میں سے جو کوئی آپ پر سلام پڑھے گا میں دس بار اس پر سلامتی نازل کروں گا۔ رواہ النسائی والدارمی۔

حضرت ابی بن کعب کا بیان ہے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں آپ پر درود بہت پڑھتا ہوں کتنی بار پڑھا کروں فرمایا جتنی (بھی) چاہو میں نے عرض کیا (ذکر خداوندی اور دعا کا) ایک چوتھائی (درود کے لئے مقرر کرلوں) فرمایا جتنا تم چاہو اگر زیادہ کرلو تو تمہارے لئے بہتر ہوگا۔ میں نے عرض کیا (کل ذکر کا) آدھا حصہ (درود کو بنالوں فرمایا تم جتنا چاہو (کرلو لیکن) اگر زیادہ کرلو تو تمہارے لئے بہتر ہوگا میں نے عرض کیا دو تہائی فرمایا جتنا چاہو مگر زیادہ کرلو تو تمہارے لئے بہتر ہوگا میں نے عرض کیا کیا میں اپنی ساری دعا آپ کے لئے کردوں فرمایا تو ایسی حالت میں تمہارے سارے فکر دور ہو جائیں گے (کام پورے کر دیئے جائیں گے اور تمہارے گناہ ساقط کر دیئے جائیں گے۔ رواہ الترمذی۔

حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر کسی کو یہ بات (پسند اور) مسرور کرنے والی ہو کہ جب وہ ہم گھر والوں کے لئے دعا کرے تو اس کو بھرپور پیمانہ سے (بدلہ) دیا جائے تو اس کو اس طرح کہنا چاہئے۔ اللھم صل علی محمد النبی الامی وازواجہ امہات المؤمنین وذریتہ واھل بیتہ کما صلیت علی ابراھیم انک حمید

مجید۔ (رواہ ابوداؤد)

حضرت عبداللہ بن عمروؓ کا قول ہے کہ جو شخص نبی ﷺ پر ایک بار درود پڑھے گا اللہ اور اس کے فرشتے ستر رحمتیں اس پر نازل کریں گے۔ رواہ احمد۔

حضرت رویفعؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے مجھ پر درود پڑھی اور کہا اللھم انزله المقعد المقرب عندک یوم القیامة وجبت له شفاعتی اے اللہ قیامت کے دن محمد ﷺ کو اپنا مقام قرب عنایت کر اس کے لئے میری شفاعت لازم ہو گی۔ رواہ احمد۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا بیان ہے ایک روز رسول اللہ ﷺ (گھر سے) برآمد ہوئے اور ایک نخلستان کے اندر پہنچے وہاں پہنچ کر آپ نے سجدہ کیا اور اتنا طویل سجدہ کیا کہ مجھے اندیشہ ہو گیا کہیں حضور ﷺ کی وفات نہ ہو گئی ہو میں دیکھنے کے لئے (قریب گیا) آپ نے سر اٹھا کر فرمایا کیا بات ہے؟ میں نے اپنا اندیشہ بیان کر دیا۔ فرمایا جبرئیلؑ نے (آکر) مجھ سے کہا تھا کیا میں آپ کو یہ خوشخبری نہ سنادوں کہ اللہ نے آپ کے (اعزاز اور خوش کرنے کے) لئے فرمادیا ہے کہ جو شخص آپ پر درود پڑھے گا میں اس پر رحمت نازل کروں گا اور جو آپ پر سلام پڑھے گا میں اس کو سلامتی عطا کروں گا۔ رواہ احمد۔

حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا دعا آسمان اور زمین کے درمیان روک لی جاتی ہے جب تک تم اپنے نبی پر درود نہ پڑھو دعا کا کوئی حصہ اوپر نہیں چڑھنے پاتا۔ رواہ الترمذی۔

عبداللہ بن عامر بن ربیعہ نے اپنے باپ کا بیان نقل کیا کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا جو شخص مجھ پر جتنی درود پڑھتا ہے فرشتے اتنی ہی اس پر رحمتیں نازل کرتے ہیں۔ اب بندہ کو اختیار ہے کم درود پڑھے یا زیادہ۔ رواہ البغوی۔

حضرت علی راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص مجھ پر ایک بار درود پڑھتا ہے اس کے لئے ایک قیراط (ثواب) لکھ دیا جاتا ہے اور ایک قیراط کوہ احد کے برابر ہوتا ہے۔ رواہ عبدالرزاق فی الجامع بسند حسن۔

حضرت ابودرداءؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص صبح اور شام دس دس مرتبہ درود پڑھے گا اس کو میری شفاعت مل جائے گی۔ رواہ الطبرانی فی الکبیر بسند حسن۔ ؎

مسئلہ: کیا انبیاء کے علاوہ دوسروں کے لئے بھی صلوٰۃ و سلام کا استعمال درست ہے؟

صحیح یہ ہے کہ تنہا غیر انبیاء کے لئے صحیح نہیں ہے اور ضمناً یعنی انبیاء کے ساتھ ملا کر صحیح ہے۔ جس طرح کہ محمد عزوجل کہنا مکروہ ہے باوجودیکہ آپ معزز اور جلیل القدر تھے، اس کی وجہ یہ ہے عرف میں صلوٰۃ و سلام کا استعمال انبیاء کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے جیسے جل وعز کے لفظ باری تعالیٰ کے لئے خاص کر دیئے گئے ہیں۔ سورۂ توبہ کی آیت وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ

؎ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا بیان ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس موجود تھا ایک آدمی نے آکر سلام کیا حضور ﷺ نے اس کو سلام کا جواب دیا اور کشادہ روئی کے ساتھ اس کو اپنے پہلو میں بٹھا لیا جب وہ شخص اپنا کام پورا کر کے اٹھ گیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ابوبکر روزانہ اس شخص کا عمل باشندگان زمین کے سارے اعمال کے برابر اٹھایا جاتا ہے، میں نے عرض کیا ایسا کیوں ہے؟ فرمایا جب صبح ہوتی ہے تو یہ شخص دس بار مجھ پر درود پڑھتا ہے اور اس کا یہ درود ایسا ہوتا ہے جیسے ساری مخلوق کا درود۔ میں نے عرض کیا وہ کیا درود ہے فرمایا وہ کہتا ہے۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدِ النَّبِيِّ عَدَدَ مَنْ صَلّٰى مِنْ خَلْقِكَ وَصَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كَمَا يَنْبَغِيْ لَنَا اَنْ نُّصَلِّيَ عَلَيْهِ وَصَلِّ عَلٰى مُحَمَّدِ النَّبِيِّ كَمَا اَمَرْتَنَا اَنْ نُّصَلِّيَ عَلَيْهِ

حضرت ابوبکر صدیقؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نبی ﷺ پر درود پڑھنا گناہوں کو اس سے زیادہ مٹاتا ہے جتنا پانی آگ کو بجھاتا ہے اور رسول اللہ ﷺ پر سلام پڑھنا گردنیں (یعنی بردے) آزاد کرنے سے بھی افضل ہے اور رسول اللہ ﷺ کی محبت (راہ خدا میں اپنا) خون دل دینے سے بھی افضل ہے یا فرمایا راہ خدا میں شمشیر زنی سے بھی افضل ہے۔

(از مفسر قدس سرہ)

صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا کی تفسیر کے ذیل میں اس کی مکمل تشریح ہو چکی ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰهَ بے شک جو لوگ اللہ کو اذیت دیتے ہیں۔

بغوی نے لکھا ہے ان لوگوں سے مراد ہیں یہودی، عیسائی اور مشرک یہودی تو کہتے تھے عُزَیْرُ ابْنُ اللّٰهِ اور یَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ اور اِنَّ اللّٰهَ فَقِیْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِیَآءُ اور عیسائی کہتے تھے اَلْمَسِیْحُ ابْنُ اللّٰهِ اور کہتے تھے اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ اور مشرک کہتے تھے ملائکہ خدا کی بیٹیاں ہیں اور بت معبود ہونے میں اللہ کے ساجھی ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے ارشاد فرمایا ہے آدم کے بیٹے نے میری تکذیب کی اور اس کو ایسا کرنا جائز نہ تھا اور آدم کے بیٹے نے مجھے گالی دی اور اس کے لئے یہ جائز نہ تھا میری تکذیب تو یہ ہوئی کہ وہ کہتا ہے جس طرح خدا نے مجھے پہلی بار پیدا کیا ایسا دوبارہ نہیں کرے گا حالانکہ پہلی مرتبہ پیدا کرنا دوسری مرتبہ پیدا کرنے سے آسان نہیں ہے اور میرے لئے گالی یہ ہوئی کہ وہ کہتا ہے کہ اللہ نے اپنی اولاد بنائی ہے حالانکہ میں احد ہوں بے نیاز ہوں نہ کسی کا والد ہوں نہ کسی کا مولود میرا کفو کوئی نہیں۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت اس طرح ہے اس کا مجھے گالی دینا یہ ہے کہ وہ (میرے متعلق) کہتا ہے کہ میری اولاد ہے حالانکہ میں اس سے پاک ہوں کہ کسی کو اپنی بیوی بناؤں یا اولاد۔ رواہ البخاری۔

حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ فرماتا ہے۔

آدم کا بیٹا دہر (زمانہ) کو گالی دے کر مجھے دکھ دیتا ہے حالانکہ میں ہی دہر (کا حکمران) ہوں میرے ہی ہاتھوں میں حکم دیتا ہے میں ہی رات دن کو الٹ پلٹ کرتا ہوں۔ متفق علیہ

بعض نے کہا اللہ کو اذیت پہنچانے سے مراد ہے اللہ کے اسماء و صفات میں کج روی اختیار کرنا (کیونکہ اللہ کو اذیت پہنچانا اور اللہ کا اذیت پانا ممکن نہیں راحت و تکلیف کا احساس تو جسمانی خواص میں شامل ہے اللہ ہر تاثر سے پاک ہے۔ مترجم)

عکرمہ نے کہا وہ (خدا کو اذیت دینے والے) مصور ہیں (یعنی اَلَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰهَ سے مراد مصور ہیں)

ابوزرعہ نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا حضرت ابوہریرہؓ نے کہا میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا اللہ فرماتا ہے اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون جو میری تخلیق کی طرح پیدا کرنے چلا ہے ایک چھوٹی چیونٹی تو بنالیں ایک دانہ یا ایک جو تو بنائیں۔ متفق علیہ۔

بخاری نے حضرت ابن عباسؓ کا قول لکھا ہے کہ جو شخص کوئی تصویر بنائے گا اللہ (قیامت کے دن) اس کو عذاب دے گا کہ وہ اس کے اندر جان ڈالے اور جان تو کبھی نہیں ڈال سکے گا (اس لئے عذاب سے بھی کبھی نہیں چھوٹے گا)

بعض علماء کا قول ہے کہ اذیت سے مراد ہے گناہوں کا ارتکاب اور اللہ کے احکام کی مخالفت حقیقی معنی مراد نہیں اللہ تو ہر دکھ (سکھ) سے پاک ہے کلام کی بناء عرف عام پر ہے (آپس میں لوگ حکم کی خلاف ورزی کو ایذا دہی سے تعبیر کر لیتے ہیں)

وَرَسُوْلَهٗ اور اس کے رسول کو۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا لوگوں نے اللہ کے رسول ﷺ کے چہرہ کو زخمی کر دیا حضور کا دانت توڑ دیا کسی نے ساحر کہا کسی نے شاعر کسی نے دیوانہ پاگل (یہ سب اللہ کے رسول ﷺ کو ایذا دینے کی صورتیں تھیں) یہ تشریح ان لوگوں کی نظر میں صحیح ہو گی جو (ایک وقت میں) ایک لفظ کا دو معنی پر اطلاق جائز قرار دیتے ہیں۔ (اللہ کو ایذا پہنچانے کا مفہوم کچھ اور ہے اور اللہ کے رسول ﷺ کو دکھ دینے کا مطلب اور ہے یہ لفظ یُؤْذُوْنَ ایک ہی ہے) جمہور کے نزدیک (یؤذون کا ایک ہی معنی مراد ہے) مطلب یہ ہے کہ ایسے کام کرتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کو ناپسند ہیں۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ایذائے اللہ کا ذکر رسول اللہ ﷺ کی عظمت کے اظہار کے لئے کیا گیا ہو یُؤْذُوْنَ اللّٰهَ کا معنی یُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ ہی ہو گویا جس نے اللہ کے رسول کو دکھ پہنچایا اس نے اللہ کو ایذا پہنچائی۔

ابن ابی حاتم نے بطریق عوفی حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت صفیہ بنت حیی

کو (بی بی) بنالیا تو کچھ لوگوں نے آپ کو مطعون کیا انہی لوگوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ جویبر نے بوساطت ضحاک حضرت ابن عباسؓ کا یہ بیان نقل کیا کہ عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی ان لوگوں نے حضرت عائشہ صدیقہؓ پر تہمت لگائی تھی رسول اللہ ﷺ نے ایک خطبہ دیا اور فرمایا وہ شخص جو مجھے اذیت پہنچاتا ہے اور مجھے اذیت پہنچانے والوں کو اپنے گھر میں جمع کرتا ہے اس کی طرف سے مجھے بچانے کو کون معذرت خواہی کر سکتا ہے اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ فرماتا ہے کہ جو (میرے) کسی ولی کی اہانت کرتا ہے دوسری روایت کا لفظ ہے جو (میرے) ولی سے دشمنی کرتا ہے وہ جنگ کے لئے میرے مقابلہ پر آتا ہے اور جو کام میں کرنے والا ہوتا ہوں اس میں مجھے (کبھی) اتنا تردد نہیں ہوتا جتنا تردد اپنے مؤمن بندہ کی روح قبض کرنے میں ہوتا ہے کہ وہ مرنا پسند نہیں کرتا اور میں اس کو ناراض کرنا نہیں چاہتا اور مرنا اس کے لئے لازم ہوتا ہے۔ میرے مؤمن بندہ کو میرا قرب (کسی عمل سے) اتنا حاصل نہیں ہوتا جتنا دنیا سے بے رغبت ہونے سے ہوتا ہے اور بندۂ مؤمن میری کوئی عبادت ایسی نہیں کرتا جیسی میرے عائد کئے ہوئے فرض کو ادا کر کے کرتا ہے۔ (یعنی فرض کی ادائیگی سب سے بڑی عبادت ہے اس کے برابر کوئی عبادت نہیں ہے۔ مترجم) رواہ البخاری۔

حضرت ابوہریرہؓ اس بیان نبوی کے راوی ہیں کہ اللہ فرمائے گا اے ابن آدم میں بیمار ہوا اگر تو نے میری عیادت نہیں کی۔ بندہ عرض کرے گا اے میرے رب میں تیری عیادت کیسے کرتا تو رب العالمین ہے (ہر بیماری سے پاک ہے) اللہ فرمائے گا کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا اور تو نے اس کی عیادت نہیں کی کیا تجھے علم نہیں کہ اگر تو اس کی عیادت کو جاتا تو مجھے اس کے پاس موجود پاتا۔ اے ابن آدم میں نے تجھ سے کھانا مانگا تو نے مجھے کھانا نہیں دیا الی آخر الحدیث رواہ مسلم۔

میں کہتا ہوں کہ جب اولیاء سے دشمنی اللہ سے دشمنی اور جنگ ہے اور اپنے اولیاء کی بیماری کو اللہ نے اپنا مرض قرار دیا ہے حالانکہ وہ ان تمام حوادث سے پاک اور بالا ہے تو اس کی وجہ اللہ کے ساتھ اولیاء کا وہ وصل ہے جو ہر کیفیت سے پاک ہے جب (عام) اولیاء کی یہ حالت ہے تو ایذاء رسول کو ایذاء خدا کہنا تو بدرجہ اولیٰ مناسب اور صحیح ہے۔

احادیث مذکورہ ہی کی بناء پر بعض علماء نے آیت مذکورہ (میں اللہ سے پہلے لفظ اولیاء محذوف مانا ہے اور آیت) کی تفسیر میں اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰهَ ـ اَنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ کہا ہے جیسے آیت وَاسْئَلِ الْقَرْيَةَ میں اَهْلَ الْقَرْيَةِ مراد ہیں میرے نزدیک یہ تشریح غلط ہے ورنہ وَرَسُوْلَهٗ کے لفظ سے پہلے بھی لفظ اَوْلِیَآءَ محذوف قرار دینا پڑے گا۔ اگر اس کی توجیہ اس طرح کی جائے کہ رسول اولیاء میں داخل ہیں (اور تمام اولیاء میں ممتاز ہیں) اس لئے اولیاء اللہ کے عام لفظ کے بعد رسولہ فرمانا حضور ﷺ کی خصوصیت کو ظاہر کرتا ہے۔ (اس وقت رسولہ سے پہلے لفظ اولیاء کو محذوف ماننے کی ضرورت نہیں بلکہ رسول کا عطف اولیاء اللہ پر ہو جائے گا اور خاص کا عطف عام پر خاص کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے کیا جاتا ہے۔ مترجم)

تو میں اس کے جواب میں کہوں گا کہ آیت وَالَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ میں لفظ محذوف کی وجہ سے تکرار لازم آئے گی (کیونکہ مومنین بھی تو اولیاء ہی ہیں۔ مترجم)

لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِی الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۵۷﴾ دنیا اور آخرت میں

ان پر اللہ کی لعنت ہے اور اللہ نے ان کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

مسئلہ: رسول اللہ ﷺ کی شخصیت، دین، نسب یا حضور کی کسی صفت پر طعن کرنا اور صراحتاً یا کنایۃً یا اشارۃً یا بطور تعریض آپ پر نکتہ چینی کرنا اور عیب لگانا کفر ہے ایسے شخص پر دونوں جہاں میں اللہ کی لعنت ہے دنیوی سزا سے اس کو توبہ بھی نہیں بچا سکتی۔ ابن ہمام نے لکھا ہے جو شخص رسول اللہ ﷺ سے دل میں نفرت کرے وہ مرتد ہو جائے گا۔ برا کہنا تو بدرجہ اولیٰ مرتد بنا دیتا ہے اگر اس کے بعد توبہ بھی کرلے تو قتل کی سزا ساقط نہیں ہو سکتی۔ اہل فقہ نے لکھا ہے یہ قول علماء کوفہ (امام ابو حنیفہؒ، صاحبینؒ وغیرہ) کا اور امام مالکؒ کا ہے ایک روایت میں حضرت ابو بکرؓ کا بھی یہی فتویٰ منقول ہے۔

یہ سزا بہر حال دی جائے گی خواہ وہ اپنے قصور کا اقرار کرلے اور تائب ہو کر آئے یا منکر جرم ہو اور شہادت سے ثبوت

ہو جائے دوسرے موجبات کفر کا اگر انکار کردے خواہ شہادت ثبوت موجود ہو تو انکار معتبر ہو گا۔ علماء نے یہاں تک کہا ہے کہ نشہ کی حالت میں بھی اگر رسول اللہ ﷺ کو برا کہنے کے جرم کا ارتکاب کیا ہو تب بھی اس کو معاف نہیں کیا جائے گا ضرور قتل کیا جائے گا۔ ہاں نشہ کی حالت کیلئے یہ شرط ضروری ہے کہ اس نے خود اپنے اختیار سے بغیر جبر و اکراہ کے ممنوع طریقہ سے نشہ آور چیز کھائی پی ہو اگر ارتکاب فسق اپنے اختیار سے نہ کیا ہو تو ایسا مدہوش آدمی پاگل کے حکم میں ہے (اس کو سزا نہیں دی جائے گی)

وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا اور جو لوگ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو بے خطا دکھ دیتے ہیں یعنی جو مومن مرد و عورت بے قصور ہوں کسی ایسے جرم کا انہوں نے ارتکاب نہ کیا ہو کہ ان کو دکھ پہنچانا لازم ہو یا ان کو جو لوگ اذیت پہنچاتے ہیں اور ان کو ناکردہ گناہ کے ساتھ متہم کرتے ہیں۔

خطابی نے کہا ہے کہ میں نہیں جانتا کہ ایسے شخص کے واجب القتل ہونے میں کسی نے اختلاف کیا ہو۔ ہاں اگر اللہ کے معاملہ میں کسی کا قتل واجب ہو جائے تو توبہ کرنے سے سزائے قتل ساقط ہو جاتی ہے اسی طرح کوئی مست نشہ میں مدہوش ہو کر رسول اللہ صلعم کی شان میں گستاخی کرنے کے علاوہ کوئی اور کلمۂ کفر زبان سے نکال دے تو خواہ اس نے باختیار خود بغیر جبر و اکراہ کے ممنوع طریقہ سے نشہ کیا ہو پھر بھی اس کو مرتد قرار نہیں دیا جائے گا

فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۝ وہ بڑے بہتان اور صریح گناہ کا بار اپنے اوپر اٹھاتے ہیں۔

بُهْتَانًا اور اِثْمًا کی تنوین بہتان اور گناہ کی بڑائی کو ظاہر کر رہی ہے مقاتل نے کہا اس آیت کا نزول حضرت علیؓ کے متعلق ہوا ایک روایت یہ بھی آئی ہے کہ حضرت عائشہؓ کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔

میں کہتا ہوں سبب نزول خواہ اخص ہو مگر الفاظ عام ہے ہر وہ شخص جو کسی مسلمان مرد عورت کو بے وجہ اذیت پہنچائے۔ آیت کے حکم میں داخل ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ (کے ظلم و ایذا) سے مسلمان محفوظ رہیں اور مومن وہ ہے کہ لوگوں کو اپنے جان و مال کا اس کی طرف سے اندیشہ نہ ہو۔ (رواہ الترمذی والنسائی)

حضرت عائشہؓ کو گالی دینا (یعنی زنا کی تہمت لگانی) رسول اللہ ﷺ کو ہی گالی دینا ہے (کیونکہ ام المومنین نبی ﷺ کی بیوی تھیں) عرفاً بھی اور عقلاً بھی اور روایت کے لحاظ سے بھی جویبر نے بوساطت ضحاک حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھ سے اس شخص کی طرف سے کون عذر خواہی کرے گا جو مجھے ایذا پہنچاتا ہے اور مجھے ایذا دینے والوں کو اپنے گھر میں جمع کرتا ہے۔ یعنی عبداللہ بن ابی جس نے حضرت عائشہؓ پر زنا کی تہمت لگائی تھی۔ بعض لوگوں کا جو قول ہے کہ یہ آیت حضرت عائشہؓ کے متعلق نازل ہوئی اس کا مطلب یہ ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ سے اِثْمًا مُّبِيْنًا تک پوری آیت آپ کے متعلق نازل ہوئی صرف آخری آیت کا نزول مراد نہیں ہے اسی طرح جس نے حضرت علیؓ کو گالی دی اس نے رسول اللہ ﷺ کو دکھ پہنچایا۔ حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے (اے علیؓ) تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں۔ رواہ الشیخان فی الصحیحین عن البراء بن عازب۔

بلکہ عام صحابہؓ کو برا کہنا رسول اللہ ﷺ کو دکھ پہنچانے کا موجب ہے حضرت عبداللہ بن مغفل راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ سے ڈرو اللہ سے ڈرو۔ میرے صحابہ کے معاملہ میں میرے بعد ان کو (ملامت کا) نشانہ نہ بنانا جو شخص ان سے محبت رکھے گا وہ میری محبت کے ساتھ ان سے محبت رکھے گا اور جو ان سے بغض رکھے گا وہ میرے بغض کے ساتھ ان سے بغض رکھے گا جس نے ان کو ایذا دی اس نے مجھے ایذا دی اور جس نے مجھے ایذا دی اس نے اللہ کو ناراض کیا اور جس نے اللہ کو ناراض کیا اس کو عن قریب اللہ عذاب میں گرفتار کرے گا۔ رواہ الترمذی و قال ہٰذا حدیث غریب۔

ضحاک اور کلبی کا بیان ہے کہ آیت کا نزول ان زناکاروں کے حق میں ہوا جو منافق تھے راتوں کو مدینہ کے راستوں میں گھوما کرتے تھے جب رات کو عورتیں قضائے حاجت کے لئے گھروں سے باہر نکل کر (جنگل کی طرف) جاتی تھیں تو راستہ میں یہ ان کو دبا لیتے تھے اگر عورتیں خاموش رہتی تھیں تو یہ ان کے پیچھے لگ جاتے تھے اور اگر وہ جھڑک دیتی تھیں تو یہ

رک جاتے تھے حقیقت میں ان کا مقصد ہوتا تھا باندیوں کو چھیڑنا لیکن لباس چونکہ باندی اور آزاد عورت کا ایک ہی جیسا ہوتا تھا کرتہ اور اوڑھنی پہن کر سب ہی نکلتی تھیں اس لئے ان کو شناخت نہیں ہوتی تھی کہ کون باندی ہے اور کون آزاد عورت اس لئے آزاد عورتیں اس زد میں آجاتی تھیں۔ عورتوں نے اس کی شکایت اپنے شوہروں سے کی اور شوہروں نے جاکر رسول اللہ ﷺ کو اطلاع دیدی اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ پھر اگلی آیت میں آزاد عورتوں کو باندیوں جیسا لباس پہن کر نکلنے کی ممانعت کر دی گئی۔

ابن سعد نے طبقات میں حضرت ابو مالک کی روایت سے لکھا ہے اور اسی جیسی حدیث حسن اور محمد بن کعب قرظی کی روایت سے بھی آئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بیبیاں قضائے حاجت کے لئے رات کو نکلتی تھیں کچھ منافق ان کو چھیڑتے اور ستاتے تھے بیبیوں نے اس کی شکایت رسول اللہ ﷺ سے کی منافقوں سے جب اس کی باز پرس ہوئی تو انہوں نے کہا ہم تو یہ حرکت باندیوں سے کرتے ہیں (یعنی ہم تو ان کو باندیاں سمجھ کر چھیڑتے ہیں) اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ

اے نبی آپ اپنی بیبیوں سے اور اپنی بیٹیوں سے اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دیجئے کہ وہ نیچے کر لیا کریں اپنے اوپر تھوڑی سی اپنی چادریں۔

جَلَابِیْب، جلباب کی جمع ہے جلباب اس چادر کو کہتے ہیں جس کو عورت دوپٹے اور کرتے کے اوپر سے لپیٹ لیتی ہے۔

بخاری نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ حکم حجاب کے بعد سودہؓ قضائے حاجت کے لئے نکلیں عورت ڈیل ڈول کی تھیں جو ان کو پہچانتا تھا اس کے لئے (باوجود چہرہ پوشیدہ ہونے کے) مخفی نہیں ہو سکتی تھیں۔ چنانچہ عمر بن خطابؓ نے (ظاہری قد اور جسامت) دیکھتے ہی پہچان لیا اور آواز دے کر کہا سودہ تم کس طرح نکل رہی ہو اس کو دیکھ لو ہم سے خدا کی قسم تم چھپ نہیں سکتیں (ہم نے تمہیں پہچان لیا) سودہ فوراً لوٹ پڑیں رسول اللہ ﷺ اس وقت میرے گھر میں شام کا کھانا تناول فرما رہے تھے ہڈی ہاتھ میں تھی سودہ اندر آگئیں اور کہا یا رسول اللہ میں اپنے کسی کام سے باہر نکلی تھی عمر نے مجھے ایسا ایسا کہا۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے حضور ﷺ کے ہاتھ میں ہڈی موجود ہی تھی آپ نے اس کو ہاتھ سے رکھا بھی نہ تھا کہ وحی آنے لگی۔ وحی کے ختم ہونے کے بعد آپ نے فرمایا تم عورتوں کو اجازت دیدی گئی کہ تم باہر اپنے کام سے نکل سکتی ہو۔

میں کہتا ہوں مراد یہ تھی کہ چادر اوڑھ کر نکل سکتی ہو۔

حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابو عبیدہ نے فرمایا مسلمانوں کی عورتوں کو حکم دیا گیا تھا کہ اپنے سروں اور چہروں کو چادروں سے ڈھانک کر نکلیں صرف ایک آنکھ کھلی رہے۔ تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ آزاد بیبیاں ہیں باندیاں نہیں ہیں) مِن جَلَابِیْبِهِنَّ میں مِنْ تبعیضیہ ہے یعنی چادروں کا کچھ حصہ اپنے اوپر لٹکائیں۔

ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا

اس سے جلدی پہچان ہو جایا کرے گی۔ پھر ان کو ستایا نہ جائے گا اور اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔ یعنی پھر ان کو کوئی منافق بدچلن نہ چھیڑ سکے گا۔

وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا یعنی جو کچھ پہلے ہو چکا اللہ اس کو معاف کرنے والا ہے اور اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے۔ بندوں کے مصالح کا لحاظ رکھتا ہے یہاں تک کہ جزئی جزئی مسائل میں بھی بندوں کی مصلحتوں کی پاسداری کرتا ہے۔

حضرت انسؓ راوی ہیں کہ ایک نقاب پوش باندی حضرت عمرؓ کی طرف سے گزری آپ نے اس کا پردہ اٹھایا اور فرمایا کمینی تو آزاد عورتوں جیسی بنتی ہے۔ پھر اس کا نقاب پھینک دیا۔

لَئِنْ لَّمْ یَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِی الْمَدِیْنَةِ

منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں (ضعف ایمان کی) بیماری ہے اور وہ لوگ جو مدینہ میں جھوٹی خبریں اڑایا کرتے ہیں اگر باز نہ آئے

یعنی اگر منافق اپنے نفاق سے اور عورتوں کو چھیڑنے سے باز نہ آئے اور جن کے دلوں میں ضعف ایمان کی بیماری ہے وہ اپنے مذہبی استقلال یا بدکاریوں سے باز نہ آئے اور مدینہ میں سنسنی پیدا کر دینے والے اپنی سنسنی خیز جھوٹی خبروں کو پھیلانے سے باز نہ آئے۔ رَجْفَۃ کا معنی ہے زلزلہ اور حرکت کا شدید اضطراب۔ جب رسول اللہ ﷺ فوجی دستوں کو (ادھر ادھر قبائل میں) بھیجتے تھے تو کچھ منافق مدینہ میں جھوٹی خبریں پھیلاتے تھے کبھی کہتے جن لوگوں کو بھیجا گیا تھا وہ مارے گئے یا شکست کھا کر بھاگ کھڑے ہوئے، کبھی کہتے عنقریب دشمن مسلمانوں پر مدینہ میں حملہ کرنے والا ہے۔ کلبی نے کہا وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں کوئی بری بات پھیل جائے وہ جھوٹی خبریں اڑاتے تھے۔

لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ تو ہم ضرور آپ کو ان کے خلاف برانگیختہ کر دیں گے یعنی حکم دے دیں گے کہ آپ ان سے قتال کریں اور ان کو جلاوطن کر دیں یا ایسی بات کا حکم دے دیں گے جس کی وجہ سے وہ دیس بدر ہونے کی خواہش پر مجبور ہو جائیں یا یہ مطلب ہے کہ ہم آپ کو ان پر مسلط کر دیں گے۔

ثُمَّ لَا يُجَاوِرُونَكَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا ۝ پھر مدینہ میں وہ آپ کے ساتھ نہیں رہ سکیں گے مگر تھوڑے وقت۔ آخر ان کو شہر بدر ہونا پڑے گا یا مارے جائیں گے۔

مَلْعُونِينَ (وہ بھی ہر طرف سے) پھٹکارے ہوئے۔

أَيْنَمَا ثُقِفُوا أُخِذُوا وَقُتِّلُوا تَقْتِيلًا ۝ جہاں ملیں گے ان کی پکڑ دھکڑ ہو گی اور مار دھاڑ پڑے گی۔

مَلْعُونِينَ حالت نصب میں ہے۔ منافقوں کی مذمت کی گئی ہے (گویا کلام اس طرح تھا) أَذُمُّ مَلْعُونِينَ میں ملعونوں کو مذموم قرار دیتا ہوں یا حال ہونے کی بنا پر یہ لفظ منصوب ہے اور استثناء کے ذیل میں ہے اصل کلام اس طرح تھا لَا يُجَاوِرُونَكَ إِلَّا مَلْعُونِينَ آپ کے ساتھ نہ رہ سکیں گے مگر ملعون ہونے کی حالت میں، تَقْتِيل باب تفعیل کثرت قتل پر دلالت کر رہا ہے۔

سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلُ ۖ اقوام گزشتہ میں اللہ نے (یہی) ضابطہ جاری کر دیا تھا۔ یعنی جو لوگ انبیاء سے منافقانہ سلوک کرتے تھے اور سنسنی خیز خبریں پھیلا کر انبیاء کے مشن کو کمزور کرنا چاہتے تھے ان کو قتل کرنے کا ضابطہ اللہ نے مقرر کر دیا تھا۔

وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ۝ اور اللہ کے ضابطہ میں آپ ہرگز تبدیلی نہیں پائیں گے یعنی نہ وہ خود اپنا دستور بدلتا ہے اور نہ کسی میں طاقت ہے کہ اس کے ضابطے کو بدل دے۔

يَسْأَلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ ۖ لوگ آپ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں یعنی قیامت کا مقررہ وقت دریافت کرتے ہیں اور یہ سوال مشرکوں کی طرف سے انکاری استہزاء کے طور پر تھا اور یہودیوں کی طرف سے عداوت کی وجہ سے یا بطور آزمائش تھا کیونکہ توریت اور تمام کتب الٰہیہ میں وقوع قیامت کا کوئی مقررہ وقت نہیں بتایا گیا ہے۔

قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِندَ اللَّهِ ۚ آپ کہہ دیجئے کہ قیامت (کی تعیین) کا علم تو اللہ ہی کے پاس ہے۔ یعنی قیامت کا علم اللہ نے نہ کسی نبی کو عطا کیا نہ فرشتہ کو۔ اس کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔

وَمَا يُدْرِيكَ اور (جب اللہ نے نہیں بتایا تو) کون چیز آپ کو بتا سکتی ہے۔

لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُونُ قَرِيبًا ۝ شاید وہ گھڑی قریب ہی ہو۔ وہ گھڑی یعنی قیامت۔ جو چیز ضرور آنے والی ہے وہ قریب ہے (خواہ کتنی ہی مدت کے بعد آئے، مترجم) لعل ظاہر کر رہا ہے کہ قیامت کا آنا ضروری اور لازم ہے (اللہ کی طرف سے کلمہ امید یعنی لعل کا استعمال شک و شبہ کو ظاہر نہیں کرتا ہے بلکہ لازم الوقوع ہونے کو بتاتا ہے۔ مترجم) اس جملہ میں ان لوگوں کے لئے تہدید ہے جو بطور استہزاء و تکذیب) قیامت کے جلد آجانے کے طلب گار تھے اور ان لوگوں کو

خاموش کر دیا گیا ہے جو محض ضد کی وجہ سے منکر تھے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَاَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا ۝ اللہ نے کافروں کو اپنی (اخروی) رحمت سے دور کر دیا ہے اور ان کے لئے سخت بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔

خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۚ اس آگ کے اندر ہمیشہ رہنا ان کے لئے مقدر کر دیا گیا ہے۔

لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝ نہ وہ اپنا کوئی دوست پائیں گے (جو ان کو عذاب سے بچا سکے) اور نہ کوئی مددگار پائیں گے (جو عذاب کو دفع کر سکے)

يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ جس روز کہ آگ کے اندر ان کے چہروں کو الٹ پلٹ کیا جائے گا۔ جیسا کہ گوشت کے بھوننے کے وقت کیا جاتا ہے۔ وُجُوْه (چہرے) سے مراد یا تو پورا جسم ہے (جزء بول کر کل مراد لیا گیا ہے) یا چہرہ کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے کہ جسم کے سارے اعضاء (ظاہری) میں چہرے کو اعلیٰ مقام حاصل ہے۔

يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَآ اَطَعْنَا اللّٰهَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلَا ۝ وہ کہتے ہوں گے اے کاش ہم نے (دنیا میں) اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کی ہوتی (تو آج اس عذاب میں مبتلا نہ ہوتے) لفظ یا صرف تنبیہ کے لئے ہے یا منادیٰ محذوف ہے اصل کلام اس طرح تھا، اے لوگو! کاش ہم نے اطاعت کی ہوتی تو آج اس الخ۔

وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ۝ اور وہ کہیں گے اے ہمارے رب ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کے کہے پر چلے (یعنی وہ ہمارے لیڈر تھے جنہوں نے ہمارے لئے کفر کا طریقہ ایجاد کیا اور ہم اس طریقے پر چلے) سو انہوں نے ہم کو راہ سے بھٹکا دیا یعنی راہ کفر کو پر فریب بنا کر دکھایا اور سیدھے راستہ سے بھٹکا دیا۔)

رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ۝ (جتنا عذاب تو نے ہم کو دیا اس سے) دوگنا عذاب ان کو دے (ایک گمراہ ہونے کا دوسرا گمراہ کرنے کا) اور ان پر سخت ترین پھٹکار برسا۔ بڑی لعنت سے مراد ہے سخت ترین لعنت۔ ع ۵

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ۭ

اے ایمان والو ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے موسیٰ کو دکھ پہنچایا تھا پھر ان کی کہی ہوئی بات سے اللہ نے موسیٰ کی برأت ظاہر فرما دی۔

کہا گیا ہے کہ یہ واقعہ وہی تھا جو حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا موسیٰ بڑے حیادار شریف النفس اور اپنے (اندرونی) جسم کو چھپانے والے تھے انتہائی شرم کی وجہ سے وہ اپنی (اندرونی) جلد بھی ظاہر نہیں کرتے تھے۔ بنی اسرائیل میں سے بعض لوگوں نے کہا موسیٰ جو اتنا اپنے بدن کو چھپائے چھپائے رکھتے ہیں ضرور ان کو کوئی جلدی اندرونی بیماری ہو گی یا برص ہے یا خصیوں میں پانی آ گیا ہے یا کوئی اور مرض ہے اللہ نے موسیٰ کو اس غلط بات سے پاک ظاہر کرنا چاہا جس کی صورت یہ ہوئی کہ ایک روز غسل کرنے کے لئے موسیٰ نے تنہائی میں کپڑے اتار کر ایک پتھر پر رکھے پھر غسل کیا غسل کے بعد جب کپڑے لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو پتھر آپ کے کپڑے لے کر بھاگا آپ اپنی لاٹھی لے کر پتھر کے تعاقب میں دوڑے اور کہنے لگے پتھر میرے کپڑے، پتھر میرے کپڑے۔ آخر پتھر بنی اسرائیل کی ایک جماعت تک پہنچ کر ٹھہر گیا لوگوں نے آپ کو برہنہ دیکھ لیا آپ کا اندرونی بدن بہت خوبصورت اور بے عیب پایا اس طرح اللہ نے ان لوگوں کی (بدگمانی سے) موسیٰ کی برأت ظاہر کر دی۔ موسیٰ نے کپڑے لے کر پہن لئے اور لاٹھی سے پتھر کو مارنے لگے۔ خدا کی قسم لاٹھی کی ضرب سے پتھر پر تین چار یا پانچ نشان پڑ گئے۔ آیت يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا سے یہی مراد ہے۔

رواہ البخاری والترمذی واحمد وابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم وابن مردویہ وعبدالرزاق وعبد بن حمید۔

ابوالعالیہ نے کہا آیت مذکورہ میں قارون کے قصہ کی طرف اشارہ ہے، قارون نے ایک عورت کو اجرت دے کر اس

بات کے لئے مقرر کیا کہ وہ بر سر عام مجمع کے سامنے موسیٰ پر اپنے ساتھ زنا کرنے کی تہمت لگائے لیکن اللہ نے اس تہمت سے موسیٰ کو محفوظ رکھا اور ان کی تہمت تراشی سے آپکو بچالیا، اور قارون کو ہلاک کر دیا۔ سورۂ قصص میں اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ موسیٰ کو اذیت دینے سے یہ مراد ہے کہ حضرت ہارون نے تیہ میں جب وفات پائی تو لوگوں نے موسیٰ پر تہمت لگائی کہ آپ نے ہارون کو قتل کیا ہے اللہ نے فرشتوں کو حکم دیا فرشتے حضرت ہارون کا جنازہ لے کر بنی اسرائیل کے سامنے لائے اس وقت لوگوں کو یقین آیا کہ موسیٰ نے ہارون کو قتل نہیں کیا۔

اخرجہ ابن منیع وابن جریر ابن المنذر وابن ابی حاتم وابن مردویہ والحاکم عن ابن عباس عن علی بن ابی طالب بخاری نے حضرت عبداللہ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کچھ مال لوگوں کو تقسیم کیا ایک شخص کہنے لگا یہ تقسیم لوجہ اللہ نہیں ہوئی۔ میں نے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس بات کی اطلاع پہنچادی۔ سنتے ہی حضور گرامی ﷺ اتنے ناراض ہوئے کہ غصہ کی علامت چہرہ مبارک پر نمودار ہو گئی، پھر فرمایا اللہ موسیٰ پر اپنی رحمت فرمائے ان کو اس سے زیادہ ایذا پہنچائی گئی اور انہوں نے صبر کیا۔

وَكَانَ عِندَ اللَّهِ وَجِيهًا ۝ اور موسیٰ اللہ کے نزدیک آبرو والے تھے۔

وَجَاہت آبرو، وجیہ آبرو دار (منہ والا) حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا حضرت موسیٰؑ اللہ کے نزدیک اس مقام پر تھے کہ جو مانگتے تھے اللہ عطا فرمادیتا تھا۔ کذا قال الحسن۔ بعض نے کہا وجیہ ہونے سے یہ مراد ہے کہ وہ اللہ کے محبوب اور مقبول بارگاہ تھے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ۝ اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور درست بات کہو۔ یعنی اللہ کو جو بات ناپسند ہے اس سے پرہیز کرو۔ ایذاء رسول کا تو ذکر ہی کیا ہے حضرت ابن عباسؓ نے سَدِیدًا کا ترجمہ کیا صحیح بات۔ قتادہ نے کہا انصاف کی بات۔ بعض نے کہا سیدھی بات۔ کچھ لوگوں نے کہا حق تک پہنچنے کا قصد رکھنے والی بات۔ تمام اقوال کا نتیجہ ایک ہی ہے یعنی سچی بات جو قطعاً جھوٹی نہ ہو اور نہ اٹکل پر مبنی ہو۔ کیونکہ جھوٹ فنا ہو جاتا ہے اور سچ باقی رہتا ہے۔

بعض لوگوں نے کہا آیت میں بازداشت ہے اس بات سے جو حضرت زینب کے معاملہ میں لوگوں نے ناحق بغیر کسی اعتدال کے اختیار کرلی تھی اور ممانعت ہے حضرت عائشہؓ پر بہتان تراشی کے واقعہ کی۔ عکرمہ نے کہا قول سدید لا الٰہ الا اللہ ہے۔

يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ اللہ درست کر دے گا تمہارے لئے تمہارے اعمال۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا یعنی تمہاری نیکیاں قبول فرمالے گا۔ مقاتل نے کہا تمہارے اعمال کو پاک کر دے گا یعنی قبول ہونے اور ثواب پانے کے قابل بنادے گا۔ بعض نے کہا اصلاح عمل سے یہ مراد ہے کہ تم کو نیک اعمال کی توفیق دے گا۔

وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔ یعنی تمہارے قول و عمل کی استقامت کو گناہوں کا کفارہ بنادے گا۔

وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا ۝ اور جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرے گا وہ بڑی کامیابی حاصل کرے گا یعنی دنیا میں بھی قابل ستائش حالت میں رہے گا اور آخرت میں بھی خوش نصیب ہوگا۔

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ۝ واقعہ یہ ہے کہ ہم نے آسمانوں اور زمین کے اور پہاڑوں کے سامنے امانت (کا بار اٹھانے کے لئے) رکھا لیکن سب نے اٹھانے سے انکار کر دیا اور ڈر گئے اور انسان نے اس امانت کو اٹھالیا۔ بے شک وہ ظالم اور جاہل ہے۔

اس آیت کی تشریح میں چند امور تنقیح طلب ہیں (۱) امانت سے کیا مراد ہے (۲) آسمانوں سے اور زمین سے اور پہاڑوں سے مراد کیا آسمان زمین اور پہاڑ ہی ہیں یا ان کے باشندے۔ باشندے بھی مراد ہو سکتے ہیں جیسے وَاسْئَلِ الْقَرْيَةَ میں اہل القریہ مراد ہیں (۳) پیش کرنے سے خطاب مقالی مراد ہے یا حالی (۴) اٹھانے اور انکار کرنے سے کیا مراد ہے؟

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا امانت سے مراد ہے طاعت اور وہ فرائض جو اللہ نے بندوں پر فرض کئے ہیں۔ اللہ نے زمین آسمان اور پہاڑوں پر یہ فرائض پیش کئے اور فرمایا اگر تم ان فرائض کو ادا کرو گے تو اللہ تم کو اجر دے گا ادا نہ کرو گے تو عذاب دے گا۔

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا امانت سے مراد ہے نماز ادا کرنا، زکوٰۃ دینا، رمضان کے روزے، بیت اللہ کا حج، صدق مقال، ناپ تول میں انصاف اور ان سب سے زیادہ سخت امانتوں کی حفاظت۔ مجاہد نے کہا امانت سے مراد ہے ادائے فرائض اور حفاظت دین۔ ابو العالیہ کے نزدیک تمام اوامر و نواہی مراد ہیں۔

زید بن اسلم نے کہا امانت سے مراد ہے روزہ، غسل جنابت اور اندرونی شرائع (جیسے حسد نہ کرنا، دل میں مسلمان سے عداوت نہ کرنا، حب جاہ و مال نہ رکھنا وغیرہ تمام اخلاق باطنہ) یعنی جن میں ریاکاری کا کوئی دخل نہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ نے فرمایا انسانی جسم میں سب سے پہلے شرمگاہ بنائی اور فرمایا یہ امانت ہے بطور ودیعت میں تیرے سپرد کرتا ہوں۔ کان بھی امانت ہے آنکھ بھی امانت ہے اور جس میں امانت (کی پاسداری) نہیں اس کے پاس ایمان نہیں۔

بعض اہل علم نے کہا امانت سے مراد ہیں لوگوں کی باہمی امانتیں اور ایفاء وعدہ۔ ہر مؤمن پر حق ہے کہ دوسرے مؤمن یا معاہد کے ساتھ دھوکہ نہ کرے نہ چھوٹے معاملہ میں نہ بڑے معاملہ میں۔ ضحاک کی روایت میں حضرت ابن عباسؓ کی طرف اس قول کی نسبت کی گئی ہے۔ ان تمام اقوال کا مآل یہ ہے کہ امانت سے مراد ہیں شرعی اوامر و نواہی اور آسمان و زمین سے مراد آسمان و زمین ہی ہیں (ان کے باشندے مراد نہیں ہیں) اور پیش کرنے سے مراد ہے خطاب لفظی مقالی (خطاب تکوینی فطری مراد نہیں ہے) بغوی نے لکھا حضرت ابن عباسؓ اور اکثر سلف کا یہی قول ہے۔

بغوی نے لکھا ہے اللہ نے زمین و آسمان سے فرمایا تھا کیا تم بار امانت کو مع ان کے لوازم کے اٹھاتے ہو؟ آسمان و زمین نے کہا لوازم امانت کیا ہے؟ اللہ نے فرمایا اگر تعمیل کرو گے تو تم کو اچھا بدلہ دیا جائے گا اگر نافرمانی کرو گے تو سزا پاؤ گے۔ آسمان و زمین نے عرض کیا (ان لوازم کے ساتھ ہم برداشت) نہیں (کر سکتے) اے رب ہم تیرے حکم کے پابند ہیں نہ ثواب چاہتے ہیں نہ عذاب۔ آسمان و زمین نے یہ بات (نافرمانی کے) خوف اور دین خداوندی کی تعظیم کی وجہ سے کہی ان کو ڈر ہوا کہ دین خداوندی کا حق ہم سے ادا نہ ہو سکے گا (تو عذاب میں مبتلا ہوں گے) یہ مطلب نہیں کہ اللہ نے بار امانت اٹھانے کا حکم ان کو دیا تھا اور انہوں نے سرتابی کی اللہ کی طرف سے عرض امانت کی برداشت اختیاری تھی لازمی نہیں تھی اگر لازمی ہوتی تو آسمان و زمین ضرور اس بار کو اٹھاتے۔

بعض اہل علم کہتے ہیں پیش کرنے سے مراد ہے لفظی خطاب لیکن آسمان و زمین اور پہاڑوں سے مراد ہیں ان کے باشندے (یعنی آسمان و زمین اور پہاڑوں کی رہنے والی مخلوق کو اللہ نے بار امانت اٹھانے کی پیش کش کی تھی) اور مضاف محذوف ہے جیسے آیت وَاسْئَلِ الْقَرْيَةَ میں اہل قریہ مراد ہیں قریہ کی زمین اور دوسری چیزیں مراد نہیں ہیں۔

بعض کا قول ہے کہ آسمان و زمین اور پہاڑوں سے (ان میں رہنے والی مخلوق مراد نہیں ہے بلکہ) عینہ آسمان و زمین اور پہاڑ مراد ہیں اور عرض سے مراد ہے فطری صلاحیت کا اعتبار اور انکار سے مراد ہے لیاقت و صلاحیت کا فقدان یعنی طبعی عدم استعداد۔ اور برداشت امانت سے مراد ہے قابلیت و استعداد جو انسان میں موجود ہے۔ باوجود فطری قابلیت کے انسان کو ظلوم و جہول اس لئے کہا گیا کہ قوت غضبیہ اور شہوانیہ کا اس پر غلبہ ہے۔ اس تفسیر پر ظلوم و جہول ہونا نقص نہ ہوگا بلکہ یہ برداشت امانت پر آمادہ کرنے والی دو اچھی صفتیں قرار پائیں گی۔

بیضاوی نے لکھا ہے کہ شاید امانت سے عقل یا تکلیف شرعی مراد ہے عقل قوت غضبیہ و شہوانیہ کی نگراں ہے۔ دونوں کو حدود شرعیہ سے آگے بڑھنے اور تجاوز کرنے سے روکتی ہے۔ شرعی احکام کا اصل مقصد ہی غضبیہ اور شہوانیہ قوتوں کو اعتدال پر لانا ہے۔ اسی تشریح کی بناء پر بیضاوی نے لکھا ہے کہ سابق آیت میں جو اطاعت کی عظمت شان کو ظاہر کیا تھا اس کی اس آیت سے تائید ہو رہی ہے۔ طاعت کو امانت کہنے کی وجہ یہ ہے کہ امانت واجب الرد ہوتی ہے۔ طاعت کا ادا کرنا بھی امانت کی طرح واجب ہے آیت کا مطلب اس صورت میں یہ ہوگا کہ طاعت قلبیہ اتنا بار ثقیل ہے کہ اگر آسمان و زمین اور پہاڑوں سے اس کو برداشت کرنے کی پیش کش کی جاتی تو وہ بھی اس بار کو اٹھانے سے انکار کر دیتے اور ڈر جاتے لیکن انسان نے اپنی جسمانی ساخت کی کمزوری اور طاقت کی کمی کے سبب اس کو اٹھالیا لامحالہ جو شخص حقوق امانت پورے پورے ادا کرے گا اور برداشت امانت کو ہر وقت پیش نظر رکھے گا وہ ضرور کامیاب ہوگا اور اس کو فلاح دارین حاصل ہوگی۔

میں کہتا ہوں اسی آیت کی مثل ایک اور آیت بھی آئی ہے فرمایا ہے۔ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (اگر پہاڑ پر ہم یہ قرآن اتارتے تو ان میں بھی خشوع پیدا ہو جاتا اور اللہ کے خوف سے وہ بھی پارہ پارہ ہو جاتے ہم لوگوں کی ہدایت کے لئے یہ مثالیں بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور کریں) بیضاوی کی اس تشریح کی صورت میں آیت زیر تشریح کا مضمون بطور مثال کے ہوگا۔ واقعہ تحقیقی کا اظہار اور اصل مکالمہ مقصود نہ ہوگا۔

کچھ لوگوں نے جمادات سے خطاب کرنے اور ان کے جواب دینے کو بعید از عقل سمجھا ہے اس لئے مجاز کا راستہ اختیار کیا ہے خواہ اس طرح کہ آسمان وغیرہ سے مراد آسمان وغیرہ کی مخلوق مراد ہو یا عرض خطاب سے مجازی مفہوم مراد ہو۔ اس استبعاد کو دور کرنے کے لئے بعض لوگوں نے کہا کہ اجرام علویہ و سفلیہ پیدا کر کے اللہ نے ان کے اندر سمجھ بھی پیدا کر دی تھی اور فرمایا تھا میں نے ایک فریضہ لازم کیا ہے جو میری اطاعت کرے گا اس کے لئے میں نے جنت پیدا کر دی ہے اور جو نافرمانی کرے گا اس کے لئے دوزخ بنادی ہے۔ اجرام مذکورہ نے جواب دیا تو نے جیسا ہم کو پیدا کیا ہے (بالاضطرار) اس کے پابند ہیں کسی (اختیاری) فریضہ کو برداشت نہیں کر سکتے اور ثواب نہیں چاہتے لیکن آدم کو پیدا کر کے بار فریضہ کی پیش کش کی تو انہوں نے اٹھالیا کیونکہ وہ یہ بار گراں اپنے نفس پر ڈال کر خود اپنے اوپر ظلم کرنے والے تھے اور انجام کی خرابی سے ناواقف تھے۔

ابن ابی حاتم نے مجاہد کا بھی تفسیری قول نقل کیا ہے اس روایت میں اتنا اور بھی ہے کہ بار امانت کو اٹھانے اور جنت سے نکالے جانے کے درمیان بس اتنی ہی مدت ہوئی جتنی ظہر و عصر کے درمیان ہوتی ہے۔

بعض اہل علم نے کہا جمادات ہمارے لحاظ سے بے عقل ہیں۔ ہماری بات نہیں سمجھتے لیکن اللہ کے فرمان کو سمجھتے ہیں اور سمجھ کر اطاعت کرتے ہیں اور سر بسجود ہو جاتے ہیں۔ اللہ نے آسمان و زمین سے فرمایا اِئْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا دونوں نے جواب دیا، اَتَيْنَا طَائِعِيْنَ۔ دوسری آیات میں وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ کچھ پتھروں سے دریا پھوٹ کر نکلتے ہیں اور کچھ پتھر اللہ کے خوف سے نیچے کو گرتے ہیں۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ میں اَلْاِنْسَانُ سے مراد حضرت آدم ہیں۔ اللہ نے آدم سے فرمایا تھا کہ میں نے یہ امانت آسمان زمین اور پہاڑوں کے سامنے رکھی لیکن سب نے اٹھانے سے انکار کر دیا کیا تو اس کو مع اس کے لوازم لے لے گا۔ آدم نے عرض کیا اے میرے رب اس کے لوازم کیا ہیں۔ اللہ نے فرمایا اگر تو نیکی کرے گا تو اس کا ثواب پائے گا اور بدی کرے گا تو عذاب میں پکڑا جائے گا۔ آدم نے امانت کو اٹھالیا اور عرض کیا میں اس بوجھ کو اپنے کاندھے پر لیتا ہوں اللہ نے فرمایا جب تو نے اس امانت کو قبول کر لیا ہے تو میں بھی تیری مدد کروں گا۔ تیری آنکھوں کے اوپر ایک نقاب ڈال دوں گا تاکہ ناجائز چیز پر نظر پڑنے کا جب تجھے ڈر ہو تو آنکھ پر نقاب ڈال لے۔ (یعنی پلکیں جھکالے اور آنکھیں بند کرلے) اور تیری زبان کے لئے دو

جبڑے اور ایک قفل بنادوں گا تجھے جب (ناجائز بات زبان سے نکلنے کا) اندیشہ ہو تو قفل بند کر لینا اور میں تیری شرمگاہ کے لئے لباس مقرر کر دوں گا تو شرمگاہ کو اس کے سامنے نہ کھولنا جس کے سامنے کھولنا میں نے حرام کر دیا ہے۔

مجاہد نے کہا برداشت امانت کے وقت اور جنت سے نکالے جانے کے وقت کی درمیانی مدت صرف اتنی ہوئی جتنی ظہر و عصر کے درمیان ہوتی ہے۔

میں کہتا ہوں برداشت امانت کے بعد جنت سے نکالے جانے کی وجہ شاید یہ ہو کہ جنت اداء امانت (یعنی عمل) کا مقام نہیں ہے بلکہ اداء امانت کے ثواب کا مقام ہے (دار العمل نہیں دار الجزاء ہے) اس لئے حضرت آدم کو جنت سے نکال کر دنیا میں بھیج دیا گیا۔ دنیا آخرت کی کھیتی ہے (جو دنیا میں بوتے ہیں اس کا نا آخرت میں ہے)

بغوی نے لکھا ہے نقاش نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن مسعودؓ کا قول نقل کیا ہے کہ امانت کو اس بھاری پتھر سے تشبیہ دی گئی جو کسی جگہ پڑا ہو۔ آسمانوں کو زمین کو اور پہاڑوں کو اس کے اٹھانے کی دعوت دی گئی لیکن کوئی اس کے قریب بھی نہیں آیا اور سب نے کہہ دیا ہم میں اس کو اٹھانے کی طاقت نہیں پھر بغیر دعوت کے آدم آگئے اور انہوں نے پتھر کو ہلا کر کہا اگر مجھے اس کو اٹھانے کا حکم دیا گیا تو میں اس کو اٹھا لوں گا اللہ نے فرمایا اٹھاؤ آدم اس کو اٹھا کر زانو تک لے آئے پھر رکھ دیا اور کہا خدا کی قسم اگر میں زیادہ اٹھانا چاہوں تو اٹھا سکتا ہوں۔ آسمان و زمین نے کہا اٹھاؤ۔ آدم نے اس کو اٹھا کر اپنے کاندھے پر رکھ لیا اور پھر اتار کر نیچے رکھ دینے کا ارادہ کیا۔ اللہ نے فرمایا ہرگز اس کو نیچے نہ رکھو یہ تمہاری اور تمہاری اولاد کی گردن میں قیامت تک بندھا رہے گا۔

زجاج اور دوسرے اہل معانی نے بیان کیا ہے کہ امانت سے مراد طاعت ہے خواہ طبعی (فطری) ہو یا اختیاری اور عرض امانت سے مراد ہے طلب طاعت خواہ طاعت اختیاری ہو یا ارادۂ تکوینی ہو اور حمل امانت سے مراد ہے امانت میں خیانت کرنا اور اداء امانت سے باز رہنا۔ جو شخص امانت کو ادا نہ کرے اور امانت کی ذمہ داری سے سبکدوش نہ ہو اس کو حامل امانت اور متحمل امانت (امانت کو اٹھانے والا) کہا جاتا ہے۔ اس صورت میں برداشت امانت سے انکار کا مستحق ہو گا بقدر امکان امانت کو ادا کرنا۔ رہا ظلوم و جہول ہونا تو خیانت اور قصور ادا کی وجہ سے اس کو ظلوم و جہول کہا گیا۔ اللہ نے فرمایا ہے يَحْمِلُوْنَ اَثْقَالَهُمْ وہ اپنا بار اپنے اوپر اٹھائیں گے اس تفسیر کی بنیاد پر حسن کا ایک قول روایت میں کیا ہے کہ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ میں اَلْاِنْسَان سے مراد کافر اور منافق ہیں جنہوں نے امانت الٰہیہ میں خیانت کی ہے۔ بغوی نے لکھا ہے سلف کا اول قول ہے (کہ امانت سے طاعت اور شرعی تکالیف مراد ہیں۔)

میں کہتا ہوں آیت کی رفتار بتا رہی ہے کہ امانت کا حامل صرف انسان ہے۔ اب اگر امانت سے مراد طاعت اور شرعی تکالیف ہوں گی تو انسان کی کوئی خصوصیت نہیں رہے گی جن اور ملائکہ بھی مکلف شرعی ہیں بلکہ انسانوں پر ملائکہ کی فضیلت لازم آئے گی کیوں کہ ملائکہ تو معصوم ہیں امانت کو کامل طور پر ادا کر رہے ہیں۔ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ رات دن اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں۔ سست نہیں پڑتے اور انسانوں میں سے کچھ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ اپنے اوپر ظلم کرنے والے ہیں۔ اور کچھ مُقْتَصِدٌ میانہ چال سے چلنے والے اور کچھ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بھلائیوں کی طرف پیش قدمی کرنے والے۔ اس لئے صوفیہ نے کہا کہ امانت سے مراد ہے نور عقل اور نار عشق۔ عقل کی روشنی میں منطقی استدلال کے ساتھ معرفت قلبیہ کا حصول ہوتا ہے اور آتش عشق سے سارے درمیانی حجابات سوختہ ہو جاتے ہیں۔ ملائکہ مقربین بارگاہ ضرور ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک کا ایک مقام قرب و معرفت معین ہے وہ اپنے مقام سے ترقی نہیں کر سکتے۔ اللہ نے فرمایا ہے وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ہماری طرف سے ہر ایک کا مرتبہ مقرر ہے ہاں نور عشق تمام حجابات بُعد کو جلا ڈالتی ہے اور صرف انسان معرفت کے غیر متناہی مراتب میں ترقی کر سکتا ہے۔

میں نے حضرت مجدد الف ثانیؒ کے کلام سے یہ استفادہ کیا ہے کہ امانت تجلیات ذاتیہ کو قبول کرنے کی وہ استعداد ہے جو

اللہ نے ماہیت انسانیہ میں ودیعت رکھی ہے۔ ایمان اور نیک اعمال کے بعد جن کا الحاق اور شمار ملائکہ میں ہو سکتا ہے اور تجلیات صفاتیہ کو قبول کرنے کی اس میں استعداد ہو سکتی ہے لیکن ذاتی تجلی کی برداشت تو صرف اسی میں ہو سکتی ہے جس کا مزاج خاکی ہو اسی استعداد نے آدم کو مستحق خلافت بنایا اور یہی استعداد مراد ہے اس علم سے جس کا اظہار آیت اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ میں کیا ہے یعنی اللہ نے ملائکہ سے فرمایا کہ میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے کہ تجلی ذاتی کو وہی برداشت کر سکتا ہے جس کا مزاج خاکی ہو اسی کی طرف اشارہ ہے۔ لفظ ظلوم وجہول سے یعنی انسان کو سبعی قوت بھی دی گئی ہے اور بہیمی قوت بھی۔ سبعی قوت کا تقاضا ہے بلند چوٹیوں پر چڑھنا۔ بلند سے بلند مراتب معرفت کی طرف ترقی کرتا چلا جانا اور بہیمی قوت انسان کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وصل محبوب کے لئے سخت ریاضتیں اور مشقتیں وہ برداشت کر سکے ظلوم وجہول ہونا انسان کی صفت محمودہ ہے اور مستحق خلافت بنا دینے کی علت ہے سبعی اور بہیمی قوتیں ارضی مزاج رکھتی ہیں۔

موجودات ارضی اپنی مزاجی کثافت کی وجہ سے نور آفتاب کو جذب کر کے اپنے اندر روک لیتے ہیں اور لطیف اجرام میں جذب نور کر کے روک رکھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ مادۂ ارضی اپنی کثافت کی وجہ سے تجلی ذاتی کو برداشت کرنے کی قابلیت رکھتا ہے۔ مادۂ نوری اس قابلیت سے محروم ہے ملائکۂ مقربین کے مقامات قرب محدود ہیں اگرچہ ملائکہ کے قرب ولایت (اتصال) کا مرتبہ انبیاء کے مقام قرب و ولایت سے بالا ہے کیونکہ ملائکہ کا مرتبۂ ولایت اور انبیاء کا مرتبۂ ولایت دونوں صفات سے مستفاد ہیں مگر انبیاء کے مرتبہ میں ظہور کی حیثیت معتبر ہے یعنی ذات کے ساتھ صفات کا قیام ملحوظ نہیں اور ملائکہ کے مرتبۂ ولایت میں بطون کی حیثیت معتبر ہے یعنی ذات کے ساتھ صفات کا قیام ملحوظ ہوتا ہے۔

لیکن تجلی ذاتی جو نبوت کا کمال ہے ملائکہ کو میسر نہیں اس لئے نبوت انسان کے ساتھ مخصوص ہے اور انبیاء کے خواص ملائکہ کے خواص سے افضل ہیں اور جنت صرف انسانوں کے لئے پیدا کی گئی ملائکہ کا جنت میں ہر دروازہ سے داخلہ انسانوں کے احترام کے لئے ہوگا۔

جو علماء امانت سے شرعی اوامر و نواہی مراد لیتے ہیں اور امانت اٹھانے سے مراد اوامر و نواہی کو اختیار کے ساتھ قبول کرنا قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک ظلوم وجہول ہونے کا مطلب ہے کہ انسان نے اپنے اوپر خود ظلم کیا بڑی سخت مشقت کو برداشت کیا اور اس انجام بد سے ناواقف رہا جو ادائے امانت نہ کرنے کی صورت میں اس کا ہوگا لیکن یہ دونوں باتیں انسان کی مذمت کو ظاہر نہیں کر رہی ہیں بلکہ ایک واقعی امر کو بیان کر رہی ہیں۔ بیضاوی نے اس آیت کو سابق الذکر وعدہ کی تائید قرار دیا اور مطلب اس طرح بیان کیا کہ امانت اتنا عظیم بار ہے کہ اگر بزرگ ترین اجسام بالفرض باشعور ہوتے تو وہ بھی اٹھانے سے انکار کر دیتے اور اٹھا نہ سکتے لیکن انسان نے باوجود اپنی جسمانی کمزوری کے اس کو اٹھا لیا اس لئے جو شخص اس امانت کے حقوق کی نگہداشت کرے گا وہ دونوں جہاں میں کامیاب ہوگا اس مطلب پر بیضاوی کے نزدیک اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا سے یہ مراد ہوگی کہ انسان نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا اور حق امانت کا لحاظ نہیں رکھا اور حقیقت امانت کے نتیجہ سے ناواقف رہا۔ یہ دونوں برے اوصاف جنس انسان کے قرار دیئے (لیکن کل افراد کے نہیں بلکہ) عام طور پر زیادہ افراد کے (کیونکہ بعض افراد یعنی انبیاء اولیاء اور مؤمنین صالحین نے تو امانت کے پورے حقوق ادا کئے اور وعدہ پورا کیا)

مصنف بحر مواج نے لکھا ہے کہ انسان نے اپنے نفس کو اس چیز کے ادا کرنے پر قادر خیال کیا جس کو ادا کرنے سے آسمان و زمین خوف زدہ ہو گئے اس اعتبار سے انسان ظلوم قرار پایا اور چونکہ ادائے امانت سے اپنے عاجز رہنے سے وہ ناواقف تھا اس لئے جہول قرار پایا۔

میرے نزدیک یہ تشریح ناپسندیدہ ہے کیونکہ الانسان سے مراد حضرت آدمؑ ہیں اور آدم ہی نے بار امانت اٹھایا تھا اور آدم نبی معصوم تھے انہوں نے جو بوجھ اٹھایا تھا اس کو پورا پورا ادا کر دیا اور اِنَّهٗ کی ضمیر کا رجوع اسی شخص کی طرف ہے جس نے بار امانت اٹھایا تھا (یعنی حضرت آدم علیہ السلام)

صوفیہ نے انسان کے ظلوم وجہول ہونے کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ انسان کے اکثر افراد نے اپنے نفوس پر ظلم کیا معرفت اور تجلیات الٰہیہ کی اس استعداد کو کھو دیا جو فطرت اللہ ہے۔ اللہ نے سب لوگوں کو اس فطرت پر پیدا کیا ہے۔ اکثر انسان انتہائی نادان بھی ہیں جو چیز فوت ہو گئی اس کی خوبی سے ناواقف ہیں اور جو کمایا اس کی خرابی سے لاعلم ہیں۔

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہر پیدا ہونے والا بچہ سرشت پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ الحدیث متفق علیہ من حدیث ابی ہریرۃ۔

میں کہتا ہوں یہ بات معلوم ہو گئی کہ بطور کنایہ ظلم سے مراد قوت سبعیہ (غضبیہ) ہے اور جہالت سے مراد قوت بہیمیہ (شہوانیہ) ہے اور ان دونوں قوتوں کی اچھائی برائی مصرف کے تنوع کے لحاظ سے ہے۔ قوت سبعیہ کا استعمال اگر اللہ کے دشمنوں کو دفع کرنے اور مدارج قرب تک پہنچنے اور مراتب معرفت میں ترقی کرنے کے لئے کیا جائے تو یہ قوت مستحسن قرار پاتی ہے اللہ نے فرمایا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اس کے راستہ میں اس طرح صف بند ہو کر لڑتے ہیں جیسے وہ سیسہ پلائی ہوئی مضبوط دیوار ہیں۔ بلاشبہ اللہ بلندی عزم اور رفعت ہمت کو پسند فرماتا ہے۔ لیکن اگر اسی قوت کا استعمال بے قصور لوگوں پر جبر و ظلم کرنے اور اللہ کے مقابلہ میں تکبر و غرور کرنے کے لئے کیا جائے تو یہ قوت قبیح قرار پاتی ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ خوب سن لو کہ ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے۔ وَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ اور اللہ ہر اترانے والے شیخی جتانے والے کو پسند نہیں کرتا۔

اسی طرح قوت بہیمیہ کا استعمال حصول سعادت کے لئے کیا جائے تو یہ قوت اچھی ہے اور اگر فانی لذتوں کے حصول کے لئے کیا جائے تو بری ہے اللہ نے فرمایا ہے۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ۔

اور یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ان دونوں قوتوں کے استعمال و صرف کی اچھائی کا مدار نفس و قلب کے تزکیہ اور عناصر کی تطہیر پر ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے بنی آدم کے جسم کے اندر ایک بوٹی ایسی ہے کہ جب وہ ٹھیک ہوتی ہے تو سارا جسم ٹھیک ہوتا ہے اور جب وہ بگڑتی ہے تو سارا بدن بگڑ جاتا ہے خوب سن لو وہ بوٹی دل ہے، رواہ البخاری۔ اللہ نے فرمایا ہے۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا جس نے نفس کو پاک کر لیا وہ فلاح یاب ہو گیا اور جس نے نفس کو میل آلود اور گندہ کر دیا وہ نامراد رہا اور یہ بھی صحیح ہے کہ شریعت کے اوامر و نواہی کی پابندی تطہیر نفس کا ذریعہ ہے۔ اب اگر امانت سے مراد شرعی اوامر و نواہی ہوں تو ظلوم و جہول ہونے سے اشارہ ہو گا اس علت کی طرف جس کی وجہ سے انسان پر بار امانت ڈالا گیا اور اس نے اس بوجھ کو اٹھایا ہے، اس صورت میں مطلب اس طرح ہو گا کہ انسان چونکہ ظلوم و جہول تھا اس لئے ہم نے اس پر بار امانت ڈالا اور اس نے اٹھا لیا تاکہ بری خصلتوں سے اس کی تطہیر ہو جائے اور اعلیٰ فضائل حاصل کرنے کی اس میں صلاحیت ہو جائے اور دونوں جہاں میں وہ بامراد ہے۔ اور اگر امانت سے مراد تجلیات ذاتیہ ہوں تو مطلب اس طرح ہو گا کہ چونکہ انسان ظلوم و جہول تھا اس لئے وہی اس امانت کو اٹھانے کے قابل تھا اس امانت کو برداشت کرنے کا وہی اہل ہو گا جو ان دونوں اوصاف کا حامل ہو۔

امانت سے مراد طاعت و فرائض ہوں یا معرفت اور مراتب قرب کا حصول بہر حال سبعیہ اور بہیمیہ قوتیں اچھی بھی ہیں اور بری بھی اگر نفس کا تزکیہ نہ کیا اور اللہ کی طرف سے انسان کو بے مدد چھوڑ دیا گیا اور باطل میں ان قوتوں کو مشغول رکھا گیا تو یہ قوتیں بری ہیں اور اگر اس کے خلاف ان قوتوں سے کام لیا تو یہ قوتیں اچھی ہیں۔

دونوں صورتوں میں ان قوتوں کی عطاء کو بار امانت انسان پر لادنے اور اس بوجھ کو اٹھانے کی علت قرار دینا بالکل صحیح ہے۔

لِيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ کہ اللہ منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو عذاب دے۔

لِيُعَذِّبَ میں لام عاقبت کا ہے یعنی اس برداشت امانت کا انجام یہ ہو گا کہ اللہ عذاب دے گا جیسے ایک مصرع ہے لدوا

للموت و ابنو للخراب مرنے کے لئے جنم دو اور ویران ہونے کے لئے تعمیر کرو۔ یعنی پیدائش کا نتیجہ موت اور تعمیر کا انجام ویرانی ہے۔

منافق اور مشرک ہی ظلم اور عیش میں ڈوبے رہتے ہیں اور یہ ہی امانت مفوضہ کو کھو دینے والے ہیں اس لئے انھیں عذاب دیا جائے گا۔

وَيَتُوبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنٰتِ اور اللہ (اپنی رحمت، مغفرت اور عطاء قرب کے ساتھ) مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں کی طرف متوجہ ہو۔ مؤمن ہی امانت کا حق ادا کرنے اور تجلیات الٰہیہ میں ڈوب جانے والے ہیں اس لئے انھیں کی مغفرت اور انھیں پر رحمت الٰہیہ کی بارش ہوگی۔

ابن قتیبہ نے آیات کا مطلب اسطرح بیان کیا ہم نے امانت یعنی شرعی تکلیفات یا فطری استعداد کو پیش کیا تاکہ منافق کا نفاق اور مشرک کا شرک ظاہر ہو جائے اور اللہ ان کو عذاب دے اور مؤمن کے ایمان (نیز عارف کی معرفت) کا اظہار ہو جائے اور اللہ ان پر رحم فرمائے اور اگر کسی طاعت میں ان سے قصور ہو جائے تو ان کو بخش دے۔ (میں کہتا ہوں) اور دوامی تجلیات ذاتیہ کی بارش اور بلا کیف وصل بے حجاب کی نعمت ان کو نصیب ہو جائے۔

وعدہ کے موقع پر یَتُوبَ کہنے سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ چوں کہ سرشت کے لحاظ سے انسان ظلوم و جہول ہے اس لئے کچھ قصور ان سے ضرور ہوگا۔

وَكَانَ اللّٰهُ غَفُورًا اور اللہ (مومنوں کو) بخشنے والا ہے۔ ان کی لغزشوں کو وہ معاف کرتا ہے۔

رَّحِيمًا ۝ بڑا مہربان ہے کہ اپنی مہربانی سے مومنوں کی طاعت کا ثواب عطا فرمائے گا۔

الحمد اللہ سورۂ احزاب کی تفسیر یکم محرم الحرام ۱۳۰۷ھ کو ختم ہوئی۔

اس سے آگے انشاء اللہ سورۂ سبا کی تفسیر آئے گی۔

وصلی اللہ علی محمد رسولہ والہ و اصحابہ وسلم۔

سورۂ سبا

یہ سورۃ مکی ہے اس میں ۵۴ آیات ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ تمام حمد ہے اس اللہ کے لئے کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب اسی کا ہے۔

یعنی وہی سب کا مالک اور خالق اور حاکم ہے اس لئے وہی ہر ظاہری، باطنی، جہری اور سری حمد کا مستحق ہے دوسرا کوئی حمد کا مستحق نہیں ہے۔ اللہ کے سوا دوسرے کی ستائش مجازاً کی جاتی ہے کیوں کہ اس کے ہاتھوں سے بظاہر کچھ نعمتیں دوسروں کو پہنچتی ہیں۔

وَلَهُ الْحَمْدُ فِی الْاٰخِرَةِ اور آخرت میں (بھی) حمد اسی کے لئے ہے۔ کیوں کہ آخرت کی نعمتوں کی عطاء اسی کے لئے مخصوص ہے۔

یہ جملہ پہلے جملہ پر معطوف ہے بظاہر پہلا جملہ مطلق تھا اور یہ جملہ آخرت کے ساتھ مقید ہے (پہلے جملہ میں مطلق حمد اللہ کے لئے ثابت کی گئی تھی اور اس جملہ میں ثبوت حمد صرف آخرت میں خدا کے لئے ثابت کیا گیا ہے) اور مقید کا عطف مطلق پر (بے سود ہوتا ہے اس لئے) کا جائز ہے (مطلق کے اندر مقید کا ہر فرد آجاتا ہے اس لئے مقید کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں رہتی)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ پہلے جملہ میں مطلق حمد مراد نہیں ہے بلکہ صرف دنیوی نعمتوں کی عطاء پر حمد مقصود ہے۔ موصول مع صلہ (یعنی اَلَّذِیْ اور لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ) اس مفہوم کو ظاہر کر رہا ہے کہ اس دنیا کی موجودات چونکہ اللہ ہی کی ہے اس لئے یہاں وہی حمد کا مستحق ہے اور چونکہ آخرت کی نعمتیں بھی اسی کی ہیں اس لئے وہاں بھی وہی حمد کا مستحق ہوگا۔

اول جملہ میں لفظ اَلْحَمْدُ کے بعد لِلّٰهِ کا لفظ ہے کیونکہ مجازی حمد دنیا میں دوسروں کی بھی ہوتی ہے۔ اس لئے یہاں ہر حمد کا حصر اللہ کے لئے نہیں ظاہر کیا گیا ہے۔ اور دوسرے جملہ میں لَهٗ کا لفظ اَلْحَمْدُ سے پہلے ذکر کیا گیا ہے جو خصوصیت اور حصر کو ظاہر کر رہا ہے کیوں کہ آخرت میں ہر نعمت دینے والا اللہ ہی ہوگا۔ پس ہر حمد کا مستحق وہی ہوگا۔

بعض علماء کے نزدیک حمد آخرت سے مراد ہے اہل جنت کا حمد کرنا۔ اللہ نے اہل جنت کی طرف سے اظہار حمد کا ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے۔ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَاۤ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ۔ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْۤ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ

وَهُوَ الْحَكِیْمُ اور وہی حکمت والا ہے کہ اسی نے امور دین کو محکم کیا ہے۔

الْخَبِیْرُ۝ بڑا باخبر ہے چیزوں کی ظاہری اور باطنی احوال کو خوب جانتا ہے۔

یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وہ جانتا ہے اس چیز کو جو زمین کے اندر داخل ہوتی ہے مثلاً بارش کا پانی زمین کے مسامات کے اندر داخل ہوتا ہے یا مردے یا خزانے (دفینے وغیرہ)

وَمَا یَخْرُجُ مِنْهَا اور اس چیز کو جو زمین سے نکلتی ہے یعنی سبزہ، مختلف دھاتیں، کنوؤں اور چشموں سے

پانی۔ پھر قیامت کے دن مردے بھی زمین سے نکلیں گے۔
وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ اور اس چیز کو جو آسمان سے اترتی ہے جیسے بارش، کڑک کا بجلی، ملائکہ، اللہ کی کتابیں، مقادیر خلق، رزق، طرح طرح کی برکتیں اور بلائیں۔
وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا اور اس چیز کو جو آسمان میں چڑھتی ہے جیسے ملائکہ، بندوں کے اعمال اور دعائیں۔
وَهُوَ الرَّحِيمُ اور وہی بڑا مہربان ہے۔ کہ انسانوں کی ضرورت کی چیزیں نازل فرماتا ہے۔
الْغَفُورُ ﴿۲﴾ اور شکر میں بندوں سے جو قصور ہوتا ہے اس کو معاف کرنے والا ہے۔
وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَأْتِينَا السَّاعَةُ اور کافروں نے کہا ہم پر قیامت (کبھی نہیں آئے گی۔)
قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتَأْتِيَنَّكُمْ آپ کہہ دیجئے کیوں نہیں۔ اپنے رب کی قسم ضرور ضرور تمہارے لئے قیامت آئے گی۔
عَالِمِ الْغَيْبِ وہ رب جو غیب کو جاننے والا ہے۔
عَالِمِ الْغَيْبِ کے لفظ سے اس طرف اشارہ ہے کہ قیامت کا وجود امور غیبیہ میں سے ہے۔ جس کو جاننے والا سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں لہٰذا اسی کی شہادت قیامت کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے اور غیب کی چیزوں کا اقرار یا انکار کسی کے لئے بغیر اللہ کے بتائے ہوئے جائز نہیں۔
لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ اس کے علم سے کوئی چھوٹی چیونٹی کے برابر (چیز) آسمانوں میں پوشیدہ ہے نہ زمین میں۔ یعنی موجود اور گزشتہ اور آئندہ زمانہ کی کوئی چیز اس سے چھپی ہوئی نہیں ہے جو لوگ کہتے ہیں کہ آیت میں صرف وہ چیزیں مراد ہیں جو صرف زمانہ حال میں موجود ہیں (مستقبل معدوم ہے اور ماضی مفقود) یہ مفہوم مقام اور رفتار کلام کے خلاف ہے کیوں کہ اس آیت کا مفہوم تو عالم الغیب کی تاکید و تائید کر رہا ہے اور اللہ کے علمی احاطہ کو ظاہر کر رہا ہے جس سے باہر نہ کوئی گزشتہ چیز ہے نہ آنے والی۔ عالم الغیب سے تو ہمہ گیر احاطہ علمی مقصود ہے کیوں کہ قیامت آنے کا علم کا اظہار اور اثبات اسی لفظ سے کیا گیا ہے۔
اس کے علاوہ موجود فی الحال ساری اشیاء کا علم تو بعض مخلوق کو بھی ہوتا ہے۔ سورۂ انعام کی آیت تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا کی تشریح میں ہم اس کا بیان کر چکے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ دو لشکر لڑتے ہیں اور ایک ہی وقت میں مارے جاتے ہیں پھر مشرق مغرب اور اس کے درمیان کچھ لوگ مرتے ہیں۔ کچھ بچے پیٹ سے گرتے ہیں۔ ملک الموت تو ایک ہے سب کی روحیں کیسے قبض کرتا ہے۔ فرمایا ملک الموت ساری دنیا کو گھیرے ہوئے ہے۔ جیسے میرے سامنے طشت ہے اسی طرح ساری دنیا اللہ نے ملک الموت کے سامنے کر دی ہے کیا اس سے کوئی چیز چھپ سکتی ہے؟ (مفہوم الحدیث)

فائدہ

بعض اکابر پر کبھی ایسی حالت طاری ہو جاتی ہے کہ وہ زمانہ کی حدود سے خارج ہو جاتے ہیں۔ ماضی یا مستقبل ان کے سامنے آجاتا ہے اس کا ثبوت اس حدیث سے ہوتا ہے جو شیخین نے صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت سے بیان کی ہے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں سورج گرہن ہوا رسول اللہ ﷺ لوگوں کو ساتھ لے کر نماز کو کھڑے ہو گئے اور ایک طویل قیام کیا (الحدیث) اس حدیث میں آیا ہے کہ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم نے دیکھا کہ (نماز میں) اپنی جگہ کھڑے کھڑے آپ نے کسی چیز کو لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا پھر ہم نے دیکھا آپ کچھ ٹھٹکے۔ فرمایا میں نے جنت دیکھی تھی اور اس سے ایک خوشہ لینے کو ہاتھ بڑھایا تھا۔ اگر میں اس کو لے پاتا تو جب تک دنیا باقی رہتی (تم یعنی سارے مسلمان) اس کو کھاتے رہتے (اور وہ ختم نہ ہوتا) پھر میں نے دوزخ کو دیکھا آج کی طرح کبھی میں نے کوئی خوفناک منظر نہیں دیکھا۔ دوزخیوں کی زیادہ تعداد میں نے عورتوں کی دیکھی۔ الحدیث۔

ظاہر ہے کہ دوزخ میں عورتوں کا داخلہ تو قیامت کے دن ہو گا لیکن رسول اللہ ﷺ نے ان کو دوزخ کے اندر پالیا۔

ایک شبہ

جس طرح آدمی خواب میں بعض چیزیں دیکھ لیتا ہے اسی طرح عالم مثال میں رسول اللہ ﷺ نے جنت اور دوزخ کی تصویر دیکھ لی ہو گی۔

ازالہ

رسول اللہ ﷺ کا یہ قول کہ اگر میں اس کو لے پاتا تو رہتی دنیا تک تم اس میں سے کھاتے رہتے۔ بتا رہا ہے کہ آپ نے حقیقۃً جنت اور دوزخ کو دیکھا تھا تصویر نہیں دیکھی تھی۔

مسلم نے حضرت جابرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے جنت کو دیکھا اس کے اندر ابو طلحہ کی بیوی نظر آئی اور قدموں کی آہٹ میں نے اپنے سامنے سنی میں نے دیکھا تو وہ بلال تھا۔

امام احمد، ابوداؤد اور ضیاء نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب میرا رب مجھے اوپر چڑھا کر لے گیا تو میرا گزر ایسے لوگوں کی طرف سے ہوا جن کے ناخن تانبے کے تھے اور وہ اپنے چہروں اور سینوں کو ناخنوں سے کھرونچ رہے تھے۔ میں نے کہا جبرئیل یہ کون لوگ ہیں؟ جبرئیل نے کہا یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے ہیں (غیبت کرتے ہیں) اور ان کی آبروریزی کرتے ہیں۔

حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے سامنے دوزخ لائی گئی اس میں بنی اسرائیل کی ایک عورت مجھے دکھائی دی جس کو ایک بلی کی وجہ سے عذاب دیا جا رہا تھا۔ بلی کو اس نے باندھ رکھا تھا نہ تو وہ اس کو کچھ کھانے کو دیتی تھی نہ چھوڑتی تھی کہ وہ کیڑے مکوڑے کھا سکے آخر وہ بھوک سے مر گئی۔ اور میں نے عمر بن عامر خزاعی کو دیکھا جو دوزخ میں اپنی انتڑیاں گھسیٹتا پھر رہا تھا یہی شخص تھا جس نے سب سے پہلے سانڈھ چھوڑنے کی رسم نکالی۔ رواہ مسلم۔

وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝ اور نہ کوئی چیز اس سے چھوٹی ہے اور نہ کوئی بڑی ہے مگر وہ سب کتاب مبین میں موجود ہے۔

اکثر اہل تفسیر کا قول ہے کہ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ سے مراد ہے لَا يَعْزُبُ عَنْ عِلْمِهٖ یعنی اس کے علم سے غائب نہیں ہے اس لئے اگر عزوب سے علم سے غائب ہونا مراد ہو یا کتاب مبین سے علم الٰہی یا لوح محفوظ ہو تو یہ جملہ نفی عزوبیت کی تاکید ہو جائے گی کیونکہ لوح محفوظ بھی اللہ کے علم کا ایک حصہ ہے اور اگر عدم عزوب کا یہ مطلب ہو کہ اللہ کی ذات سے مخفی نہیں ہے تو یہ جملہ سابق جملہ کی تاکید نہ ہو گا بلکہ نیا جملہ ہو گا اور اصغر و اکبر مبتدا ہو گا۔ اس کی تائید اسی قرأت سے ہوتی ہے جس میں لا نفی جنس کا اور اَصْغَرَ وَ اَكْبَرَ (بفتح راء) اس کا اسم قرار دیا گیا ہے۔

اَصْغَرُ اور اَكْبَرُ کو مرفوع پڑھ کر مِثْقَالُ پر یا مفتوح پڑھ کر ذَرَّةٍ پر معطوف قرار دینا غلط ہے کیونکہ استثناء متصل اس سے مانع ہے نہ استثناء منقطع کہا جا سکتا ہے کیونکہ نفی کے بعد استثناء منقطع اثبات ہو جائے گا اس وقت عبارت اس طرح ہو گی وَلٰكِنْ يَعْزُبُ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ اور یہ مطلب غلط ہے۔ بیضاوی نے اس کے جواز کی ایک ضعیف توجیہ یہ کی ہے کہ یعزب کی ضمیر غیب کی طرف راجع ہے اور لوح محفوظ میں جو چیز محفوظ ہے وہ دائرۂ غیب سے خارج ہے کیونکہ لوح محفوظ کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے وہ ظاہر ہے ان سے غائب نہیں ہے یہ توجیہ غلط ہے۔ لوح محفوظ میں اندراج اس بات کا مقتضی نہیں ہے کہ مندرج چیز علم خدا سے خارج ہے اللہ کا علم تو ہمہ گیر ہے اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ سورۂ یونس میں یہ آیت ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے لَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ اس آیت میں بیضاوی کی مذکورہ توجیہ فاسد ہے۔

بعض اہل علم کا قول ہے کہ یہ مدح بصورت ذم ہے جیسے محاورہ میں کہا جاتا ہے کہ زید میں سوائے اس کے کوئی عیب نہیں

کہ وہ عالم ہے۔ اس صورت میں آیت کا مطلب اس طرح ہوگا کہ ذرہ برابر علم خدا سے کوئی چیز غائب نہیں سوائے اسکے کہ کتاب مبین میں اس کا علم موجود ہے جب کتاب مبین میں اس کا علم موجود ہے تو علم خدا سے وہ چیز غائب کیسے ہو سکتی ہے۔

لِّيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ۚ أُولَٰئِكَ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ۝

تاکہ اللہ ان لوگوں کو جزا دے جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے انہیں لوگوں کے لئے مغفرت ہے اور عزت کا رزق ہے۔ یعنی حقوق عبدیت کی ادائیگی میں جو کوتاہی ان سے ہو گئی ہوگی (پوری ادائیگی تو ممکن ہی نہیں) اللہ اس کوتاہی کو معاف کر دے گا اور جو نیک کام انہوں نے کئے ہیں ان کے بدلے میں اپنی مہربانی سے جنت کے اندر اچھا رزق عطا فرمائے گا۔ جس کے حاصل کرنے میں نہ تھکنا پڑے گا نہ کسی کا (سوائے خدا کے) احسان ہوگا۔

وَالَّذِينَ سَعَوْا فِي آيَاتِنَا مُعَاجِزِينَ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّن رِّجْزٍ أَلِيمٌ ۝

اور جن لوگوں نے ہماری آیات کے متعلق (ان کو باطل کرنے کے لئے) کوشش کی (ہم کو) ہرانے کے لئے ایسے لوگوں کے لئے سختی کا دردناک عذاب ہوگا۔ یعنی آیات خداوندی کو باطل کرنے اور ان کی طرف سے لوگوں کو بے رغبت اور متنفر بنانے کے لئے کوشش کرتے ہیں (مقصد یہ کہ انہوں نے اپنی روز کا میدان اسی بات کو بنا رکھا کہ اللہ کی آیات کی طرف سے لوگوں کو نفرت دلائیں ہم پر غالب آنے کے لئے (یعنی یہ بات لوگوں کو بتانے کے لئے کہ نہ کوئی قیامت ہوگی نہ حشر ہوگا اور انہوں نے فرض کر لیا ہے کہ خدا مردوں کو زندہ کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ وہ ہم کو عاجز بنا دینا چاہتے ہیں) ایسے لوگوں کیلئے بڑا دکھ دینے والا عذاب ہے۔

قتادہ نے رجز کا ترجمہ سُوْءُ الْعَذَاب کیا ہے۔ اَلِیْم کا ترجمہ ہے دکھ والا مگر مراد ہے دکھ دینے والا۔

وَيَرَى الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ الَّذِي أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ وَيَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ۝

اور جن لوگوں کو (آسمانی کتابوں کا) علم دیا گیا ہے وہ اس قرآن کو جو آپ کے رب کی طرف سے آپ کے پاس بھیجا گیا ہے۔ ایسا سمجھتے ہیں کہ وہ حق ہے اور وہ خدا غالب محمود (کی رضا) کا راستہ بتاتا ہے (ترجمہ مولانا اشرف علی رحمہ اللہ)

اَلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ سے مراد ہیں وہ اہل کتاب جو مسلمان ہو گئے تھے جیسے حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی۔ قتادہ نے کہا صحابہ کرام اور ان کی راہ پر چلنے والے مراد ہیں۔ اس تفسیر پر یہ مطلب ہوگا کہ قیامت کے دن صحابہ کرام اور دوسرے مومنین صالحین دیکھ لیں گے کہ قرآن حق ہے یعنی دلائل کی روشنی میں اب قرآن کو حق جانتے ہیں قیامت کے دن قرآن کی حقانیت کو آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔

اول الذکر مطلب کتابی علماء کے قول سے جاہلوں کے خلاف استشہاد کیا گیا ہے۔

وَیَہْدِیْ یعنی اللہ ہدایت کرتا یا قرآن ہدایت کرتا ہے۔ اِلٰی صِرَاطٍ یعنی اسلام کی طرف۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ يُنَبِّئُكُمْ إِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ إِنَّكُمْ لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ ۝

اور کافر (آپس میں) کہتے ہیں کیا ہم تم کو ایسا آدمی بتائیں جو تم کو یہ عجیب خبر دیتا ہے کہ جب تم بالکل ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے تو (اس کے بعد قیامت میں) ضرور تم ایک نئے جنم میں آؤ گے۔

قَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یعنی منکرین قیامت نے آپس میں بطور تعجب کہا۔ رَجُلٍ سے مراد ہیں رسول اللہ ﷺ یعنی ایک ایسا آدمی جو تم کو بڑی تعجب آمیز خبر دے رہا ہے۔

مُزِّقْتُمْ کُلَّ مُمَزَّقٍ یعنی جب تم مر جاؤ گے اور تمہارے جسم بالکل ریزہ ریزہ ہو جائیں گے خاک بن جائیں گے۔ اس مطلب پر کُلَّ مُمَزَّقٍ مفعول مطلق ہوگا۔ یا یہ مطلب ہے کہ ہر جگہ تم ریزہ ریزہ کر دیئے جاؤ گے اور سیلاب تم کو ادھر ادھر بہا کر لے جائیں گے اور جگہ جگہ پھینک دیں گے اس مطلب پر کُلَّ مُمَزَّقٍ مفعول فیہ ہوگا۔

اِنَّكُمۡ لَفِيۡ خَلۡقٍ جَدِيۡدٍ مقولہ ہے کیوں کہ یُنَبِّئُكُمۡ کے اندر قول کا معنی موجود ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی تو قریش میں مشہور تھی۔ کوئی شخص آپ کی حالت سے ناواقف نہ تھا اس کے باوجود کافروں نے حضور ﷺ کے لئے لفظ رَجُلٍ (بلفظ تنکیر غیر معروف) استعمال کیا۔ اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ یہ شخص غیر معروف ہے ہم اس سے واقف نہیں اس طرح طرز ادا میں تجاہل بھی ہے اور تحقیر رسول ﷺ کے ارادہ کا اظہار بھی اور مضمون کے بعید از عقل ہونے کی طرف اشارہ بھی۔

اَفۡتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَمۡ بِهٖ جِنَّةٌ کیا اس نے اللہ پر دروغ تراشی کی ہے (یعنی قصداً اللہ پر جھوٹ باندھا ہے) یا اس کو کسی قسم کا جنون ہے جو اس کے دل میں وہم ڈالتا اور زبان سے (ایسی بات) کہلواتا ہے۔

چونکہ آیت میں افتراء کے مقابل جنون کا ذکر کیا ہے اس لئے بعض لوگوں نے صدق و کذب کے درمیان ایک درمیانی واسطہ مانا ہے (جو نہ صدق ہوتا ہے نہ کذب) یعنی ایسی غلط خبر جو بے ارادہ کہہ دی جائے۔ لیکن یہ استدلال کمزور ہے کیوں کہ افتراء اور کذب باہم مساوی نہیں ہیں (کہ ہر افترا کذب ہو اور ہر کذب افترا) بلکہ افترا اس کذب کو کہتے ہیں جو قصداً ہو اور کذب کا لفظ عام ہے بالقصد کذب ہو یا بلا قصد دونوں کذب کی صورتیں ہیں کذب تو ہر اس خبر کو کہتے ہیں جو واقع کے خلاف ہو۔

بَلِ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ فِى الۡعَذَابِ وَالضَّلٰلِ الۡبَعِيۡدِ ۝ (اللہ کے رسول نے نہ افترا بندی کی نہ ان کو جنون ہے) بلکہ آخرت پر ایمان نہ رکھنے والے (آخرت میں) عذاب میں مبتلا ہوں گے اور دنیا میں دور کی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔ اللہ نے اس آیت میں کافروں کے قول کی تردید کرتے ہوئے ان کے سخت گم کردہ راہ ہونے کی صراحت فرمائی جس سے رہا ہونے کی امید نہیں کی جا سکتی۔ بعید کو ضلال کی صفت بطور مبالغہ کہا ہے۔ جیسے شعر شاعر ضلال سبب عذاب ہے لیکن عذاب کو ضلال سے پہلے ذکر کرنے سے استحقاق عذاب کو بصورت مبالغہ بیان فرمایا ہے۔

اَفَلَمۡ يَرَوۡا اِلٰى مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ ؕ اِنۡ نَّشَاۡ نَخۡسِفۡ بِهِمُ الۡاَرۡضَ اَوۡ نُسۡقِطۡ عَلَيۡهِمۡ كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ ؕ کیا انہوں نے اپنے آگے پیچھے آسمان و زمین کو نہیں دیکھا کہ اگر ہم چاہیں تو ان کو زمین میں دھنسا دیں یا ان پر آسمان کے ٹکڑے گرا دیں۔

مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ سے مراد ہیں وہ چیزیں جو ہر طرف محیط ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مشاہدہ کائنات صانع مختار کی قدرت کاملہ کو ثابت کر رہا ہے پھر ایسے قادر مختار کے لئے دوبارہ زندہ کر کے اٹھانا کس طرح ناممکن ہو سکتا ہے جو شخص بعث و حشر کی خبر دے رہا ہے اس کے عقل مند اور صادق ہونے کا انکار کس طرح کیا جا سکتا ہے جب کہ وہ پہلے سے عقل مند اور صادق القول معروف اور مسلم ہے۔ ایسے عقل مند کو مجنون اور ایسے صادق کو مفتری کہنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔

بعض اہل علم کا قول ہے کہ اَفَلَمۡ يَرَوۡا ڈرانے اور خوف دلانے کی تمہید ہے مطلب یہ ہے کہ کیا یہ نابینا ہیں۔ کیا ان کو نہیں دکھتا کہ آسمان و زمین کے اندر یہ گھرے ہوئے ہیں جہاں رہیں اور جہاں جائیں آسمان و زمین سے باہر نہیں نکل سکتے اور اقتدار خداوندی سے خارج نہیں ہو سکتے ان کو ڈرنا چاہئے کہ کہیں زمین میں دھنسا دیئے جائیں جیسے قارون کو دھنسا دیا گیا یا آسمان سے کوئی ٹکڑا ان پر گرا دیا جائے جیسے قوم لوط پر پتھر برسائے گئے اور یہ سب کچھ پیغمبر کو جھوٹا قرار دینے اور آیات خداوندی کا انکار کرنے کی وجہ سے ہوا۔

اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّـكُلِّ عَبۡدٍ مُّنِيۡبٍ ۝ اس میں (قدرت الٰہیہ) کی پوری دلیل ہے مگر اس بندے کے لئے جو اللہ کی طرف متوجہ بھی ہو یعنی آسمان و زمین جو ان کی نظروں کے سامنے ہیں اللہ کی قدرت کاملہ ثبوت قیامت اور کافروں کو قیامت کے دن عذاب دیئے جانے کی کھلی دلیل ہے لیکن یہ واضح دلیل اس شخص کے لئے ہے جو دل سے اللہ کی طرف متوجہ ہو کیوں کہ وہی غور و فکر سے کام لینے والا اور نتیجہ تک پہنچنے والا ہوتا ہے۔ ع

وَلَقَدۡ اٰتَيۡنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضۡلًا ؕ اور بلاشبہ داؤد کو ہم نے اپنی طرف سے فضیلت عطا کی۔ یعنی بہت سے مومن بندوں پر برتری عطا کی۔ اس مضمون کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے جس میں حضرت سلیمان کے قول کو اللہ نے نقل کیا

ہے۔ حضرت سلیمان نے کہا تھا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ فَضَّلَنَا عَلٰی كَثِیْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِیْنَ
نبوت۔ کتاب اللہ (زبور) حکومت، خوش آوازی۔ آپ کے ہاتھ میں (بغیر تپائے) لوہے کا نرم ہو جانا وغیرہ یہ سب چیزیں فضائل داؤد کی مختلف صورتیں تھیں۔

یٰجِبَالُ اَوِّبِیْ مَعَهٗ اے پہاڑو! داؤد کے ساتھ تسبیح پڑھو۔ اِیاب کا معنی ہے رجوع کرنا یعنی جب داؤد تسبیح میں مشغول ہوں تو تم بھی ان کے ساتھ تسبیح میں مشغول ہو۔ یا اِیاب کا معنی اللہ کی پاکی بیان کرنا ہے۔ اَوِّب بمعنی سَبِّح آتا ہے اللہ کی پاکی بیان کرنے والا دوسروں سے منہ موڑ کر اللہ کی طرف لوٹتا ہے۔ قتیبی نے کہا تاویب بمعنی تسبیح۔ تاویب فی السیر سے ماخوذ ہے تاویب کا معنی ہے دن بھر چلنا پھر رات کو قیام کرنا اس صورت میں یہ مطلب ہوگا کہ جب دن ہو تو دن بھر تم داؤد کے ساتھ تسبیح میں رواں رہو۔ بعض نے اَوِّبِیْ کا ترجمہ کیا ہے داؤد کے ساتھ مل کر نوحہ کرو۔

وَالطَّیْرَ مع پرندوں کے۔ بیضاوی نے لکھا ہے اصل کلام اس طرح تھا وَلَقَدْ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا وَّهِیَ تَاوِیْبُ الْجِبَالِ وَالطَّیْرِ (ہم نے اپنی طرف سے داؤد کو فضیلت دی تھی اور وہ فضیلت یہ تھی کہ پہاڑ اور پرندے اس کے ساتھ تسبیح پڑھتے تھے) عبارت کا طرز اپنی عظمت شان، جلال حکومت اور قوت اقتدار کو ظاہر کرنے کے لئے بدل دیا گیا کہ ہمارے حکم سے بے عقل مخلوق بھی اہل فہم کی طرح ہماری مشیت کے موافق عمل کرتی ہے۔

بغوی نے لکھا ہے حضرت داؤد جب نوحہ کی آواز بلند کرتے تھے تو پہاڑوں سے آواز کی بازگشت ہوتی تھی۔ یہ پہاڑوں کی طرف سے نوحہ کا جواب ہوتا تھا اور اوپر سے پرندے اڑتے اڑتے ٹھہر جاتے اور رک جاتے تھے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت داؤد پہاڑوں میں گھس کر اللہ کی تسبیح کے ترانے گاتے تھے تو جس طرح آپ تسبیح کرتے تھے ویسے ہی پہاڑ بھی تسبیح کرتے تھے۔ ایک قول یہ بھی آیا ہے کہ حضرت داؤد کے بدن میں کچھ سستی پیدا ہو جاتی تھی تو ان کو چست بنانے کے لئے اللہ پہاڑوں کی تسبیح کی آواز سنواتا تھا۔

وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِیْدَ ۝ اور ہم نے ان کیلئے لوہے کو نرم کر دیا تھا۔ لوہا آپ کے ہاتھ میں موم یا گوندھے ہوئے آٹے کی طرح ہو جاتا تھا جس طرح چاہتے ہاتھ سے پکڑ کر اس کو موڑ دیتے تھے۔ تپانے اور کوٹنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔

بغوی نے لکھا ہے اخبار میں آیا ہے کہ حضرت داؤد جب بنی اسرائیل کے بادشاہ ہوئے تو آپ نے اپنا یہ دستور بنا لیا تھا کہ لوگوں کے حالات معلوم کرنے کے لئے بھیس بدل کر (رات) کو نکلا کرتے تھے اور ایسے لوگوں سے جو آپ کو پہچانتے نہ تھے مل کر دریافت کرتے تھے کہ داؤد کیسا آدمی ہے۔ تمہاری اس کے متعلق کیا رائے ہے۔ یہ تمہارا حاکم کیسا شخص ہے سب لوگ آپ کی تعریف کرتے تھے اور آپ کے متعلق کلمہ خیر ہی کہتے تھے۔ ایک روز اللہ نے ایک فرشتہ بہ شکل انسانی بھیجا۔ حضرت داؤد کی اس سے ملاقات ہوئی اور حسب عادت اس سے اپنے متعلق دریافت کیا فرشتے نے کہا اگر ایک بات نہ ہو تو بادشاہ اچھا آدمی ہے۔ حضرت داؤد یہ سنتے ہی خوف زدہ ہو گئے اور دریافت فرمایا بندۂ خدا وہ کون سی بات ہے؟ فرشتے نے کہا وہ خود بھی بیت المال سے کھاتا ہے اور اپنے اہل و عیال کو بھی بیت المال سے لے کر کھلاتا ہے۔ کلبی نے کہا اسی سبب سے حضرت داؤد نے اللہ سے دعا کی کہ میرے لئے رزق کا کوئی ذریعہ مقرر فرما دے تاکہ اس سے میں اپنی بھی روزی کماؤں اور اہل و عیال کو بھی کھلاؤں، اور بیت المال کا محتاج نہ رہوں اللہ نے (دعا قبول فرمائی اور) لوہے کو ان کے لئے نرم کر دیا اور زرہ بنانا سکھا دی سب سے پہلے آپ نے ہی زرہ بنائی آپ سے پہلے زرہ کی ایجاد ہی نہیں ہوئی تھی کہا جاتا ہے کہ آپ ایک زرہ چار ہزار درہم کو فروخت کرتے تھے جس سے خود بھی کھاتے تھے گھر والوں کو بھی کھلاتے اور غریبوں مسکینوں کو خیرات بھی دیتے تھے بعض اقوال میں آیا ہے کہ روزانہ ایک زرہ بنا لیا کرتے تھے جو چھ ہزار کو فروخت ہوتی تھی۔ جس میں سے دو ہزار اپنے اہل و عیال کے صرف میں لاتے تھے، اور چار ہزار غریبوں، مسکینوں کو خیرات کر دیتے تھے۔

حضرت مقدام بن معد یکرب راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے ہاتھوں کی کمائی سے بہتر کسی نے کوئی کمائی بھی

نہیں کھائی۔ اللہ کے نبی داؤد اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے تھے۔ رواہ البخاری واحمد۔ بغوی کی روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے داؤد نہیں کھاتے تھے مگر اپنے ہاتھ کی کمائی۔

اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ (ہم نے ان کو حکم دیا) کہ ایسی کشادہ پوری لمبی زرہیں بنائیں جو زمین میں گھسٹتی چلیں۔

وَّقَدِّرْ فِی السَّرْدِ اور (کڑیوں) کے جوڑنے میں اندازہ رکھو۔ سرد کھال کو سینا مجازاً مراد ہے زرہ بننا یعنی زرہ کی بناوٹ میں ایک خاص انداز رکھو، کڑیاں اور کیلیں خاص تناسب کے ساتھ بناؤ نہ اتنی پتلی کہ پھٹ جائیں نہ اتنی موٹی کہ کڑیاں ٹوٹ جائیں۔

وَاعْمَلُوْا صَالِحًا اور (اے داؤد اور داؤد کے گھر والو) نیک عمل کرو۔ یعنی خالص اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اچھے اعمال کرو۔

اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝۱۱ جو کچھ تم کرتے ہو اس کو میں دیکھتا ہوں یعنی تم کو ان اعمال کی جزا دوں گا حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ بلاشبہ پاک ہے پاکیزہ ہی کو پسند کرتا ہے اس نے جو حکم پیغمبروں کو دیا وہی حکم مؤمنوں کو دیا اور فرمایا اے پیغمبرو پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک کام کرو۔ الحدیث رواہ مسلم۔

وَلِسُلَیْمٰنَ الرِّیْحَ اور ہوا کو ہم نے سلیمان کا تابع بنا دیا۔

غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ صبح سے زوال تک اس کی رفتار ایک ماہ (کی مسافت کے برابر) تھی اور زوال سے مغرب تک اس کی رفتار ایک ماہ (کی مسافت راہ کے برابر) تھی حسن نے کہا حضرت سلیمانؑ صبح کو دمشق سے چلتے اور اصطخر میں قیلولہ کرتے تھے۔ ان دونوں مقاموں کے درمیان مسافت تیز سوار کی ایک ماہ کی مسافت کے برابر ہے۔ پھر پچھلے دن میں اصطخر سے چل کر بابل میں رات کو قیام کرتے ان دونوں کی درمیانی مسافت بھی تیز شہسوار کی ایک ماہ کی مسافت کے برابر ہے یہ بھی کہا گیا ہے کہ صبح کا کھانا آپ رے میں کھاتے اور شام کا کھانا سمرقند میں۔

وَاَسَلْنَا لَهٗ عَیْنَ الْقِطْرِ اور ان کے لئے تانبے کا چشمہ ہم نے بہا دیا تھا اَلْقِطْر بمعنی نحاس (تانبا) سیال تانبا حضرت سلیمانؑ کے لئے پانی کے چشمہ کی طرح اللہ نے زمین سے نکال دیا تھا اس لئے اس کو عَیْنَ الْقِطْرِ فرمایا۔

بغوی نے لکھا ہے کہ اہل تفسیر کا قول ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے لئے اللہ نے تانبے کا چشمہ تین روز تک جاری رکھا اور یہ چشمہ یمن میں تھا۔ جس سے لوگ اس زمانہ میں فائدہ اندوز ہوتے تھے۔

وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ یَّعْمَلُ بَیْنَ یَدَیْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ اور کچھ جن سلیمان کے پیش خدمت بحکم رب کام کرتے تھے۔ اِذن سے مراد ہے حکم یا ارادہ یا تابع بنا دینا۔

وَمَنْ یَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِیْرِ ۝۱۲ اور ان میں سے جو بھی ہمارے حکم سے عدول کرتا تھا ہم اس کو بھڑکتی آگ میں مزا چکھاتے تھے۔ عَذَابِ السَّعِیْرِ سے مراد بعض کے نزدیک دوزخ کا عذاب ہے، بعض کے نزدیک اسی زندگی میں سوختہ کر دینا۔ میں کہتا ہوں اگر اِذن اور امر سے مراد امر تکلیفی ہو تو عَذَابِ سعیر سے عذاب آخرت مراد لینا مناسب ہے کیوں کہ تمام شرعی احکام کا مقام سزا جزا آخرت ہے اور اگر اِذن سے مراد ارادہ اور حکم کا تابع بنا دینا ہو اور بظاہر ایسا ہی ہے تو عَذَابِ السَّعِیْرِ سے عذاب دنیا مراد لینا مناسب ہے۔

ایک شبہ

اگر جن سے کام کرانے کا اللہ کا ارادہ تھا تو ممکن نہ تھا کہ جن سرتابی کر سکتے ارادۂ الٰہیہ سے مراد کا تخلف نہیں ہو سکتا (یعنی اللہ کا ارادہ ہو اور جو مراد خداوندی ہے وہ حاصل نہ ہو ایسا ناممکن ہے۔)

ازالہ

مِنَ الْجِنِّ میں مِنْ تبعیضیہ ہے اور بعض سے مراد ہیں اکثر مطلب یہ کہ سلیمانؑ کے لئے اکثر جن کام کرتے تھے۔ اس لئے ایک فرشتے کو مسلط کر دیا گیا تھا کہ سلیمان کے حکم سے جو جن سرتابی کرے فرشتہ اس کو سزا دے۔ اس کا حاصل یہ ہوا

کہ اکثر جن حضرت سلیمان کے کام کی انجام دہی میں منہمک تھے (اور یہی مراد خداوندی تھی) یا یوں کہا جائے کہ مَنْ یَّزِغْ کا یہ معنی ہے جو جن حکم سے عدول کرنے کا ارادہ کرتا تھا فرشتہ اس کو مار کر سیدھا کر دیتا تھا (گویا نافرمانی سے مراد ہے نافرمانی کا ارادہ)

یَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا یَشَآءُ مِنْ مَّحَارِیْبَ وَتَمَاثِیْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِیٰتٍ

سلیمان کو جو بنوانا منظور ہوتا جنات ان کے لئے وہ بناتے بڑی بڑی عمارتیں اور مورتیں اور لگن (اتنے بڑے بڑے) جیسے حوض اور دیگیں جو (بڑے ہونے کی وجہ سے) ایک ہی جگہ جمی رہیں۔

مَحَارِیْبَ مضبوط محل اونچی مسجدیں اور اعلیٰ مکانات۔ محراب کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ حرب کا معنی ہے دفع کرنا اور اعلیٰ عمارتوں کی بھی حفاظت کی جاتی ہے اور ہر نقصان رساں چیز کو ان سے دفع کیا جاتا ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ سب سے پہلے بیت المقدس کی تعمیر حضرت داؤد نے شروع کی تھی قد آدم تعمیر اٹھائی تھی کہ اللہ کی طرف سے وحی آئی۔ تمہارے ہاتھ سے اس عمارت کی تکمیل کا فیصلہ میں نے نہیں کیا ہے بلکہ تمہارے بیٹے کو جس کا نام سلیمان ہوگا میں بادشاہ بناؤں گا اس کے ہاتھ سے اس عمارت کو پورا کراؤں گا۔ حضرت داؤد کی وفات کے بعد جب حضرت سلیمانؑ ان کے جانشین ہوئے تو آپ نے بیت المقدس کی تعمیر مکمل کرنی چاہی چنانچہ جنات اور شیاطین کو جمع کر کے ان کی ٹولیاں بنا کر الگ الگ کاموں کی درستی پر مقرر کیا۔ جنات اور شیاطین کو کانوں سے اکھاڑ کر سنگ مرمر سفید کے لانے کا حکم دیا۔

پتھر آگئے تو سنگ مرمر سفید اور دوسری سنگین چٹانوں سے شہر بنانے کا امر دیا۔ شہر کی بارہ فصیلیں بنائیں کیوں کہ بنی اسرائیل کے بارہ قبائل تھے ہر قبیلہ کو ایک فصیل میں رکھا۔ شہر بن چکا تو تعمیر مسجد کا آغاز کیا جس کی ابتدا اس طرح کی کہ جنات اور شیاطین کے گروہ الگ الگ کر دیئے۔ ایک گروہ کو کانوں سے سونا چاندی اور یاقوت لانے کا اور سمندر سے چمکدار موتی نکال کر لانے پر مامور کیا اور دوسرے گروہ کو جواہر اور دوسرے (قیمتی) پتھر معدنوں سے اکھاڑ کر لانے کا حکم دیا۔ تیسرے گروہ کو مشک، عنبر اور دوسری خوشبودار چیزیں لانے پر مقرر کیا۔ آخر یہ سب چیزیں اتنی فراہم ہو گئیں کہ جن کی مقدار اور تعداد اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ پھر کاری گروں اور صنعت کاروں کو بلوا کر اونچے اونچے پتھر تراشنے اور ان کی تختیاں اور جواہر کو درست کرنے اور موتیوں اور یاقوت وغیرہ میں سوراخ کرنے پر مامور کیا، مسجد کی تعمیر سفید، زرد اور سبز سنگ مرمر سے کرائی اور ستون بھی اسی کے قائم کئے چھت میں قیمتی جواہر کی تختیاں لگائیں اور چھتوں اور دیواروں کا گارا اور پلاسٹر مروارید یاقوت اور دوسرے جواہر کا لگوایا۔ زمین پر فیروزے کی تختیوں کا فرش کیا۔ اس زمانے میں روئے زمین پر اس سے زیادہ پر رونق اور چمکیلی عمارت کوئی نہیں تھی تاریکی میں وہ چودھویں کے چاند کی طرح چمکتی تھی تعمیر سے فراغت کے بعد حضرت سلیمانؑ نے علماء بنی اسرائیل کو طلب فرما کر بتایا کہ میں نے یہ عمارت خالص اللہ کے لئے بنائی ہے اس میں جو کچھ ہے وہ اللہ کے لئے ہے (کوئی اس کا مالک نہیں)۔ جس روز تعمیر سے فراغت ہوئی آپ نے اس روز جشن منایا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ سلیمانؑ نے تعمیر بیت المقدس سے فارغ ہونے کے بعد اپنے رب سے تین چیزوں کی دعا کی۔ اللہ نے دو چیزیں تو عطا فرما دیں اور تیسری کے متعلق بھی مجھے امید ہے کہ عطا فرما دی ہو گی۔ سلیمانؑ نے درخواست کی تھی کہ اللہ ان کو فیصلہ کرنے کی قوت عطا فرمادے کہ ان کا فیصلہ اللہ کے فیصلہ کے موافق ہو (یعنی فیصلہ کرنے میں ان سے غلطی نہ ہو) اللہ نے ان کو یہ چیز عطا فرمادی انہوں نے اپنے رب سے ایسی حکومت مانگی تھی جو ان کے بعد کسی کے لئے سزاوار نہ ہو۔ اللہ نے یہ چیز بھی ان کو عطا فرمادی۔

سلیمانؑ نے دعا کی تھی کہ اس گھر (بیت المقدس) میں جو شخص آکر دو رکعت نماز ادا کرے اس کو گناہوں سے ایسا پاک کر دیا جائے جیسا اس دن تھا جب ماں نے اس کو جنم دیا تھا میں امید کرتا ہوں کہ اللہ نے یہ چیز بھی ان کو مرحمت فرمادی ہو گی۔ (رواہ البغوی) حضرت انس بن مالک کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے گھر کے اندر آدمی کی ایک نماز کا ثواب ایک نماز کا ثواب ہے اور مسجد قباء کے اندر ایک نماز کا ثواب پچیس نمازوں کا ہے اور مسجد جامع میں ایک نماز کا ثواب پانچ سو نمازوں کا ہے اور مسجد اقصیٰ میں ایک نماز کا ثواب ایک ہزار نمازوں کا ہے اور میری مسجد میں ایک نماز کا ثواب پچاس ہزار نمازوں کا ہے۔ اور کعبہ کے

اندر ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کا ہے۔ رواہ ابن ماجہ۔

حضرت ابو سعید خدریؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سواریاں کس کر نہ جاؤ (یعنی سفر نہ کرو) مگر تین مسجدوں کی طرف مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور میری یہ مسجد (متفق علیہ)

مسئلہ :- کیا مسجدوں کو سونے چاندی وغیرہ سے آراستہ کرنا جائز ہے۔ یہ مسئلہ اختلافی ہے۔ بعض علماء کے نزدیک مکروہ ہے اس میں فضول مال کی بربادی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مساجد کو مزین بنانے کی اجازت نہیں دی۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا تم مسجدوں کو ضرور اس طرح آراستہ کرو گے جیسے یہودی اور عیسائی کرتے تھے حضور اقدس ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ مسجدوں کی آرائش علامات قیامت میں سے ہے۔

بعض اہل علم نے کہا مسجد کو آراستہ کرنا ثواب ہے اس میں مسجد کی عظمت کا اظہار ہے حضرت سلیمانؑ نے مسجد بیت المقدس کو آراستہ کیا تھا۔ اس سے تائید ہوتی ہے تزئین مساجد کے قول کی۔

صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ تزئین مساجد کا جواز اس وقت ہوگا جب کوئی شخص اپنے مال سے کرے متولی کے لئے جائز نہیں کہ سوائے ضروریات تعمیر کے وقف کا روپیہ نقاشی وغیرہ میں صرف کرے اگر ایسا کرے گا تو خود اس کو اپنے پاس سے تاوان ادا کرنا ہوگا۔ ابن ہمام نے لکھا ہے کہ تزئین مساجد کے مقابلہ میں غریبوں کی امداد کرنا بہر حال بلاشبہ بہتر ہے۔

اکثر علماء کے نزدیک منبت کاری اور نقاشی مصالحہ کی ہو یا لکڑی کی اور سنہرے پانی کا استعمال مساجد کے لئے جائز ہے اس میں کوئی حرج نہیں۔ کوئی حرج نہیں کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ نہ اس کا ثواب ملے گا نہ گناہ ہوگا۔ کذا فی الہدایہ۔

ابن ہمام نے لکھا ہے کہ محل کراہت (یعنی مکروہ تحریمی) تو یہ ہے کہ بہت ہی پر تکلف دقیق نقاشی وغیرہ کی جائے خصوصاً محراب میں باریک فن کاری سے کام لیا جائے یا مسجد کی آرائش تو کر دی جائے اور (اس میں) نماز نہ پڑھی جائے یا مسجد کو اس کا حق نہ دیا جائے یعنی مسجد کے اندر شور مچایا جائے یا دنیا کی باتیں کرنے کے لئے وہاں بیٹھک کی جائے۔ حدیث کا آخری جملہ ہے کہ وقلوبھم خاویۃ عن الایمان اور ان کے دل ایمان سے خالی ہوں گے۔ یہ جملہ مذکورہ بالا بیان کو ثابت کر رہا ہے۔

میں کہتا ہوں سلیمانؑ کے قصہ کے مقابلہ میں رسول اللہ ﷺ کی حدیث کا اتباع زیادہ ضروری ہے کیوں کہ گزشتہ انبیاء کی شریعتیں اسی وقت کے لائق ہیں جب ہماری شریعت میں ان کے خلاف کوئی حکم نہ آیا ہو۔ اس کے علاوہ حضرت سلیمانؑ کا فعل (یعنی تزئین مسجد) تو ایک حکمت کا حامل تھا آپ شیاطین اور جنات کو سخت کاموں میں اس لئے مشغول رکھنا چاہتے تھے کہ شیاطین کو لوگوں کو گمراہ کرنے کا موقع نہ ملے (تزئین مسجد اصل مقصود نہ تھا) بغوی نے لکھا ہے کہ اہل اخبار کا بیان ہے کہ بخت نصر کے حملہ تک حضرت سلیمان کی بنائی ہوئی مسجد اپنی اصلی حالت پر باقی رہی جب بخت نصر نے بیت المقدس پر حملہ کیا تو شہر کو تباہ کر دیا اور ساری عمارتیں ڈھادیں مسجد گرا دی مسجد کی چھت اور دیواروں میں جو سونا چاندی موتی یاقوت اور جواہر لگے ہوئے سب اکھاڑ کر اپنے ملک (عراق) کو لے گیا۔

جنات نے حضرت سلیمانؑ کے لئے یمن میں پتھر کے بڑے عجیب قلعے بھی تعمیر کئے تھے۔

تماثیل یعنی پیتل تانبے شیشے اور سنگ مرمر کی مورتیاں۔ کہا گیا ہے کہ وہ درندوں اور پرندوں کی تصویریں بناتے تھے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ملائکہ انبیاء اور نیک لوگوں کی تصویریں مساجد میں بناتے تھے تاکہ ان کو دیکھ کر لوگوں میں عبادت کا جذبہ ترقی کرے۔ ان کی شریعت میں تصویر کشی جائز تھی۔

میں کہتا ہوں شاید تماثیل سے مراد بے جان چیزوں کی تصویریں ہوں کیوں کہ انسانی مورتیوں کی تو حضرت سلیمان سے پہلے بھی پوجا کی جاتی تھی حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ اور قوم سے فرمایا تھا۔

مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ

صحیحین میں حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے ہر مصور دوزخ میں جائے گا جو

صورت اس نے بنائی ہو گی اس میں قیامت کے دن جان ڈالی جائے گی اور وہی تصویر اس کو دوزخ میں عذاب دے گی۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اگر تم کو ایسا کرنا ہی ہے یعنی تصویر بنانی ہی ہے تو درختوں کی اور بے جان چیزوں کی بنالو۔ (متفق علیہ) اس حدیث میں صرف اس امت کے مصوروں کی حالت نہیں بیان کی گئی۔ بلکہ ہر مصور کی حالت کا اظہار کیا گیا ہے اور چونکہ جملہ خبریہ ہے اس لئے منسوخ ہونے کا بھی احتمال نہیں ہے (حکم منسوخ ہو سکتا ہے خبر منسوخ نہیں ہوتی خبر میں تو ایک واقعہ کا بیان ہوتا ہے اگر خبر کا بھی منسوخ ہونا ممکن ہو تو تکذیب خبر لازم آئے گی۔ مترجم)

حضرت ابن عباسؓ کی مرفوع حدیث ہے کہ جو مصور کوئی صورت بنائے گا اس کو عذاب دیا جائے گا اور اس کو حکم دیا جائے گا کہ اپنی بنائی ہوئی تصویر کے اندر جان بھی ڈال لیکن وہ کبھی اس کے اندر روح نہیں پھونک سکے گا۔ رواہ البخاری)

حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن ایک گردن (سب لوگوں سے اونچی) برآمد ہو گی جس کی دو آنکھیں ہوں گی جو دیکھ رہی ہوں گی اور دو کان ہوں گے جو سن رہے ہوں گے اور زبان ہو گی جو بول رہی ہو گی وہ کہے گی مجھے تین آدمیوں کے لئے مقرر کیا گیا ہے ہر ظالم کے لئے جو عناد رکھتا ہے ہر اس شخص کے لئے جو اللہ کے ساتھ دوسرے کو معبود قرار دیتا ہے اور تمام مصوروں کے لئے۔ رواہ الترمذی۔

یہ بھی حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا اللہ فرماتا ہے اس سے بڑھ کر ظالم (ناحق کوش) کون ہے جو میری تخلیق کی طرح بنانے چلا ہے (اگر ان میں تخلیق کی طاقت ہے) تو ان کو چاہئے کہ ایک چھوٹی چیونٹی ہی بنا لیں ایک دانہ یا ایک جو ہی پیدا کر لیں۔ متفق علیہ

ان تمام احادیث کی رفتار بتا رہی ہے کہ تصویر کشی کی حرمت امت محمدیہ ﷺ کے لئے ہی مخصوص نہیں ہے۔

ایک شبہ :- حضرت عیسیٰ علیہ السلام پرندہ کی شکل کی مٹی کی مورتی بنا کر اس میں پھونک مارتے تھے تو وہ زندہ پرندہ بن جاتی تھی اور ایسا بحکم خدا ہوتا تھا۔

جواب :- بے شک ایسا ہوتا تھا کہ بحکم خدا حضرت عیسیٰ کی بنائی ہوئی مورتی پرندہ بن جاتی تھی (یہ تو آپ کا معجزہ تھا جو بحکم خدا آپ کے ہاتھ سے سرزد ہوتا تھا۔ مترجم) صورت بنانا حرام تو ان لوگوں کے لئے ہے جو صورت میں جان نہیں ڈال سکتے انکو حکم دیا جائے گا کہ اپنی بنائی ہوئی تصویر میں روح پھونکیں مگر وہ کبھی نہ پھونک سکیں گے۔

جِفَانٍ جَفْنَۃٌ کی جمع ہے جفنہ بڑے پیالے کو کہتے ہیں۔

کَالْجَوَابِ ۔ یہ جَابِیَۃٌ کی جمع ہے۔ جابیۃ بڑے حوض کو کہتے ہیں کذافی القاموس یہ لفظ جبی الخراج (خراج وصول کیا) سے مشتق ہے بڑے حوض کو جابیہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں پانی آکر جمع ہوتا ہے۔ یہ ان صفات میں سے ہیں جن کے موصوف کو ذکر نہیں کیا جاتا (یعنی الحوض الجابیۃ) نہیں کہا جاتا بلکہ صفات ہی کو موصوف کے قائم مقام قرار دے لیا جاتا ہے۔ بغوی نے لکھا ہے ایک پیالہ پر ہزار آدمی بیٹھ کر کھایا کرتے تھے یعنی پیالہ اتنا بڑا تھا کہ ایک پیالہ کا کھانا ہزار آدمیوں کے لئے کافی ہوتا تھا۔

وَّقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ اپنی جگہ جمی ہوئی ان دیگوں کے پائے لگے ہوئے تھے اور وہ اتنی بڑی تھیں کہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتی تھیں نہ ان کو (چولہے سے) اتارا جا سکتا تھا نہ خالی کیا جا سکتا تھا زینہ لگا کر ان پر چڑھا جاتا تھا یہ دیگیں یمن میں تھیں۔

اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ؕ (ہم نے داؤد اور انکے گھر والوں سے کہا) اے داؤد کے خاندان والو! تم سب شکریہ میں نیک کام کیا کرو۔

شُكْرًا میں تنوین تقلیل پر دلالت کر رہی ہے (یعنی نعمتوں کا پورا پورا ادا نہیں کر سکتے تو نعمتوں سے کم ہی شکریہ ادا کرو۔ مترجم) کیوں کہ اللہ کی عطا کردہ نعمتوں سے زیادہ شکریہ ادا کرنا تو انسانی طاقت سے خارج ہے بلکہ کسی مخلوق کے لئے ممکن نہیں

شُکْرًا یا مفعول لہ ہے۔ یعنی فعل مذکور کی علت ہے۔ آیت کا مطلب اس طرح ہوگا کہ اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی غرض سے اللہ کی طاعت کرو یا مفعول مطلق ہے اور اس کا موصوف محذوف ہے یا مفعول بہ ہے۔ جعفر بن سلیمان نے کہا میں نے ثابت سے سنا ہے کہ حضرت داؤدؑ نے اپنے اور اپنے گھر والوں کی عبادت کے لئے رات اور دن کے حصے مقرر کر دیئے۔ پس دن رات میں کوئی ساعت ایسی نہ ہوتی تھی کہ حضرت داؤد کے گھر کوئی نہ کوئی عبادت میں مشغول نہ ہو۔

وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ ۝ اور میرے بندوں میں بڑے شکر گزار کم ہیں۔ یعنی ایسے لوگ کم ہیں جو زبان اور اعضاء جسم سے اکثر اوقات ادا شکر کرتے ہوں اور ہمیشہ بلا سستی کے شکر میں مشغول رہتے ہوں۔ یہ مرتبہ حضور دوامی اور فنائے قلب کے بعد حاصل ہوتا ہے اور اس دوامی شکر کے بعد بھی اللہ کی نعمتوں کا حق ادا نہیں ہوتا کیونکہ توفیق شکر بھی عطاء الٰہی ہے اور ایک نعمت ہے پس ہر شکر کا شکر پھر شکر کے شکر کا شکر ادا کرتا چلا جانا انسانی طاقت سے خارج ہے، اسی لئے کہا گیا ہے کہ شکور وہ شخص ہے جو ادا شکر سے اپنے آپ کو عاجز سمجھتا ہو۔[1]

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ پھر جب ہم نے انکے لئے موت کا حکم جاری کر دیا۔ بغوی نے لکھا ہے اہل علم کا بیان ہے کہ حضرت سلیمانؑ مسجد بیت المقدس کے اندر مہینہ دو مہینہ سال دو سال یا اس سے کم و بیش مدت تک گوشہ نشین ہو جاتے تھے۔ وہیں آپ کا کھانا پانی پہنچا دیا جاتا تھا۔ ایک بار حسب معمول بیت المقدس کے اندر تھے کہ آپ کی وفات ہو گئی۔ جس کے قصہ کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ روزانہ صبح کے وقت بیت المقدس کی محراب میں ایک بوٹی نمودار ہوتی تھی۔ آپ اس سے اس کا نام دریافت کرتے تھے وہ اپنا نام بتا دیتی تھی آپ اس سے اس کے خواص دریافت کرتے تھے تو وہ اپنے فائدے بیان کر دیتی تھی۔ آپ اس کو کٹوا لیتے تھے پھر اگر وہ کسی پودے کی شاخ ہوتی تو اس کو (کسی باغ میں) لگوا دیتے تھے اور اگر دوائی بوٹی ہوتی تو لکھ دیتے تھے ایک روز درخت خروبہ (محراب میں) اگا حضرت نے اس سے دریافت کیا تو کون ہے؟ اس نے جواب دیا خروبہ۔ آپ نے فرمایا تو کس لئے اگا ہے؟ اس نے کہا آپ کی مسجد کو برباد کرنے کے لئے حضرت سلیمانؑ نے فرمایا یہ بات تو ہو گی نہیں کہ میری زندگی میں اللہ اس مسجد کو برباد کر دے ایسے معلوم ہوتا ہے کہ (پہلے) میری موت اور پھر بیت المقدس کی بربادی تیری وجہ سے ہوگی پھر آپ نے اس کو ایک اچھے باغ میں لگوا دیا اور دعا کی اے اللہ میری موت کو جنات سے پوشیدہ رکھنا تاکہ انسانوں کو معلوم ہو جائے کہ غیب داں جنات نہیں ہوتے۔ جنات آدمیوں سے کہا کرتے تھے کہ ہم غیب کی باتیں جان لیتے ہیں اور آنے والے دن میں جو کچھ ہوگا اس سے بھی واقف ہیں۔

اس کے بعد حضرت سلیمانؑ محراب (عبادت خانہ) میں چلے گئے اور لاٹھی پر سہارا لگائے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگے۔ اسی حالت میں کھڑے کھڑے آپ کی وفات ہو گئی۔ محراب کے اندر آگے پیچھے کچھ روشن دان تھے جن میں جنات آپ کو کھڑا دیکھ کر خیال کرتے تھے کہ آپ نماز میں مشغول ہیں اس لئے جو سخت محنت کا کام آپ کی زندگی میں وہ کیا کرتے تھے ان میں آپ کی وفات کے بعد بھی سرگرم رہے اور چونکہ آپ کی عادت ہی تھی کہ نماز میں مشغول ہونے کے بعد (ایک مدت تک) باہر نہیں نکلتے تھے اس لئے آپ کے برآمد نہ ہونے سے جنات کو آپ کی وفات کا کوئی شبہ بھی نہیں ہوا۔ اس طرح وفات کے بعد ایک سال گزر گیا اور جنات برابر کام میں مشغول رہے۔ آخر دیمک نے لاٹھی کو کھا لیا اور آپکی میت نیچے گر پڑی اور جنات کو علم ہوا۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جنات نے دیمک کا شکریہ ادا کیا کہ اس کی وجہ سے ان کو سخت مشقتوں سے آزادی ملی۔ اب بھی پانی اور مٹی جنات لکڑی کے کھوکھلے حصہ میں (دیمک کے لئے) ڈالتے ہیں۔ ابن ابی حاتم نے ابن یزید کی روایت سے بیان کیا

---

[1] ابراہیم تیمی راوی ہیں کہ ایک شخص نے حضرت عمرؓ کے سامنے کہا اے اللہ مجھے کم لوگوں میں سے کر دے حضرت عمر نے فرمایا یہ کیسی دعا ہے اس شخص نے کہا میں نے سن لیا ہے کہ اللہ نے فرمایا وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ اس شخص نے ایک آیت اور بھی پڑھی تھی حضرت عمرؓ نے فرمایا ہر شخص عمر سے زیادہ اسلامی سمجھ رکھتا ہے۔ از مظہری۔

ہے کہ حضرت سلیمان نے ملک الموت سے کہہ دیا تھا جب آپ کو میرے متعلق حکم دیا جائے تو مجھے اطلاع دے دینا ایک روز ملک الموت نے آکر اطلاع دی کہ اب مجھے آپ کی بابت حکم دیا گیا ہے کہ آپ کی زندگی کا ذرا سا وقت رہ گیا ہے آپ نے جنات کو طلب فرما کر اپنے گرد اگرد اور اوپر ایک شیشہ گھر تعمیر کرا لیا جس کا کوئی دروازہ نہیں رکھا پھر اسکے اندر نماز پڑھتے کھڑے ہو گئے اور لاٹھی سے سہارا لگا لیا اور اسی حالت میں ملک الموت نے آپکی روح قبض کر لی۔ وفات کے بعد بھی آپ یونہی کھڑے رہے بالآخر گھن نے لاٹھی کو کھا لیا اور آپ گر پڑے اس کے بعد لوگوں نے اس شیشہ گھر میں ایک دروازہ بنا لیا اور اندر داخل ہو گئے۔ اور یہ جاننے کے لئے کہ آپ کی وفات کو کتنا عرصہ ہو گیا۔ گھن کو لاٹھی پر اٹھا لیا گھن ایک رات دن لاٹھی کو کھاتا رہا۔ اس طرح لوگوں نے اندازہ لگایا تو معلوم ہوا کہ آپ کی وفات کو ایک سال ہو گیا۔

مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ تو کسی چیز نے ان کے مرجانے کا پتہ نہ بتلایا مگر گھن کے کیڑے نے۔

مَا دَلَّهُمْ یعنی جناب کویا حضرت سلیمان کے گھر والوں کو آپ کی موت کی اطلاع صرف گھن لگنے کی وجہ سے ہوئی۔

دَآبَّةُ الْاَرْضِ جس کو عربی میں اَلْاَرَضَۃ اور فارسی میں دیوک کہتے ہیں۔ یہ ننھا کیڑا ہوتا ہے جو لکڑی کو کھا جاتا ہے اَلْاَرْضِ سے مراد نمناک مٹی ہے بعض کا قول ہے کہ الارض، ارضت الخشبۃ (لکڑی کھائی گئی) کا مصدر ہے اس صورت میں اَلْاَرْض دَآبَّۃ کا فعل قرار پائے اور اضافت فعل کی طرف ہو جائے گی یعنی لکڑی کھانے کا کیڑا جیسے زمین جوتنے کے بیل (بقر الحرث) لڑائی کا آدمی (رجل الحرب)

تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ جو کھا رہا تھا سلیمان کی لاٹھی کو نسأت الغنم میں نے بکریوں کو ڈانٹا اور ہنکایا منسأت اسی محاورہ سے ماخوذ ہے۔

فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِى الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ﴿۱۴﴾ جب سلیمان گر پڑے تب جنات کی یہ بات ظاہر ہو گئی کہ اگر وہ غیب دان ہوتے تو اتنی مدت اس ذلت کی مصیبت میں نہ رہتے۔ اَلْغَيْبَ یعنی وہ بات جو ان سے غائب ہو جیسے حضرت سلیمان کی وفات اَلْعَذَابِ الْمُهِيْنِ یعنی سخت محنت و مشقت میں اتنی مدت تک نہ پڑے رہتے حضرت سلیمان کی موت کا جنات کو علم نہ ہو سکا اس لئے حضرت کے حکم کے مطابق کام کرتے رہے۔ مطلب یہ ہے کہ پہلے جنات اپنی غیب دانی کا دعویٰ کر کے لوگوں کو دھوکا دیا کرتے تھے لیکن جب حضرت سلیمان کی وفات کا جنات کو علم نہ ہو سکا تو لوگوں کے لئے یہ بات واضح ہو گئی کہ جنات غیب داں نہیں ہوتے۔ آیت کا یہ مطلب حضرت ابن مسعودؓ کی قرات کے مطابق ہے ابن مسعود کی قرأت میں آیا ہے تبینت الانس لو کانوا یعلمون (ای الجن) مَا لَبِثُوْا فِى الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ بعض اہل تفسیر نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ حضرت سلیمان کی وفات سے بے علم رہنے کی وجہ سے جنوں کو معلوم ہو گیا کہ وہ اگر غیب داں ہوتے تو مشقت میں پڑے نہ رہتے یہ مطلب بعید از فہم ہے کیوں کہ جنات کو تو پہلے ہی معلوم تھا کہ وہ غیب داں نہیں ہیں آدمیوں کو دھوکا دینے کے لئے غیب دانی کا دعویٰ کرتے تھے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ اہل تاریخ نے بیان کیا ہے کہ حضرت سلیمان کی کل عمر ۵۳ سال ہوئی ۱۳ سال کی عمر میں باپ کے جانشین ہوئے اور چالیس سال حکومت کی، چار سال حکومت کو گزرے تھے کہ بیت المقدس کی تعمیر کا آغاز کیا۔ ابن ابی حاتم نے کہا مجھ سے علی بن رباح نے بیان کیا علی نے کہا مجھ سے ایک شخص نے کہا کہ فروہ بن سلیک غطفانی خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا یا نبی اللہ قوم سبا کو جاہلیت کے زمانہ میں غلبہ حاصل تھا اور مجھے اندیشہ ہے کہ وہ اسلام سے پھر جائیں گے۔ کیا میں ان سے جہاد کروں؟ حضور ﷺ نے فرمایا مجھے انکے بارے میں کوئی حکم نہیں ملا ہے۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِىْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ (قوم) سبا کے لئے ان کے مقام سکونت میں ہماری قدرت کاملہ کی نشانی موجود تھی (جس کا شکر کرنا ان پر واجب تھا)

بغوی نے بروایت ابو سبرہ نخعی بحوالۂ فروہ بن مسیک غطفی بیان کیا ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ مجھے سبا کے متعلق بتائیے کہ کیا وہ کوئی مرد تھا یا عورت یا کسی مقام کا نام تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا وہ ایک عربی مرد تھا جس کے دس بیٹے ہوئے۔ چھ دائیں طرف (یعنی یمن) کو چلے گئے اور چار بائیں طرف (یعنی شام) کو۔ جو چھ یمن کو گئے ان کے نام یہ تھے، کندہ، اشعر، ازد، مدحج، انمار، حمیر، ایک شخص نے کہا انمار کون۔ فرمایا جن میں سے خثعم اور بجیلہ ہیں (وہی انمار) جو چار شام کو گئے وہ یہ تھے۔ عاملہ، جذام، لخم، غسان۔ امام احمد وغیرہ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے مرفوعاً اسی طرح بیان کیا ہے سبا یشجب کا بیٹا اور یشجب یعرب کا اور یعرب قحطان کا۔

جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّشِمَالٍ ۬ؕ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ ۝

باغ کی دو قطاریں تھیں۔ راستے کے دائیں اور بائیں ہم نے کہہ دیا تھا کہ اپنے رب کا عطا کیا ہوا رزق (مفت بغیر محنت کے) کھاؤ پاکیزہ شہر ہے اور بخشنے والا پروردگار ہے۔

جَنَّتٰنِ سے مراد ہیں باغوں کی دو قطاریں۔ ایک دائیں طرف اور دوسری بائیں طرف یعنی شہر کے دائیں بائیں یا یہ مطلب ہے کہ ہر شخص کے دو باغ تھے ایک مقام سکونت سے دائیں جانب اور دوسرا بائیں جانب (قوم سبا کی تاریخ کے مطابق دائیں بائیں پھلنے والے درختوں کی قطاریں تھیں اور کسی مسافر کو سر راہ مفت پھل کھانے کی ممانعت نہیں تھی۔ اسی کے موافق ترجمہ کیا گیا ہے۔ مترجم)

وَاشْكُرُوْا لَهٗ یعنی اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرو مراد یہ ہے کہ اللہ کے احکام کی پابندی کرو۔ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ مقولہ نبی تھا یعنی ان کے نبی نے کہا یا زبان حال — ان سے کہہ رہی تھی کہ یہ رزق خداداد کھاؤ اور اللہ کے فرمانبردار رہو۔

بلدة طيبة پاکیزہ شہر جہاں پھلوں کی کثرت تھی اور زمین زرخیز تھی شور یلی نہ تھی۔ سدی اور مقاتل نے کہا کہ اگر کوئی عورت سر پر ٹوکرا رکھے باغ کی قطاروں کی طرف سے گزرتی تھی تو خود بخود درختوں سے ٹوٹ کر اتنے پھل گرتے تھے کہ اس کا ٹوکرا بھر جاتا تھا ہاتھ سے توڑنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ ابن زید نے کہا ان کے شہر میں نہ مچھر تھے نہ مکھیاں اور نہ پسو نہ بچھو نہ سانپ۔ اگر کسی شخص کے کپڑوں میں جوئیں ہوتیں اور اس شہر کی طرف گزر جاتا ہے تو ہوا کی پاکیزگی کی وجہ سے ساری جوئیں مر جاتی تھیں بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ سے یہی مراد ہے یعنی وہاں کی ہوا پاکیزہ تھی۔

رَبٌّ غَفُوْرٌ مقاتل نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اگر خدا کے عطا کردہ رزق کا تم شکر ادا کرو گے تو اللہ تمہارے گناہ معاف فرما دے گا۔

وہب (بن منبہ) نے بیان کیا کہ اللہ نے قوم سبا کی ہدایت کے لئے تیرہ پیغمبر بھیجے اور ہر پیغمبر نے ان کو اللہ کی نعمتیں یاد دلائیں اور نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی نصیحت کی اور اللہ کے فرمانبردار ہونے کی دعوت دی لیکن۔

فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ پھر انہوں نے روگردانی کی تو ہم نے ان پر عرم کا سیلاب چھوڑ دیا۔ یعنی انہوں نے پیغمبروں کی تکذیب کی اور کہنے لگے ہم تو اس کو خدا کی عطا کردہ نعمت نہیں جانتے یہ تو ہماری زمین کی پیداوار ہے اور ہمارے لگائے ہوئے باغوں کے پھل ہیں۔ مترجم) تم اپنے رب سے کہہ دو کہ اگر وہ اس نعمت کو روک سکتا ہے تو روک لے۔ اس ناشکری کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ نے (بند توڑ کر) ایک عظیم الشان سیلاب جس کو سیل عرم کہا جاتا ہے ان پر چھوڑ دیا۔

اَلْعَرِمِ امر صعب سخت مصیبت عرم الرجل وہ شخص سخت بد خلق ہو گیا۔ یا سَيْلَ الْعَرِمِ سے مراد ہے سخت بارش کا سیلاب۔ بعض اقوال میں آیا ہے کہ اللہ نے سرخ پانی کا سیلاب ان پر چھوڑ دیا تھا۔ بعض نے عرم کا ترجمہ وادی کیا ہے یہ لفظ عرامة سے مشتق ہے عرامة کا معنی ہے شدت، قوت۔ بعض نے کہا عرم کا معنی ہے پانی کو روکنے کا بند۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ عرم جنگلی چوہے کو کہتے ہیں۔ بلقیس نے پانی کو روک کر جمع رکھنے کے لئے ایک بند باندھا تھا۔ جنگلی چوہے نے اس میں سوراخ کر دیا تھا۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے عرمة بروزن فرحة وہ بند جو وادی کا پانی روکنے کے لئے باندھا جائے عرمة کی جمع عرم

آتی ہے یا یوں کہا جائے کہ عرم ہے تو جمع لیکن اس کا واحد کا صیغہ (اس لفظ سے) نہیں آتا جیسے نسوۃ اور نساء آء جمع ہے لیکن اس کا واحد اس لفظ سے نہیں آتا بلکہ امراۃ آتا ہے) یا عرم کا معنی ہے وہ رکاوٹیں اور بند جو وادیوں میں (مختلف مقامات پر) بنادی جاتی ہیں یا عَرِم کا معنی ہے زور شور والا سخت تیز یا سخت بارش یا وادی۔ سَيْلَ الْعَرِمِ کی تفسیر ہر معنی کے ساتھ کی گئی ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ اور وہب وغیرہ نے بیان کیا کہ عرم ایک بند تھا جو بلقیس نے بنوایا تھا بات یہ تھی کہ وادی کے پانی پر قوم سبا والے آپس میں لڑتے تھے بلقیس نے رفع شر کے لئے ایک عرم یعنی بند بنوانے کا حکم دیا تھا۔ حمیری لغت میں عرم کا معنی بند ہے۔ چنانچہ پتھروں سے اور تارکول سے دو پہاڑوں کے درمیان ایک بند بنادیا گیا اور اوپر نیچے ترتیب کے ساتھ تین دریچے رکھے گئے اور بند سے ورے ایک بڑا حوض بنادیا گیا اور پانی نکلنے کی اس حوض میں بارہ موریاں بنائی گئیں ہر موری ایک دریا کے دہانے پر کھلتی تھی ضرورت کے وقت جس موری کو چاہتے تھے کھول لیتے تھے اور جب سینچائی کی ضرورت پوری ہو جاتی تو اس کو بند کر دیتے تھے۔ بارش کا پانی یمن کی ساری وادیوں کا یہاں جمع ہو جاتا تھا اور بند کے اندر ہی رک جاتا تھا اس وقت بلقیس باہر کی کھڑکی کھلواتی تھی کھڑکی سے پانی نکل کر حوض میں جاتا تھا۔ پھر ضرورت ہوتی تو درمیانی کھڑکی بھی کھول دی جاتی پھر اگر ضرورت ہوتی تو نچلا دریچہ بھی کھول دیا جاتا تھا اس طرح بند کے اندر کا پانی ختم نہ ہونے پاتا کہ دوسرے سال کی برسات کا پانی آکر جمع ہونے لگتا۔

یہ بند طویل مدت تک قائم رہا لیکن جب اس قوم نے اللہ سے سرکشی اور ناشکری کی تو اللہ نے ایک جنگلی چوہے کو جس کو گھونس کہا جاتا ہے ان کی تباہی پر مسلط کر دیا۔ گھونس نے بند کے نچلے حصہ میں سوراخ کر دیا۔ پانی پھٹ پڑا اور سارے کے سارے باغ ڈوب گئے اور زمین تباہ ہو گئی۔

وہب نے کہا ان لوگوں کو کسی کاہن نجومی نے بتادیا تھا کہ اس بند کو ایک چوہا برباد کر دے گا۔ اس لئے ہر دو پتھروں کی دراز (شگاف) کے پاس ایک بلی باندھ دی تھی لیکن جب بربادی کا وقت آیا اور اللہ نے انکو تباہ کرنا چاہا تو ایک بڑا سرخ چوہا آیا اور بلی پر جھپٹا بلی پیچھے ہٹ گئی اور اس شگاف میں داخل ہو گئی جو قریب ہی موجود تھا اور بند میں گھس گئی چوہا (بلی کے تعاقب میں) بند کو کھودنے لگا۔ اوپر پانی کے ریلے کی وجہ سے بند کمزور ہو تا گیا اور کسی کو اس کا علم نہ ہونے پایا آخر سیلاب آگیا اور شگاف میں گھس کر بند کو پھاڑ دیا پانی بہہ نکلا اور ان کے سارے مال و متاع کو غرق کر دیا۔ گھر ریت میں دفن ہو گئے غرض سب ڈوب گئے اور کچھ ادھر ادھر منتشر ہو گئے قوم سبا کی بربادی ایک مثال بن گئی عرب کسی قوم کی تباہی کو بیان کرتے ہیں تو کہتے ہیں۔

صار بنوا فلان ایدی سبا یا ایادی سبا

وَبَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ اُكُلٍ خَمْطٍ وَّاَثْلٍ وَّشَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ ۝

اور ہم نے ان کو دونوں باغوں کے بدلے میں دو باغ دوسرے دیئے جو بد مزہ پھل اور جھاؤ اور تھوڑی سی بیری والے تھے۔

اُكُلٍ صاحب قاموس نے لکھا ہے اُكْل بالضم اور اُكُل بضمتین پھل اور رزق خَمْطٍ اُكُل کی صفت ہے خَمْط کا معنی ہے ترش یا تلخ مزا اور اراک کا پھل یا اراک کا درخت۔ خَمِيْط ہر اس بوٹی کو کہتے ہیں جس کا مزہ تلخ ہو۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے خَمْط ہر ترش یا تلخ چیز ہر وہ بوٹی جس کے مزہ میں تلخی ہو اور ایک درخت بھی ہوتا ہے جس کی بو بیری کی طرح ہوتی ہے، ایک قاتل درخت بھی ہوتا ہے اور ہر اس درخت کو بھی کہتے ہیں جس میں کانٹے نہ ہوں اور اراک کے پھل کو بھی خمط کہتے ہیں۔ اور بعض کے نزدیک درخت اراک کو بھی خمط کہا جاتا ہے۔

بغوی نے لکھا ہے اُكُل پھل خَمْط اراک (پیلو) اور پیلو کا پھل جس کو بریر کہا جاتا ہے اکثر اہل تفسیر کا یہی قول ہے۔

مبرد کا قول ہے خَمْط ہر وہ بوٹی ہے جس کا مزہ تلخی لئے ہوئے ہو۔ ابن اعرابی کا قول ہے خَمْط ایک درخت کا پھل ہوتا ہے جس کو نسوۃ الضبع کہتے ہیں یہ خشخاش کی شکل کا ہوتا ہے جو جھڑ جاتا ہے کسی کام نہیں آتا۔

اَثْلٍ جھاؤ یا جھاؤ نما ایک درخت سے بڑا ہوتا ہے۔ قَلِيْلٍ سِدْرٍ کی صفت ہے چونکہ بیر ایک عمدہ پھل ہوتا ہے جس کا مزہ عمدہ ہوتا ہے اس لئے اس کو باغوں میں لگایا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی قلت کی صراحت کی۔ بغوی نے کہا یہ (باغوں میں لگائی جانے والی بیری) مراد نہیں۔ بلکہ جنگلی بیری مراد ہے جو کسی کام نہیں آتی نہ اس کے پتے کسی کام کے ہوتے ہیں۔

مذکورہ بالا پھل دار باغوں کے عوض بیکار درختوں کے جھنڈ کو بھی صرف ہم شکل ہونے کی بناء پر فرمایا اور اس سے استہزاء بھی مقصود ہے۔

ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا ۭ وَهَلْ نُجٰزِيْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ ۝۱۷ ہم نے یہ سزا ان کو ناشکری (یا پیغمبروں کا انکار) کرنے کی وجہ سے دی اور ہم (ایسی) سزا بڑے ناسپاس ہی کو دیا کرتے ہیں۔

وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَّقَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْرَ ۭ سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَاَيَّامًا اٰمِنِيْنَ ۝۱۸ اور ہم نے ان کے اور بستیوں کے درمیان جن کے اندر ہم نے برکت (پھول پھل کی کثرت اور دریاؤں کی بہتات) کر رکھی تھی بہت سے گاؤں آباد کر رکھے تھے جو نظر آتے تھے اور ہم نے ان دیہات کے درمیان ان کے چلنے کا ایک خاص انداز رکھا تھا۔ اور کہہ دیا تھا کہ بے خوف و خطر امن کے ساتھ چلو۔ وَجَعَلْنَا کا عطف بَدَّلْنٰا پر اگرچہ واقع میں تبدیل مؤخر تھی۔ واؤ اس جگہ صرف عطف ذکر کے لئے ہے ترتیب کے لئے نہیں ہے۔

بَيْنَهُمْ اہل سبا کے درمیان بَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا یعنی ملک شام کی بستیاں جہاں بکثرت دریا اور درخت تھے۔ اور وہاں ان کے باشندوں کو وسعت رزق حاصل تھی قری ظاہرہ یعنی وہ بستیاں قریب قریب تھیں ایک دوسری کے سامنے تھیں ایک کے بعد دوسری فوراً آجاتی تھی قَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْرَ یعنی ان بستیوں میں چلنے کے لئے ایک خاص انداز ہم نے مقرر کر دیا تھا۔ رات ایک بستی میں گزری اور دوپہری کو دوسری بستی میں پہنچ گئے۔ کھانے پینے کی چیزیں ساتھ لینے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ یہ بستیاں سبا سے شام تک تھیں۔ بعض اقوال میں آیا ہے کہ یہ دیہات چار ہزار سات سو مسلسل متصل تھے (کہیں لق و دق بیابان اور ویرانہ نہ تھا) قتادہ نے کہا عورت نکلا ہاتھ میں لے کر (خالی) ٹوکرا سر پر رکھے راستے سے گزرتی تھی اور آدھے راستے تک نہیں پہنچتی تھی کہ (راستہ کے دونوں کناروں کے درختوں سے اتنے پھل ٹوٹ کر ٹوکرے میں جمع ہو جاتے تھے کہ) ٹوکرا پھلوں سے بھر جاتا تھا یمن اور شام کے درمیان سارے راستے کی یہی کیفیت تھی۔ سِيْرُوْا فِيْهَا یعنی ہم نے ان کو اجازت دے دی تھی اور کہہ دیا تھا یا قول سے مراد قول حالی یعنی اس راستہ کا حال یہ تھا لَيَالِيَ وَاَيَّامًا رات دن یعنی جب چاہو۔

اٰمِنِيْنَ امن کے ساتھ۔ نہ دشمن کا کوئی خوف نہ کسی درندے کا ڈر نہ بھوکے پیاسے رہنے کا اندیشہ۔ اہل سبا اپنی خوش عیشی پر مغرور ہو گئے۔ بجائے شکر کے سرکش ہو گئے اور کہنے لگے۔ (ایسے پھلوں کا کیا مزہ جن کی اتنی کثرت ہے) اگر ہمارے باغوں کی درمیانی مسافت لمبی ہو جائے (اور سفر میں دشواری ہو) تو ہمارے لئے زیادہ مناسب ہوگا اس لئے۔

فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا کہنے لگے اے ہمارے رب ہمارے سفروں کی دوری بڑھا دے یعنی یمن اور شام کے درمیان بیابان اور چٹیل میدان بنا دے تاکہ ہم زاد اور توشہ ساتھ لے کر اونٹوں پر سوار ہو کر سفر کو جائیں اور (مشقت سفر کے بعد جو مال خرید کر لائیں اس میں) ہم کو تجارتی فائدہ ہو اور ہم دوسروں پر فخر کر سکیں کہ ہم بڑی بڑی مشقتیں اور صعوبتیں اٹھا کر ملک شام تک ہو آئے ہیں) اللہ نے ان کی یہ دعا بہت جلد قبول فرمالی۔

وَظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ اور انہوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا یعنی اترانے اور سرکشی کرنے کی وجہ سے خود انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔

فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ سو ہم نے انکو افسانہ بنا دیا لوگ تعجب کے ساتھ ان کے قصے بیان کرتے ہیں اور ان کی بربادی ایک کہاوت بن گئی ہے (جب کوئی قوم بالکل تباہ و برباد ہو جائے تو) لوگ کہتے ہیں۔

تفرقوا ایدی سبا

وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ　اور ان کو بالکل تتر بتر کر دیا۔ یعنی مختلف ملکوں میں پراگندہ کر دیا۔
شعبی کا بیان ہے جب ان کی بستیاں ڈوب گئیں تو لوگ مختلف ملکوں میں منتشر ہو گئے غسان شام میں آکر آباد ہو گئے ازد عمان کی طرف خزاعہ تہامہ کی جانب جزیمہ عراق کی سمت اور اوس و خزرج یعنی بنی انصار یثرب کی طرف چلے گئے۔ مدینہ میں سب سے پہلے عمرو بن عامر انصاری آیا۔ یہی اوس و خزرج کا جد اعلیٰ تھا۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ⑲　بلا شبہ اس (واقعہ) میں ہر صابر و شاکر مومن کے لئے بڑی بڑی عبرتیں ہیں۔

صَبَّارٍ گناہوں سے اپنے نفس کو روکنے والا مصیبتوں پر صبر کرنے والا اور اطاعت پر جما رہنے والا۔ شَكُوْرٍ نعمتوں کا بڑا شکر گزار۔ مقاتل نے کہا۔ صَبَّار و شَكُوْر سے اس امت کے مومن مراد ہیں۔ جو مصیبتوں پر صبر کرنے والے اور اللہ کی نعمتوں کے بڑے شکر گزار ہیں۔ مطرف کا بھی یہی قول ہے۔ میں کہتا ہوں مومن ہمیشہ بڑا صابر و شاکر ہوتا ہے۔ دنیا امتحان گاہ ہے یہاں کی راحت و نعمت بھی ایک امتحان ہے جس میں بندۂ مومن مبتلا کیا جاتا ہے اور آزمائش کی جاتی ہے کہ وہ شکر کرتا ہے یا نہیں کرتا مومن کے لئے موت بھی امتحان ہے اور زندگی بھی اللہ نے فرمایا خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا اللہ نے موت اور زندگی کو تمہاری آزمائش کے لئے پیدا کیا کہ تم میں سے کس کے عمل سب سے اچھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مومن ہمیشہ گناہوں سے اپنے آپ کو روکتا ہے۔ مصائب پر صابر اور طاعات پر ثابت قدم رہتا ہے اس کے لئے ہر مصیبت گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے اس لئے مصیبت کا لازمی اقتضا جس طرح صبر ہے۔ پھر صبر کی توفیق بھی تو اللہ کی ایک نعمت ہے جس کا شکر واجب ہے حضرت مجدد نے فرمایا محبوب کی طرف سے دی ہوئی مصیبت انعام سے زیادہ لذیذ ہوتی ہے مصیبت کا شکر تو اور بھی ضروری ہے ایک شاعر کا قول ہے۔

وصال کی حالت میں میں اپنے نفس کا ادنیٰ غلام ہوں اور فراق کی حالت میں تمام آقاؤں کا آقا ہوں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایمان کے دو حصے ہیں آدھا ایمان صبر میں ہے اور آدھا شکر میں۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔ میں کہتا ہوں مومن ہمیشہ کامل الایمان ہوتا ہے ایمان کے دونوں حصوں کا مجموعہ ہوتا ہے صرف آدھے ایمان پر بس نہیں کرتا بلکہ دوسرا آدھا بھی اس کے پاس ہوتا ہے۔

وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ⑳　اور واقعی ابلیس نے ان لوگوں کے بارے میں اپنا گمان صحیح پایا کہ یہ سب سوائے مومنوں کے ایک گروہ کے اس کی راہ پر ہو لئے۔ بعض اہل تفسیر نے عَلَيْهِمْ کی ضمیر اہل سبا کی طرف راجع کی ہے (ہم نے ترجمہ میں اسی قول کو اختیار کیا) یعنی اہل سبا میں سے جو کافر تھے ان کے متعلق شیطان کا گمان صحیح نکلا۔ مجاہد نے کہا عام انسانوں کی طرف ضمیر راجع ہے ابلیس نے اللہ کے سامنے اپنا یہ گمان ظاہر کیا تھا کہ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ تیری عزت کی قسم میں ان سب کو گمراہ کروں گا۔ یہ بھی ابلیس نے کہا تھا وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہیں پائے گا چنانچہ اس نے اپنا یہ گمان سچ کر دکھایا سچ پایا اور سوائے گروہ مومنین کے سب اس کی راہ پر لگ گئے۔

ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ جب ابلیس نے مہلت مانگی اور اللہ نے اس کو مہلت دے دی تو اس نے کہا کہ لَاُضِلَّنَّهُمْ میں ان کو ضرور گمراہ کروں گا۔ لَاُغْوِيَنَّهُمْ میں انکو ضرور کج راہ بنا دوں گا۔ لیکن ابلیس کو اس بات کو کہنے کے وقت یہ یقین نہ تھا کہ اس کی بات پوری بھی ہو سکے گی صرف گمان تھا لیکن اہل سبا جب اس کی راہ پر لگ لئے اور اس کے کہنے پر چلنے لگے تو اس کا گمان صحیح ثابت ہو گیا۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ میں الْمُؤْمِنِيْنَ سے مراد یا تو قوم سبا کا ایماندار گروہ ہے یا عام انسانوں میں سے جو مومن ہیں وہ مراد ہیں۔

سدی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اصل دین میں کسی مؤمن نے شیطان کا اتباع نہیں کیا۔ اللہ نے فرمادیا تھا اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطَانٌ یعنی میرے مؤمن بندوں پر تیرا تسلط نہ ہوگا اس تفسیر پر مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ میں مِنْ بیانیہ ہوگا۔ بعض کے نزدیک مِنْ تبعیضیہ ہے۔ یعنی بعض مؤمنوں کا گروہ مستثنیٰ ہے جو اللہ کے اطاعت گزار ہیں نافرمان نہیں۔

وَمَا كَانَ لَهٗ عَلَيْهِمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يُّؤْمِنُ بِالْاٰخِرَةِ مِمَّنْ هُوَ مِنْهَا فِيْ شَكٍّ ؕ

اور ان لوگوں پر ابلیس کا جو تسلط بطور اغوا تھا وہ، بجز اس کے اور کسی وجہ سے نہیں تھا کہ ہم کو ظاہری طور پر ان لوگوں کو جو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں ان لوگوں سے الگ کرنا ہے جو اس کی طرف سے شک میں پڑے ہیں۔ یعنی ابلیس کو کوئی قدرت نہیں تھی کہ وہ ان کو بہکا سکتا اور دلوں میں جھوٹی آرزوئیں اور امیدیں پیدا کرتا۔ مگر جب ہم نے اس کو مسلط کر دیا اور اس سے کہہ دیا وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ تو اس میں قدرت پیدا ہو گی۔

حسن نے کہا ابلیس نے ان پر تلوار نہیں سونتی نہ تلوار سے کسی کو مارا نہ کسی کے کوڑے مارے (یعنی تسلط سے مراد جبر اور مار دھاڑ نہیں) بلکہ ان سے جھوٹے وعدے اور امیدیں بندھوائیں جس کی وجہ سے وہ فریب کھا گئے اور دھوکہ میں آ گئے۔

اِلَّا لِنَعْلَمَ مگر اس لئے کہ ہم جان لیں یعنی الگ الگ چھانٹ دیں۔

ایک شبہ

آیت اِلَّا لِنَعْلَمَ سے ثابت ہو رہا ہے کہ اللہ کا علم حادث ہے پہلے نہیں تھا پھر شیطان کے تسلط اور لوگوں کے گمراہ ہونے کے بعد اس کو معلوم ہوا کہ کون آخرت پر یقین رکھتا ہے اور کون شک میں پڑا ہوا ہے۔

جواب

اللہ کا علم تو قدیم ہے (یعنی ہمیشہ سے ہے) البتہ علم کا معلوم سے تعلق حادث ہے آیت میں علم سے مراد معلوم سے علم کا تعلق ہے اس توجیہ پر اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ علم کا جب تک معلوم سے تعلق نہ ہو۔ عالم کو معلوم کا انکشاف نہیں ہوتا۔ معلوم سے تعلق کے قبل تو علم بالقوہ تھا بالفعل نہیں تھا جب معلوم سے بالفعل تعلق ہوا تو بالفعل انکشاف ہوا مطلب یہ ہوا کہ جب تک معلوم سے تعلق نہیں ہوا اس وقت تک اللہ کو علم نہ تھا۔

جواب

حادث کے موجود ہونے سے پہلے بھی اللہ کے علم کا تعلق حادث سے تھا اللہ حادث کے موجود ہونے کو جانتا تھا اس کا یہ مطلب نہیں کہ وجود حادث سے پہلے اللہ وجود حادث سے جاہل تھا۔ جاہل نہ تھا ہاں وجود حادث سے پہلے اللہ کا علم کا تعلق عدم حادث سے تھا۔ اسی صورت میں آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ وجود شی سے پہلے جس طرح ہمارے علم کا تعلق شی معدوم سے تھا وجود ایمان و کفر کے بعد ہمارے علم کا تعلق موجود کفر و ایمان سے ہو گیا۔

مزید شبہ

اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ اللہ کی ذات محل تغیر ہو گئی (پہلے عدم شی کی عالم تھی پھر وجود شی کی عالم ہو گئی۔ مناسب اور صحیح جواب یہ ہے کہ زمانہ مع اپنے تمام اجزا (ماضی، مستقبل اور حال کے اور مع ان تمام موجودات کے جن کا وجود بھی ہو لیا ہے یا ہو گا)۔ اللہ کے سامنے حاضر ہے علم خدا کا تعلق ہمیشہ اس سے رہا ہے اور ہے اور رہے گا۔ علم خدا میں کوئی تعاقب تجزی اور عدم وجود کا تغیر نہیں ہے بلکہ) تعاقب زمانہ کے اجزا (اور موجودات زمانہ) میں ہوتا ہے زید بھی معدوم تھا پھر موجود ہوا پھر معدوم ہو گیا (یہ تعاقب و تغیر زید کے عدم وجود کا ہوا) لیکن ہر حالت میں زید اللہ کے سامنے حاضر ہی ہے سابقیت و مسبوقیت تو اجزا زمانہ میں ان چیزوں میں ہوتی ہے جو زمانہ کے اندر محدود ہیں جس طرح موجودات کے اختلاف مکانی کا اثر اللہ کے علم پر نہیں پڑتا (زید

ایک مقام پر پہلے نہ تھا پھر ہو گیا پھر اس مقام کو چھوڑ گیا) اللہ کے سامنے جو ہر مقام مع اپنے اجزا اور موجودات کے حاضر ہے اس لئے اللہ کے علم میں اس سے کوئی تغیر نہیں آتا اللہ تو ہر مقام کو محیط ہے اونچا نیچا ہونا تو اس چیز کی صفت ہے۔ جس کا وجود کسی مقام پر ہو اور کوئی مقام اس کو گھیرے ہوئے ہو اللہ تو زمان و مکان کا خالق ہے اور خود زمانیت و مکانیت سے پاک ہے۔ آیت سے توا تنا معلوم ہوتا ہے کہ علم معلوم کے تابع ہے اور کسی معلوم کا حدوث اس بات کا مقتضی نہیں ہے کہ اس کا علم بھی حادث ہو۔ معلوم تو تعاقب زمانہ سے گھرا ہوا ہے اور علم زمانہ کو محیط ہے۔ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ وَرَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ۝

اور آپ کا رب ہر چیز کا نگراں ہے۔ یعنی زمانہ ہو یا زمانہ کے اندر کی چیزیں۔ مؤمن یا کافر سب کا نگراں ہے۔ کسی چیز کی طرف سے غافل نہیں ہے اس لئے ہر ایک کو اس کے عمل کے موافق بدلہ دے گا۔

قُلِ — اے محمد آپ (کفار مکہ سے) کہہ دیجئے۔

ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ۝

کہ جن کو تم سوائے خدا کے اپنے (معبود اور کارساز) سمجھ رہے ہو ان کو پکار دیکھو وہ ذرہ برابر اختیار نہیں رکھتے آسمانوں میں نہ زمین میں اور نہ ان دونوں (کے پیدا کرنے اور انتظام قائم رکھنے میں) ان کی کوئی شرکت ہے اور نہ ان میں سے کوئی (کسی کام میں) اللہ کا مددگار ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حصول منفعت یا دفع مصیبت کے لئے تم ان کو پکار دیکھو اگر (ان کی الوہیت و حکمرانی کے متعلق) تمہارا قول صحیح ہے تو وہ تمہاری مدد کریں گے یہ قیاس استثنائی شرطیہ ہے۔ لیکن وہ تو چھوٹی چیونٹی کے برابر آسمان وزمین میں ہونے والی خیر و شر کا اختیار نہیں رکھتے اس لئے تمہاری دعا قبول نہیں کر سکتے اور نہ تمہاری مدد کر سکتے ہیں حاصل یہ کہ تمہارا یہ (مخلوق کے معبود اور شریک ہونے کا) خیال ہی غلط ہے۔ آسمان وزمین کا ذکر عموم عرفی کی وجہ سے کیا یہ وجہ ہے کہ کافروں کے معبود کچھ سماوی تھے جیسے ملائکہ اور ستارے اور کچھ ارضی تھے جیسے بت یا ان دونوں کے ذکر کرنے کی یہ وجہ ہے کہ خیر و شر کے ظاہری اسباب کچھ آسمانی ہوتے ہیں اور کچھ زمینی۔

مِنْ ظَهِيْرٍ یعنی تمہارے معبودوں میں سے کوئی آسمان وزمین کے پیدا کرنے اور ان کا انتظام کرنے میں اللہ کا مددگار نہیں ہے۔

وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ۚ — اور خدا کے سامنے (کسی کی) سفارش کسی کے لئے کام نہیں آئے گی۔ ہاں اس کے لئے کام آئے گی جس کے لئے سفارش کرنے کی سفارش کرنے والے کو اللہ اجازت دے دے گا۔ یعنی شفیع کو اجازت دے دے گا یا جس کے لئے شفاعت کئے جانے کی اجازت دے دے گا۔ لَهٗ کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں شفیع کی طرف بھی ضمیر راجع ہو سکتی ہے اور جس کی سفارش کی جائے۔ اس کی طرف بھی کافر (ہارکر) آخر درجہ پر کہتے تھے کہ ہم مانتے ہیں ملائکہ اور بت خود کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتے اور یہ اللہ کے شریک نہیں ہیں لیکن ہم انکی پوجا تو اس لئے کرتے ہیں کہ خدا کی بارگاہ میں یہ ہماری شفاعت کریں گے انکی تردید میں آیت مذکورہ نازل ہوئی اور اللہ نے فرمایا کہ بغیر اذن الٰہی کے کوئی کسی کی سفارش نہیں کرے گا۔ بت تو ظاہر ہے بے جان ہیں اس امر کے قابل ہی نہیں ہیں کہ ان کو شفاعت کرنے کی اجازت ملے اب رہے وہ لوگ جن کی سفارش کا امکان ہے ان میں کافر اپنی حد سے بڑھی ہوئی سرکشی اور طغیانی کی وجہ سے شفاعت پانے کے مستحق نہیں ہیں اس لئے انبیاء (اولیاء) اور ملائکہ کو صرف مؤمنوں کی شفاعت کرنے کی اجازت دی جائے گی۔

حَتّٰٓى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّكُمْ ۭ قَالُوا الْحَقَّ ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ۝

یہاں تک کہ جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہو جاتی ہے تو ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں تمہارے رب نے کیا فرمایا وہ کہتے ہیں (فلاں) حق بات فرمائی اور وہ عالی شان سب سے بڑا ہے۔ فُزِّعَ (تفزیع سے ماضی مجہول) تفزیع کا معنی ہے فزع

گھبراہٹ دور کردیا جیسے تمریض مرض کو زائل کردیتا۔ پہلے کلام سے شفاعت کرنے والے اور وہ جن کی شفاعت ہوسکتی ہے دونوں سمجھے جاتے ہیں اس لئے قُلُوْبِهِمْ کی ضمیر شافعین اور مشفوع لہم دونوں کی طرف راجع ہے اور حَتّٰٓى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ کا تعلق ایک محذوف جملہ سے ہے جو سابق کلام سے سمجھا جارہا ہے سابق کلام سے یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ شفاعت کرنے والے اور جن کے لئے شفاعت کی جائے گی وہ سب گھبرائے ہوئے اذن شفاعت کے منتظر ہوں گے ان کو خوف ہوگا کہ کہیں شفاعت کی اجازت نہ ملے یا یوں کہا جائے کہ جب شفاعت کی اجازت ہوجائے گی تو اللہ کا کلام سننے سے ان پر غشی کی کیفیت طاری ہوجائے گی وہ اللہ کی جلالت شان اور عظمت سے خوف زدہ ہوجائیں گے۔ میں کہتا ہوں اسی طرح جب اللہ کوئی حکم جاری فرماتا تو فرشتوں پر گھبراہٹ کی وجہ سے غشی طاری ہوجاتی ہے۔ بخاری نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ جب آسمان میں حکم جاری فرماتا ہے تو عاجزی سے ملائکہ اپنے بازو پھٹ پھٹاتے ہیں (اس کی آواز ایسی ہوتی ہے) جیسے پتھر کی چٹان پر کوئی زنجیر ماری جائے، پھر جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور کردی جاتی ہے تو باہم پوچھتے ہیں تمہارے رب نے کیا فرمایا۔ دوسرے ملائکہ کہتے ہیں حق فرمایا اور عالی شان سب سے بڑا ہے یہ بات چوری سے سننے والے (جنات) اور پھر (ان کے نیچے) چوری سے سننے والے سن پاتے ہیں اس طرح نیچے والے اوپر والوں سے سنتے چلے جاتے ہیں۔ سفیان نے اپنے ہاتھ کو ذرا ترچھا کر کے ترتیب وار انگلیوں کو الگ الگ کر کے بتایا کہ اس طرح اوپر نیچے جنات لگے ہوتے ہیں اوپر والا وہ بات سن پاتا ہے تو نیچے والے کو القاء کردیتا ہے پھر وہ اپنے نیچے والے کو القاء کرنے سے پہلے ہی اوپر والے پر ایک انگارہ آ پڑتا ہے۔ (اور اس کو جلا ڈالتا ہے) اور کبھی القاء کے بعد انگارا آلگتا ہے ساحر یا کاہن کو جب اس بات کا علم ہوجاتا ہے تو وہ اپنی طرف سے اس میں) سو جھوٹ ملا کر بیان کرتا ہے (جب وہ ایک بات صحیح ہوجاتی ہے) تو کہا جاتا ہے کہ کیا فلاں دن کاہن یا ساحر نے ہم سے ایسا ایسا نہیں کہا تھا۔ چنانچہ آسمان سے سنی جانے والی اس ایک بات کی تصدیق کی جاتی ہے۔ مسلم نے بوساطت حضرت ابن عباسؓ ایک انصاری کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک طویل حدیث میں فرمایا ہمارا رب تبارک اسمہ (اس کا نام بابرکت ہے) جب کوئی حکم نافذ کرتا ہے تو حاملین عرش (عرش کو اٹھانے والا ملائکہ) تسبیح پڑھتے ہیں پھر ان سے متصل آسمان والے تسبیح پڑھتے ہیں بالآخر وہ حکم اسی طرح اس آسمان دنیا پر رہنے والوں تک پہنچ جاتا ہے اور وہ تسبیح پڑھتے ہیں وہ ملائکہ جو حاملین عرش کے متصل ہیں حاملین عرش سے پوچھتے ہیں تمہارے رب نے کیا فرمایا حاملین عرش اللہ کا فرمان بیان کردیتے ہیں۔ اسی طرح نچلے آسمان والے اونچے آسمان والوں سے پوچھتے چلے جاتے ہیں۔ اور وہ بیان کرتے چلے جاتے ہیں بالآخر یہ سلسلہ (سوال و جواب) اس دنیوی آسمان تک پہنچتا ہے یہاں سے کوئی جن اس بات کو جھپٹ کر سن پاتا ہے اور اپنے دوستوں کی طرف پھینک دیتا ہے (یعنی جلدی سے کہہ دیتا ہے ان پر انگارے مارے جاتے ہیں سو جن اگر وہ بات صحیح صحیح پہنچا دیتے ہیں تو وہ حق ہوتی ہے لیکن وہ اس میں زیادتی کرتے ہیں۔

بغوی نے حضرت نواس بن سمعان کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب اللہ کسی امر کا ارادہ کرتا ہے تو وحی کے ذریعہ سے کلام کرتا ہے جس کو سن کر اللہ کے خوف سے آسمان لرز جاتے ہیں جب آسمان والے اس کلام کو سنتے ہیں تو بے ہوش ہوجاتے ہیں اور سب سجدہ میں گر پڑتے ہیں سب سے پہلے جبرئیل (سجدہ سے) سر اٹھاتے ہیں اللہ جو کچھ چاہتا ہے ان کو وحی کلامی کرتا ہے پھر جبرئیل ملائکہ کی طرف سے گزرتے ہیں اور جس آسمان سے گزرتے ہیں وہاں کے ملائکہ ان سے دریافت کرتے ہیں ہمارے رب نے کیا فرمایا: جبرئیل جواب دیتے ہیں اللہ نے جو کچھ فرمایا وہ حق ہے اللہ عالی شان بڑی عظمت والا ہے یہ سن کر سب ملائکہ وہی بات کہتے ہیں پھر جبرئیل کہتے ہیں آخر جہاں وحی پہنچانے کا اللہ نے حکم دیا ہوتا ہے جبرئیل وہاں وحی پہنچا دیتے ہیں قَالُوْا یعنی اذن شفاعت حاصل ہونے سے پیدا ہونے والی گھبراہٹ دور ہونے کے بعد انہوں نے کہا مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ یعنی شفاعت کی اجازت جن مومنوں کے متعلق دی گئی ہے وہ حق ہے الْعَلِیُّ الْكَبِیْرُ وہی بڑے بلند مرتبہ اور بزرگی والا ہے کوئی مقرب فرشتہ یا نبی مرسل بغیر اذن کے اس کے سامنے بول نہیں سکتا۔ بغوی نے لکھا ہے فرشتے قیامت برپا ہوجانے

کے خوف سے گھبرا جائیں گے مقاتل سدی اور کلبی نے کہا۔ حضرت عیسیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی درمیانی مدت ۵۵۰ برس اور بقول بعض ۶۰۰ سو برس کی تھی۔ یہ انقطاع وحی کا زمانہ (فترت) تھا اس مدت میں ملائکہ نے کوئی وحی کی آواز نہیں سنی جب رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے اور فرشتوں نے وحی کی آواز سنی تو انہوں نے خیال کیا کہ قیامت آگئی کیونکہ آسمان والوں کو اس کا علم تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت قیامت کی علامت ہے پس جب وحی کی آواز سنی تو قیامت برپا ہونے کے خوف سے بے ہوش ہو گئے۔ جب ابتداء وحی کے موقع پر حضرت جبرئیل (بارگاہ خداوندی سے) نیچے اترے تو جس آسمان کی طرف سے گزرے تو وہاں کے باشندوں نے سر اوپر اٹھائے اور ایک نے دوسرے سے پوچھا تمہارے رب نے کیا فرمایا؟ دوسروں نے جواب دیا حق فرمایا۔ حق سے مراد وحی ہے۔

ایک شبہ

مقاتل اور کلبی وغیرہ کی تفسیر پر آیت حَتّٰٓی اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ کا ربط گزشتہ کلام سے کس طرح ہوگا (کیونکہ گزشتہ کلام میں تو شفاعت کا بیان تھا اور اس آیت میں نزول وحی کے وقت بے ہوشی طاری ہو جانے اور پھر گھبراہٹ دور ہونے کے بعد سوال وجواب کرنے کا بیان ہے) شفاعت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

ازالہ:۔ ارتباط کی توجیہ اس طرح کی جاسکتی ہے کہ آیت وَيَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ وَيَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ سے ہے اور اَلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ سے مراد ہیں ملائکہ۔ ان دونوں آیتوں کے درمیان کی عبارت بطور معترضہ ہے اور پورا مطلب اس طرح ہوگا کہ ملائکہ جانتے ہیں کہ جو قرآن آپ کے پاس آپ کے رب کی طرف سے بھیجا گیا ہے وہ حق ہے اس لئے نزول قرآن کے وقت قیامت برپا ہو جانے کے خوف سے وہ گھبرا جاتے ہیں کیونکہ نزول قرآن قیامت کی علامت ہے یہاں تک کہ جب ان کی گھبراہٹ دور ہو جاتی ہے تو وہ کہتے ہیں تمہارے رب نے کیا فرمایا؟ دوسرے جواب دیتے حق فرمایا (یعنی کلمات وحی ارشاد فرمائے) اور وہ بڑی شان والا عظمت والا ہے۔

اہل تفسیر کی ایک جماعت کا قول ہے کہ آیت مذکورہ میں مشرکوں کی حالت بیان کی ہے حسن اور ابن زید نے کہا کہ نزول موت کے وقت مشرکوں کو جو گھبراہٹ ہوتی ہے حجت پوری کرنے کے لئے جب وہ گھبراہٹ ان کے دلوں سے دور کر دی جاتی ہے تو مشرک کہتے ہیں پیغمبروں کی زبانی تمہارے رب نے دنیا میں کیا فرمایا تھا۔ دوسرے مشرک کہتے ہیں (جو کچھ فرمایا) حق فرمایا۔ گویا مشرک ایسے وقت قرآن کی صداقت کا اقرار کرتے ہیں جو ان کے لئے مفید نہیں ہوتا۔ میں کہتا ہوں اس تفسیر کی بناء پر آیت زیر بحث کا ربط آیت هُوَ فِيْ شَكٍّ سے ہو جائے گا یعنی موت تک مشرک شک میں پڑے رہتے ہیں۔ آخر مرنے کے بعد ان کا شک دور (شہودی) یقین پیدا ہو جاتا ہے تو اقرار کرتے ہیں مگر بے سود۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ آپ ان سے سوال کیجئے کہ آسمانوں سے (بصورت بارش) اور زمین سے (بصورت سبزہ) کون رزق عطا فرماتا ہے۔ یہ استفہام تقریری ہے یعنی بصورت سوال مخاطب کو آمادہ کرنا مقصود ہے کہ وہ اللہ کے رازق لاشریک ہونے کا اقرار کرے۔ اس جملہ میں آیت لَا يَمْلِكُوْنَ کے مضمون کی تاکید ہے اور اس جملہ کا تعلق قُلِ ادْعُوْا سے ہے۔

قُلِ اللّٰهُ آپ (اس سوال کے جواب میں خود ہی) کہہ دیجئے کہ صرف اللہ ہی تم کو رزق عطا فرماتا ہے (کیونکہ اس سوال کا جواب سوا اس کے اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔

آیت میں ایماء ہے۔ اس امر کی طرف کہ اگر وہ اقراری مجرم بن جانے کے خوف سے جواب دینے میں تامل کریں اور خاموش رہیں تو آپ (ان کی بجائے) جواب دے دیجئے۔

وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ اور (یہ بھی کہہ دیجئے کہ) ہم یا تم ضرور راہ راست پر ہیں یا صریح گمراہی میں ہیں یعنی ہم اہل توحید یا تم اصحاب شرک راہ راست پر ہیں یا ہم میں سے کوئی گمراہی میں ہیں۔

توحید کا معنی ہے نفی شرک توحید شرک کی نقیض ہے جس طرح ضلال اور ہدایت کے درمیان تناقض ہے کیوں کہ ضلال نفی ہدایت کا نام ہے ایسا نہیں ہو سکتا کہ دونوں باتیں (توحید و شرک اور گمراہی و ہدایت) صحیح ہوں۔ یا دونوں میں کوئی صحیح نہ ہو آیت سابقہ سے ثابت ہو رہا ہے کہ روزی دینے والا صرف اللہ ہے کوئی اور رازق نہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اہل توحید یا ہدایت پر ہیں یا گمراہی میں ہیں اور ان کا ہدایت پر ہونا تو یقینی ہے۔ کیوں کہ رازق سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں تنہا وہی رازق ہے۔ اس لئے اہل توحید گمراہی میں نہیں ہیں یا صورت استدلال اس طرح قرار دی جائے کہ اہل توحید یا ہدایت پر یا گمراہی میں ہیں لیکن ان کا گمراہی میں نہ ہونا تو یقینی ہے اس لئے وہی ہدایت پر ہیں یا یوں قیاس استثنائی کی ترتیب دی جائے مشرک یا ہدایت پر ہیں یا کھلی ہوئی گمراہی میں اور چوں کہ وہ ہدایت پر نہیں ہیں اس لئے لازمی طور پر گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں یا یوں کہا جائے چوں کہ رازق اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ اس لئے مشرک گمراہ ہیں اور گمراہ ہیں تو ہدایت پر نہیں ہیں۔

اس کلام کی بناء شک پر نہیں ہے (لفظ او تردید کے لئے ضرور ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ متکلم کو کوئی شک ہے) بلکہ طرز کلام مناظرانہ ہے جو احتمالات ہو سکتے تھے ان کو بطور حصر بیان کر دیا ہے اور ایک نقیض کا ابطال دوسرے نقیض کے اثبات سے یا ایک نقیض کا اثبات دوسرے نقیض کے ابطال سے کیا ہے۔

قُلْ لَّا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّآ اَجْرَمْنَا وَلَا نُسْـَٔلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ۝ آپ کہہ دیجئے کہ (اگر ہم نے کوئی جرم کیا ہو گا تو) ہمارے جرائم کی تم سے باز پرس نہیں ہو گی اور نہ تمہارے اعمال کی ہم سے باز پرس ہو گی یعنی میں جو تم کو توحید کے ماننے اور شرک چھوڑ دینے کا حکم دے رہا ہوں۔ یہ محض تمہاری خیر خواہی کے پیش نظر ہے ورنہ کسی کو دوسرے کے عمل سے ضرر نہیں پہنچے گا نہ مجھے نہ تمہیں۔

اس کلام میں توحید کو ماننے کی ترغیب ہے۔ اَجْرَمْنَا کے لفظ میں ارتکاب جرم کی اپنی طرف نسبت کی اور تَعْمَلُوْنَ کے لفظ میں (جرم کی نسبت مخاطب کی طرف نسبت نہیں کی بلکہ) عمل کی نسبت مخاطبوں کی طرف کی یہ تقاضا تہذیب کا مظاہرہ اور خیر خواہی کا اظہار ہے جو ہر قسم کے تعصب سے آزادانہ طرز بیان ہے۔

قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ۭ وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ۝ آپ کہہ دیجئے کہ ہمارا رب ہم کو (یعنی مجھے اور تمہیں قیامت کے دن) جمع کرے گا پھر ہمارے درمیان فیصلہ حق کر دے گا وہی بڑا فیصلہ کرنے والا اور جاننے والا ہے یَفْتَحُ فیصلہ کر دے گا حکم دے دے گا بِالْحَقِّ یعنی ہم میں سے جو کوئی جس بدلہ کا مستحق ہے اللہ وہی بدلہ اس کو دے دے گا۔ حق پرستوں کو جنت میں اور باطل پرستوں کو دوزخ میں داخل کر دے گا۔ اَلْفَتَّاحُ حاکم اور لاینحل معاملات کا فیصلہ کرنے والا۔ اَلْعَلِيْمُ یعنی فیصلہ کیا ہونا چاہئے اس کو خوب جاننے والا۔ آیت سابقہ میں کفار کی مذمت کا اظہار بطور مناظرہ کیا گیا ہے اور اس کے بعد مذمت بطور خیر خواہی ہے اور اس آیت میں بطور تنبیہ کفار کی مذمت کی گئی ہے اور بتایا گیا کہ قیامت کے دن کافروں کا فیصلہ اللہ کے حکم سے ہو گا۔ (یعنی کافروں کا ٹھکانا دوزخ ہو گا)

قُلْ اَرُوْنِيَ الَّذِيْنَ اَلْحَقْتُمْ بِهٖ شُرَكَاۗءَ آپ کہہ دیجئے مجھے ذرا وہ تو بتاؤ جن کو تم نے شریک بنا کر خدا کے ساتھ ملا رکھا ہے۔

اَرُوْنِيَ (مجھے دکھاؤ) سے مراد ہے مجھے بتاؤ۔ اَلْحَقْ سے مراد ہے استحقاق الوہیت میں خدا کے ساتھ ملا دینا مطلب یہ ہے کہ کس صفت کی وجہ سے تم نے اپنے معبودوں کو اللہ کا شریک بنا رکھا ہے کیا وہ کوئی چیز پیدا کرتے ہیں یا کسی کو نفع و ضرر پہنچا سکتے ہیں یا روزی دیتے ہیں جب ان اوصاف میں سے کوئی وصف ان کے اندر نہیں تو ان کو شریک خدا قرار دینے کی وجہ جواز نہیں اتمام حجت اور مدلل ثبوت کے بعد پھر وجہ شرک کا استفسار حقیقت میں لاجواب بنانے کی تکمیل ہے۔

كَلَّا ۭ ہرگز نہیں۔ جب ظاہر ہو گیا کہ کسی صفت الوہیت میں کوئی اللہ کا شریک نہیں تو اب اس لفظ سے بازداشت فرمائی کہ ہرگز کسی کو الوہیت میں خدا کے ساتھ نہ ملاؤ۔

بَلْ هُوَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۷﴾ بلکہ وہ (یعنی مستحق معبودیت) اللہ ہی ہے جو بڑے غلبہ اور حکمت والا ہے۔ یعنی عزت قاہرہ اور حکمت کاملہ اللہ ہی کو حاصل ہے کسی صفت میں کوئی اس کا ساجھی نہیں پھر کس طرح اس کی معبودیت میں ان جمادات کو شریک قرار دینا جائز ہو گا جو ممکنات (مخلوقات) میں بھی سب سے نچلے درجے پر ہیں اور علم و قدرت سے (بلکہ حرکت و نمو سے بھی) یکسر محروم ہیں۔

ھو ضمیر مستحق عبادت کی طرف راجع ہے اور جملہ کی ساخت مفید حصر ہے یعنی مستحق عبادت اللہ کے سوا کوئی نہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا

اور ہم نے تو آپ کو تمام لوگوں کے لئے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے (جنت کی) بشارت دینے والا اور دوزخ سے ڈرانے والا۔ کَآفَّةً موصوف محذوف کی صفت ہے یعنی اِرسالۃً کَافَّۃً اور کافۃ کا معنی ہے عام جس سے کوئی مستثنیٰ نہیں۔ مطلب اس طرح ہو گا کہ سب لوگوں کے لئے آپ کو رسالت عامہ دے کر ہم نے بھیجا ہے کوئی شخص آپ کے دائرۂ رسالت سے باہر نہیں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کافۃ میں ت مبالغہ کی ہو یعنی ہم نے آپ کو ایسی حالت میں بھیجا کہ آپ سب لوگوں کو اپنے دائرۂ رسالت میں جمع کرنے والے ہیں۔ حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے پانچ چیزیں (خصوصیت کے ساتھ) عطا کی گئیں ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں دی گئیں (۱) مجھے یہ بات دی گئی کہ ایک ماہ کی مسافت پر میرا رعب (دشمنوں کے دلوں میں) ڈالا گیا۔ (۲) تمام زمین کو میرے لئے مسجد اور حصول طہارت کا ذریعہ بنا دیا گیا۔ لہٰذا میری امت میں سے جس کسی کے لئے نماز کا وقت آ پہنچے۔ وہ (جس پاک جگہ پر) نماز پڑھنا چاہے وضو کر کے اور پانی کے فقدان کی صورت میں مٹی سے تیمم کر کے نماز پڑھ لے (۳) میرے لئے مال غنیمت حلال کیا گیا مجھ سے پہلے کسی کے لئے حلال نہیں کیا گیا (۴) مجھے شفاعت کبریٰ عطا کی گئی (۵) ہر نبی کو صرف اس کی قوم کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا لیکن مجھے سب لوگوں کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا ہے۔ متفق علیہ۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھ کو چھ چیزیں عطا فرما کر (دوسرے انبیاء پر) فضیلت دی گئی (۱) مجھے جوامع الکلم (الفاظ جامعہ مختصر جو زیادہ معانی کو حاوی ہوں) دیئے گئے (۲) (دشمن پر) رعب (ڈال کر اس کے) ذریعہ سے میری مدد کی گئی (۳) میرے لئے مال غنیمت حلال کیا گیا (۴) زمین کو میرے لئے مسجد اور ذریعہ طہارت بنا دیا گیا (۵) مجھے سب لوگوں کی طرف ہدایت کے لئے بھیجا گیا (۶) مجھ پر (سلسلہ) انبیاء کا خاتمہ کر دیا گیا۔

آیت کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ہم نے آپ کو روکنے والا بنا کر بھیجا کہ کافروں کو کفر سے دنیا اور دوزخ میں گرنے سے آخرت میں آپ روکتے ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ میری مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص نے آگ جلائی تھی ہو جب چاروں طرف آگ کی روشنی پھیل گئی ہو تو پتنگے اور یہ کیڑے مکوڑے اس میں گرنے لگے ہوں وہ شخص کتنا ہی آگ میں گرنے سے روکتا ہو مگر پتنگے اس میں زبردستی گر رہے ہوں میں بھی اسی طرح پیچھے سے تمہاری کمر پکڑ کر آگ میں گھسنے سے روک رہا ہوں مگر تم آگ میں گھسے پڑتے ہو۔ حدیث متفق علیہ ہے۔ الفاظ بخاری کے ہیں۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کَآفَّةً النَّاسِ سے حال ہو اور اہمیت جتانے کے لئے حال کو مقدم کر دیا ہو۔ یعنی ہم نے تم کو سب لوگوں کی ہدایت کے لئے بھیجا گورے کالے سب تمہارے دائرۂ تبلیغ میں داخل ہیں۔ اکثر علماء نحو کے نزدیک یہ ترکیب ناجائز ہے کیوں کہ معمول مجرور کا جار پر تقدم صحیح نہیں۔

بَشِيْرًا اہل ایمان کو جنت کی بشارت دینے والا۔ نَذِيْرًا اور کافروں کو دوزخ سے ڈرانے والا۔

وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾ لیکن اکثر لوگ (یعنی کافر) نہیں جانتے یعنی یقین نہیں کرتے بلکہ آپ کی رہنمائی کو مخالفت اور عداوت سمجھتے ہیں۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اور انتہائی جہالت کی وجہ سے بطور استہزاء و تکذیب کہتے ہیں کہ یہ ڈرانے اور بشارت دینے کا وعدہ کب آئے گا (یعنی کب پورا ہو گا) یا وعد بمعنی موعود ہے۔ یعنی جس عذاب و ثواب کا تم وعدہ کرتے ہو وہ کب آئے گا۔

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ اگر تم سچے ہو (تو معین وقت بتاؤ) یہ خطاب کافروں کی طرف سے رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو تھا۔

قُلْ لَّكُمْ مِّيْعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً وَّلَا تَسْتَقْدِمُوْنَ ۝ آپ کہہ دیجئے کہ تمہارے (حساب کتاب اور عذاب ثواب) کے لئے ایک خاص دن کا وعدہ مقرر ہے جس سے نہ گھڑی بھر پیچھے رہ سکتے ہو نہ آگے بڑھ سکتے ہو۔

مِيْعَادُ يَوْمٍ یعنی (مقرر وخاص) دن کا وعدہ یا وعدہ کا وقت یوم سے مراد قیامت کا دن ہے۔ ضحاک نے کہا موت کا وقت مراد ہے آگے پیچھے نہ ہٹنے سے مراد یہ ہے کہ مدت عمر میں نہ زیادتی ہو سکتی ہے نہ کمی۔ ان کا سوال استہزائی اور انکاری تھا اسی کے مطابق جواب بھی تہدید آمیز دیا گیا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ اور کافروں نے کہا ہرگز نہ اس قرآن کو مانیں گے۔ اور نہ اس سے پہلے والی (توریت وانجیل) کو کافروں نے اہل کتاب سے رسول اللہ ﷺ کے متعلق دریافت کیا کہ کیا یہ نبی ہیں؟ اہل کتاب نے بتایا ان کے اوصاف ہماری کتابوں میں موجود ہیں۔ اس پر مشرک غضبناک ہو گئے اور یہ بات کہی جو آیات میں بیان کی گئی ہیں۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اَلَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ سے رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی مراد ہو ایک قول یہ بھی آیا ہے کہ اَلَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ سے روز قیامت اور جنت دوزخ مراد ہے (یہ سب چیزیں مستقبل میں آنے والی ہیں۔)

وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۖۚ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ ِۨالْقَوْلَ ۚ اور اگر آپ ان کی اس وقت حالت دیکھیں گے تو ہولناک منظر آپ کو دکھائی دے گا جب ان ظالموں کو (حساب کے لئے) ان کے رب کے سامنے کھڑا کیا جائے گا یعنی روکا جائے گا ایک دوسرے پر بات ڈالتا ہوگا۔

تَرٰى کا مخاطب رسول اللہ ﷺ ہیں یا مخاطب عام ہے کوئی ہو۔ يَرْجِعُ باہم گفتگو کا الٹ پلٹ کرتے ہوں گے۔ ایک دوسرے پر بات ڈال رہا ہوگا۔ چنانچہ:

يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْلَاۤ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ ۝ ادنیٰ درجہ کے لوگ بڑے لوگوں سے کہیں گے اگر تم نہ ہوتے تو ہم مؤمن ہو گئے ہوتے (اس پر)

قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْۤا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ ۝ وہ بڑے لوگ ادنیٰ درجہ کے لوگوں سے کہیں گے کیا ہم نے (ہدایت کو ماننے اور اس پر عمل کرنے سے) تم کو زبردستی روک دیا تھا بعد اس کے کہ ہدایت تم کو پہنچ گئی تھی۔ (نہیں) بلکہ تم خود ہی قصوروار ہو۔

اَلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا سے مراد ہیں نچلے طبقہ والے یعنی پیروی کرنے والے اَلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا سے مراد ہیں سرداران قوم۔ لَوْلَاۤ اَنْتُمْ یعنی اگر تم ہم کو اللہ اور رسول ﷺ پر ایمان لانے سے نہ روکتے اور کفر کی دعوت نہ دیتے لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ تو ہم پیغمبر پر ضرور ایمان لے آتے تم نے ہی ہم کو عذاب میں ڈالا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ استفہام انکاری ہے یعنی ہم نے تم کو نہیں روکا تھا۔ اس آیت سے اس امر کو ثابت کیا کہ ادنیٰ درجہ کے لوگوں نے خود اپنے آپ کو ایمان سے روکا۔ بے دلیل کافروں کی پیروی اور اتباع کو اختیار کیا اور اس رسول کی متابعت ترک کی جس کے دعویٰ کی تصدیق معجزات سے ہوتی تھی۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ (اس کے جواب میں) کم درجہ کے لوگ ان بڑے لوگوں سے کہیں گے ہم یہ نہیں کہتے کہ تم نے ہم پر زبردستی کی تھی بلکہ تمہاری رات دن کی پرفریب تدبیروں نے روکا تھا۔ بعض علماء نے کہا رات دن کے مکر سے مراد ہے زمانہ کا فریب طول آرزو

اور طول سلامتی۔

اِذْ تَاْمُرُوْنَنَآ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَ نَجْعَلَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ؕ جب کہ تم ہم کو مشورہ دیتے تھے کہ ہم اللہ کے ساتھ کفر کریں۔ (یعنی اللہ کے ایک ہونے کا انکار کریں) اور اس کے شریک بنائیں۔

اَنْ نَّكْفُرَ میں اَنْ مفسرہ ہے یا مصدریہ مؤخر الذکر صورت میں ب محذوف مانی جائے گی۔

وَ اَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ؕ جب وہ دونوں فریق سردار اور ان کے پیرو عذاب کو دیکھ لیں گے تو (دلوں کے اندر گمراہ ہونے اور گمراہ کرنے پر پشیمان ہوں گے اور اس) پشیمانی کو ہر فریق والے دوسرے فریق والوں سے چھپائیں گے۔

تاکہ ایک فریق دوسرے فریق پر طعنہ کر سکے یا اَسَرُّوْا میں ہمزہ سلب ماخذ کے لئے ہے جیسے اَشْكَيْتُهٗ میں نے اس کی شکایت زائل کر دی اس صورت میں اَسَرُّوْا کا معنی ہوگا اَظْهَرُوْا یعنی وہ ندامت ظاہر کریں گے۔

وَ جَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِیْٓ اَعْنَاقِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ؕ اور (دوزخ کے اندر) ہم کافروں کے گلوں میں طوق ڈال دیں گے۔ بجائے ضمیر کے اَلَّذِیْنَ كَفَرُوْا صراحت کے ساتھ کہنے سے طوق ڈالنے کی اصل علت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

هَلْ یُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ ان کو سزا نہیں دی جائے گی مگر ان ہی اعمال کی جو وہ کرتے تھے۔ ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے بوساطت سفیان عاصم کی روایت سے ابورزین کا بیان نقل کیا ہے کہ دو آدمی شریک تھے جن میں سے ایک ملک شام کو چلا گیا۔ دوسرا (مکہ میں ہی) رہا جب رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی تو مقیم شخص نے مسافر کو یہ خبر لکھ کر بھیجی مسافر نے مقیم کو لکھا کہ اس شخص کا جس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے کیا بنا مقیم نے جواب میں لکھا قریش میں سے صرف نچلا طبقہ اور غریب لوگ اس کے پیرو ہوئے ہیں۔ جونہی یہ تحریر مسافر کو ملی وہ اپنی تجارت چھوڑ کر اپنے ساتھی مقیم شخص سے آکر ملا اور کہا مجھے اس شخص کا پتہ بتادو۔ یہ مسافر شخص بعض (سابقہ آسمانی) کتابیں پڑھا کرتا تھا۔ غرض رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچ گیا اور سوال کیا آپ کس بات کی دعوت دیتے ہیں حضور ﷺ نے فرمایا فلاں فلاں (اوامر و نواہی) کی یہ سنتے ہی وہ بول اٹھا۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں حضور ﷺ نے فرمایا تم نے کیسے جانا کہنے لگا۔ جو نبی بھی مبعوث ہوا (پہلے پہلے) نچلا طبقہ اور غریب لوگ ہی اس کے پیرو ہوئے اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَ مَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝ اور ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا یعنی پیغمبر نہیں بھیجا مگر (جب بھیجا تو) وہاں کے خوش حال لوگوں نے کہا کہ جو کچھ (احکام) تم کو دے کر بھیجا گیا ہے ہم ان کے منکر ہیں۔

اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کو کہلا بھیجا کہ تمہارے قول کی تصدیق اللہ نے نازل فرما دی مُتْرَفُوْهَآ خوش حال لوگ۔ خوش حال لوگوں کا خصوصی تذکرہ انکار رسالت کے لئے کیا کہ عموماً غرور اور دنیوی دولت مندی پر فخر اور لذت اندوزی میں انہماک اور غریبوں کو ذلیل جاننا انکار رسالت کا موجب ہوتا ہے اسی لئے منکروں نے تکذیب کے ساتھ استہزاء اور فخر کو بھی ملا دیا۔

وَ قَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا ۙ اور انہوں نے کہا ہم تم سے زیادہ مال و اولاد والے ہیں۔ یعنی اللہ نے یہ سب کچھ تم سے زیادہ ہم کو دے رکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم اللہ کے محبوب اور چہیتے ہیں اس لئے جس بات کے تم مدعی ہو اس کے ہم زیادہ حق دار ہیں۔

وَّ مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ ۝ اور ہم کو عذاب نہیں دیا جائے گا یعنی اول تو عذاب ثواب ہی نہ ہوگا اور اگر عذاب ہوا تو ہم کو عذاب نہیں دیا جائے گا کیونکہ اللہ نے دنیا میں ہم کو عزت عطا کی ہے اس لئے آخرت میں ذلیل نہیں کرے گا مشرکوں

کے اس خیال کو رد کرنے کے لئے فرمایا۔

قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ آپ کہہ دیجئے بلاشبہ میرا رب جس کی روزی (دنیا میں بطور آزمائش) کشادہ کرنا چاہتا ہے کشادہ کر دیتا ہے اور (جس کی روزی بطور امتحان تنگ کرنا چاہتا ہے اس کو روزی) نپی تلی دیتا ہے۔ یعنی روزی کی تنگی فراخی تحقیر و اعزاز کا معیار نہیں ہے دنیا امتحان گاہ ہے دار الجزاء نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ لوگوں کے احوال (دولت و افلاس کے لحاظ سے) مختلف ہوتے ہیں باوجودیکہ اوصاف و خصوصیات (علمی و جسمانی) ایک جیسے ہوتے ہیں۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۟ لیکن اکثر لوگ (یعنی کافر) اس حقیقت کو نہیں جانتے اس لئے ان کا خیال ہوتا ہے کہ مال و اولاد کی کثرت عزت افزائی کا موجب ہے۔

وَمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِیْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰۤی اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا اور تمہارے اموال و اولاد ایسی چیز نہیں جو درجہ میں تم کو ہمارا مقرب بنا دے مگر ہاں جو ایمان لائے اور اچھے کام کرے۔

اخفش نے کہا زُلْفٰی (بمعنی تقریب) اسم مصدر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے مال و اولاد کے ساتھ تمہارے اندر ایسی خصلت نہیں ہے جو تم کو اللہ کے قرب میں پہنچا دے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بِالَّتِیْ میں ب زائد ہو اس صورت میں یہ مطلب ہوگا کہ تم سب کے مال اولاد ایسی چیز نہیں جو قرب الٰہی میں پہنچا دے۔

اِلَّا مَنْ اٰمَنَ میں استثناء منقطع ہے مطلب یہ ہوگا لیکن جو نیکوکار مومن ہو اس کا ایمان اور عمل قرب الٰہی میں پہنچا سکتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے یہی تفسیر منقول ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ استثناء متصل ہو اور تُقَرِّبُكُمْ کی كُمْ ضمیر مفعول سے استثناء کیا گیا ہو۔ مطلب اس طرح ہوگا کہ مال و اولاد کسی کو اللہ کے قرب میں نہیں پہنچا سکتا مگر مومن صالح کو پہنچا دے گا جو راہ خدا میں اپنا مال صرف کرتا ہے اولاد کی صحیح تربیت کرتا ہے اور اس کو نیکی کی تعلیم دیتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا سے پہلے مضاف محذوف ہو مطلب اس طرح ہوگا مگر مومن صالح کی اولاد و مال قرب خدا میں پہنچا دے گا۔

فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ سو ایسے لوگوں کے لئے دوگنا ثواب ہے مطلب یہ ہے کہ انہی لوگوں کی نیکیوں کا ثواب کئی گنا دیا جائے گا ایک نیکی کا ثواب دس گنے سے سات سو گنے تک اور اس سے بھی زیادہ غیر محدود ملے گا۔

بِمَا عَمِلُوْا وَهُمْ فِی الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ ۟ اور وہ بالاخانوں میں امن سے رہیں گے اَلْغُرَف کسی چیز کو اوپر اٹھانا۔ جنتوں کے غرفات سے مراد ہیں اونچے اونچے بالاخانے۔ غرفات کے متعلق جو احادیث آئی ہیں سورۂ فرقان کی آیت اُولٰٓئِكَ یُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا کی تفسیر کے ذیل میں ہم نے نقل کر دی ہے۔

وَالَّذِیْنَ یَسْعَوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا مُعٰجِزِیْنَ اُولٰٓئِكَ فِی الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ۟ اور جو لوگ ہماری آیتوں کے متعلق ان کے ابطال کی کوشش کر رہے ہیں نبی کو ہرانے کے لئے ایسے لوگ عذاب میں لائے جائیں گے۔

قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَیَقْدِرُ لَهٗ آپ کہہ دیجئے کہ میرا رب اپنے بندوں میں سے جس کی روزی کشادہ کرنا چاہتا ہے کشادہ کرتا ہے اور تنگ کرنا چاہتا ہے تو تنگ کرتا ہے یعنی ایک ہی شخص کی روزی کبھی تنگ کرتا ہے کبھی فراخ کرتا ہے اس آیت میں ایک ہی شخص کی (مختلف زمانہ میں) روزی فراخ اور تنگ کرنے کا ذکر کیا ہے اور سابق آیت میں دو شخصوں کے متعلق فرمایا تھا کہ ایک کی روزی فراخ کرتا ہے اور دوسرے کی روزی تنگ کرتا ہے۔

صاحب بحر مواج نے لکھا ہے سابق آیت میں تو کافروں کے غرور مال کی تردید کی تھی اور اس آیت میں ان کے بخل کی تردید فرمائی ہے۔

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ یُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ ﴿۳۹﴾ اور جو چیز تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے تو اللہ اس کا عوض دے گا اور وہ سب سے اعلیٰ روزی دینے والا ہے۔ یعنی اللہ اس کا بدل عطا فرمائے گا دنیا میں فوراً یا آخرت میں جنت کے اندر پھر راہ خدا میں مال خرچ نہ کرنے اور کنجوسی کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ کا مطلب یہ ہے کہ دوسرا کوئی اگرچہ بظاہر روزی رساں نظر آتا ہے تو حقیقت میں وہ (خداداد) روزی رسانی کا ایک مجازی ذریعہ ہے حقیقی رازق نہیں ہے۔

خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ کے لفظ سے یہ دھوکہ نہ کھانا چاہئے کہ اللہ جب رازق حقیقی ہے اور دوسروں پر لفظ رازق کا اطلاق مجازی ہے تو ایک ہی لفظ سے ایک ہی وقت میں حقیقی اور مجازی دونوں معنی مراد ہو گئے جو ناجائز ہے ایسا نہیں ہے بلکہ اَلرّٰزِقِیْنَ کا اطلاق عموم مجاز کے طور پر ہے۔

وَیَوْمَ یَحْشُرُهُمْ جَمِیْعًا ثُمَّ یَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِیَّاكُمْ كَانُوْا یَعْبُدُوْنَ ﴿۴۰﴾ اور یاد کرو اس دن کو جب اللہ ان سب کو جمع کرے گا اور فرمائے گا کہ یہ سب تمہاری پوجا کرتے تھے۔ جَمِیْعًا یعنی مغرور سرداروں اور نچلے طبقہ والوں کو سب کو هٰٓؤُلَآءِ یعنی یہ کافر جو ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں اور ان کی پوجا کرتے تھے۔

ملائکہ سے یہ خطاب مشرکوں کو ذلیل کرنے اور شفاعت ملائکہ سے مایوس بنانے کے لئے کیا جائے گا (کافروں کے معبود تو اور بھی ہیں اصنام و کواکب وغیرہ کی بھی وہ پوجا کرتے ہیں لیکن) خصوصیت کے ساتھ ملائکہ کو خطاب اس لئے کیا جائے گا کہ خطاب کی صلاحیت انہیں میں ہے پھر وہ دوسرے فرضی شرکاء سے افضل بھی ہیں نیز مبدء شرک بھی انہیں کی عبادت ہے (ملائکہ غیبیہ اس کائنات کے منتظم ہیں اور ان کا منتظم ہونا اصل سبب ہے کافروں کے کفر اور مشرکوں کے شرک کا۔ مشرک سمجھتے ہیں کہ یہی دیوتا معبود اور بارگاہ خداوندی کے مقربین ہیں اس لئے بامید شفاعت ان کی پوجا کرتے ہیں۔ مترجم)

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِیُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ بَلْ كَانُوْا یَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۚ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ﴿۴۱﴾ فرشتے عرض کریں گے تو پاک ہے (یعنی تجھے ہر شرک سے ہم پاک سمجھتے اور تیری پاکی کا اقرار کرتے ہیں) ہمارا تعلق تو تجھی سے ہے نہ کہ ان سے۔ بلکہ یہ لوگ شیاطین کو پوجتے تھے ان میں سے اکثر لوگ انہیں کے معتقد تھے۔ یعنی ہمارا رشتہ عبدیت و معبودیت تجھی سے ہے ان سے ہمارا کوئی رشتہ موالات نہیں ہے اس جواب سے گویا فرشتوں نے ظاہر کر دیا کہ ہم ان کی عبادت کو پسند نہیں کرتے تھے ہم اس جرم سے بیزار ہیں۔

اَلْجِنَّ اس سے مراد ہیں شیاطین جنہوں نے کافروں کو اغوا کر کے فرشتوں کی پوجا کو ان کی نظر میں مستحسن بنا دیا تھا۔

بعض علماء نے کہا شیاطین خود بھیس بدل کر ان کے سامنے آتے تھے اور ان کے خیال میں یہ بات ڈالتے تھے کہ وہ (شیاطین) ملائکہ ہیں اس خیالی تصویر کی وہ پوجا کرتے تھے۔

اَكْثَرُهُمْ یعنی اکثر لوگ اس سے مراد ہیں مشرک یا اکثر سے مراد ہیں سب۔ اس مطلب پر هُمْ ضمیر مشرکوں کی طرف راجع ہو گی۔ یعنی سب مشرک۔

بِهِمْ ان جنات کے معتقد تھے (جنات پر ایمان رکھتے تھے)

فَالْیَوْمَ لَا یَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَّفْعًا وَّلَا ضَرًّا ۭ اس روز نہ کوئی کسی کو نفع پہنچانے کا اختیار رکھے گا نہ ضرر پہنچانے کا۔

یعنی کوئی مخلوق جن ہو یا انسان یا ملائکہ۔ دوسرے کو نہ نفع پہنچانے یعنی ثواب دینے یا شفاعت کرنے کا اختیار رکھے گا نہ عذاب دینے کا کیونکہ (اس روز) یہ سارے معاملات اللہ ہی کے ہاتھ میں ہوں گے۔

وَنَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّتِیْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿۴۲﴾ اور ہم ظالموں سے کہیں گے کہ (اب) آگ کے عذاب کا مزہ چکھو جس کو دنیا میں تم جھوٹ قرار دیتے تھے۔

(ظلم کا معنی ہے کسی چیز کو بے محل رکھنا یا بے محل استعمال کرنا) کافر عبادت کا عمل بے محل کرتے ہیں (اللہ کے سوا دوسروں کی پوجا کرتے ہیں) اس لئے ان کو ظالم کہا۔

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالُوا مَا هَٰذَا إِلَّا رَجُلٌ يُرِيدُ أَن يَصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُكُمْ وَقَالُوا مَا هَٰذَا إِلَّا إِفْكٌ مُّفْتَرًى ۚ اور جب ان (اہل مکہ) کے سامنے ہماری قرآنی آیات (رسول اللہ ﷺ کی زبانی) کھلی کھلی پڑھی جاتی ہیں تو کہتے ہیں نہیں ہے یہ (شخص یعنی رسول اللہ ﷺ) مگر ایک ایسا آدمی ہے جو تم کو ان چیزوں کی پوجا سے روکنا چاہتا ہے جن کی پوجا تمہارے اسلاف کیا کرتے تھے اور یہ (قرآن) محض خود تراشیدہ جھوٹ ہے۔

یعنی محمد رسول اللہ ﷺ نے خود بنا کر اللہ کی طرف نسبت کر دی ہے (یہ خدا کا کلام نہیں ہے)

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ﴿٤٣﴾ اور یہ امر حق جب ان کے پاس پہنچ گیا تو کافر کہتے ہیں یہ تو بس جادو ہے (جادو کے سوا کچھ نہیں ہے)

حق سے مراد ہے نبوت یا اسلام یا قرآن۔ یعنی قرآن یا امر نبوت یا اسلام جب ان کے پاس پہنچا تو بغیر سوچے اور غور کرنے کے اس کو کھلا ہوا جادو کہنے لگے۔ باعتبار معنی کے کافروں نے قرآن کو خود تراشیدہ جھوٹ کہا اور الفاظ و اعجاز ترکیب کی وجہ سے جادو قرار دیا۔

وَمَا آتَيْنَاهُم مِّن كُتُبٍ يَدْرُسُونَهَا ۖ وَمَا أَرْسَلْنَا إِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِن نَّذِيرٍ ﴿٤٤﴾

اور ہم نے ان کو (یعنی کفار مکہ کو) کتابیں نہیں دی تھیں کہ انکو پڑھتے پڑھاتے ہوں اور نہ آپ سے پہلے ہم نے ان کے پاس کسی پیغمبر کو بھیجا۔

مِّن كُتُبٍ یعنی ایسی کتابیں نہیں دی تھیں جن میں شرک کو صحیح قرار دیا گیا ہو۔

مِن نَّذِيرٍ اور نہ کوئی ایسا پیغمبر بھیجا تھا جس نے انکو شرک کی دعوت دی ہو اور ترک شرک پر عذاب سے ڈرایا ہو پھر شرک کے مدعی یہ کہاں سے بن بیٹھے اور قرآن کو جھوٹ کہنے اور جادو قرار دینے اور نبی پر خود ساختی اور افترا بندی کا الزام رکھنے کی اجازت ان کو کس نے دی۔ اس آیت میں مشرکوں کی جہالت و سبک سری کا اظہار ہے اس سے آگے تہدید عذاب دینے کے لئے فرمایا۔

وَكَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ اور ان سے پہلے والوں نے بھی (پیغمبروں کی) تکذیب کی تھی۔

یعنی عاد، ثمود، قوم ابراہیم، قوم لوط، اہل مدین اور ایکہ والوں نے اپنے اپنے پیغمبروں کو جھوٹا قرار دیا تھا۔

وَمَا بَلَغُوا مِعْشَارَ مَا آتَيْنَاهُمْ اور جو کچھ (سر و سامان طول عمر اور دولت و مال) ہم نے ان گزشتہ امتوں کو دیا تھا اس کے دسویں حصہ کو بھی یہ (کفار مکہ) نہیں پہنچے۔

فَكَذَّبُوا رُسُلِي ۖ پھر انہوں نے میرے پیغمبروں کو جھوٹا قرار دیا یعنی انہوں نے جب میرے پیغمبروں کی تکذیب کی تو میرا عذاب ان پر آ پہنچا اور ان کو تباہ کر دیا۔

فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ ﴿٤٥﴾ سو (دیکھ لو) میرا عذاب ان پر کیسا آیا۔ ع ۵

نَكِيرِ یعنی عذاب اور تباہی کی شکل میں میری ناراضگی کیسا رنگ لائی۔ یہ سوال توبیخی ہے مطلب یہ ہے کہ ان کو بھی اس قسم کی تکذیب سے احتراز رکھنا چاہئے۔

پہلے كَذَّبَ سے کثرت تکذیب مراد ہے اور دوسری بار كَذَّبُوا میں کثرت تکذیب مراد نہیں ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ اول كَذَّبَ کا مفعول مذکور نہیں ہے تکذیب مطلق اور مجمل ہے اور دوسرے كَذَّبُوا کے بعد مفعول مذکور ہے اور تکذیب مقید ہے۔ (گویا) یہ اجمال کے بعد تفصیل ہے۔

مولف رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ کذبوا کی ضمیر کفار مکہ کی طرف راجع ہے (کفار مکہ نے رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کی تھی اور رسول اللہ ﷺ نے تمام سابق انبیاء کو سچا بتایا تھا اس طرح کفار مکہ نے رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کر کے تمام پیغمبروں کی تکذیب کی۔ مترجم)

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَ فُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۟ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ ؕ اے محمد ﷺ آپ کہہ دیجئے کہ میں تم کو صرف ایک بات سمجھاتا ہوں وہ یہ کہ تم محض اللہ کے واسطے دو دو اور ایک ایک (یعنی اجتماعی شکل میں یا الگ الگ تنہائی میں) کھڑے ہو جاؤ پھر سوچو کہ تمہارے اس ساتھی کو کسی طرح کا جنون نہیں ہے۔

کھڑے ہونے سے مراد یہ نہیں ہے کہ نہ بیٹھو، نہ لیٹو، کھڑے ہو جاؤ بلکہ مراد ہے تیار ہو جانا، آمادہ ہو جانا۔ آیت ان تقوموا للیتامی بالقسط میں بھی اسی معنی کے لئے لفظ ان تقوموا استعمال کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تعصب ہٹ دھرمی اور اسلاف کی تقلید کو چھوڑ کر محض اللہ کے لئے غور کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔

مثنی وفرادی یعنی زیادہ ہجوم نہ ہو جس سے فکر کی یکسوئی ختم ہو جائے بلکہ دو دو مل کر یا ایک ایک الگ ہو کر رسول اللہ ﷺ کے معاملہ میں سوچو پھر ہر شخص اپنے خیال کا دوسرے سے اظہار کرے اور وہ انصاف وعدل کے ساتھ غور کرے یا تنہائی میں ہر ایک انصاف کے ساتھ سوچے تاکہ تصویر حق سامنے آ جائے۔ اور سمجھ لے کہ تمہارے اس ساتھی کو کسی طرح کا جنون نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ ان کو کسی قسم کا جنون نہیں ہے ان کی عقل صحیح ہے۔ فہم سلیم ہے فکر درست ہے۔

ان کے صحیح الدماغ ہونے کا انکار وہی کر سکتا ہے جو خود پاگل ہو یا محض عناد کا مظاہرہ کر رہا ہو۔ اور یہ بھی بدیہی حقیقت ہے کہ کوئی عقلمند صحیح الدماغ شخص کوئی اتنا عظیم الشان کام جس سے سارے لوگ دشمن ہو جائیں اور وہ خود اکیلا تہی دست بے یار و مددگار رہ جائے اس وقت تک نہیں کرتا جب تک اس کو اپنی حقانیت کا یقین مضبوط عقلی دلائل کی روشنی میں نہ ہو جائے اور یہ بھی ضروری ہے کہ دانشمند آدمی جب اتنے بڑے کام کا بیڑا اٹھاتا ہے تو بے مقصد اور فضول نہیں اٹھاتا اس کے پیش نظر یا حصول منفعت ہوتا ہے یا دفع مضرت اور رسول اللہ ﷺ کے پیش نظر ان دونوں دنیوی مقاصد میں سے کوئی بھی نہیں ہے حصول منفعت دنیوی کی تو ان کو ممانعت کر دی گئی ہے۔ وہ خود کہتے ہیں ما سالتکم من اجر فھو لکم میں تم سے جو کچھ مانگوں وہ تم ہی لے لو۔ مجھے ضرورت نہیں۔ رہا دفع مضرت کا مقصد تو یہ بھی ان کے پیش نظر نہیں ہے ان کے دعویٰ سے تو سارے لوگ دشمن اور درپے آزار ہو گئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے پیش نظر آخرت کی مضرت کا دفع اور آخرت کے نفع کا حصول ہے۔

اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ ۝ وہ تو تم کو بس ایک سخت عذاب آنے سے پہلے ڈرانے والے ہیں۔

یعنی اس دنیا سے آگے دوسرے جہان میں جو سخت عذاب آنے والا ہے اس سے وہ تم کو ڈرا رہے ہیں۔

دلیل مذکور کے مقدمات (جو یقینی ہیں۔ مترجم) بتا رہے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی پیروی واجب ہے پھر اس دلیل کے ساتھ کثیر معجزات کو بھی ملا دیا جائے تو وجوب اتباع اور بھی ضروری ہو جاتا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ جب آیت وانذر عشیرتک الاقربین نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے کوہ صفا پر چڑھ کر قبائل قریش کو نام بنام پکارنا شروع کیا اور فرمایا اے بنی فہر اے بنی عدی یہاں تک کہ سب لوگ جمع ہو گئے تو حضور ﷺ نے فرمایا اگر میں تم کو اطلاع دوں کہ پہاڑ کے پار کچھ سوار موجود ہیں اور تم پر حملہ کرنا چاہتے ہیں تو بتاؤ کیا تم مجھے سچا سمجھو گے۔ حاضرین نے کہا ہمارے تجربہ میں آپ کا کوئی جھوٹ نہیں آیا (اس لئے سچا سمجھیں گے) اس پر حضور ﷺ نے فرمایا تو

میں تم کو آگے آنے والے سخت عذاب سے پہلے ہی ڈرا رہا ہوں۔ یہ سن کر ابولہب بولا تجھے ہمیشہ کے لئے موت آجائے کیا اس لئے تو نے ہم کو جمع کیا تھا اس پر آیت تبت یدا ابی لہب و تب نازل ہوئی۔ متفق علیہ۔

قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ آپ کہہ دیجئے کہ (رسالت کا) جو معاوضہ میں تم سے طلب کروں وہ تمہارا ہی ہے (تم اپنے پاس رکھو مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے) یعنی میں تم سے کسی معاوضہ کا طلب گار نہیں ہوں۔

بعض اہل علم نے کہا آیت کا مطلب یہ ہے کہ میں نے جو تم سے کہا ہے ما اسالکم علیہ من اجر الا من شاء ان یتخذ الی ربہ سبیلا اور یہ بھی میں نے تم سے کہا ہے لا اسالکم علیہ اجرا الا المودۃ فی القربی تو میری طلب تمہارے ہی فائدہ کے لئے ہے، راہ خدا اختیار کرنا تمہارے ہی لئے مفید ہے اور میری تمہاری قرابت ایک ہی ہے۔

میں کہتا ہوں رسول اللہ ﷺ کے قرابتدار علماء ظاہر و باطن ہیں خواہ اہل بیت میں سے ہوں یا دوسرے لوگ ہوں۔ علماء کی مودت قرب خداوندی کے حصول کا ذریعہ ہے۔

اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ میرا معاوضہ تو صرف اللہ کے ذمہ ہے۔ یعنی اگلی دنیا میں اللہ سے اجر کا خواستگار ہوں اگر یہ خواہش نہ ہوتی تو میں یہ مشقت نہ برداشت کرتا اس لئے میرا اتباع تم پر لازم ہے تم ایسے عمل کرو کہ حسب وعدہ اپنی مہربانی سے اللہ تم کو اجر عنایت فرمائے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا معاذ کیا تم جانتے ہو کہ اللہ کا اپنے بندوں پر کیا حق ہے اور بندوں کا اللہ پر کیا حق ہے۔ حضرت معاذؓ نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول کو ہی پورا علم ہے۔ فرمایا بندوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ اسی کی عبادت کریں کسی اور کو اللہ کا شریک نہ قرار دیں اور بندوں کا اللہ پر یہ حق ہے کہ جو شرک نہ کرتا ہو اللہ اس کو عذاب نہ دے۔ متفق علیہ۔

وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۴۷﴾ اور وہی ہر چیز کا مشاہدہ کرنے والا ہے۔ پس ہر شخص کو اس کے اعمال اور عقیدے کے موافق بدلہ دے گا۔

قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَقْذِفُ بِالْحَقِّ آپ کہہ دیجئے کہ میرا رب حق (یعنی اسلام) کو (باطل یعنی کفر پر) غالب کر رہا ہے۔

یقذف یعنی اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے منتخب کر کے اس پر حق کو نازل فرماتا ہے اور وحی بھیجتا ہے۔ یا یہ معنی ہے کہ حق کی چوٹ باطل پر لگاتا اور باطل کو چکنا چور کر دیتا ہے یا یہ مطلب ہے کہ حق کو اطراف عالم میں پھیلائے گا۔ اس صورت میں یہ اسلام کو غالب کرنے کا وعدہ ہوگا۔

امام احمد کی روایت ہے کہ حضرت مقدادؓ نے بیان کیا میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے۔ روئے زمین پر کوئی گھر مٹی کا ہو یا اون (کا خیمہ) ایسا نہ بچے گا جس کے اندر اللہ کلمۂ اسلام داخل نہ کر دے خواہ عزت والے کی عزت کے ساتھ یا ذلیل کی ذلت کے ساتھ۔ یعنی جو لوگ قبول کرلیں گے اللہ ان کو عزت والا کر دے گا۔ جو نہیں مانیں گے ان کو ذلیل کر دے گا اور ذلیل ہو کر وہ کلمۂ اسلام کی اطاعت کریں گے۔

عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۴۸﴾ وہی چھپی باتوں کو خوب جاننے والا ہے یعنی وہی جانتا ہے کہ کون وحی و رسالت کے لئے منتخب ہونے کا اہل ہے اور وہی واقف ہے کہ اسلام کا مآل کیا ہوگا۔ اطراف عالم میں کفر کو مغلوب اور اسلام کو غالب کر دے گا۔

قُلْ جَآءَ الْحَقُّ آپ کہہ دیجئے کہ حق (یعنی قرآن یا اسلام) آگیا۔

وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيْدُ ﴿۴۹﴾ اور باطل نہ کرنے کا رہا نہ دھرنے کا۔ یعنی باطل (شرک) ختم ہو گیا نابود ہو گیا اور باطل کا کوئی حصہ ایسا باقی نہیں رہا جو کسی چیز کو ابتداءً نمودار کر سکے یا اعادہ کر سکے۔ دوسری آیت میں آیا ہے بل یقذف بالحق علی الباطل فیدمغہ فاذا ھو زاھق قتادہ نے کہا باطل سے مراد ابلیس ہے جو نہ کسی کی ابتدائی تخلیق کرتا ہے نہ دوبارہ قبروں سے اٹھا سکے گا۔ کلبی کا بھی یہی قول ہے۔ بعض کے نزدیک باطل سے بت مراد ہیں۔

بغوی نے لکھا ہے مکہ کے کافر رسول اللہ ﷺ سے کہا کرتے تھے تم گمراہ ہو گئے تم نے اپنے باپ داوا کا مذہب چھوڑ دیا اس پر آیت ذیل کا نزول ہوا۔

قُلْ إِنْ ضَلَلْتُ فَإِنَّمَا أَضِلُّ عَلَىٰ نَفْسِي ۖ وَإِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوحِي إِلَيَّ رَبِّي

(اے محمد ﷺ) آپ کہہ دیجئے کہ اگر بالفرض میں گمراہ ہوں تو میری گمراہی مجھی پر وبال ہو گی اور اگر میں راہ راست پر ہوں تو یہ قرآن کی وجہ سے ہو گی جو میرا رب میرے پاس وحی کے ذریعہ سے بھیج رہا ہے۔

یعنی جو دین میں نے اختیار کیا ہے اگر وہ گمراہی ہے تو گمراہی کا وبال مجھی پر پڑے گا اور ظاہر ہے کہ میں دیوانہ نہیں نہ اس سے مجھے کوئی دنیوی فائدہ حاصل ہو گا پھر گمراہی کے وبال کو میں اپنے لئے کیسے اختیار کر سکتا ہوں اور اگر یہ دین مبنی بر ہدایت ہے تو میری طرف سے نہیں ہے۔ (یعنی میرا ساختہ پرداختہ نہیں ہے) نہ اس فن میں میں نے کسی سے سیکھا ہے کیونکہ میرا امی ہونا ظاہر ہے نہ مجھے لکھنا آتا ہے نہ پڑھنا (میں لکھا پڑھا نہیں ہوں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ دین خدا کا بھیجا ہوا ہے اور اللہ نے میرے پاس وحی بھیجی ہے اس لئے تم کو بھی میرے طریقہ پر چلنا چاہئے تاکہ جس طرح میں نے ہدایت پائی تم بھی ہدایت یافتہ ہو جاؤ۔ اس تفسیر پر اس آیت میں ثبوت نبوت پر استدلال ہو گا اور یہی دونوں شرطوں میں مقابلہ کی وجہ قرار پائے گی لیکن دونوں شرطوں میں مقابلہ کی یہ توجیہ کی ہے کہ ان ضللت فانما اضل علی نفسی کا مطلب یہ ہے کہ میری گمراہی کا وبال میرے ہی نفس پر پڑے گا کیونکہ نفس ہی کے سبب سے گمراہی ہو گی وہی بالذات گمراہ اور آمادہ بالسوء ہے اور اگر میں ہدایت پر ہوں گا تو اللہ کی رہنمائی سے مجھے ہدایت ملے گی۔ دوسری آیت میں اسی مضمون کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ما اصابک من حسنۃ فمن اللہ وما اصابک من سیئۃ فمن نفسک۔

إِنَّهُ سَمِيعٌ قَرِيبٌ ۝ بلاشبہ وہ سب کچھ سننے والا اور بہت قریب ہے۔ ہر گمراہ اور ہدایت یافتہ کے قول و فعل کو جانتا ہے خواہ کوئی کتنا ہی چھپائے۔

وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ فَزِعُوا فَلَا فَوْتَ وَأُخِذُوا مِن مَّكَانٍ قَرِيبٍ ۝ اور اے مخاطب تو حیرت سے دیکھے گا جبکہ وہ گھبرائے ہوں گے پھر نکل بھاگنے کی کوئی راہ نہ ہو گی اور اس وجہ سے پاس ہی سے پکڑ لئے جائیں گے۔

فزعوا یعنی مرنے کے وقت کافر گھبرائے ہوئے ہوتے ہیں۔ قتادہ نے کہا قبروں سے اٹھائے جانے کے وقت گھبرائے ہوئے ہوں گے۔ لو شرطیہ ہے جزا محذوف ہے۔ یعنی اگر تو کافروں کے گھبرانے کا منظر دیکھے گا تو ہولناک منظر تیرے سامنے ہو گا۔

فلا فوت یعنی اللہ کی گرفت سے نکل نہ سکیں گے نہ بھاگ کر نہ قلعہ بند ہو کر نہ اپنی جان کا مالی معاوضہ دے کر۔

من مکان قریب یعنی زمین کے اوپر سے پکڑ کر زمین کے اندر لے جائے جائیں گے۔ (یہ تفسیر اس وقت ہو گی جب فزع سے مراد فزع موت ہو۔ مترجم) یا موقف حساب سے پکڑ کر دوزخ کی طرف لے جائے جائیں گے۔ ضحاک نے کہا بدر کا دن مراد ہے جب کہ کفار گھبرائے ہوئے تھے۔ اور پاس کے مکان سے عذاب دنیوی میں ان کو پکڑ لیا گیا تھا۔ ضحاک کی یہ تشریح آئندہ جملہ سے مناسب نہیں رکھتی۔ کیونکہ آگے آیا ہے۔

وَقَالُوا آمَنَّا بِهِ اور وہ کہیں گے ہم اس پر یعنی رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آئے۔ اور بدر کے دن کافروں نے آمنا بہ نہیں کہا تھا ابو جہل جب زخمی ہو کر گرا تھا آخری سانس باقی تھا کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے اس کی داڑھی پکڑ کر کہا اللہ کا شکر ہے کہ اس نے دشمن خدا کو رسوا کیا۔ ابو جہل نے کہا میری رسوائی کس طرح ہوئی کیا جس شخص کو اس کی قوم والے ہی قتل کر دیں اس کی رسوائی ہوتی ہے۔

کافر تو اس وقت آمنا بہ کہتے ہیں جب سکرات موت میں مبتلا ہوتے ہیں اور آس ٹوٹ جاتی ہے یا اس وقت ایمان لائیں گے جب قبروں سے اٹھائے جانے کے بعد عذاب کو آنکھوں سے دیکھیں گے اور دوزخ کی طرف کھنچے جائیں گے۔

وَأَنَّىٰ لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِن مَّكَانٍ بَعِيدٍ ۝ اور (اتنی) دور جگہ سے (ایمان کا) ہاتھ آنا ان کے

لئے کہاں ممکن ہے۔

نوش ہاتھ سے لینا طلب کرنا چلنا تیزی سے اٹھنا۔ کذا فی القاموس۔ مطلب یہ کہ ایمان کا حصول تو اس وقت ممکن تھا جب دنیا میں آدمی مکلف تھا اور وہ مقام تکلیف بالا ایمان تو دور ہو گیا۔ اگر رہائی کا وقت اور موقع فوت ہو گیا ہو تو ایسی صورت میں رہائی ممکن نہیں ہوتی اسی مفہوم کو بطور تشبیہ اس آیت میں بیان کیا گیا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کفار دنیا کی طرف واپسی کی درخواست کریں گے لیکن دور کے مقام یعنی آخرت سے دنیا میں ان کا لوٹنا کہاں ہو سکے گا۔

وَقَدْ كَفَرُوا بِهِ مِنْ قَبْلُ ۚ اور اس سے پہلے (دنیا میں) انہوں نے اللہ کا (یا اللہ کے رسول ﷺ کا یا قرآن کا یا عذاب کا) انکار کیا تھا۔ (ضمیر کا مرجع پہلے کلام میں ہونا ضروری ہے خواہ صراحۃً اس کا ذکر کیا گیا ہو یا ضمناً) اللہ کا ذکر تو صراحۃً پہلے موجود ہے اور رسول اللہ ﷺ کا ذکر آیت مابصاحبکم من جنۃ میں کر دیا گیا ہے اسی طرح قرآن کا ذکر آیت جاء الحق میں آیا ہے اور اخذوا کے لفظ کے اندر عذاب کا مفہوم موجود ہے۔

وَيَقْذِفُونَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَكَانٍ بَعِيدٍ ﴿۵۳﴾ اور بے تحقیق باتیں دور ہی دور سے ہانکا کرتے تھے۔ یعنی رسول اللہ ﷺ اور آخرت کے معاملہ میں بلا تحقیق شبہات کرتے تھے جو شخص ان دیکھی چیز پر دور سے تیر چلائے اور نشانہ پر لگنے کا خیال کرنے لگے ایسے شخص سے ان کافروں کو تشبیہ دی ہے جو بلا تحقیق رسول اللہ ﷺ اور آخرت کے معاملہ پر رائے زنی کرتے تھے۔

مجاہد نے کہا رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارک کو انہوں نے بلا تحقیق نشانہ بنا رکھا تھا۔ شاعر کہتے تھے جادوگر کہتے تھے، بہت بڑا دروغ گو کہتے تھے، تکلم بالغیب سے یہی مراد ہے۔ قتادہ نے کہا وہ اپنے گمان کے تیر چلاتے تھے ان کا قول تھا کہ نہ قیامت ہو گی نہ جنت نہ دوزخ۔

وَحِيلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُونَ اور ان میں اور ان کی مطلوب چیزوں میں آڑ کر دی جائے گی۔

مایشتھون سے مراد ہے ایمان کا نفع، دوزخ سے نجات دنیا کی طرف واپسی یا وہ تمام ماکولات و مشروبات وغیرہ مراد ہیں جو دنیا میں حاصل تھے اور جن کی طرف ان کی طبعی رغبت ہو گی۔

كَمَا فُعِلَ بِأَشْيَاعِهِمْ مِنْ قَبْلُ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا فِي شَكٍّ مُرِيبٍ ﴿۵۴﴾ جیسا کہ ان کے ہم مشرب لوگوں کے ساتھ کیا جائے گا جو ان سے پہلے تھے کیوں کہ یہ سب بڑے شک میں پڑے ہوئے تھے جس نے ان کو تردد میں ڈال رکھا تھا۔ ع ۱۴

اشیاع، یعنی اقوام گزشتہ کے ان جیسے کافر۔

فی شک یعنی قیامت اور نزول عذاب کے متعلق وہ شک میں پڑے ہوئے تھے۔

مریب شک پیدا کرنے والا یا شک والا۔

مریب شک کی صفت ہے جو مبالغہ کے طور پر ذکر کی گئی ہے۔

الحمد للہ

سورۃ السبا کی تفسیر ۲۰ر محرم ۱۲۰۲ھ کو ختم ہوئی اس کے بعد انشاء اللہ سورۃ ملائکہ (فاطر) کی تفسیر آئے گی۔ وصلی اللہ علی خیر خلقہ محمد و الہ و اصحابہ اجمعین۔

بعونہ تعالی

تفسیر مظہری سورۂ سبا کا ترجمہ مع اضافات تشریحی۔ ۲۳ ذی الحجہ ۱۳۹۱ھ کو ختم ہوا۔

فالحمدللہ من قبل و من بعد وھوالموفق و المعین

سورہ الملائکۃ

سورۂ فاطر

یہ سورت مکی ہے اس میں ۴۵ آیات ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ تمام حمد (ستائش) اسی اللہ کو زیبا ہے جو آسمانوں کو زمین کو عدم کا پردہ پھاڑ کر وجود میں لانے والا ہے۔ یعنی سب کا خالق ہے بغیر سابق مثال کے ایجاد کرنے والا ہے۔

فاطر فطرۃ سے مشتق ہے (فطرۃ کا معنی ہے پھاڑنا) مراد ہے نیستی کو پھاڑ کر ہستی میں لانا۔ اس جگہ فاطر بمعنی ماضی ہے یعنی اللہ نے سارے جہان کو پیدا کیا ہے۔ اس صورت میں فاطر اللہ کی صفت ہوگا۔

جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ جو فرشتوں کو پیغام رساں بنانے والا ہے جن کے دو دو تین تین اور چار چار پر (بازو) ہیں۔

رسلا (پیام رساں) یعنی اللہ اور انبیاء اور نیک بندوں کے درمیان وحی یا الہام یا سچے خوابوں کے پہنچانے کے وسائط اور ذرائع ہیں۔ یا یہ مطلب ہے کہ اللہ اور اس کی مخلوق کے درمیان ملائکہ وسائط ہیں جو آثار صفت الٰہیہ کو مخلوق تک پہنچاتے ہیں۔

جاعل (اسم فاعل) بمعنی حال یا بمعنی استقبال ہے اور اضافت محض لفظی ہے اس صورت میں یہ لفظ اللہ کی صفت نہیں ہوگی بلکہ اللہ کے لفظ سے بدل ہوگی۔

مثنی و ثلث ورباع۔ اجنحۃ کی صفت ہے۔ قتادہ اور مقاتل نے کہا بعض ملائکہ کے دو بازو بعض کے تین اور بعض کے چار اللہ نے بنائے ہیں لیکن یہ تعداد محدود نہیں ہے۔ حدبندی کے خیال کو دور کرنے کے لئے آگے فرمایا۔

يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ وہ جو کچھ چاہتا ہے پیدائش میں زیادہ کر دیتا ہے بلاشبہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے (اپنے ارادے کے مطابق کر سکتا ہے۔ مترجم)

مسلم نے صحیح میں آیت لقدرای من ایۃ ربہ الکبری کی تشریح کے ذیل میں حضرت ابن مسعودؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جبرئیل کو ان کی اصلی صورت میں دیکھا کہ ان کے چھ سو بازو تھے۔

ابن حبان کی روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے (حضور ﷺ نے فرمایا) میں سدرۃ المنتہی کے پاس جبرئیل کو ان کی اصلی صورت میں دیکھا جن کے سات سو بازو تھے اور ان کے پروں سے موتی اور یاقوت جھڑ رہے تھے۔

الخلق کا لفظ ملائکہ اور غیر ملائکہ سب کو شامل ہے۔ یزید فی الخلق۔ جملہ مستانفہ ہے جو بتا رہا ہے کہ تفاوت تخلیق اللہ کی مشیت و حکمت کے زیر اثر ہے ملائکہ کا ذاتی تقاضا نہیں ہے۔ لفظ یزید ہر قسم کی زیادتی کو شامل ہے۔ صوری زیادتی ہو یا معنوی، چہرہ کی ملاحت، آواز کا حسن، بلندی اخلاق، عقل و فہم کی نورانیت سب ہی کو یہ لفظ شامل ہیں۔

زہری کے نزدیک حسن صورت اور قتادہ کے نزدیک آنکھوں کی ملاحت مراد ہے۔ بعض کے نزدیک عقل و امتیاز کی زیادتی مراد ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ تعیین نہیں ہے بلکہ ان علماء نے زیادتی کی ایک ایک شاخ بطور مثال بیان کر دی ہے۔

مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكْ ۙ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ اللہ جو رحمت (بارش وغیرہ) لوگوں کے لئے کھول دے سو اس کا کوئی بند کرنے والا نہیں اور جس کو بند کردے سو اس کی بندش کے بعد کوئی اس کو جاری کرنے والا نہیں اور وہی غالب حکمت والا ہے۔

يَفْتَحِ۔ فتح کا معنی ہے کھولنا۔ مجاز امراد ہے عطا کرنا۔ سبب کا اطلاق مسبب پر کیا گیا ہے۔ یعنی جو رحمت اللہ عطا فرمائے۔ رحمت دنیوی ہو جیسے بارش، رزق، امن، صحت، عزت، حکومت، مال، اولاد وغیرہ یا دینی ہو جیسے ایمان، علم دین، نبوت، نیکیوں کی توفیق وغیرہ۔ مِنْ رَّحْمَةٍ میں لفظ رحمت ہر قسم کی رحمت کو شامل ہے۔

فَلَا مُمْسِكَ لَهَا کوئی اس کو روک دینے والا نہیں۔ بند کرنے سے مراد ہے روک دینا۔

وَمَا يُمْسِكْ اور جس کو بند کردے۔

فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ تو اس کو کوئی جاری کرنے والا یعنی بندش دور کرنے والا نہیں۔ لَهَا کی ضمیر رحمت کی طرف راجع ہے اور لَهٗ کی ضمیر مَا يُمْسِكْ کی طرف لوٹ رہی ہے اور مَا يُمْسِكْ میں لفظ ما مطلق ہے رحمت کو بھی شامل ہے اور غضب کو بھی۔ اس ترتیب میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ کی رحمت اس کے غضب پر غالب ہے۔ الْعَزِيْزُ یعنی اللہ جو کچھ چاہے اس پر قادر ہے کوئی اس کی قدرت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ الْحَكِيْمُ وہ حکمت والا ہے یعنی ہر کام علم و مصلحت کے ساتھ کرتا ہے۔

شیخین نے صحیحین میں بیان کیا ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ ہر نماز کے بعد یہ پڑھا کرتے تھے۔ لا اله الا الله وحده لاشريك له له الملك وله الحمد وهو على كل شيء قدير لا مانع لما اعطيت ولا معطي لما منعت ولا ينفع ذا الجد منك الجد۔

آیت مذکورہ میں جب اللہ نے بیان فرمایا کہ وہی تمام چیزوں کا خالق ہے اور جیسا چاہتا ہے کرتا ہے تو آئندہ آیت میں اپنی عطا کردہ نعمتوں کا شکر ادا کرنے کا حکم دیا اور فرمایا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ اے لوگو (یعنی اے اہل مکہ) یاد کرو اللہ کی نعمتوں کو جو تم پر کی ہیں۔ اللہ نے تم کو حرم کا باشندہ بنایا کہ جرم کی وجہ سے کوئی تم کو لوٹ نہیں سکتا۔ اللہ ہی نے تمہارے لئے زمین کا فرش بچھایا۔ آسمان کی چھت بغیر ستونوں کے قائم کی۔ تم کو عدم سے وجود میں لایا۔ رزق کے دروازے تمہارے لئے کھول دیئے جن کو کوئی بند نہیں کر سکتا تو پھر

هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۭ کیا اللہ کے سوا تمہارا کوئی پیدا کرنے والا ہے جو آسمان و زمین سے تم کو رزق دیتا ہو۔ یعنی آسمان سے بارش کرتا ہو اور زمین سے سبزہ اگاتا ہو۔ استفہام انکاری ہے یعنی اللہ کے سوا تمہارا کوئی خالق و رازق نہیں ہے۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ڮ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝ اس کے سوا کوئی معبود نہیں سو (شرک کر کے) تم کہاں الٹے جارہے ہو۔

یعنی جب تم کو اعتراف ہے کہ اللہ کے سوا کوئی خالق و رازق نہیں تو پھر کس وجہ سے توحید سے لوٹ کر شرک کی طرف جارہے ہو۔

وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ ۭ اور اگر یہ لوگ آپ کی تکذیب کر رہے ہیں تو (آپ صبر کریں کیونکہ) آپ سے پہلے بھی پیغمبر کی تکذیب (ان کی کافر امتوں کی طرف سے) کی جاچکی ہے۔

یعنی اگر توحید، قیامت اور عذاب کے مسائل میں یہ لوگ آپ کو جھوٹا قرار دیتے ہیں تو آپ دوسرے پیغمبروں پر اپنے آپ کو قیاس کرلیں اور صبر رکھیں غمگین نہ ہوں ان کو بھی ان کی امتوں نے جھوٹا قرار دیا تھا۔

رُسُلٌ کی تنوین عظمت و کثرت کو ظاہر کر رہی ہے یعنی بڑی عظمت والے طویل عمریں رکھنے والے اولوالعزم کثیر پیغمبروں کا بھی یہی حال تھا ان کو بھی کفار کی تکذیب کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ۝ اور اللہ کی طرف تمام امور لوٹائے جائیں گے۔ وہی آپ کے صبر کا بدلہ بصورت نصرت و ثواب عطا فرمائے گا اور وہی ان کافروں کی تکذیب کی سزا دونوں جہان میں بصورت عذاب دے گا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ اے لوگو (قیامت اور معاوضہ اعمال کا) اللہ کا کیا ہوا وعدہ حق ہے۔ یعنی اس کے خلاف ہونے کا احتمال بھی نہیں ہے۔

فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا سو تم کو یہ دنیوی زندگی فریب خوردہ نہ بنا دے۔ یعنی آخرت کی طلب و سعی سے یہ دنیوی بے ہودہ مشاغل غافل نہ بنا دیں۔

وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللَّهِ الْغَرُورُ ۝ اور اللہ کے متعلق شیطان تم کو دھوکے میں نہ ڈال دے یعنی اللہ نے اپنے حلم کی وجہ سے جو تم کو ڈھیل دے رکھی ہے اس ڈھیل کے سبب شیطان تم کو عذاب آخرت فراموش نہ کرا دے اور باوجود گناہوں پر جمے رہنے کے شیطانی اغواء کی وجہ سے تم کو مغفرت کا یقین نہ ہو جائے۔ اگرچہ معاصی پر اصرار کے باوجود مغفرت ممکن ہے (لیکن یقینی نہیں ہے) یہ تو ایسا ہی ہے جیسے زہر کھانا اور تریاق (کی تاثیر) کی امید رکھنا۔

إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ بلاشبہ شیطان تمہارا دشمن ہے تم سے اس کی عداوت پرانی ہے اور برابر چلی آرہی ہے۔

فَاتَّخِذُوهُ عَدُوًّا اس لئے تم اس کو اپنا دشمن ہی یقین کرو۔ اپنے تمام احوال میں اس کی وسوسے سے بچتے رہو اس کا کہنا نہ مانو اس کی مرضی کے خلاف محض اللہ کی اطاعت کرو۔ محبت کا تقاضا ہے کہ محبوب جس کام کو پسند کرے وہی کیا جائے تاکہ اس کی رضامندی حاصل ہو اور دشمنی کا تقاضا ہے کہ جو کام دشمن کو پسند ہو وہ نہ کیا جائے اور اس کو غصہ کی آگ میں جلایا جائے۔

إِنَّمَا يَدْعُو حِزْبَهُ لِيَكُونُوا مِنْ أَصْحَابِ السَّعِيرِ ۝ شیطان تو بس اپنے گروہ کو (یعنی اپنا اتباع کرنے والے آدمیوں کو گناہ، اتباع خواہشات اور دنیا کی طرف میلان رکھنے کی) دعوت دیتا ہے تاکہ وہ دوامی جہنمی ہو جائیں۔ یعنی اس کی عداوت کا ثبوت یہ ہے کہ انسانوں کو جہنمی بنا دینا اس کا مقصود ہے۔

الَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۖ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ ۝ جنہوں نے اللہ کا انکار کیا اور شیطان کی پیروی کی ان کے لئے شدید عذاب ہے اور جنہوں نے اللہ کو مانا اور نیک کام کئے اور شیطان کی مخالفت کی ان کے لئے مغفرت اور بڑا ثواب ہے۔

أَفَمَنْ زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ فَرَآهُ حَسَنًا ۖ فَإِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ ۖ کیا ایسا شخص جس کو اس کا عمل بد اچھا کر کے دکھایا گیا ہو پھر وہ اس کو اچھا سمجھنے لگا ہو اور ایسا شخص جو برے کو برا سمجھتا ہو۔ یعنی کافر اور مومن برابر ہو سکتے ہیں! سو اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت یاب کر دیتا ہے۔

فَرَآهُ حَسَنًا، زُيِّنَ کے مضمون کی تاکید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے جس کو بے مدد چھوڑ دیا اس کا وہم فہم پر اور جذبات نفسانی عقل پر غالب آگئے ہوں فکر و رائے میں اختلال پیدا ہو گیا ہو۔ شیطان نے اس کا ذہنی اغوا کر لیا ہو وہ اچھے کو برا اور باطل کو حق سمجھنے لگا ہو کیا ایسا آدمی اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے۔ جس کو شیطان فریب نہ دے سکا ہو شیطان کو اس کے پاس آنے کا راستہ ہی نہ ملا ہو اللہ نے اس کو ہدایت یاب کر دیا ہو وہ حق کو باطل سے الگ کرنے کی سوجھ بوجھ رکھتا ہو۔ اچھے اعمال کو اچھا اور برے اعمال کو برا جانتا ہو۔

فَاِنَّ اللّٰهَ میں ف عطف کے لئے اور کچھ کلام محذوف ہے جس پر اس کا عطف ہے محذوف کلام اس طرح تھا آپ یہ خیال نہ رکھیں کہ ہر شخص کو آپ ہدایت کر سکیں گے اور جس کی مدد اللہ کی طرف سے نہ کی گئی ہو اور جس کو اللہ نے ہدایت کر دی ہو دونوں برابر ہو جائیں گے۔ ایسا ہرگز نہ ہوگا کیونکہ اللہ ہی جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت یاب کرتا ہے (آپ کے قبضہ میں گمراہ کو ہدایت یافتہ بنانا نہیں ہے۔ مترجم)

فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ؕ سو ان پر افسوس کر کے کہیں آپ کی جان نہ جاتی رہے۔

حَسَرٰتٍ مفعول لہ ہے یعنی افسوس کرنے کی وجہ سے کہیں آپ کی جان نہ جاتی رہے۔ حَسَرٰتٍ حسرت کی جمع ہے۔ جمع کا صیغہ یا اس لئے استعمال کیا کہ گمراہ کافروں کے احوال پر رسول اللہ ﷺ کو بکثرت افسوس ہوتا تھا یا یہ وجہ ہے کہ ان کی بد اعمالیاں بہت کثرت سے تھیں جو افسوس کی (الگ الگ) متقاضی تھیں۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا یہ آیت ابو جہل اور دوسرے مشرکین مکہ کے بارے میں نازل ہوئی۔

جویبر نے بوساطت ضحاک حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول اس وقت ہوا جب رسول اللہ ﷺ نے دعا کی تھی اے اللہ اپنے دین کو عمر بن خطاب یا ابو جہل بن ہشام کے ایمان لانے سے غلبہ عطا فرما چنانچہ اللہ نے حضرت عمر کو ایمان کی توفیق عنایت کر دی اور ابو جہل کو گمراہ چھوڑ دیا ان ہی دونوں کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔

سعید بن جبیرؒ نے کہا یہ آیت اہل بدعت اور پرستاران ہوا و ہوس کے حق میں نازل ہوئی۔ قتادہ نے کہا انہیں میں سے خارجیوں کا گروہ تھا جو مسلمانوں کا خون بہانا اور مال لوٹنا حلال سمجھتے تھے دوسرے اہل کبائر ان میں شامل نہیں ہیں کیونکہ وہ کبیرہ گناہوں کو حلال نہیں سمجھتے بلکہ ان کو کبیرہ گناہ ہی جانتے ہیں اگرچہ عملاً کبائر کے مرتکب ہوتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝ اللہ کو ان کے سب کاموں کی بلاشک و شبہ خبر ہے۔ یعنی ان کے اعمال کی ضرور سزا دے گا۔

وَاللّٰهُ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَحْيَيْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ ۝ اور اللہ وہی تو ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے پھر ہوائیں بادلوں کو اٹھاتی ہیں پھر ہم بادل کو مردہ (یعنی خشک) قطعۂ زمین کی طرف چلاتے ہیں پھر اس (کے پانی) سے مردہ زمین کو مرے پیچھے (یعنی خشک ہو جانے کے بعد) زندہ کر دیتے ہیں (یعنی سرسبز کر دیتے ہیں) اسی طرح ہوگا مردوں کا قبروں سے اٹھنا۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہواؤں کے ذریعہ سے بادلوں کو اٹھا کر اور پھر پانی برسا کر اللہ مردہ زمین کو زندہ کر دیتا ہے اسی طرح قیامت کے دن تم کو زندہ کر کے اٹھائے گا۔

فَتُثِيْرُ سَحَابًا یہ گزشتہ حال کی حکایت ہے تاکہ وہ نادر اور عجیب صورت جو اللہ کی حکمت پر دلالت کرتی ہے دماغوں میں مستحضر ہو جائے۔ فَاَحْيَيْنَا بِهٖ پھر بارش سے ہم نے زندہ کر دیا۔ بِهٖ کی ضمیر پانی کی طرف راجع ہے کیونکہ سحاب سے بارش کا مفہوم سمجھ لیا جاتا ہے یا لفظ سحاب کی طرف ضمیر راجع ہے کیونکہ زمین کی زندگی کا سبب پانی ہے اور پانی کا سبب بادل ہے۔ زمین کو زندہ کرنے سے مراد ہے سرسبز کر دینا اور زمین کی موت سے مراد ہے زمین پر خاک اڑنا اور ہریالی کا سوکھ جانا۔ کَذٰلِکَ۔ یعنی جس طرح سبزی کے سوکھ جانے کے بعد اللہ اس کو زندہ کر دیتا ہے اسی طرح تمہاری دوبارہ زندگی ہوگی اور قبروں سے زندہ کر کے اٹھائے جاؤ گے کیونکہ دائرۂ قدرت سے دونوں میں سے کوئی بھی خارج نہیں۔ سبزہ کی روئیدگی کا مادہ ضرور مختلف ہے لیکن مادہ کے اختلاف کو زندگی میں کوئی دخل نہیں ہے۔

بعض علماء کا قول ہے کہ اس آیت میں عطاء زندگی کی کیفیت میں تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی روایت سے مسلم نے ایک حدیث نقل کی ہے جس میں بعث کی کیفیت ان الفاظ کے ساتھ بیان کی گئی ہے پھر اللہ ایک بارش بھیجے گا

کی طرح بھیجے گا جس کی وجہ سے اجسام اگیں گے۔ الحدیث۔

ابو الشیخ نے العظمۃ میں وہب کی روایت سے بیان کیا ہے کہ بحر مسجور (آتشیں سمندر) کی ابتدا اللہ کے علم میں ہوگی اور اس کا آخری کنارہ اللہ کے ارادہ میں ہوگا اس کے اندر مادۂ منویہ کی طرح گاڑھا پانی ہو جس کو راجفہ اور رادفہ (زمین کے دو زلزلوں) کے درمیان اللہ برسائے گا جس سے لوگ اس طرح اگیں گے جس طرح سیلابی مٹی میں سبزہ اگتا ہے پھر اللہ مومنوں کی روحوں کو جنت سے لا کر اور کافروں کی روحوں کو دوزخ سے لا کر یکجا کرے گا تاکہ ان کو صورتیں عطا فرمائے اسرافیل بحکم خدا صور پھونکیں گے جس سے ہر روح اپنے بدن میں داخل ہو جائے گی۔ الحدیث۔

شیخین نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دونوں بار صور پھونکنے کے درمیان چالیس (کا فاصلہ) ہوگا۔ حاضرین نے حضرت ابوہریرہؓ سے دریافت کیا کیا چالیس دن کا فاصلہ ہوگا؟ حضرت ابوہریرہؓ نے کہا مجھے اس سے انکار ہے۔ لوگوں نے کہا تو کیا چالیس ماہ کا فاصلہ ہوگا۔ حضرت ابوہریرہؓ نے جواب دیا مجھے اس کو ماننے سے بھی انکار ہے۔ لوگوں نے کہا تو کیا چالیس سال مراد ہیں۔ ابوہریرہؓ نے کہا میں یہ بھی نہیں مانتا (یعنی رسول اللہ ﷺ نے چالیس کا لفظ فرمایا تھا تعیین نہیں کی اس لئے میں بھی کوئی تعیین نہیں کر سکتا) پھر اللہ آسمان سے پانی برسائے گا جس سے لوگ اس طرح اگیں گے جیسے سبزی اگتی ہے۔ سوائے ایک ہڈی کے انسان کے جسم کا ہر حصہ گل جاتا ہے وہ ہڈی دم گزے کی ہے (یہ نہیں گلتی) اسی سے قیامت کے دن سارا جسم جوڑا جائے گا۔

ابن مبارک نے سلیمان کی روایت سے بیان کیا کہ قبروں سے اٹھائے جانے سے پہلے چالیس روز گاڑھے پانی کی بارش ہوگی۔

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے کہ دونوں صوروں کے درمیان عرش کی جڑ سے پانی کی ایک وادی جاری ہو جائے گی دونوں صوروں کے درمیان چالیس سال کا فصل ہوگا۔ اس پانی سے انسانوں اور پرندوں اور چوپایوں کا گلا ہوا جسم اگ آئے گا۔ دنیا میں اگر کوئی ان کو پہچانتا ہوگا اور اس وقت وہ ان کی طرف سے گزرے گا تو فوراً شناخت کرلے گا پھر روحوں کو چھوڑا جائے گا اور وہ آکر اپنے اپنے جسموں سے جڑ جائیں گی۔

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ۚ جو شخص عزت حاصل کرنا چاہتا ہے تو (دنیا اور آخرت میں) ساری عزت اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

فراء نے آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا جو شخص جاننا چاہتا ہے کہ عزت کس کے لئے ہے۔ تو وہ سمجھ لے کہ تمام تر عزت اللہ کے لئے ہے۔ بظاہر آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو اپنے لئے عزت کا خواستگار ہے تو اللہ کی بارگاہ سے ہی اس کو عزت طلب کرنی چاہئے اسی کی فرماں برداری کر کے عزت حاصل کرے کیونکہ ساری عزت کا خالق و مالک اللہ ہی ہے جس کو چاہے عطا کرے۔

کافر بتوں کی پوجا کر کے عزت کے خواستگار تھے اللہ نے کافروں کے متعلق فرمایا ہے وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ۙ كَلَّا۔

اور منافق کافروں کی نظر میں معزز بننا چاہتے تھے اللہ نے منافقوں کے متعلق فرمایا اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا۔

آیت مذکورہ میں دونوں کے خیال کی تردید کردی گئی۔ آگے فرمایا کہ عزت کے حصول کا ذریعہ صرف توحید اور نیک عمل ہے۔

اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ اللہ ہی کی طرف چڑھتے ہیں پاک کلمات۔ پاک کلمات سے مراد ہیں: سبحان اللہ والحمد للہ واللہ اکبر ولا الہ الا اللہ وتبارک اللہ وغیرہ۔

چڑھنے سے مجازاً مراد ہے قبول ہونا۔ قتادہ کا یہی قول روایت میں آیا ہے۔ یا کلمات کے چڑھنے سے مراد ہے ان فرشتوں کا عرش کی طرف چڑھنا جو ان پاک کلمات کو لکھ کرلے جاتے ہیں۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا جو شخص پانچ کلمات سبحان الله والحمد لله ولا اله الا الله والله اکبر و تبارک الله کہتا ہے۔ کوئی ایک فرشتہ ان کو فوراً لے کر اپنے پروں کے نیچے چھپا کر اوپر چڑھ جاتا ہے اور ملائکہ کی جس جماعت کی طرف سے گزرتا ہے وہ ملائکہ ان کلمات کے قائل کے لئے دعاء مغفرت کرتے ہیں۔ آخر رب العالمین کی بارگاہ میں ان کلمات کو وہ فرشتہ پیش کر دیتا ہے۔ اس کی تصدیق اللہ کی کتاب کی اس آیت سے ہوتی ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ۔

رواہا البغوی والحاکم وغیرہ۔ ثعلبی اور ابن مردویہ نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے اس حدیث کو مرفوعاً بیان کیا ہے۔

وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ اور اچھا کام اس (اچھے کلام) کو پہنچا دیتا ہے۔

کلبی اور مقاتل کے نزدیک يَرْفَعُ کی ضمیر فاعل اَلْكَلِمُ کی طرف راجع ہے اور يَرْفَعُهٗ میں ہ ضمیر مفعول العمل کی طرف لوٹ رہی ہے مطلب یہ ہے کہ (کلمات توحید وغیرہ عمل صالح کو مقبول بنا دیتے ہیں یعنی) جب تک عمل صالح کی بناء توحید پر نہ ہو قابل قبول نہیں ہوتا۔

سفیان بن عیینہ کے نزدیک يَرْفَعُ کی ضمیر فاعل اللہ کی طرف راجع ہے مطلب یہ ہے کہ عمل صالح یعنی اس عمل کو جو خالص اللہ کے لئے کیا جائے جس کے اندر کسی شہرت طلبی اور دکھاوٹ کی آمیزش نہ ہو اللہ اوپر اٹھاتا یعنی قبول فرماتا ہے۔ خلوص نیت اقوال و اعمال کے مقبول ہونے کا ذریعہ ہے۔

(عام اہل تفسیر کے نزدیک) یرفع کی ضمیر عمل صالح کی طرف راجع ہے اور ہ ضمیر منصوب مفعول ہے اور اَلْكَلِمُ کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی اعمال صالحہ، کلمات طیبہ کو مقبول بنا دیتے ہیں۔ اَلْكَلِمُ کا لفظ مفرد ہے جمع نہیں ہے جنس مراد ہے اسی وجہ سے اَلطَّيِّبَةُ کی جگہ اَلطَّيِّبُ فرمایا۔ یا یوں کہا جائے کہ اَلْكَلِمُ الطَّيِّبُ بعض کلمات طیبہ یعنی صرف وہ کلمات جن کی بناء خلوص نیت پر ہو۔ حضرت ابن عباسؓ، سعید بن جبیرؓ، حسن، عکرمہؓ اور اکثر اہل تفسیر کا یہی قول ہے مطلب وہی ہے جو عام اہل تفسیر نے بیان کیا ہے۔

حسن اور قتادہ نے کہا اَلْكَلِمُ الطَّيِّبُ اللہ کا ذکر اور عمل صالح اداء فریضہ ہے جو اللہ کا ذکر تو کرے اور فرض ادا نہ کرے اس کا ذکر رد کر دیا جاتا ہے۔ ایمان آرزو کرنے سے نہیں ملتا نہ (دل پر) ملمع پاشی کا نام ایمان ہے بلکہ ایمان وہ ہے جو دل میں جما ہوا ہو اور اعمال صالحہ اس کی تصدیق کر رہے ہوں جس کا قول تو اچھا ہو اور عمل صالح نہ ہو اللہ اس کے قول کو اس کے منہ پر مار دیتا ہے اور جس کا قول بھی اچھا ہو اور عمل بھی صالح ہو اللہ اس کو قبول فرمالیتا اس کا قول عمل کو مقبول بنا دیتا ہے یہی مطلب ہے آیت اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ کا۔

حدیث مبارک میں آیا ہے کہ بغیر عمل کے اللہ قول کو قبول نہیں فرماتا اور (قول و عمل کے ساتھ خلوص نیت بھی ضروری ہے) صرف قول و عمل بھی بغیر نیت کے مقبول نہیں۔

میں کہتا ہوں آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بغیر عمل کے ایمان ناقابل اعتبار اور بے کار ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ جس نے اس بات کی شہادت دی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ ہی تنہا معبود ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں اور عیسیٰ اللہ کے بندے اور رسول اور اللہ کی بندی کے بیٹے اور کلمۃ اللہ تھے جو اللہ نے مریم کی طرف القاء کیا تھا اور اللہ کی طرف سے روح تھے اور اس بات کی بھی شہادت دی کہ جنت حق ہے اور دوزخ حق ہے تو اللہ اس کو جنت میں داخل فرمادے گا اس کے عمل کچھ بھی ہوں۔ رواہ الشیخان فی الصحیحین عن عبادۃ بن الصامت۔

بلکہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ کلمات طیبہ اللہ کی طرف چڑھتے ہیں بارگاہ الٰہی میں قبول کئے جاتے ہیں اب اگر ان کے ساتھ اعمال صالحہ بھی ہوں تو کلمات کی شان اور اونچی ہو جاتی ہے اور ثواب بڑھ جاتا ہے۔

رہی وہ حدیث جس میں فرمایا ہے کہ بغیر عمل کے قول مقبول نہیں ہوتا اس سے مراد یہ ہے کہ منافق کا زبانی قول جو عمل قلبی کے ساتھ نہ ہو اور اعمال اعضاء بھی قول کے خلاف ہوں وہ ناقابل اعتبار اور بے کار ہے اسی طرح جو عمل بغیر خلوص نیت کے کیا جائے نہ قلبی عقیدہ عمل کے مطابق ہو نہ اخلاص قلبی اس عمل کے ساتھ ہو وہ بھی قابل قبول نہیں ہوتا۔

بعض اہل علم نے آیت کے آخری فقرہ کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ عمل صالح پاک کلام کے قائل (یعنی اس) کے درجہ کو اونچا کر دیتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۗ وَمَكْرُ اُولٰٓئِكَ هُوَ يَبُوْرُ ۝

اور جو لوگ بری بری تدبیریں کرتے ہیں ان کو سخت عذاب ہوگا اور ان لوگوں کا یہ مکر نیست و نابود ہو جائے گا۔

ابو العالیہ نے کہا بری تدبیروں سے مراد ہیں قریش کی وہ خفیہ تدبیریں جو دار الندوہ میں بیٹھ کر رسول اللہ ﷺ کے متعلق انہوں نے کی تھیں۔ انہیں تدبیروں کے متعلق سورۂ انفال میں کہا ہے وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ کلبی نے يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ کا ترجمہ کیا ہے برائیاں کرتے ہیں۔ مجاہد اور شہر بن حوشب کے نزدیک ریاکار لوگ مراد ہیں۔

هُوَ يَبُوْرُ۔ وہ یعنی اللہ ان کو نابود کر دے گا۔ اللہ نے فرمایا ہے وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ۗ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ یا یہ مطلب ہے کہ اللہ ریاکاروں کے اعمال کو نابود کر دے گا۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا ۗ اور اللہ نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے پھر نسلاً نطفہ سے پیدا کیا پھر تم کو جوڑے جوڑے بنایا۔

اس آیت میں بھی حشر جسمانی پر اللہ کے قادر ہونے کو ثابت کیا ہے کیونکہ ابتدائی تخلیق دوبارہ پیدا کرنے سے آسان نہیں ہے (جب ابتداء میں اللہ نے پیدا کر دیا تو دوبارہ پیدا کرنا اس کے لئے کچھ دشوار نہیں)

مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ یعنی اصل بعید (ابتدائی بنیاد) تو تمہاری مٹی سے ہے حضرت آدم کو مٹی سے بنایا تھا اور اصل قریب نطفہ ہے۔

اَزْوَاجًا یعنی صنف نر اور مادہ۔

وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ۗ اور کسی عورت کو نہ حمل رہتا ہے اور نہ وہ اس کو جنتی ہے مگر ہر بات اللہ کے علم میں ہوتی ہے یعنی اللہ کو معلوم ہوتی ہے۔

وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖۤ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ۗ اور نہ کسی کی عمر زیادہ مقرر کی جاتی ہے اور نہ کسی کی عمر کم مقرر کی جاتی ہے مگر یہ سب لوح محفوظ میں ہوتا ہے

لَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖ یعنی کسی کی عمر کا کوئی حصہ نہیں گزرتا اور اس طرح اس کی عمر میں کمی نہیں ہوتی۔

اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مگر اس کا اندراج پہلے سے لوح محفوظ میں ہوتا ہے یا کِرَامًا کَاتِبِیْنَ کے اعمال ناموں میں اس کا اندراج ہو جاتا ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا اُمُّ الْكِتٰبِ یعنی لوح محفوظ میں لکھا ہوتا ہے کہ فلاں شخص کی عمر اتنے سال کی ہوگی پھر اس کے نیچے لکھا ہوتا ہے ایک دن گزر گیا دو دن گزر گئے تین دن گزر گئے اسی طرح پوری عمر کے دن لکھے ہوئے ہوتے ہیں اور اس طرح عمر ختم ہو جاتی ہے۔

بعض علماء کے نزدیک آیت کا یہ مطلب ہے کہ کسی کی عمر میں بیشی یا کمی نہیں کی جاتی مگر اس کا اندراج پہلے سے لوح محفوظ میں ہوتا ہے مثلاً لوح محفوظ میں لکھا ہوتا ہے کہ فلاں شخص کی عمر اتنے سال کی ہوگی پھر بعض نیکیوں کی وجہ سے اس کی عمر بڑھا دی جائے گی یا بعض گناہوں کی وجہ سے اس کی عمر کم کر دی جائے گی۔ یہ سب کچھ لوح محفوظ میں پہلے سے لکھا ہوتا ہے اس مطلب کی تائید رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے کہ دعا کے سوا قضا کو کوئی چیز پلٹ نہیں سکتی اور سوائے حسن سلوک

کے عمر میں اور کوئی چیز زیادتی نہیں کر سکتی رواہ الترمذی عن سلمان الفارسی۔
بعض اہل تفسیر نے یہ مطلب بیان کیا ہے طویل العمر شخص کی عمر میں بیشی اور ناقص العمر کی عمر میں اس طرح کی نہیں کی جاتی کہ ناقص العمر کی عمر کا کوئی حصہ اس کی عمر سے گھٹا کر طویل العمر کی عمر میں بڑھا دیا جائے اور اس طرح ایک طویل العمر ہو جائے اور دوسرا ناقص العمر۔

إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ۝ بلاشبہ یہ (عمر اور اعمال کی کتابت) اللہ کے لئے آسان ہے۔

وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرَانِ هَٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَائِغٌ شَرَابُهُ وَهَٰذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ
اور دونوں سمندر برابر نہیں ہیں (بلکہ) ایک تو شیریں ہے پیاس بجھانے والا جس کا پینا خوشگوار ہے اور دوسرا شور تلخ ہے۔

فُرَاتٌ۔ بہت شیریں۔ بعض نے ترجمہ کیا پیاس بجھانے والا ہے۔
سَائِغٌ۔ آسانی سے حلق میں اتر جانے والا۔ أُجَاجٌ۔ سخت نمکین۔ بعض نے اس کا ترجمہ کیا اتنا نمکین کہ حلق کو جلا دے۔
یہ مومن و کافر کی مثال ہے اس آیت میں اللہ کی قدرت کاملہ کا بیان کیا گیا ہے کہ ایک ہی جنس سے اللہ نے مختلف الخواص دو چیزیں پیدا کی ہیں۔

وَمِن كُلٍّ تَأْكُلُونَ لَحْمًا طَرِيًّا اور تم ہر ایک سمندر سے نکال کر تازہ گوشت یعنی مچھلیاں کھاتے ہو۔

یہ جملہ یا تو دونوں سمندروں کی صفت ہے جس کو ذیلی طور پر بیان کیا گیا ہے یا ذیلی صفت نہیں ہے بلکہ تشبیہ کی تکمیل ہے مطلب اس طرح ہوگا کہ جس طرح دونوں سمندر بعض فوائد میں مشترک ہونے کے باوجود ایک جیسے نہیں ہیں پانی کا جو اصل مقصد ہے اس کے لحاظ سے دونوں میں بڑا فرق ہے اسی طرح مومن و کافر بعض خواص انسانی میں مشترک ہونے کے باوجود تخلیق انسانی کے اصل مقصد یعنی معرفت رب اور عبادت الٰہیہ میں برابر نہیں ہیں۔ اللہ نے تخلیق کے اصل مقصد کو بیان کرتے کے لئے فرمایا ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ۔
یا کافر پر تلخ نمکین پانی کو فضیلت دینے کے لئے وَمِن كُلٍّ تَأْكُلُونَ لَحْمًا طَرِيًّا فرمایا ہے کہ تلخ پانی شیریں پانی کے ساتھ بعض منافع میں شریک ہے نمکین کافر ایسا بھی نہیں ہے۔

وَتَسْتَخْرِجُونَ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا اور (نیز) زیور (یعنی موتی مونگے) تم نکالتے ہو جس کو پہنتے ہو۔ یعنی نمکین سمندر سے نکالتے ہو شیریں سمندر سے موتی مونگے نہیں نکلتے بعض اہل علم نے کہا شیریں سمندر سے بھی موتی نکلتے ہیں اور اس طرح نکلتے ہیں کہ شور سمندر میں شیریں پانی کے کچھ چشمے ہوتے ہیں ان چشموں کا پانی شور سمندر میں اکٹھا ہو جاتا ہے۔

وَتَرَى الْفُلْكَ فِيهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوا مِن فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝ اور دریا میں (آتی جاتی) پانی چیرتی ہوئی کشتیاں تم کو نظر آتی ہیں تاکہ (ان کے ذریعہ سے) تم خدا کی روزی ڈھونڈو اور (اللہ کا) شکر کرو۔

فِيهِ یعنی ہر سمندر میں شیریں میں بھی اور شور میں بھی۔
مَوَاخِرَ۔ یہ مَاخِرَةٌ کی جمع ہے اس کا مادہ مخر ہے مخر کا معنی ہے پھاڑنا۔ مراد ہے پانی کو پھاڑنا۔ یعنی آتے جاتے پانی کو پھاڑتی ہیں۔
مِن فَضْلِهِ۔ یعنی تجارت کے ذریعہ سے تم اللہ کی دی ہوئی روزی بحری سفر کر کے تلاش کرو۔
وَلَعَلَّكُمْ۔ لَعَلَّ امید کے لئے آتا ہے اور اللہ کسی کے شکر کی امید نہیں رکھتا نہ اس کے کسی فعل کی غرض ذاتی منفعت ہوتی ہے اس لئے مراد یہ ہے کہ ظاہر حال کا تقاضا ہے کہ تم سے شکر کی امید کی جائے۔ یا لَعَلَّ مجازاً لام کے معنی میں ہے۔ لام کا

معتی ہے تاکہ۔

يُولِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وہ (موسم گرما میں) رات کو دن میں داخل کر دیتا ہے اور (موسم سرما میں) دن کو رات میں داخل کر دیتا ہے۔ یعنی دن کو بڑھاتا اور رات کو گھٹاتا ہے اور رات کو بڑھاتا دن کو گھٹاتا ہے۔

وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُسَمًّى اور اس نے سورج اور چاند کو کام پر لگا رکھا ہے ہر ایک مقرر مدت تک چلتا رہے گا۔ یعنی آسمان میں چلتا رہے گا۔

لِأَجَلٍ مُسَمًّى۔ اس سے مراد یا دورے کی مدت ہے یا دورے کی انتہا یا قیامت کا دن۔ قیامت ہونے پر ان کی رفتار ختم ہو جائے گی۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ یہ ہی (جس نے یہ تمام اشیاء بنائی ہیں)۔ اللہ ہے جو تمہارا رب ہے اسی کا ملک ہے۔ یعنی اللہ ہی یہ تمام کام کر رہا ہے اس لئے وہی معبود ہے وہی رب ہے اسی کی حکومت ہے۔

وَالَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِهٖ مَا يَمْلِكُونَ مِنْ قِطْمِيرٍ ﴿۱۳﴾ اور اللہ کے سوا جن (بتوں وغیرہ) کو تم پکارتے ہو (یعنی عبادت کرتے ہو) وہ ادنیٰ اختیار بھی نہیں رکھتے۔

قِطْمِيرٍ۔ کھجور کی گٹھلی کا چھلکا جو گٹھلی پر لپٹا ہوتا ہے مطلب یہ کہ جب اللہ کے سوا کسی کو ادنیٰ اختیار بھی نہیں تو استحقاق معبودیت کیسے ہو سکتا ہے۔

إِنْ تَدْعُوهُمْ لَا يَسْمَعُوا دُعَاءَكُمْ وَلَوْ سَمِعُوا مَا اسْتَجَابُوا لَكُمْ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُونَ بِشِرْكِكُمْ اور اگر تم ان کو (مراد پوری کرنے کے لئے) پکارو گے تو تمہارے پکار (دعا) سنیں گے نہیں اور اگر سن لیں گے تو تمہارا کہنا قبول نہ کر پائیں گے اور قیامت کے دن وہ (خود) تمہارے شرک کرنے کی مخالفت کریں گے۔

یعنی اول تو بے جان ہونے کی وجہ سے وہ تمہاری پکار کو سن نہ سکیں گے اور اگر ان میں سے کچھ باشعور ہوئے جیسے ابلیس وغیرہ تو تمہاری دعا کو قبول نہ کر سکیں گے کیونکہ اول تو ان کو نفع رسانی کی قدرت ہی نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ تم سے اور تمہارے شرک سے بیزار ہیں جیسے عیسیٰ اور عزیر اور ملائکہ۔

يَكْفُرُونَ بِشِرْكِكُمْ یعنی تم جن کو اللہ کی عبادت میں شریک کرتے ہو وہ قیامت کے دن اس کے منکر ہو جائیں گے اور کہیں گے مَا كُنْتُمْ إِيَّانَا تَعْبُدُونَ تم ہماری پوجا نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے ہوا و ہوس اور باطل خیالات کی پوجا کرتے تھے۔

۱۴ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيرٍ ﴿۱۴﴾ اور تم کو خبر رکھنے والے کی برابر کوئی نہیں بتائے گا۔

خَبِيرٍ (باخبر) عالم۔ مراد اللہ۔ اللہ ہی کا ہر چیز کا صحیح پورا علم ہے یا یہ مطلب ہے کہ اے وہ شخص جو اسباب فریب پر فریفتہ ہے۔ تجھے کوئی ایسی اطلاع نہیں دے گا جیسے اللہ دے رہا ہے جو حقائق اشیاء سے پورا باخبر ہے۔

يٰٓأَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ﴿۱۵﴾ اے لوگو تم اللہ کے محتاج ہو اور اللہ بے نیاز اور خوبیوں والا ہے۔

یعنی وجود، توابع وجود، بقاء وجود، دوزخ سے نجات اور جنت کے ثواب میں تم ہمیشہ اللہ کے محتاج ہو۔ یوں تو ساری خلائق اللہ کی محتاج ہے لیکن انسان نے باوجود کمزور اور ظالم و جاہل ہونے کے بار امانت اپنے کندھوں پر اٹھایا اس لئے دوسری مخلوق کے مقابلہ میں یہ زیادہ محتاج ہے اس کی احتیاج کی نسبت باقی مخلوق کی احتیاج در خور اعتناء نہیں ہے۔

الْغَنِيُّ میں الف لام عہدی ہے یعنی اللہ وہ ہستی ہے جس کی بے نیازی اور موجودات پر عمومی انعام معروف ہے۔

الْحَمِيدُ۔ فی نفسہ وہ مخلوق کی حمد کا مستحق ہے۔

إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِيدٍ ﴿۱۶﴾ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيزٍ ﴿۱۷﴾

اگر وہ چاہے تم سب کو فنا کر دے اور ایک نئی مخلوق پیدا کر دے اور یہ بات اللہ کے لئے کچھ مشکل نہیں ہے۔

بِخَلْقٍ جَدِيدٍ۔ یعنی ایک اور مخلوق جو تمہاری جگہ آباد ہو اور تم سے زیادہ اطاعت گزار ہو یا ایک نیا عالم جس سے تم ناواقف ہو۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرَىٰ ۚ اور کوئی دوسرے کا (گناہ کا) بوجھ (اپنے اوپر) نہیں اٹھائے گا۔

یعنی کوئی گناہ گار آدمی دوسرے شخص کے گناہ کا بوجھ برداشت نہیں کرے گا۔

ایک شبہ

ایک آیت ہے وَلَيَحْمِلُنَّ أَثْقَالَهُمْ وَأَثْقَالًا مَّعَ أَثْقَالِهِمْ اور وہ اپنے بار گناہ اٹھائیں گے اور اپنے بوجھ سے اور بوجھ بھی اٹھائیں گے۔ اس سے ثابت ہوا کہ لوگ اپنا بار گناہ اٹھائیں گے اور دوسروں کے گناہ بھی ان پر لادے جائیں گے۔

ازالہ:۔ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں جو خود بھی گناہ گار ہیں اور دوسروں کو گمراہ کرنے والے بھی ہیں ان لوگوں پر اپنے گمراہ ہونے کا بار بھی پڑے گا اور دوسروں کے گمراہ کرنے کا بھی۔ گمراہ کرنے کا بار گناہ بھی انہیں کا ہو گا۔

(یہ مطلب نہیں کہ گمراہ کرنے والے ان لوگوں کا بار گناہ اپنے اوپر اٹھالیں گے جو ان کے گمراہ کرنے سے گمراہ ہوئے اور ان کو گناہ کے بوجھ سے آزاد کر دیں گے)

مسلم نے حضرت ابو موسیٰ کی روایت سے مرفوعاً بیان کیا ہے کہ قیامت کے دن کچھ مسلمان پہاڑوں کے برابر گناہ لے کر آئیں گے۔ اللہ ان کے گناہوں کو بخش دے گا اور ان کے گناہ یہود و نصاریٰ پر ڈال دے گا۔

دوسری روایت میں آیا ہے جب قیامت کا دن ہو گا تو اللہ ہر مسلمان کے سامنے ایک یہودی یا عیسائی کو لائے گا اور فرمائے گا یہ دوزخ کے لئے تیرا بدلہ ہے (یعنی تیری جگہ دوزخ میں اس کو بھیجا جا رہا ہے)۔

طبرانی اور حاکم نے اول الذکر حدیث بیان کی ہے اور ابن ماجہ و طبرانی نے موخر الذکر حدیث نقل کی ہے۔

ابن ماجہ اور بیہقی نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے قیامت کا دن ہو گا تو ہر مسلم کے سامنے ایک مشرک کو لایا جائے گا اور اس سے کہا جائے گا یہ دوزخ سے بچاؤ کے لئے تیرا معاوضہ ہے۔

میرے نزدیک ان احادیث کا مطلب یہ ہے کہ امت اسلامیہ سے کافروں نے بعض گناہوں کی بنیاد ڈالی، خود بھی ان گناہوں کا ارتکاب کیا اور گناہ کرنے کا ایک طریقہ بھی ایجاد کر دیا آئندہ اقوام و افراد نے ان کی پیروی کی اور ان کے نقش قدم پر چل نکلے۔ مسلمان بھی ان میں سے بعض گناہوں میں آلودہ ہو گئے لیکن اللہ ان کی مغفرت فرما دے گا۔ مسلمانوں پر یہ اللہ کی مہربانی ہو گی لیکن گناہ کی بنیاد ڈالنے اور طریقہ ایجاد کرنے والوں کو دوہرا عذاب ہو گا۔ خود گناہ کرنے کا اور گناہ کا طریقہ جاری کرنے کا۔

وَإِن تَدْعُ مُثْقَلَةٌ إِلَىٰ حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ۗ

اور اگر کوئی بوجھ سے لدا ہوا شخص (یعنی گناہ گار) کسی کو اپنا بوجھ اٹھا لینے کے لئے بلائے گا تو (اس کا) کچھ بھی بوجھ نہیں اٹھایا جائے گا خواہ وہ قرابتدار ہی ہو۔

مُثْقَلَةٌ یعنی اس شخص پر گناہوں کا بوجھ لاد دیا گیا ہو مراد یہ ہے اگر کوئی گناہ گار کسی کو اپنا بار گناہ اٹھا لینے کے لئے بلائے گا۔

لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ یعنی گناہ گار کے بار گناہ کا کوئی حصہ دوسرا آدمی اپنے اوپر نہیں اٹھائے گا مطلب یہ کہ نہ کسی دوسرے کا بوجھ اس پر ڈالا جائے گا نہ اس کا بوجھ دوسرے پر ڈالا جائے گا۔

وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ خواہ جس کو بوجھ اٹھانے کے لئے بلایا گیا ہو وہ بلانے والے کا قرابتدار ہی ہو۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ماں باپ بیٹے کو پکاریں گے اور کہیں گے بیٹے ہمارا کچھ بار تو اٹھا لے۔ بیٹا جواب دے گا مجھ میں برداشت

کی طاقت نہیں میرے عمل کا بار ہی کافی ہے۔ آپ تو صرف ایسے لوگوں کو ڈرا سکتے ہیں جو

اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ

بے دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔

اخفش نے کہا مطلب یہ ہے کہ آپ ڈرانے سے انہی لوگوں کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں مراد یہ ہے کہ تخویف اگرچہ عام ہے ہر شخص کو آپ عذاب سے ڈراتے ہیں لیکن اس تخویف کا فائدہ صرف اہل خشیت کو پہنچتا ہے اس لئے حقیقت میں آپ رب سے خشیہ رکھنے والوں کو ہی ڈراتے ہیں۔

بِالْغَيْبِ۔ یعنی رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں ایسی حالت میں کہ عذاب ان کے سامنے نہیں ہے۔ یا تنہائی کی حالت میں ڈرتے ہیں جب سب لوگوں سے وہ غائب ہوتے ہیں۔

وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۚ اور نماز کی پابندی کرتے ہیں۔

یعنی جو لوگ اللہ کے خوف سے تمام گناہوں سے پرہیز رکھتے اور فرائض کو ادا کرتے ہیں انہیں کو آپ کے خوف دلانے کا فائدہ پہنچے گا۔ اور جو شخص پاک ہوتا ہے وہ

وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ ۚ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ⑱

اپنے لئے پاک ہوتا ہے اور اللہ کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ پاک ہونے سے مراد ہے گناہوں سے پاک ہونا۔

وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ⑲ وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ ⑳ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ ㉑ وَمَا

يَسْتَوِي الْاَحْيَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ ۚ

اور اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں اور نہ تاریکیاں اور روشنی اور نہ چھاؤں اور دھوپ اور زندے اور مردے برابر نہیں ہو سکتے۔

اَلْاَعْمٰى راہ راست سے نابینا یعنی کافر یا جاہل۔

اَلْبَصِيْرُ دیکھنے والا یعنی مومن یا جاننے والا۔

اَلظُّلُمٰتُ تاریکیاں یعنی کفر۔

اَلنُّوْرُ روشنی یعنی ایمان۔

اَلظِّلُّ چھاؤں یعنی جنت اور ثواب۔

اَلْحَرُوْرُ یعنی دوزخ اور عذاب۔

وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ۔ اہل ایمان و کفر کی دوسری تشبیہ ہے جو اول تشبیہ سے زیادہ بلیغ ہے اس لئے فعل کو مکرر ذکر کیا۔ بعض کے نزدیک یہ اہل علم و جہل کی تمثیل (اور اول الذکر تشبیہ اہل ایمان و کفر کی ہے)۔

اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ اللہ یا شبہ جس کو (راہ راست پر چلانا) چاہتا ہے اس کو سناتا ہے یعنی آیات کو سمجھنے اور نصیحت اندوز ہونے کی توفیق دیتا ہے۔ اور آپ ان لوگوں کو نہیں سنانے

وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ ㉒ اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِيْرٌ ㉓

والے جو قبروں میں مدفون ہیں آپ تو محض ڈرانے والے ہیں۔

کفر پر جمے رہنے والوں کو مردوں سے تشبیہ دی اور مردے بھی وہ جو قبروں کے اندر ہوں۔ اس ترشیح تمثیل سے کافروں کے ایمان لانے کی امید کو پرزور طور پر منقطع کر دیا۔

اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِيْرٌ کا یہ مطلب ہے کہ آپ کا کام صرف دوزخ کا خوف دلانا ہے ہدایت یاب کرنے پر آپ کو قدرت نہیں ہے۔

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۭ وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ㉔

ہم نے ہی آپ کو دین حق دے کر خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور کوئی امت ایسی نہیں گزری کہ اس میں کوئی ڈر سنانے والا نہ گزرا ہو۔

بَشِیْرًا۔ مومنوں کو سچے وعدہ کے ساتھ خوش خبری دینے والا۔

نَذِیْرًا۔ کافروں کو سچی وعید کے ساتھ ڈرانے والا۔

مِّنْ اُمَّةٍ۔ گزشتہ امتوں میں سے کوئی امت ایسی نہیں ہوئی۔

اِلَّا خَلَا فِیْهَا نَذِیْرٌ۔ نذیر سے مراد ہے نبی یا نبی کے قائم مقام کوئی عالم۔ چونکہ پہلے جملہ میں نذیر کے ساتھ بشیر کا ذکر آچکا تھا اس لئے اس جگہ مکرر بشیر کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ صرف نذیر کا ذکر کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ تاثیر کے اعتبار سے تخویف کا درجہ بشارت دینے سے زائد ہے۔ نفع کا لالچ دفع ضرر سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔

وَاِنْ یُّكَذِّبُوْكَ اور اے محمد ﷺ اگر وہ لوگ آپ کو جھوٹا قرار دے رہے ہیں (تو آپ اس کا رنج نہ کریں اور ان کی طرف سے اذیت رسانی پر صبر کریں جس طرح آپ سے پہلے انبیاء نے صبر کیا)

فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ وَبِالزُّبُرِ وَبِالْكِتٰبِ الْمُنِیْرِ ﴿۲۵﴾

کیونکہ ان سے پہلے لوگوں نے بھی تکذیب کی تھی جب ان کے پیغمبر کھلے کھلے معجزات اور صحیفے اور روشن کتاب کے ساتھ ان کے پاس پہنچے تھے۔

اَلْبَیِّنٰتِ۔ کھلے کھلے معجزات جو انبیاء نبوت کی سچی شہادت دے رہے تھے۔

اَلْكِتٰبِ الْمُنِیْرِ۔ روشن کتاب جیسے توریت اور انجیل۔ یعنی ہر پیغمبر الگ الگ معجزہ اور کتاب کے ساتھ آیا۔

ثُمَّ اَخَذْتُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَكَیْفَ كَانَ نَكِیْرِ ﴿۲۶﴾ پھر میں نے ان کافروں کو پکڑ دھرا سو (دیکھ لو) میرا کیسا عذاب ہوا۔ ع ۱۵

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ؕ
وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِیْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِیْبُ سُوْدٌ ﴿۲۷﴾

کیا (اے مخاطب) تو نے اس بات پر نظر نہیں کی کہ اللہ نے اوپر سے پانی اتارا پھر اس کے ذریعہ سے ہم نے مختلف رنگوں کے پھل پیدا کئے۔ اور اسی طرح پہاڑوں کے بھی مختلف حصے ہیں بعض سفید اور بعض سرخ کہ ان کے رنگ بھی مختلف ہیں اور بعض بہت گہرے سیاہ ہیں۔

مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا۔ یعنی پھلوں کی جنسیں مختلف ہیں یا ان کی اصناف مختلف ہیں یا ان کی رنگتیں مختلف ہیں زرد۔ سبز۔ سرخ۔

جُدَدٌ۔ یعنی دھاری دار۔

بِیْضٌ وَّحُمْرٌ۔ یعنی سفید ہیں۔ سرخ ہیں (اور زرد ہیں)

مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا۔ یعنی گہرے اور ہلکے ہونے کے لحاظ سے ان کی رنگتوں میں اختلاف ہے۔

وَغَرَابِیْبُ سُوْدٌ۔ غرابیب سے پہلے سود موصوف محذوف ہے اور سود مذکور اس کی تاکید ہے غرابیب چونکہ تابع (صفت) ہے اور تابع متبوع (موصوف) کے بعد آنا چاہئے اس لئے سود مذکور کی صفت غرابیب نہیں ہے۔ بیضاوی نے لکھا ہے یہ طرز اداء مزید تاکید کے لئے مفید ہے۔

جلال الدین محلی نے کہا اسود غربیب کثیر الاستعمال ہے اور غربیب اسود کا استعمال کم ہے۔ میں کہتا ہوں یہ قلیل استعمال اس وقت ہوتا ہے جب سیاہی کی مزید تاکید مقصود ہو۔

وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ؕ اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ

اور اسی طرح آدمیوں اور جانوروں اور چوپایوں میں بھی بعض کے رنگ مختلف ہیں اور خدا سے وہی بندے ڈرتے ہیں جو (اللہ کی عظمت) کا علم رکھتے ہیں۔

اللہ نے پہلے آسمان سے بارش ہونے کا ذکر فرمایا پھر اس سے مختلف اجناس واصناف اور کثیر انواع والوان کی مخلوق کی نشوونما پانے کا اظہار کیا یہ تمام اجناس وانواع خلق صانع کی ہستی قدرت معبودیت اور دوسری صفات پر دلالت کر رہی ہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ اللہ کا خوف وہی علماء کرتے ہیں جو خلق اللہ کی حالت کا مطالعہ غور وفکر سے کرتے ہیں اور مصنوع سے صانع کی ذات صفات افعال اور انفعالات پر استدلال کرتے ہیں ان کے خلاف وہ جاہل (کفار مکہ وغیرہ) اور وہ جاہل بننے والے ہیں جن کو یا تو علم نہیں یا علوم کی ان کے دلوں تک خلوص کے ساتھ رسائی نہیں۔ جیسے علماء یہود ونصاریٰ۔

شیخ اجل شہاب الدین سہروردی نے لکھا ہے اس آیت میں در پردہ بیان کیا گیا ہے کہ جس کے دل میں خشیت نہیں وہ عالم نہیں۔ میں کہتا ہوں اللہ کی عظمت وجلالت اور صفات کمالیہ کو جاننا مستلزم خشیت ہے خشیت علم کے لئے لازم ہے اور لازم کی نفی ملزوم کی نفی پر دلالت کرتی ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا مراد یہ ہے کہ مجھ سے وہی ڈرتا ہے جس کو میرے قہر غلبہ اور سطوت کا علم ہو جو شخص جتنا زیادہ اللہ اور اس کی صفات کو جانتا ہے وہ اتنا ہی اللہ سے ڈرتا ہے۔

شیخین نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بعض کام کئے اور لوگوں کو اس کی اجازت دے دی لیکن بعض لوگوں نے ان کاموں سے پاک رہنا چاہا (یعنی جائز یا مناسب نہ سمجھا) حضور ﷺ کو اس کی اطلاع ملی تو ایک خطبہ دیا جس میں اللہ کی حمد وثنا کے بعد فرمایا کیا وجہ ہے کہ کچھ لوگ اس کام سے پرہیز رکھتے ہیں جو میں کرتا ہوں۔ خدا کی قسم میں ان سے زیادہ اللہ کو جانتا ہوں اور ان سے بڑھ کر اللہ سے ڈرتا ہوں۔

دارمی نے بروایت مکحول مرسل حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسی میری فضیلت تم میں سے ادنیٰ آدمی پر پھر حضور ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا۔

بخاری نے صحیح میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے جو کچھ میں جانتا ہوں اگر تم جانتے تو روتے بہت۔ ہنستے کم۔ اس بیان سے ثابت ہوا کہ کامل خشیت انبیاء کو ہوتی ہے اس کے بعد اولیاء کا درجہ ہے۔ حقیقت شناس کی ہوتے ہیں اس کے بعد درجہ بدرجہ علماء کا نمبر ہے۔

مسروق کا قول ہے خشیت اللہ ہونا ہی بڑا علم ہے اور فریب خوردہ ہونا بڑی جہالت۔

شعبی کا قول ہے عالم وہی ہے جو اللہ سے ڈرتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ۝ بے شک اللہ بڑے غلبہ اور مغفرت والا ہے۔

یہ خشیت اللہ کے واجب ہونے کی علت ہے۔ یعنی اللہ اپنی حکومت میں غالب ہے۔ سرکشی پر جمے رہنے والوں کو سزا دینے والا ہے اور گناہ سے توبہ کرنے والے کو معاف کرنے والا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ ۝ لِيُوَفِّيَهُمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ جو لوگ خدا کی کتاب کی تلاوت (مع عمل) کے کرتے ہیں اور نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا کیا ہے اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ ہماری راہ میں خرچ کرتے ہیں وہ ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جو کبھی ماند نہ ہوگی تاکہ اللہ ان کی اجرتیں پوری پوری دے۔ اور اپنی مہربانی سے زیادہ بھی دے۔

يَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ یعنی کتاب اللہ کی تلاوت ہمیشہ کرتے رہتے ہیں اور اس کے مضمون پر عمل بھی کرتے ہیں۔ کتاب اللہ سے مراد صرف قرآن مجید ہے یا تمام کتاب الٰہیہ۔ اس صورت میں تکذیب کرنے والوں کی حالت کے بیان کے بعد اس آیت

میں تمام گزشتہ اور موجودہ امتوں میں سے تصدیق کرنے والے مومنوں اور قاریوں اور عالموں کی مدح ہو جائے گی۔

اَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۔ یعنی پوری رعایت حقوق کے ساتھ نماز کی پابندی رکھتے ہیں۔

سِرًّا وَّعَلَانِيَةً ۔ یعنی جس طرح موقع ملے پوشیدہ یا علانیہ راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں۔ بعض نے کہا پوشیدہ خرچ کرنا عام خیرات میں اور علانیہ خرچ کرنا مفروضہ زکوٰۃ و صدقات میں۔ (مراد ہے)

يَرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ ۔ یعنی اطاعت کر کے حصول ثواب کے امیدوار ہوتے ہیں اور تجارت بھی ایسی جس میں بھی خسارہ ہونہ تباہی آئے۔

لِيُوَفِّيَهُمْ ۔ یعنی مذکورہ افعال وہ اس لئے کرتے ہیں کہ اللہ ان کے اعمال کا پورا پورا ثواب ان کو عطا فرمائے اور اپنی مہربانی سے ثواب اعمال میں اضافہ چند گنا بھی کر دے۔ اس مطلب پر لِيُوَفِّيَهُمْ کا تعلق محذوف فعل سے ہوگا یعنی فَعَلُوا مَا فَعَلُوا لِيُوَفِّيَهُمْ الخ یا لِيُوَفِّيَهُمْ میں لام عاقبت کا ہے اور اس کا تعلق يَرْجُوْنَ سے ہے یعنی اس امید تجارت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ ان کے اعمال کا پورا بدلہ دے گا اور اپنی مہربانی سے ان کے ثواب میں اضافہ بھی کر دے گا۔

ابن ابی حاتم اور ابو نعیم نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لِيُوَفِّيَهُمْ اُجُوْرَهُمْ (یعنی) ان کو جنت میں داخل فرما دے اور يَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ (یعنی) جن کے لئے دوزخ واجب ہو گئی ہے ان کے لئے شفاعت کا اختیار عطا فرما دے۔

اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ۝ بلاشبہ بڑی مغفرت کرنے والا اور بڑا قدر دان ہے یعنی لغزشوں کو معاف کرنے والا اور طاعتوں کی قدر افزائی کرنے والا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا وہ بڑے گناہوں کو بخش دے گا اور تھوڑے عمل کی قدر دانی فرمائے گا یعنی بڑا ثواب عنایت کر دے گا۔

عبد الغنی نے تخریج کی ہے کہ اس آیت کا نزول حصین بن حارث بن عبد المطلب بن عبد مناف کے متعلق ہوا تھا۔

وَالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ۭ اور جو کتاب (یعنی قرآن) ہم نے وحی کے ذریعہ سے آپ کے پاس بھیجی ہے وہی حق ہے اور اپنے سے پہلی (آسمانی) کتابوں کی تصدیق کرتی ہے یعنی عقائد اصول احکام اور اخبار میں ان کے موافق ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ ۝ حقیقت یہ ہے کہ اللہ اپنے بندوں سے پورا باخبر اور دیکھنے والا ہے یعنی اشیاء کی ظاہری حالت سے بھی واقف ہے اور اندرونی حقیقت سے بھی۔ اسی کو حق ہے کہ یہ کتاب آپ کے پاس بذریعہ وحی بھیجے اور اس کو معجزہ بنا دے۔

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ پھر یہ کتاب ہم نے ان لوگوں کے ہاتھ میں پہنچائی جن کو ہم نے اپنے تمام بندوں سے منتخب کر لیا۔

ارث کا معنی ہے کسی کے پاس سے ایک چیز کا دوسرے کے پاس منتقل ہو جانا۔ اَوْرَثْنَا کا ترجمہ اَخَّرْنَا بھی کیا گیا ہے اسی معنی کے لحاظ سے میراث کو میراث کہتے ہیں اس صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا کہ گزشتہ امتوں سے اس قرآن کو موخر کر دیا اور اپنے منتخب بندوں کو دیا۔ مِنْ عِبَادِنَا میں مِنْ تبعیضیہ اور عِبَادِنَا میں اضافت عباد کی عزت و عظمت کو ظاہر کر رہی ہے۔

عباد سے مراد ہیں صحابہ کرام اور ان کے بعد قیامت تک آنے والے علماء امت۔ حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک پوری امت اسلامیہ مراد ہے۔ اللہ نے اس امت کو امت وسط بنایا اور تمام امتوں پر برتری عطا فرمائی ہے۔ یہی سب لوگوں پر شہادت دینے والی ہے اور سید الانبیاء کو مبعوث فرما کر اس امت کو یہ شرف عنایت کیا۔

طوبی لنا معشر الاسلام ان لنا ۔۔۔ من العنایت رکنا غیر منہدم

اے گروہ اہل اسلام ہمارے لئے خوشی ہو کہ ہمارا ایک مضبوط سہارا ہے خدا کی عنایت سے جو منہدم ہونے والا نہیں ہے۔

لما دعی الله داعینا لطاعته ۔۔۔ باکرم الرسل کنا اکرم الامم

جب اشرف المرسلین کے ذریعہ اللہ نے ہم کو اپنی طاعت کے لئے دعوت دی تو ہم اشرف الامم ہو گئے۔

فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ سو ان میں سے کچھ تو اپنی جان پر ظلم کرنے والے ہیں اور کچھ ان میں متوسط درجہ کے ہیں اور کچھ ان میں ایسے ہیں جو خدا کی توفیق سے نیکیوں میں ترقی کئے چلے جاتے ہیں۔

ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ یعنی عمل میں کوتاہی کرنے والے۔ اللہ نے انہیں کے حق میں فرمایا ہے وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ دوسری جگہ فرمایا ہے۔ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ۔

مُّقْتَصِدٌ یعنی ظاہر قرآن پر عمل کرتے ہیں حقیقت تک ان کی رسائی نہیں ہوئی۔ اللہ نے انہیں کے متعلق ارشاد فرمایا ہے۔ وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔

بِاِذْنِ اللّٰهِ یعنی اللہ کے ارادہ سے یہ وہ لوگ ہیں جن کی رسائی حقائق قرآن تک ہے۔ اللہ نے انہیں کے متعلق فرمایا ہے وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْھُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ دوسری جگہ فرمایا۔ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ اُولٰۗىِٕكَ الْمُقَرَّبُوْنَ۔ اول الذکر دونوں قسمیں دائیں جانب والوں کی ہوں گی۔

بعض علماء کا قول ہے کہ مقتصد وہ لوگ ہیں جو اکثر قرآن کے موافق عمل کرتے ہیں اور سابق بالخیرات وہ ہیں جو عمل بھی کرتے ہیں اور دوسروں کو تعلیم بھی دیتے اور ہدایت بھی کرتے ہیں۔

بغوی نے اپنی سند سے ابو عثمان نہدی کی روایت سے بیان کیا کہ میں نے خود حضرت عمرؓ سے سنا آپ نے یہ آیت پڑھی اور فرمایا رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے ہم میں کے جو سابق ہیں وہ تو آگے بڑھنے والے ہیں اور جو مقتصد ہیں وہ نجات پانے والے ہیں اور جو ہم میں ظالم ہیں ان کی مغفرت کر دی جائے گی۔[۱] ابو قلابہ نے کہا میں نے یہ حدیث یحییٰ بن معین سے بیان کی تو وہ تعجب کرنے لگے۔ بغوی نے یہ حدیث مرفوعاً بھی بیان کی ہے۔ سعید بن منصور اور بیہقی نے اس کو حضرت عمر کا قول بیان کیا ہے۔

بغوی نے ابو ثابت کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ایک شخص مسجد میں آیا ہے اور اس نے کہا اے اللہ میری غریب الوطنی پر رحم فرما میری تنہائی میں انس (کا ذریعہ) پیدا کر دے اور کسی نیک ہم نشیں کو میرے پاس پہنچا دے۔ حضرت ابو درداء (وہاں

[۱] حضرت صہیب راوی ہیں میں نے خود سنا کہ رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے مہاجرین آگے بڑھ جانے والے شفاعت کرنے والے اور اپنے رب پر ناز کرنے والے ہوں گے قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے قیامت کے دن وہ اپنے اسلحہ کندھوں پر رکھے ہوئے آئیں گے اور جنت کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے جنت کے دربان ان سے کہیں گے تم کون ہو؟ وہ جواب دیں گے ہم مہاجر ہیں۔ دربان کہیں گے کیا تمہارا حساب ہو چکا ہے؟ یہ سنتے ہی مہاجر دوزانو بیٹھ کر آسمان کی طرف دعا کے لئے ہاتھ اٹھا کر کہیں گے اے ہمارے رب کیا اس کا ہم سے حساب ہو گا ہم تو گھر بار مال اور اولاد چھوڑ کر (تیری رضا حاصل کرنے) نکلے تھے اللہ ان کے بازو سونے کے لگا دے گا جن میں زبرجد اور یاقوت جڑے ہوں گے پھر وہ ان بازوؤں سے اڑ کر جنت میں داخل ہو جائیں گے یہی مطلب ہے اللہ کے اس قول کا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ...... سے وَلَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ تک۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ جنت کے اندر اپنے گھروں کو زیادہ جانتے ہوں گے بہ نسبت دنیوی گھروں کی شناخت کے۔ حضرت عثمان اس آیت سے گھبرا گئے اور فرمایا ہمارے سابق اہل جہاد ہیں ہمارے مقتصد شہر والے ہمارے ظالم بدوی ہیں۔ (از مظہر بر واللہ ملہم)

موجود تھے) آپ نے فرمایا اگر تو سچا ہے تو میں تجھ سے زیادہ خوش نصیب ہوں کہ میری ملاقات تجھ سے ہو گئی۔ میں نے خود سنا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت پڑھی پھر فرمایا سَابِقٌ تو بلا حساب جنت میں چلا جائے گا اور مُقْتَصِدٌ کا آسانی سے کسی قدر حساب ہو جائے گا اور ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ کو مقام حساب میں حساب کے لئے روک لیا جائے گا تاکہ اس کو فکر پیدا ہو جائے گی پھر اس کو بھی جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔ یہ فرمانے کے بعد آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرٌ۔ یہ حدیث احمد ابن جریر، طبرانی، حاکم اور بیہقی نے بھی نقل کی ہے۔ اس میں اتنا زائد ہے لیکن جن لوگوں نے (اپنی جانوں پر) ظلم کیا ہوگا ان کو پورے حشر کی مدت تک روک کر (مقام حساب میں) رکھا جائے گا پھر اللہ اپنی رحمت سے ان کے (گناہوں کی) تلافی فرماوے گا یہی لوگ کہیں گے، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرٌ۔

بیہقی نے لکھا ہے یہ حدیث متعدد طریقوں سے حضرت ابو درداء کی روایت سے آئی ہے اور کوئی حدیث اگر متعدد طریقوں سے منقول ہو تو اس کی کچھ اصل ہوتی ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت اسامہ بن زید نے اس آیت کے متعلق فرمایا رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا یہ سب (تینوں قسم کے لوگ) اسی امت کے ہوں گے بیہقی نے بھی یہ حدیث حضرت اسامہ کی روایت سے بیان کی ہے۔ اسی طرح کعب و عطاء کی روایت سے بیان کیا ہے کہ تینوں قسمیں جنت میں جائیں گی۔

ابن ابی الدنیا اور بیہقی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول اس آیت کی تشریح میں نقل کیا ہے کہ یہ سب امت محمدیہ ہو گی۔ اللہ نے جو کتاب بھی نازل فرمائی سب کا وارث اس امت کو بنایا ان میں سے جو لوگ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ہیں ان کی مغفرت کر دی جائے گی جو لوگ مُقْتَصِدٌ ہیں ان کا ہلکا سا حساب ہو جائے گا اور جو لوگ سَابِقٌ ہیں وہ بلا حساب جنت میں چلے جائیں گے۔

امام احمد ترمذی اور بیہقی نے حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے بیان کیا ہے اور ترمذی نے اس کو حسن کہا ہے کہ اس آیت کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ سب لوگ معزولہ ایک جماعت کے ہوں گے اور سب جنت میں جائیں گے۔ فریابی نے حضرت براء بن عازب کا قول بیان کیا ہے حضرت براء نے آیت فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ الخ کی تشریح میں فرمایا میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ ان سب کو جنت میں داخل فرمائے گا۔

ابن ابی عاصم اور اصبہانی نے حضرت ابو موسیٰ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن اللہ بندوں کو اٹھائے گا پھر علماء کو الگ کر کے فرمائے گا اے گروہ علماء میں نے تمہارے اندر علم اس لئے رکھا تھا کہ میں تم کو جانتا تھا (تم کو جانے بغیر میں نے تم کو عالم نہیں بنایا تھا) اور نہ اپنا علم تمہارے اندر اس لئے رکھا کہ علم دینے کے بعد پھر تم کو عذاب دوں۔ جاؤ میں نے تم کو بخش دیا۔

طبرانی نے ثقہ راویوں کے سلسلے سے حضرت ثعلبہ بن حکم کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ جب اپنی کرسی پر اپنے بندوں کے فیصلے کے لئے بیٹھے گا تو علماء سے فرمائے گا میں نے تم کو اپنا علم اور حکم صرف اس لئے دیا تھا کہ تمہاری مغفرت کرنا چاہتا تھا جو عمل بھی تم سے صادر ہو (سب کو میں نے بخش دیا) اور مجھے پروا نہیں۔

ابن عساکر نے ابو عمر صنعانی حفص بن میسرہ کی روایت نقل کی ہے کہ قیامت کا دن ہو گا تو علماء کو الگ کر دیا جائے گا۔ جب اللہ حساب فہمی کر چکے گا تو علماء سے فرمائے گا میں نے اپنی حکمت تمہارے اندر رکھی تھی وہ ایک بھلائی کی لئے رکھی تھی جو آج میں تم سے کرنا چاہتا ہوں تم سے جو کچھ بھی ہوا ہو اس کے باوجود تم جنت میں چلے جاؤ۔

عقبہ بن صہبان کا بیان ہے میں نے حضرت عائشہؓ سے متعلق آیت اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا کے متعلق دریافت کیا ام المومنین نے فرمایا میرے بیٹے یہ سب جنت میں جائیں گے۔ سَابِقٌۢ بِالْخَیْرٰتِ تو وہ تھے جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں گزر گئے۔ حضور ﷺ نے ان کے لئے جنت کی شہادت دے دی تھی اور مُقْتَصِدٌ وہ لوگ ہیں جو رسول

اللہ ﷺ کے نشان قدم پر چل کر آپ سے جاملے اور ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مجھ جیسے اور تم جیسے لوگ ہیں۔ ام المومنین نے اپنے آپ کو بھی ہمارے ساتھ شامل کر دیا۔

میں کہتا ہوں تینوں قسمیں اگر اکابر امت اسلامیہ کی قرار دی جائیں تب بھی ممکن ہے یعنی تینوں اقسام اولیاء امت ہی کے مانے جائیں۔ پہلی قسم ظالم لنفسہ کی ہے یہ وہ گروہ ہے جو اپنے نفوس کو لذتوں سے تو محروم کر ہی دیتا ہے جائز حقوق سے بھی محروم کر دیتا ہے یہ وہ اہل رہبانیت ہیں جو سخت ریاضتیں اور مجاہدے کرتے ہیں اور یہ رہبانیت انہوں نے خود ایجاد کر رکھی ہے۔ دوسرا گروہ اہل اقتصاد کا ہے جو لذتوں میں ڈوبنے سے تو اپنے نفوس کو روکتا ہے لیکن حقوق نفوس ضرور دیتا ہے روزہ بھی رکھتا ہے ناغہ بھی کرتا ہے نماز بھی پڑھتا ہے سوتا بھی ہے نکاح بھی کرتا ہے اور جائز چیزیں کھاتا پیتا بھی ہے غرض پورے طور پر اتباع سنت کرتا ہے یہ وہی گروہ ہے جس کے متعلق حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے نشان قدم پر چلتا ہے یہاں تک کہ آپ سے جاملتا ہے۔ تیسرا گروہ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ کا ہے جو کمالات نبوت میں ڈوبا ہوتا ہے یہ گروہ صحابہ کا اور صدیقوں کا ہے۔ حضرت عائشہ نے ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ گروہ میں اپنے آپ کو محض انکسار کے طور پر شامل کیا اور قالب جیسے لوگوں کو اس گروہ میں اس لئے شامل کیا کہ وہ لوگ سخت ریاضتیں کرنے والے تھے۔

خلاصہ یہ کہ احادیث مبارکہ سے یہ امر ثابت ہو گیا کہ تینوں قسمیں (جن کا ذکر آیت میں کیا گیا ہے)۔ اسی امت کی ہیں یا علماء کی ہیں۔ اس تفصیل کے بعد بھی جو شخص کہتا ہے کہ مِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ سے مراد کافر یا منافق ہیں اس کا قول واجب الرد اور نا قابل قبول ہے۔

امام ابو یوسف سے اس آیت کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا یہ سب مومن ہیں رہے کفار تو ان کی حالت اگلی آیت وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ میں بیان فرمائی ہے۔ تینوں طبقات مومنوں کے ہوں گے اس کا ثبوت یہ ہے کہ اللہ نے اپنے منتخب بندوں کے تین طبقات ذکر فرمائے ہیں تینوں جگہ منہم منہم منہم میں ضمیریں منتخب کردہ بندوں ہی کی طرف راجع ہیں۔ جمہور علماء کا یہی قول ہے۔ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ کو سب سے آخر میں اور ظالم لنفسہ کو پہلے بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ظالمین کی تعداد سب سے زیادہ ہے اور سابقین کی تعداد بہت کم اور مقتصدین کی تعداد متوسط ہے یا یوں کہا جائے کہ اپنے اوپر ظلم یعنی خواہشات نفس کی طرف جھکاؤ پیدائشی اور فطری ہوتا ہے۔ باقی دونوں امور یعنی اقتصاد اور سبقت بالخیرات عارضی ہیں اور اقتصاد کا درجہ پھر بھی کسی قدر توسط کا ہے۔

ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ﴿۳۲﴾ یہی اللہ کا بڑا فضل ہے یعنی کتاب کا وارث بنانا یا بندوں کو منتخب کر لینا بڑی مہربانی ہے۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۚ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ﴿۳۳﴾ وہ باغات ہیں ہمیشہ رہنے کے جن میں وہ داخل ہوں گے اور ان کو وہاں سونے کے کنگنوں اور موتیوں کا زیور پہنایا جائے گا اور وہاں ان کی پوشاک ریشم کی ہوگی۔

يَدْخُلُوْنَ کی ضمیر اہل جنت کے تینوں اقسام کی طرف راجع ہے اس کا ثبوت احادیث سے پیش کیا جا چکا ہے۔ حضرت ابو سعید خدریؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے آیت جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا الخ تلاوت کی پھر فرمایا ان کو تاج پہنائے جائیں گے جن کا ایک ادنیٰ موتی مشرق سے مغرب تک پوری دنیا کو روشن کر دے (کے لئے کافی ہوگا)۔ رواہ الترمذی والحاکم والبیہقی۔ حاکم نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔

قرطبی نے لکھا ہے اہل تفسیر نے کہا ہے کہ کوئی جنتی ایسا نہ ہوگا جس کے ہاتھ میں تین کنگن نہ ہوں ایک سونے کا ایک چاندی کا اور ایک موتی کا۔

حضرت ابو ہریرہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن کے ہاتھ میں زیور وہاں تک پہنچے گا جہاں تک وضو کا پانی پہنچا

ہوگا۔ متفق علیہ۔

حضرت حذیفہ کا بیان ہے میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے ریشم اور دیبائی نہ پہنو سونے اور چاندی کے برتنوں میں نہ پیو نہ ان کی رکابیوں میں کھاؤ۔ یہ ان (کافروں) کے لئے دنیا میں ہیں اور تمہارے لئے آخرت میں۔ رواہ الشیخان فی الصحیحین۔

حضرت عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو دنیا میں ریشم پہنے گا آخرت میں ریشم نہیں پہنے گا۔ متفق علیہ۔ طیالسی نے صحیح سند سے اور ابن حبان و حاکم نے حضرت ابو سعید خدری کی روایت سے اسی طرح یہ حدیث روایت کی ہے۔ اس کے آخر میں اتنا زائد ہے کہ وہ اگر جنت میں داخل بھی ہو جائے گا تو ریشم (کا لباس) نہیں پہنے گا۔

ابن ابی حاتم اور ابن ابی الدنیا نے حضرت کعب کی روایت سے بیان کیا ہے کہ اگر جنت کا کوئی کپڑا آج دنیا میں پہن لیا جائے تو جس کی نظر اس پر پڑے گی وہ بے ہوش ہو جائے گا کسی کی نظر اس کی برداشت نہ کر سکے گی۔

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ۔ اور کہیں گے کہ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے ہم سے (ہر قسم کا) غم دور کیا۔

قَالُوْا یعنی کہیں گے (ماضی بمعنی مستقبل) احادیث مندرجہ اسی پر دلالت کر رہی ہیں اور اسی پر دلالت کر رہی ہے آیت اَلَّذِیْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ (یعنی جنتی جنت میں یہ بات کہیں گے) قبروں سے اٹھنے کے وقت بھی مومن یہی بات کہیں گے۔ حضرت ابن عمر کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لا الہ الا اللہ کہنے والوں کو نہ مرنے کے وقت وحشت ہوگی نہ قبروں کے اندر نہ قبروں سے اٹھنے کے وقت۔ گویا وہ منظر میرے سامنے ہے کہ صور پھونکے جانے پر لوگ سروں سے مٹی جھاڑ رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ۔ رواہ الطبرانی۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا حزن سے مراد ہے دوزخ کا غم۔ قتادہ نے کہا موت کا غم مراد ہے۔ مقاتل نے کہا اس غم کی وجہ یہ ہوگی کہ ان لوگوں کو معلوم نہیں کہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا۔ عکرمہ نے کہا گناہوں اور خطاکاریوں کا خوف اور طاعت کے نامقبول ہونے کا خوف (مراد ہے)۔ کلبی نے کہا دنیوی زندگی میں آخرت میں ہونے والے امور کا غم مراد ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا دنیا میں روزی کی فکر مراد ہے۔ بعض نے کہا معاش اور معاد دونوں کا غم مراد ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ حزن سے ہر فکر مراد ہے کوئی فکر ہو۔

اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ ۝ واقعی حقیقت یہ ہے کہ ہمارا رب بہت مغفرت کرنے والا اور بڑا قدردان ہے۔ یعنی جن لوگوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ان کو بخشنے والا ہے اور مقتصدین و سابقین کی قدردانی کرنے والا ہے۔

الَّذِیْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ جس نے اپنی مہربانی سے ہم کو ہمیشہ رہنے کے مقام میں لا اتارا۔

یعنی یہ اللہ کی مہربانی اور اس کا کرم ہے کہ اس نے ہم کو دوامی قیام کے لئے یہ مقام عطا فرمایا۔ ہمارا کوئی حق اللہ پر واجب نہ تھا۔

مُقَامَةٌ مصدر میمی بمعنی اقامت۔

بیہقی نے البعث میں اور ابن ابی حاتم نے بوساطت نفیع بن حارث حضرت عبد اللہ بن ابی اوفی کی روایت سے بیان کیا کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ (یعنی) نیند سے اللہ ہماری آنکھیں ٹھنڈی کرتا ہے تو کیا جنت میں بھی نیند آئے گی۔ فرمایا نہیں۔ نیند تو موت کی شریک ہے (یعنی موت کا ایک حصہ ہے) اور جنت کے اندر موت نہیں ہوگی۔ سائل نے عرض کیا پھر وہاں راحت کیسے ملے گی یہ بات حضور ﷺ کو بے ادبی کی معلوم ہوئی اور فرمایا وہاں کسی طرح کی تھکان ہی نہیں ہوگی۔ اہل جنت کا ہر کام تو سکھ ہی سکھ ہوگا۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

لَا يَمَسُّنَا فِيهَا نَصَبٌ وَلَا يَمَسُّنَا فِيهَا لُغُوبٌ ۝ جہاں ہم کو نہ کوئی کلفت پہنچے گی نہ خستگی پہنچے گی۔

نَصَبٌ تھکان کلفت۔ لُغُوبٌ۔ خستگی ماندگی۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ لَا يُقْضَىٰ عَلَيْهِمْ فَيَمُوتُوا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُم مِّنْ عَذَابِهَا كَذَٰلِكَ نَجْزِي كُلَّ كَفُورٍ ۝ اور جن لوگوں نے کفر کیا (اور توبہ نہیں کی) ان کے لئے دوزخ کی آگ ہے نہ تو ان کی قضا آئے گی کہ مر ہی جائیں اور نہ دوزخ کا عذاب ہی ان سے ہلکا کیا جائے گا ہم ہر کافر کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔

لَا يُقْضَىٰ عَلَيْهِمْ۔ یعنی ان کی موت کا فیصلہ کیا جائے گا کہ مر جائیں اور سکھ سے ہو جائیں۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت ابن عمر کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب جنتی جنت کو چلے جائیں گے اور دوزخی دوزخ کو تو پھر موت کو لا کر جنت اور دوزخ کے درمیان ذبح کر دیا جائے گا اور منادی ندا دے گا اے اہل جنت (آئندہ) موت نہیں اے دوزخ والو (آئندہ) موت نہیں۔ یہ سن کر جنتیوں کو مسرت بالائے مسرت ہو گی اور دوزخیوں کو غم بالائے غم۔ شیخین نے حضرت ابو سعید کی روایت سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے اس روایت میں ہے قیامت کے دن موت کو چتکبرے مینڈھے کی شکل میں لایا جائے گا۔ الحدیث۔

وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُم یعنی پل بھر کے لئے بھی عذاب جہنم میں کمی نہیں کی جائے گی بلکہ جب دوزخیوں کی کھالیں پک جائیں گی تو دوسری کھالیں پہنا دی جائیں گی اور جب آگ بجھنے لگے گی تو اور بھڑکا دی جائے گی۔

كَفُورٍ۔ بڑا ناشکرا یعنی اللہ کا منکر۔ ہر منعم کی نعمت کا انکار کرنے والے سے اللہ کے منکر کا کفر شدید ہوتا ہے۔

وَهُمْ يَصْطَرِخُونَ فِيهَا رَبَّنَا أَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِي كُنَّا نَعْمَلُ اور وہ دوزخ کے اندر چیخیں گے اے ہمارے رب ہم کو اس دوزخ سے نکال تاکہ جو عمل ہم پہلے کرتے تھے ان کے خلاف نیک عمل کریں۔

صراخ کا معنی ہے چیخنا مراد ہے فریاد کرنا یعنی دوزخی چیخ کر فریاد کریں گے۔

رَبَّنَا أَخْرِجْنَا یعنی وہ کہیں گے اے ہمارے رب ہمیں دوزخ سے نکال۔

نَعْمَلْ صَالِحًا یعنی دوزخیوں کو اپنے گزشتہ غیر صالح اعمال پر افسوس ہو گا یا گزشتہ اعمال کے غیر صالح ہونے کا اعتراف ہو گا اور یہ مقصد ہو گا کہ پہلے دنیا میں ہم ان اعمال کو صالح جانتے تھے اب ان کا غیر صالح ہونا کھل گیا اس لئے ہم درخواست کرتے ہیں کہ گزشتہ اعمال کی تلافی کرنے کیلئے تو ہم کو دوزخ سے باہر نکال دے۔ اللہ اس کے جواب میں فرمائے گا۔

أَوَلَمْ نُعَمِّرْكُم مَّا يَتَذَكَّرُ فِيهِ مَن تَذَكَّرَ کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی تھی جس میں نصیحت حاصل کرنے والا نصیحت حاصل کر لیتا ہے۔

آیت میں عمر سے کتنی عمر مراد ہے۔ علماء کے اقوال اس میں مختلف ہیں۔ بغوی نے لکھا ہے کہ قتادہ، عطاء اور کلبی کے نزدیک اٹھارہ سال کی عمر مراد ہے۔ حسن نے چالیس کی حد مقرر کی ہے۔ حضرت ابن عباس اور حضرت علی کے نزدیک ساٹھ سال کی عمر مراد ہے۔ یہ وہ عمر ہے کہ اس کے بعد آدمی کو اللہ کے سامنے عذر خواہی کا کوئی موقع نہیں رہتا۔ حضرت ابو ہریرہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب اللہ کسی شخص کی عمر ساٹھ سال تک پہنچا دے تو پھر اس کی طرف سے کسی عذر کو قبول نہیں کرتا۔ رواہ البخاری و کذا اخرج احمد و عبد بن حمید عن ابی ہریرۃ۔

طبرانی اور ابن جریر نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کا دن ہو گا تو کہا جائے گا ساٹھ سال کی عمر والے کہاں ہیں یہی وہ عمر ہے جس کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے أَوَلَمْ نُعَمِّرْكُم مَّا يَتَذَكَّرُ فِيهِ مَن تَذَكَّرَ۔

میں کہتا ہوں حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کی عمر ساٹھ سال تک پہنچا دی گئی تو اس کے بعد اللہ اس کی ہر

معذرت کو سلب کر لیتا ہے کیونکہ زیادہ تر طبعی عمر اس کے بعد نہیں رہتی۔ ترمذی نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے ابو یعلیٰ نے مسند میں حضرت انس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عام طور پر میری امت کی عمریں ساٹھ سے ستر برس تک ہوں گی اور ستر سے آگے بڑھنے والے بہت کم ہوں گے۔ یہ مطلب نہیں کہ ساٹھ سال سے پہلے گناہ کرنے کا عذر قابل قبول ہوگا کیونکہ بالغ ہونے کے بعد ہی آدمی مکلف ہو جاتا ہے۔ اور غور و تامل کر کے نصیحت پکڑنے کا اس کو موقع ہوتا ہے بالغ ہونے کے بعد نماز اور دوسرے فرائض کو ترک کرنے کا کوئی معقول عذر نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً ایمان نہ لانے کا تو کوئی عذر ہو ہی نہیں سکتا اگر یہ مطلب آیت کا نہ مانا جائے تو پھر قیامت کے دن اللہ کی طرف سے اس جواب کے مخاطب تو صرف وہی کافر قرار پائیں گے جن کی عمر ساٹھ برس ہوئی اور دوسرے کم عمر کے کفار مخاطب ہی نہیں قرار پائیں گے۔

وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ ؕ اور تمہارے پاس ڈرانے والا (محمد رسول اللہ ﷺ) آ گئے تھے۔

مگر تم نے ان کی بات نہیں مانی۔ نذیر سے مراد ہیں رسول اللہ ﷺ اکثر مفسرین کا یہی قول ہے۔ ابن ابی حاتم نے سدی کا نیز ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے زید کا قول بھی یہی بیان کیا ہے۔ بعض کے نزدیک قرآن مراد ہے۔ نذیر کا لفظ عام ہے تمام پیغمبر اور اللہ کی سب کتابیں اس لفظ میں شامل ہیں لیکن اس امت کے لئے رسول اللہ ﷺ اور قرآن نذیر ہیں (اور قرآن و رسول کے منکروں کے حق میں آیت کا نزول ہوا ہے اس لئے رسول اللہ ﷺ اور قرآن ہی آیت میں مراد ہیں۔)

بعض علماء کے نزدیک عقل مراد ہے۔ یہ ان لوگوں کا قول ہے جو تنہا عقل کو وجوب ایمان کے لئے کافی سمجھتے ہیں ان لوگوں کے نزدیک اگر کوئی عاقل بالغ پہاڑ کی چوٹی پر تمام انسانوں سے الگ تھلگ ہو اور نبی کی دعوت اس کو نہ پہنچی ہو تب بھی وہ اللہ پر ایمان لانے کا مکلف ہے اگر اللہ کو نہیں مانے گا تو اس کو کافر قرار دیا جائے گا۔

لیکن وَجَآءَكُمُ کا اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ پر عطف ہے اور عطف مغایرت کو چاہتا ہے (معطوف و معطوف علیہ میں مغایرت ہونی چاہئے) اس لئے نذیر سے عقل مراد نہیں ہو سکتی کیونکہ سوچنے اور غور کرنے کے قابل عمر ہو جانا اور صاحب عقل ہو جانے میں مفہوم کی مغایرت نہیں ہے کیونکہ بالغ ہونے کے بعد اگر عاقل بھی ہے تو مکلف ہے اور بے عقل ہے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ سوچنے اور غور کرنے کی عمر اس کو دی گئی ہے (گویا بالغ العمر وہی ہوگا جو صاحب عقل ہو اور صاحب عقل اسی کو کہا جائے گا جو قابل تامل و غور عمر بھی رکھتا ہو۔)

عکرمہ، سفیان بن عیینہ اور وکیع کے نزدیک نذیر سے مراد ہیں بڑھاپے کے سفید بال۔ عبد بن حمید اور ابن المنذر نے اس قول کی عکرمہ کی طرف نسبت کی ہے۔ بیہقی نے سنن میں حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ بڑھاپے کے سفید بال موت کے قاصد ہیں۔

بغوی نے ایک اثر نقل کیا ہے کہ اگر ایک بال بھی سفید ہوتا ہے تو وہ اپنے ساتھی سے کہتا ہے تو بھی تیار ہو جا موت قریب آ گئی ہے۔ بعض نے کہا عزیزوں اور ساتھیوں کی موت نذیر ہے۔

فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ۝ سو (عذاب کا مزہ) چکھو اب ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہے (کہ عذاب کو دفع کر سکے)۔

اِنَّ اللّٰهَ عٰلِمُ غَيْبِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝

بلاشبہ اللہ ہی آسمانوں کی اور زمین کی چھپی چیزوں کو جاننے والا ہے کوئی شک نہیں کہ وہ دلوں کی باتوں سے (بھی) خوب واقف ہے۔

جب وہ آسمانوں کی اور زمین کی تمام چھپی باتوں کو جاننے والا ہے تو لوگوں کے حالات اس سے پوشیدہ کیسے رہ سکتے ہیں وہ تو دلوں کے اندر کے پوشیدہ خیالات سے بھی بخوبی واقف ہے پھر لوگوں کے (بیرونی) احوال سے کس طرح ناواقف ہو سکتا ہے۔

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ ؕ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ؕ وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِلَّا

مَقْتًا ۚ وَلَا يَزِيدُ الْكَافِرِينَ كُفْرُهُمْ إِلَّا خَسَارًا ﴿٣٩﴾
وہی تو ہے جس نے تم کو زمین میں آباد کیا سو جو شخص کفر کرے گا اس کے کفر کا وبال اسی پر پڑے گا اور کافروں کے لئے ان کا کفران کے پروردگار کے نزدیک ناراضی ہی بڑھنے کا باعث ہوتا ہے اور کافروں کے لئے ان کا کفر خسارہ ہی بڑھاتا ہے۔

خَلٰٓئِفَ: خَلِيفَة کی جمع ہے اور خلفاء خلیفت کی۔ یعنی بعض انسان بعض کے جانشین ہوتے ہیں اس صورت میں تمام انسان مخاطب ہوں گے۔ بعض نے یہ مطلب بیان کیا کہ اللہ نے تم کو ایک ایسی امت بنایا جو پچھلی امتوں کے بعد آئی ہے اور گزشتہ امتوں کے احوال اس امت کے لئے عبرت آفرینی کا سامان اپنے اندر رکھتے ہیں۔ بعض نے یہ مطلب بیان کیا کہ اللہ نے تم کو زمین میں خلیفہ کے بعد خلیفہ بنایا یعنی ایک کے بعد دوسرے کو اس کا جانشین بنایا اور زمین میں تصرف کرنے کا تم کو اختیار دیا اور کائنات ارضی پر تم کو تسلط عطا کیا۔

مَقْت: ناراضی، غضب، نفرت۔ اِلَّا خَسَارًا یعنی آخرت میں کافروں کا کفر خسارہ بڑھنے ہی کا باعث ہوگا۔

لَا يَزِيدُ الْكَافِرِينَ كُفْرُهُمْ کی تکرار بتا رہی ہے کہ کفر کا مستقل تقاضا اللہ کی ناراضگی کی زیادتی بھی ہے اور آخرت کا خسارہ بھی اس لئے کفر سے پرہیز لازم ہے۔

قُلْ أَرَأَيْتُمْ شُرَكَاءَكُمُ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَرُونِي مَاذَا خَلَقُوا مِنَ الْأَرْضِ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمَاوَاتِ
اے محمد ﷺ آپ کہئے کہ تم اپنے قرار دادہ شریکوں کا حال تو بتاؤ۔ جن کو تم خدا کے سوا پوجا کرتے ہو مجھے بتاؤ کہ انہوں نے اس زمین کا کونسا جزء بنایا ہے یا ان کا آسمان (بنانے) میں کچھ ساجھا ہے۔

شُرَكَاءَ سے مراد ہیں بت۔ شُرَكَاءَكُمْ کہنے کے دو معنی ہیں (فاعل کی طرف اضافت ہے یا مفعول کی کی طرف) (۱) تم نے ان کو اللہ کا شریک قرار دے رکھا ہے (۲) تم نے اپنے مال میں ان کو شریک بنا رکھا ہے (کہ ان کی منت مانتے اور بھینٹ چڑھاتے ہو)

أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ یا اللہ کے ساتھ تخلیق سماوات میں ان کی شرکت ہے جس کی وجہ سے وہ الوہیت ذاتیہ میں شریک ہوگئے۔

أَمْ آتَيْنَاهُمْ كِتَابًا فَهُمْ عَلَىٰ بَيِّنَتٍ مِنْهُ ۚ یا ہم نے ان کو کوئی کتاب دی ہے کہ یہ اس کی کسی دلیل پر قائم ہوں۔

أَتَيْنَاهُمْ مقاتل نے کہا یعنی ہم نے کفار مکہ کو کوئی ایسی کتاب دی ہے جو ظاہر کر رہی ہو کہ جن معبودوں کو انہوں نے شرکاء بنا رکھا ہے وہ شرکاء ہیں۔

بَلْ إِنْ يَعِدُ الظَّالِمُونَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا إِلَّا غُرُورًا ﴿٤٠﴾ بلکہ یہ ظالم ایک دوسرے سے نرے دھوکہ کی باتوں کا وعدہ کرتے ہیں۔ یعنی ان کے پاس شرک کا کوئی ثبوت نہیں نہ کوئی کتاب جس سے یہ شرک پر استدلال کر سکیں بلکہ ان کے اسلاف اپنے اخلاف کو بے بنیاد دھوکہ دیتے چلے آئے ہیں ایسی کوئی دلیل نہیں کہ ان بتوں کا اللہ کی بارگاہ میں شفیع ہونا ثابت کر سکے ان کے اسلاف کہتے چلے آئے ہیں کہ یہ بت اللہ کے ہاں ہماری سفارش کریں گے۔

إِنَّ اللَّهَ يُمْسِكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُولَا ۚ یقینی بات ہے کہ اللہ آسمانوں کو اور زمین کو تھامے ہوئے ہے کہ (کہیں) وہ موجودہ حالت کو چھوڑ نہ دیں۔ یعنی اللہ آسمانوں کو اور زمین کو تھامے ہوئے ہے کہ یہ اپنے مقام سے ہٹ نہ سکیں یا یہ مطلب کہ اللہ ان کو زوال سے روکے ہوئے ہے کیونکہ جس طرح کسی چیز کے وجود کے لئے کسی علت موجودہ کا

ہونا ضروری ہے اسی طرح کسی چیز کو اس کی حالت پر باقی رکھنے کے لئے بھی باقی رکھنے والی علت کا ہونا لازم ہے۔

وَلَئِنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْ بَعْدِهٖ ؕ اور اگر بالفرض وہ موجودہ حالت کو چھوڑ بھی دیں تو پھر خدا کے سوا اور کوئی ان کو تھام بھی نہیں سکتا۔

یعنی اگر یہ دونوں ذاتی امکان کے تقاضے کی وجہ سے زائل ہو جائیں اور اللہ اپنی طرف سے افاضہ وجود باقی نہ رکھے تو اللہ کے بعد یعنی اللہ کے سوا یا زوال کے بعد ان کو کوئی روک کر نہیں رکھ سکتا۔

اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ۝ بلاشبہ اللہ بڑی برداشت والا اور مغفرت کرنے والا ہے۔

حلم ہی کی وجہ سے اس نے کفار کو ڈھیل دے رکھی ہے اور فوری عذاب میں گرفتار نہیں کیا اور مغفرت ہی کے سبب مسلمانوں کے قصوروں کو وہ معاف کرتا رہتا ہے اگر اس کی طرف سے کافروں کو مہلت نہ ملتی اور مسلمانوں کو مغفرت حاصل نہ ہوتی تو وہ آسمانوں کو اور زمین کو تھامے نہ رہتا نتیجہ میں آسمان ان پر لوپرسے ٹوٹ پڑتے اور زمین ان کو لے کر دھنس جاتی۔

ابن ابی حاتم نے ابن ابی ہلال کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے قریش کہا کرتے تھے اگر اللہ ہم میں سے کسی کو نبی بنادے گا تو ہم سے زیادہ اس نبی کے فرماں بردار اور خالق کی اطاعت گزار اور کتاب اللہ کے احکام کی پابند کوئی اور امت نہیں گزری ہوگی اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ ۚ

اور انہوں نے اللہ کی پکی قسمیں کھائی تھیں کہ اگر ان کے پاس کوئی ڈرانے والا (یعنی پیغمبر) آئے گا تو وہ ہر امت سے زیادہ قبول کرنے والے ہوں گے۔

اَیْمَان قسمیں۔ جَهْدَ اَيْمَانِ زور دار پکی قسمیں۔ بغوی نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے قریش کو اطلاع ملی تھی کہ اہل کتاب نے اپنے پیغمبروں کی تکذیب کی اس پر انہوں نے کہا یہودیوں اور عیسائیوں پر خدا کی لعنت ان کے پاس ان کے پیغمبر آئے اور انہوں نے پیغمبروں کو جھوٹا قرار دیا پھر انہوں نے قسمیں کھا کر کہا کہ اگر ہمارے پاس کوئی پیغمبر ہماری ہدایت کے لئے آیا تو گزشتہ امتوں میں سے ہر امت سے زیادہ ہم اس کی ہدایت پر چلیں گے۔

کذا۔ قریش نے یہ بات اس لئے کہی تھی کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے باہم ایک دوسرے کی تکذیب کی تھی یہودیوں نے کہا تھا کہ عیسائی حق پر نہیں ہیں (ان کے دین کی کوئی بنیاد ہی نہیں ہے) اور عیسائیوں نے یہودیوں کے متعلق یہی بات کہی تھی۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ۝ لیکن جب ان کے پاس ڈرانے والا (یعنی محمد رسول اللہ ﷺ) آگئے تو ان کے آنے سے بس ان میں نفرت ہی کی ترقی ہوئی۔

یعنی رسول ﷺ کے آنے سے ان کے اندر حق سے اور دوری پیدا ہوگئی۔ رسول ﷺ کے آنے کی طرف زیادت نفرت کی نسبت مجازی ہے۔

اِسْتِكْبَارًا فِى الْاَرْضِ وَمَكْرَ السَّيِّئِ ؕ دنیا میں اپنے کو بڑا سمجھنے کی وجہ سے اور بری تدبیر کی وجہ سے۔

یعنی برے عمل کی وجہ سے۔ کلبی نے کہا مَكْرَ السَّيِّئِ سے مراد ہے سب کا شرک پر اتفاق کر لینا۔ میں کہتا ہوں ان کا برا فریب یہ تھا کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو قید یا قتل کر دینا یا وطن سے نکال دینا چاہا تھا اور اس تدبیر پر سب کا اتفاق رائے ہو گیا تھا۔

وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ؕ اور بری تدبیروں کا وبال تدبیر والوں پر ہی پڑتا ہے۔ چنانچہ بدر کے دن بری تدبیر کا وبال تدبیر کرنے والوں پر ہی پڑا کچھ مارے گئے (کچھ گرفتار کئے گئے۔)

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا شرک کا برا نتیجہ مشرکوں پر ہی پڑتا ہے یعنی شرک کا وبال انہیں پر لوٹ کر پڑتا ہے۔

فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ سو کیا یہ لوگ اسی دستور کے منتظر ہیں جو اگلے کافر لوگوں کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔ سو آپ خدا کے اس دستور کو ہرگز کبھی بدلتا ہوا نہ پائیں گے۔

سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ یعنی پچھلے کافروں کے ساتھ اللہ کا دستور عمل۔ اس سے مراد ہے یہ ضابطہ تھا کہ جب کافر کفر پر جمے رہے تو اللہ نے ان کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا۔

فَلَنْ تَجِدَ الخ یعنی اللہ کا ضابطہ بدلتا نہیں اس میں تغیر نہیں آتا چنانچہ سوا ان لوگوں کے جو ایمان لے آئے مکہ کا کوئی کافر نہیں بچا سب ہی تباہ کر دیئے گئے۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ۝ اور آپ خدا کے ضابطہ کو ہرگز منتقل ہوتا ہوا نہ پائیں گے۔

یعنی ایسا بھی نہیں ہوتا کہ ضابطہ ہلاکت تکذیب کرنے والوں کو چھوڑ کر دوسروں کی طرف منتقل کر دیا جائے (کہ بجائے منکروں کے دوسروں کو تباہ کر دیا جائے۔)

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَكَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۚ کیا یہ لوگ ملک میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے بھالتے کہ جو (منکر) لوگ ان سے پہلے ہو گزرے ہیں ان کا انجام کیسا ہوا حالانکہ وہ قوت میں ان سے بڑھے ہوئے تھے۔

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا میں استفہام انکاری اور محذوف جملہ پر اس کا عطف ہے پورا کلام اس طرح تھا کیا ان لوگوں نے گزشتہ کافروں کے نشانات نہیں دیکھے اور کیا یہ ملک میں چلے پھرے نہیں کہ گزشتہ لوگوں کا برا انجام ان کو نظر آجاتا۔ مطلب یہ کہ شام، عراق اور یمن کو آتے جاتے میں انہوں نے گزشتہ کافروں کے کھنڈر دیکھے ہیں وہ مکہ کے باشندوں سے زیادہ قوت والے تھے اس کے باوجود ان کو تباہ کر دیا گیا ان کی قوت ان کو کچھ بھی فائدہ نہ پہنچا سکی پھر مکہ والے ان سے عبرت کیوں نہیں حاصل کرتے۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهٗ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَلِيْمًا قَدِيْرًا ۝ اور اللہ ایسا نہیں کہ کوئی چیز اس کو ہرا دے (یعنی اس کی گرفت سے چھوٹ جائے اور اس سے آگے بڑھ جائے) نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں کیونکہ وہ بڑے علم والا اور بڑی قدرت والا ہے۔ یعنی تمام چیزوں کو اور ان کے استحقاق کو جاننے والا ہے اور جیسا چاہے ویسا کرنے پر قدرت رکھنے والا ہے۔ آیات مذکورہ سے واضح ہو گیا کہ کافروں کی جڑ اکھاڑ دینے کا اللہ کا مقررہ ضابطہ ہے اور یہ ضابطہ ناقابل تغیر ہے اسی ضابطہ کے مطابق گزشتہ کافروں کو تباہ کر دیا گیا باوجودیکہ وہ بڑے طاقتور تھے مگر ان کی طاقت ان کو فائدہ نہ پہنچا سکی پھر ان کافروں کو اللہ نے ڈھیل کیوں دے دی ہے اس کا جواب آئندہ آیات میں دیا ہے اور فرمایا ہے۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰي ظَهْرِهَا مِنْ دَاۗبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ اور اگر اللہ ان لوگوں کی (فوری) گرفت ان کے اعمال پر کرتا تو زمین پر کسی متنفس کو نہ چھوڑتا لیکن اللہ ایک معین میعاد (یعنی قیامت) تک ان کو مہلت دے رہا ہے۔ دَاۗبَّةٍ جاندار جو زمین پر چلتے ہیں یعنی کسی گناہ گار متنفس کو نہ چھوڑتا یا یہ مطلب کہ ان کافروں کی بداعمالی کی نحوست سب زندہ جانوروں پر پڑتی اور اللہ سب کو تباہ کر دیتا۔ اجل مسمّی سے مراد ہے موت یا قیامت۔

ع ۵ ۱۴ فَاِذَا جَاۗءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا ۝ پھر جب ان کی وہ میعاد آجائے گی اس وقت اللہ اپنے بندوں کو خود دیکھ لے گا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا عباد سے مراد تمام بندے ہیں۔ اطاعت گزار ہوں یا نافرمان۔ اللہ سب کے احوال کو دیکھ رہا ہے یعنی سب کو ان کے اعمال کے موافق سزا جزا دے گا۔

الحمد للہ سورۂ ملائکہ کی تفسیر ۱۱ ماہ صفر ۱۲۰۷ھ کو ختم ہوئی اس کے بعد انشاء اللہ سورۂ یٰسین کی تفسیر آئے گی۔

سورۂ یٰسٓ

یہ سورۃ مکی ہے اس میں ٨٣ آیات ہیں

اس سورۃ کا نام معمہ[1] بھی ہے۔ ابن مردویہ، خطیب اور بیہقی نے حضرت ابو بکرؓ صدیق کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، سورۂ یٰسٓ کو معمہ بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ اپنے پڑھنے والے کو دونوں جہان کی بھلائی عموماً عطا کرتی ہے۔ اس کو دافعہ بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ اپنے پڑھنے والے سے ہر برائی کو دفع کرتی ہے۔ اس سورۃ کا نام قاضیہ بھی ہے یہ اپنے پڑھنے والے کی ہر ضرورت کو پورا کرتی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

یٰسٓ ۝ ابو نعیم نے دلائل میں بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا، رسول اللہ ﷺ مسجد (کعبہ) میں اونچی آواز سے قرات کرتے تھے۔ قریش کے کچھ لوگوں کو اس سے دکھ ہوتا تھا (ایک روز) حضور ﷺ پر ہاتھ ڈالنے کے لئے وہ لوگ اٹھے لیکن فوراً گردنوں سے ان کے ہاتھ بندھ گئے اور آنکھیں اندھی ہو گئیں کچھ سوجھائی نہیں دیتا تھا مجبور ہو کر خدمت گرامی میں حاضر ہوئے اور اللہ کا اور قرابت کا واسطہ دے کر دعا کرنے کی درخواست کی۔ قریش کی کوئی شاخ ایسی نہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ کی قرابتداری اس سے نہ ہو چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے دعا کی اور وہ معیبت اللہ نے ان کی دور کر دی۔

اس پر یٰسٓ سے لَا یُؤْمِنُوْنَ تک آیات نازل ہوئیں لیکن ان میں سے کوئی بھی ایمان نہیں لایا۔ لفظ یٰسٓ۔ معنوی اعتبار سے دوسرے مقطعات کی طرح ہے (یعنی اس کا مرادی معنی سوائے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے کسی کو معلوم نہیں مترجم) بعض نے کہا، حبشی کے محاورہ میں یس کا معنی ہے اے انسان۔ انسان سے رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارک مراد ہے۔ یٰسٓ (یا سین) اصل میں یا انیسین تھا ان کا لفظ حذف کر دیا گیا۔ جیسے ایمن اللہ میں مِنَ اللہ کہا جاتا ہے۔ کذا روی عن ابن عباس۔ حسن۔ سعید بن جبیر اور ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ ابو العالیہ نے کہا یٰسٓ کا معنی ہے یا رجل (اے شخص) ابو بکر وراق نے کہا اس کا معنی ہے یا سید البشر۔ ایک روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے کہ یہ قسم ہے۔ یٰسٓ کی قسم کھائی ہے۔

وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝ قرآن حکیم کی قسم۔ یعنی اس قرآن کی قسم جو ندرت معانی اور عبارت کی تعجب انگیزی کے لحاظ سے محکم ہے۔ واو قسمیہ ہے اور یٰسٓ کو قسم قرار دیا جائے تو واو عاطفہ ہو جائے گا۔

---

[1] حضرت ابو بکرؓ کی ایک روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سورۂ یٰسٓ کو توریت میں معمہ کہا گیا ہے کیونکہ یہ اپنے پڑھنے والے کو دونوں جہاں کی بھلائی عموماً عطا کرتی اور دنیا و آخرت کی دکھ کو دور کرتی ہے اس کا نام دافعہ اور قاضیہ بھی ہے یہ اپنے پڑھنے والے سے ہر برائی کو دفع کرتی اور اس کی ہر ضرورت پوری کرتی ہے جو اس کو پڑھے گا اس کو بیس حج کی برابر ثواب ملے گا اور جو اس کو سنے گا اس کو راہ خدا میں ہزار دینار صرف کرنے کے برابر ثواب ملے گا اور جو اس کو لکھے گا اس کے سینہ کے اندر ہزار دوائیں اور ہزار نور اور ہزار یقین اور ہزار نیکیاں اور ہزار رحمتیں داخل کر دی جائیں گی اور ہزار کینے اور مرض اس کے اندر سے نکال دیے جائیں گے۔ یہ بھی حضرت ابو بکرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص جمعہ کے دن اپنے ماں باپ کی قبروں پر یا دونوں میں سے ایک کی قبر پر جا کر سورہ یٰسٓ پڑھے گا اللہ اس سورت کے ہر حرف کی تعداد کے برابر اس کے گناہ معاف کر دے گا۔ (از مفسر قدس سرہ)

إِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝ بلاشبہ آپ اللہ کے بھیجے ہوئے انبیاء میں سے ہیں۔

ایک شبہ

خبر دینے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مخاطب کو جو بات معلوم نہ ہو وہ معلوم ہو جائے اور اگر مخاطب کو اس بات کا علم ہو تو کم سے کم مخاطب کو یہ معلوم ہو جائے کہ متکلم کو بھی اس بات کا علم ہے اور ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو پہلے ہی معلوم تھا کہ میں پیغمبر ہوں اور میرا پیغمبر ہونا اللہ کو معلوم ہے پھر یہ کہنا کہ آپ ﷺ مرسلین میں سے ہیں بے سود ہے۔

جواب

کافروں کو اطلاع دینا مقصود ہے اور ان کے انکار کو رد کرنا مطلوب ہے کیونکہ انہوں نے کہا تھا لَسْتَ مُرْسَلًا (آپ رسول نہیں ہیں)۔

جواب کا حاصل یہ کہ خبر کے دو فائدے تو وہی ہوتے جو معترض نے بیان کئے لیکن ایک تیسرا فائدہ بھی ہوتا ہے وہ یہ کہ مخاطب کے علاوہ کسی اور شخص کو بتانا اور اطلاع دینا مقصود ہوتا ہے اور یہی تیسرا فائدہ اس جگہ ہے۔ مترجم)

عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝ جو سیدھے راستے پر (بھیجے گئے) تھے یعنی توحید اور استقامت پر، یا یہ مطلب ہے کہ آپ سیدھے راستے پر ہیں۔ اگرچہ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ کے لفظ سے صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ پر ہونا معلوم ہو گیا تھا لیکن ضمناً معلوم ہوا تھا اس جملہ میں صراحت کردی گئی کہ آپ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ پر ہیں۔

تَنزِيلَ الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ۝ لِتُنذِرَ قَوْمًا مَّا أُنذِرَ آبَاؤُهُمْ فَهُمْ غَافِلُونَ ۝
یہ قرآن خدائے زبردست مہربان کی طرف سے نازل کیا گیا ہے کہ آپ اولاً ایسے لوگوں کو ڈرائیں جن کے باپ دادا کو نہیں ڈرایا گیا سو وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

لِتُنذِرَ کا تعلق تنزیل سے ہے (یعنی اس لئے یہ قرآن نازل کیا گیا ہے کہ آپ ڈرائیں) یا اس کا تعلق لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ کے مفہوم سے ہے (یعنی آپ کو ہم نے اس لئے بھیجا ہے کہ آپ ڈرائیں)۔

مَا أُنذِرَ میں مَا نافیہ ہے حضرت اسماعیلؑ کے بعد مکہ میں کوئی پیغمبر مبعوث نہیں ہوا مکہ والوں کو پیغمبر کی ضرورت بہت زیادہ تھی اس لئے فرمایا کہ ان لوگوں کے آباء و اجداد کے پاس کوئی پیغمبر نہیں بھیجا گیا (اور ان کو پیغمبر کی ضرورت سخت تھی اس لئے) آپ کو ان کے پاس پیغمبر بنا کر بھیجا گیا۔ مگر ان کو ڈرانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوا جس غفلت میں پہلے تھے انذار کے بعد بھی اسی میں پڑے ہوئے ہیں۔ یا ما موصولہ ہے یعنی جس چیز (عذاب آخرت۔ تباہی) سے ڈرانے کے لئے ان کے آباء و اجداد کے پاس پیغمبروں کو بھیجا گیا تھا۔ اسی عذاب سے ڈرانے کے لئے آپ کو ان کے پاس بھیجا گیا ہے۔ یا ما مصدریہ ہے یعنی جیسے ان کے آباء و اجداد کو ڈرایا گیا تھا ویسے ہی آپ ان کو ڈرائیں۔

لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلَىٰ أَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝ ان میں سے اکثر لوگوں پر (تقدیری) بات ثابت ہو چکی سو وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

اَلْقَوْلُ سے مراد ہے اللہ کا یہ قول لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ (میں جہنم کو ضرور بھر دوں گا جنات سے اور انسانوں سے سب سے)

فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ پس وہ یعنی اکثر لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔

ابن جریر نے عکرمہ کا بیان نقل کیا ہے کہ ابوجہل نے کہا تھا اگر میں نے محمد ﷺ کو دیکھ پایا تو ایسا ایسا کروں گا اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

إِنَّا جَعَلْنَا فِي أَعْنَاقِهِمْ أَغْلَالًا فَهِيَ إِلَى الْأَذْقَانِ فَهُم مُّقْمَحُونَ ۝
ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیے ہیں پھر وہ ٹھوڑیوں تک اڑ گئے ہیں سو ان کے سر اوپر کو اٹھے ہوئے ہیں۔

مذکورہ آیت ابوجہل کے حق میں لَا یُبْصِرُوْنَ تک نازل ہوئی۔ چنانچہ لوگ ابوجہل سے کہتے تھے یہ محمد موجود ہیں (اب تم جو کہتے تھے وہ کر دکھاؤ) تو ابوجہل کہتا تھا کہاں ہیں مجھے تو دکھائی نہیں دیتے۔

بغوی نے لکھا ہے اس آیت کا نزول ابوجہل اور اس کے ایک مخزومی ساتھی کے حق میں ہوا۔ ابوجہل نے قسم کھا کر کہا تھا کہ میں نے جہاں بھی محمد ﷺ کو دیکھ پایا پتھر سے ان کا سر کچل دوں گا چنانچہ رسول اللہ ﷺ کو نماز کی حالت میں اس نے دیکھ لیا۔ اس کے پاس ہی پتھر بھی پڑا ہوا تھا اس نے رسول اللہ ﷺ کے سر پر مارنے کے لئے پتھر اٹھانا چاہا فوراً ہاتھ گردن سے چمٹ گیا اور پتھر چھوٹ کر ہاتھ پر گر پڑا ابوجہل فوراً اپنے ساتھیوں کے پاس لوٹ کر آیا اور جو کچھ دیکھا تھا وہ بیان کیا اور بیان کرتے ہی گر پڑا۔ مخزومی شخص بولا اب میں جا کر اسی پتھر سے محمد ﷺ کو قتل کروں گا چنانچہ پتھر مارنے کے لئے وہ حضور ﷺ کی طرف چلا آپ ﷺ اس وقت بھی نماز پڑھ رہے تھے اللہ نے اس کو اندھا کر دیا۔ حضور ﷺ کی آواز تو اس کو سنائی دیتی تھی مگر آنکھوں سے کچھ نہیں دکھتا تھا وہ بھی اپنے ساتھیوں کے پاس لوٹ آیا لیکن ساتھیوں میں سے بھی وہ کسی کو دیکھ نہ سکا لوگوں نے اس کو آواز دی اور کہا تو نے کیا کیا مخزومی نے کہا مجھے تو وہ نظر ہی نہیں آئے ہاں ان کی آواز میں نے ضرور سنی مگر میرے اور ان کے درمیان کوئی ایسی چیز حائل تھی جیسے کوئی نر اونٹ ہو جو (حملہ کرنے کے لئے) دم ہلا رہا ہو۔ اگر میں ان کے قریب جاتا تو وہ اونٹ مجھے کھا جاتا اس پر آیت اِنَّا جَعَلْنَا فِیْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا نازل ہوئی۔

فَهِیَ اِلَى الْاَذْقَانِ۔ یعنی گلے میں پڑے ہوئے طوق ٹھوڑیوں تک ہیں جن کی وجہ سے وہ گردن جھکا نہیں سکتے۔ بغوی نے لکھا ہے اغلال سے بطور کنایہ ہاتھ مراد ہیں اگرچہ ہاتھوں کا ذکر پہلے نہیں آیا ہے کیونکہ غل کا معنی ہے ہاتھوں کو گردن سے باندھ دینا اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ ہاتھ گردن سے بندھے ہوئے ہیں اور ہاتھوں کو گردن سے ملا کر ہم نے ٹھوڑیوں تک طوق کو کس دیا ہے۔

فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ یعنی ٹھوڑیوں تک طوق ہونے کی وجہ سے ان کی گردنیں اوپر کو اٹھی ہوئی ہیں۔ آنکھیں بند ہو گئی ہیں کسی چیز کو دیکھ نہیں سکتیں۔

بیہقی نے دلائل میں بطریق سدی صغیر از کلبی از ابوصالح۔ حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ قبیلہ بنی مخزوم کے کچھ لوگوں نے باہم مشورہ کر کے یہ بات طے کی کہ رسول اللہ ﷺ کو شہید کر دیں ان مشورہ کرنے والوں میں ابوجہل اور ولید بن مغیرہ بھی شامل تھے۔ ایک روز رسول اللہ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے اور یہ لوگ آپ کی قرأت کی آواز سن رہے تھے ساتھیوں کے مشورہ کے مطابق ولید بن مغیرہ رسول اللہ ﷺ کو قتل کر دینے کے ارادہ سے چل دیا جس جگہ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے وہاں تک پہنچ گیا لیکن آواز سننے کے علاوہ حضور ﷺ اس کو نظر نہیں آئے۔ واپس آ کر اپنے ساتھیوں کو یہ بات بتا دی یہ سنتے ہی دوسرے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور جہاں آپ نماز پڑھ رہے تھے وہاں تک پہنچ بھی گئے اور قرأت کی آواز بھی سنتے رہے لیکن حضور ﷺ نظر نہ آئے آواز کی طرف بڑھتے تھے تو آواز پیچھے سے آنے لگتی تھی۔ پیچھے کی طرف آواز کی جانب آتے تھے تو آواز پیچھے سے آنے لگتی تھی آخر ناکام لوٹ آئے اور رسول اللہ ﷺ تک پہنچنے کا راستہ نہیں ملا۔ کی مطلب ہے آئندہ آیت کا۔

وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَیْنٰهُمْ فَهُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ ۝۹

اور ہم نے ایک آڑ ان کے سامنے کر دی اور ایک آڑ ان کے پیچھے سے پھر ہم نے ان کو (ہر طرف سے پردوں سے) گھیر دیا جس کی وجہ سے وہ نہیں دیکھ سکتے۔

فَاَغْشَیْنٰهُمْ یعنی ہم نے اس کو اندھا کر دیا تغشیہ پردہ سے ڈھانک دینا۔

اہل معنی کہتے ہیں یہ ایک تشبیہ ہے حقیقت میں نہ طوق تھا نہ آڑ بلکہ مراد یہ ہے کہ اللہ نے ان کے لئے چند موانع پیدا کر دیئے جن کی وجہ سے وہ ایمان لانے سے محروم ہیں۔ موانع پیدا کرنے کو طوق اور آڑ پیدا کرنے سے تشبیہ دی ان کو کفر پر اتنا پختہ

کر دیا اور ان کے دلوں پر ایسی چھاپ لگ گئی کہ کوئی نصیحت اور آیت ان کے لئے سود مند نہیں ہوتی۔ پس ان کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کی گردن میں طوق ڈال دیا گیا ہو اور طوق تھوڑی تک پہنچ گیا ہو اور ایسا جکڑا ہوا ہو کہ وہ گردن نہ جھکا سکتا ہو اور سر اوپر کو اچکا ہوا ہو اور ان کافروں کی مثال اس طرح بھی ہے جیسے آنکھوں کے سامنے ہر طرف سے کوئی چیز آڑ بن جائے اور آدمی کو آڑ ہونے کی وجہ سے کچھ بھی دکھائی نہ دے کافروں کی بھی یہی حالت ہے کہ حق کی طرف توجہ کرہی نہیں سکتے حق کی جانب گردن موڑ ہی نہیں سکتے۔ موانع کی وجہ سے سر جھکا کر حق کی تصویر دیکھ ہی نہیں سکتے۔ اگر بالفرض سر جھکا کر تصویر حق دیکھنا بھی چاہیں تو نگاہ کے سامنے بندش کی دیوار اور آڑ حائل ہے اوپر سے بھی پردہ ہے اور آگے پیچھے سے بھی رکاوٹیں موجود ہیں اس لئے راہ ہدایت ان کو سوجھائی نہیں دے سکتی۔

یا یہ مطلب ہے کہ جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو جسمانی دکھ پہنچانے کا ارادہ کیا ہم نے رسول اللہ ﷺ کو محفوظ رکھنے کے لئے ان کو روک دیا موانع کر دیے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ماضی کو بمعنی مستقبل لیا جائے (جَعَلْنَا کو بمعنی نَجْعَلُ کے قرار دیا جائے) یعنی قیامت کے دن جہنم کے اندر ہم ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیں گے اور آگ کے صندوقوں میں بند کر دیں گے کہ ان کے ہر طرف آگ کی دیوار ہوگی۔ آئندہ ایسا ہونا یقینی اور قطعی تھا اس لئے مستقبل کی جگہ ماضی کا صیغہ استعمال کیا (گویا ایسا ہو ہی گیا)

وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ اور آپ کا ان کو (عذاب سے) ڈرانا یا نہ ڈرانا دونوں ان کے لئے برابر ہیں یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اس کی (لفظی اور معنوی) تفسیر سورہ بقرہ کی آیت سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ الخ میں گزر چکی ہے۔

اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ ۚ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ ۝ بس آپ تو صرف ایسے شخص کو ڈرا سکتے ہیں (یعنی آپ کے ڈرانے کا فائدہ صرف ایسے شخص کو پہنچ سکتا ہے) جو نصیحت پر چلے اور رحمٰن سے بن دیکھے ڈرے۔ سو آپ اس کو مغفرت اور عمدہ ثواب کی خوش خبری دے دیجئے۔

اَلذِّكْرُ نصیحت سے مراد قرآن ہے قرآن کا اتباع کرنے سے مراد ہے اس کے مطلب پر غور کرنا اور اس کی تعلیم کے بموجب عمل کرنا۔ رحمٰن سے ڈرنے کا مطلب ہے اس کے عذاب سے ڈرنا۔ یا یہ مطلب ہے کہ آپ کا ڈرانا اسی شخص کے لئے مفید ہو سکتا ہے جو قرآن کے اتباع کا اہل ہو اور اللہ سے خشیت (خوف) رکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

اَلْقَهَّارُ الْمُنْتَقِمُ کی بجائے الرحمٰن فرمایا حالانکہ رحمٰن سے ڈرنے کا کوئی تعلق نہیں۔ خوف تو قہار کے قہر اور منتقم کے انتقام کا ہونا چاہئے کیونکہ رحمٰن کی صفت رحمت جانتے ہوئے پھر اس سے ڈرنا یہ خشیت کا انتہائی درجہ ہے اور عین ایمان ہے (رحمٰن کی رحمت کو جاننا اور پھر اس سے خوف کرنا) کمال ایمان ہے خوف و امید کے درمیان ہی ایمان ہوتا ہے۔

بِالْغَيْبِ۔ یعنی بن دیکھے عذاب سے ڈرتا ہے یا تنہائی میں اللہ کے عذاب سے ڈرتا ہے۔

بِمَغْفِرَةٍ یعنی گناہوں کی معافی کی بشارت دے دیجئے۔

اَجْرٍ كَرِيْمٍ۔ اعلیٰ عمدہ اجر یعنی جنت۔

اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ ۚ بے شک ہم ہی مُردوں کو زندہ کریں گے اور ہم لکھتے جاتے ہیں وہ اعمال (بھی) جن کو لوگ آگے بھیجتے ہیں اور وہ اعمال (بھی) جن کو وہ پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔

یعنی قبروں سے اٹھانے کے وقت ہم ہی مردوں کو زندہ کریں گے یا یہ مطلب ہے کہ جہالت اور گمراہی (جو حقیقت میں موت ہیں) کے بعد ہم علم اور ہدایت (جو حقیقت میں زندگی ہیں) دیتے ہیں۔ آثار سے مراد اعمال حسنہ بھی ہیں جیسے سکھایا ہوا علم، وقف کیا ہوا مال (مردہ سنت کو زندہ کر جانا) اور اچھا طریقہ جاری کرنا اور برے اعمال بھی ہیں جیسے باطل کو رواج دینا، ظلم کی بنیاد ڈالنا، کفر کی مدد کرنا، بدعت ایجاد کرنا۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ ایجاد کیا جس پر بعد والوں نے عمل کیا تو اس شخص کو اپنے کئے کا بھی ثواب ملے گا اور ان لوگوں کے عمل کے برابر بھی جو اس کے جاری کردہ طریقے پر چلے مگر بعد کو اس طریقہ پر چلنے والوں کا ثواب کم نہیں کیا جائے گا۔ اور جس نے اسلام میں کوئی برا طریقہ ایجاد کیا جس پر بعد کو آنے والے لوگ چلے تو ایجاد کرنے والے پر اپنے عمل کا بھی گناہ ہو گا اور بعد کو عمل کرنے والوں کا بھی لیکن بعد کو عمل کرنے والوں کے بوجھ میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ رواہ مسلم من حدیث جریر۔

بعض علماء نے کہا اٰثَارَهُمْ سے مراد ہیں مسجدوں تک جانے کے نشان ہائے قدم یعنی مسجدوں تک پہنچنے میں جتنے ان کے قدموں کے نشان پڑتے ہیں ہم سب کو لکھتے ہیں۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نماز میں سب سے بڑا اجر اس شخص کے لئے ہوتا ہے جو سب سے زیادہ دور سے چل کر آئے پھر اس کے بعد اس شخص کا اجر ہوتا ہے جو (اوروں سے) زیادہ دور سے آئے۔ اور جو شخص امام کے ساتھ نماز پڑھنے کے انتظار میں رہتا ہے اس کو ثواب اس شخص سے بڑھ کر ملتا ہے جو نماز پڑھ کر سو جاتا ہے۔ متفق علیہ۔

حضرت جابر کا بیان ہے مسجد کے گرد کچھ زمین کے قطعے خالی پڑے تھے بنی سلمہ کا ارادہ ہوا کہ (اپنے محلہ سے) منتقل ہو کر مسجد کے قریب آبسیں۔ رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع ملی تو فرمایا کیا تم چاہتے ہو کہ منتقل ہو کر مسجد کے قریب آجاؤ۔ بنی سلمہ نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ ہمارا یہی ارادہ ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا بنی سلمہ اپنے گھروں میں ہی رہو تمہارے قدموں کے نشان لکھے جاتے ہیں۔ رواہ مسلم۔

بغوی نے حضرت انس کی روایت سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔ ترمذی اور حاکم نے حضرت ابو سعید خدری کی روایت سے یہ حدیث نقل کی ہے جس کو ترمذی نے حسن اور حاکم نے صحیح کہا ہے۔

وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُّبِينٍ ﴿۱۲﴾ اور ہم نے ہر چیز کو ایک واضح کتاب میں ضبط کر دیا تھا۔ ع

اَحْصَيْنٰهُ یعنی ہم نے لکھ دیا تھا۔ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ سے مراد ہے لوح محفوظ۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۳﴾ اور آپ ان کے سامنے ایک قصبہ والوں کا اس وقت کا قصہ بیان کیجئے جب کہ اس بستی میں کئی رسول آئے تھے۔

اِضْرِبْ لَهُمْ کفار مکہ سے بطور مثال ایک قصہ بیان کیجئے۔ محاورہ میں بولا جاتا ہے یہ سب چیزیں ایک ضرب کی ہیں یعنی ایک جیسی ہیں۔ ضَرَبَ کبھی دو مفعولوں کی جانب متعدی ہوتا ہے اس جگہ مَثَلًا پہلا مفعول ہے اور اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ دوسرا مفعول۔

اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ سے انطاکیہ والے مراد ہیں۔

بغوی نے لکھا ہے علماء تاریخ کا بیان ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے دو حواری قاصد بنا کر انطاکیہ شہر کو بھیجے یہ دونوں جب شہر کے قریب پہنچے تو ایک بوڑھا آدمی بکریاں چراتا ملا۔ (یہ شخص حبیب تھا جو حضرت عیسیٰ کا صحابی ہوا) دونوں نے اس کو سلام کیا بوڑھے نے کہا تم کون ہو؟ قاصدوں نے کہا اللہ کا رسول تم کو بت پرستی چھوڑ کر اللہ کی عبادت کی طرف آنے کی دعوت دے رہا ہے بوڑھے نے کہا کیا تمہارے پاس کوئی نشانی ہے؟ قاصدوں نے کہا ہاں ہم اللہ کے حکم سے بیمار کو تندرست اور مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو بھلا چنگا کر دیتے ہیں بوڑھے نے کہا میرا ایک بیٹا ہے جو دو سال سے بیمار ہے۔ قاصدوں نے کہا تو چلو ہم کو وہاں لے چلو ہم بھی اس کی حالت دیکھیں۔ بوڑھا دونوں کو لے کر اپنے گھر پہنچا قاصدوں نے اس کے بیٹے پر جونہی ہاتھ پھیرا وہ اللہ کے حکم سے (تندرست ہو کر) اٹھ کھڑا ہوا یہ خبر شہر میں پھیل گئی اور ان کے ہاتھ سے اللہ نے بہت مریضوں کو شفا عطا فرما دی۔ انطاکیہ والوں کا ایک بادشاہ تھا وہب نے اس کا نام انطیخس کہا ہے یہ بادشاہ رومی تھا اور بتوں کی پوجا کرتا تھا جب اس کو یہ اطلاع ملی تو اس نے دونوں قاصدوں کو طلب کیا دونوں حضرات اس کے پاس پہنچ گئے بادشاہ نے پوچھا تم کون ہو؟ قاصدوں نے کہا ہم عیسیٰ کے قاصد ہیں۔ بادشاہ نے کہا کس غرض سے آئے ہو قاصدوں نے کہا ہم آپ کو دعوت دیتے ہیں کہ ایسے (بتوں

کی) جو نہ کچھ سنتے ہیں نہ دیکھتے ہیں پوجا چھوڑ کر ایسی ذات کی عبادت کی طرف آجاؤ جو سنتا اور دیکھتا ہے۔ بادشاہ نے کہا کیا تمہارا کوئی خدا ہمارے معبودوں کے علاوہ ہے؟ قاصدوں نے کہا جی ہاں جس نے آپ کو اور آپ کے معبودوں کو پیدا کیا ہے (وہی ہمارا معبود ہے) بادشاہ نے کہا اچھا اب تو اٹھ جاؤ میں تمہارے معاملہ پر غور کروں گا قاصد اٹھ آئے پھر لوگوں نے ان کا پیچھا کیا اور بازار میں پکڑ کر دونوں کو مارا۔

وہب کا بیان ہے کہ حضرت عیسیٰ نے ان دونوں شخصوں کو انطاکیہ کو بھیجا تھا۔ دونوں انطاکیہ پہنچے مگر بادشاہ تک رسائی نہیں ہوئی اور ایک طویل مدت تک ان کو وہاں ٹھہرنا پڑا ایک روز بادشاہ (اپنے قصر سے یا شہر سے) برآمد ہوا تو ان دونوں نے اللہ اکبر کہا اور اللہ کا ذکر (اونچی آواز سے) کیا بادشاہ نے غضب ناک ہو کر دونوں کو قید کر دیئے اور سو سو کوڑے مارنے کا حکم دے دیا۔ اہل تاریخ نے لکھا ہے۔ جب ان دونوں قاصدوں کی تکذیب کی گئی اور مارا گیا تو حضرت عیسیٰ نے حواریوں کے سردار شمعون صفا کو ان کے پیچھے ان کی مدد کرنے کے لئے بھیجا۔ شمعون بستی میں حلیہ بدل کر پہنچے اور بادشاہ کے مصاحبوں سے ربط ضبط پیدا کیا جب بادشاہ کے مصاحب ان سے مانوس ہو گئے تو انہوں نے ان کی اطلاع بادشاہ تک پہنچا دی۔ بادشاہ نے طلب کر لیا۔ شمعون دربار میں حاضر ہو گئے بادشاہ نے ان کی صحبت کو پسند کر لیا اور مانوس ہو گیا اور ان کی عزت کی۔ کچھ مدت کے بعد ایک روز شمعون نے بادشاہ سے کہا مجھے خبر ملی ہے کہ آپ نے دو آدمیوں کو قید خانہ میں بند کر رکھا ہے اور جب انہوں نے آپ کو آپ کے مذہب کے خلاف دعوت دی تو آپ نے ان کو پکڑ لیا اور قید کر دیا کیا آپ نے ان سے کچھ گفتگو بھی کی تھی اور ان کی بات بھی سنی تھی؟ بادشاہ نے کہا مجھے اتنا غصہ آیا کہ میں ان سے کوئی بات نہ کر سکا۔ شمعون نے کہا اگر بادشاہ مناسب سمجھے تو ان کو طلب فرما کر دریافت کرے کہ وہ کیا کہتے ہیں۔ شمعون کے مشورہ کے موافق بادشاہ نے دونوں حواریوں کو طلب کیا۔ شمعون نے ان دونوں سے دریافت کیا تم کو یہاں کس نے بھیجا ہے؟ قاصدوں نے جواب دیا اللہ نے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ شمعون نے کہا اللہ کے مختصر اوصاف بیان کرو۔ قاصدوں نے کہا وہ جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے اور جیسی اس کی مشیت ہوتی ہے حکم دیتا ہے۔ شمعون نے کہا تم دونوں کے پاس نشانی کیا ہے۔ قاصدوں نے کہا جو آپ طلب کریں یہ سنتے ہی بادشاہ نے ایک لڑکے کو بلوایا جس کی دونوں آنکھوں کے نشان بھی مٹے ہوئے تھے دونوں آنکھوں کی جگہ ایسی سپاٹ تھی جیسے پیشانی۔ دونوں حواریوں نے اپنے رب سے دعا کرنی شروع کی اور برابر کرتے رہے آخر دونوں آنکھوں کی جگہ پھٹ گئی دونوں نے مٹی کے دو ڈلے فوراً لے کر آنکھوں کے شگافوں میں رکھ دیے۔ فوراً دونوں ڈلے آنکھوں کے ڈیلوں کی طرح ہو گئے اور دونوں سے دکھائی دینے لگا۔ بادشاہ کو (بڑا) تعجب ہوا شمعون نے بادشاہ سے کہا اگر آپ اپنے معبود سے درخواست کریں اور وہ بھی ایسا ہی کر دے تو آپ کو برتری حاصل ہو جائے گی بادشاہ نے کہا تم سے کچھ چھپی بات نہیں حقیقت یہ ہے کہ ہمارا معبود جس کی ہم پوجا کرتے ہیں نہ سنتا ہے نہ دیکھتا ہے نہ ضرر پہنچا سکتا ہے نہ نفع دے سکتا ہے (وہ کچھ نہیں کر سکتا) شمعون کا قاعدہ یہ تھا کہ بادشاہ جب بتوں کی پوجا کرنے جاتا تھا تو شمعون بکثرت نماز پڑھتا اور (اللہ کے سامنے) گڑ گڑاتا تھا لوگ یہ سمجھتے تھے کہ یہ ہمارے مذہب پر ہے۔

اس کے بعد بادشاہ نے دونوں حواریوں سے کہا اگر تمہارا خدا جس کی تم پوجا کرتے ہو مردہ کو زندہ کر سکے تو ہم اس کو مان لیں گے۔ حواریوں نے کہا ہمارا معبود ہر چیز کی قدرت رکھتا ہے بادشاہ نے کہا ایک زمیندار کا بچہ سات روز ہوئے مر گیا تھا اس کا باپ موجود نہ تھا ہم نے اس کے باپ کے آنے تک اس کو دفن کرنے سے روک دیا ہے (اس کو تمہارا خدا زندہ کر دے تو ہم مان لیں گے) حسب الحکم لوگ میت کو لے آئے میت بگڑ چکی اور شکل ذرا اوپری ہو گئی تھی۔ دونوں حواری اللہ سے علانیہ دعا کرنے لگے اور شمعون چپکے چپکے خدا سے دعا مانگ رہا غرض کچھ دیر کے بعد مردہ اٹھ بیٹھا اور کہا میں سات روز ہوئے شرک کی حالت میں مرا تھا مجھے آگ کی سات وادیوں میں لے جایا گیا میں تم کو اس شرک سے ڈراتا ہوں جس میں تم مبتلا ہو۔ اللہ پر ایمان لے آؤ پھر اس نے کہا آسمان کے دروازے کھلتے مجھے دکھائی دیے اور میں نے ایک خوبصورت جوان کو دیکھا جو ان تینوں کی سفارش کر رہا تھا۔ بادشاہ نے کہا تینوں کون؟ اس نے کہا شمعون اور یہ دونوں بادشاہ کو یہ سن کر اور دیکھ کر بڑا تعجب ہوا۔ شمعون نے جب دیکھ لیا کہ اس کی بات

بادشاہ پر اثر کر چکی ہے تو بادشاہ سے کہا آپ ان دونوں شخصوں سے سوال کریں کہ وہ آپ کی لڑکی کو زندہ کر دیں۔ بادشاہ نے دونوں حواریوں سے اپنی لڑکی کو زندہ کر دینے کی درخواست کی۔ فوراً دونوں نماز پڑھنے کھڑے ہو گئے اور اللہ سے دعا کی شمعون بھی دعا میں ان کے ساتھ شریک تھے مگر چپکے چپکے دعا کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد اللہ نے اس عورت کو زندہ کر دیا۔ قبر پھٹی اور عورت اس سے نکل آئی اور کہا خوب جان لو کہ یہ دونوں سچے ہیں اور میرا خیال ہے کہ تم نہیں مانو گے۔ پھر اس نے دونوں حواریوں سے درخواست کی کہ وہ اس کو اس کی جگہ واپس کر دیں پھر اس نے اپنے سر پر کچھ مٹی ڈالی اور قبر میں لوٹ گئی۔

ابن اسحاق نے بحوالہ کعب و وہب بیان کیا ہے کہ بادشاہ ایمان نہیں لایا اور قوم کے اتفاق رائے سے اس نے قاصدوں کو قتل کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ یہ خبر حبیب کو مل گئی حبیب اس وقت شہر کے آخری دروازہ پر تھا دوڑ کر شہر والوں کے پاس پہنچا ان کو نصیحت کی اور قاصدوں کا کہا ماننے کی دعوت دی۔ یہی مطلب ہے اللہ کے آئندہ قول کا۔

إِذْ أَرْسَلْنَا إِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوا إِنَّا إِلَيْكُم مُّرْسَلُونَ ﴿١٤﴾

جب ہم نے ان کے پاس دو (رسولوں) کو بھیجا ان لوگوں نے دونوں (رسولوں) کو جھوٹا قرار دیا تو ہم نے تیسرے (رسول) سے ان دونوں کی تائید کی سو تینوں نے کہا ہم کو تمہارے پاس (ہدایت کے لئے) بھیجا گیا ہے۔

وہب نے کہا پہلے دونوں قاصدوں کے نام یحییٰ اور یونس تھے تیسرے قاصد کا نام شمعون تھا۔ کذا اخرج ابن المنذر عن سعید بن جبیر۔ اگر کلام کی کوئی خاص غرض ہو تو کلام کی رفتار اسی مقصد کے لئے ہوتی ہے دوسری چیز کا ذکر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہاں اس لطیف تدبیر کا اظہار مقصود ہے جس کی وجہ سے حق غالب اور باطل نابود ہو گیا اس لئے عَزَّزْنَا کے بعد مفعول کا ذکر نہیں کیا۔

عبدالرزاق عبد بن حمید ابن جریر ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے قتادہ کا بیان نقل کیا ہے قتادہ نے کہا مجھے یہ روایت پہنچی ہے کہ حضرت عیسیٰ نے اہل قریہ کے پاس دو حواریوں کو بھیجا تھا۔ کعب نے کہا پہلے دونوں قاصد صادق و صدوق تھے اور تیسرا قاصد سلوم تھا۔

قاصدوں کو بھیجنے کی نسبت اللہ نے اپنی طرف کی (باوجودیکہ وہ قاصد حضرت عیسیٰ کے تھے) کیونکہ حضرت عیسیٰؑ نے ان کو بامر خداوندی بھیجا تھا۔

فَقَالُوا یعنی تینوں قاصدوں نے انطاکیہ والوں سے کہا۔

قَالُوا مَا أَنتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَمَا أَنزَلَ الرَّحْمَٰنُ مِن شَيْءٍ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا تَكْذِبُونَ ﴿١٥﴾

(انطاکیہ والوں نے) کہا تم بھی ہماری طرح آدمی ہی ہو (اس کے سوا کچھ نہیں ہے) اور رحمٰن نے کچھ بھی نہیں اتارا (یعنی وحی نازل نہیں کی) تم محض جھوٹ کہتے ہو (رسالت کا جھوٹا دعویٰ کرتے ہو) یعنی تم کو کوئی (مافوق البشریت) برتری حاصل نہیں جس کی وجہ سے تم کو رسول بنایا گیا ہو۔

قَالُوا رَبُّنَا يَعْلَمُ إِنَّا إِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُونَ ﴿١٦﴾ رسولوں نے کہا ہمارا رب جانتا ہے (یعنی اللہ گواہ ہے) کہ ہم کو تمہاری جانب ہی (رسول بنا کر) بھیجا گیا ہے۔

رسولوں نے اللہ کے علم سے استشہاد کیا جو قسم کے قائم مقام ہے (یعنی انہوں نے اللہ کی قسم کھا کر کہا) اس لئے (احناف کا مسلک ہے کہ) جس نے دانستہ جھوٹ بولا اور جانتے ہوئے کہا اللہ جانتا ہے کہ میں نے یہ کام کر لیا اور واقع میں وہ کاذب ہو تو اس پر یمین غموس پڑ جائے گی (دانستہ گذشتہ واقعہ پر جھوٹی قسم)

کافروں نے رسولوں کی رسالت کا انکار کیا تھا اس لئے رسولوں نے دوسری مرتبہ اپنا رسول ہونا پرزور طور پر قسم اور تاکید کے ساتھ بیان کیا۔

وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۞ اور ہمارے ذمے فقط واضح طور پر پہنچا دینا ہے (یعنی تمہارے ماننے نہ ماننے کی ہم پر کوئی ذمہ داری نہیں) یعنی ہمارا کام صرف اللہ کا پیام واضح طور پر پہنچا دینا ہے ایسی نشانیاں جو ہمارے پیام کے صحیح ہونے کو ظاہر کر رہی ہیں موجود ہیں۔ مردوں کو زندہ کر دینا، مادر زاد اندھوں کو بینا اور کوڑھیوں کو بھلا چنگا کر دینا ہمارے پیام کی صحت کو واضح کر رہا ہے اب نفع نقصان تمہارا ہے۔ تمہارا انکار ہم کو ضرر نہیں پہنچا سکتا۔

جب پیغمبروں کو جھوٹا قرار دینے کی وجہ سے اللہ نے ان کو کال میں مبتلا کر دیا اور بارش نہ ہوئی تو

قَالُوْٓا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۞ انہوں نے کہا ہم تم کو منحوس سمجھتے ہیں اگر تم باز نہ آئے تو ہم تم کو سنگسار کر دیں گے اور تم کو ہماری طرف سے سخت تکلیف پہنچے گی۔

یعنی یہ مصیبت جو ہم پر آئی وہ تمہاری نحوست کی وجہ سے آئی۔ پیغمبروں کی رسالت کا دعویٰ ان کو عجیب معلوم ہوا ان کو اس قول سے ہی نفرت پیدا ہوئی اور جاہلوں کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ جس طرف ان کی طبیعتیں راغب ہوتی ہیں اس کو پسند کرتے ہیں اور جو چیز طبیعت کی رغبت اور میلان نفس کے خلاف ہوتی ہے اس کو برا سمجھتے اور اس سے نفرت کرتے ہیں۔

لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا یعنی اگر تم اپنے قول سے باز نہ آئے تو ہم پتھر مار مار کر تم کو ہلاک کر دیں گے۔

قَالُوْا طَآئِرُكُمْ مَّعَكُمْ ۚ اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ۞ رسولوں نے کہا تمہاری نحوست تو تمہارے ساتھ ہی لگی ہوئی ہے کیا (اس کو تم نحوست سمجھتے ہو کہ) تم کو نصیحت کی جا رہی ہے (نحوست کی اور کوئی وجہ نہیں ہے) بلکہ تم خود حد (شریعت و عقل) سے نکل جانے والے لوگ ہو۔

یعنی تمہاری نحوست کا سبب تمہارے ساتھ موجود ہے مراد یہ کہ نحوست کا سبب تمہارا کفر ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے یہ مطلب بیان کیا تمہارے نصیب کی بھلائی اور برائی تمہارے ساتھ ہے وہ ضرور تم کو پہنچے گی تم سے دور نہیں ہوگی۔

اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ میں استفہام انکاری ہے یعنی اگر تم کو نصیحت کی جا رہی ہے تو کیا اس کو تم ہماری نحوست سمجھتے ہو اور ہم کو سنگسار کر دینے کی دھمکیاں دیتے ہو ایسا سمجھنا مناسب نہیں بلکہ تم کو ہمارا منت کش اور احسان مند ہونا چاہئے۔

بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ یعنی گناہ میں حد سے آگے بڑھ جانا تمہارا شیوہ ہی ہے وہ رسول جن کو برکت کا ذریعہ سمجھنا چاہئے تم ان کو منحوس سمجھتے ہو۔

وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى اور ایک آدمی اس شہر کے دور مقام سے دوڑتا ہوا آیا۔

یہ شخص حبیب نجار تھا۔ (یعنی بڑھئی تھا) عبدالرزاق اور ابن ابی حاتم نے قتادہ کا یہی قول بیان کیا ہے۔ سدی نے کہا حبیب دھوبی تھا۔ وہب نے کہا حبیب ریشمی کپڑے بناتا تھا اور بیمار تھا اس کو جذام ہو گیا تھا اس لئے شہر کے آخری دروازہ پر پڑا رہتا تھا اور مرد مومن تھا خیرات بہت کرتا تھا دن میں جو کچھ کماتا تھا شام کو دو حصے کر کے ایک حصہ خیرات کر دیتا تھا اور ایک حصہ اپنے متعلقین کے صرف میں لاتا تھا جب اس کو اطلاع ملی کہ اس کی قوم والوں نے رسولوں کو قتل کر دینے کا ارادہ کر لیا ہے تو دوڑا ہوا آیا اور۔

قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ ۞ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۞ اس نے کہا اے میری قوم والو ان رسولوں کی راہ پر چلو ایسے لوگوں کی راہ پر چلو جو تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتے اور وہ خود راہ راست پر ہیں۔

لَا يَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا یعنی تبلیغ رسالت کا وہ کوئی معاوضہ نہیں چاہتے۔

وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ یعنی دونوں جہاں کی بھلائی کے راستہ پر چل رہے ہیں۔

تیئسواں پارہ شروع

وَمَالِیَ

وَمَالِيَ لَآ أَعْبُدُ الَّذِي فَطَرَنِي وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۝ اور میرے پاس کون سا عذر ہے کہ میں اس (معبود) کی عبادت نہ کروں جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور تم سب کو اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔

اس کلام میں لطیف طرز میں ہدایت کی ہے اپنے نفس کو نصیحت کرنے کے پیرایہ میں دوسروں کو خالص نصیحت کی ہے کہ دوسروں کو بھی اسی بات کو اختیار کرنا چاہئے جو ناصح نے اپنے لئے اختیار کی ہے۔ حقیقت میں کفار کو اس امر پر زجر کرنا مقصود ہے کہ انہوں نے خالق کی عبادت کو چھوڑ کر دوسروں کی عبادت پسند کی ہے۔

وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ اس کلام میں پر زور تہدید ہے۔

ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے قتادہ کا بیان نقل کیا ہے کہ حبیب ایک غار کے اندر اللہ کی عبادت کرتا تھا جب اس کو رسولوں کی خبر معلوم ہوئی تو فوراً غار سے نکل کر اپنی قوم کے پاس پہنچا اور اپنے مذہب کا اعلان کرتے ہوئے ان سے کہا يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِينَ اتَّبِعُوا مَنْ لَّا يَسْأَلُكُمْ أَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُونَ قوم والوں نے کہا کیا تو ہمارے مذہب کا مخالف ہو گیا اور ان رسولوں کے مذہب کا پیرو ہو گیا۔ حبیب نے اس کے جواب میں کہا وَمَالِيَ لَآ أَعْبُدُ الَّذِي فَطَرَنِي وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ۔

اس شخص نے تخلیق الٰہی کی نسبت تو اپنی طرف کی اور اللہ کی طرف لوٹ کر جانے کی نسبت قوم والوں کی طرف کی۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ تخلیق الٰہی ایک نعمت ہے جس کا اظہار اس شخص پر لازم تھا اور اللہ کی طرف لوٹ کر جانے میں ایک طرح کی توبیخ و زجر ہے اس لئے اس کی نسبت کافروں کی طرف کرنی مناسب تھی۔

بعض اہل روایت کا بیان ہے کہ اس شخص نے جو اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِينَ کہا تو لوگ اس کو پکڑ کر بادشاہ کے پاس لے گئے۔ بادشاہ نے اس سے کہا کیا تو ان رسولوں کا پیرو ہو گیا اس نے جواب دیا۔ وَمَالِيَ لَآ أَعْبُدُ الَّذِي فَطَرَنِي وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ یعنی اگر میں اپنے خالق کی عبادت نہ کروں تو میرے پاس اس کا کیا عذر ہے اور تم سب کو قیامت کے دن اسی کے پاس جانا ہے وہ تم کو ضرور بدلہ دے گا۔

ءَأَتَّخِذُ مِنْ دُونِهِ آلِهَةً إِنْ يُرِدْنِ الرَّحْمَٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا وَّلَا يُنْقِذُونِ ۝ إِنِّي إِذًا لَّفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ کیا میں خدا کو چھوڑ کر ایسوں کو معبود بناؤں کہ اگر رحمٰن مجھے کوئی تکلیف پہنچانی چاہے تو ان معبودوں کی سفارش میرے کچھ کام آسکے نہ وہ مجھے چھڑا سکیں اگر میں ایسا کروں گا تو صریح گمراہی میں جا پڑوں گا۔

لَا تُغْنِ عَنِّي شَفَاعَتُهُمْ یعنی تمہارے خیال میں جو یہ معبود سفارش کریں گے (اگر بالفرض انہوں نے سفارش کی) تو ان کی شفاعت میرے کام نہیں آئے گی (مطلب یہ کہ ان کو شفاعت کرنے کا اختیار ہی نہ ہوگا۔ مترجم) اور اگر اللہ مجھے عذاب دے گا تو یہ معبود مجھے اللہ کے عذاب سے چھڑا نہ سکیں گے۔ دفع ضرر اور عذاب سے رہائی کے لئے شفاعت کا کام میں نہ آنا ظاہر کر کے شفاعت کے بے سود ہونے کو پر زور طریقہ سے بیان کر دیا کیونکہ شفاعت سے رحمت کا حصول تو بڑی بات ہے جب دفع ضرر معبودوں کی شفاعت سے ممکن نہیں تو حصول رحمت کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔

اِذًا یعنی ایسی حالت میں کہ میں ان معبودوں کی پوجا کروں جو نہ نفع پہنچا سکتے ہیں نہ ضرر اور اس خدا کی عبادت چھوڑ دوں جو نفع ضرر پہنچانے پر قدرت رکھتا ہے۔ اگر میں نے ایسا کیا تو کھلی گمراہی میں پڑ جاؤں گا۔

ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ یعنی ایسی صریح گمراہی جو لونی تمیز رکھنے والے کی نظر سے بھی پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔

اِنِّیْۤ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ ﴿۲۵﴾ بلاشبہ میں تمہارے رب پر (یعنی جو حقیقی رب ہے اس پر) ایمان لاچکا سو تم میری یہ بات سن لو۔

بِرَبِّكُمْ یعنی جس رب نے تم کو پیدا کیا ہے۔ خطاب قوم کو ہے یا بادشاہ کو۔

فَاسْمَعُوْنِ یعنی میرے ایمان کی اطلاع سن لو۔

اس تفسیر پر یہ قول جو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے نصیحت کا تتمہ قرار پائے گا کیونکہ قوم والوں سے جب اس نے کہا تھا اِتَّبِعُوا الْمُرْسَلِیْنَ تو گویا قوم نے اس سے دریافت کیا تو ان پر ایمان لے آیا اس کے جواب میں اس نے کہا اِنِّیْۤ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ میں تمہارے رب پر ایمان لے آیا۔ میرے ایمان کے اقرار کو تم بھی سن لو اگر یہ بہتر نہ ہوتا تو میں خود اس کو کیوں اختیار کرتا۔

بجائے بِرَبِّیْ کہنے کے بِرَبِّكُمْ کہنے میں ایمان کی ایک بلیغ دعوت ہے۔

بغوی نے لکھا ہے جب اس شخص نے یہ بات کہی تو قوم والوں نے اس پر یکدم حملہ کر کے قتل کر دیا۔ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا قدموں سے ایسا روندا کہ اس کی آنتیں پیچھے سے نکل گئیں۔ سدی نے کہا لوگ اس کو پتھروں سے مار رہے تھے اور وہ کہہ رہا تھا اے اللہ میری قوم کو ہدایت کر آخر اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور مار ڈالا۔ حسن نے کہا اس کے گلے کو پھاڑ کر شہر کی فصیل سے لٹکا دیا۔ اس کی قبر انطاکیہ میں موجود ہے۔

اللہ نے اس کو جنت میں داخل فرمادیا وہ زندہ ہے اللہ کی طرف سے اس کو روزی ملتی ہے یعنی وہ شہید ہو گیا اور شہیدوں کی زندگی اس کو عطا کر دی۔[1]

بعض علماء نے کہا بِرَبِّكُمْ میں خطاب رسولوں کو ہے کیونکہ جب اس کو یقین ہو گیا کہ مجھے قتل کر دیا جائے گا تو اس نے اپنے مؤمن ہونے کا گواہ پیغمبروں کو بنایا (گویا) پورا کلام اس طرح تھا۔ پھر اس نے رسولوں سے کہا میں تمہارے رب پر ایمان لایا۔

قِیْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ؕ (مر جانے کے بعد اس سے) کہا گیا جنت میں چلا جا۔

یعنی جب حبیب نجار شہید ہو گیا تو اس کی عزت افزائی کے لئے جنت میں جانے کی اجازت دے دی گئی اور بطور اجازت اس سے کہہ دیا گیا جنت میں داخل ہو جا۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ مرنے سے پہلے ہی اس کو جنت میں داخل ہونے کی بشارت دے دی گئی اس صورت میں جنت سے مراد ہو گی قبر کیونکہ قبر (مومن کے لئے) جنت کا ایک باغیچہ ہوتی ہے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے جو بطور جواب استعمال کیا گیا ہے سوال یہ پیدا ہو سکتا تھا کہ دینی پختگی کے بعد جب وہ اللہ سے ملا تو اللہ نے اس سے کیا فرمایا اس امکانی سوال کا جواب دے دیا گیا۔ جب حبیب جنت میں پہنچا تو۔

---

[1] روایت میں آیا ہے کہ حضرت عروہ بن مسعود ثقفی خدمت گرامی میں حاضر ہو کر مسلمان ہو گئے پھر انہوں نے اپنے قبیلے کے پاس واپس جانے کی اجازت طلب کی حضور ﷺ نے فرمایا وہ تجھ سے لڑیں گے۔ عروہ نے کہا حضور اگر وہ مجھے سوتا پائیں گے تو بیدار بھی نہیں کریں گے (وہ میرا ایسا ادب کرتے ہیں) چنانچہ واپس جا کر عروہ نے اپنی قوم کو اسلام کی دعوت دی لیکن انہوں نے عروہ کا کہنا نہ مانا اور تکلیف دہ باتیں سنائیں جب فجر کا وقت ہوا تو انہوں نے اپنے بالاخانہ پر نماز ادا کی اور توحید و رسالت کی شہادت دی باہر سے کسی ثقفی شخص نے ان کے تیر مار اور شہید کر دیا۔ حضور ﷺ کو جب ان کے شہید ہونے کی خبر پہنچی تو فرمایا عروہ کی مثال ایسی ہے جیسے یٰسین والے شخص کی جس نے اپنی قوم کو توحید کی طرف بلایا تھا اور انہوں نے اس کو قتل کر دیا۔ (از مظہر رحمۃ اللہ)

قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ۝ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ۝ اس نے کہا اے (میرے رب) کاش میری قوم کو معلوم ہو جاتا کہ میرے رب نے مجھے کیا بخش دیا اور عزت یافتہ لوگوں میں مجھے شامل کر دیا۔

مَا غَفَرَ میں مَا موصولہ یا مصدریہ یا استفہامیہ (ترجمہ اسی کے مطابق کیا گیا ہے) یعنی کس وجہ سے اللہ نے میری مغفرت کر دی یعنی ایمان اور کافروں کی طرف سے ایذاء پہنچنے پر صبر کرنے کی وجہ سے۔

اہل صلاح کی عادت ہوتی ہے کہ وہ غصہ کو پی جاتے ہیں اور دشمنوں پر بھی رحم کرتے ہیں۔ اسی عادت کے سبب حبیب نے بھی اپنی قوم کو اپنی حالت سے واقف ہو جانے کی تمنا کی تاکہ اس اطلاع کے بعد وہ ایمان لے آئیں اور طاعت گزار ہو جائیں۔ قوم کو واقف بنانے کی تمنا اس نے اس وجہ سے کی کہ وہ بتانا چاہتا تھا کہ میں حق پر تھا اور قوم والے بڑی غلطی پر تھے۔

بغوی نے لکھا انطاکیہ والوں نے جب حبیب کو شہید کر دیا تو اللہ کا غضب جوش میں آ گیا اور فوری عذاب اس نے نازل کر دیا۔ جبرئیلؑ نے بحکم الٰہی ایک چیخ ماری جس سے سب مر گئے۔

وَمَا أَنْزَلْنَا عَلٰى قَوْمِهٖ مِنْ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ ۝ إِنْ كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَإِذَا هُمْ خَامِدُوْنَ ۝ اور ہم نے اس کی قوم پر کوئی لشکر (فرشتوں کا) آسمان سے نہیں اتارا اور نہ ہم کو اتارنے کی ضرورت تھی بس وہ سزا ایک چیخ کی آواز تھی جس سے وہ اسی دم بجھ کر رہ گئے (یعنی مر گئے)۔

عَلٰى قَوْمِهٖ حبیب کی قوم پر

مِنْ بَعْدِهٖ حبیب کے شہید ہونے کے بعد

مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَاءِ یعنی آسمان سے فرشتوں کا کوئی لشکر ہم نے نہیں اتارا جیسے خندق اور بدر کے دن اتارا تھا بلکہ ایک فرشتہ کی ایک چیخ ہی ان کے لئے کافی ہو گئی۔ اس میں حبیب کی قوم کی تحقیر کا اظہار اور رسول اللہ ﷺ کی عظمت کی طرف اشارہ ہے۔

وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ یعنی ہماری یہ عادت اور دستور نہیں ہے کہ کسی قوم کو ہلاک کرنے کے لئے فرشتوں کی فوج بھیجیں اللہ کو اس کی ضرورت نہیں۔ رہی یہ بات کہ خندق اور بدر کے دن جو فرشتوں کو بھیجا گیا تھا وہ محض بشارت دینے اور رسول کی عظمت کا اظہار کرنے اور مسلمانوں کے دلوں کو تسکین دینے کے لئے تھا اللہ نے فرمایا ہے وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ إِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ

بعض اہل علم کے نزدیک مَا كُنَّا میں مَا موصولہ ہے اور جند سے مراد ہے آسمان سے سنگ باری یا طوفان یا شدید بارشیں یعنی جس طرح گزشتہ قوموں پر ہم نے عذاب کی فوج بھیجی ایسی عذابی فوج حبیب کی قوم پر نازل نہیں کی۔

بغوی نے لکھا ہے حضرت جبرئیلؑ نے شہر کے دروازے کے دونوں بازو پکڑ کر ایک چیخ ماری تھی۔ یہ مفسروں کا قول ہے۔

خَامِدُوْنَ یعنی سب یکدم مر گئے خمود (بجھنا) سے مراد موت ہے کیونکہ زندگی حرارت غریزیہ سے وابستہ ہے جب طبعی حرارت بجھ جاتی ہے موت ہو جاتی ہے۔

فَإِذَا میں فَ سببیہ ہے اور إِذَا مفاجاتیہ یعنی اسی چیخ کے سبب سب یکدم مر گئے۔

يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ مَا يَأْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ إِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝

افسوس ایسے بندوں کے حال پر۔ کبھی ان کے پاس کوئی رسول نہیں آیا جس کی انہوں نے ہنسی نہ اڑائی ہو۔

يٰحَسْرَةً میں تنوین تعظیم ہے یعنی حسرت کی عظمت پر دلالت کر رہی ہے۔

إِلَّا كَانُوْا بِهٖ میں استثناء شرط و جزاء کے معنی میں ہے یعنی جب بھی کوئی رسول ان کے پاس آتا تھا وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ یہ حسرت کی عظمت کا اظہار ہے جو لوگ اپنے ان مخلص خیر خواہوں کا مذاق اڑائیں جن کی نصیحت سے دونوں جہاں کی

بہبودی وابستہ ہے تو ایسے لوگ اسی قابل ہیں کہ ان کی حالت پر اظہار حسرت کیا جائے اور جن وانس وملائکہ ان پر افسوس کریں۔
یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حسرت سے مراد ایمان والے بندوں کی طرف سے اظہار حسرت نہ ہو بلکہ بطور استعارہ اللہ کی طرف سے
حسرت کا اظہار ہو اس صورت میں استہزاء کرنے والوں کے جرم کی عظمت کی طرف اشارہ ہوگا۔ بعض نے کہا منادیٰ محذوف
ہے یعنی اے لوگو ان بندوں پر افسوس کرو جو انبیاء کا مذاق اڑاتے ہیں۔ حسرت کا معنی ہے شدت حزن اور پشیمانی۔
بغوی نے لکھا ہے اس میں دو قول ہیں ایک قول یہ ہے کہ چونکہ لوگ پیغمبروں پر ایمان نہیں لائے۔ اس لئے قیامت کے
دن اللہ فرمائے گا کہ آج بندوں کے لئے حسرت ندامت اور غم ہے دوسرا قول یہ ہے کہ ہلاک ہونے والوں کا یہ کلام ہے۔
ابو العالیہ نے کہا جب انہوں نے عذاب آنکھوں سے دیکھ لیا تو یٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ کہا۔
العباد میں الف لام عہد کا ہے اور اس سے مراد ہیں انطاکیہ کے باشندے یا تمام وہ لوگ مراد ہیں جو پیغمبروں پر ایمان نہیں
لائے اور رسولوں کا مذاق اڑایا اس صورت میں یہ اہل مکہ پر تعریض ہو گی۔

أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُم مِّنَ الْقُرُونِ أَنَّهُمْ إِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿٣١﴾
کیا ان لوگوں نے اس پر نظر نہیں کی کہ ہم ان سے پہلے بہت سی امتیں غارت کر چکے کہ وہ پھر ان کی طرف لوٹ کر
نہیں آتے۔

أَلَمْ يَرَوْا کیا مکہ والے نہیں جانتے کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی کثرت سے امتوں کو ہلاک کر دیا کیا یہ واقف نہیں کہ
ہلاک شدہ امتیں ان کے پاس لوٹ کر نہیں آئیں گی۔ اس کلام سے ایک شبہ پیدا ہو سکتا تھا کہ شاید مرنے کے بعد بھی نہیں لوٹیں گے
(اور کبھی دوبارہ زندگی ان کو نہیں ملے گی) اس شبہ کو دور کرنے کے لئے آگے فرمایا۔
ع ٢ وَإِن كُلٌّ لَّمَّا جَمِيعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُونَ ﴿٣٢﴾ اور ان میں سے کوئی ایسا نہیں جو مجموعی طور پر ہمارے
روبرو حاضر نہ کیا جائے۔
یعنی قیامت کے روز سب ہمارے سامنے حاضر کئے جائیں گے جمیع بروزن فعیل بمعنی مفعول ہے اور لَدَيْنَا کا
تعلق جمیع سے (ہمارے پاس جمع کئے جائیں گے) یا تعلق مُحْضَرُونَ سے ہے (ہمارے پاس حاضر کئے جائیں گے)

وَآيَةٌ لَّهُمُ الْأَرْضُ الْمَيْتَةُ أَحْيَيْنَاهَا وَأَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَأْكُلُونَ ﴿٣٣﴾
اور (اللہ کی قدرت کی) ایک نشانی ان کے لئے مردہ (خشک) زمین ہے جس کو ہم زندہ کر دیتے ہیں (بارش کی وجہ سے
سرسبز کر دیتے ہیں) اور اس سے غلہ برآمد کرتے ہیں پھر اس غلہ میں سے یہ لوگ کھاتے ہیں۔
الْأَرْضُ سے کوئی معین زمین مراد نہیں ہے۔
حَبًّا سے مراد جنس غلہ ہے جیسے گندم جو وغیرہ فَمِنْهُ کو يَأْكُلُونَ سے پہلے لانے سے یہ اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ کھانے
کی چیزوں میں اناج کا بڑا حصہ ہے (یعنی اناج ہی زیادہ کھایا جاتا ہے) اور زندگی کا یہی بڑا ذریعہ معاش ہے۔

وَجَعَلْنَا فِيهَا جَنَّاتٍ مِّن نَّخِيلٍ وَأَعْنَابٍ اور زمین میں ہم نے کھجوروں اور انگوروں کے باغ پیدا کئے۔
حب چونکہ جنس ہے اس لئے اس کا مختلف ہونا معلوم ہی ہے اس لئے اس کو بصیغہ جمع ذکر نہیں کیا لیکن نخیل و اعناب پھلوں
کی انواع ہیں اس لئے ان کو بصیغہ جمع ذکر کیا۔
نخیل کھجور کے درخت کو کہتے ہیں اور تمر چھوارے کو کہتے ہیں۔ مناسب تو یہ تھا کہ انگوروں اور اناج کے ساتھ چھواروں
کا ذکر کیا جاتا۔ لیکن بجائے چھواروں کے ان کے درختوں کا اس لئے ذکر کیا کہ کھجور کے درختوں کے فوائد پھلوں کے علاوہ اور بھی
بہت ہیں اور صنعت الٰہیہ کا ظہور درخت کھجور سے بھی بہت ہوتا ہے۔

وَفَجَّرْنَا فِيهَا مِنَ الْعُيُونِ ﴿٣٤﴾ لِيَأْكُلُوا مِن ثَمَرِهِ وَمَا عَمِلَتْهُ أَيْدِيهِمْ أَفَلَا يَشْكُرُونَ ﴿٣٥﴾
اور اس میں چشمے جاری کئے تاکہ لوگ باغ کے پھلوں میں سے کھائیں اور اس پھل (اور غلہ) کو ان کے ہاتھوں نے نہیں بنایا سو کیا

وہ شکر نہیں کرتے۔

مِنَ الْعُيُوْنِ (مِنْ تبعیضیہ ہے یعنی) کچھ چشمے۔ اخفش کے نزدیک مِنْ زائد ہے۔

مِنْ ثَمَرِهٖ یعنی مذکورہ (درختوں یا) باغوں کے پھل بعض کے نزدیک ثمرہ کی ضمیر اللہ کی طرف راجع ہے یعنی خدا کے پیدا کئے ہوئے پھل۔

وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ مَا موصول ہے ثمرہ پر اس کا عطف ہے تاکہ کھائیں وہ چیزیں جو وہ اپنے ہاتھوں سے بناتے ہیں جیسے عرق شیرہ، شربت وغیرہ بعض کے نزدیک مَا نافیہ ہے مراد یہ ہے کہ سب پہلے اللہ کے پیدا کئے ہوئے ہیں انسان کی صنعت کو ان میں دخل نہیں ہے۔

اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ہمزہ سوالیہ ہے اور واؤ عاطفہ ہے معطوف علیہ محذوف ہے یعنی کیا وہ خدا اور نعمت کے منکر ہیں اور شکر نہیں کرتے۔ ترک شکر کا انکار شکر کے حکم کو مستلزم ہے یعنی ان کو شکر کرنا چاہئے۔

سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ پاک ہے وہ ذات جس نے انواع و اصناف پیدا کئے زمین کی پیداوار میں سے بھی اور ان کے اندر سے بھی اور ان چیزوں میں سے بھی جن کو وہ نہیں جانتے۔

الْاَزْوَاجَ سے مراد ہیں انواع و اصناف۔

مَا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ یعنی سبزہ اور درخت

مِنْ اَنْفُسِهِمْ یعنی مرد عورت۔

مِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ یعنی بحر و بر کی وہ مخلوق جس کا علم کسی کو نہیں۔

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ ۚۖ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ۝ اور ان کے لئے (ہماری قدرت کی) ایک نشانی رات ہے جس (کے اوپر) سے ہم دن کی (چڑھی ہوئی) کھال اتار لیتے ہیں تو وہ یکایک تاریکی میں رہ جاتے ہیں۔

اصل تاریکی ہے۔ سورج نکلنے سے تاریکی پر دن کا خول چڑھ جاتا ہے جب سورج ڈوب جاتا ہے تو گویا رات کے اوپر سے (روشنی کی) کھال اتر جاتی ہے اور تاریکی سامنے آجاتی ہے۔ سلخ کا معنی ہے کھال اتارنا اس جگہ بطور استعارہ اتار لینا مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دن چلا جاتا ہے اور رات آجاتی ہے۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝ اور (قدرت کی ایک نشانی) سورج ہے جو اپنے ٹھکانے کی طرف چلتا رہتا ہے یہ اندازہ مقرر کیا ہوا اس خدا کا ہے جو غالب اور باعلم ہے۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ یعنی اپنے دائرہ کے اندر سورج اس طرح چلتا رہتا ہے جیسے پانی میں مچھلی یہ شب و روز کی پیدائش کی علت کا بیان ہے۔

لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا مستقر مصدر میمی ہے یعنی ایک طریقہ کی رفتار پر برقرار رہنے کے لئے۔ یا مستقر ظرف ہے یعنی دورے کا آخری نقطہ (جہاں ایک دورہ ختم ہوتا ہے) آفتاب کی سیر کو مسافر کی رفتار سے تشبیہ دی۔ جس طرح مسافر اپنا سفر طے کرتا اسی طرح سورج بھی اپنی رفتار جاری رکھتا ہے۔ یا مستقر سے مراد ہے زوال سے کچھ پہلے وسط سماء کا مرکزی نقطہ۔ اس جگہ پر سورج کی رفتار بہت سست پڑ جاتی ہے کہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ سورج ٹھہر گیا۔ یا مستقر سے مراد ہے گرمی کے موسم میں انتہائی بلندی پر پہنچ جانے کا اور سردی کے موسم میں آخری ہبوط (نزول) پر آجانے کا مقام۔ یا مستقر سے مراد ہیں مشارق و مغارب کا منتہا سورج کے پورے دورے میں ۳۶۵ طلوع ہونے کے مقامات اور اتنے ہی غروب ہونے کے مقامات ہوتے ہیں روزانہ نئے مطلع سے نکلتا اور نئے مغرب میں چھپتا ہے اور آئندہ سال تک نہ پھر اس مطلع سے طلوع ہوتا ہے نہ اس مغرب میں غروب ہوتا ہے یا مستقر سے مراد ہے دنیا کے تباہ ہونے کے وقت سورج کی رفتار ختم ہو جانے کا مقام۔

بظاہر سورج کی رفتار میں ٹھہراؤ اور وقفہ منزل نظر نہیں آتا اس لئے مذکورہ بالا تاویلوں کی ضرورت پڑی۔ حضرت ابن مسعود کی قرات سے اسی بات کی تائید ہوتی ہے کہ سورج کی کوئی قرارگاہ نہیں ہے۔ بغوی نے عمرو بن دینار کی روایت جو حضرت ابن عباس کے حوالے سے نقل کی ہے اس میں ہے کہ حضرت ابن مسعود نے وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لَا مُسْتَقَرَّ لَهَا پڑھا۔
لیکن صحیح حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سورج کا مستقر عرش کے نیچے ہے۔ رواه البخاری فی الصحیح۔
بغوی نے حضرت ابوذر کی روایت سے لکھا ہے کہ جس وقت سورج غروب ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ یہ کہاں چلا جاتا ہے؟ ابوذرؓ نے کہا میں نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول ﷺ ہی کو بخوبی علم ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا یہ جا کر عرش کے نیچے سجدہ کرتا ہے اور (آگے چلنے کی) اجازت طلب کرتا ہے اس کو اجازت دے دی جاتی ہے لیکن عنقریب ایسا وقت آئے گا کہ یہ سجدہ کرے گا اور سجدہ قبول نہ ہوگا۔ اور (آگے جانے کی) اجازت طلب کرے گا مگر اس کو اجازت نہیں ملے گی اور حکم دیا جائے گا کہ جہاں سے آیا ہے وہیں لوٹ جا چنانچہ وہ (لوٹ کر) مغرب سے طلوع ہوگا یہی (مطلب) ہے آیت وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا کا حضور ﷺ نے فرمایا اس کا مستقر عرش کے نیچے ہے۔ متفق علیہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ غروب ہونے کے بعد طلوع ہونے سے قبل سورج عرش کے نیچے سجدہ کرتا پھر اس کو مشرق سے طلوع ہونے کی اجازت مل جاتی ہے تو وہ طلوع ہو جاتا ہے لیکن عنقریب مشرق سے نکلنے کی اجازت اس کو نہیں ملے گی بلکہ مغرب سے برآمد ہونے کی اجازت ملے گی اور وہ مغرب سے نکلے گا۔ قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہوگی۔

ایک شبہ

ممالک کے اختلاف سے رات کی مقدار میں کمی بیشی ہوتی ہے غروب سے طلوع تک کا وقت سب جگہ برابر نہیں ہوتا جب سورج راس سرطان کے پاس ہوتا ہے تو قطب شمالی کے نیچے بلغار کے پار عشاء کا وقت ہی نہیں ہوتا غروب آفتاب کے بعد ایک طرف شفق غائب ہوتی ہے تو دوسری طرف سے صبح نکلتی ہوتی ہے۔ اتنا وقت ہی کہاں ہوتا ہے کہ سورج جا کر عرش کے نیچے پہنچ کر سجدہ کرے۔
میں کہتا ہوں یہ مراد ہے کہ وقت غروب سے وقت طلوع تک سورج برابر سجدہ میں رہتا ہے اس لئے ممکن ہے کہ کوئی وقت ایسا آتا ہو جس میں رات کی تاریکی ساری آباد دنیا میں ہو جاتی ہو اور یہ وقت وہی ہوگا جب سورج نصف دنیا پر پہنچا ہوگا۔ ایسے وقت موکل ملائکہ سورج کو لے جاتے ہوں گے اور عرش کے نیچے پہنچ کر سجدہ میں سر افگندہ ہو جاتا ہوگا پھر اس کو طلوع کی اجازت مل جاتی ہوگی۔ اختلاف ممالک کی وجہ سے رات کی مقدار کے اختلاف کا تعلق رات کی ابتداء اور انتہا سے ہے۔
بعض لوگ تحت العرش پہنچ کر سورج کے سجدہ کرنے کی حدیث کو متشابہات میں سے کہتے ہیں بعض لوگوں کے نزدیک سجدہ سے اطاعت اور فرماں برداری مراد ہے یہ دونوں قول ظاہر حدیث کے خلاف ہیں۔
ذٰلِكَ یعنی اس پر حکمت اندازہ کے مطابق سورج کی رفتار۔
تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ ایک ایسے خدا کی مقرر کردہ جو ساری کائنات پر غالب ہے اور ہمہ گیر علم رکھتا ہے۔
وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ۝ اور چاند کے لئے ہم نے منزلیں مقرر کیں یہاں تک کہ ایسا رہ جاتا ہے جیسے کھجور کی پرانی ٹہنی۔
یعنی ہم نے چاند کی سیرگاہ مقرر کی۔ اللہ نے چاند کی ۲۸ منزلیں مقرر کی ہیں ہر رات ایک منزل میں اترتا ہے کبھی اپنی منزل سے نہیں چوکتا۔ منزل تک پہنچنے سے قاصر رہتا ہے آخری منزل پر باریک اور خمیدہ ایسا ہو جاتا ہے جیسے کھجور کی پرانی خمیدہ ٹہنی۔ پھر محاق کی تاریخ کو سورج کی شعاعوں کے نیچے آجاتا ہے۔ (بالکل چھپ جاتا ہے)
لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۭ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝

نہ سورج کی مجال ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ (اگلی) رات دن سے پہلے آسکتی ہے اور دونوں (اپنے اپنے) دائرے میں تیر رہے ہیں۔

لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا یعنی سورج کے لئے صحیح نہیں۔ ممکن نہیں۔

اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ یعنی چاند کی تیز رفتاری کو سورج نہیں پہنچ سکتا۔ یہ تشریح بیضاوی نے کی ہے اور اس تشریح کی بناء فلاسفہ کے اس نظریہ پر ہے کہ چاند کی رفتار سورج کی رفتار سے بہت تیز ہے چاند کا دورہ ایک ماہ میں پورا ہو جاتا ہے اور سورج کا دورہ ایک سال میں ہوتا ہے۔

میرے نزدیک واقعہ اس کے برعکس ہے آئندہ ہم اس کی تفصیل بیان کریں گے۔ بہتر اور صحیح مطلب یہ ہے کہ چاند کی جو مخصوص رفتار ہے سورج اس کو پا نہیں سکتا یعنی دونوں کی رفتار متحد نہیں ہو سکتی اس سے نباتات کی پیدائش و افزائش اور حیوانات کی آسائش و زندگی میں خلل پڑ جاتا (نظام بگڑ جاتا) یا یہ مطلب کہ آثار و منافع میں سورج چاند کو نہیں پا سکتا یا اس کی جگہ اور مقام اور دائرہ عمل میں نہیں اتر سکتا کہ اس کے نور کو مٹادے میں کہتا ہوں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سورج سے مراد دن ہو اور چاند سے مراد رات۔ اس صورت میں تقابل صحیح ہو جائے گا یعنی دن رات سے آگے نہیں بڑھ سکتا اور نہ رات دن سے آگے بڑھ سکتی ہے بلکہ ایک مقرر حساب کے ساتھ ایک کے بعد دوسرا آتا ہے کوئی اپنے وقت سے پہلے نہیں آتا۔ بغوی کے کلام سے یہی مطلب مستفاد ہوتا ہے۔

وَكُلٌّ اور دونوں میں سے ہر ایک۔ بیضاوی نے لکھا ہے کہ کُلٌّ سے تمام سورج اور چاند مراد ہیں چونکہ احوال مختلف ہیں اور اختلاف احوال سے سورجوں اور چاندوں کا فی الجملہ تعدد ہو جاتا ہے یا سورج و چاند کے ذیل میں چونکہ ستاروں کا بھی ذکر آگیا اس لئے کواکب کی طرف ضمیر راجع ہے۔

فِي فَلَكٍ یعنی ایک آسمان میں اس سے مراد آسمان دنیا ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ۔

يَّسْبَحُوْنَ یعنی مچھلی کی طرح تیرتے ہیں۔

آیت صراحتاً بتارہی ہے کہ چاند سورج اور ستارے آسمان میں قسری (یعنی ملائکہ کے زور سے) یا بالارادہ چل رہے ہیں کیلوں کی طرح جڑے ہوئے نہیں ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ آسمان کی حرکت سے ان کی حرکت ہو رہی ہو اور حرکت وضعی ہو (یعنی تمام سیاروں کی حرکت اپنی اور مکانی ہے حرکت وضعی نہیں ہے) فلاسفہ سیاروں کی حرکت وضعی کے قائل ہیں کیونکہ سیاروں کی حرکت اینیہ سے فلک کا پھٹنا اور جڑنا لازم آئے گا اور آسمان میں خرق والتیام محال ہے۔

فلاسفہ کواکب کی حرکات کے تعدد سے افلاک کے تعدد کو ثابت کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ کواکب کی جتنی حرکات ہیں اتنے ہی افلاک ہیں چنانچہ افلاک کی تعداد انہوں نے نو بتائی اور پیاز کے چھلکوں کی طرح ہر فلک کو دوسرے فلک سے پیوستہ چسپاں اور محیط کہا ہے بالاترین نویں آسمان (فلک الافلاک محدد جہات) کو وہ محیط کل قرار دیتے ہیں جو مشرق سے مغرب کی طرف ایک منطقہ اور دو قطبوں پر حرکت کر رہا ہے اس کا چکر ہر رات دن میں تقریباً ایک بار پورا ہو جاتا ہے۔ باقی آسمانوں کی دو قسم کی حرکات ہیں ایک حرکت تو حرکت قسری ہے جو فلک الافلاک کی حرکت کے تابع ہے یعنی مشرق سے مغرب کی طرف فلک الافلاک کے ساتھ یہ حرکت کر رہے ہیں ان کی دوسری حرکت ذاتی اور طبعی ہے جو مغرب سے مشرق کی جانب ہے اس حرکت کا منطقہ بھی فلک الافلاک کی حرکت کے منطقہ سے جدا ہے اور قطبین بھی دوسرے ہیں۔ چاروں قطب یعنی دو قطب فلک الافلاک کے اور دو قطب فلک ثوابت (آٹھویں فلک) کے باہم تقاطع کرتے ہیں اور سورج فلک ثوابت کے منطقہ کا تابع ہے۔ فلک ثوابت کو فلک البروج بھی کہتے ہیں کیونکہ فلک ثوابت کے منطقہ کے بارہ حصے ہیں۔ ہر حصے کو برج کہا جاتا ہے چونکہ سبعہ سیارہ (قمر عطارد زہرہ شمس مریخ مشتری زحل) کے علاوہ باقی کواکب کی نسبت نہیں بدلتی جتنا ان کا باہم قرب و بعد ہے وہ برابر قائم رہتا ہے۔ اور ایک دن رات میں ان کا دورہ پورا نہیں ہوتا کچھ کم رہ جاتا ہے اگرچہ یہ کمی بہت ہی خفیف ہوتی ہے مگر ہوتی

ضرور ہے اس لئے سیارات کے علاوہ کواکب کو وہ ایک فلک (یعنی فلک ثوابت) میں جڑا ہوا اور کیلوں کی طرح گڑا ہوا مانتے ہیں۔

یہ مشاہدہ ہے کہ سبعہ سیارہ کا دورہ ایک رات دن میں پورا نہیں ہوتا چاند کا مکمل دورہ ۳۰ یا ۲۹ دن میں ہوتا اور سورج کا پورا چکر ۳۶۵ یا ۳۶۶ دن میں ہوتا ہے اور اسی طرح دوسرے سیاروں کے دورے کی حالت ہے اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ ساتوں سیاروں کی رفتار مغرب سے مشرق کی طرف ہے اس لئے ایک رات دن میں ان کی رفتار پورے چکر سے کسی قدر کم ہوتی ہے اب یہ بات چونکہ مشاہدہ سے ثابت ہے کہ فلک قمر کا چکر مشرق سے ایک ماہ میں پورا ہو جاتا ہے اس لئے فلک قمر کی رفتار کو علماء ہیئت زیادہ تیز مانتے تھے اور فلک شمس کا چکر تین سو پینسٹھ دن میں پورا ہوتا ہے اس لئے چاند کے مقابلہ میں سورج کی رفتار کو سست قرار دیتے تھے۔ باقی سیاروں کی رفتار کی بھی یہی حالت ہے۔

پانچ سیاروں کو خمسہ متحیرہ کہا جاتا تھا عطارد، زہرہ، مشتری، مریخ، زحل ان پانچوں کی رفتار کبھی پورے دائرہ سے زائد ہوتی ہے کبھی دائرہ سے کم اور کبھی پورا ایک چکر نہ دائرہ سے کم نہ زیادہ اس لئے ان کو خمسہ متحیرہ کہا جاتا تھا بر قول علماء ہیئت ان کی تدویرات ہیں۔ بالا تدویر کی رفتار زیریں تدویر کی رفتار کے مخالف ہے۔ یہ سب اقوال اہل ہیئت کے ہیں جن کو علماء ہیئت نے اپنے دلائل سے ثابت کیا ہے۔

لیکن قرآن کی نصوص قطعیہ بتا رہی ہیں کہ آسمان سات ہیں اس سے زائد نہیں ہیں۔ اس کا منکر کافر ہو جاتا ہے۔ ہر آسمان کا پھٹنا اور جڑنا جائز ہے بلکہ آسمان ضرور پھٹے گا اس کا منکر کافر ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ وَاِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ۔ اِنْشَقَّ الْقَمَرُ وغیرہ

صحیح احادیث میں آیا ہے کہ آسمان باہم چسپاں نہیں ہے بلکہ ہر آسمان دوسرے آسمان سے بہت دور ہے جو شخص آسمانوں کو باہم چسپاں کہتا ہے وہ فاسق ہے (اخبار آحاد کا منکر فاسق ہوتا ہے اور نصوص قطعیہ کا منکر کافر)

امام احمد اور ترمذی نے حضرت ابوہریرہ کی مرفوع روایت بیان کی ہے۔ حدیث طویل ہے جس میں یہ بھی فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آسمانوں کی درمیانی مسافت کا ذکر کیا اور فرمایا ہر آسمان کی دوسرے آسمان سے دوری پانچ سو برس کی (راہ) ہے۔ ترمذی اور ابوداؤد نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے ایک طویل حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا زمین سے آسمان تک کا فاصلہ اور ہر آسمان کی دوسری آسمان سے دوری اکہتر یا بہتر یا تہتر برس کی (راہ کے برابر) ہے۔ شاید یہ عددی اختلاف کا چلنے والوں کی رفتار کی تیزی اور سستی کی بناء پر ذکر فرمایا۔ (از مفسر قدس سرہ)

آیات و احادیث مذکورہ سے ثابت ہو رہا ہے کہ علماء ہیئت کے مفروضات غلط ہیں جو شخص ان کو صحیح خیال کرتا ہے اس کے کافر ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

جب آسمانوں کا پھٹنا اور جڑنا جائز قرار پایا تو اب کہا جا سکتا ہے کہ سب کواکب آسمان دنیا میں ہیں (اس قول سے کوئی امر مانع نہیں رہا) اللہ نے خود فرمایا ہے وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ اور دوسری آیت میں فرمایا كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اکثر ستاروں کی رفتار کی مقدار تقریباً برابر ہے یعنی پورا دائرہ (یعنی مکمل دورہ کا وقت تقریباً برابر ہے) اور یہ امر بھی ماننے سے کوئی خرابی لازم نہیں آئی کہ حسب مشاہدہ سبعہ سیارہ کی رفتار کی مقدار مختلف ہو اور خمسہ متحیرہ کی رفتار بھی زائد ہو اور کبھی کم۔ انہیں پانچ سیاروں کو (جن کی رفتار میں کمی کبھی بیشی ہوتی ہے) آیت میں اَلْخُنَّسِ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ کہا گیا ہے۔ واللہ اعلم۔

وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۴۱﴾ وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ ﴿۴۲﴾

اور (اللہ کی قدرت کی) ان کے لئے ایک بڑی نشانی یہ ہے کہ ہم نے ان کی اولاد کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا۔

بظاہر ذریت سے مرد لڑکے ہیں جو تجارتی سفر میں ساتھ جاتے ہیں یا بچے اور عورتیں مراد ہیں جن کو لوگ اپنے ساتھ

سفر میں لے جاتے ہیں۔ ذریت کا اطلاق عورتوں پر بھی ہوتا ہے حدیث میں آیا ہے کہ ایک عورت کو مقتول پاکر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ تو لڑنے کی اہل نہ تھی۔ خالد سے جاکر کہہ دو کہ ذریت کو اور مزدوروں کو قتل نہ کرے۔ چونکہ عورت کو مقتول پاکر رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا تھا اس لئے ذریت سے مراد عورتیں ہی ہیں۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا ذریت کے ساتھ حج کر وان کی روزی نہ کھاؤ اور نہ ان کی گردنوں میں پڑی ہوئی رسیاں چھوڑ دو (گلے میں پڑی ہوئی رسیوں سے مراد فریضہ حج ہے) یعنی عورتوں کو ساتھ لے کر حج کرو۔ کذافی النہایہ

الْفُلْكِ سے مراد ہیں کشتیاں جہاز۔ ذریت کا خصوصی ذکر اس لئے کیا کہ کشتیوں میں جم کر اور استقرار کے ساتھ بیٹھنا ان کے لئے نہایت دشوار ہوتا ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ الفلک سے مراد حضرت نوح کی کشتی ہے اور ذریت سے مراد ہیں آباء واجداد ذریت کا اطلاق جیسے اولاد پر ہوتا ہے اسی طرح آباء پر بھی ہوتا ہے۔ بیضاوی نے لکھا ہے اگر کشتی نوح مراد ہو تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ نے نوح کی کشتی میں ان کے آباء کو اس وقت سوار کیا جب ساری ذریت ان کی پشت میں تھی اس وقت ذریت کا خصوصی ذکر اس لئے کیا گیا کہ ایجاز اور اختصار عبارت کے ساتھ کامل منت نمی اور تعجب کا پرزور اظہار ہو جائے۔

وَمِنْ مِّثْلِهٖ یعنی عام کشتیوں کی طرح یا کشتی نوح کی طرح۔

مَا يَرْكَبُوْنَ اللہ نے سواریاں پیدا کر دیں سواریوں سے مراد ہیں اونٹ۔ اونٹ ریگستان کے جہاز ہوتے ہیں یا یہ مطلب ہے کہ کشتی نوح کی شکل کی اللہ نے دوسری کشتیاں اور ڈونگے پیدا کر دیے۔

وَاِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ اور اگر ہم چاہیں تو ان کو ڈبو دیں۔

فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ پھر ان کا کوئی فریاد رس بھی نہ ہوگا جو غرق ہونے سے بچا سکے یا صریخ سے مراد ہے استغاثہ فریاد یعنی فریاد بھی نہ کر سکیں گے۔

وَلَا هُمْ يُنْقَذُوْنَ ۝ اور نہ (ڈوبنے سے) وہ نجات پا سکیں گے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا کوئی بھی ان کو میرے عذاب سے نہ بچا سکے گا۔

اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ۝ مگر ہماری رحمت سے اور ایک مقرر وقت تک فائدہ اٹھانے کے لئے۔

حِيْنٍ سے مراد ہے مدت زندگی جو اللہ نے مقرر کر دی ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّقُوْا مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ وَمَا خَلْفَكُمْ اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ اس عذاب سے ڈرو جو تمہارے آگے ہے اور اس عذاب سے بھی جو تمہارے پیچھے ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ سے مراد ہے آخرت اور مَا خَلْفَكُمْ سے مراد ہے دنیا یعنی آخرت کے لئے عمل کرو اور دنیا سے ہوشیار ہو اس پر فریفتہ نہ ہو۔ قتادہ نے کہا مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ سے مراد ہیں وہ بربادی و تباہی کے واقعات جو گذشتہ امتوں کو پیش آئے اور مَا خَلْفَكُمْ سے مراد ہے عذاب آخرت۔ بعض نے کہا حوادث سماوی ارضی مراد ہیں اللہ نے ایک اور آیت میں فرمایا ہے اَوَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ۔

بعض نے کہا اول سے مراد عذاب دنیا ہے اور دوسرے سے مراد عذاب آخرت۔ بعض نے اس کے برعکس کہا ہے بعض نے کہا اگلے پچھلے گناہ مراد ہیں۔

لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ تاکہ تم پر رحم کیا جائے یعنی تاکہ تم اللہ کی رحمت کے امیدوار ہو جاؤ۔

اِذَا قِيْلَ کا جواب محذوف ہے یعنی جب ان سے یہ بات کہی جاتی ہے تو وہ منہ پھیر لیتے ہیں پرواہ نہیں کرتے۔ اگلی متصل آیت اس جواب کو محذوف قرار دینے کا قرینہ ہے۔

وَمَا تَأْتِيهِمْ مِنْ آيَةٍ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِمْ إِلَّا كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ۝ اور ان کے رب کی آیات میں سے کوئی آیت ان کے سامنے نہیں آتی مگر یہ اس کی طرف سے رخ گرداں ہو جاتے ہیں۔

یہ آیت سابق آیت کی علت کے طور پر ذکر کی گئی ہے یعنی جب ان سے ڈرنے کے لئے کہا جاتا ہے تو وہ رخ پھیر لیتے ہیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ رب کی ہر آیت سے وہ اعراض کرتے ہیں یعنی اعراض کرنے اور رخ پھیرنے کے عادی ہیں۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنُطْعِمُ مَنْ لَوْ يَشَاءُ اللَّهُ أَطْعَمَهُ ۚ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو مال تم کو عطا فرمایا ہے اس میں سے کچھ راہ خدا میں خرچ کرو تو یہ کافر مسلمانوں سے کہتے ہیں کیا ہم ایسے لوگوں کو کھانے کو دیں کہ اگر اللہ چاہے تو ان کو کھانے کو دے دے۔

أَنْفِقُوا یعنی غریبوں کو دو۔

أَنُطْعِمُ مَنْ لَوْ يَشَاءُ اللَّهُ أَطْعَمَهُ یعنی اللہ نے باوجود قدرت رکھنے کے ان کو کھانے کو نہیں دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی مشیت ہی نہیں ہے کہ ان کو کھانے کو دیا جائے اس لئے اللہ کی مشیت کے موافق ہم بھی ان کو کچھ نہیں دیتے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ غریب مسلمانوں نے کفار قریش سے جب کچھ مانگا تو انہوں نے یہ جواب دیا۔ (اخرجہ ابن ابی حاتم عن الحسن و ابن المنذر و عبد بن حمید عن اسماعیل بن خالد)

کافروں کا یہ قول غلط تھا اللہ نے بعض لوگوں کو مال دار بنایا ہے اور بعض کو نادار غریب کو مالدار اس لئے نہیں کیا کہ نعوذ باللہ خدا بخیل ہے بلکہ مال دار کا امتحان مقصود ہے۔ اللہ غنی کا محتاج نہیں ہے لیکن اس نے بطور آزمائش مال داروں کو حکم دیا ہے کہ وہ کچھ مال غریبوں کو دیں۔ اللہ کی مشیت کو بہانہ بنانا اور اس پر اعتراض کرنا صحیح نہیں ہے۔ فعل الٰہی کی حکمت کا علم تک عقل کی رسائی نہیں ہے۔ (مترجم کہتا ہے کہ کافروں نے اللہ کے حکم اور مشیت میں فرق نہیں کیا بندہ اس کا مکلف نہیں ہے کہ مشیت خدا کے موافق کام کرے کیونکہ اس کو مشیت کا علم ہی نہیں ہے بلکہ بندہ احکام خدا کا مکلف ہے حکم کی تعمیل اس کا فرض ہے بے شک مال داری اور ناداری اللہ کی مشیت کے تابع ہیں لیکن غریبوں کی مدد کرنے کا اللہ نے مال داروں کو حکم دیا ہے اس لئے مال داروں پر محتاجوں کی امداد فرض ہے یہ معلوم نہیں کہ مفلسوں کو غریب رکھنا ہی خدا کی مشیت ہے۔ ممکن ہے مالداروں سے غریبوں کی امداد کرانا بھی اس کی مشیت میں ہو مشیت کو بہانہ بنا کر تعمیل حکم سے گریز کرنا علامت کفر ہے)

إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ۝ (یہ قول بھی اگر کافروں کا مانا جائے تو ترجمہ اس طرح ہو گا۔ اے مسلمانو!) تم جو ہم کو غریبوں کی مدد کا مشورہ دے رہے ہو تو) تم کھلی ہوئی صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہو۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ جملہ کافروں کے قول کا تتمہ نہ ہو بلکہ اللہ کی طرف سے کافروں کی بات کا جواب ہو یا جو جواب مسلمانوں نے کافروں کو دیا تھا اس کا بیان ہو۔

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ اور یہ کافر کہتے ہیں کہ (قیامت آنے کا) یہ وعدہ کب پورا ہو گا اگر سچے ہو تو اس کے آنے کا وقت بتاؤ کافروں کا یہ خطاب رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں سے تھا۔

مَا يَنْظُرُونَ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً تَأْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُونَ ۝ یہ لوگ بس ایک سخت آواز کے منتظر ہیں جو ان کو آپکڑے گی ایسی حالت میں کہ وہ جھگڑ رہے ہوں گے۔

صَيْحَةً وَاحِدَةً سے حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک پہلی بار صور پھونکا جانا مراد ہے۔

ایک شبہ

کافروں کا تو صور پھونکے جانے کا عقیدہ ہی نہ تھا پھر نفخہ صور کا انتظار کرنے کا کیا معنی۔

ازالہ

انتظار کرتے سے مراد ہے گناہوں کو اس وقت تک ترک نہ کرنا کہ موت آجائے یا اچانک قیامت واقع ہو جائے جب انہوں نے ساری عمر گناہ ترک نہ کیے تو در پردہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ گناہوں کو چھوڑ دینے کے لئے گویا وہ صور کی آواز کے منتظر ہیں۔

وَهُمْ يَخِصِّمُوْنَ یعنی ایسی حالت میں صور کی آواز آجائے کہ وہ دنیوی کاروبار میں مشغول ہوں لین دین کھیتی باڑی اور دوسرے معاملات میں باہم جھگڑے کر رہے ہوں اور دل میں قیامت برپا ہونے کا کوئی خیال بھی نہ ہو۔

شیخین نے صحیحین میں بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت ایسی حالت میں آجائے گی کہ دو آدمی (بائع اور مشتری) کپڑا پھیلائے ہوئے خرید و فروخت میں مشغول ہوں گے نہ عقد کو ختم کر چکے ہوں گے نہ کپڑے کو لپیٹ چکے ہوں گے (کہ اچانک صور کی آواز سنائی دے گی) اور قیامت ایسی حالت میں آجائے گی کہ آدمی اپنی اونٹنی کا دودھ لے کر واپس آ رہا ہوگا اور کھانے نہ پائے گا اور قیامت ایسی حالت میں آجائے گی کہ آدمی نے لقمہ اٹھا کر منہ میں رکھ لیا ہوگا اور کھانہ سکا ہوگا (کہ قیامت برپا ہو جائے گی) کذا رواہ ابو ہریرہؓ

فریابی کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت ایسی حالت میں برپا ہو جائے گی کہ لوگ بازاروں میں خرید و فروخت کر رہے ہوں گے کپڑے ناپ رہے ہوں گے اونٹنیاں دوہ رہے ہوں گے اور دوسرے کاموں میں مشغول ہوں گے۔

فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً وَّلَآ اِلٰٓى اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ ۝ پھر وہ کوئی وصیت بھی نہ کر سکیں گے اور نہ اپنے گھر والوں کے پاس لوٹ پائیں گے۔

عبداللہ بن احمد نے زوائد الزہد میں حضرت زبیر بن عوام کی روایت سے بیان کیا ہے قیامت ایسی حالت میں برپا ہو جائے گی کہ (کوئی) آدمی کپڑا ناپ رہا ہوگا اور (کوئی) آدمی اونٹنی کو دوہ رہا ہوگا پھر آپ نے یہ آیت پڑھی فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً وَّلَآ اِلٰٓى اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ۔

بعض لوگ اپنے کسی معاملہ میں وصیت بھی نہ کر سکیں گے اور گھر بھی لوٹ نہ پائیں گے کہ گھر والوں کی حالت دیکھ سکیں بلکہ صور کی آواز سنتے ہی مر جائیں گے۔

وَنُفِخَ فِى الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ ۝ اور (دوبارہ) صور پھونکا جائے گا سو وہ سب یکدم قبروں سے نکل نکل کر اپنے رب کی طرف جلدی جلدی چلنے لگیں گے۔

چونکہ صور کا پھونکا جانا یقینی ہے اس لئے نُفِخَ ماضی کا صیغہ استعمال کیا یعنی لوگ مر جائیں گے پھر دوبارہ صور پھونکا جائے گا۔ پہلی اور دوسری مرتبہ نفخۂ صور کے درمیان چالیس سال کا فصل ہوگا۔ ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ کی طرف اس قول کی نسبت کی ہے۔

صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دونوں نفخوں میں چالیس کی مدت ہوگی۔ حاضرین نے حضرت ابوہریرہؓ سے پوچھا کیا چالیس دن کی ہوگی؟ حضرت ابوہریرہؓ نے کہا مجھے (اس کو ماننے سے) انکار ہے لوگوں نے کہا تو کیا چالیس ماہ کی مدت ہوگی۔ حضرت ابوہریرہؓ نے کہا مجھے اس سے بھی انکار ہے لوگوں نے (آخر میں) کہا چالیس سال مراد ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ نے کہا میں یہ بھی نہیں مانتا (یعنی حضور ﷺ نے کوئی تعیین نہیں کی اس لئے مجھے نہیں معلوم کہ دن مراد ہیں یا مہینے یا سال) الحدیث۔ لیکن ابن ابی داؤد نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے جو مرفوع حدیث نقل کی ہے اس میں چالیس سال کا لفظ ہے۔

الْاَجْدَاثِ جدث کی جمع ہے، جدث بمعنی قبر۔

يَنْسِلُوْنَ نکل پڑیں گے نسل کا اصل لغوی معنی ہے کسی چیز کا کسی چیز سے الگ ہو جانا۔ نسل الوبر من البعیر اونٹ سے اون جدا ہو گئی۔ اولاد کو نسل اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ باپ سے ہی جدا ہوتی ہے۔ بعض اہل علم نے يَنْسِلُوْنَ کا ترجمہ کیا

تیز دوڑیں گے۔ قاموس میں یَنْسُلُ اور یَنْسِلُ وہ تیز دوڑتا ہے نسل نسیل اور نسلان مصدر ہے۔

قَالُوا يَا وَيْلَنَا مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَرْقَدِنَا　وہ کہیں گے ہائے ہماری کم بختی ہم کو ہماری خوابگاہ سے کس نے اٹھا دیا۔

یعنی کافر کہیں گے یقینی ہونے کی وجہ سے مستقبل کی جگہ قَالُوْا ماضی کا صیغہ استعمال کیا۔

ویل مصدر ہے اس سے فعل مشتق نہیں ہوتا۔ صاحب قاموس نے ویل کا معنی طول شر لکھا ہے بعض اہل تحقیق کا قول ہے کہ لغت میں اس معنی کے لئے ویل کا لفظ وضع نہیں کیا گیا بلکہ یہ جہنم کی ایک وادی کا نام ہے۔

امام احمد ترمذی، ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن حبان، حاکم بیہقی ابن ابی الدنیا اور ہناد نے حضرت ابو سعید خدری کی روایت سے بیان کیا ہے اور حاکم نے اس حدیث کو صحیح بھی کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ویل جہنم کے اندر وادی ہے جس میں کافر چالیس برس تک (نیچے کو) تہ تک پہنچنے سے پہلے لڑکتا چلا جائے گا۔ (یعنی چالیس برس تک لڑکتا ہوا تہ میں پہنچے گا)

سعید بن منصور ابن المنذر اور بیہقی نے حضرت ابن مسعود کی روایت سے بیان کیا ہے۔ ویل جہنم کے اندر ایک وادی ہے جس میں دوزخیوں کا کچ لہو بہہ کر آتا ہے یہ وادی (اللہ کے رسول کی) تکذیب کرنے والوں کے لئے بنائی گئی ہے۔ ابن جریر نے حضرت عثمان بن عفان کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ویل دوزخ کے اندر ایک پہاڑ ہے۔ بزار نے ضعیف سند سے حضرت سعد بن ابی وقاص کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دوزخ میں ایک پتھر (یعنی پہاڑ) ہے جس کو ویل کہا جاتا ہے اس پر عرفاء چڑھیں گے اور اتریں گے۔

مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَرْقَدِنَا حضرت ابن عباس اور قتادہ نے فرمایا کافروں کے اس قول کی وجہ یہ ہوگی کہ دونوں نفخوں کی درمیانی مدت میں ان پر سے عذاب اٹھا لیا جائے گا اور وہ سو جائیں گے دوسری مرتبہ نفخ صور کے بعد جب اٹھیں گے تو یہ بات کہیں گے۔

معتزلہ عذاب قبر کے منکر ہیں ان کے قول کی تردید حضرت ابن عباسؓ کی اس تفسیر سے ہو رہی ہے معتزلہ نے اس آیت سے عذاب قبر کی نفی پر استدلال کیا ہے (کیونکہ آیت میں لفظ مرقد آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر مرنے کے بعد سو جاتا ہے یا سوتے ہوئے آدمی کی طرح ہو جاتا ہے حضرت ابن عباسؓ کے قول سے اس کی تردید ہو رہی ہے کیونکہ آپ نے مدت خواب دونوں نفخوں کے درمیانی وقفہ کو قرار دیا جو چالیس سال کا ہوگا۔ مترجم)

اہل حقیقت کہتے ہیں کہ کافر جب جہنم کے گوناگوں عذاب کو دیکھیں گے تو عذاب جہنم کے مقابلہ میں ان کو قبر کا عذاب خواب کی طرح محسوس ہوگا اس وقت کہیں گے کہ ہم کو خواب سے کس نے اٹھایا۔

هَذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمَنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُونَ　یہ وہی ہے جس کا اللہ نے وعدہ کیا تھا اور پیغمبروں نے سچ کہا تھا۔

کافروں کی طرف سے اس وقت وجود قیامت (اور صداقت انبیاء) کا اقرار ہوگا لیکن بے سود۔

بعض نے کہا یہ قول ملائکہ کا ہوگا کافروں کے کلام کا جواب دیں گے۔ مجاہد نے کہا کافروں کی بات کا یہ جواب مومن دیں گے۔ کلام مذکور میں طرز جواب اختیار نہیں کیا اس سے مقصود ہوگا ان کو کفر کی یاد دہانی کرنی اور اس بات پر تنبیہ کرنی کہ زندہ کر کے اٹھانے والا کون ہے یہ سوال بے کار ہے اصل اہمیت اس کی ہے کہ وہ دریافت کریں کہ کیا ان کو زندہ کر کے اٹھا دیا گیا اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا اللہ نے جو تم سے دوبارہ زندہ کرنے کا وعدہ کیا تھا وہ اس نے پورا کر دیا اور پیغمبروں نے جو کچھ تم سے کہا تھا وہ سچ کہا تھا واقعی تم کو زندہ کر کے اٹھا دیا گیا تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ تم کو نیند سے جگایا گیا ہے یہ بعث اکبر ہے جو کچھ ہو لیا کیوں کا حامل ہے کس نے زندہ کیا یہ سوال فضول ہے۔

إِنْ كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً فَإِذَا هُمْ جَمِيعٌ لَدَيْنَا مُحْضَرُونَ　وہ بس ایک چیخ ہوگی

فوراً سب کے سب ہمارے سامنے حاضر کر دیے جائیں گے یعنی حشر کا واقعہ بڑا ہولناک ہو گا۔ دنیا میں تو بغیر اسباب کے کچھ نہیں ہوتا لیکن قیامت کے دن بعث و حشر کے لئے اسباب کی ضرورت نہیں ہو گی۔

فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَلَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝ سو اس روز کسی پر کوئی ظلم نہ ہو گا اور صرف اسی کام کو بدلہ دیا جائے گا جو تم کرتے تھے۔

قیامت کے دن جو باتیں ان سے کہی جائے گی اس کو نقل کیا گیا تاکہ اللہ نے جو کچھ وعدہ کیا ہے اس کی تصویر کشی ہو جائے اور دلوں میں اس کا تصور جم جائے۔

إِنَّ أَصْحَابَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِي شُغُلٍ فَاكِهُونَ ۝ اہل جنت اس دن بلا شبہ (اپنے) مشغلوں میں خوش دل ہوں گے۔

شغل سے کیا مراد ہے اہل تفسیر کا اس میں اختلاف ہے۔

دوشیزہ عورتوں سے صحبت مراد ہے (حضرت ابن عباس) یا سماع مراد ہے (وکیع بن جراح) شغل سے مراد یہ ہے کہ دوزخیوں کی اور ان کے احوال کی ان کو پرواہ نہ ہو گی وہ دوزخیوں کو یاد بھی نہیں کریں گے (کلبی) جنت کی نعمتوں اور راحتوں میں ایسے مشغول ہوں گے کہ دوزخیوں کے عذاب کا ان کو خیال بھی نہ ہو گا (حسن) سب اللہ کی مہمانی میں ہوں گے اور باہم ملاقاتیں کریں گے (ابن کیسان)

اولیٰ یہ ہے کہ (کوئی خاص مشغلہ نامزد نہ کیا جائے بلکہ یوں) کہا جائے کہ اپنے اپنے پسندیدہ مرغوب کاموں میں مشغول ہوں گے۔

صوفیہ کا مقصود سوائے ذات خداوندی کے اور کچھ نہیں اس لئے اپنے اپنے درجات کے مطابق یہ گروہ اللہ کی ذاتی نور پاشیوں میں غرق ہوں گے (جنت کی اور کوئی نعمت سوائے تجلیات ذاتیہ کے اپنی طرف ان کو مائل نہ کر سکے گی) دوسرے اہل جنت کے مشاغل مختلف ہوں گے کھانا پینا گانا سننا عورتوں سے قربت اور خواہشات کے مطابق دوسرے مشاغل میں انہماک ان کا پسندیدہ عمل ہو گا۔ ابو نعیم نے ہمارے شیخ طریقت بایزید بسطامی کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ کے کچھ خاص بندے ایسے بھی ہیں جن سے اللہ اگر اوٹ کرے گا تو جس طرح دوزخی دوزخ سے نکلنے کے لئے فریاد کریں گے اسی طرح وہ جنت کے اندر حجاب دیدار سے نکلنے کے لئے فریاد کریں گے۔

شُغُلٍ میں تنوین تنکیر اظہار عظمت کے لئے ہے یعنی جنت کے اندر اہل جنت کے لئے عظیم الشان خوشی اور لذت ہو گی اتنی کہ نہ وہ احاطۂ فہم کے اندر آسکتی ہے نہ اس کی حقیقت کو الفاظ میں ظاہر کیا جا سکتا ہے۔

فَاكِهُونَ فکاہت سے مشتق ہے یعنی وہ مزے اور عیش میں ہوں گے۔ مجاہد اور ضحاک نے کہا جن نعمتوں میں ہوں گے اترانے کی حد تک خوش ہوں گے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا وہ خوشی میں پھولے نہیں سمائیں گے۔

هُمْ وَأَزْوَاجُهُمْ فِي ظِلَالٍ عَلَى الْأَرَائِكِ مُتَّكِئُونَ ۝ وہ اور ان کی بیبیاں سایوں میں مسہریوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے۔

ظِلَالٍ ظل کی جمع ہے جہاں دھوپ نہ پڑے اس کو ظل کہتے ہیں (یعنی سایہ) یا ظلہ کی جمع ہے ظلہ سائبان دھوپ سے بچانے والی چیز کو کہتے ہیں جیسے زیر خیمہ۔

أَرَائِكُ اریکۃ کی جمع ہے پردے دار مسہریاں۔ بغوی نے ثعلب کا قول بیان کیا ہے کہ اریکہ بغیر پردہ کی مسہری کو نہیں کہتے۔ بیہقی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ سریر (تخت، مسہری) جب تک پردہ کے اندر نہ ہو اس وقت تک لفظ اریکہ اس کے لئے نہیں بولا جاتا۔ بغیر پردہ کا سریر اریکہ نہیں ہوتا اور اگر صرف پردہ ہی ہو اندر سریر نہ ہو اس کو بھی اریکہ نہیں کہا جاتا۔ سریر مع پردہ کے ہو تو اس کو اریکہ کہتے ہیں۔ بیہقی نے مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ وہ مسہریاں موتی اور یاقوت کی ہوں گی۔

لَهُمْ فِيهَا فَاكِهَةٌ وَلَهُمْ مَّا يَدَّعُونَ ﴿٥٧﴾ ان کے لئے وہاں (ہر قسم کے) میوے ہوں گے اور جو چاہ طلب کریں گے وہ ان کو ملے گا۔

یعنی اپنے لئے جو کچھ مانگیں گے ان کو ملے گا۔ اس ترجمہ پر لفظ یَدَّعُوْنَ دعا (طلب) سے ماخوذ ہوگا۔

مَا يَدَّعُوْنَ: ادع علی ماشئت سے ماخوذ ہے یعنی جس چیز کی ان کو تمنا ہوگی ان کو ملے گی یا یہ مطلب ہے کہ دنیا میں جس جنت اور مراتب جنت کی آرزو اور طلب تھی وہ ان کو ملے گی۔

سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيمٍ ﴿٥٨﴾ ان کو رحمت والے رب کی طرف سے سلام فرمایا جائے گا۔

یعنی اللہ براہ راست ان کو سلام فرمائے گا یا ملائکہ کے ذریعہ سے اللہ کا سلام ان کو پہنچے گا اور یہی ان کا مقصود اور تمنا ہوگی۔

ابن ماجہ، ابن ابی الدنیا اجری اور دار قطنی نے حضرت جابرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اہل جنت اپنے عیش میں ہوں گے اسی اثناء میں ایک نور ان پر جلوہ انداز ہوگا۔ اہل جنت سر اٹھا کر دیکھیں گے تو اوپر سے باری تعالیٰ جلوہ دار نظر آئے گا اور فرمائے گا اے اہل جنت تم پر سلام ہو یہی (بیان ہے آیت) سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيمٍ (میں) حضور ﷺ نے فرمایا اہل جنت اس کی طرف دیکھیں گے اور وہ اہل جنت کا نظارہ کرے گا ایسی حالت میں جنت والے کسی اور چیز کی طرف گوشہ چشم سے بھی نہیں دیکھیں گے۔ اسی کی طرف دیکھتے رہیں گے یہاں تک کہ وہ خود اوٹ کر لے گا لیکن اس کا نور اور برکت ان کے گھروں میں باقی رہے گی۔

سیوطی نے کہا اللہ کا جھانکنا حلول اور مکان سے پاک ہے۔ (یعنی کسی آدمی کے دیکھنے کے لئے کسی مقام کی اور حلول مکانی کی ضرورت ہے لیکن اللہ ہر جسمانیت اور لوازم جسمانیت سے پاک ہے اس لئے جھانکنے کے لئے اس کو نہ مقام کی ضرورت ہے نہ حلول کی۔ اس لئے مترجم نے اشراف اور اطلاع یعنی جھانکنے کا ترجمہ جلوہ اندوز ہونا کیا ہے)

بغوی نے لکھا ہے کہ رب کی طرف سے فرشتے اہل جنت کو سلام پہنچائیں گے۔ مقاتل نے کہا جنت کے ہر دروازہ سے ملائکہ یہ کہتے ہوئے داخل ہوں گے اے اہل جنت تم پر تمہارے رب رحیم کی طرف سے سلامتی ہے دوامی سلامتی ہے۔

وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ ﴿٥٩﴾ اور اے مجرموں آج الگ ہو جاؤ۔ مقاتل، سدی اور زجاج نے کہا یعنی صالحین سے الگ ہو جاؤ۔ مطلب یہ ہے کہ مومنوں کو جنت کی طرف اور مجرموں کو دوزخ کی طرف بھیج دیا جائے گا۔

ضحاک نے کہا ہر کافر کا دوزخ میں ایک گھر ہوگا جس میں وہ داخل ہو جائے گا اور داخلہ کے بعد آگ کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا جائے گا۔ نہ اندر سے باہر دیکھ سکے گا نہ اس کو دیکھا جا سکے گا۔

ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن ابی الدنیا اور بیہقی نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جب دوزخ کے اندر ان لوگوں کو جو ہمیشہ وہاں رہنے والے ہیں ڈال دیا جائے گا تو (اس کی صورت یہ ہوگی کہ) ان کو لوہے کے صندوقوں میں بند کر کے صندوقوں میں لوہے کی کیلیں ٹھونک دی جائیں گی پھر ان صندوقوں کو دوسرے آہنی صندوقوں میں بند کر دیا جائے گا پھر ان کو جحیم کے تہ میں پھینک دیا جائے گا کوئی کافر بھی اندر سے سوائے اپنے کسی اور کو عذاب پاتے نہیں دیکھ پائے گا۔ (اس کا گمان ہوگا کہ بس مجھے ہی عذاب دیا جا رہا ہے اس طرح دوسرے کو عذاب میں مبتلا دیکھ کر کسی قسم کی تسلی حاصل کرنے کا موقع نہیں ملے گا)

ابو نعیم اور بیہقی نے سوید بن علقمہ کی روایت سے بھی حضرت ابن مسعودؓ کا بیان اسی طرح نقل کیا ہے۔

أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَا بَنِي آدَمَ أَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿٦٠﴾ وَأَنِ اعْبُدُونِي هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ﴿٦١﴾ وَلَقَدْ أَضَلَّ مِنكُمْ جِبِلًّا كَثِيرًا أَفَلَمْ تَكُونُوا تَعْقِلُونَ ﴿٦٢﴾

اے اولاد آدم! کیا میں نے تم کو تاکید نہیں کر دی تھی کہ تم شیطان کی عبادت نہ کرنا وہ تمہارا صریح دشمن ہے اور یہ کہ میری ہی عبادت کرنا یہی سیدھا راستہ ہے اور یقیناً وہ تم میں سے کثیر مخلوق کو گمراہ کر چکا ہے سو کیا تم نہیں سمجھتے تھے۔

یعنی کیا پیغمبروں کی زبانی تم کو تاکید نہیں کر دی تھی۔ یہ استفہام انکاری ہے اور نفی کا انکار اثبات ہوتا ہے، اس لئے مطلب یہ ہوا کہ میں نے تاکید کر دی تھی۔ یہ جملہ حکم سابق کی علت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے یعنی مومنوں سے الگ ہو جانے کا اس لئے حکم دیا گیا کہ تم کو میں نے تاکید کر دی تھی۔

لَا تَعْبُدُوا یعنی شیطان کے کہنے میں آکر اللہ کی نافرمانی نہ کرنا۔

اِنَّهٗ لَكُمْ الخ یہ حکم سابق کی علت ہے یعنی اس لئے شیطان کے کہنے میں آکر گناہ نہ کرنا کہ وہ تمہارا صریحی دشمن ہے۔

هٰذَا صِرَاطٌ الخ یہ یعنی شیطان کی عبادت نہ کرنے کی تاکیدی ممانعت یا اللہ کی عبادت سیدھا راستہ ہے۔ صراط کی تنوین مبالغہ کے لئے ہے یا اظہار عظمت کے لئے یا تبعیض، کیونکہ توحید سیدھے راستے پر چلنے کا ایک حصہ ہے (تکمیل تو تمام فرائض کی ادائیگی اور ممنوعات کے اجتناب کامل سے ہوتی ہے)

جِبِلًّا مخلوق یا جماعت جن کو پوری سمجھ اور کامل دانش حاصل ہے۔ ان کے لئے یہ جملہ شیطان کی انسانوں سے دشمنی کا ثبوت ہے۔ اس کی عداوت کا اظہار اور گمراہی کی توضیح ہے۔ شیطان انسان کو بے حیائی کی باتوں اور برے کاموں کا مشورہ دیتا ہے وہ خالق و رازق جس کے دست قدرت میں ہر نفع و ضرر ہے اس کی عبادت کو چھوڑ کر ان بتوں کی پوجا کی ترغیب دیتا ہے جن کو نہ نفع رسانی کی طاقت حاصل ہے نہ ضرر رسانی کی اور اس نبی کے اتباع و اطاعت کو ترک کر کے خواہشات نفس کے پیچھے پڑ جانے کا حکم دیتا ہے جس کی تصدیق منجانب اللہ معجزات سے ہو رہی ہے۔

اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا الخ یعنی شیطان کی عداوت بالکل واضح ہے اتنی کھلی ہوئی دشمنی کو کیا تم جانتے نہ تھے۔ یہ استفہام بمعنی زجر و توبیخ ہے۔

هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ اِصْلَوْهَا الْیَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝

(دوزخ کے قریب پہنچ جائیں گے تو ان سے کہا جائے گا کہ یہ جہنم ہے جس سے تم کو ڈرایا جاتا تھا آج اس میں چلے جاؤ (اور اس کی آگ کا مزہ چکھو) اس کفر کی پاداش میں جو (دنیا میں) تم کرتے تھے۔

اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰۤى اَفْوَاهِهِمْ وَ تُكَلِّمُنَاۤ اَیْدِیْهِمْ وَ تَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ۝

اس روز ہم ان کے منہ پر مہریں لگا دیں گے اور ہم سے ان کے ہاتھ کلام کریں گے۔ اور جو کچھ وہ دنیا میں کرتے تھے اس کی شہادت ان کے پاؤں دیں گے۔

حضرت انس کا بیان ہے ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے آپ نے مسکراتے ہوئے فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ میں کس وجہ سے مسکرا رہا ہوں۔ ہم نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی جانے۔ فرمایا مجھے اس بات پر مسکراہٹ آئی کہ ایک بندہ اپنے رب سے کہے گا۔ اے میرے رب کیا تو نے مجھے ظلم کرنے سے پناہ نہیں دے رکھی ہے (یعنی کیا تو نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ کسی پر قیامت کے دن ظلم نہیں کیا جائے گا) اللہ فرمائے گا۔ کیوں نہیں بندہ عرض کرے گا تو میں اپنے خلاف کسی کی شہادت نہیں مانوں گا سوائے اس گواہ کے جو میرے ہی بدن کا حصہ ہو۔ اللہ فرمائے گا آج تیرا نفس اور کِرَامًا كَاتِبِیْنَ (اعمالنامے لکھنے والے فرشتے) تیرے خلاف شہادت دینے کے لئے کافی ہیں۔ پھر اللہ اس کے منہ پر مہر لگا دے گا اور اعضاء کو حکم دیا جائے گا تم بولو۔ حسب الحکم اعضاء بندہ کے اعمال کے متعلق بولیں گے اس کے بعد بندے کو (زبان سے) گویائی کی اجازت دے دی جائے گی اور وہ اپنے اعضاء سے کہے گا تم مر جاؤ مٹ جاؤ تمہاری طرف سے ہی تو میں دفاع کر رہا تھا۔ (مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا قیامت کے دن ہم اپنے رب کو دیکھیں گے۔ فرمایا دوپہر کے وقت جب کہ کوئی بدلی نہ ہو تم کو سورج کے دیکھنے میں کوئی رکاوٹ ہوتی ہے۔ صحابہؓ نے جواب دیا نہیں۔ فرمایا چودھویں کی رات کو جب کہ کوئی ابر نہ ہو تم کو چاند دیکھنے میں کوئی رکاوٹ ہوتی ہے۔ صحابہ نے عرض کیا نہیں۔ فرمایا قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم کو اپنے رب کے دیکھنے میں بھی کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی مگر اتنی جتنی سورج اور

چاند کو دیکھنے میں ہوتی ہے۔ پھر اللہ بندے سے فرمائے گا۔ اے فلاں شخص کیا میں نے تجھے عزت نہیں دی تھی، کیا تجھے سردار نہیں بنایا تھا، کیا تجھے تیرا جوڑا نہیں دیا تھا، کیا گھوڑوں اور اونٹوں کو تیرے حکم کا تابع نہیں بنادیا تھا کہ تجھے سیادت (سرداری) نہیں دی تھی، کیا تجھے مال غنیمت کی چوتھائی کا مستحق نہیں بنایا تھا۔ بندہ عرض کرے گا کیوں نہیں اے میرے رب تو نے یہ سب کچھ مجھے دیا تھا۔ اللہ فرمائے گا کیا تیرا گمان یہ تھا کہ مجھ سے آکر ملے گا۔ بندہ عرض کرے گا نہیں۔ اللہ فرمائے گا جس طرح تو مجھے بھولا رہا اسی طرح میں بھی (تجھے دوزخ میں ڈال کر) بھولا بسرا کر دوں گا۔

پھر اللہ دوسرے بندے سے ملاقات کرے گا اور اس سے بھی یہی فرمائے گا اور وہ یہی جواب دے گا۔ پھر تیسرے سے ملاقات کرے گا اور اس سے بھی یہی فرمائے گا وہ عرض کرے گا میں تجھ پر تیری کتاب پر اور تیرے رسول پر ایمان لایا تھا اور نمازیں پڑھی تھیں، روزے رکھے تھے، زکوٰۃ دی تھی، غرض جس قدر کر سکے گا اپنی تعریف کرے گا اس سے کہا جائے گا کیا ہم تیرے خلاف گواہ کھڑا کر دیں وہ شخص اپنے دل میں سوچے گا۔ میرے خلاف کس کو گواہ بنایا جائے گا۔ پھر اللہ اس کے منہ پر مہر لگوادے گا اور اس کی ران سے فرمائے گا تو بات کر حسب الحکم اس کی ران گوشت اور ہڈی اس کے اعمال جو کچھ ہوئے ہوں گے بتائے گی۔ حضور ﷺ نے فرمایا یہ شخص منافق ہوگا جو اپنی طرف سے (جھوٹے) عذر پیش کرے گا اور اسی پر اللہ کا غضب ہوگا۔ (مسلم)

طبرانی نے اور امام احمد نے کھری سند سے حضرت عقبہ بن عامرؓ کی مرفوع حدیث بیان کی ہے کہ جس روز منہ پر مہر لگادی جائے گی۔ اس روز انسان کی اول ترین ہڈی جو کلام کرے گی وہ بائیں ٹانگ کی ران ہوگی۔

احمد اور نسائی اور حاکم اور بیہقی نے معاویہ بن حیدہ کی روایت بیان کی ہے قیامت کے دن تم ایسی حالت میں آؤ گے کہ تمہارے منہ پر میرا (دہان بند) چڑھا ہوگا اور سب سے پہلے آدمی کی ران اور ہتھیلی بات کرے گی۔

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی روایت سے بیان کیا ہے قیامت کے دن مؤمن کو حساب کے لئے طلب کیا جائے گا اور اس کا رب تخلیہ میں اس کے اعمال اس کے سامنے لائے گا۔ مؤمن اقرار کرے گا اور عرض کرے گا میرے رب میں نے (ایسا) کیا تھا میں نے ایسا کیا تھا۔ اللہ اس کے گناہوں پر پردہ ڈال دے گا اور معاف فرمادے گا اور روئے زمین پر اس کے کسی گناہ کی کسی مخلوق کو اطلاع نہ ہوگی اور اس کی نیکیاں لوگوں پر ظاہر ہوں گی سب لوگ نیکیاں ہی دیکھیں گے اور کافر و منافق کو جب حساب کے لئے طلب کیا جائے گا اور اس کا رب اس کے عمل سامنے لائے گا تو وہ ان اعمال کا انکار کر دے گا اور عرض کرے گا اے میرے رب تیری عزت کی قسم اس فرشتہ نے میرے خلاف وہ اعمال لکھ دیئے ہیں جو میں نے نہیں کئے تھے اللہ فرمائے گا تو نے فلاں (فلاں) عمل فلاں (فلاں) جگہ کیا تھا۔ کافر و منافق کہے گا تیری عزت کی قسم میں نے نہیں کیا۔ جب وہ اس طرح انکار کر دے گا تو اللہ اس کے منہ پر مہر لگادے گا۔ حضرت ابو موسیٰؓ نے کہا میرا خیال ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا سب سے پہلے اس کی سیدھی ران بولے گی پھر آپ نے آیت اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓی اَفْوَاهِهِمْ الخ تلاوت فرمائی۔

ابو یعلی اور حاکم نے حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے بیان کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب قیامت کا دن ہوگا تو کافر کو اس کے اعمال پر عار دلائی جائے گی۔ وہ انکار کر دے گا اور جھگڑا کرے گا۔ حکم دیا جائے گا کہ قسم کھاؤ وہ قسمیں کھائیں گے پھر اللہ ان کو خاموش کر دے گا اور انہیں کی زبانوں سے ان کے خلاف شہادت دلوائے گا۔ پھر ان کو دوزخ میں ڈال دے گا۔

وَلَوْ نَشَآءُ لَطَمَسْنَا عَلٰٓی اَعْيُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَاَنّٰى يُبْصِرُوْنَ ﴿۶۶﴾

اور اگر ہم چاہتے تو (دنیا میں ہی) ان کی آنکھوں کو ملیامیٹ کر دیتے پھر وہ (دیکھتے ہوئے) راستہ کی طرف دوڑتے پھرتے مگر ان کو (دیکھا ہوا راستہ بھی) کہاں دکھائی پڑتا۔

یعنی ان ظاہری آنکھوں کو ایسا مٹا دیتے کہ نہ پپوٹے کا نشان رہتا نہ آنکھوں کا شگاف۔ طمس کا یہی معنی ہے۔

اَلصِّرَاطَ یعنی وہ راستہ جس پر چلنے کے وہ عادی ہیں۔
فَاَنّٰى یُبْصِرُوْنَ استفہام انکاری ہے یعنی ان کو راستہ نہ سوجھتا۔ بغوی نے لکھا ہے یہ تفسیر حسن اور سدی نے کی لیکن حضرت ابن عباسؓ، قتادہ، مقاتل اور عطاء (کے نزدیک اَعْیُنِهِمْ سے مراد ہیں گمراہی کی آنکھیں اور طمس اعین سے مراد ہے ان آنکھوں کا نکال دینا اور گمراہی کی آنکھوں کو ہدایت کی طرف پھیر دینا ان بزرگوں) کے نزدیک مطلب یہ ہے کہ اگر ہم چاہتے تو ان کی گمراہی کی آنکھوں کو نکال باہر کر دیتے اور گمراہی کی طرف سے ان کو نابینا کر دیتے اور ضلالت سے ہدایت کی طرف ان کی نگاہوں کو پھیر دیتے پھر ان کو ضلالت کا راستہ نہ سوجھتا لیکن ہم نے ایسا کرنا نہ چاہا اب کہاں وہ ہدایت ان کو دیکھ سکتی ہے۔

وَلَوْ نَشَآءُ لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰى مَكَانَتِهِمْ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مُضِیًّا وَّلَا یَرْجِعُوْنَ ۝

اور اگر ہم چاہتے تو ان کی جگہ پر (باقی رکھتے ہوئے) ان کی صورتیں بدل ڈالتے پھر وہ نہ (آگے) چل سکتے نہ (پیچھے) لوٹ سکتے۔

یعنی اگر ہم چاہتے تو ان کے گھروں کے اندر ہی ان کو سوروں اور بندروں کی شکل پر کر دیتے۔ بعض نے یہ مطلب بیان کیا کہ ہم ان کو بے جان پتھر کر دیتے کہ گھروں کے اندر پڑے رہتے (حرکت بھی نہ کر سکتے)

وَّلَا یَرْجِعُوْنَ یعنی اس جگہ سے نہیں لوٹ سکتے۔ بعض نے کہا واپس نہ لوٹنے سے مراد ہے تکذیب سے تصدیق کی طرف رجوع نہ کرنا۔

بہ تفسیر حسن اس آیت اور سابقہ آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ عہد شکنی اور کفر کی وجہ سے یہ لوگ مستحق تو اسی بات کے تھے کہ ان کی شکلیں مسخ کر دی جاتیں۔ لیکن اللہ کی عمومی رحمت نے دنیا میں ان کے ساتھ ایسا نہیں کیا اور اس نے باقتضائے حکمت ان کو مہلت دے رکھی۔

وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِی الْخَلْقِ ؕ اَفَلَا یَعْقِلُوْنَ ۝ اور ہم جس کی زیادہ عمر کر دیتے ہیں تو اس کو طبعی حالت میں الٹا کر دیتے ہیں سو کیا یہ لوگ (اتنا بھی) نہیں سمجھتے۔

یعنی جس کی عمر ہم دراز کرتے ہیں اس کو سرنگوں کر دیتے ہیں۔ سرنگوں کر دینے سے یہ مراد ہے کہ شروع میں وہ برابر رو بہ ترقی تھا۔ قوت مسلسل بڑھ رہی تھی پھر کمزوری آتی رہی اور مرنے کے وقت تک ضعف میں اضافہ ہوتا رہا۔

اَفَلَا یَعْقِلُوْنَ استفہام انکاری ہے یعنی ان کو اتنا جاننا اور سمجھنا چاہیے کہ جو خدا اتنے عظیم الشان تغیر پر قادر ہے وہ آنکھوں کو نابود کرنے اور صورتوں کو مسخ کرنے پر بھی قادر ہے فرق صرف یہ ہے کہ یہ تغیرات تدریجی ہوتے ہیں (اور اگر مسخ ہوتا تو یکدم ہوتا)

بغوی نے حسب قول کلبی بیان کیا ہے کہ رسول اللہ کو کفار مکہ شاعر قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ محمد جو کلام بناتے ہیں یہ شعر ہیں اس کی تردید میں آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا یَنْۢبَغِیْ لَهٗ ؕ اور ہم نے محمد (ﷺ) کو شاعری نہیں سکھائی اور نہ شاعری ان کی شایان شان ہے۔

یعنی قرآن کی تعلیم دی جو نہ مقفّٰی ہے نہ موزوں ہے (نہ اس میں قافیہ کی پابندی ہے نہ وزن کی) نہ اس کے اندر وہ تخیلات کا ذخیرہ ہیں (جو شاعری کا معنوی اثاثہ ہیں) نہ اس کا مقصد غلط طور پر جذبات نفرت و رغبت کو برانگیختہ کرنا ہے (جو شاعری کا اصل مقصد ہے) نہ شعر سازی میں اور وزن و قافیہ کی تلاش میں وقت عزیز کو ضائع کرنا ان کے لئے زیبا ہے۔

ایک شبہ:۔ بخاری و مسلم نے صحیحین میں حضرت براء بن عازبؓ کی روایت سے رسول اللہ ﷺ کا یہ قول نقل کیا ہے انا النبی لا کذب انا ابن عبد المطلب میں نبی ہوں اس میں کوئی جھوٹ نہیں میں عبد المطلب کا بیٹا (یعنی پوتا) ہوں۔ (یہ شعر ہے اور رسول اللہ ﷺ کا ساختہ پرداختہ ہے)۔

حضرت جندب بن ابی سفیان راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا هل انت الا اصبع دميت وفي سبيل الله ما لقيت (یہ بھی شعر حضور کا ہے) تو صرف ایک انگلی ہے جو تیرے زخمی ہوئی ہے اور جو دکھ تو نے پایا وہ اللہ ہی کی راہ میں پایا۔

ازالہ :۔ یہ شعر بلا ارادہ حضور کی زبان مبارک سے نکل گئے آپ نے ان کے بنانے کا نہ ارادہ کیا نہ سوچنے میں وقت ضائع (گویا بلا ارادہ آپ نے ان کی ساخت پرداخت نہیں کی) اور بلا ارادہ اتفاقاً اگر زبان سے کوئی مقفیٰ موزوں کلام نکل جائے تو ایسے شخص کو شاعر نہیں کہا جاتا۔ یہ وزن و قافیہ تو نثر میں بھی بکثرت آجاتا ہے بلکہ خلیل نے تو رزمیہ رجز کو شعر نہیں مانا ہے اور رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے دونوں شعر رجز ہی تھے (جو معرکۂ جنگ میں کہے گئے تھے)

اس کے علاوہ بعض روایات میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے لاکذب اور ابن عبدالمطلب پڑھا تھا یعنی مسکون باء نہیں فرمایا۔ دونوں جگہ ب کو متحرک پڑھا۔ اس لئے قافیہ بدل گیا اور یہ شعر نہیں رہا اور دوسرے شعر میں رمیت پڑھا۔ رمیت اشباع کے ساتھ نہیں پڑھا بلقیت مسکون (ت) پڑھا بحرکت نہیں پڑھا۔ اس طرح اختلاف قافیہ ہو گیا۔

بغوی نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کوئی شعر ٹھیک نہیں پڑھ سکتے اگر کوئی شعر پڑھتے بھی تھے تو اس طرح کہ شعر کا وزن ٹوٹ جاتا تھا۔

حسن کی روایت سے بغوی نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ شعر بطور مثل پڑھا۔

كفى بالاسلام والشيب للمرء ناهيا

(اسلام اور بالوں کی سفیدی آدمی کو گناہوں سے روکنے کے لئے کافی ہے)

حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا اے اللہ کے نبی شاعر نے تو اس طرح کہا ہے۔

كفى الشيب والاسلام بالمرء ناهيا

آپ نے دوبارہ پڑھا تو پھر بھی پہلے ہی کی طرح پڑھا۔ اس پر حضرت ابو بکرؓ نے کہا میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اللہ نے فرمایا ہے وما علمنه الشعر وما ينبغي له ۱۔

مقدام بن شریح کے والد کا بیان ہے میں نے حضرت عائشہؓ سے عرض کیا رسول اللہ ﷺ بطور مثل کبھی کوئی شعر پڑھتے تھے ام المومنینؓ نے جواب دیا ہاں عبداللہ بن رواحہ کا شعر اس طرح بطور مثل پڑھتے تھے۔

وياتيك الاخبار من لم تزودی

معمر کا بیان ہے مجھ سے قتادہ نے کہا کہ حضرت عائشہؓ سے کسی شخص نے پوچھا کیا رسول اللہ ﷺ کوئی شعر بطور مثل کبھی پڑھتے تھے۔ ام المومنینؓ نے فرمایا شعر سے رسول اللہ ﷺ کو ہر کلام سے زیادہ نفرت تھی۔ آپ کوئی شعر بطور مثل نہیں پڑھتے تھے مگر (قبیلہ) قیس بن طرف کے شاعر کا یہ شعر بطور مثل پڑھتے تھے۔

ستبدی لک الایام ماکنت جاهلا وياتيك بالاخبار من لم تزودی

لیکن اس شعر کو آپ نے اس طرح پڑھا تھا۔

وياتيك من لم تزود بالاخبار

حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا یہ شعر اس طرح نہیں ہے۔ فرمایا میں شاعر نہیں ہوں اور نہ (شاعری) میرے لئے سزاوار ہے۔

بعض اہل تفسیر نے کہا لہٗ کی ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے یعنی قرآن کا شعر ہونا صحیح نہیں ہے (یعنی قرآن کو شعر کہنا

۱۔ عبدالرحمن بن ابی الزناد کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عباس بن مرداس سے فرمایا بتاؤ کیا تمہارا یہ قول ہے۔ اصبح نهبى ونهب العبيد بين الاقراع وعيينه۔ حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے ماں باپ قربان آپ شاعر نہیں ہیں نہ راوی شعر ہیں نہ آپ کے لئے ایسا ہونا درست ہے۔ شاعر نے تو بین عيينة والاقرع کہا تھا (از مفسر قدس سرہ)

غلط ہے)۔

إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ وَقُرْآنٌ مُّبِينٌ ﴿٦٩﴾ وہ تو محض نصیحت ہے اور ایسا قرآن ہے جو کھول کر بیان کرنے والا ہے۔

ذِكْرٌ یعنی نصیحت اور ہدایت۔ مُّبِينٌ بیان کرنے والا ظاہر کرنے والا۔ یعنی فرائض، حدود، احکام، ماضی کی خبریں، آئندہ ہونے والے واقعات کی اطلاع بیان کرنے والا ہے۔ شاعر ایسا نہیں کر سکتا بلکہ کسی شخص سے ایسے کلام کا صدور ممکن نہیں ہے۔

لِّيُنذِرَ مَن كَانَ حَيًّا وَيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكَافِرِينَ ﴿٧٠﴾ تاکہ ایسے شخص کو ڈرائے جو زندہ ہو اور کافروں پر (عذاب کی) حجت ثابت ہو جائے۔ یعنی ہم نے محمد کو رسول بنایا اور قرآن نازل کیا اس غرض سے کہ مومنوں کو یہ رسول یا قرآن ڈرائے۔ زندہ سے مراد مومن ہے کیونکہ مومن ہی کا دل زندہ ہوتا ہے، وہی حقائق اشیاء سے صحیح طور پر واقف ہوتا ہے۔ حیات لازوال ایمان سے ہی حاصل ہوتی ہے ایمان کا فائدہ اسی کو پہنچتا ہے کافر تو مردہ ہوتا ہے اس کو قرآن سے کوئی فائدہ اور زندگی کا نفع حاصل نہیں ہوتا اس کو اچھے کا برے سے امتیاز نہیں ہوتا۔ وہ پتھروں کی پوجا اور شیطان کی پیروی کو اچھا سمجھتا ہے اور خالق کائنات کی عبادت اور اس کے بھیجے ہوئے رسول ناصح کے اتباع کو برا جانتا ہے اس لئے آخرت میں اس کی حالت ایسی ہوگی کہ نہ مرے گا نہ جئے گا یہ بتانے کے لئے کہ کافر حقیقت میں مردہ ہیں زندوں کے مقابلے میں اَلْكَافِرِينَ کا لفظ استعمال کیا۔

يَحِقَّ الْقَوْلُ۔ القول سے مراد ہے کلمۂ عذاب (عذاب کی حجت)

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا خَلَقْنَا لَهُم مِّمَّا عَمِلَتْ أَيْدِينَا أَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مَالِكُونَ ﴿٧١﴾ وَذَلَّلْنَاهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوبُهُمْ وَمِنْهَا يَأْكُلُونَ ﴿٧٢﴾ وَلَهُمْ فِيهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ ۖ أَفَلَا يَشْكُرُونَ ﴿٧٣﴾

کیا ان لوگوں نے اس پر نظر نہیں کی کہ ہم نے ان کے نفع کے لئے اپنے ہاتھ کی ساختہ چیزوں میں سے مویشی پیدا کئے پھر یہ لوگ ان کے مالک بن رہے ہیں اور ہم نے ان مویشیوں کو ان کا تابع بنا دیا ہے سو ان میں سے بعض تو ان کی سواریاں ہیں اور بعض کو وہ کھاتے ہیں اور ان سے ان لوگوں کے اور بھی منافع ہیں اور پینے کی چیزیں (دودھ، مٹھا دہی وغیرہ) بھی ہیں سو کیا لوگ شکر نہیں کرتے۔

أَوَلَمْ يَرَوْا میں استفہام انکاری ہے یعنی دیکھ رہے ہیں اور اقرار کر رہے ہیں۔

أَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ کہ ہم نے ہی پیدا کئے اور ان کے نفع کے لئے پیدا کئے۔ کوئی دوسرا اس تخلیق میں شریک نہیں ہے۔

مِّمَّا عَمِلَتْ أَيْدِينَا ہمارے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیزوں میں سے بنانے کی نسبت ہاتھوں کی طرف بطور استعارہ ہے جس سے تخلیق میں انفرادیت خداوندی اور بلا شرکت اللہ کے ساتھ ساری چیزوں کی پیدائش کی وابستگی پرزور طور پر ظاہر ہو رہی ہے۔

أَنْعَامًا چوپایوں کے اندر فطرت کے پر ندرت مظاہر اور نفع کی کثرت ہے اس لئے خصوصیت کے ساتھ چوپایوں کا ذکر کیا۔

فَهُمْ لَهَا مَالِكُونَ یعنی ہم نے ان کو مالک بنایا تو وہ مالک بن گئے یا ہم نے چوپایوں کو ان کے تابع کر دیا تو وہ ان پر قابو یافتہ ہو گئے اور ان سے کام لینے لگے۔

وَذَلَّلْنَاهَا لَهُمْ اور ہم نے چوپایوں کو ان کا تابع بنا دیا۔

يَأْكُلُونَ یعنی ان کا گوشت کھاتے ہیں۔

وَلَهُمْ فِيهَا مَنَافِعُ یعنی کھالیں، بال اور دوسرے منافع جیسے زمین جوتنا، بوجھ اٹھانا جانوروں سے ان کو حاصل ہوتے ہیں۔

وَمَشَارِبُ اور پینے کی چیزیں یعنی دودھ، مشارب مشربة کی جمع ہے اور مشربة ظرف مکان ہے یا مصدر میمی۔

اَفَلَا یَشْکُرُوْنَ سوال انکاری ہے اور فعل محذوف پر اس کا عطف ہے پورا کلام اس طرح تھا کیا یہ انکار کرتے ہیں اور شکر نہیں کرتے یعنی انکار نہیں کرتے اقرار کرتے ہیں پھر کفران نعمت کرتے ہیں۔

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ یُنْصَرُوْنَ ۝ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ نَصْرَهُمْ وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ ۝ اور انہوں نے اللہ کے سوا اور معبود قرار دے رکھے ہیں، اس امید پر کہ ان کو مدد ملے (لیکن) وہ ان کی کچھ مدد کر ہی نہیں سکتے اور وہ ان لوگوں کے حق میں ایک (مخالف) فریق ہو جائیں گے جو حاضر کئے جائیں گے۔

وَاتَّخَذُوْا الخ یعنی اللہ کی پیہم نعمتیں اور محیط کل قدرت کا مشاہدہ کرتے ہوئے اور یہ دیکھتے ہوئے کہ اللہ تنہا اس قدرت کاملہ اور ربوبیت عامہ کا مالک ہے دوسروں کو عبادت میں انہوں نے شریک کر رکھا ہے۔ بیہقی اور حکیم نے حضرت ابو درداءؓ کی روایت سے بیان کیا کہ حضور ﷺ نے فرمایا اللہ نے فرمایا میرا اور جن و انس کا ایک عجیب معاملہ ہے۔ میں پیدا کرتا ہوں اور دوسروں کی عبادت کی جاتی ہے میں رزق دیتا ہوں اور شکر دوسروں کا کیا جاتا ہے۔

لَعَلَّهُمْ یُنْصَرُوْنَ یعنی اس امید پر کہ وہ معبود ان کی مدد کریں گے حالانکہ نتیجہ اس کے برعکس ہو گا۔

لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ الخ وہ عذاب سے بچانے کی طاقت ہی نہ رکھتے ہوں گے۔

وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ یعنی کفار اپنے معبودوں کے لئے فریق بنے ہوئے دنیا میں ان کی حفاظت کرتے ہیں اور ان کی نگرانی کے لئے تیار رہتے ہیں باوجودیکہ وہ معبود ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتے۔ نہ کسی شر سے ان کو بچاتے ہیں۔ بعض علماء نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ قیامت کے دن کافروں کے معبودوں کو طلب کیا جائے گا ان کے ساتھ ان کے پرستاروں کو بھی لایا جائے گا گویا وہ سب ایک فوج ہوں گے جن کو دوزخ میں جھونک دیا جائے گا۔

فَلَا یَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ اِنَّا نَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ ۝ سو ان لوگوں کی باتیں آپ کو آزردہ خاطر نہ کریں ہم سب جانتے ہیں جو کچھ یہ دل میں رکھتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں۔

فَلَا یَحْزُنْكَ تسلیت کے لئے ہے یعنی آپ نے کافروں کے لئے عذاب کی وعید سن لی تو اب آپ کو ان کی باتوں سے رنجیدہ نہ ہونا چاہئے اللہ کے معاملہ میں جو وہ الحاد کی باتیں کرتے ہیں اور آپ کی تکذیب و توہین کرتے ہیں اس سے آپ آزردہ خاطر نہ ہوں۔

اِنَّا نَعْلَمُ الخ دلوں میں جو آپ سے عداوت اور غلط عقائد چھپائے ہوئے ہیں ہم ان سے واقف ہیں اور جو بری باتیں کہتے اور برے اعمال ظاہر کرتے ہیں ان کو بھی ہم جانتے ہیں ہم ان کو اس کی سزا دیں گے اور یہی کافی ہے آپ کو غمگین اور فکر مند نہ ہونا چاہئے۔

حاکم نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے اور اس کو صحیح قرار دیا ہے کہ عاص بن وائل ایک بوسیدہ ہڈی ہاتھ میں لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا محمد اس کی حالت جو میں دیکھ رہا ہوں کیا اس کے بعد بھی خدا اس کو زندہ کر کے اٹھائے گا۔ حضور نے فرمایا بے شک اللہ اس کو بھی زندہ کر کے اٹھائے گا۔ تم کو بھی مردہ کرے گا پھر جہنم میں داخل کرے گا۔ اس پر آیات ذیل آخر سورۃ تک نازل ہوئیں۔

اَوَلَمْ یَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ ۝ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِیَ خَلْقَهٗ ۭ قَالَ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَهِیَ رَمِیْمٌ ۝

کیا آدمی کو یہ معلوم نہیں کہ میں نے اس کو نطفہ سے پیدا کیا۔ سو وہ علانیہ اعتراض کرنے لگا اور اس نے ہماری شان میں ایک عجیب مضمون بیان کیا اور اپنی اصل خلقت کو بھول گیا۔ کہتا ہے کہ ہڈیوں کو (خاص طور پر) جب کہ وہ بوسیدہ ہو گئی ہوں کون زندہ کرے گا۔

اَلْاِنْسَانُ یعنی عاص بن وائل، ابن ابی حاتم نے متعدد اسناد سے مجاہد، عکرمہ، عروۃ بن زبیر اور سدی کی روایت سے اور بیہقی نے شعب الایمان میں ابومالک کی روایت سے نیز بغوی نے بیان کیا ہے کہ ان آیات کا نزول ابی بن خلف جمحی کے حق میں ہوا۔ یہی ایک بوسیدہ کہنہ ہڈی لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور انکار بعث وحشر کر کے حضور سے جھگڑا کر رہا تھا اسی نے کہا تھا اس قدر بوسیدہ ہو جانے کے بعد اس کو کون زندہ کر سکتا ہے حضور اقدس نے فرمایا اللہ تجھے (بھی) زندہ کر کے اٹھائے گا اور جہنم میں داخل کر دے گا۔ اس پر ان آیات کا نزول ہوا۔

اَوَلَمْ يَرَ میں استفہام انکاری ہے اور محذوف جملہ پر عطف ہے پورا کلام اس طرح تھا کیا انسان دوبارہ زندہ کرنے پر ہمارے قادر ہونے کا انکار کرتا ہے اور یہ جانتا ہے کہ ہم نے اس کو نطفہ سے پیدا کیا۔

فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ تو اسفاجاتیہ ہے اچانک یکدم یعنی علی الاعلان واضح طور پر جھگڑا کرنے لگتا ہے۔ تحقیق حق نہیں چاہتا۔ جانتا ہے اور اپنی ابتدائی تخلیق کا معترف بھی ہے اس کے باوجود دوسری تخلیق کا جو پہلی تخلیق سے کہیں آسان ہے انکار کرتا ہے۔

اس کلام میں مکرر پیام تسلی ہے یہ بتا کر کہ کافر جو انکار حشر کرتے ہیں اس کے مقابلے میں آپ کے متعلق ان کا قول کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ اس عبارت میں بلیغ مذمت بھی ہے کہ اللہ کی نعمت کے مقابلے میں یہ کفر کرتے ہیں اور کفر سے بڑھ کر اور کوئی نہیں ہو سکتی اللہ کی (کتنی بڑی) نعمت ہے کہ اس نے ذلیل ترین اور نہایت ہی حقیر چیز سے ایک باعزت حامل شرف انسان کو پیدا کیا۔

بعض علماء نے فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ کا یہ مطلب بیان کیا کہ ایک ذلیل پانی ہونے کے بعد اللہ نے اس کو حامل تمیز و شعور اور ایسا سلیس البیان بنایا کہ اس کو جھگڑنے اور مقابلہ کرنے کی قدرت حاصل ہو گئی اور اپنے دل کی بات کو بیان کرنے لگا۔ لہٰذا وہ اپنی اصلی کمینگی اور ابتدائی حقارت پر آ گیا اور اللہ کی زندگی بخشنے والی قدرت کا منکر بن گیا اور اپنے رب سے جھگڑا کرنے کے درپے ہو گیا۔

وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا اور ہمارے متعلق ایک تعجب انگیز بات کہنے لگا۔ امر عجیب یہ کہ اللہ زندہ کرنے پر قادر نہیں اور مخلوق سے خالق کو تشبیہ دینے لگا کہ جس چیز سے مخلوق عاجز ہے اس سے خالق بھی عاجز ہے اور بھول گیا کہ ہم نے اس کو ایک قطرہ سے پیدا کیا نطفہ سے جاندار کو پیدا کرنا تو ہڈیوں کو زندہ کرنے سے زیادہ عجیب ہے۔

وَهِيَ رَمِيْمٌ کہنہ فرسودہ ہڈیاں۔

بیضاوی نے لکھا ہے یہ آیت بتا رہی ہے کہ ہڈیوں میں زندگی ہوتی ہے پھر ان پر موت اثر انداز ہو جاتی ہے دوسرے اعضاء کی بھی یہی حالت ہے۔

بیضاوی کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح مردار کے دوسرے اعضاء نجس ہوتے اسی طرح مردار کی ہڈی بھی نجس ہوتی ہے۔ امام شافعی کا یہی قول ہے۔

ابن جوزی نے التحقیق میں امام احمد کی طرف بھی اس قول کی نسبت کی ہے لیکن مولف رحمۃ اللہ نے لکھا ہے صحیح بات یہ ہے کہ امام احمد کے نزدیک مردار کے دانت اور پر اور ہڈیاں پاک ہیں۔ مردار کی ہڈی کو نجس کہنے والوں نے آیت مذکورہ سے استدلال کیا ہے ایک حدیث کو بھی انہوں نے ہڈی کے نجس ہونے کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مردار کی کسی چیز سے نفع اندوز نہ ہو۔ یہ حدیث ابو بکر شافعی نے اپنی سند سے بوساطت ابوزبیر حضرت جابر کی روایت سے بیان کی ہے۔ مولف المغنی اور صاحب تنقیح التحقیق نے کہا ہے کہ اس کی سند حسن ہے یہ حدیث ابن وہب نے مسند میں زمعہ بن صالح کی روایت سے بحوالہ ابو الزبیر از جابر بن عبداللہ ان الفاظ کے ساتھ بیان کی ہے کہ مردار کی کسی چیز سے نفع اندوز نہ ہو اور میت سے فائدہ اندوز نہ ہو۔ مولف التنقیح نے لکھا ہے زمعہ (کے ثقہ ہونے) میں کلام ہے اور

حدیث معلول ہے ابن معبود وغیرہ نے علت ذکر کی ہے۔

صاحب ہدایہ نے لکھا ہے مردار کے بالوں اور ہڈیوں میں زندگی نہیں ہوتی صاحب ہدایہ کی مراد یہ ہے کہ (جب ان دونوں چیزوں میں زندگی نہیں ہوتی تو ان پر موت بھی نہیں آتی لہٰذا مردار کا لفظ ان کو شامل ہی نہیں ہے اور حدیث میں مردار سے انتفاع کی ممانعت کی گئی ہے لیکن آیت مذکورہ دلالت کر رہی ہے کہ ہڈی میں زندگی ہوتی ہے اس لئے صاحب ہدایہ کا قول غلط ہے۔

(احناف کی طرف سے) بہترین توجیہ یہ بیان کی جاسکتی ہے کہ نجس کرنے والی چیز سیال خون ہے اور ہڈی بال اور پٹھے میں سیال خون نہیں ہوتا اگرچہ ان میں زندگی ہوتی ہے اسی لئے جس جانور میں سیال خون نہ ہو وہ اگر پانی میں مرجائے تو پانی نجس نہیں ہوتا۔

حضرت سلمان فارسی راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کھانے پینے میں کوئی ایسا کیڑا مکوڑا (مکھی بھنگا وغیرہ) گر کر مرجائے جس میں خون نہ ہو تو اس چیز کا کھانا پینا اور اس سے وضو کرنا جائز ہے (رواہ الدار قطنی) دار قطنی نے اس روایت کے متعلق کہا ہے کہ سعید بن سعید زبیدی سے صرف بقیہ نے اس کو نقل کیا ہے اور کسی نے نقل نہیں کیا اور سعید مجہول ہے اور ابن عدی نے سعید کو مجہول کہا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی کے برتن میں اگر مکھی گر جائے تو پوری مکھی کو اس میں غوطہ دے کر پھر نکال کر پھینک دے کیونکہ مکھی کے ایک بازو میں شفاء اور دوسرے بازو میں بیماری ہوتی ہے۔ رواہ البخاری۔

ہماری دلیل حضرت ابن عباس کی روایت کردہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مردار بکری کو دیکھ کر فرمایا تم اس کی کھال کو کیوں کام میں نہیں لائے۔ حاضرین نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ مردار ہے فرمایا اسکا کھانا حرام ہے۔ متفق علیہ۔

دار قطنی نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے مردار کے گوشت کو حرام کیا ہے کھال، بال اور اون میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اس حدیث کی سند ایک راوی عبدالجبار بن مسلم ہے جس کو دار قطنی نے ضعیف کہا ہے لیکن ابن حبان نے ثقہ راویوں میں شمار کیا ہے۔

ابن ہمام نے کہا یہ حدیث درجۂ حسن سے گری ہوئی نہیں ہے تعجب ہے کہ ابن جوزی نے اس حدیث کو مردار کے بال اور اون کی طہارت کے ثبوت میں تو پیش کیا لیکن مردار کی ہڈی کی طہارت پر اس سے استدلال نہیں کیا۔ اور ہڈی کی نجاست کے ثبوت میں رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کو پیش کیا کہ مردار کی کسی چیز نفع اندوز نہ ہو بال اور اون کی نجاست پر اس حدیث سے استدلال نہیں کیا۔

صحیح بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے فرمان مردار کی کسی چیز نفع اندوز نہ ہو کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز کھائی جاتی ہے مردار کی اس چیز سے نفع اندوز نہ ہو کیونکہ سیال خون اس میں شامل ہوتا اور بال اون اور ہڈی میں چونکہ سیال خون مخلوط نہیں ہوتا اس لئے ان میں کوئی حرج نہیں ہے اور مردار کی کھال میں بھی کوئی خرابی نہیں رہتی بشرطیکہ اس کی دباغت کرلی جائے اور رطوبت زائل کردی جائے۔ اس بحث کی احادیث اور بھی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

دار قطنی کا بیان ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا سن لو مردار کی ہر چیز حلال ہے سوائے اس چیز کی جو کھائی جاتی ہے۔ کھال بال اون اور ہڈی سب حلال ہے کیونکہ اس کو ذبح کرنے سے پاکی حاصل نہیں ہوتی (بلکہ یہ مرتی ہی نہیں اس لئے مردار کا حکم اس پر لاگو نہیں ہوتا) اس کی سند میں ایک راوی ابوبکر ہذلی ہے جس کو دار قطنی نے متروک اور غندر نے کذاب کہا ہے اور یحییٰ و علی نے کہا یہ کچھ نہیں ہے۔

دار قطنی نے بیان کیا کہ حضرت ام سلمہ نے فرمایا میں نے خود حضور سے سنا آپ فرما رہے تھے مردار کی کھال میں اگر اس

کی دباغت کرلی جائے تو کوئی حرج نہیں اور نہ مردار کے بال اون اور سینگوں میں کوئی حرج ہے اگر ان کو پانی سے دھولیا جائے دار قطنی نے کہا یہ حدیث صرف یوسف بن سفر نے روایت کی ہے اور یوسف متروک ہے جھوٹ کہتا ہے۔ ابوزرعہ اور نسائی نے بھی اس کو متروک کہا ہے اور رحیم نے کہا یہ کچھ نہیں ہے۔ ابن حبان نے کہا اس کی حدیث سے کسی حالت میں استدلال جائز نہیں ہے۔

ابن جوزی نے بطریق ابو یعلیٰ از حمید شامی از سلیمان بروایت حضرت ثوبان بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہ کے لئے تانت کا ایک ہار اور عاج (ہاتھی دانت) کے دو کنگن خریدے۔ ابن جوزی نے کہا یہ حدیث صحیح نہیں ہے حمید اور سلیمان دونوں مجہول ہیں امام احمد نے فرمایا میں حمید سے واقف نہیں۔ یحییٰ بن معین نے کہا میں سلیمان کو نہیں جانتا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ عاج سے اس جگہ مراد ذبل ہے (ذبل سمندر یا خشکی کے کچھوے کی کھال) ابن قتیبہ نے کہا یہاں عاج سے وہ عاج نہیں جس کو عام لوگ جانتے ہیں اور ہڈی یا دانت سے چھلے کر بناتے ہیں یہ تو مردار ہے جس کی ممانعت ہے رسول اللہ ﷺ حضرت فاطمہ کے لئے اس کے کنگن کیسے خرید سکتے تھے۔ عاج سے مراد تو ذبل ہے اصمعی نے یہی کہا۔

ابن ہمام نے کہا اصمعی نے جو یہ کہا کہ عاج وہ نہیں ہے جس کو عام لوگ جانتے ہیں اس سے دھوکہ ہوتا ہے کہ شاید لغت میں اس کو عاج نہیں کہا جاتا لیکن یہ خلاف واقعہ ہے المحکم میں ہے کہ عاج ہاتھی دانت کو کہتے ہیں اور ناب (نوکیلے دانت) کے علاوہ عاج نہیں ہوتا۔

جوہری نے لکھا ہے کہ عاج عاجۃ کی جمع ہے۔ عاجۃ۔ ہاتھی کی ہڈی کو کہتے ہیں۔ اصمعی کا چونکہ خیال تھا کہ ہاتھی کی ہڈی ناپاک ہے اس لئے انہوں نے کہا کہ حدیث میں وہ عاج مراد نہیں ہے جس کو عام لوگ جانتے ہیں۔

صاحب قاموس نے لکھا ہے کہ عاج کا لفظ مشترک ہے ذبل کو بھی کہتے ہیں اور ہاتھی کی ہڈی کو بھی۔ جزری نے نہایہ میں یہی لکھا ہے اور ذبل۔ بحری و بری کچھوے کی کھال کو کہتے ہیں یا ایک سمندری جانور کی پشت کی ہڈیوں کو جن سے کنگن بنائے جاتے ہیں کذا فی القاموس۔

بیہقی نے بحوالہ بقیہ بوساطت عمرو بن خالد بروایت قتادہ حضرت انسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ عاج کا کنگھا استعمال کرتے تھے۔ بیہقی نے کہا کہ بقیہ کی روایت نامعلوم راویوں کی وساطت سے ضعیف ہے۔

ابن ہمام نے کہا یہ احادیث خواہ (سند کے لحاظ سے) ضعیف ہوں لیکن متن کے لحاظ سے حسن ہیں اور ان میں سے بعض احادیث تو (سند کے لحاظ سے بھی) حسن سے کم درجہ کی نہیں ہیں اور صحیحین میں ان کا اول شاہد موجود ہے۔

قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِيٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ۙ﴿۷۹﴾ آپ کہہ دیجئے ان کو وہی زندہ کرے گا جس نے پہلی بار ان کو زندگی عطا کی اور وہ سب طرح پیدا کرنا خوب جانتا ہے۔

قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِيٓ الخ پیدا کرنے والے کی قدرت میں کوئی تغیر نہیں وہ بحالہ باقی ہے اور مادہ بالذات قابلیت رکھتا ہے اس لئے وہ دوبارہ زندہ کردے گا۔

بِكُلِّ خَلْقٍ خلق سے مراد ہے مخلوق۔

عَلِيْمٌ یعنی مخلوقات کی تفصیل اور کیفیت تخلیق کو جانتا ہے وہ اجسام کے منتشر متفرق اجزاء کے اصول مواقع اور امتزاج کے طریقوں اور سابق کے طرز پر ان کو باہم جوڑنے اور گزشتہ اعراض اور قوتوں کو لوٹا کر لانے یا از سر نو پیدا کرنے سے واقف ہے۔

الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ﴿۸۰﴾ وہی ہے جس نے تمہارے فائدے کے لئے سبز درخت سے آگ پیدا کی پھر تم اس سے اور آگ سلگاتے ہو۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا دو قسم کے درخت ہیں ایک کو مرخ کہا جاتا ہے اور دوسرے کو عفار دونوں درختوں کی

مسواک کی دو ہری شاخیں اتنی ہری کہ ان سے پانی ٹپکتا ہو کاٹ لی جائیں پھر مرخ کو عفار سے رگڑا جائے تو ان سے آگ نکلتی ہے
عرب کہتے ہیں ہر درخت میں آگ ہے اور مرخ عفار میں گھس جاتی علماء کہتے ہیں سوائے عناب کے ہر درخت میں آگ ہے۔
فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ یعنی آگ سلگانے کے وقت تم کو شک نہیں رہتا کہ ہرے درخت میں آگ نکلتی ہے آگ میں
اور پانی میں کیفیت کا تضاد ہے لیکن تضاد کیفیت کے باوجود پانی ٹپکتے ہوئے ہرے درخت سے اللہ آگ پیدا کر دیتا ہے تو جو ذات
اتنی بڑی قادر ہے وہ اس خشک بوسیدہ چیز کو جو پہلے تر و تازہ تھی پھر تر و تازہ کر سکتی ہے۔

اَوَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ۚ بَلٰى ۖ وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴿۸۱﴾
اور جس نے آسمانوں کو زمین کو پیدا کیا کیا وہ اس پر قادر نہیں ہے کہ
ان جیسے آدمیوں کو (دوبارہ) پیدا کر دے۔ کیوں نہیں وہ بڑا پیدا کرنے والا اور خوب جاننے والا ہے۔
استفہام انکاری ہے اور فعل محذوف پر عطف ہے پورا کلام اس طرح تھا۔ جس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا اور تم کو اس
بات کا اقرار بھی ہے تو جس نے اتنے عظیم الشان اجرام پیدا کئے وہ ان آدمیوں کی طرح پیدا کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔
مِثْلَهُمْ یعنی جتنے بڑے آسمان و زمین ہیں اتنے ہی چھوٹے یہ آدمی ہیں۔ یا مثل ہونے سے مراد ہے اصول و صفات میں
ایک جیسا ہونا۔
وَهُوَ الْخَلّٰقُ وہ بہت بڑا خالق ہے ایک مخلوق کے بعد دوسری مخلوق پیدا کرتا ہے۔
الْعَلِيْمُ یعنی تمام ممکنات کو خوب جانتا ہے۔

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۸۲﴾ وہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو
بس اس کا معمول یہ ہے کہ وہ اس سے کہہ دیتا ہے ہو جا وہ فوراً ہو جاتی ہے۔
بیضاوی نے لکھا ہے یہ ایک تشبیہ ہے جس طرح کوئی حاکم محکوم کو حکم دے اور وہ فوراً بلا توقف حکم بجا لائے اسی طرح
اللہ کی قدرت کا اثر مراد الٰہی پر ہوتا ہے کسی چیز کو کرنے کے لئے اللہ کو نہ کسی مشق کی ضرورت ہے نہ آلات کو استعمال کرنے کی
(اگر مزاولت یا آلات کی ضرورت ہوتی تو احتیاج کا شبہ ہو جاتا) شبہ کے مادہ کو جڑ سے کاٹ دینے کے لئے یہ تمثیل ذکر فرمائی۔
قدرت مخلوق پر قدرت خدا کا قیاس غلط ہے۔

فَسُبْحٰنَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾ سو پاک ہے وہ ذات
جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا پورا اختیار ہے اور تم سب کو اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔
فَسُبْحٰنَ، سبحان مصدر ہے یہ محذوف فعل کا مفعول مطلق ہے اور ف سببیت کے لئے ہے یعنی جب تم کو معلوم
ہو گیا کہ انسان کو نطفہ سے پیدا کیا اور اللہ بوسیدہ ہڈیوں کو زندگی عطا کرنے پر قدرت رکھتا ہے اور وہ جب کسی چیز کو کرنا چاہتا
ہے تو کہہ دیتا ہے ہو جا وہ چیز فوراً ہو جاتی ہے تو اب اس خدا کی پاکی بیان کرو جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا پورا اختیار ہے۔
مَلَكُوْتُ بمعنی ملک ہے اور ملک سے مراد ہے اقتدار ملکوت میں واو اور تاء کو مبالغہ کے لئے بڑھا دیا گیا ہے۔
یعنی اللہ چونکہ مالک الملک اور با اقتدار ہے ہر چیز پر مکمل قدرت رکھتا ہے اس لئے ان تشبیہات و تمثیلات سے پاک ہے جو
کفار اس کے لئے بیان کرتے ہیں۔ اور تعجب ہے کہ اس کی شان میں کفار ایسی باتیں کہتے ہیں۔
وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ اس میں مومنوں کے لئے ثواب کا وعدہ اور منکروں کے لئے عذاب کی وعید ہے۔
حضرت معقل بن یسار کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے مُردوں کے لئے یٰسین پڑھا کرو۔ رواہ احمد و
ابوداؤد و ابن ماجہ و ابن حبان والحاکم۔ دوسری روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں یٰسین قرآن کا دل ہے جو شخص اللہ اور دار آخرت کے
لئے اس کو پڑھے گا اس کو بخش دیا جائے گا۔ اس کو اپنے مُردوں کے لئے پڑھا کرو۔
جزری نے حصن حصین میں یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ ذکر کی ہے۔ یٰسین کو جو شخص اللہ اور دار آخرت کی طلب میں

پڑھے گا اس کو ضرور بخش دیا جائے گا۔ اس کو اپنے مردوں کے لئے پڑھا کرو۔
حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر چیز کا ایک دل ہوتا ہے اور قرآن کا دل یٰسین ہے جو شخص (ایک بار) یٰسین پڑھے گا اللہ اس کیلئے دس بار قرآن پڑھنے کا ثواب لکھ دے گا اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔ رواہ الترمذی۔ ل

الحمد للہ

تفسیر مظہری متعلق سورۂ یٰسین آخر ربیع الاول ۱۲۰۵ھ کو
ختم ہوئی

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین

بعونہ تعالیٰ

تفسیر مظہری سورۂ یٰسین کا ترجمہ مع اضافات تشریحی ۱۵ ذی الحجہ ۱۳۹۱ھ کو ختم ہوا۔
فالحمد للہ من قبل ومن بعد وھو الموفق والمعین

ل حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص ہر رات کو یٰسین پڑھے گا اس کو بخش دیا جائے گا۔ رواہ البیہقی بسند ضعیف۔
حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص رات کو سورۂ یٰسین پڑھے گا صبح ہوئی تو اس کی مغفرت ہو چکی ہوگی۔ رواہ ابو نعیم فی الحلیۃ بسند ضعیف۔
حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے سورۂ یٰسین ایک بار پڑھی اس نے گویا دس بار قرآن پڑھا۔ رواہ البیہقی بسند ضعیف۔
حضرت معقل بن یسارؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے یٰسین پڑھے گا اس کے گزشتہ گناہ معاف کر دیے جائیں گے اس لئے اپنے مرنے والوں کے پاس اس کو پڑھا کرو۔ رواہ البیہقی بسند ضعیف۔
طبرانی نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے جو شخص ہر رات یٰسین پڑھنے کی پابندی کرے گا پھر مر جائے گا تو شہید مرے گا۔
دارمی اور طبرانی نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے جو شخص خوشنودی خدا حاصل کرنے کے لئے یٰسین پڑھے گا اس کو بخش دیا جائے گا۔
دیلمی اور ابو الشیخ ابن حبان نے فضائل میں حضرت ابوذرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے جس مرنے والے کے پاس یٰسین پڑھی جاتی ہے اللہ اس کے لئے (موت کی) آسانی کر دیتا ہے۔
محاملی نے امالی میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے جو شخص یٰسین کو اپنی حاجت کا پیش رو بنا دے گا اس کی حاجت پوری کر دی جائے گی۔ دارمی کے نزدیک اس حدیث کا ایک شاہد بھی ہے جو مرسلاً مروی ہے۔
مستدرک میں حضرت امام ابو جعفر محمد بن امام زین العابدین کا قول مذکور ہے کہ جو شخص اپنے دل میں کچھ سختی محسوس کرے اس کو چاہئے کہ ایک پیالہ میں زعفران سے یٰسین لکھ کر پی لے۔ ابن الضریس نے سعید بن جبیر کا قول نقل کیا ہے کہ جو شخص دیوانہ پر سورۂ یٰسین پڑھے گا دیوانہ اچھا ہو جائے گا۔ یحییٰ بن ابی کثیر کا قول ہے کہ جو شخص صبح شام کو یٰسین پڑھے گا (دن بھر) شام تک خوشی میں رہے گا اور جو شخص شام کو یٰسین پڑھے گا صبح تک خوشی میں رہے گا۔ تجربہ کرنے والوں کا یہی بیان ہے۔ (از مفسر قدس سرہ)